مجالسِ امام حسینؑ



محمد حسین ممتاز الافاضل لکھنوی

2

مجالسِ امام حسین علیہ السلام

مولانا محمد حسین ممتاز الافاضل

ناشر

اِمامیہ پبلی کیشنز پاکستان

35، حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور

فون: 042-37158717

نام کتاب: .... مجالسِ امام حسین علیہ السلام

تالیف: .... مولانا محمد حسین ممتاز الافاضل

مطبع: .... مکتبہ جدید پریس، لاہور

اشاعت بار ششم .... نومبر 2011

کمپوزنگ: .... سید قارب حسین زیدی

ناشر: .... امامیہ پبلی کیشنز، لاہور

ہدیہ: ....

ملنے کا پتہ:

العصر اسلامک بک سنٹر

35، حیدر روڈ اسلام پورہ لاہور۔ فون: 042-37159188

اللهم صل علی محمد و آل محمد

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

❁❁❁

عرضِ ناشر

مجالس عزا کی دینی و دنیوی افادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ان سے ہر فرد بلا تخصیص استفادہ کرتا رہے گا اور تا حشر مستفید ہوتا رہے گا۔ علماء و ذاکرین کا اندازِ ذکر و بیان ہمیشہ ان کی علمی صلاحیتوں کے پیش نظر تعمیری رہا ہے اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ نہ صرف مسلمانانِ پاک و ہند بلکہ اہل ہنود، سکھ اور مسیحی فرقہ کے افراد بھی بدرجہ اتم اور کما حقہٗ آئمہ معصومینؑ کے مقدس ذکر سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ان میں سے منتخب افراد کی شاعرانہ وسعتیں اور دیگر مضامین اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں۔

یہ امر قابل صد افسوس ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے مجالس عزا کا دینی تقدس اور درسِ عمل کی تحریک بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ سائنسی دور کی نئی ایجادات، بالخصوص فلم نے جہاں پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لیا، وہاں مجالس عزاء بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ علاوہ ازیں فرسودہ روایات اور غیر مصدقہ مضامین اس منبر پاک سے بیان ہونے لگے جس سے درسِ عمل کی بجائے بے عملی کا دور دورہ شروع ہوا۔ خصوصاً جب ذاکرین عظام کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروائی گئی تو بجائے تعمیری پہلو کو اپنانے کے اُنہوں نے اپنا مخصوص اندازِ بیان بصورتِ فضائل و مصائب جاری رکھا۔ جب انہیں علمی اور دینی ضرورت کے تحت سمجھایا گیا تو یہ عذر پیش کیا گیا کہ اُردو زبان میں کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب نہیں ہے۔ جس میں مصدقہ اور صحیح واقعاتِ فضائل و مصائبِ معصومین علیہم السلام مندرج ہوں۔

اگرچہ یہ علمائے وقت کیلئے ایک بہت بڑا چیلنج تھا لیکن خوش نصیب کہ اس ضمن میں ٹھوس اور مرتبت اقدامات کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

علماء و ذاکرین وقت کی دینی ضرورت، علمی افادیت اور مؤمنین کی علمی سطح کو فرسودات سے مبرا کر کے محققانہ جذبہ بیدار کرنے کیلئے اس سے قبل ادارہ ہذا نے "تذکرۃ الاطہار"، شیخ مفیدؒ، "احسن المقال"، علامہ مجلسیؒ جیسی کتب کو اُردو میں چھپ کر اپنا دینی فریضہ ادا کیا۔

زیر نظر کتاب نہ صرف قارئین کیلئے حق و باطل میں تمیز، سامعین مجالس کیلئے دماغی عیاشی اور مشغلہ سے مبرا، مجالس کی حقیقی روحانیت اور مقاصدِ حسینیؑ کی آئینہ دار ثابت ہوگی بلکہ تعزیت اور عزاداری کی صحیح روح کی عکاسی کرے گی جو خوشنودیٔ آلؑ عمران کا سبب بھی ثابت ہوگی۔

آپ کی آراء کا منتظر، ادارہ

عرضِ مؤلف

مجالس حسین علیہ السلام بہت سے فوائد اپنے دامن میں رکھتی ہیں اور بہت سے نیک نتائج اس درس گاہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں مظلوموں کی داستانیں، مظلوموں سے ہمدردی کے جذبات، ظالموں کے فسانے اور ان کے مظالم سے نفرت کے اثرات تازہ کئے جاتے ہیں۔ ویسے بھی مظلوم کی کہانی لوگ دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ مظلوم کے ذکر میں کشش ہوتی ہے۔ خاص طور پر اہل بیتِ رسولؐ اور آلِ علیؑ و بتولؑ کی مظلومانہ شہادتیں ایک بلند مقصد اور اعلیٰ مطلب رکھتی ہیں۔

انسانیت کے شرف کی بقا، اقدار آدمیت کی ارتقاء، دین انبیاء و مرسلین کی حفاظت، شریعتِ مطہرہ، رسولؐ پاک کی صیانت، ان کی شہادت نفیس اور شریف مقصد تھا۔ اس واسطے لوگ ان مجالس سے مظلوم کی ہمدردی کے جذبات، اشکوں، آہوں اور صدائے نوحہ و شیون کی صورت میں ظاہر کر کے اور ظالموں، غاصبوں اور جابروں سے نفرت و بیزاری کے اثرات نفرین و لعنت کی صورت میں بیان کر کے اُٹھتے ہیں۔

مظلوم سے پیدا اُلفت ہو اور روحِ یزیدی مٹ جائے
اس واسطے تیرے درد بھرے حالات سنائے جاتے ہیں

ان مجالس میں تاریخ انبیاء و اوصیاء، امر آئمہ علیہم السلام زندہ کیا جاتا ہے۔ احکامِ اسلام، مسائل دین، فضائل و مصائب آئمہ طاہرین علیہم السلام بیان کئے جاتے ہیں۔ اس واسطے سامعین دینی معلومات، اسلامی واقعات اور مذہبی معاملات سے آگاہ ہوتے ہیں اور محبتِ اہل بیتؑ اور نفرتِ اعدائے دین کے جذبات سے سرشار ہو کر واپس جاتے ہیں۔ اس لئے مجالس حسینؑ اِن مقاصد و مطالب نفیسہ کا بہترین مدرسہ ہیں، جن کے ذاکرین بہترین مدرس اور سامعین حضرات بہترین شاگرد و طلباء ہیں۔ لیکن یہ مطالب اسی وقت اور اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جبکہ مجالس صحیح طور پر مجالس ہوں، تجارت گاہیں نہ ہوں۔ ذاکرین صحیح صورت میں ذاکرین ہوں، تاجر اور دُکاندار نہ ہوں اور سامعین صحیح شکل میں سننے والے ہوں، لذتِ نفسانی، شغل حیوانی اور تماشائے حظ کا شکار نہ ہوں۔

آج مجالس نے دوسرا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ پہلا انداز باقی نہیں رہا۔ ذہنی عیاشی و کاروباری حیثیت غالب آگئی ہے اور حسینیؑ منبر سے غلط بیانی بکثرت ہو رہی ہے۔ فضائل ہوں یا مصائب، صحیح کم بیان ہوتے ہیں اور غلط زیادہ۔

چنانچہ اس موضوع پر اکثر ذاکرین اور کم علم واعظین سے بات چیت ہوئی تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ اُردو زبان

میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جس میں صحیح واقعات مصائب موجود ہوں۔ اس لئے ایک ایسی کتاب تالیف کریں جس میں واقعاتِ مصائب کربلا از مدینہ روانگی تا مدینہ واپسی تمام مذکور ہوں۔ پھر ہم اپنی ذاکری کو پابندِ کتاب کر دیں گے اور غلط بیانی کا کوئی عذر نہ رہے گا۔ بعض مؤمنین اور بعض علمائے مکرمین نے بھی فرمائش کی کہ اس موضوع پر ایک جامع کتاب تحریر کریں۔

چنانچہ ان حضرات محترمین کے فرمانوں کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اس کتاب کو جلد از جلد مرتب کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں تاریخ و مقاتل کی بہت سی کتابیں دیکھیں۔ مصائب کی جو روایت مستند اور معتبر دیکھی، اسے اخذ کیا اور کتاب میں درج کیا۔ اس میں مجالس کی صورت میں فضائل و مصائب ترتیب دیے ہیں۔

سورۂ الحمد کی تفسیر فضائل کی جگہ تحریر کی ہے۔ تفسیر مسلکِ شیعہ کے مطابق ہے اور فضائل اہل بیت علیہم السلام بھی اس میں شامل ہیں۔ علمی، اصلاحی اور تبلیغی مجالس درج ہیں۔ اُردو زبان میں واقعاتِ کربلا اور مصائب کی اس قدر جامع کتاب آپ نے نہ دیکھی ہوگی۔ اُمید ہے کہ پڑھنے کے بعد آپ اس کے متعلق اچھی رائے قائم کریں گے اور لکھنے والے کیلئے دعائے خیر فرمائیں گے۔

روایات کی صحت و سند کا ہمارے پاس معیار یہ ہے کہ معتبر و مستند کتب تاریخ و مقتل سے روایات نقل کی جائیں اور صراحتاً مضمون قرآن مجید، مسلمہ روایات اور عقل سلیم کے خلاف نہ ہوں۔ اسی معیار پر روایاتِ مصائب ذکر کی گئی ہیں۔ ضعیف، غیر مستند اور خلافِ عقل روایات درج کرنے سے گریز کیا ہے۔

میں اس کتاب کو سرمایۂ آخرت، توشہ سفر اور زادِ راہِ قبر و قیامت، کفارۂ ذنوب سمجھتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ذاکرین کرام، واعظین عظام، مؤمنین ذوالاحترام مجالس کے تقدس اور مقاصد کو برقرار رکھیں گے اور اس وقت مجالس جو رنگ اختیار کر چکی ہیں، اس کا مل جل کر ازالہ کریں گے۔ اسے کاروباری حیثیت اور خونِ حسینؑ کی تجارتی منڈی بننے کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ہوسِ زر اور دُنیوی منافع کی لالچ نہ کریں۔ حق میں باطل اور سچ میں جھوٹ کی آمیزش سے اجتناب کریں اور سامعین حضرات دماغی عیاشی اور مشغلہ دلچسپی کے طور پر مجالس نہ سنیں بلکہ درس گاہِ اسلام اور مقاصدِ حسینیؑ کی نشر و اشاعت اور تعزیت اور پرسہ دینے کی سوگوارانہ ادا استعمال کریں۔

احقر الدارین

محمد حسین (ممتاز الافاضل) لکھنوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

'ابتدا کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے'۔

یہ ایک مختصر آیہ ہے جو ہر سورہ کے آغاز میں مرقوم ہے۔ دیکھنے میں تو نہایت مختصر ہے لیکن مطالب و معارف کے اعتبار سے نہایت وسیع ہے۔

اسے تسمیہ کہتے ہیں کیونکہ اس میں اللہ کے اسمِ مبارک سے ابتداء ہے۔ اس میں ایک نام ذاتی ہے جو اللہ ہے اور رحمٰن و رحیم دو صفاتی نام ہیں۔

حدیث میں آیا ہے:

"كُلُّ اَمْرٍ ذِی بَالٍ لَمْ يُبْدَا بِبِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرُ"۔

"ہر اچھا کام جو بسم اللہ سے نہ شروع کیا جائے، بے برکت ہوتا ہے۔"

جناب امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "بسم اللہ، اللہ تعالٰی کے اسم اعظم سے اس قدر قریب ہے، جتنی آنکھ کی سفیدی سیاہی سے۔"

اس آیت میں تین اسماء کا ذکر

اس میں اللہ تعالٰی کے تین نام مذکور ہیں۔ ایک اللہ جو ذاتی ہے اور دو صفاتی رحمٰن اور رحیم ہیں۔ بسم اللہ شریف میں ان تین ناموں کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر کام دینی یا دنیوی تین چیزوں پر موقوف ہے۔

اوّل: اس کام کے اسباب کا مہیا ہونا اور یہ اسم اللہ کے تصرفات میں سے ہے کہ جملہ امور اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہی مدبر الامور ہے اور تدبیر امور کا تعلق لفظ اللہ سے ہے۔

دوم: ان اسباب کا انجامِ کار تک باقی رکھنا کام کی ابتداء سے آخر تک اس کا مقتضی اسم "رحمٰن" ہے کیونکہ عالم کی بقاء صفتِ رحمٰن سے متعلق ہے۔

سوم: اس کام کا انجام تک پہنچنا اور اس کے ثمرات کا ظاہر ہونا اور نتائج کا مرتب ہونا اور اس سے فائدہ حاصل کرنا یہ صفتِ رحیم

کا تقاضا ہے کہ اس کی شانِ رحیمی بندوں کی کوشش اور محنت کو ضائع نہیں کرتی، اس لئے ان اسمائے مبارکہ کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں منتخب کیا ہے اور ہر سورہ کی ابتداء اس مبارک آیت سے کی ہے اور اسی واسطے ہر معقول کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کی ابتداء سے اسے مبارک بنانے کی تاکید ہے۔

باءِ بسم اللہ کا شرف و مرتبہ

گو بسم اللہ ایک آیت مختصر سی آیت ہے۔ مگر معانی و مطالب کے لحاظ سے ایک بحرِ وسیع ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ تمام علوم چار کتابوں تورات، زبور، انجیل، اور قرآن مجید جو کتب سماویہ ہیں ان میں مندرج ہیں اور قرآن مجید تمام علوم پر حاوی ہے اور قرآن مجید کے تمام علوم سورۃ مبارکہ فاتحہ میں ہیں اور سورۃ فاتحہ کے جملہ علوم "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" میں اور اس آیت کے جملہ و معارف بسم اللہ کی با میں ہیں اس واسطے اس با کا بڑا شرف اور مرتبہ ہے جو "اسم اللہ" کے ساتھ متعلق ہے۔ کیونکہ تمام علوم سے مقصود یہ ہے کہ بندہ جناب حق تعالیٰ میں رسائی حاصل کرے، ذات حق سبحانہ، کمال مجرد، منزہ مقدس ہے وہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے، اور بندہ ہر قسم کے عیوب و نجاسات طبعیہ میں غلطاں، عبد معبود تک نہیں پہنچ سکتا مگر اس کے اسماء مبارکہ کے ذکر اور اس کے پاک نام کے ساتھ چسپاں ہو کر اس کی یاد میں مستغرق ہو کر ذہن اس کی طرف ملتفت ہو، دل میں اس کی یاد ہو اور زبان اس کے ذکر سے تر ہو تو عبد اور معبود کے درمیان حجاب اٹھ جاتا ہے۔ ذاکر لذت وصال کرتا ہے۔

ذاکر اور عابد کو "اسم اللہ" کے ساتھ چسپاں کرنے والی باء ہے گویا کہ باء ایک وسیلہ ہے جو ذاکر کو مذکور اور عابد کو معبود کے قریب کر دیتی ہے عبد کا معبود کے ساتھ تعلق جوڑنے اور غیر سے رشتہ توڑنے میں باء کا عمل دخل ہے، لہٰذا باء "بسم اللہ" عظیم المرتبت رفیع الدرجت حرف ہے۔ قرآن مجید کے افتتاح اور تلاوت کرنے میں قاری کی زبان سے پہلا حرف باء نکلتا ہے۔ چنانچہ باء ایک ایسا کوزہ ہے جس میں علوم و معارف اور نکات و لطائف کا سمندر بند ہے۔

نقطہ، با

باء مبارکہ اس وقت تک باء نہیں بن سکتی جب تک اس کے تحت نقطہ نہ آئے بغیر نقطہ یہ حرف نہ پڑھا جا سکتا ہے اور نہ کوئی مفہوم و مطلب ادا کر سکتا ہے۔ اس باء کو شرف اس نقطے سے ہے جو اس کے نیچے ہے۔ سرتاج اولیاء علی علیہ السلام جیسا کہ فرماتے ہیں:

"اَنَا النُّقْطَةُ تَحْتَ الْبَاءِ".

''وہ باء کے نیچے والا نقطہ میں ہوں''۔

علامہ اقبال بھی اسی عقیدہ کا اظہار فرماتے ہیں

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر

معنی ذبح عظیم آمد پسر

جس طرح کہ الفاظ میں اسماء خدا ہیں اسی طرح معانی میں بھی اسماء خدا ہیں وہ نفوس قدسیہ اسماء خداوندی کے مظاہر ہیں چہاردہ معصومین علیہم السلام جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنیٰ فَادْعُوْهُ بِهَا".

''اللہ کے بہت سے اچھے نام ہیں، تم اس کو اس کے ناموں کے ذریعہ پکارو''۔

وہ اسماء حسنیٰ خدا کی صفات اپنے الفاظ سے ظاہر کرتے ہیں اور چہاردہ معصومین علیہم السلام صفات خداوندی اپنے علوم اور کمالات کے ذریعہ ظاہر کرتے اسماء حسنیٰ الفاظ ہیں اور معصومین علیہم السلام ان کے معانی ہیں۔

جس طرح اسماء حسنیٰ اپنے الفاظ کے ذریعہ خدا کے قریب کر دیتے ہیں اسی طرح یہ ذوات قدسیہ ان اسماء کا مظہر بن کر عبد کو معبود تک پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"نَحْنُ اَسْمَاءُ اللّٰهِ الْحُسْنیٰ".

''وہ اسماء حسنیٰ ہم ہیں''۔

یعنی اس کی صفات کی جھلک دوسری اشیاء کی نسبت ہم میں زیادہ ہے۔ گو اس کی مخلوق کی ہر شے اس کی ذات پاک کی آیت ہے مگر یہ آیات اللہ العظمیٰ ہیں اسی واسطے انبیاء علیہم السلام نے خدا کو ان اسماء حسنیٰ کا واسطہ دے کر پکارا اور ان کو وسیلہ بنایا جیسا کہ جناب آدم علیہ السلام نے توبہ کے وقت اس طرح دعا کی:

"يَا مَحْمُوْدُ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ يَا اَعْلیٰ بِحَقِّ عَلِيٍّ يَا فَاطِرُ بِحَقِّ فَاطِمَةَ يَا مُحْسِنُ بِحَقِّ الْحَسَنِ يَاقَدِيْمَ الاِحْسَانِ بِحَقِّ الْحُسَيْنِ".

اب ہم جناب سید الشہداء کی ولادت باسعادت کا حال بیان کرتے ہیں۔

ولادت با سعادت

سردار انبیاء مکہ سے بادل نخواستہ ہجرت کرنے کے بعد جب مدینہ وارد ہوئے تو مخالفت کی آندھیاں کسی قدر کم ہوئیں

اور رنج وغم کے بادل کچھ دور ہوئے، خداوند عز وعلا نے کچھ فرحت وسرور کے مواقع بہم پہنچائے بدر کے پہلے معرکے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور مشرکین کی حوصلہ شکنی کی اور جناب رسالت مآب کو فتح حاصل ہوئی اور اسلام کو کفر پر غلبہ ہوا۔

ہجرت کے دوسرے سال حسب مرضی خیر الانام کعبہ کو قبلہ بنایا گیا اور جناب امیر المومنین علیؑ اور جناب سیدہؑ کے عقد اور ازدواج کی مسرت نصیب ہوئی۔

بحر شجاعت وسخاوت و بحر عصمت وحیا کا اقتران ہوا نور کے منبع سے پھوٹنے والا دریا جب جناب عبدالمطلبؑ سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر جناب عبداللہ اور جناب ابو طالب کی صلبوں میں جاری ہوا مکارم اخلاق کا یہ دریا مختلف وادیوں سے گزرتا ہوا وادی پاک جناب عبداللہ میں پہنچ کر بحر رسالت بن گیا اور ارض پاک ابو طالب میں داخل ہو کر بحر امامت کے شرف سے مشرف ہوا۔

دوسری ہجری میں یہ نور کے دریا جناب علیؑ وجناب بتولؑ کے پیکر میں باہم مقارن ہوئے تیسری ہجری میں عصمت کے دریاؤں اور طہارت کی خلیج سے ۱۵ ماہ رمضان المبارک کو حلم وسخا کا دُرِ آبدار برآمد ہوا اور سال ۳ یا ۵ شعبان المعظم کو صدف امامت کا تیسرا موتی اور خلیج شہادت کا لال مرجان پیدا ہوا۔

نام

شعبان المعظم کی تیسری یا پانچویں تاریخ کو خمیس یا منگل کے دن مدینہ منورہ دار العصمت میں جناب سیدۃ نساء فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے۔ جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کا نام بحکم رب جلیل "حسینؑ" رکھا جو لفظ حسن کی تصغیر ہے۔ تورات میں شبر ہے چونکہ جناب علی علیہ السلام مثل ہارون ہیں جس طرح کہ حضرت ہارون جناب موسیٰ کے وزیر تھے اسی طرح جناب علیؑ حضور پاکؐ کے وزیر ہیں۔ جناب ہارون کے صاحبزادوں کا نام شبر وشبیر تھا جو عبرانی زبان کے الفاظ ہیں عربی میں ان کا ترجمہ حسن اور حسین ہوتا ہے۔ اسی واسطے حضورؐ نے مرضی خدائے پاک کے مطابق بڑے شہزادے کا نام حسنؑ اور چھوٹے شہزادے کا نام حسین رکھا۔

یہ دونوں نرالے نام ہیں اس سے پہلے ملک عرب میں یہ دو نام کسی کے نہیں تھے، ان دونوں نواسوں کے ولادت سے خاندانِ ہاشمی میں خوشی ہوئی۔

جناب امام حسین علیہ السلام بطنِ مادر میں چھ ماہ رہے اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدّت حمل بھی چھ ماہ ہے مدت حمل اور مظلومی میں بھی ان دونوں معصوموں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ جناب یحییٰ علیہ السلام ایک ظالم بادشاہ کے ظلم

وجور سے بے گناہ شہید کئے گئے اور ان کی شہادت پر زمین و آسمان سے آثار حزن وملال ظاہر ہوئے اسی طرح جناب امامؑ مظلوم کی شہادت عظمیٰ پر زمین سے خون ابلا آسمان لہو کے آنسو رویا، سرخ آندھی چلی، عالم امکان میں اضطراب پیدا ہو۔ دریا کھولنے لگے مچھلیاں تڑپنے لگیں، صحرائی جانور بے تابی سے ادھر اُدھر دوڑنے لگے، پرندوں نے آشیانے چھوڑ دیئے فرزند فاطمہؑ کی مظلومی، غربت بے کسی پر ہر چیز نے اپنے اپنے رنگ میں نوحہ وماتم کیا۔

القاب و کنیت

آپؑ کی کنیت ابوعبداللہ اور ابوعلی ہے۔ آپؑ کے القاب بہت سے ہیں جن میں الشہید، السعید، سبط ثانی، تابع لمرضاتِ اللّٰہ، الدلیل علیٰ ذات اللّٰہ، الامام الشہیدالولی الرشید، الطرید الفرید، الطیب الوفی، الامام الرضی، الذبیحا لعطشان، القتیل العریان، ابو الائمہ، شافع الامۃ، صاحب المختہ الکبریٰ، اولو اقعۃ العظمیٰ، الصابر، الشاکر، لیکن جس لقب سے آپؑ کو امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے، وہ ہے ''سیدُالشہداءؑ''۔

حالاتِ ولادت

جناب صفیہ بنت عبدالمطلب حضورؐ پاک کی عمہ محترمہ بیان کرتی ہیں کہ بعد ولادت یہ مولود مسعود میری تحویل میں تھا حضورؐ پاک تشریف لائے اور فرمایا:

پھوپھی صاحبہ میرے بیٹے کو لایئے۔

میں نے کہا: یارسولؐ اللہ میں نے اسے ابھی غسل ولادت دے کر پاک نہیں کیا۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: تو اسے پاک کرے گی؟ اسے تو خداوند عالم نے پاک و پاکیزہ پیدا کیا ہے۔

بس میں نے پیش کیا تو حضورؐ نے ان کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور ان کے منہ میں اپنی زبان مبارک دی اور وہ چوسنے لگے۔

جناب امام حسینؑ کی غذا کا معمول یہ تھا کہ حضورؐ پاک اپنا انگوٹھا ان کے منہ میں دیتے اور جناب حسینؑ وہ انگوٹھا چوستے اسی انگشت پاک سے غذا کے چشمے جاری ہوتے اور امامؑ اسی پاک غذا سے تربیت پاتے رہے۔ اس واسطے جناب حسین علیہ السلام کا خون خونِ رسولؐ اور ان کا گوشت گوشتِ رسولؐ ہے۔ وہ بدنِ رسالت کا حصہ اور جسم کا جزو ہیں۔

جناب صفیہ بیان فرماتی ہیں کہ حضور پاکؐ نے اپنے پیارے نواسے کی پیشانی کا بوسہ لیا اور آنسو بہاتے ہوئے مجھے

واپس کیا اور تین بار کہا اے میرے پیارے بیٹے خدا اس قوم پر لعنت کرے جو تیرے ساتھ جنگ کرے گی اور تجھے قتل کرے گی جناب صفیہ نے کہا کہ میں نے دریافت کیا کہ حضورؐ اس نازنین رسالت کو کون کم بخت قتل کرے گا؟

جناب نے فرمایا بنی امیہ کا باغی گروہ قرآن مجید کی مکتوب ذیل آیت کے مصداق جناب حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔

"ووَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا. حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَ حَمْلُهُ وَ فِصَالُهُ ثَلٰثُونَ شَهْرًا حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ"۔

"ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا اسے اس کی ماں نے ناخوشی اور رنج کی حالت میں پیٹ میں اٹھایا اور رنج ہی کی حالت میں جنا اس کے حمل اور دودھ بڑھائی کی مدت تیس مہینے ہے یہاں تک کہ جب اپنی پوری قوت کمال کو اور چالیس برس کو پہنچتا ہے تو کہتا ہے میرے پروردگار! مجھے توفیق عطا فرما کہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کرسکوں جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور یہ بھی توفیق دے کہ ایسا عمل صالح بجالاؤں جو تجھے پسند ہو اور میرے لئے میری اولاد میں صلاح اور تقویٰ پیدا کر۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور یقیناً میں تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔"

تفسیر اہل بیت علیہم السلام میں اس آیت کے مصداق جناب حسینؑ بن علیؑ ہیں کیونکہ جب امام حسینؑ بطن مادر میں تھے تو جناب رسول پاکؐ نے اپنی لخت جگر سیدہؑ کو خبر سنائی کہ بیٹی تیرے ہاں حجت خدا پیدا ہوگا جسے میری امت بھوکا و پیاسا بے جرم و بے خطا شہید کرے گی اس خبر کو سن کر معصومہ بہت مغموم ہوئیں اور فرمایا کہ مجھے ایسے فرزند کی کیا حاجت ہے۔ جو مظلومی و بیکسی سے مارا جائے، کاش کہ میں اسے نہ جنوں اور جب پیدا ہوئے تو اس وقت خوشی میں رنج کی لہر تھی۔ مبارک بادیں بھی تھیں او صاتم پرسی بھی تھی، تہنیت بھی تھی اور تعزیت بھی تھی چنانچہ بعد ولادت جہاں مسرت کی تقریب تھی وہاں آنسو بھی بہائے گئے مسرت و عزا کے ملے جلے جذبات ظاہر ہوئے۔

اس آیت میں مدت حمل چھ ماہ اور مدت رضاعت دو سال قرار دی گئی اور دونوں کو ملا کر تیس ماہ بنتے ہیں آیت میں عموم ہے اصول وکلیات ہیں لیکن مصداق اس کے جناب حسینؑ بن علیؑ ہیں اور ان آیات کا مفہوم صرف ذات امام مظلوم پر منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ سوائے آپؑ اور حضرت یحییٰ بن زکریا علیہم السلام کے کوئی چھ ماہ کا بچہ زندہ نہیں رہا اور نہ زندہ رہتا ہے۔

محبت رسولؐ

جناب رسالت مآبؐ کو ان دو صاحبزادوں کے ساتھ بہت محبت تھی۔ حضورؐ کی محبت کے واقعات کتب فریقین میں مستند حوالوں کے ساتھ ملتے ہیں مثلاً عید کے روز دونوں نواسوں کو کندھوں پر اٹھا کر مدینہ کی گلیوں میں پھرانا، منبر پر لے جا کر امت کے سامنے اظہار محبت فرمانا اور حضورؐ کی محبت صرف اس وجہ سے نہ تھی کہ لخت جگر ہیں، نواسے ہیں، پیاری بیٹی کے پیارے بیٹے ہیں۔ ایسی قربت رشتہ داری اور اولاد ہونے کی حیثیت سے صرف اپنی ذات تک محدود رکھتے۔ کون ہے جسے اولاد اور افراد خانہ سے محبت نہیں؟

لیکن حضورؐ پاک نے اس محبت کو اپنے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اپنی امت کو ان سے محبت و مودّت کا تعلق قائم رکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا۔ ایک دفعہ نہیں بار بار فرمایا صرف فرمایا ہی نہیں، پہلے خود عمل کر کے دکھایا۔ رسول و نبی ہر حال میں ہر وقت ہر جگہ رسول و نبی ہوتا ہے۔ اگر نماز پڑھنے پڑھانے اور احکام شریعت پر عمل کرنے اور احکام پہنچانے کے وقت وہ رسول ہیں اور ان کا کوئی فعل عمل رسالت، حکم اسلام کی تعمیل اور ایسے حکم کی پیروی، اسلامی حکم کی پیروی اور سنت رسولؐ کی پیروی ہے تو کیا حسنینؑ کے ساتھ محبت کے مختلف طریقے گود میں لینا کندھوں پر اٹھانا، انگلی پکڑا کر ساتھ لئے چلنا، خطبہ قطع کر کے منبر چھوڑ کے خود جا کر اٹھانا، کیا یہ عمل رسالت اور فعل نبوت نہیں؟ یہ محبت کے اطوار اور مودّت کا کردار زبانی تبلیغ اور عملی تاکید اس وجہ سے تھی کہ جناب امام حسینؑ کا مرتبہ اور مقام اللہ کے نزدیک بہت بلند ہے۔ یہ خدا کے پیارے ہیں۔

گو صغیر السن ہیں مگر رہبر ہیں امام ہیں اور حجت خدا ہیں۔ چنانچہ جناب کی معروف حدیث:

"حُسین منّی و انا مِنَ الحسین اَحَبَّ اللّٰہُ من احبَّ حسیناً و اَبغض اللّٰہُ من اَبغَض حسیناً".

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں خدا اس سے محبت کرتا ہے جو حسینؑ سے محبت کرتا ہے اور خدا اسے اپنا دشمن جانتا ہے جو حسینؑ سے بغض رکھے"۔

جملہ خبریہ ہو یا دعائیہ، ظاہر کرتا ہے کہ نہ صرف حسینؑ سے خدا محبت کرتا ہے، بلکہ حسینؑ کے محبوں سے بھی خدا محبت کرتا ہے۔ حسینؑ خود محبوب خدا بلکہ محبّ حسینؑ بھی محبوب خدا ہے۔

تو یہ محبت کے واقعات صرف خونی رشتہ اور قربت کی بناء پر نہ تھے۔ یہ صرف رسولؐ پاک کے پیارے نہ تھے بلکہ

رسولؐ کے خدا کے پیارے بھی، انبیاء و مرسلین کے محبوب، حریم کبریا کے سر مکتوم اور ملائکہ مقربین کے مخدوم ہیں۔

عزادارو! جس قدر جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو اپنے اہل بیتؑ کے متعلق درسِ محبت دیئے اور ان کے ساتھ مودّت کے انداز سکھائے اتنا ہی مخالفت وعداوت پر امت نے کمر باندھی۔ جناب رسولؐ پاک نے تو بحکم خدا اقرباء کیلئے مودّت مانگی تھی لیکن امت نے مخالفت وعداوت کا اظہار کیا۔ کسی مولود کی ولادت پر مجلس غم منعقد نہیں ہوئی مگر حسینؑ و زینبؑ کی ولادت نے ماں باپ کو اشکبار کر دیا۔ ملائکہ آسمان نے مبارک کے پر مسرت پیغام سنائے اور بے کسی غریبی اور مظلومی کی موت کی خبر بھی دی۔ ماں کا دل کڑھتا تھا۔ جب عطشان کی آوازیں کانوں میں آتی تھیں، پانی پینے کو جی نہیں چاہتا ہوگا۔ جب بتایا جاتا ہوگا کہ تیری اولاد بہتے دریا کے کنارے پیاسی شہید ہوگی۔ روتی بھی تھیں اور کہتی بھی تھیں کہ میں ایسے فرزند کو کیا کروں قتیل عبرات ہے جو بے کسی کی موت مارا جائے گا جسے غسل وکفن بھی نہ ملے گا، جس کے وارثوں کو دفن کرنے سے روکا جائے گا۔ اس وقت رسولؐ زادی "حملتهُ اُمّهُ کُرهاً" کی تصویر تھی۔

البتہ اس غم کو دور کرنے والی دکھ کو راحت میں بدلنے والی اور بے چین دل کو تسلی دینے والی وہ حدیث تھی کہ بیٹی غم نہ کر تیرے مظلوم بیٹے کی نسل سے خدا سلسلہء امامت تا قیام قیامت قائم رکھے گا یہ نو اماموں کا باپ ہوگا۔ اس خبر سے بہتے ہوئے آنسو تھم جاتے دل کی دھڑکنیں پُر سکون ہو جاتیں۔

اسی طرح ولادت کے بعد یہ خبر غم باعث رنج وملال بنی جب پوچھا: "بابا! آپ روتے کیوں ہیں؟ باباجان! ریش مبارک آنسوؤں سے تر کیوں ہوگئی ہے؟ میں قربان جاؤں روئے اقدس کا رنگ بدل کیوں گیا ہے؟ آپ کیوں غمگین ہیں؟"

فرمایا: "بیٹی جبرئیلؑ نے مجھے مولود کی تہنیت کے ساتھ شہادت کی خبر بھی سنائی ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ زمین کربلا میں ظلم و جور کے ساتھ مع اعزہ و انصار پیاسا شہید کر دیا جائے گا۔ میری امت میرے بیٹے کے ناحق خون سے ہاتھ رنگین کرے گی۔"

عرض کی: "باباجان! اس وقت آپ نہ ہوں گے؟"

فرمایا: "بیٹی میں اس وقت نہ ہوں گا۔"

گریہ کرتے ہوئے جناب سیدہ نے عرض کی: "بابا! اس وقت علیؑ نہ ہوں گے؟" فرمایا: "علیؑ بھی نہ ہوں گے" پھر پوچھا: "کیا حسنؑ بھی نہ ہوں گے؟"

فرمایا: "نہیں بیٹی! حسنؑ بھی نہ ہوں گے، آپ بھی نہ ہوں گی۔"

کہا: "باباجان! پھر میرا بیٹا غریب و مظلوم و بے کس ہو کر مارا جائے گا تو اس پر رونے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ اس کی لاش

پر غم کے آنسو بہانے نوحہ و ماتم کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔"

فرمایا: "اس وقت تو غریب الدیار ہو کے مارا جائے گا ورثاء کو رونے کی اجازت بھی نہ ملے گی۔ غسل و کفن اور دفن کا وارثوں کو موقع بھی نہ ملے گا۔ انہیں صفِ ماتم بچھانے کی فرصت بھی نصیب نہ ہوگی۔ مگر خدا ایک قوم پیدا کرے گا جو تیرے مظلوم پسر کے سوگ میں صفِ ماتم بچھا کر رویا کرے گی اور کربلا کے شہیدوں کا غم سنا کر تیری روح کو پرسا دے گی اور تیرے دکھے ہوئے دل کو عزاداری سے تسکین دے گی"۔

یہ سن کر جناب مخدرۂ عصمتؑ نے کہا: "بابا! میں اس قوم کے حق میں دعا کرتی ہوں اور روزِ قیامت میں ان کو اپنے ساتھ لے کر بہشت میں جاؤں گی۔"

منقول ہے کہ: جناب سیدہؑ کو ایسے سوگواروں کے ساتھ اس قدر محبت ہے کہ جب کسی مومن مخلص عزادار کا بچہ انتقال کرتا ہے اور اسے وہ مومن قبر کی آغوش کے سپرد کرتا ہے تو جناب سیدہؑ اس کے فرزند کو اپنی گود میں لے کر پیار و محبت کرتی ہیں: "تو میرے فرزند کے سوگوار کا لختِ جگر ہے"۔

جنابِ سیدہؑ تو مومن بچوں کو اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر پیار کرتی ہیں لیکن افسوس کہ جنابِ بتولؑ پاک کی کمسن اولاد کو امت نے کس ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ یتیموں کے سر پر دست شفقت کی بجائے طمانچے مارے، معصوم بچوں کے سر کے بالوں کو پکڑ کر بے رحمی سے کھینچا، ننھے منے ہاتھوں میں رسیاں باندھیں، پیاسا رکھا، پانی کے لیے ترستے رہے، جنگلوں اور ویرانوں میں ڈر کر پناہ لیتے تھے۔ ظالموں کی جھڑکیں اور کرخت آوازیں دل ہلا دیتی تھیں۔ پاؤں پر آبلے، پھٹے ہوئے کرتے، منہ پر طمانچوں کے نشان، چوٹیاں کھلی ہوئی ہیں، "وامحمدا، واعلیا" کی صدائیں دیتے تھے، کوئی آسرا نہ ملتا تھا، رحم دل تلاش کرتے، بے رحم ہاتھوں کے عذاب میں مبتلا ہوتے۔ سایہ ڈھونڈتے مگر کوئی بیٹھنے نہ دیتا، آسمان روتا، زمین فریاد کرتی، جنگل کے درخت آنسو بہاتے مگر ظالموں کو ترس نہ آتا۔

✿✿✿

سورۂ مبارکہ حمد کی تعریف

تخصیصِ حمد

یثرب سے سیدّ الشہداء کا سفر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ. اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ . مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ. اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ. صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ. غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ. وَلَا الضَّآلِّيۡنَ.

"سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جو بہت رحم کرنے والا اور بہت رحمٰن ہے، روز جزاء کا مالک ہے۔ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھی راہ پر چلا، ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ ان لوگوں کی راہ پر جن پر تیرا غضب ہوا ہے اور نہ ہی گمراہوں کی راہ پر"۔

فاتحہ کی قدر و عظمت

اس سورہ کے کئی نام ہیں۔ فاتحہ: جس سے کسی شے کی ابتداء ہوتی ہے، اسے فاتحہ کہتے ہیں۔ چونکہ یہ قرآن مجید کے شروع میں ہے، اس واسطے اس کا نام فاتحہ ہے۔

شافیہ

یہ علیلوں کو شفا دیتی ہے۔ اس کے ذریعے بیمار جامِ شفا پیتے ہیں۔ مریض تندرست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسے پڑھ کر پانی دم کرکے بیماروں کو پلایا جائے یا تعویز بنا کر اپنے پاس رکھا جائے تو شفا ملتی ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ذیشان ہے:

"فَاتِحَةُ الۡكِتَابِ شِفَاءٌ مِنۡ دَاءٍ"

"سورۂ فاتحہ ہر بیماری کی شفا ہے"۔

یہ ایسی باعظمت وسعادت سورہ ہے کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

"لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب"

"بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز نہیں"۔

تمام سورتوں سے زیادہ ثواب اس کے پڑھنے کا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث میں مسطور ہے کہ سورۂ اخلاص کے پڑھنے سے پورے قرآن کی تہائی کا ثواب ملتا ہے اور سورۂ حمد کے پڑھنے سے قرآن کے دو ثلث یعنی دو تہائیوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میت کی روح کو ثواب پہنچانے کیلئے اس کی صف ماتم بچھا کر سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور پرسہ دینے والے لوگ سورۂ فاتحہ پڑھ کر ثواب ہدیہ کرتے ہیں۔ عموماً لوگ کہتے ہیں کہ فاتحہ پڑھنے جا رہا ہوں۔ فاتحہ خوانی کے لیے لوگ آ رہے ہیں۔ قبروں پر فاتحہ خوانی ہو رہی ہے۔ فاتحہ پڑھنے والے حضرات اگر سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ سورۂ توحید کی تلاوت بھی کر دیا کریں تو پورے قرآن کا ثواب مل جائے۔

لیکن یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ان ہر دو سورتوں کے پڑھ لینے کے بعد قرآن کی تلاوت، اور اس کے معانی و مطالب کو سمجھنا، دن رات اس کی تلاوت سے گھر کو مبارک بنانا، اسے زندگی کا مکمل دستور العمل جان کر اس کے مطابق زندگی گزارنا ترک کر دیا جائے۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ مسلمان پورے قرآن کو پڑھنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، یا وقت میں وسعت نہ ہو، مومن کو قرآن سے محبت ہو، ثواب جزیل کا خواہشمند ہو، سارا قرآن پڑھنے سے معذور ہو تو ان سورتوں کی تلاوت سے سارے قرآن کا ثواب ملتا ہے۔ اس سورۃ کو سبع مثانی بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں سات آیات ہیں اور ہر نماز میں کم از کم یہ دو دفعہ پڑھی جاتی ہے اور منقول ہے کہ یہ دو دفعہ نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری بار مدینہ میں۔

اسلوبِ بیان

سورۂ فاتحہ اگرچہ قرآن مجید کا حصہ ہے مگر قرآن مجید سے اس کا طریقِ نزول جداگانہ ہے اور اس کا اسلوب بیان دوسری سورتوں سے الگ ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ بذریعہ الہام والقاء بر زبانِ بندگان نازل ہوئی ہے۔ بندوں کو بارگاہِ ایزدی متعال میں مناجات کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ جب پہلی سورۃ "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ حکم ہوا:

"پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔"

اس حکم کی تعمیل میں جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ حمد پڑھی۔

آخر جب خداوند عالم نے پڑھنے کا حکم دیا، تو پیغمبرؐ نے پڑھنا تو تھا سورہ علق، یعنی اِقْرَاء بِاسْمِ رَبِّکَ کی ہر آیت کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حمد کی تمام آیات کی تلاوت کی۔ حکم بھی خدا کا تھا اور جواب میں پڑھنے کا ڈھنگ اور مطالب بھی خدا نے القاء فرمائے۔ اس واسطے باقی تمام قرآن بذریعہ وحی جبرئیل نازل ہوا اور یہ سورۃ بذریعہ القاء پیغمبرؐ خدا کو تعلیم کی گئی اور زبانِ پیغمبرؐ سے جاری ہوئی۔

یہی وہ سورۃ ہے، جس کی تفسیر عالمِ لدنی، بابِ مدینۃ العلم حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے بیان فرمائی۔ لسان اللہ کی زبان حمد کی تفسیر میں ترجمی اور جناب ابن عباسؓ شاگردِ رشید، ہمہ تن گوش تھے۔ معارف و مطالب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر زبان کے دہانے سے تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا اور جناب عبداللہؓ اپنی علمی تشنگی بجھا رہے تھے۔ علم کے موتی خلیج حمد کی تہہ سے رول رہے تھے۔ سورۂ کی تفسیر کی وہ وسعتیں دراز ہو رہی تھیں اور دامانِ شب سمٹ رہا تھا۔ نہ بیان کرنے والے زبان تھکی اور نہ سننے والے کان تھکے۔ البتہ رات تھک گئی، رات کی تاریکی تھک گئی، سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا، جناب ابن عباسؓ نے رات کے رخصت ہونے پر آہِ سرد کھینچی اور کہا کہ کاش! رات لمبی ہو جاتی اور یہ علمی صحبت ختم نہ ہوتی۔ تفسیر باقی تھی، وقت ختم تھا۔ اس وقت جناب امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

"لَوْ شِئْتُ لَاَوْقَرْتُ سَبْعِیْنَ بَعِیْراً مِنْ تَفْسِیْرِ سُوْرَةِ الْفَاتِحَةِ".

اگر میں چاہوں تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے اتنی کتابیں لکھوں، جنہیں ستر اونٹ اُٹھا سکیں۔

اس سورۃ کو ام الکتاب بھی کہتے ہیں۔ لفظ ام اصل اور بنیاد کے معنی دیتا ہے۔ یہ سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی اصل اور بنیاد ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ ابتداء میں ہے اور اس وجہ سے بھی کہ تمام معانی و معارف قرآن کی جامع ہے۔ علاوہ ازیں اسے سورۂ الکافیہ، وافیہ، سورۂ الحمد، سورۂ دعا بھی کہتے ہیں۔ سورۃ الکنز بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"فَاتِحَةُ الْکِتَابِ کَنْزٌ مِنْ کُنُوْزِ عَرْشِیْ"

سورۂ فاتحہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

جس طرح کہ بسم اللہ ہر کام کے آغاز کے لیے باعثِ برکت ہے، اسی طرح حمدِ خدا بھی ہر ذیشان کام کے آغاز میں ضروری ہے۔ ہر خطبے کے آغاز میں، بسم اللہ کے بعد حمدِ باری تعالیٰ کی جاتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:

"کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَاءُ بِحَمْدِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرٌ".

ہر وہ کام جو شان و شرف والا ہے، اگر حمدِ خدا سے اس کی ابتداء نہ کی جائے وہ بے برکت اور نامبارک ہوتا ہے۔

بسم اللہ کے بعد اس سورۃ کی پہلی آیہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ "تمام تعریفیں، ساری ثناء وستائش مخصوص ہے، اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا، کل کائنات کا پروردگار ہے"۔

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو بذریعہ زبان کسی کی اختیاری خوبی پر اس کو مستحق ثناء سمجھتے ہوئے کی جائے، خواہ اس کی طرف سے نعمت و بھلائی ہو یا نہ ہو۔

اور شکر اس تعریف کو کہا جاتا ہے جو کسی بھلائی کرنے والے کسی منعم اور محسن کی بھلائی اور احسان کے بدلے میں کی جائے، پس حمد اور شکر میں فرق یہ ہے کہ حمد اس ذات کی ذاتی خوبیوں اور استحقاق کی بناء پر کی جاتی ہے اور شکر وہ تعارفی کلمات ہیں جنھیں نعمت و بھلائی کے معاوضے میں ادا کیا جاتا ہے۔ خداوند عالم حمد کا بھی مستحق ہے اور شکر کا بھی۔ شکر کا اپنی لاتعداد نعمتوں کی بناء پر اور حمد کا تمام صفات وخوبیوں کا مالک ہونے کی بناء پر۔ اسی لئے کہا جاتا ہے:

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ عَلٰی کُلِّ حَالٍ"

تخصیصِ حمد

حمد مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے لیے۔ دراصل تمام کمالات وخوبیاں اسی ذات پاک پر جا رکتی ہیں۔ اگر کوئی جاندار یا بے جان چیز، کوئی خوبی یا صفت اپنے میں رکھتی ہے، تو اس کی خالق وہ خود نہیں بلکہ اس کو اس کے غیر نے عطا کی ہے، پھولوں کی خوبصورتی اور خوشبو، پھلوں کا ذائقہ اور حسن، نباتات کی تاثیر اور رنگت، جواہرات کی چمک اور خوشنمائی، جڑی بوٹیوں اور معدنیات کی افادیت گو اِن کی صفات اور اثرات وافادیات ان کے اپنے ہیں اور ان کی خوبیوں کی بنا پر قابل مدح وثناء ہیں۔ اگر ان تمام صفات وحسنات کی خالق یہ اشیاء خود ہوتیں تو تعریف انہی تک رک جاتی اور آگے نہ بڑھتی۔

مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اشیاء اور ان کی صفات مخلوق ومصنوع ہیں تو بے ساختہ ان کو دیکھ کر زبان پکار اٹھتی ہے سبحان اللہ، پاک ہے وہ اللہ اور حمد کے لائق ہے وہ خدا جس نے ان اشیاء کو وجود بخشا اور ان خوبیوں کا حامل اور ان صفات کا موصوف بنایا۔ کس قدر بلند اور صاحب کمال ہے وہ ذات جس نے ان کو گونا گوں خوبیوں سے آراستہ کر کے نوعِ انسان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، لہٰذا یہ اشیاء اپنے مقام پر قابلِ مدح ہے۔ لیکن قابلِ حمد نہیں۔ ان کو قابلِ مدح بنا کر مستحق حمد وہ خود ہے جس نے اپنے جمال وکمال کا جلوہ ان میں ودیعت فرمایا۔ ان کو لباسِ حسن پہنایا۔ خوشذائقہ بنا کر مرغوب ومحبوبِ بشر بنایا۔

اسی طرح حیوانات کی مختلف اقسام، ان کی عجیب وغریب شکلیں، مختلف اور پیاری رنگت، حسن وجمال اور قوت وکمال،

سب کچھ قابلِ مدح ہے۔ لیکن وہ اور ان کی جملہ خوبیاں ان کی اختیاری نہیں، بلکہ ان کے خالق و صانع کی عطا ہے، اس واسطے دراصل قابلِ حمد وہ ذات ہے جو ان کی خالق و صانع اور ان کو یہ خوبیاں بخشنے والی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس، انسان جس کو اشرف المخلوقات کا خطاب زیبا ہے، وہ اپنی شکل و صورت اور با اختیار ہو کر منازل ارتقاء اختیار کرنے میں شاہکارِ قدرت ہے، جو خلاصۂ کائنات ہے۔

جسے ترقی کے غیر محدود اختیارات و اسباب دیئے گئے اور بے حد قوتیں اس کے اندر ودیعت کی گئیں اور بے شمار کمالات کا مالک ہے، یہ بھی مستقلاً حمد کا اہل نہیں، کیونکہ جن وسائل کی بناء پر جس قوتِ بازو اور عقل و ادراک کے ذریعے یہ منازلِ کمال و مدارج ارتقاء طے کرتا ہے، وہ اس کے اپنے پیدا کردہ نہیں۔ وہ اپنے وجود میں محتاجِ عقل و شعور ہے اور یہ اس کا ذاتی نہیں، بدنی قوتیں اور ذہنی طاقتیں اس کی اپنی نہیں۔ وہ خود مخلوق ہے، خالق نے اس کو تمام قوتیں عنایت کیں۔

اگر قابلیت و ذہانت، دل و دماغ، جسمانی و دماغی قوتیں، عقل و ادراک کی تیزی انسان کے بس میں ہوتی تو ہر انسان ان نعمتوں سے مالا مال ہوتا، خصوصاً دولتمند آدمی یہ چیزیں دولت کے بل بوتے پر خرید لیتے مگر:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست		تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تو جس قدر انسان خالق کی عطا کردہ قوتوں اور وسائل و اسباب کو حسبِ مرضی خالق، اپنے تصرف میں لا کر گوناگوں ترقی کے درجات طے کرتا ہے، وہ اپنی محنت و کوشش میں تو قابلِ تعریف ہے، مگر دراصل لائقِ حمد وہ ذات ہے جس نے انسان کو وجود بخشا اور غیر محدود ترقی کی قوتیں عطا فرمائیں، جس نے انسان کے بدن اور ادراک کی تربیت کی، اس کی کوششوں کی قدر کی، جادۂ عروج میں اس کی رہنمائی کی، فتوحات کے دروازے کھولے۔

اسی واسطے خدا نے بندوں کو ہدایت کی کہ کہو "الحمدللہ" "سب تعریفیں دراصل خدا کے لیے ہیں۔" غرض یہ کہ جملہ مخلوقات اپنی ذات و صفات میں بے نیاز ذات کی مرہونِ منت ہے۔

پودوں کا نکھار، چمن کی بہار، پھولوں کی نزاکت، پھلوں کی حلاوت، جواہرات کی چمک، تاروں کی دمک، سورج کی ضیاء، قمر کا نور، پرندوں کا حسن، چرندوں کی زیبائی، روباہ کی ذکاوت، شیر کی شجاعت، انسان کا کمال، بشر کا جمال، سب قادرِ کریم کی قدرت کے کرشمے ہیں اور تمام کمالات اسی کی ذات پر منتہی ہوتے ہیں اور وہی بخشندۂ تمام کمالات معارج ہے، اسی بناء پر وہ لائقِ حمد و ستائش ہے۔

ایک اور مقام پر اس کا ارشاد ہے:

"وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ".

"اس کی تعریف ہے آسمانوں اور زمین میں"۔

"وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ".

"اسی کی حمد ہے دنیا میں اور آخرت میں۔"

اللہ کو لائقِ حمد سمجھتے ہوئے اس کی حمد و ثناء کرنا بہت بڑی عبادت ہے اور خاصانِ خدا کا یہ معمول ہے کہ ہر حال میں اس کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ پنجتنِ پاک علیہم السلام نے جس طرح حمد و ثنائے باری تعالیٰ کی ہے، اس قدر کسی نے نہیں کی۔ چنانچہ عالمِ ارواح اور حجاباتِ نور میں ان ذواتِ مقدسہ نے تسبیح و حمد کا ورد جاری رکھا۔ چنانچہ ملائکہ مقربین نے بھی تسبیح و تقدیس کے ڈھنگ ان سے سیکھے۔ یہ اتنا عظیم الشان عمل، جسے ملائکہ نے خلافت کی تمنا کرتے ہوئے اسے بطور استحقاق پیش کیا:

"نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ".

"ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں"۔

اسی کثرتِ حمد کی وجہ سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام آسمانوں میں "احمد" ہے۔ احمد کا معنی ہے "سب سے زیادہ حمد کرنے والا" عالمِ انوار میں یہ احمد تھے، عالمِ اجساد میں محمدؐ بن کر آئے۔ انہوں نے خدا کی تعریف کی اور خدا نے ان کو اس عالم میں محمدؐ بنا دیا، جن کی ہر جگہ تعریف ہوتی ہے اور ان کا ذکر بلند کیا کہ جہاں توحید کا ذکر ہوتا ہے، وہاں ان کی رسالت کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

وہ چونکہ ہر چیز کا خالق اور رب ہے، اس واسطے ہر چیز اس کی تسبیح و حمد کرتی ہے اور اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے ڈھنگ سے ہر مخلوق فریضہ حمد ادا کر رہی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ".

"کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو لیکن تم ان کی حمد کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے"۔

ہر شے نے امام حسین علیہ السلام پر گریہ کیا

جہاں جہاں خداوندِ عالم نے ہر شے کو تسبیح و حمد کرنے پر مامور کیا ہے، وہاں ہر شے کو جنابِ سید الشہداءؑ پر نوحہ و بکا کرنے کی سعادت بھی بخشی ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ امامِ مظلوم علیہ السلام کی شہادت پر ہر شے روئی ہے۔ آسمان رویا، زمین روئی، ملائک

روئے، جن و بشر نے ماتم کیا، ملائکہ نے آسمان میں ماتم کیا، پرندوں نے ہوا میں، چرندوں نے صحراء میں، آبی جانور پانی میں تڑپے، ریت کے ذرّوں، زمین کے ڈھیلوں اور پہاڑوں کے سنگریزوں نے غم سنایا۔ دوست بھی روئے دشمن بھی روئے۔ جن ہتھیاروں سے تن اقدس مجروح اور شہید ہوا وہ بھی مغموم ہوئے، شمر کا خنجر رویا، حرملہ کا تیر کمان رویا، خولی کا نیزہ رویا، سنان بن انس کی تلوار روئی، خود ظالم اور قاتل روئے۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

"اَنَا قَتِیلُ الْعَبَرَاتِ".

"میں تو آنسوؤں کا کشتہ ہوں۔"

مدینہ سے سفر کی تیاری

عزادارو! ہمیں یہی ایک نرالا اور ممتاز مظلوم شہید نظر آتا ہے کہ جس کی ولادت سے پہلے، ولادت کے وقت اور شہادت کے وقت گریہ و بکاء ہوا اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ اس غریب الوطن کی کون سی مصیبت دل ہلا دینے والی نہیں ہے؟

مومنین کرام! ذرا اس وقت کا تصور کریں جب مدینہ کی گلیوں اور یثرب کے در و دیوار اس کی جدائی پر آنسو بہا رہے تھے۔ سید الشہداؑ یثرب سے سفر کی تیاریاں کر رہے ہیں اور بنی ہاشم کے گھروں میں ماتم بپا ہے، قبر رسولؐ ہل رہی ہے، ضریح بتولؑ مضطرب ہے، مزارِ حسنؑ متزلزل ہے، مسجدِ نبوی بے رونق ہو رہی ہے، گلدستۂ اذان فریاد کر رہا ہے، منبرِ رسولؐ مصروفِ غم ہے، آج مدینہ اجڑ رہا ہے، مدینہ کی گلیاں اداس، نازنینِ رسالتؐ، دل بندِ مرتضیٰؑ، لختِ دلِ زہراؑ مدینہ سے رخصت ہو رہا ہے۔

صرف حسینؑ نہیں جا رہے، زہراؑ کی بیٹیاں، اولادِ علیؑ، حسنؑ مجتبیٰ کا کنبہ، عقیلؑ کا گھرانہ اور ابو طالبؑ کا سارا خاندان فرزندِ فاطمہؑ کے ہمراہ ہے۔

تو مومنین! میں پوچھتا ہوں کہ محلّہ بنی ہاشم میں کیا رہ گیا ہے؟ برباد نہیں ہو گیا؟ اس چمن میں خزاں نہیں چھا گئی؟

ہائے جن گھروں میں ملائک کا نزول ہوتا تھا، جہاں حوریں کنیزیں بن کر آتی تھیں، جہاں ملائک چکیاں پیستے اور جھولے جھلاتے تھے، جنت کی لوریاں ہوتی تھیں، جنت سے کھانے اور لباس آتے تھے، میں قربان! آج ان گھروں کے دروازے بند ہو رہے ہیں، صحن برباد اور مکانوں کو تالے لگ رہے ہیں، سامان سمیٹا جا رہا ہے، حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، آج مدینہ میں یومِ وفاتِ رسولؐ تازہ ہو گیا ہے۔

منقول ہے کہ جنابِ فرزندِ رسولؐ، ولید کے دربار سے بمع جماعتِ بنی ہاشم واپس گھر آئے اور بنی امیہ کے ارادے

معلوم ہوئے تو مدینہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کرلیا اور اٹھارہ بنی ہاشم تو گھروں میں چلے گئے، پھر جب رات چھا گئی تو آپؑ اداسی کے عالم میں قبر رسولؐ پر آئے، پریشان زلفوں، محزون دل اور غمگین چہرے کیساتھ قبر رسولؐ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ریشِ مبارک آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ گلوگیر لہجے میں کہتے ہیں:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ".

میں آپ کا نواسہ حسینؑ ہوں، تیری امت میں تیرا خلیفہ ہوں۔ نانا! گواہ رہنا! تیری امت نے میری کوئی قدر نہیں کی۔ میری کوئی مدد نہیں کی، میری حقوق ضائع کر دیئے۔ میرے ماں باپ قربان جائیں، میں مجبوراً آپؐ کی قبر چھوڑ رہا ہوں، بے بس آپؐ کے قریب سے جدا کیا جا رہا ہوں نانا! میں یزید کی بیعت کیسے کروں؟ اس کی بیعت سے آپ کا دین کیسے برباد کروں؟ اگر بیعت کرتا ہوں تو تیرا دین اور تیری شریعت ختم ہوتی ہے اور اگر انکار کروں تو میں قتل ہوتا ہوں۔ نانا! تیرا دین زندہ رہے، میں موت کو قبول کرتا ہوں اور میں جان قربان کرتا ہوں، تیرے دین کو زندہ رکھتا ہوں"۔

پھر دوبارہ سلام پڑھ کر گھر واپس آ گئے۔

دوسری رات پھر نانا کی قبر پر گئے، چند رکعت نماز پڑھی، پھر دستِ دعا بلند کئے اور یہ مناجات کی: "اے اللہ! یہ تیرے نبی محمد مصطفےٰؐ کی قبر ہے اور میں تیرے نبی کا بیٹا ہوں۔ اب مجھ پر وہ کام آپڑا ہے جسے تو جانتا ہے، خدایا میں نیکی سے محبت اور برائی سے نفرت کرتا ہوں، اے ذوالجلال والاکرام! میں تجھ سے اس قبر اور قبر والے کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ میرے لئے وہی اختیار کر جس میں تیری اور تیرے رسولؐ کی رضا وخوشنودی ہو۔

اس کے بعد قبر کے پاس بیٹھ کر روتے رہے۔ روتے روتے قبر مبارک پر سر رکھ دیا۔ نیند آ گئی، عالمِ خواب میں دیکھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر سے باہر نکلے ہیں، ان کے دائیں اور بائیں فرشتوں کا لشکر ہے۔ حضورؐ نے مظلوم نواسے کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی کا بوسہ لیا اور فرمایا: "میرے مظلوم بیٹے! میں عنقریب تجھے خون میں غلطاں دیکھتا ہوں، تو مجھے پیاسا نظر آتا ہے، تیرے بدن پر تیروں، نیزوں اور پتھروں کے زخم ہیں، زمینِ کربلا پر تیری لاش بے گور وکفن پڑی ہے اور میری امت کا ایک لعین گروہ باغِ بتولؑ کو تاراج کر رہا ہے، شمر خنجر چلا رہا ہے اور زہراؑ جائیاں فریاد کر رہی ہیں۔

بیٹا! تیرا باپ علیؑ اور تیری ماں فاطمۃ الزہراؑ، تیرا بھائی حسنؑ ابھی میرے پاس آئے ہیں، تیری مدینہ سے جدائی پر غمزدہ نظر آتے ہیں۔ بیٹا! تھوڑا عرصہ باقی رہ گیا ہے گزار پھر تو میرے ساتھ مل جائے گا۔ حسینؑ! جنت میں کچھ ایسے درجات ہیں،

جنہیں بغیر شہادت کے تو پا نہیں سکتا۔"

حسینؑ نیند کی حالت میں نانا سے کہہ رہے ہیں: "نانا! مجھے دنیا میں واپس جانے کی حاجت نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھ قبر میں داخل کرلو۔ نانا! زمین تنگ ہوگئی ہے، امت دشمن ہے۔" جواب آیا: "واپس ضرور آنا ہے اور شہادت کا مرتبہ پانا ہے، جو کام تو نے کرنا ہے وہ اور کوئی نہیں کرسکتا۔ میرے دین کا شجر سوکھ رہا ہے، تیرے خون سے سیراب ہوگا۔ میری شریعت تیرے لہو سے سرخرو ہوگی"۔

پس صبح کے وقت حسین علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے۔ بے چین اور مضطرب ہیں، اپنے گھر واپس آئے۔ دن کے وقت اپنے اہل بیتؑ کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے خواب کا واقعہ بیان کیا۔ اس دن اہل بیتؑ کے گھر میں اتنا غم ہوا، گویا مدینہ کے در و دیوار شدت غم سے ہل رہے تھے۔ اہل بیتؑ رسولؐ کا گھر ماتم کدہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعد وفات جناب رسولؐ اس قدر غم اہل بیتؑ کے گھر میں نہیں ہوا۔

یہ بھی منقول ہے کہ امامِ مظلومؑ رات کے وقت مظلومہ، مغمومہ، محرومہ ماں کے مزار پر وداع کرنے کیلئے گئے۔ مہیج الاحزان کی روایت ہے کہ ماں کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكِ يَا اُمَّاهُ حُسَيْنُكِ جَاءَ لِوِدَاعِكِ وَهٰذِهٖ آخِرِ زِيَارَتِهٖ اِيَّاكِ"

اماں! غریب بیٹے کا سلام ہو۔ تیرا حسینؑ تیرے وداع کے لیے آیا ہے اور اس کی یہ آخری زیارت ہے۔

قبر سے صدا آئی: "تجھ پر سلام! اماں کے مظلوم بیٹے۔ تجھ پر سلام ہو ماں کے شہید اور غریب بیٹے!" مظلوم امامؑ کی آواز شدت گریہ سے گلوگیر ہوگئی۔ یہاں تک کہ امامؑ فرط گریہ سے کلام نہ کرسکے۔ معلوم نہیں کہ مظلوم بیٹے کی غربت، بے کسی اور جدائی کا ماں کے دل پر کیا اثر ہوا؟ زخمی پہلو والی ماں نے مسافر بیٹے کو کس طرح رخصت کیا؟ حسینؑ ماں کی قبر پر گئے۔

ہاں! گیارہویں کی رات کو ماں کربلا میں بیٹے کی لاش پر آئی اور اشکبار آنکھوں سے بیٹے کی لاش دیکھی۔ کس طرح دیکھی کہ لاش کے اعضاء سلامت نہ تھے، زخمی بدن میں سر موجود نہ تھا، کوئی جگہ بوسہ کے لیے زخموں سے خالی نہ تھی، ہاتھ کٹے ہوئے تھے، لاش خاک اور خون میں غلطاں تھی۔

اسی طرح قبر مبارک جناب حسن علیہ السلام پر گئے اور وہاں بھی یہی کیفیت رہی۔

محمد بن حنفیہؓ سے وداع

صبح کے وقت جناب محمد بن حنفیہ آئے۔ رو کر گلے لگے، ملے اور کہا:

"آپ مجھے تمام مخلوق سے زیادہ عزیز ہیں۔ اہل بیت رسولؐ کے اس وقت آپ ہی سردار ہیں۔ آپ کی اطاعت کا قلادہ میری گردن میں ہے۔ آپ میرے امام ہیں، میں آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ آپ بیعت یزید سے الگ رہیں اور خطرے والے شہروں سے دور رہیں۔ اپنے قاصد لوگوں کی طرف بھیجیں اور حالات سے ان کو مطلع کریں اور انہیں اپنی بیعت کی دعوت دیں۔ اگر لوگ آپ کی بیعت قبول کرلیں تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور اگر لوگ کسی غیر کی بیعت کرلیں تو وہ نہ آپ کے دین کو گھٹا سکتے ہیں اور نہ آپ کی فضیلت اور آپ کے شرف کو ختم کرسکتے ہیں۔ لیکن ایسے شہر میں جہاں آپ کے مخالف بھی ہوں گے اور موافق بھی۔ لیکن میں ڈرتا ہوں، لوگوں کی بے وفائی سے۔ کہیں آپ ان کے نیزوں اور تیروں کا نشانہ نہ بن جائیں"۔

جناب امام علیہ السلام نے فرمایا: "بھائی! اب میں کہاں جاؤں؟ زمین تنگ ہوگئی۔ لوگ خانوادۂ رسول کے دشمن ہو گئے ہیں"۔ جناب محمدؓ نے فرمایا: "آپ مکہ چلے جائیں، اگر مکے میں سکون نصیب ہو تو بہتر ورنہ یمن چلے جائیں۔ وہ آپ کے نانا اور بابا کے مددگار رہے ہیں۔ وہ رحم دل، نرم مزاج اور وسیع الظرف ہیں۔ آپ کو وہاں راحت و آرام حاصل ہوگا ورنہ ہی پہاڑ کی گھاٹیوں اور ریت کے ٹیلوں میں شہر بہ شہر پھرتے رہیں۔ آپ خدا کوئی فیصلہ کردے گا"۔

جناب محمد بن حنفیہؓ کی نصیحت سن کر مولاؑ نے فرمایا: "بھائی خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے اچھی نصیحت کی ہے۔ میں فی الحال مکہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" اس کے بعد محمد بن حنفیہؓ جناب حسین علیہ السلام کے گلے میں باہیں ڈال کر روتے رہے۔ مولاؑ نے فرمایا: "آپ مدینے میں ہی رہیں اور میرے خاندان کے پسماندگان کے آپ ہی محافظ و نگران ہیں۔ میرے ساتھ میرے بھائی بھی ہیں، میری بہنیں بھی ہیں، میرے بیٹے بھی، بھائی حسنؑ کا کنبہ، عقیلؑ کی اولاد میرے ہمسفر ہیں۔" اس کے بعد ایک وصیت نامہ لکھا اور بند کر کے اس پر مہر لگا کے محمد بن حنفیہؓ کے سپرد کیا۔

جناب امام حسین علیہ السلام، مسافر کربلا نے نانا کے مزار مبارک پر جو درد بھرے کلمات کہے اور رسولؐ پاک نے جو غم خیز جملے جواب میں ارشاد فرمائے۔ اس جگر پاش مکالے کو ایک عربی شاعر نے نظم کیا۔ ہم ذاکرین اور سامعین کے لیے قلمبند کرتے ہیں۔ امامِ مظلومؑ کی دلسوز صدا ہے:

ضُمَّنِیُ عِنۡدَکَ یَاجَدَّاہ فِیُ ھٰذَاالضَّرِیۡحِ
عَلِّنِیُ یَا جَدُّ مِنۡ بَلۡوٰی زَمَانِی اَسۡتَرِیۡحُ

نانا! مجھے اپنے ساتھ اپنی اس ضریح میں اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیجئے اور مجھے بہلائیے کہ میں زمانے کی مصیبت سے راحت پا جاؤں۔

میرے مولاؑ کو بچپن کا زمانہ یاد آیا کہ کبھی آغوشِ محبت اور کبھی دوشِ عظمت پر بٹھا کر پیار کرتے۔ اب دکھوں کا دور آ گیا ہے۔ نانا کو سکھ کا زمانہ یاد دلا کر نانا کا پیار طلب کرتے ہیں۔

ضَاقَ بِیْ یَا جَدُّ مِنْ رَحْبِ الْفَضَا کُلُّ فَسِیْحٍ
فَعَسٰی طَوْرُ الْاَسٰی یَنْدک بَیْنَ الْاَکْتَیْنِ

نانا! فضا اپنی وسعت اور زمین اپنی فراخی کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی ہے۔ راہیں بند ہیں، مصیبتوں نے گھر لیا ہے۔ قریب ہے کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

جَدُّ صَفْوُ الْعَیْشِ مِنْ بَعدکَ بِالْاَکْدَارِ شِیْبَ
وَاشْبَابَ لَھُمْ وَاسی قبل ابَانِ الْمشَیب

نانا! زندگی کا صاف پانی، دکھوں کی میل کچیل میں گدلا ہو گیا ہے اور غم نے میرا سر بڑھاپے سے پہلے سفید کر دیا ہے۔ زندگی غموں اور دکھوں سے آلودہ ہوگئی ہے۔

فَعَلَا مِنْ داخِلِ الْقَبْرُ بکَاءٌ وَ نَحِیْبٌ
وَ نِدَاءٌ بِافْتِجَاعٍ یَا حَبِیْبِی یَا حُسَیْنُ

قبر کے اندر سے رونے کی آواز بلند ہوئی اور درد بھری پکار آئی: اے میرے پیارے حسینؑ!

اَنْتَ یَا رَیْحَانَۃَ الْقَلْبِ حَقِیْقٌ بِالْبَلَاءِ
اِنَّمَا الدُّنْیَا اُعِدَّتْ لِبَلَاءِ النُّبَلَاءِ

اے میرے دل کے پھول! میرے قلب کے ثمران! مصیبتوں اور بلاؤں کے لیے تو ہی سزاوار ہے، یہ دنیا تو شرفاء کی آزمائش اور امتحانوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ بیٹا انہی امتحانوں کے لیے میں نے تیری تربیت کی ہے۔ اس سب سے بڑی آزمائش میں تیرے سوا کون اترنے والا ہے؟

لَکِنَّ الْمَاضِیْ قَلِیْلٌ بِالَّذِیْ قَدْ اَقْبَلَ
فَاتَّخِذْ دِرْعَیْنَ مِنْ حَزْمٍ وَ عَزْمٍ بِالْغَیْنِ

ماضی میں جو دکھ آئے ہیں وہ قلیل ہیں۔ دکھ تو اب آنے والے ہیں۔ مصیبتوں اور بلاؤں کا ہجوم اور آلام وغموم کے حملے

اب ہونے والے ہیں بیٹا! ہوشیاری اور پختہ زرہیں ان کے مقابلے کے لیے تیار کر لے۔

بَستَذُوقُ الْمَوْتَ ظلماً ظامِیاً فِیْ کربلا

وَ سَتَبقی فِی ثَراھَا ثَاوِیاً مُنْجَدِلاً

غریب الوطن بیٹا! تو کربلا میں پیاسا ظلم کے ساتھ مارا جائے گا اور کربلا کی زمین میں خاک وخون میں غلطاں پڑا رہے گا۔ تیری لاش بے گورو کفن رہے گی اور وہیں تیری قبر بنے گی۔

وَکَاَنِّیْ بِالاَیَامٰی من بناتی تستغیث

لِغَباً تستعطفُ القَومَ و قَد عَزَّا لمُغِیث

میری اُمت کے ستائے ہوئے بیٹے! گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ میری بیٹیاں کربلا میں وارث رہ گئی ہیں ان کا کوئی سہارا اور آسرا نہیں۔ بیکسی کے عالم میں عاجز و ماندہ ہو کر فریاد کر رہی ہیں اور لوگوں سے رحم کی فریاد کر رہی ہیں لیکن ان بیکسوں کی فریاد کو پہنچنے والا کوئی نہیں۔

قَدْ بَرِیٰ اَجْسَامَھُنَّ الضَّربُ الیَرُّ الحثیثُ

بَینَھَا السَّجَّادُ فِیْ الْاَصْفَادِ مَغلولُ الْیَدین

میں دیکھ رہا ہوں ظالموں کے ظلم وستم اور اونٹوں کی تیز رفتاری نے ان کے بدن لاغر کر دیے اور ان بے وارث غریب الوطن مظلوم بیبیوں میں سجادؑ بیمار بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کڑیوں میں گرفتار ہیں۔

متواتر سفر، بھوک و پیاس کی شدت، وارثوں کی موت کے صدموں اور قید و بند کی صعوبتوں نے مدینہ کی شہزادیوں کے بدن لاغر و اس قدر دبلے و کمزور کر دیے تھے کہ ہڈیوں پر گوشت نہیں رہا تھا۔

❁❁❁

ذاتِ باری تعالیٰ کا ثبوت
رب العالمین کی شان
مدینہ سے سفر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ".

ذاتِ باری تعالیٰ کے موجود ہونے کی علماء و متکلمین نے جو دلیلیں پیش کی ہیں، ان میں سے چند ایک پیش کی جاتی ہیں تا کہ مومنین ہستیِ خالق کی معرفت حاصل کر کے ایمان و یقین بڑھائیں۔ آج کل چونکہ منکرینِ خدا اطراف عالم میں پھیل رہے ہیں اس واسطے ذاتِ باری تعالیٰ کا بقدر امکان تعارف ضروری ہے تا کہ ملحدین کی رد ہو اور مسلمین کا ایمان مضبوط ہو۔

وجودِ باری تعالیٰ کی دلیل

اہل علم اس بات کی گواہی دیں گے کہ دنیا کی ہر شے مخلوق ہے۔ جماد ہو یا نبات، حیوان ہوں یا انسان مخلوق ہیں۔ یہ جہان دنیا اور جو کچھ اس میں ہے مخلوق ہے۔ قدیم نہیں کیونکہ دنیا کی ہر چیز کو تغیر و تبدل لاحق ہے۔ ہر آن اس میں تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے، مضبوط کمزور ہو جاتی ہے۔ سالم میں نقص آ جاتا ہے، تازہ چیز کملا جاتی ہے۔

نباتات کسی وقت نہ تھیں، انہیں وجود ملا۔ بڑھیں، پھلی پھولیں، بہار دکھائی، پھر آہستہ آہستہ روبہ زوال ہوتی گئیں۔ آخر اگلی مٹ گئیں، پھر دوسری آئیں، وہ مٹ گئیں پھر اور آئیں۔ اسی طرح نباتات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ حیوانات نہ تھے۔ پیدا ہوئے بچے تھے۔ جوان ہوئے، پھر بوڑھے ہوئے اور صفحہ ہستی سے معدوم ہو گئے۔

یہی حال انسان کا ہے، ماں کے پیٹ میں بچہ تھا۔ پیدا ہوا، بڑھنے لگا، گھٹنیوں چلنے لگا، طاقت آتی گئی۔ دوڑنے لگا، شباب آیا، بھرپور طاقت ملی۔ قوتیں کامل ہو گئیں۔ عروج پر پہنچا۔ جوانی کی بہاریں ختم ہوئیں۔ زوال کی خزاں آئی، طاقتیں گھٹنے لگیں، قویٰ مضمحل ہو گئے، اعصاب کمزور، اعضاء میں ضعف پیدا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ تمام طاقتیں جواب دینے لگیں، قدم لڑکھڑانے لگے، کمر جھک گئی۔ سننے کی طاقت گھٹ گئی، بصارت جانے لگی۔ زمین پر اترا کے چلنے والا غرور و پندار کے نشے میں بدمست اکڑ کر چلنے والا اپنی جوانی پر ناز کرنے والا، کپڑوں سے گرد و غبار جھاڑ کر صاف ستھرا رہنے والا، قبر کی آغوش میں منوں مٹی

کے نیچے ابدی نیند جا سویا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ہر شی مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

ایک اور شاعر فرماتے ہیں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

دنیا متغیر ہے، ہر شے متغیر ہے، کوئی چیز ایک حال پر برقرار نہیں۔ اس دنیا کا تغیر ورداں بتاتا ہے کہ یہ دنیا حادث ہے۔ یہ جہاں مخلوق ہے، اسی چیز میں تغیر وزوال رونما ہوتا ہے، جو حادث ہو، مخلوق ہو۔ کوئی مقتول بغیر قاتل کے نہیں۔ کوئی مصنوع بغیر صانع کے نہیں۔ کوئی ایجاد بغیر موجد کے نہیں تو کوئی مخلوق بغیر کسی خالق کے کس طرح ہو سکتی ہے؟

کوئی متحرک بغیر محرک کے نہیں۔ کوئی چلنے والا، چلانے والی قوت کے بغیر نہیں۔ دنیا کا کوئی کارخانہ، کوئی مشین، کوئی کارخانہ، کوئی کار، کوئی لاری، کوئی گاڑی، کوئی جہاز بغیر چلانے والی قوت کے متحرک نہیں تو سارے جہان کا اتنا بڑا کارخانہ زمین پر، زمین میں، پانی میں، ہوا میں، آسمانوں میں جو دن رات قدرت کے کارخانے چل رہے ہیں، کیا بغیر چلانے والے چل رہے ہیں؟ ہرگز نہیں! اس عالم کے عظیم کارخانے کو وجود میں لانے والی، اس کو چلانے والی ایک ان دیکھی ہستی ہے، ایک غائبانہ قوت ہے، جو کائنات کا نظام چلا رہی ہے، جسے چہرے کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، دل کی آنکھیں یقین کی قوت سے دیکھتی ہیں۔ سائنس اسے نیچر کے نام سے پکارتی ہے۔ فلسفہ اسے طبیعت کہتا ہے اور اسلام کی آواز ہے، وہ اللہ ہے جو رب العالمین ہے۔

دوسری دلیل

خالق اور مخلوق میں مغایرت ضروری ہے۔ یعنی خالق مخلوق کا غیر ہے، دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ مثلاً زید مخلوق ہے اور اپنا خود خالق ہے۔ یہ محال اور باطل ہے، اس واسطے کہ زید مخلوق ہے یعنی پیدا کیا گیا ہے، پہلے نہ تھا، کسی وقت نہ تھا۔ اب پیدا ہوا، پیدا ہونے سے پہلے معدوم تھا، اس کا وجود نہ تھا، کیونکہ پیدا ہونے سے پہلے وجود ہونا خلاف عقل ہے۔ اگر وجود ہوتا تو پیدا یوں ہوتا۔ پیدا ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پہلے معدوم تھا، موجود نہ تھا۔

اگر اپنا خالق وہ خود ہو تو خالق کے لیے وجود کا ہونا لازمی ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے اس کا وجود ضروری ہے کیونکہ خالق جب خود موجود نہیں، خود صاحب وجود نہیں تو دوسروں کو وجود کس طرح بخش سکتا ہے؟ کیا خود معدوم کسی دوسرے کو پیدا کر سکتا ہے؟ اگر پیدا ہونے سے پہلے اسے موجود تصور کیا جائے تو ثابت ہوا کہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ تو مخلوق کیونکر ہوا؟ وہ تو قدیم ہوا۔ اگر معدوم یعنی غیر موجود تصور کیا جائے تو پھر خالق کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیونکہ جو خود موجود نہیں معدوم ہے، وہ دوسرے کو کیسے پیدا کر سکتا ہے؟

یہی کلیہ، یہی قاعدہ و قانون ہر مخلوق جاندار یا بے جان میں جاری ہو سکتا ہے۔ تو ماننا پڑتا ہے کہ مخلوق اور ہے، خالق اور ہے۔ جملہ مخلوقات اپنے وجود میں محتاجِ غیر ہیں اور جس کی محتاج ہیں، وہ خود بے نیاز ہے۔ اس کا وجود اپنا ذاتی ہے۔ وہ ہے اللہ جو ربّ العالمین ہے۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے:

وَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ آیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

ہر چیز میں اس کے وجود یعنی ہونے کی نشانی موجود ہے جو اپنی زبانِ حال سے پکار کے کہہ رہی ہے، وہ ذات واحد و یکتا ہے۔

شانِ ربّ العٰلمین

ربّ کا معنی ہے ''پرورش کرنے والا'' پروردگار تمام جہانوں، کل کائنات، تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ تربیت کا معنی ہے ''پرورش کرنا۔'' کسی چیز کی پرورش کرنا۔ اس طرح کہ آہستہ آہستہ اس کی ترقی کے اسباب مہیا کرنا اور اس کی بڑھوتری میں رکاوٹ پیدا کرنے والی اشیاء کو دور کرنا اور درجہ بدرجہ اس کی مناسب حدِ کمال تک پہنچانا، جس طرح باغبان زمین میں بیج بوتا ہے۔ وہ کونپل کی صورت میں اگتا ہے، پھر پودا بنتا ہے، باغبان اس پودے کی پرورش کرتا ہے، اسے پانی دیتا ہے، سردی گرمی سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی چیزوں کو دور کرتا ہے جو اس کے نمو اور بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ ساتھ اگنے والی جڑی بوٹیوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ کھاد وغیرہ جو اس کے نمو میں معاون ہو، استعمال کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ نہال، ایک تن آور شجر کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس پر پھل لگتے ہیں، ڈالیاں پھلوں کے وزن سے جھک جاتی ہیں۔ باغبان دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی جب اسے اس کی محنت کا ثمر ملنے لگتا ہے۔

باغبان اس شجر کا یا ایک باغ کا پرورش کرنے والا ہے۔ اسے کہا جا سکتا ہے، مربیٔ بستان، ربُّ البُستان۔

اسی طرح والدین اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ ان کی جسمانی تربیت کرتے ہیں، غذا دیتے ہیں۔ آغاز میں بچہ غذا حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ماں اس کے منہ میں غذا رکھتی ہے، اس کا بدن صاف رکھتی ہے، غسل دیتی ہے، اس کے بدن پر مالش کرتی ہے، آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے، گرمی و سردی سے بچاؤ کا انتظام کرتی ہے، بیماری کی حالت میں اسے دوا دیتی ہے، اسے اکیلا و تنہا نہیں چھوڑتی، اس کی نگرانی کرتی ہے، اسے بہلاتی ہے، لوریاں دے کر سلاتی ہے۔ ہر طرح کا خیال رکھتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس پرورش سے ترقی کر کے حدِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔

باغبان ایک باغ کی پرورش کرتا ہے۔ والدین اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ پرندہ اپنے بچے کے منہ میں دانہ ڈالتا ہے۔ ہر حیوان اپنی اولاد کی حفاظت کرتا ہے۔

آفتاب کا دنیا کی بہت سی چیزوں میں تربیت کا حصہ ہے۔ خصوصاً نباتات میں۔ وہ اپنی حرارت سے پھلوں کو پکاتا ہے اور چاند اپنی ٹھنڈی روشنی میں پھلوں میں چاشنی اور لذت پیدا کرتا ہے۔ آفتاب کی گرمی و یبوست بدنوں میں حرارتِ عزیزی، بلکہ بدنِ عالم میں حرارتِ عزیزی پیدا کرتی ہے۔ گیلی اور تر چیزوں کو خشک کرتی ہے۔

عناصر اربعہ یعنی آگ، پانی، مٹی اور ہوا، ہر جاندار کی زندگی کے بنیادی اجزاء ہیں اور ہر جانور کی زندگی کی بقاء بھی انہی عناصر اربعہ کے اتحاد و یگانگت پر قائم ہے۔ وہ فرشتے جو ان عناصر کی نگہداشت پر مامور کیے ہیں، وہ ان عناصر کے نگران ملائکہ ہیں۔ فلاسفہ کے مذہب میں ان کو ارواح و نفوس کہتے ہیں۔ مذہب اسلام میں انہیں اربابِ انواع کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام مربی مستقل مربی نہیں بلکہ اپنی قوتوں اور اثرات میں وہ غیر کے محتاج ہیں۔ ان کا وجود ان میں قوتیں، ان میں تاثیرات، ان کی اپنی ذاتی نہیں ہیں بلکہ ایک اور طاقت نے یہ امور عطا کیے ہیں۔

علاوہ ازیں ان میں سے کوئی بھی تمام جہان کی پرورش کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی کسی ایک یا چند افراد کی تربیت کرتا ہے۔ کوئی کسی ایک نوع کی یا چند انواع کی، کوئی کسی ایک حصے کی، کوئی کسی ایک قطعے کی، اس بناء پر یہ تمام مربّی لائق حمد وثناء نہیں۔ لائق حمد وثناء وہ ذات ہے، جو ہر شے کی خالق، ہر شے کو وجود بخشنے والی، ہر ایک چیز چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، دیکھنے کی آتی ہو یا انسان کی آنکھیں اس کے دیکھنے سے قاصر و عاجز ہوں، زمین کے اوپر ہو یا زمین کے اندر، ہوا میں ہو یا فضا میں ہو، پانی کے اندر ہو، تالابوں، نہروں یا دریاؤں میں، سمندروں کی تہوں میں، پہاڑوں میں، پہاڑوں کی غاروں، آسمانوں میں، تحت الثریٰ سے عرشِ علیٰ تک، جاندار ہو یا بے جان، ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، ہر ایک کی دیکھ بھال کرنے والی، ہر ایک کی آواز اپنی ذاتی قوت سے سننے

والی، ہر ایک کی حرکت وسکون پر نظر رکھنے والی، ہر ایک کی زندگی کی ضروریات کو جاننے اور ان ضروریات کو پورا کرنے والی، ان کی نشوونما، ان کی بڑھوتری، ان کی جسمانی ترقی کے اسباب مہیا کرنے والی اور رکاوٹوں کو دُور کرنے والی وہ ذات ہے جو ربّ العالمین ہے۔

وہ لائق حمد وستائش ہے، وہی لائق عبادت ہے، اسی واسطے بندوں کو حمد وثناء کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ کہو "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔" کل کائنات، تمام جہانوں، ہر شے میں اس کی ربوبیت کے جلوے آشکار ہیں۔ ربّ العالمین اللہ کی صفت ہے، گویا الحمد کی علت اور سبب ہے کہ حمدِ خدا کیلئے خاص کیوں ہے؟ اس کا یہ جواب ہے کہ وہ ربّ العالمین اور حمد کا مستحق ہے۔

کہا جاتا ہے کہ "اَلْحَمْدُ رَاْسُ الشُّکْرِ" "حمد سب سے بڑا شکر ہے۔" اور انسان پر رب العٰلمین کا شکر واجب ہے، اس کی بیشمار نعمتوں سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہم لاکھ عبادت کریں، لاکھ حمد وثناء کریں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عابد شب وروز عبادتِ خدا میں مشغول رہتا تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں نے عبادت کا حق ادا کر دیا ہے اور اس کی نعمتوں کا شکر عبادت کی صورت میں ادا کر دیا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میں بہشت کی نعمتوں کا مستحق ہو گیا ہوں۔ کیونکہ شکر ادا کرنے سے نعمتیں زیادہ ملتی ہیں۔ اس کے یہ کلما خ اوند کریم کو پسند نہ آئے۔

ایک دن یہی عابد جنگل میں سے گزرا۔ پیاس کا غلبہ ہوا، تلاش سے بھی پانی نہ ملا۔ مایوس ہو کر موت کا انتظار کرنے لگا۔ اس اثناء میں ایک آدمی نے حاضر ہو کر اس شرط پر عابد کو پانی کا پیالہ پیش کیا کہ زندگی کی آدھی عبادت پانی کے پیالے کے عوض بخش دے۔ پانی سے مایوس اور زندگی سے مانوس عابد نے اپنی نصف عبادت بخش دی۔ پانی پیا اور چل پڑا۔ کچھ دیر کے بعد پھر پیاس نے غلبہ کیا۔ پانی نہ ملا۔ ناامید ہو کر بیٹھ گیا کہ اتنے میں ایک آدمی حاضر ہوا اور پانی کا پیالہ بھر کر اس شرط پر پیش کیا کہ باقی آدھی عبادت بھی اس کے عوض دیدے۔ عابد نے یہ خیا' کر کے کہ جان تو بچتی ہے، پھر اور عبادت کر لوں گا، باقی آدھی عبادت بھی دے دی۔

اس کی ساری زندگی کی عبادت دو پیالوں کے بدولت فروخت ہوگئی۔ قدرت کی طرف سے آواز آئی: "او عبادت پر ناز کرنے والے! تو عبادت کا حق کہاں تک ادا کیا اور میری نعمتوں کا شکر کیا؟ تیری ساری زندگی کی عبادت کا مول میرے پانی کے دو پیالے ہیں۔ تو بتا تو نے میرا کتنا پانی ساری زندگی میں استعمال کیا؟ تو نے خود پیا، غسل کیا، کپڑے دھوئے، اس کی قیمت ادا کرنے کیلئے تیار ہو جا!"

جب ہاتف کی آواز عابد و زاہد کے کان میں پڑی تو سجدے میں گر پڑا اور رو کے عرض کرنے لگا: "پروردگار! تیری بخشش و فضل امیدوار ہوں۔ میں تیرا حق نہیں ادا کر سکتا۔ اپنے فضل و کرم سے سرفراز فرما۔"

بہر حال انسان کو اپنے منعمِ حقیقی کا شکر اور اپنے پروردگار کی حمد کا ورد ہر حال میں کرنا چاہیے۔ رنج ہو یا راحت، خوشی ہو یا غمی، دکھ ہو یا سکھ، ہر حال میں وہ سزاوارِ حمد ہے اور یہی خاصانِ خدا کا طریقہ ہے کہ ہر حال میں حمدِ خدا سے زبان کو تر اور دل کو روشن رکھتے ہیں، بلکہ جس قدر ان پر مصیبتیں پڑتی ہیں، وہ زیادہ حمد و ثناء کرتے ہیں۔

جناب امام حسین علیہ السلام سے زیادہ مصیبتیں کس پر آئیں؟ ہر دکھ اور رنج کی گھڑی میں حمد و ثناء، تسبیح و تقدیس اور صبر و شکر کے کلمات ادا کیے۔

مدینہ سے سفر کی تیاری

مدینۃ المعاجز میں جناب جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ: "جب امامِ مظلومؑ نے مدینہ سے مسافرت کا قصد کیا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: آپؑ فرزندِ رسولؐ ہیں اور ان کے دو نواسوں میں سے ایک آپؑ ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ آپؑ بھی یزید کے ساتھ مصالحت کر لیں، جس طرح آپؑ کے بھائی امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ مصالحت کر لی تھی۔ تو امامِ مظلومؑ نے فرمایا: اے جابر! میرے بھائی جنابِ حسن علیہ السلام نے جو کچھ کیا، حکمِ خدا اور حکمِ رسولؐ کے مطابق کیا اور میں بھی وہی کروں گا جیسا کہ حکمِ خدا اور حکمِ رسولؐ ہوگا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ اس امر میں جنابِ رسول اللہؐ، امیر المومنینؑ اور حسنؑ مجتبیٰ کی گواہی ابھی تیرے سامنے پیش کروں؟

اس کے بعد فرزندِ مصطفیٰؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان کا دروازہ کھل گیا ہے اور جنابِ رسول اللہؐ، حضرت علی اور امام حسن علیہم السلام، حضرت حمزہ اور جنابِ جعفر طیار علیہم السلام آسمان سے نازل ہوئے اور زمین مدینہ پر قرار پکڑا۔ میں گھبرا گیا اور مرعوب ہو کے رہ گیا۔ لیکن یہ سارا منظر آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا:

اے جابر! میں نے حسنؑ کا معاملہ حسینؑ سے پہلے بتا نہ دیا تھا؟ تاکہ تو ان کے معاملات کو تسلیم کرے اور ان کے کسی فعل پر اعتراض نہ کرے۔

اے جابر! کیا تو معاویہ اور اس کے بیٹے یزید کا ٹھکانہ اور میرے بیٹے حسینؑ کا مقام دیکھنا چاہتا ہے؟ جابر کہتا ہے میں

نے کہاہاں! ہاں یارسولؐ اللہ۔

جنابِ رسولؐ اللہ نے زمین پر پاؤں مارا۔ زمین پھٹ گئی اور ایک دریا ظاہر ہوا۔ وہ دریا پھٹ گیا اور ایک زمین نکلی۔ پھر وہ زمین پھٹ گئی اور ایک دریا ظاہر ہوا۔ وہ دریا پھٹ گیا اور ایک زمین نکلی۔ پھر وہ زمین پھٹ گئی اور اس سے دریا نکلا۔ اس طرح سات مرتبہ ہوا۔ یعنی سات مرتبہ زمین ظاہر ہوئی اور سات مرتبہ دریا ظاہر ہوا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ان سات دریاؤں اور سات زمینوں کے نیچے بہت بڑی آگ دہک رہی ہے اور اس آگ میں ولید بن مغیرہ، ابوجہل، معاویہ اور یزید ایک ساتھ زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ سرکش شیاطین ہم عذاب ہیں اور جہنم والوں میں سب سے زیادہ عذاب ان پر ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: اے جابر! اپنا سر اٹھا، اوپر نگاہ کر!

جابر کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں اور جنت کا نظارہ سامنے ہے۔ جنت کا باغ اور نعتیں سامنے دکھائی دے رہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت آسمان پر چلے گئے۔ جب ہوا میں بلند ہوئے تو پکار کر فرمایا: بیٹا حسینؑ! آ ہمارے ساتھ مل جا۔ پس جناب حسین علیہ السلام بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ پس وہ سارے اوپر چلے گئے اور جنت میں داخل ہوئے۔

جابر کہتے ہیں: ابھی میں دیکھ رہا تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز آئی، انہوں نے امام حسین علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور فرماتے تھے: جابر! یہ میرا بیٹا حسینؑ ہے جو اس جگہ میرے ساتھ ہے۔ پس اس کا امر تسلیم کر لے اور شک نہ کر تاکہ تیرا ایمان مضبوط ہو جائے۔

جابر کہتے ہیں: اگر میں غلط کہوں تو میری دونوں آنکھیں اندھی ہو جائیں۔

وطن سے کسے محبت نہیں؟ اپنے گھروں اور شہر سے کون مانوس نہیں؟ پرندے بھی اپنے آشیانے چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ کس مجبوری سے فرزندِ رسولؐ مدینہ چھوڑنے پر آمادہ ہوئے؟ مسجد نبوی سے جدا ہونا کب گوارا تھا؟ وہ گھر جس میں ملائکہ کا نزول ہوتا تھا، جبرئیل بچوں کو بہلایا کرتے تھے، لوریاں دے کر جھولا جھلایا کرتے تھے، جہاں پنجتن پاک علیہم السلام کی پاک محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ آج ان کے صحن برباد ہو رہے ہیں، دروازے بند ہو رہے ہیں، محلہ بنی ہاشم میں کہرام بپا ہے، فضاء اداس ہے، درودیوار پر حسرت ٹپکتی ہے، بتولؑ کا لعل سفر کی تیاری کر رہا ہے"۔

بحارالانوار میں کامل زیارت کے حوالے سے مرقوم ہے: "جب حسین علیہ السلام نے مدینہ سے سفر کا ارادہ کیا تو

خاندانِ بنی عبدالمطلب کی تمام مستورات نوحہ وزاری کیلئے ایک جگہ اکٹھی ہو گئیں۔ ان کے جگر خراش بینوں اور دلگداز فریادوں سے زمین لرزتی، قبرِ رسول کانپتی اور فضاء سوگوار نظر آتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر جناب حسین علیہ السلام مستورات میں تشریف لے گئے۔ ان کو صبر وتحمل کی تلقین کی۔

جناب امام علیہ السلام کے گرد بنی ہاشم کی مستورات کا گھیرا تھا۔ رونے کی صدا زیادہ بلند ہوئی، سوگوار بیبیوں نے آہ و زاری کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوحہ و بکاء کس کے لیے باقی رکھیں؟ کیا آپؑ کے بعد ہمارا کوئی سہارا رہ گیا ہے؟ آپؑ کی مدینہ سے رحلت کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ دن غم و ماتم میں وفاتِ رسولؐ کے دن سے کم نہیں۔ آج ایسا ہی غم کا دن ہے، جس دن علیؑ کا جنازہ اٹھا تھا۔ صدمہ میں آج کا دن یومِ وفاتِ بتولؑ کے برابر ہے۔ حسن مسمومؑ کے تیر بھرے جنازے کے اٹھنے سے یہ دن کم نہیں۔ ان دنوں میں تو صرف ایک معصوم رخصت ہوا تھا۔ آج مردوں عورتوں سے پورا محلّہ خالی ہو رہا ہے"۔

اب آج سے بے وارث و والی ہے مدینہ
اور پنجتنؑ پاک سے خالی ہے مدینہ

اُمّ ہانی جناب امام حسین علیہ السلام کی پھوپھی ہیں۔ ضعیفی کی وجہ سے بصارت کمزور تھیں۔ گھر میں بیٹھی تھیں کہ یہی عبدالمطلبؑ کی بیٹیاں روتی ہوئی جناب اُمّ ہانی کے پاس آئیں اور کہا: "اُمّ ہانی! آپ آرام سے بیٹھی ہیں! پنجتنؑ پاک کی آخری یادِ اہل وعیال سمیت گھر تنہا چھوڑ رہا ہے۔ دالان اجاڑ ہو رہے ہیں، صحن خالی ہو رہے ہیں"۔

جنابِ اُمّ ہانی یہ خبر سن کر تڑپ اٹھیں۔ ضعیفی کی وجہ سے عصا کا سہارا لیا۔ اٹھتی بیٹھتی مولاؑ کے پاس آئیں۔ امامِ مظلوم علیہ السلام کی نظر پڑی، کہا: "پھوپھی! آپ کس طرح تکلیف کر کے اس حالت میں آئیں؟" رو کر کہا: "کیوں نہ آتی؟ میں نے سنا ہے کہ بیواؤں کا سہارا، یتیموں کا والی، پنجتنؑ پاک کی آخری نشانی، قبرِ رسول کا مجاور بے بس مدینہ چھوڑ رہا ہے"۔

اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بھائی علیؑ کی یادگار کو گلے لگایا اور اپنے والد حضرت ابو طالب علیہ السلام کے یہ شعر پڑھے:

وَ اَبیضُ یُستَقَی الغَمَامُ بِوَجهِہ
ثِمَالُ الیَتَامیٰ عِصمَۃٌ لِلاَرامِلِ
تَطُوفُ بِہِ الھُلاکُ مِنْ آلِ ھَاشِمٍ
فَھُمْ عِندَہٗ فِیْ نِعْمَۃٍ وَ فَوَاضِلِ

اس کے بعد جناب اُمّ ہانی نے کہا: "بیٹا! مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر سلامتی کا سفر نہیں۔"

مولاؑ نے کہا: "پھوپھی جان! جو امر مقدر بن چکا ہے، وہ ہونے والا ہے۔" اس کے بعد جناب اُمّ ہانی آہ و بکاء کرتے ہوئے روانہ ہوئیں۔ روتی بھی جاتی تھیں، اور یہ شعر بھی پڑھتی جاتی تھیں:

وَمَا اُمّ ھانی وحدھا ساء ھا لُھا
خُرُوجُ حُسَینٍ عَن مدینۃ جدّہٖ
ولٰکنَّمَا القَبر الشَّرِیف و من بہٖ
و منبرہٗ یکُونَ منُ اھلِ فَقدہٖ

اے ام حانی! حسینؑ کے مدینے سے چلے جانے سے صرف تو ہی بے حال نہیں ہوئی، قبر پاک اور صاحب قبر، محراب و منبر حسینؑ کی جدائی سے رو رہے ہیں۔

امّ سلمۃؓ

جنابِ امّ سلمۃؓ کو امام حسین علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ازواجِ رسولؐ پاک میں سب سے زیادہ انس امامِ مظلومؑ سے آپ کو تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اکثر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حسینؑ سے مختلف انداز میں قولی اور عملی طور پر محبت کرتے ہوئے دیکھتیں اور قربت خدا اور قربت رسولؐ، فلاحِ دارین، سنتِ رسولؐ سمجھتیں، علاوہ ازیں جنابِ امام علیہ السلام کی پرورش میں بھی جنابِ امّ سلمہ کا کافی حصہ تھا۔

سیرت و تاریخ کی کتابوں میں باتفاق درج ہے فَکَفَلَتْهُ اُمُّ سَلَمَه "پس امّ سلمہ ان کی کفیل ہوئیں۔" یعنی پرورش کی۔ چنانچہ امام علیہ السلام کی شہادت کی زیادہ تر پیش گوئیاں امّ سلمۃؓ کی زبان سے مروی ہیں۔

جس طرح خداوند عالم نے اپنے پیارے رسولؐ کو ان کی شہادت سے پہلے آگاہ فرمایا تھا، اسی طرح جنابِ رسالت مآب نے جنابِ امّ سلمہ کی محبت والفت ملاحظہ فرما کر ان کو بھی ان کی شہادت سے آگاہ کر دیا تھا اور جس طرح جناب سیدۃؑ کو شہادت کی خبر دی تھی، اسی طرح اُمّ سلمہ کو بھی اطلاع کر دی۔

جنابِ سیدۃؑ ضرورت کے وقت اپنے اس پارۂ جگر کو اپنی مادرِ مہربان سے لے آتی تھیں اور جب تک جی چاہتا اپنے پاس رکھ کر پھر ان کی خدمت میں پہنچا آتی تھیں۔

تاریخ کی کتابوں میں جناب ام سلمہ کے وہ اشعار اور لوریاں مرقوم ہیں، جو امام حسین علیہ السلام کو سلانے یا خوش کرنے کی غرض سے ارشاد فرمایا کرتی تھیں۔ اس پیار و محبت کا پالا جب آمادۂ سفر ہوا تو امّ سلمہ سن کر بے قرار ہو گئیں۔ تاب ضبط نہ رہی۔ موت کی طرف جانا کیونکر گوارا کرتیں؟

عوالم میں مذکور ہے کہ جب فرزندِ رسولؐ کی تیاری ہوئی تو جناب اُمّ المومنین اُمّ سلمہ پریشان حال عصا کا سہارا لئے امام علیہ السلام کے پاس آئیں اور کہا:

"بیٹا! میں نے سنا ہے کہ آپؑ عراق جا رہے ہیں۔ آپؑ مجھے غمگین نہ کریں کیونکہ میں نے آپؑ کے جدِامجدؐ سے سنا ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ عراق کی زمین میں قتل کیا جائے گا جسے کربلا کہا جاتا ہے۔

کہا: "نانی اماں! میں جانتا ہوں، میرے نانا نے صحیح فرمایا ہے۔ بیشک میں عراق کی زمین کربلا میں قتل کیا جاؤں گا۔ نانی اماں! میں وہ مقام جانتا ہوں جہاں میرا خون بہایا جائے گا۔ وہ دن بھی جانتا ہوں جس دن میرا سر میرے بدن سے جدا کیا جائے گا۔ نانی اماں! میں اپنے قاتل کو بھی پہچانتا ہوں جو میرے بچوں کو یتیم کرے گا اور میری بہنوں کو جنگلوں میں بے سہارا کر دے گا۔ نانی! اگر آپ چاہتی ہیں تو وہ جگہ، اپنی دائمی خوابگاہ آپ کو دکھا دوں؟"

فرمایا: "میری انگلیوں کے درمیان سے دیکھیں"۔

جنابِ اُمّ سلمہ کیا دیکھتی ہیں، یکایک سرزمین کربلا پست ہو گئی۔ شہادت گاہ، مقامِ لشکر، امام کی تنہائی اور بیکسی کا مقام اور مدفن نظر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر جنابِ اُمّ سلمہ کو تاب نہ رہی۔ عصا ہاتھ سے چھوٹ گیا، زمین پر گر پڑیں۔ پھر گلے لگا کر خوب روئیں اور فرمایا: "اچھا بیٹا! سپردِ خدا۔"

کہا: "اماں! مشیت خدا یہی ہے۔ وہ مجھے صحراء میں مقتول و مذبوح دیکھنا چاہتا ہے اور میرے اہل حرم کو بازاروں اور درباروں میں اسیر۔ تقدیر یہ چاہتی ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت ظلم و جور سے شہید کر دیا جاؤں۔ میری بہنوں، بچیوں اور عورتوں کے ہاتھوں میں رسیاں باندھ دی جائیں۔ میرے بچے، یتیم، دربدر اسیر بنا کر پھرائے جائیں۔ وہ فریاد کریں لیکن کوئی فریادرس نہ پائیں۔ وہ مدد مانگیں لیکن کوئی مددگار نہ ملے۔ سہارا ڈھونڈیں لیکن کوئی مونس و غمگسار نظر نہ آئے۔"

جنابِ ام سلمہ نے کہا: "بیٹا! تیرے نانا نے یہ مٹی مجھے دی ہے، جسے میں نے ایک شیشی میں محفوظ رکھا ہے۔"

پس جنابِ امام علیہ السلام نے بھی جنابِ ام سلمہ کو ایک مٹی شیشی میں بند کر کے دی اور کہا کہ: "اس کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیں، پس جب دیکھیں کہ یہ مٹی شیشی میں سرخ ہو گئی ہے تو سمجھنا کہ قمرِ بنی ہاشم کا چراغ بجھ گیا ہے، مجاور مارا گیا ہے، زہراءؑ کی

گود کا پالا آخر کربلا میں شہید ہو گیا، باغِ بتولؑ برباد ہو گیا۔ میری واپسی کی امید ختم ہو گئی اور یہ صحن، یہ گھر، یہ دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے"۔

جنابِ امِّ سلمہ بعد از رخصت حسین علیہ السلام بیقرار رہیں۔ اپنے پیارے نواسے کی جدائی سے ہمیشہ مغموم و پریشان رہیں۔ روزانہ ان شیشیوں کو دیکھ کر غمگین دل کو تسلی دیتیں کہ ابھی میرا بیٹا زندہ ہے۔ معلوم نہیں کس حال میں ہے؟ زہراؑ کی بیٹیاں کہاں ہیں؟ اور کس حال میں پردیس میں ہیں؟

دن گزرتے گئے، آخر محرم کا چاند نمودار ہوا۔ جنابِ امِّ سلمہ کا اضطراب بڑھا۔ پہلی گزری، دوسری بھی گزر گئی، یہاں تک کہ نہم محرم بھی گزر گئی۔ دسویں کا دن آیا۔ زوجۂ رسولؐ کو چین نہ آیا۔ دن چڑھتا گیا، پریشانی بڑھتی گئی۔ رہتی مدینہ میں تھیں، خیال عراق کی زمین کربلا کی طرف۔ آخر دسویں کا دن ڈھل گیا۔ امِّ سلمہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ جب جنابِ امِّ سلمہ سو گئیں تو حالتِ خواب میں دیکھا کہ سرکارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حالت بدلی ہوئی ہے۔ کپڑوں پر گرد و غبار ہے۔ آقائے کونین کی زلفیں کھلی ہوئی ہیں۔ غالباً سر برہنہ ہیں، سر پر عمامہ نہیں۔ کیونکہ عربی کے الفاظ:

"بَاکِیًا وَ بِرَاسِہٖ وَ الْحَیَتِہٖ التُّرَاب".

"رسولِ پاک کو روتے ہوئے دیکھا اور سر اور ریش پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔"

اگر عمامہ ہوتا تو عمامہ غبار آلود ہوتا اور سر محفوظ رہتا۔ لیکن سر کا غبار آلود ہونا بتاتا ہے کہ فخرِ انبیاءؐ سر برہنہ تھے۔ سر اور داڑھی کے بال مٹی سے اٹے پڑے تھے اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ امِّ سلمہ نے جب اس حالت میں تاجدارِ مدینہ کو دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔ جس گھڑی نے بے چین کر رکھا تھا، قریب نظر آئی۔ گھبرا کر پوچھا:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ آپ کی زلفوں پر یہ گرد و غبار کیسا ہے؟ مولا آپ کی ریش مبارک مٹی سے کیوں بھر گئی ہے؟ آقائے نامدار! آپ زار و قطار کیوں رو رہے ہیں؟ آپ کا رُخِ انور کیوں مرجھایا ہوا ہے؟ میں آپ کو اس حالت میں کبھی نہ دیکھوں! آپؐ کی اس ماتمی حالت نے مجھے محزون کر دیا ہے"۔

جب رسولِ اکرمؐ نے گلوگیر لہجے میں، دھڑکتے ہوئے دل، بہتے ہوئے آنسوؤں روتی ہوئی آنکھوں اور لرزتی ہوئی زبان سے فرمایا:

"امِّ سلمہ! میرا حسینؑ! آہ! میرا لختِ جگر! آہ میرے دل کا ثمر! میری آنکھوں کی ٹھنڈک! میری گود کا پالا کربلا کی گرم ریت پر بھوکا پیاسا مارا گیا! میرے خاندان کے اٹھارہ جوان اس کے ساتھ ظلم و ستم کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔ وہ نصرت طلب

کرتے رہے، فریاد کرتے رہے لیکن میری اُمت نے بیدردی سے شہید کر ڈالا۔ دیکھ اس شیشی میں بہتر (۷۲) کا لہو ہے، جو ہر شہید کی لاش سے اکٹھا کر کے لایا ہوں۔"

پس جناب امّ سلمہ گھبراتی تھرتھراتی ہوئی اٹھیں۔ بے تابانہ گھر میں داخل ہوئیں۔ شیشیوں کو اٹھا کر دیکھا تو مٹی کی بجائے خون جوش مار رہا ہے۔ بے خودی کے عالم میں فریاد کی "واحسینا!" "ہائے میرے مظلوم بیٹے!" کی صدا بلند کی۔ منہ پہ ماتم کیا۔

اُمّ سلمہؑ بیان فرماتی ہیں کہ اب مجھ میں تاب ضبط نہ رہی۔ میری زبان پر نوحہ تھا، بدن کانپ رہا تھا، آنکھیں لگا تار آنسو بہا رہی تھیں۔ میرے نوح و بکاء کی آواز سن کر محلّہ بنی ہاشم میں تلاطم بپا ہو گیا۔ ہاشمی خاندان کی عورتیں بے قراری کے عالم میں میرے گھر میں جمع ہو گئیں۔ پوچھا: "اُمّ سلمہ کیا ہے؟"

میں نے کہا: "سر پیٹ لو! سر کے بال کھول دو! حسینؑ بن علیؑ اپنے ساتھیوں سمیت مارے گئے۔ فرزندِ رسولؐ ذبح کر دیئے گئے۔ بتولؑ کی بیٹیاں فریاد کرتی رہیں۔ حسینؑ هَلْ مِنْ نَاصِرٍ کی صدا دیتے رہے مگر امت بے رحم نے گلشن زہراؑ تاراج کر دیا۔ لوگو! ابھی ابھی رسولؐ پاک آ کر مجھے بتا گئے ہیں۔

دیکھو اس شیشی میں مٹی نہیں، خون کھول رہا ہے۔ حسینؑ شہید کر دیئے گئے۔ مدینہ برباد ہو گیا۔ محلّہ بنی ہاشم ویران ہو گیا۔ لوگو! دیکھو یہ حسینؑ کے گھر اجڑ گئے۔ اب کون آئے گا، کون ان گھروں میں آباد ہو گا؟

عزادارو! جناب امّ سلمہ اور امّ البنین، اُمّ ہانی، خواہر علیؑ، امّ لقمان بنت عقیلؑ اور دوسری خاندان بنی ہاشم اور مدینہ کی عورتیں جمع ہو کر اس قدر روئیں کہ جناب رسولؐ خدا کی وفات کا دن اور حسینؑ کے مدینہ چھوڑنے کے دن کا ماتم تازہ ہو گیا۔

مدینہ میں کہرام تھا، تمام عورتیں نوحہ و ماتم کرتی ہوئی قبر رسولؐ کی طرف روانہ ہوئیں۔ گریبان چاک تھے، سروں کے بال کھلے تھے۔ قبر رسولؐ پر جا کر بلند آواز سے کہا:

"یا رسولؐ اللہ! تیرے دوش کا سوار مارا گیا، تیری آغوش کا پالا مارا گیا، جس کے گلے کا بوسہ لیتے لیتے تھکتے نہ تھے، اس پر خنجر چل گیا"۔

ایسا معلوم ہوتا تھا قبر کانپ رہی ہے، زمین تھرتھرا رہی ہے، فضائے مدینہ سوگوار ہے، ہاشمی عورتوں کے نوحہ و بین سے کلیجے پھٹ رہے ہیں۔

سامانِ سفر

اب ہم اس سامان سفر کا ذکر کرتے ہیں جو فرزند رسولؐ، شاہ و شہنشاہِ حجاز، شاہِ دنیا و آخرت نے اپنے ساتھ لیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا، اپنا پورا کنبہ اور بنی ہاشم کا اکثر خاندان ہمراہ تھا۔ ہر قسم کی ضروریات زندگی اور اسباب معیشت ساتھ لئے تا کہ راستے میں کسی منزل و مقام پر غیروں کی احتیاج نہ رہے۔

گو آپؑ کی زندگی سادہ تھی، لیکن مفلس و غریب نہ تھے۔ امیروں کے امیر اور شاہوں کے شاہ تھے۔ ان کی خیرات کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہتیں۔ درہم و دینار کی تقسیم کے علاوہ غلے، کپڑے اور مویشی ریوڑوں کی صورت میں سائلین کو دیئے جاتے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کی امیری تو مشہور رہی ہے۔ آپؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بھائی تھے اور دونوں ہی امیر تھے۔ آخر اس قدر خیرات، اتنی سخاوت اور اتنی بخشش اپنے ذاتی مال سے ہی کرتے تھے۔ غیروں کے اموال سے تو خیرات نہیں کی جاتی۔ بے شک بہت بڑے امیر تھے اور اتنا بڑا امیر جب ایک طولانی سفر اختیار کر کرے تو کیا کچھ ساتھ نہ لیا ہوگا؟ میرے مولاؑ نے بہت سامان ساتھ لیا تھا۔ ہم سنتے ہیں کہ مولا کا کمر بند اتنا قیمتی تھا کہ جس کے حصول کے لیے جمال ملعون نے لختِ دلِ بتولؑ کے بازو قلم کیے جن کا کمر بند اتنا قیمتی ہو، باقی سامان ان کا کس قدر عالی شان اور کثیر ہوگا؟

صاحب معالی السبطین عالم و واعظ شیخ محمد مہدی مازندرانی لکھتے ہیں کہ میں نے بعض کتب میں دیکھا ہے کہ جب حضرت امام حسن علیہ السلام نے مدینے سے کوچ کا ارادہ کیا تو ان کے پاس ان کی اولاد، ازواج، بھائی، بہنیں، ان کے قریبی عزیز، ان کے بھتیجے، بھتیجیاں، غلام، کنیزیں اور خاندانِ بنی ہاشم کے بہت سے افراد اکٹھے ہوئے جن کی تعداد تمام زن و مرد، صغیر و کبیر ملا کر ایک سو سے زیادہ بنتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مولاؑ کے ساتھ مدینے سے مکہ اور مکہ سے عراق گئے۔

جب تیاری کا وقت آیا تو مولاؑ نے حکم دیا کہ کثیر تعداد میں گھوڑے زینوں سمیت حاضر کیے جائیں اور اسی طرح کثیر تعداد میں اونٹنیاں بھی۔ جب یہ پیش کیے گئے تو فرمایا کہ ستر ناقے مخصوص کیے جائیں۔ خیموں کا سامان اٹھانے کے لیے بہت سی اونٹنیوں پر خیمے لادے گئے اور کئی اونٹوں پر کھانے پکانے کے چھوٹے بڑے برتن اور خوراک کا سامان وغیرہ اور کئی اونٹ مخصوص کیے گئے تھے پانی بھری ہوئی مشکوں کے لیے۔ کیونکہ عرب و عراق کی زمین کا بہت بڑا حصہ بے آب و گیاہ ہے۔ سینکڑوں میلوں

میں پانی کا نشان نہیں ملتا۔

امامِ مظلومؑ کے ساتھ کافی تعداد مستورات و اطفال کی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ لعلِ زہراؑ نے پانی کا سامان مکمل کر رکھا تھا۔ کئی اونٹوں پر اخراجات کے لیے درہم و دینار، زیورات، پارچات، پوشاکیں، یمنی چادریں، خوشبوئیں اور عام کپڑے لادے گئے۔

تبرکاتِ پیغمبرؐ

بہت سی اونٹنیاں، بنی ہاشم کی مستوارت، خورد سال بچوں اور ان کی کنیزوں کے لیے مخصوص تھیں۔ باقی اونٹوں پر دوسر عام سامان جس کی سفر میں عموماً ضرورت ہوتی ہے، علاوہ مذکورہ سامان کے رکھا گا تھا۔

جب یہ اشیاء جمع ہو گئیں تو اپنے لیے ایک خاص گھوڑا پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس گھوڑے کا نام مرتجز تھا۔ جنابِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص سواری تھی اور حضورؐ پاک کا پیارا رہوار تھا۔ وہ جنابِ امام حسین علیہ السلام کو نانا کی طرف سے عطا ہوا۔ یہی وہ گھوڑا تھا جس پر روزِ عاشور سوار ہو کر میدانِ کارزار کی میں نکلے تھے۔ صفین کی لڑائی میں امیر المومنین علیہ السلام اس پر سوار ہو کر مشغولِ جہاد ہوئے اور کربلا میں اس پر فرزندِ رسولؐ سوار ہو کر فوجِ اشقیاء کے سامنے آئے۔

اس کے بعد جدِ امجد کی تلوار منگوائی اور گلے میں حمائل کی۔ اس تلوار کا نام بتار تھا اور رسوب اور غضب بھی کہا جاتا تھا۔ اس تلوار پر یہ شعر نقش تھا:

فِی الْجُبْنِ عَارٌ وَ فِی الْاِقْدَامِ مَکْرُمَۃٌ
وَالْمَرْءُ بِالْجُبْنِ لَا یَنْجُوْمِنَ الْقَدْرِ

بزدلی میں عار ہے اور قدم بڑھانے میں قدر و عزت ہے اور بزدلی کی وجہ سے آدمی قضا و قدر سے بچ نہیں سکتا۔

جنگِ صفین میں یہ امیر المومنین علیہ السلام کے پاس رہی اور کربلا میں فرزندِ رسولؐ نے اس کے ساتھ لاثانی جہاد کیا کہ بارہ میل تک میدانِ قتال سپاہِ اشقیاء سے خالی ہو گیا۔

پھر جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زرہ لانے کا حکم فرمایا۔ جسے سعدیہ، ذات الفضول اور ذات الوشاح کہا جاتا ہے جو مولائے مظلومؑ کو جدِّ امجد سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہی زرہ پہن کر امام علیہ السلام روزِ عاشور فوجِ اشقیاء کے پاس آئے اور ان لوگوں کو نصیحت کی اور فرمایا کہ میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا یہ وہ زرہ نہیں ہے جو میرے نانا رسولؐ پہنا

کرتے تھے؟ ان لوگوں نے کہا: "ہاں! بیشک!"

اس کے بعد تبرکات میں سے جناب رسولؐ پاک کا عمامہ طلب فرمایا، جس کا نام سحاب تھا۔ یہ عمامہ حضورؐ پاک بدر و حنین کے معرکوں میں سر پر باندھے ہوئے تھے۔ ورثہ امامت و خلافت میں مولائے مظلومؑ کو ملا۔

آخر میں وہ خاص حربہ (بھالہ) جو عکاز (ایک قسم کا عصا) کے مشابہ تھا، اپنے ساتھ لیا۔ اس حربے کا نام عنزہ تھا۔ عموماً اس بھالے کو رسولؐ پاک اپنے ساتھ رکھتے۔ عید کے روز اور سفر میں نماز کے وقت اپنے سامنے گاڑ دیا کرتے۔

امامؑ بھی روز عاشورا اسی حربے کو گاڑ کر اس پر تکیہ کرتے۔ لڑتے لڑتے اس کے پاس آ کر سہارا لیتے اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ پڑھتے۔

حضراتِ مومنین! اس ساز و سامان کے ساتھ اور ان تبرکات کے ساتھ شاہِ حجاز مدینہ سے نکلے۔ کتنا بڑا سامان، کتنے بڑے تبرکات، قربان جائیں ہماری لاکھ جانیں رسولؐ زادیوں کی غربت و بیکسی پر! کہ روزِ عاشور بعد عصر یہی سامان امت رسولؐ لوٹ رہی ہے اور نبی زادیاں حسرت سے دیکھ رہی ہیں۔

وہ خیمے جو ستر اونٹوں کا بار تھے، جل رہے ہیں اور بتولؑ کی بیٹیاں نامحرموں سے چھپنے کیلئے کوئی جگہ تلاش کر رہی ہیں۔ خیمے اور قناتیں جل رہی ہیں اور بنو ہاشم کی بچیاں اور بچے ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ مائیں کہیں ہیں اور بچے کہیں! بچوں کے ہاتھوں سے ماؤں کے دامن چھوٹ گئے۔ بیبیاں بے تحاشا جنگل کی طرف نکلیں اور بچے بیقرار ہو کر کہیں بھاگے۔ بچوں کو ماؤں کی خبر نہیں اور ماؤں کو بیٹوں کی سنبھال نہیں۔

امت رسولؐ، متاعِ بتولؑ بے دریغ لوٹ رہی ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس قدر یمنی چادریں ہمراہ تھیں جو کئی اونٹوں پر لدی ہوئی تھیں، مگر وقتِ عصر زہراؑ جائیوں کے سر عریاں اور بال ننگے تھے۔ سر چھپانے کیلئے کوئی چادر نہ مل سکی۔

جس طرح کسی کو موقع ملا، مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹا، اولادِ رسولؐ کو لوٹا، بناتِ بتولؑ کو لوٹا، نساءِ بنی ہاشم کو لوٹا۔ شب عاشور تک تو سید زادیوں کے وارث و اقربا بھی موجود تھے اور تبرکات و پوشاکیں بھی موجود تھیں۔ لیکن عصر عاشور کے بعد نہ وارث رہے، نہ اقربا رہے، نہ گھر والے رہے، نہ گھر رہے۔

اے آسمان! تو کیوں نہ گر پڑا؟ اولادِ رسولؐ پیاسی کٹتی رہی، متاعِ بتولؑ بے تحاشا لٹتا رہا اور تو دیکھتا رہا؟

مسلمانو! چادریں، پوشاکیں اور دوسرا سامان تو بے وارث سمجھ کر لوٹ لیا تھا، آخر ذریت رسولؐ تھیں، شریف خاندان کی مستورات تھیں، صاحب عصمت و پردہ دار بیبیاں تھیں، کانوں سے زیورات تو نہ اتارتے، بیکس و بے بس، بے وارث جان کر

ظلم و جور کے ساتھ زیور تو نہ اتارتے !، اے زمینِ کربلا! تو کس طرح یہ منظر دیکھتی رہی؟ کہ آگ کے شعلے نکل رہی ہیں، اولادِ رسولؐ کے گھر راکھ بن رہے ہیں:

زہراؑ کی بیٹیاں جو کھلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام سے باہر نکل پڑیں

ادھر خیمے لوٹے، جلائے، اہل حرم کو ستایا، نبی زادیوں کو لوٹا، ادھر فرزندِ رسولؐ کو لوٹا، فرزندِ رسولؐ کی لاش کو لوٹا، کسی نے زرہ اُتاری، کسی نے پیرہن اتارا، کسی نے عمامہ لیا، کسی نے انگوٹھی اتاری، تبرکاتِ رسولؐ لوٹے، مواریثِ علیؑ و بتولؑ لوٹے، بجائے اس کے کہ بدنِ پاک سے تیروں کی نوکیں نکالتے، بدن میں چبھے ہوئے سنگریزے نکالتے، لاش پر لوٹ مچادی اور لباس تک اُتار لیا۔

ظالم جمال نے کمر بند کی خاطر رسولؐ و بتولؑ کو بیقرار کر دیا۔ لاشِ پاک کی وہ بے ادبی کی کہ زمین کانپی، آسمان لرزا، رسولؐ روئے، علیؑ نے ماتم کیا، بتولؑ نے فریاد کی، امامِ حسن علیہ السلام نے دہائی دی، اس ملعون نے پہلے دایاں ہاتھ کاٹا، پھر بایاں ہاتھ کاٹا۔ عباسؑ کی زندگی میں دونوں شانے، تیری موت کے بعد تیرے ہاتھ کٹے۔ بتولؑ کی بیٹی بھرا گھر ساتھ لے کر کربلا آئیں۔ اب بھائی، بھتیجے، بھرا گھر لٹا کر شام کو چلیں۔

فریاد از غریبی و بے یاریٔ حسینؑ
وز نالہ ہائے دم بہ دم و زاریٔ حسینؑ

مسافرینِ کربلا

اب ذیل میں اس مقدس قافلے کے مسافرین کی فہرست درج کرتے ہیں جو مدینہ سے امامِ وقت، خلیفہ رسولؐ، مرکزِ شریعت جناب امام حسین ابن علی علیہم السلام کی معیت میں حفاظتِ دین اور نصرتِ حق کیلئے عازمِ عراق ہوئے۔

یہ نفوسِ قدسیہ ایک خاص مقصد کے تحت اور خاص نصب العین کی خاطر وطن کی محبوب سرزمین، پاک پیغمبرؐ کے پیارے اور پاک روضے، جناب فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی ضریحِ اقدس اور جناب حسنِ مجتبیٰؑ کی قبرِ مطہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

گھروں کا مانوس صحن، مجبوب دیواریں، مالوف آب و ہوا، کو محض حق کی سربلندی کے لیے خیر باد کہا۔ اسلام کی حفاظت اور حریت کی شمع فروزاں رکھنے کے لیے دیس کی راحت کو چھوڑ کر پردیس کا رنج قبول کیا۔

ان کے سفر کا مقصد ملک گیری نہ تھا اور نہ مالِ غنیمت بلکہ شہادت مطلوب اور شریعت مقصود تھی۔ جب کسی کام کا مقصد

نیک غرض بلند اور نصب العین اعلیٰ وارفع ہو تو اس کے حصول میں جس قدر مشکلات پیش آئیں، ایک مستقل مزاج اور پختہ ارادے والا انسان مشکلوں کو حل اور رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور ہمت اور کوشش سے، کتنی ہی دور منزل ہو پالیتا ہے۔ ایسے مقدس مقصد اور بلند نصب العین کی خاطر سختیوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کو ہنسی خوشی قبول کر لیتا ہے۔

مسافرین مدینہ کے سامنے جو نصب العین تھا، اس سے بڑھ کر کوئی نصب العین مقدس، اعلیٰ، پیار اور خوشنودئ پروردگار کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ وہ نصب العین تھا حرمتِ انسان، حفاظتِ دین وشریعت، نصرتِ حق اور باطل کا مقابلہ، ظلم وتشدد کے خلاف جہاد، طاغوتی طاقتوں سے اسلام کا دفاع۔

یہ ان مسافرین جادۂ حق وصدق کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو اس مقدس مشن میں شامل ہونے کا موقع ملا اور کاتب قضاء نے فرزندِ رسولؐ جناب سید الشہداء علیہ السلام کی رفاقت میں یہ سعادت اس کاروانِ حجاز کے حصہ میں لکھ دی۔

ہماری لاکھ جانیں قربان خاندانِ بنی ہاشم کے ان مردوں، عورتوں، بچوں بلکہ غلاموں اور کنیزوں پر بھی، جنہوں نے انسانیت کی روح اور حق وصداقت کی سربلندی کیلئے وطن کے میٹھے پانی، ٹھنڈے سائے، حجاز وعراق کی دھوپ پر قربان کر دیئے۔

اب ہم اس کاروانِ صدق وصفا کے اسمائے گرامی تحریر کرتے ہیں۔ یہ مسافرین عراق مردوں، عورتوں، بچوں اور غلاموں سمیت ایک سو سے زائد افراد پر مشتمل ہیں۔

اولادِ علی ابن ابیطالب علیہم السلام

پسرانِ علی ابن بیطالب علیہم السلام

- سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام بن امیر المومنین وابن فاطمۃ الزہرا، سیدۃ النساء العالمین سالارِ قافلہ۔
- حضرت ابو الفضل العباس علیہ السلام بن علیؑ وابن امّ البنین فاطمہ کلابیہؑ سپہ سالارِ فوجِ حسینیؑ وعلمدارِ لشکر۔
- حضرت عثمان ابن علیؑ وابن ام البنین برادر جناب عباس علیہ السلام
- حضرت جعفر بن علیؑ وابن ام البنین برادر جناب عباس علیہ السلام
- حضرت عبداللہ علیؑ وابن ام البنینؑ، یہ چاروں جوان جناب ام البنین کے بطنِ مبارک سے تھے۔
- حضرت محمد الاصغر بن علیؑ اور ان کے بھائی جناب ابوبکر بن علیؑ، یہ دونوں بھائی لیلیٰ بن مسعود دارمیہ کے فرزند ہیں ان کی والدہ بھی ساتھ تھیں۔

دختران علی ابن ابیطالب علیہم السلام

- جنابِ امّ المصائب، ثانیِ زہراؑ، شریکۃ الحسینؑ، زینب الکبریٰؑ بنت امیر المومنینؑ وبنتِ فاطمۃ الزہراءؑ سیدۃ النساءؑ۔
- جنابِ زینب سلام اللہ علیہا کے ساتھ ان کی صاحبزادی جنابِ کلثوم صغریٰ بھی شریکِ سفر ہو کر واردِ کربلا ہوئیں۔
- جنابِ زینب صغریٰؑ بنتِ امیر المومنینؑ وبنتِ سیدۃ النساء العالمین، کنیت امّ کلثوم، زوجہ محمد بن جعفر طیارؑ۔
- جنابِ خدیجہؑ، ایک کنیز کے بطنِ مبارک سے تھیں اور جنابِ عبدالرحمٰن بن عقیلؑ کی زوجہ تھیں۔ ان کے دو فرزند، سعد اور عقیل بھی ان کے ہمراہ کربلا آئے۔ شہادتِ مظلومؑ کے بعد پیاس کی شدت اور ظالموں کے خوف اور ڈر سے اس قدر گھبرائے کہ جاں بحق ہو گئے۔
- جنابِ رقیہ الکبریٰؑ، جنابِ مسلم بن عقیل علیہم السلام کی زوجہ تھیں۔ ان کے دو بیٹے، عبداللہ بن مسلم اور محمد بن مسلم علیہم السلام ماں کے ساتھ کربلا آئے اور اپنے ماموں جنابِ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جان نثار کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔
- آپؑ کی ایک دختر جنابِ عاتکہؑ بن مسلمؑ بھی ماں کے ساتھ کربلا آئیں۔ کربلا میں اس معصومہ کی عمر سات سال کی تھی۔ بعد از شہادت جب خیام پر حملہ ہوا اور سادات کے خیام جلائے گئے تو سیدانیاں گھبر کر خیموں سے باہر جنگل کی طرف نکلیں اور معصوم بچے گھبرا کر ادھر ادھر بھاگے تو بچوں کے ہاتھ ماؤں کے دامنوں سے چھوٹ گئے اور بیقراری و پریشانی کے عالم میں مائیں کہیں اور اولاد کہیں تھی۔ یہ معصومہ گھبراہٹ میں فوجِ اشقیاء کے گھوڑوں کے سُموں تلے پامال ہو گئیں۔
- اُمِ ہانی: ان کی والدہ ایک کنیز تھیں اور جنابِ عبداللہ الاکبر بن عقیلؑ کے حبالۂ نکاح میں تھیں۔ ان سے محمد الاوسط پیدا ہوئے۔
- زینب صغریٰؑ: ان کی والدہ بھی کنیز تھیں اور محمد بن عقیلؑ کی زوجہ تھیں۔ ان سے ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہوا۔
- رملۃ الکبریٰ: ان کی والدہ کا نام اُمّ مسعود بنت عروۃ ثقفی ہے۔ ان کے شوہر جنابِ عبدالرحمٰن الاوسط بن عقیلؑ ہیں۔
- رقیہ صغریٰ: ان کی والدہ بھی کنیز ہیں۔ جنابِ امیر المومنین علیہ السلام کے بھتیجے سے ان کی شادی ہوئی۔
- فاطمہ: ان کی والدہ بھی اُمّ ولد ہیں اور ان کے شوہر کا نام ابوسعید بن عقیلؑ ہے اور ان کی ایک دختر حمیدہ ہیں۔ ان کا ایک بیٹا محمد بن ابی سعیدؑ کربلا میں اپنی ماں کے ساتھ تھا۔ عمر ان کی سات سال تھی۔ جب جنابِ امام حسین علیہ السلام میدان

میں گھوڑے سے نیچے آئے اور صدائے ہل من ناصر بلند کی تو خیموں میں مستورات کی بے چینی بڑھی اور کہرام بپا ہوا تو یہ بچہ خیمے سے باہر نکلا۔ ہاتھ میں خیمے کی چوب تھامے ہوا تھا۔ باہر نکلا، اس کی والدہ در قنات سے منظر دیکھ رہی تھیں، بچہ گھبر کر دائیں بائیں مڑ کر دیکھتا تھا اور کانوں میں گوشوارے حرکت کرتے تھے۔ ایک ظالم ملعون لقیط بن ایاس جہنمی نے معصوم بچے کو شہید کر دیا۔ یہ بھی کہ جاتا ہے کہ حانی بن ثبیت حضرمی نے تیر مارا جو اس معصوم بچے کی کمر پر لگا۔ بچہ تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑا اور شہید ہو گیا۔

- خدیجہ صغریٰ: جناب عبداللہ الاوسط بن عقیلؑ کی زوجہ تھیں۔

ازواج و حرمہائے علی ابن ابیطالبؑ

جناب امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہم السلام کی ازواج مطہرات اور حضور کے حرمہائے مکرمات (یعنی کنیزیں) جو صاحب اولاد تھیں، امامِ حسین علیہ السلام کے ہمراہ مدینے سے کربلا آئیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ ان کی تعداد آٹھ ہے۔

- الصباء التغلبیہ جنابِ رقیہ الکبریٰ زوجہ جنابِ مسلم کی والدہ تھیں۔
- امّ مسعود بن عروہ ثقفی جنابِ رملة کی والدہ تھیں۔
- لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ۔
- اُمّ زینب صغریٰ، اُمّ خدیجہ، اُمّ رقیہ، اُمّ فاطمہ، ان میں کچھ ازواج تھیں اور باقی سب صاحب اولاد کنیزیں تھیں۔
- جنابِ امام حسین علیہ السلام کی پھوپھی جمانہ بنتِ ابیطالب علیہم السلام تھیں، ان کے ہمراہ کربلا آئیں اور اُمّ ہانی بنتِ ابیطالبؑ ضعیفی کی وجہ سے مدینہ میں ہی رہیں۔

اولادِ جنابِ عقیلؑ بن ابیطالبؑ

- جنابِ عقیلؑ کے فرزندوں اور پوتوں کی تعداد بارہ ہے۔ جنابِ مسلمؑ بن عقیلؑ دو فرزندوں کے ساتھ کوفہ میں شہید ہوئے۔
- جعفر بن عقیل علیہم السلام: ان کی والدہ کا نام اُمّ الثغر بقولے اُمّ الخوصاء العامریہ ہے۔
- عبدالرحمٰن بن عقیلؑ: ان کی والدہ اُمِ ولد ہیں۔ عبداللہ الاصغر بن عقیل علیہم السلام امّ ولد کے بطن مطہر سے ہیں۔
- موسیٰ بن عقیل، علی بن عقیل، عون بن عقیل علیہم السلام۔
- عبداللہ بن مسلم، محمد عبداللہ بن مسلم علیہم السلام: حضرت مسلم بن عقیل علیہم السلام کے چار فرزند شہید ہوئے۔ دو کوفہ میں

اور دو کربلا میں۔ حقِ رفاقت ادا کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

- محمد بن ابی سعید بن عقیل علیہم السلام: یہ کل تعداد بارہ ہے۔

اولادِ جنابِ جعفرؑ بن ابیطالبؑ

- عون و محمد علیہم السلام: یہ دونوں جنابِ عبداللہ بن جعفر طیارؑ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی والدۂ گرامی جنابِ زینب الکبریٰ بنتِ علی و فاطمہ علیہم السلام ہیں۔ اس وجہ سے جنابِ جعفر طیارؑ کے پوتے اور حضرت علی علیہ السلام کے نواسے۔ دادا اور نانا کی شجاعت کے ورثہ دار ہیں۔ میدانِ کربلا میں انہوں نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ کوفی اور شامی فوج کے چھکے چھڑا دیے۔

اولادِ حسین علیہ السلام

- حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہم السلام: ان کی والدۂ گرامی شاہِ زنان یا شہربانو، امامِ زین العابدین علیہ السلام کی ولادت کے چند روز بعد مدینہ میں انتقال فرما گئیں۔
- جنابِ علی اکبرؑ یا علی اوسط علیہ السلام: ان کی والدہ کا اسمِ مبارک لیلیٰ بنت ابی مرۃ بن عروہ بن مسعود ہے۔
- جنابِ علی اصغرؑ: ان کی والدہ جنابِ رباب بنت امرالقیس ہیں۔

یہ تینوں حضرات کربلا میں آئے۔ جناب امام حسین علیہ السلام کے فرزند، جنابِ جعفر بن حسین علیہم السلام ہیں۔ ان کا مدینہ میں انتقال ہو گیا تھا۔ بعض مؤرخین نے جنابِ حسین علیہ السلام کا ایک فرزند جنابِ عبداللہ بھی بیان کیا ہے جو کربلا میں شہید ہوئے اور بعض جنابِ علی اصغرؑ کو ہی عبداللہ خیال کرتے ہیں۔

دخترانِ امام علیہ السلام

- فاطمہ بنتِ حسینؑ: ان کی والدہ کا نام اُمِّ اسحاق بنت طلحہ بن عبداللہ تمیمی ہے۔
- سکینہ بنتِ حسینؑ: ان کی والدہ جنابِ ربابؑ ہیں۔

اولادِ جنابِ امام حسن علیہ السلام

- جنابِ حسن مثنیٰ علیہ السلام: ان کی والدہ خولہ بنتِ منصور الفزاریہ ہیں۔ یہ جنابؑ کربلا میں شدید زخمی ہوئے۔ میدانِ کربلا میں زخمی پڑے تھے کہ فوجِ ابن زیاد کے بعض آدمی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں علاج کیا اور تندرست ہو

گئے۔ یہ جناب امام حسین علیہ السلام کے داماد اور جناب فاطمہ کبریٰ علیہا السلام کے شوہر تھے۔ جنابِ حسن علیہ السلام کی ان ہی سے اولاد جاری ہوئی ہے۔

- عمر بن الحسن، قاسم، عبداللہ اکبر علیہم السلام: ان کی والدہ کا رملہ ہے۔ بعض اُمّ فروہ بھی کہتے ہیں۔ کربلا میں موجود تھیں۔
- احمد بن حسن علیہم السلام: ان کی والدہ کا اسم گرامی اُمّ بشر ہے۔ جو مسعود انصاری کی دختر ہیں۔ یہ بھی کربلا میں موجود تھیں۔ زید اور عبداللہ الاصغر علیہم السلام، یہ تمام رفاقتِ امامؑ میں واردِ کربلا ہوئے۔
- ابوبکر بن حسن، عبداللہ الاصغر علیہم السلام: یہ تمام رفاقتِ امامؑ میں واردِ کربلا ہوئے

دُخترانِ امام حسن علیہ السلام

- فاطمہ بنتِ حسنؑ علیہا السلام: امامِ زین العابدین علیہ السلام کی زوجۂ محترمہ اور جنابِ امام محمد باقر علیہ السلام کی والدہ ہیں۔ جنابِ فاطمہ اور جنابِ حسن اثرم اور طلحہ بن حسن کی والدہ ایک ہی تھیں، جن کا نام اُمّ اسحاق بنتِ طلحہ ہے۔ جنابِ اُمّ الحسن، اُمّ الحسین، یہ مظلوم کم عمر بچیاں شہادتِ امامِ مظلومؑ کے بعد جب خیام میں آگ لگی تو فوجِ اشقیاء اور گھوڑوں کی بھیڑ میں پامال ہو گئیں۔
- امّ عبداللہ یا امّ الحسین: یہ ایک کنیز کے بطن سے تھیں۔

الجواری

(کنیزیں جنہیں رفاقتِ حسینؑ کا شرف نصیب ہوا)

ان کی تعداد نو (۹) بیان کی جاتی ہے۔ ذیل میں ان کے اسمائے گرامی تحریر کئے جاتے ہیں۔

المتکلمة باالقرآن فِضَّةُ النّوبِیه

یہ حبش کی رہنے والی تھیں اور جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کا انہیں شرف ملا۔ خدمتِ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں رہیں۔ حضورؐ پاک نے یہ وفادار اور پاک سرشت کنیز اپنی لختِ جگر جنابِ سیدة النساء سلام اللہ علیہا کو عطا فرمائیں اور یہ خدمتِ پاکِ معصومہؑ میں رہیں۔

گھر کے کام کاج میں مصروف رہتیں اور باقی وقت عبادتِ خدا میں صرف کرتیں۔ ایندھن لانے کا فریضہ بھی انجام دیتیں۔ انہیں ایک خاص دُعا جنابِ رسالتمآبؐ نے تعلیم دی تھی جسے ضرورت کے وقت پڑھا کرتیں۔

مروی ہے کہ ایک دفعہ جنگل سے لکڑیاں بنانے گئیں۔ لکڑیوں کا گٹھا بھاری تھا۔ ظاہر اور جسمانی طاقت سے یہ بار اٹھانے سے عاجز تھیں۔ جناب فضہؓ نے وہی تعلیم کردہ دعا پڑھی اور وہ دعا یہ ہے:

"یَا وَاحِدُ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ اَحَدٌ تَمِیْتُ کُلَّ وَ تُفْنِیْ کُلَّ اَحَدٍ وَ اَنْتَ عَلٰی عَرْشِکَ وَاحِدٌ وَلَا تَاْخُذُکَ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ".

اسی اثناء میں ایک اجنبی اعرابی آیا اور لکڑیاں اٹھا کر جناب بتولؑ کے دروازے تک پہنچا گیا۔ آپؓ جناب سیدہؑ کی خاص کنیز تھیں۔ انہوں نے وقتِ وفات اس دعا کو جناب ثانی زہراء زینب سلام اللہ علیہا کے سپرد کیا۔

یہ کبھی امام حسن علیہ السلام کے گھر، کبھی امام حسین علیہ السلام کے گھر اور کبھی جناب شریکۃ الحسینؑ سلام اللہ علیہا السلام کے گھر، آپ حضراتؑ کی خدمت کرتیں۔ جب جناب زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے بھائی کے ساتھ سفر عراق اختیار کیا تو ان کے ساتھ اس سفر کی سعادت فضہؓ نے بھی حاصل کی۔

قفیزۃ

انہیں ملیکہ بھی کہا جاتا ہے۔ علقمہ بن عبداللہ بن قیس کی دختر ہیں۔ جب جناب جعفر بن ابیطالب علیہم السلام نے حبشہ کو مومنین کے ساتھ ہجرت کی تو وہاں ان کو بطور ہدیہ یہ کنیز ملیں۔ جب مدینہ واپس آئے تو انہوں نے بطور ہدیہ یہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کو بخش دیں۔ یہ سعادت مند خادمہ جناب علیؑ و بتولؑ کی خدمت کرتی رہیں۔ بعد وفات جناب سیدہؑ جناب زینبؑ کی خدمت میں آگئیں اور ان کی خادمہ رہیں۔ جب جناب بنتِ علیؑ نے سفر عراق اختیار کیا تو یہ کنیز بھی ہمراہ جناب زینبؑ کربلا آئیں۔

روضہ

یہ جناب رسولؐ پاک کی کنیز تھیں۔ حضورؐ کی خدمت کیا کرتیں۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جناب سیدۃ النساء سلام اللہ علیہا کی خدمت با برکت میں آئیں۔ بعد ازاں جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کی خدمت میں رہیں۔ جب جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شادی ہوئی تو یہ جنابؑ کے ساتھ گئیں اور ان کی خدمت کرتی رہیں۔ پھر ان کے ساتھ شریکِ سفر عراق ہوئیں۔

اُمِّ رافع

ابورافع قبطی جس کا نام ہرمز تھا، جناب رسولؐ پاک کا غلام تھا۔ یہ ان کی زوجہ تھیں۔ ان کا نام سلمٰی اور کنیت امِّ رافع

ہے۔ پہلے یہ جناب صفیہ بنت جناب عبدالمطلبؑ کی کنیز تھیں۔ بعد ازاں جناب رسالتمآب کی خدمت کا شرف حاصل کرتی رہیں۔ ان کی وفات کے بعد جناب علی و بتول علیہم السلام کی خادمہ رہیں اور پھر جناب زینب سلام اللہ علیہا کی خادمہ بنیں اور ان کے ساتھ عراق کے سفر میں شامل رہیں۔ یہ چاروں خادمائیں جناب شریکۃ الحسین حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی ہیں۔

میمونہ

عبداللہ بن یقطر کی والدۂ گرامی جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے گھر میں ان کی اولاد کی خدمت کرتی رہیں۔ ان کی شہادت کے بعد جناب امام حسن علیہ السلام کے گھر میں آئیں۔ جب جناب حسین علیہ السلام مدینہ سے عراق کو چلے تو یہ فرزند جناب عبداللہ یقطر کے ساتھ شریک سفر ہوئیں۔

جب جناب امام علیہ السلام نے مکہ سے کوچ فرمایا تو عبداللہ بن یقطر کو جناب مسلمؑ کے خط کا جواب دے کر کوفہ بھیجا۔ یہ حسین بن نمیر کے قبضے میں آگئے اور ابن زیاد کے پاس پہنچائے گئے۔ ابن زیاد نے حالاتِ امامؑ پوچھنے پر اصرار کیا، انہوں نے انکار کیا، تو جنابِ عبداللہ بن یقطیر کو کوفہ میں شہید کیا گیا۔ آپؑ کی والدہ میمونہ، امام علیہ السلام کے ساتھ کربلا آگئیں۔ یہ جناب امام علیہ السلام کی خادمہ تھیں۔

فاکھہ

یہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی کنیز ہیں۔ جناب ربابؑ کے گھر میں خدمات انجام دیا کرتی تھیں۔ ان کے شوہر عبداللہ بن اریقط دوئلی لیثی ہیں۔ ان سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام قارب تھا۔

یہ سعادت مند کنیز اپنے فرزند قارب کے ساتھ قافلۂ عراق میں شامل ہوئیں اور کربلا میں وارد ہوئیں۔ ان کے فرزند ارجمند کو مرتبہ شہادت ملا۔

زیارت ناحیہ میں جنابِ قائم آلِ محمد عج اللہ فرجہ الشریف نے قارب پر بھی سلام بھیجا ہے: ''**السّلام علٰی قارب مولٰی الحسَین**''۔

حُسنیہ

یہ مولا حسن علیہ السلام کی کنیز تھیں۔ آپ نے نوفل بن حارث بن عبدالمطلبؑ سے خریدی تھیں۔ پھر انہوں نے ایک شخص ''سہم'' سے نکاح کیا۔ اس سے ایک فرزند بنام منجح پیدا ہوئے۔

حسنیہ امام زین العابدین علیہ السلام کی خادمہ تھیں۔ مع اپنے فرزند کے رفاقتِ امام علیہ السلام میں کربلا آئیں۔ ان کے فرزند کو رتبہ شہادت نصیب ہوا اور جناب قائم آلِ محمد عج اللہ فرجہ الشریف کے سلام کا شرف نصیب ہوا۔

"اَلسَّلَامُ عَلٰی مُنْجِحٍ مولٰیٰ اَلْحُسَیْنِ".

کبشہ

آپ مولا حسین علیہ السلام کی کنیز تھیں۔ مولاؑ نے ایک ہزار درہم میں انہیں خریدا تھا۔ یہ آپؑ کی زوجہ امّ اسحاق کے گھر کی خادمہ تھیں۔ پھر کبشہؒ کے ساتھ ابورزین نے شادی کی۔ اس سے ایک لڑکا سلیمان پیدا ہوا۔ جناب کبشہ شریکِ سفرِ عراق رہیں اور ان کے فرزند کو شرف شہادت ملا۔ یہ اس طرح کہ بصرہ کے اشراف کے پاس یہ امام حسین علیہ السلام کا خط لے کر گئے تھے، عبیداللہ ابن زیاد کے قبضہ میں آگئے اور اس نے بصرہ میں قتل کروا دیا۔

ملیکہ

یہ جناب عقبہ بن سمعان کی زوجہ ہیں۔ جناب امام حسن علیہ السلام کے گھر میں خادمہ تھیں۔ بعد ازاں جناب امامِ حسین علیہ السلام کے گھر میں آئیں اور جناب عبداللہ بن جعفر طیار علیہم السلام کے گھر میں بھی خدمت کیا کرتیں۔ ان کا شوہر جناب رباب بنت عمرءالقیس، زوجہ محترمہ امام حسین علیہ السلام کا مملوک غلام تھا۔

جب امام حسین علیہ السلام نے سفرِ عراق اختیار کیا تو یہ اپنے شوہر کے ساتھ شریکِ سفر تھیں۔ جب امامِ مظلومؑ اپنے اعزہ و انصار کے ساتھ شہید ہوئے اور باقی اسیر کیے گئے تو ابن زیاد نے عقبہ بن سمعان سے پوچھا: ''تو کون ہے؟'' تو اس نے کہا: ''میں مملوک غلام ہوں''۔ ابن زیاد نے اسے رہا کر دیا۔ واقعاتِ کربلا جناب عقبہ بن سمعان کے آنکھوں دیکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ واقعات بیان کئے اور کتابی صورت میں جمع کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام مقتل عقبہ بن سمعان ہے۔

خُدام و موالی

غلامان اور خدمتگاران کی تعداد جو عراق کے سفر میں امامِ مظلوم علیہ السلام کے ہمراہ تھے، دس ہیں۔ ان میں سے آٹھ تو درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور دو زندہ بچ گئے تھے۔ وہ لوگ جو شہید ہوئے ان کے اسمائے گرامی مکتوبِ ذیل ہیں:

۱۔ قارب بن عبداللہ الدوئلی اللیثی۔

۲۔ منجح بن سہم۔

۳۔ سعد بن الحرث الخزاعی: یہ امیر المومنین کا غلام تھا اور زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور تھا۔ بعد میں امام حسین علیہ السلام کی غلامی میں آیا۔

۴۔ النصر بن عمرو: عجم کے بادشاہوں کی اولاد میں سے تھا اور کمسنی میں اسلام کی طرف رغبت کی اور اہل بیتؑ کے گھر کی خدمت کی اور شہادت کی سعادت حاصل کی۔

۵۔ حرث بن نبھان: یہ جناب حمزہ بن عبدالمطلبؑ کا غلام تھا۔ پھر جناب امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔

۶۔ جون بن حوی النوبی: یہ جناب ابوذر غفاریؓ کا غلام تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ جناب امیر المومنینؑ نے فضل بن عباس بن عبدالمطلبؑ سے ۱۵۰ دینار میں خرید اتھا۔ جناب ابوذرؓ کی خدمت کے لیے بخش دیا تھا۔ جب عثمان بن عفان نے ابوذرؓ کو مدینہ سے ربذہ کی طرف جلاوطن کیا تو یہ غلام ان کے ہمراہ تھا۔ جناب ابوذرؓ کی وفات کے بعد یہ مدینے واپس لوٹ آیا اور علی ابن ابیطالب علیہم السلام کی خدمت میں آ گیا۔ پھر جناب حسن علیہ السلام اور پھر جناب حسین علیہ السلام کے خادموں میں شامل ہو گیا۔

یہ سعادت مند غلام جناب امام زین العابدین علیہ السلام کا خادم تھا۔ سفر عراق میں ان کے ہمراہ عراق آیا۔ وقتِ شہادت اس کی عمر ۹۷ برس تھی۔ جب امام حسین علیہ السلام جون کی لاش پر گئے تو دعا مانگی: پروردگار! اس کے چہرے کو روشن کر، اس کے بدن کو خوشبودار کر اور ابرار و صالحین کے ساتھ اسے محشور کر اور محمدؐ و آل محمدؐ اور اس کے درمیان مکمل معرفت کروا۔ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جس دن شہدائے کربلا دفن ہوئے تو جون کی لاش سے خوشبو آ رہی تھی۔

۷۔ اسلم بن عمر: یہ امام حسین علیہ السلام کے غلاموں میں سے تھا اور مشہور یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اسے خریدا تھا اور اپنے فرزند علی ابن حسین علیہم السلام کو بخش دیا تھا۔ اس کا باپ عمر و ترکی تھا۔ اسلم بھی مولاؑ کے اس سفر میں ہمرکاب رہا۔

یہ سات حضرات کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ شہید ہوئے اور ایک غلام سلیمان بن ابورزین: بصرہ میں ابن زیاد کے ہاتھوں قتل ہوئے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

۹۔ عقبہ بن سمعان: ان کے حالات گزر چکے ہیں کہ یہ زندہ بچ گئے تھے۔

۱۰۔ علی بن عثمان بن الخطاب الحضرمی المغربی: امیر المومنین علیہ السلام کے غلاموں اور خدام میں سے ہیں۔ خود علی بن عثمان کا بیان ہے کہ جب میں امیرؑ کی خدمت میں رہتا تھا اور ان کے ساتھ جنگِ جمل اور صفین میں بھی شامل ہوا۔ ایک دفعہ

میں ان کے دائیں جانب جنگِ صفین میں ان کے پاس کھڑا تھا کہ ان کا کوزا ان کے ہاتھ سے گر پڑا۔ پس میں نے جھک کر وہ کوزا اٹھایا اور ان کو دیدیا۔

وہ بیان کرتا ہے کہ ان کے گھوڑے نے سر اٹھایا، لوہے کی لگام تھی، وہ لوہا میرے سر میں لگا اور میری کنپٹی زخمی ہوگئی۔ جناب امیر علیہ السلام نے میرے زخم پر لعاب دہن لگایا اور اوپر کچھ خاک لگائی، غلام کہتا ہے کہ بخدا نہ مجھے درد ہوا نہ تکلیف ہوئی اور زخم ٹھیک ہوگیا۔

بعد شہادت جناب امیر علیہ السلام اور جناب امام حسن علیہ السلام میں مولائے حسین علیہ السلام کی خدمت اقدس میں آ گیا اور ان کے ہمراہ کربلا آگیا۔ وہ شہید ہوگئے اور میں بچ گیا۔ میری قسمت میں شہادت نہ تھی اور بنی اُمیہ سے چھپتا رہا۔

ربّ کی قسمیں، شانِ ربوبیت عالمین کی تشریح، مدینہ سے کوچ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ".

سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔

"العالمین" عالم کی جمع ہے۔ **"عالم ما یُعلم بہٖ"** جس سے کسی چیز کا علم ہو۔ یعنی جو کسی شے کی حالت ہو، اسے عالم کہتے ہیں۔ چونکہ جتنی مخلوق اور کائنات ہے، وہ خداوند عالم کی علامت ہے اور اس کے وجود کی نشانی اور دلیل ہے۔ اس واسطے تمام جہانوں، ساری مخلوقات اور کل کائنات جو خدائے تعالیٰ کے سوا ہے، اس کو عالم کہا جاتا ہے۔

خدا پروردگار ہے اور تمام مخلوق اپنی پرورش میں اس کی محتاج ہے۔

اٹھارہ ہزار عالم بیان کئے جاتے ہیں، درحقیقت اس سے زیادہ ہیں اور انسانی طاقت ان کے شمار سے عاجز ہے۔ جو کسی کی پرورش کرتا ہے اس کیلئے چند چیزیں ضروری ہیں

1۔ جس کی پرورش مقصود ہے وہ پرورش کرنے والے کے قبضہ قدرت میں ہو۔ اگر وہ چیزیں اس کے تسلط سے باہر ہوں تو وہ اس کی پرورش کس طرح کرسکتا ہے؟ پرورش کرنے والا قادر ہو۔

2۔ پرورش پانے والے کی جملہ ضروریاتِ زندگی کو جانتا ہو۔ تاکہ وہ مہیا کی جائیں جو اس کی جسمانی (بدنی)، روحانی، ظاہری و باطنی قوتوں کی نشوونما کیلئے ضروری ہیں۔ وہی ماں بچے کی اچھی تربیت کرسکتی ہے جو عاقل و دانا ہو اور وہ خوراک اسے بہم پہنچائے جو اسے مفید ہو اور وہی غذا اسے دے جو اس کی بدنی اور جسمانی نشوونما کیلئے فائدہ مند ہو۔

وہی مالک اپنے ریوڑ اور مویشیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال اور تربیت کرسکتا ہے جسے علم ہے کہ ان کے لیے کون سا غلہ، کونسا چارہ اور کون سی خوراک ضروری ہے۔ ہر قسم کے حیوانوں، چرندوں اور پرندوں کی تربیت، ان کے ماہرین تربیت کرتے ہیں۔ ماہی پروری کے محکمے بھی کام کر رہے ہیں۔ نباتات، کھیتوں اور باغوں کی پرورش کرنے والے بھی پہلے علم حاصل کرتے ہیں کہ فلاں پودے کو کس طرح پروان چڑھایا جاتا ہے اور کن کیڑوں اور مضر اشیاء سے ان کی حفاظت ضروری

ہے۔اسی واسطے ہر شے کی تربیت کا علم حاصل کرنے کے ادارے قائم ہو چکے ہیں۔

3۔ جو جسمانی ترقی اور طولانی وارضی پھیلاؤ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی اشیاء ہیں، ان کا بھی علم ہوتا کہ ان موانع ومضرات سے مربوب اشیاء کو محفوظ رکھا جائے۔

4۔ پالنے والے کے دل میں جذبۂ رحم شدید ہو۔ماں کے دل میں اپنے بچے کی محبت نہ ہو اور ماں کا دل رحم سے خالی ہو تو بچہ روتا رہے گا مگر ماں دودھ نہ پلائے گی۔ مالک کو مویشیوں سے اُلفت نہ ہو تو مویشی ہلاک ہو جائیں۔ باغبان کو اپنے باغ سے محبت نہ ہو، کسان اپنے کھیت کی پرواہ نہ کرے تو کھیت اور باغ برباد ہو جائیں گے۔

جو پرورش جذبات، رحم ومحبت، علم وحکمت اور پوری طرح قدرت کے ساتھ کی جاتی ہے، وہ چیز مکمل پرورش پا کر اپنی حدِکمال کو پہنچ جاتی ہے اور پرورش کنندہ اسے حدِ کمال پر دیکھ کر اور اپنی محنت کا پھل پا کر مسرور ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اسباب میں سے اگر کوئی سبب رہ جائے تو پرورش صحیح طریقے پر نہیں ہو سکتی۔اس جہاں میں کتنی مخلوق ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ وہ کہاں کہاں رہتی ہے؟ اس کی کیا کیا ضروریات ہیں؟ اسے کس قسم کی روزی درکار ہے؟ کتنی درکار ہے؟ یہ سب کچھ انسان کے علم اور قدرت سے باہر ہے۔نہ انسان کو تمام مخلوقات کا علم ہے اور نہ قدرت لیکن اس کائنات کی ہر چیز تربیت پا رہی ہے۔

جاندار ہو یا بے جان، ذی عقل یا بے عقل، صحرا میں رہنے والی یا جنگلوں میں بسیرا کرنے والی، زمین پر، زمین کے اندر، ریت کے ٹیلوں میں، مٹی کے تہہ خانوں میں، پہاڑوں میں، پہاڑوں کی غاروں میں، پاؤں سے چلنے والی، بغیر پاؤں زمین پر رینگنے والے کیڑے، چوپائے، حشرات الارض، فضا میں بسنے والی، ہوا میں زندگی گزارنے والی، پانی کی موجوں میں، زمین کی سطحوں میں، سمندر کی گہرائیوں میں، پتھروں کی چٹانوں میں، فضائی کروں میں، آسمان میں ہر شے کی پرورش کرنے والا وہ اللہ ہے جو رب العالمین ہے۔

جماد ہو یا نبات، حیوان ہو یا انسان، جن ہوں یا ملائکہ، زمین کی تہیں ہوں یا آسمان کے طبقات، مشرق ہوں یا مغرب، ہر جگہ کے مکینوں اور جاندار کی اس نے روزی مقرر کر دی ہے۔اس کی جسمانی ساخت، اس کی عمر، اس کی راحت و تکلیف اس نے مقرر فرما دی ہے۔

چنانچہ جب جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنے رب کی شان بیان کی تو فرعون نے پوچھا:

"وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ".

''ربّ العالمین کیا ہے؟'' اس کی کیا شان ہے؟

تو حضرت موسیٰ نے جواب میں فرمایا:

''رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا''.

''تمام آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان سب کا رب ہے۔''

پھر اس کے بعد فرمایا:

''رَبُّ آبَائِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ''.

''تمہارے گزشتہ آباؤ اجداد کا رب ہے۔''

پہلی مرتبہ خداوند عالم کی اس عام ربوبیت کی ذکر کیا جس کا تعلق جگہ کی انتہاء کے ساتھ ہے۔ یعنی ربوبیت درمکانات۔ دوسری بار اس ربوبیت کا ذکر کیا جس کا تعلق زمانوں سے ہے۔ یعنی کوئی مکان اور کوئی زمان اس کی ربوبیت سے خالی نہیں۔ پھر فرمایا:

''رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا''.

''مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے۔''

جس طرح ہر مصنوع (بنائی ہوئی چیز) اپنے صانع کے وجود کی دلیل ہے، ہر مولود اپنے والد کا پتا دیتا ہے، ہر مخلوق اپنے خالق کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح ہر مربوب اپنے رب کے وجود کی شہادت دیتا ہے۔

بغیر پیدا کرنے والے کے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی تو بغیر پرورش کرنے والے کائنات کیسے پرورش پا رہی ہے؟ ارشادِ ربُّ العزت ہے:

''سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ''.

''ہم ان کو وہ نشانیاں دکھائیں گے جو اطراف عالم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ نشانیاں جو خود لوگوں کے بدنوں میں ہیں تاکہ انہیں یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ ذات باری تعالیٰ موجود ہے۔''

رب کی دو قسمیں ہیں

۱۔ ربِّ مجازی

مجازی رب وہ ہے جو کسی چیز کی دیکھ بھال کرتا ہے، اس کی پرورش کرتا ہے، اس کو خوراک دیتا ہے اور اس کی نمو کے

اسباب مہیا کرتا ہے اور اس کے جسم کو نقصان کو پہنچانے والی اور اس کی جسمانی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے والی اشیاء سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ بڑھانے والی اشیاء بہم پہنچاتا ہے اور گھٹانے والی اشیاء کو دور رکھتا ہے۔ مثلاً والدین، استاد، بادشاہ، حاکم، فارم مینیجر، گڈریا، باغبان، کسان وغیرہ اپنے زیرِ کفالت کی تربیت کرتے ہیں لیکن ان کو مجازی چند وجوہ سے کہا جاتا ہے۔

1۔ ان کی تربیت محدود ہے۔ چند افراد یا چند چیزیں ان کے زیرِ تربیت ہیں۔ کوئی چند افراد کا مربی ہے، کوئی ایک نوع یا جنس کا، بادشاہ اپنی رعایا، والدین اپنی اولاد، باغبان اپنے کھیت کا۔

2۔ اسبابِ تربیت ان کے اپنے نہیں۔ نہ ان کے پیدا کردہ ہیں۔ مثلاً ''ہوا''، اس کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ پانی دھوپ، روشنی، انسان ان چیزوں کا خالق نہیں۔ یہ اس کے قبضہ قدرت میں نہیں۔ ہاں! ان سے نفع اٹھا سکتا ہے اور نفع حاصل کرنے کی تدبیر و طاقت خالقِ حقیقی نے عطا فرمائی ہے۔

3۔ خوراک اور غذا جس سے جسم پرورش پاتا ہے اور اعضائے بدن بڑھتے ہیں، اس کا اُگانا انسان کے بس میں نہیں۔ انسان زمین میں بیج بو سکتا ہے۔ اس بیج کو اُگا نہیں سکتا۔ جیسا کہ ارشادِ قادرِ کریم ہے:

''اَفَرَاَیْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ''۔

''کیا تم اپنی کاشتکاری کو دیکھتے ہو۔ کیا تم کھیت اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟'' (واقعہ)۔

کسان ہل چلاتا ہے، زمین نرم کرتا ہے، اس کی آغوش میں دانہ سپرد کرتا ہے، لیکن دانے کو شگافتہ کر کے اس سے کونپل نکالنا کسان کا کام نہیں بلکہ رحمٰن کا کام ہے۔

پانی کے متعلق ارشاد ہے:

''اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ''

''کیا تم نے دیکھا، وہ پانی جو پیتے ہو اسے تم نے بادل سے نازل کیا یا ہم نازل کرنے والے ہیں؟''

اسبابِ زندگی خدا نے پیدا کیے ہیں۔ ان کے استعمال کا شعور اور ڈھنگ خدا نے سکھایا ہے۔ ان کو استعمال کر کے زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کے مدارج طے کر کے انسان کہیں پہنچ جائے، رب نہیں بن سکتا۔ اگر عقلِ سلیم رکھتا ہے تو جوں جوں وہ مدارجِ کمال طے کرے گا اور جس قدر رازہائے قدرت اس پر منکشف ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی معرفت بڑھتی جائے گی۔

ہاں! خالقِ کائنات کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو استعمال کرنا، یہ بشر کا مقدور ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسی چیز کو عدمِ محض یعنی نیست سے پیدا کرنا، نفع حاصل کرنے کے اسباب اور ان پر قدرت دینا اور پرورش پانے میں رکاوٹوں کو دور کرنے پر قابو دینا، یہ خالق کا

کام ہے جو ربّ العالمین ہے۔ خود تربیت دینے اور پرورش کرنے والے اصحاب، اسباب میں، بلکہ خود اپنی تربیت میں بھی محتاج باری تعالیٰ ہیں۔

درحقیقت ربوبیت اسی کی شان ہے اور ربوبیتِ مطلقہ اسی کو زیبا ہے۔ اس واسطے اسلامی اصطلاح میں اگر لفظ ربّ کہا جائے تو اس سے ذاتِ احدیت مراد ہوتی ہے۔ غیر اللہ کے لیے تنہا لفظ ربّ استعمال نہیں ہوتا بلکہ وہ مضاف کی صورت میں ہوتا ہے، جیسے ربّ البیت، گھر کا مالک۔

اہل ایمان عقائد تلقین کرتے وقت یہی تعلیم دیتے ہیں:

"اَللّٰہُ جَلَّ جَلَالُہٗ رَبِّیْ".

جب قبر میں میت کو اتار کر تلقین پڑھتے ہیں اور عقائد کی تعلیم دیتے ہیں کہ منکرین جب عقائد کے بارے میں سوال کریں کہ:

"مَنْ رَّبُّکَ".

"تیرا رب کون ہے؟"

تو جواب میں بتا کہ:

"اَللّٰہُ جَلَّ جَلَالُہٗ رَبِّیْ".

"اللہ بزرگ شان والا میرا رب ہے۔"

ربّ حقیقی تو وہ ربّ العالمین ہے جس نے مخلوقات کو عدمِ محض سے پیدا کیا۔ ہر جاندار کو زندگی بسر کرنے کا شعور بخشا۔ زندگی کے اسباب پیدا و مہیا کیے۔ انہیں اپنے تصرف میں لانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ہدایت کی۔ ہر ذی روح کو افزائش نسل کی ہدایت کی اور اپنی اولاد کو تربیت کے طریقے سکھائے۔

یہ دنیا چونکہ عالمِ اسباب ہے، اس واسطے ہر شے کی پیدائش بھی اسباب کے تحت ہے اور پرورش بھی اسباب کے تحت۔

اشرف المخلوقات کی پیدائش

اشرف المخلوقات کا تاج انسان کو عطا ہوا۔ شکل و صورت کے لحاظ اور عقل و دانش کی وجہ سے یہ شاہکار قدرت ہے۔ اس خالق حقیقی نے انسان کی پیدائش پر فخر کیا، جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ اَنْشَانَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" (مومنون)۔

"بیشک ہم نے انسان کو کیچڑ (مٹی اور پانی کی مخلوط شکل) کے خلاصہ پیدا کیا، پھر اس کو بطور نطفہ ایک محفوظ قرار گاہ میں رکھا، پھر اس نطفے کو جما ہوا خون بنایا، پھر اس منجمد کو گوشت کا لوتھڑا بنایا اور اسی گوشت کے لوتھڑے میں ہڈیاں پیدا کیں، ان ہڈیوں کو پھر گوشت کا لباس بنایا۔ (جب پیدائش کے تمام درجات مکمل ہو گئے اور شکمِ مادر میں ایک مکمل انسانی شکل بن گئی تو) ہم نے اسے دوسری خلقت عطا کی۔ یعنی اس میں روح ڈالی، اس بت میں زندگی پیدا ہوئی، پس برکت والا ہے وہ خدا جو بہترین خالق ہے"۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

"اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاءَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلَالَةٍ مَّاءٍ مَهِيْنٍ ثُمَّ سَوَّاهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلاً مَّاتَشْكُرُوْنَ".

"ربّ العالمین وہ ہے جس نے اپنی ہر مخلوق کو عمدہ و احسن پیدا کیا اور انسان کی پیدائش مٹی سے کی، پھر اس انسان کی نسل ایک ذلیل اور گندے پانی سے بنائی پھر انسان کو درست و معتدل و مناسب بنا کر اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لئے کان، آنکھیں، دل بنائے مگر تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو"۔ (سجدہ)۔

حضرات! غور فرمائیں! انسان کی پیدائش کا کارخانہ ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں نہ انسان کا عمل دخل ہے، نہ ہی وہاں اس کی نظر کام کرتی ہے، نہ اس کی عقل و تدبیر کوئی عمل کر سکتی ہے۔ عالمِ اسباب کے تحت اس نے بیج بویا۔ آگے کچھ نہیں، کوئی خبر نہیں۔ کون سی اور کس طرح کی کیمیائی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ وہاں نہ کوئی فلسفی ہے نہ کوئی سائنسدان۔ ماں کے رحم کے اندھیرے میں تدبیرِ قدرت کارفرما ہے۔ انسان کا وہاں کوئی عمل دخل نہیں۔ ایک ذلیل پانی عورت کے شکم میں شکلیں بدل رہا ہے اور مختلف درجات طے کر کے ایک بچے کی صورت میں مکمل ہو رہا ہے۔ بے جان لوتھڑا جاندار بچہ بن جاتا ہے۔ اس کو خوراک کی ضرورت ہے، پیٹ میں پرورش پا رہا ہے۔ اس کا پروردگار اسی پیٹ میں اس کو غذا دے رہا ہے۔

ایک سرکش اور ملحد انسان ہستی خدا سے لاکھ انکار کرے مگر قدرت کے اس کارخانے کا انکار ممکن نہیں۔ اسی طرح سورۂ واقعہ میں اشارہ ہے:

"اَفَرَءَیْتُم مَا تُمْنُوْنَ ءَاَنتم تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ".

"تمہارا کیا خیال ہے جو تم باہمی ملاپ کرتے ہو تم انسان کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔"

آخر وہ کون سی ذات ہے جو اس کارخانے کو چلا رہی ہے۔ ہر حیوان و انسان کے پیٹ میں بچہ بنانے والا اور اس کی حفاظت و نگہداشت کرنے والا، مناسب اعضاء بخشنے والا اور غذا دینے والا کون ہے؟ یقیناً وہ اللہ جو ربّ العالمین ہے۔

بچہ شکم مادر میں غذا حاصل کر رہا ہے۔ ماں اس کی پرورش نہیں کر رہی، باپ نہیں پال رہا۔ وہاں وہ ذات اس کی پرورش کر رہی ہے، جو سمجھتی ہے کہ اس کی خوراک کیا ہونی چاہئے۔ کس قدر ہونی چاہئے۔ معلوم نہیں بچہ کب غذا مانگتا ہے، کیونکر مانگتا ہے اور پروردگار کس طرح اسے غذا دیتا ہے۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ سرکش اور ناشکرا انسان پل رہا ہے اور رحیم و کریم رب اسے پال رہا ہے۔

آخر بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آیا۔ اس کے رحیم و کریم رب نے ماں کے دل میں رحم و محبت کے جذبات بھر دیئے اور اس کی غذا کیلئے ماں کے سینے میں خوراک کی دو نہریں جاری کر دیں۔ انسان کا بچہ اپنی پرورش پر آپ قادر نہیں۔ غذا حاصل کرنے سے عاجز ہے۔ خوراک کی نہروں تک اس کی رسائی نہیں۔ ماں کو خوراک بہم پہنچانے پر قدرت دی اور پرورش کے فرائض اسے سونپ دیئے۔

ایک حیوان چوپائے کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ جانور کی ماں اس کے منہ میں غذا نہیں دے سکتی، وہ خوراک دینے میں عاجز ہے۔ گو خوراک کا ذخیرہ اس کے پاس محفوظ ہے مگر بچے کے ذہن میں منتقل کرنے سے قاصر ہے۔ وہاں بچے کو خوراک حاصل کرنے پر قدرت دے دی اور غذا حاصل کرنے کا ڈھنگ سکھا دیا۔ چنانچہ چوپائے کا بچہ پیدا ہوتا ہے، ماں کے پستانوں کی طرف دوڑتا ہے اور خود غذا حاصل کرتا ہے۔

انسان کی حالت یہ ہے کہ بچہ عاجز ہے تو ماں قادر ہے اور حیوان کی حالت یہ ہے کہ ماں عاجز ہے تو بچہ قادر ہے۔

حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ایک سائل نے ذات باری تعالیٰ اور خالق کی ہستی کے بارے میں سوال کیا تو معصوم علیہ السلام نے ایک انڈہ پیش کیا اور فرمایا: "یہ ایک مضبوط قلعہ ہے۔ ہر طرف سے بند ہے، نہ غذا اندر جا سکتی ہے، نہ ہوا، نہ روشنی۔ لیکن اس انڈے کے اندر بھی قدرت کا کارخانہ چل رہا ہے۔ بچہ بن رہا ہے۔ جب بن جائے گا تو قلعے میں اپنی

چونچ کے ذریعے دروازہ پیدا کر کے باہر آئے گا۔ تب یہ ساری تدبیر اور عملی حکمت اور نرالی کاری گری کس کی ہے؟"

تعصب کی بناء پر فلسفہ اس کو طبیعت کہتا ہے اور ہم اسے اللہ کہتے ہیں جو رب العالمین ہے۔

انسان کی غذا

یہ تو انسان کی پیدائش اور رحم مادر میں اس کی تربیت کا تذکرہ تھا۔ اب ہم انسان بلکہ جملہ حیوانوں کی غذا اور زمین میں سے اسباب معیشت پیدا کرنے کا قرآنی ذکر سپردِ قلم کرتے ہیں کہ اس پروردگار عالمین نے تربیتِ اجسام وترقی ابدان کے کیا اسباب پیدا کئے ہیں۔ ایسی چیزیں انسانی قدرت اور بشری طاقت سے باہر ہیں۔

ہاں! ان کے اسرار ورموز کے انکشاف اور ان میں غور وفکر سے معرفتِ ربانی بڑھتی اور ایمان تازہ ہوتا ہے۔ ارشادِ رب العالمین ہے:

"اِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ" (عبس)۔

"ہم نے اوّل پانی برسایا، پھر زمین کو شگافتہ کیا اور اس سے غلے اور انگور اور سایہ دار تنے والے درخت، زیتون کھجوریں اور گنجان باغ اور میوے، چراگاہیں اور سبزہ زار اگائے جو تمہارا اور تمہارے چوپائیوں کا رزق ہے"۔

انسان کاشتکاری اور تخم ریزی کر سکتا ہے۔ زمین میں نہ دانے کو اگا سکتا ہے اور نہ پودے کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ انسان پودے کو خوراک بہم پہنچا سکتا ہے لیکن اس خوراک کو پودے کے تنے، شاخوں، رگوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں میں تقسیم نہیں کر سکتا۔

زمین میں پھیلی ہوئی جڑوں کے ذریعے خوراک کو بلند چوٹی پر پہنچانے والا، پودے اور درخت کے تمام حصوں میں یہ غذا پہنچانا والا، پودوں پر خوشہ اور بالیاں لگانے والا اور ان کو پختہ کرنے والا، پھولوں میں رنگ وبو پیدا کرنے والا اور پھلوں میں لذت اور حسن پیدا کرنے والا انسان نہیں بلکہ خالق انسان ہے جو رب العالمین ہے۔

غذا کا انسان وحیوان کے بدن میں تحلیل ہونا

یہ تو غذا کا بیان تھا، اب غذا کھانے اور بدن میں تحلیل ہونے کا بیان سنئے! اس علیم الحکیم پروردگار نے انسان کو غذا خوری کیلئے منہ دیا۔ اس غذا کو پیسنے کیلئے منہ میں دانت بنائے تا کہ کھانے کو چبا چبا کر لعابِ دہن کے ساتھ ملا کر خمیر کرے اور نگلنا آسان ہو جائے۔ پھر حلق کے ذریعے معدہ میں چبائی ہوئی غذا کو پہنچاتا ہے۔

معدہ غذا کی آمد کا پیغام سنتے ہی تیار ہو جاتا ہے اور اپنی غدود سے کیمیائی رس خارج کرنے لگتا ہے۔ وہ ہاضم رطوبت کھانے کو مزید ہضم کرتی ہیں۔ معدہ کی حرارت غذا کو پکاتی ہے۔ رطوبتیں اور معدہ کی حرکتیں غذا کو گلاتی ہیں۔ پانی کی آمیزش سے ایک سیال مادہ بن جاتا ہے۔ اندرون بدن کارخانہ قدرت حرکت میں آجاتا ہے مگر تلی، پتہ، آنتیں اپنا اپنا کام شروع کر دیتی ہیں اور غذا کیمیائی مرحلے طے کرتی ہوئی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ کارآمد حصہ خون میں شامل ہو کر بدن کے ہر حصے میں پہنچ کر جزو بدن بن جاتا ہے اور فضول اور بیکار حصہ فضلہ بن کر خارج ہو جاتا ہے۔

غذا کو تحلیل کرنے اور جزو بدن بنا کر بدن کی پرورش اور ترقی دینے کا کام کون کرتا ہے؟ اے متمرد و سرکش انسان! اے غافل و جاہل بشر! اے ملحد و منکر ذاتِ خدا! ذرا سوچ تو سہی تیرے بدن کے اندر یہ کارخانہ تربیت کون چلا رہا ہے؟ پیدا ہونے والے بچے کو جو ابھی بیٹھنے سے عاجز ہے، دیکھنے سننے سے معذور ہے، بولنے پکڑنے سے قاصر ہے، ایک کڑیل جوان، طاقتور پہلوان اور بھرپور شباب کی منزل میں پہنچانے والا کون ہے؟ ذرا غور و فکر کر! دل کی آنکھوں سے دیکھ! عقل و دانش سے پہچان! یقیناً وہ ایک ہستی ہے جو حی قیوم، علیم و خبیر ہے، سمیع و بصیر، مدرک و قدیر ہے۔

آسمان کا وسیع شامیانہ، چوڑی چکلی زمین، آنے جانے والے لیل و نہار، سورج کی تیز روشنی و حرارت، چاند کی خوشگوار ضیاء، تہہ بہ تہہ بادل، اُبلتے ہوئے چشمے، تاروں کی تابانی، دریاؤں کی روانی، چھم چھم برستا مینہ، سرد و گرم ہوائیں، پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں، صحراؤں لمبے لمبے مضبوط پھیلے ہوئے تناور درخت، درختوں کے گھنے بڑھتے سائے، خوشنما و عجیب و غریب چوپائے، حسین و جمیل پرندے، خطرناک و مہیب درندے، سبزے کی لہک، پھولوں کی مہک، غنچوں کی چٹک، پرندوں کی چہک، ربّ العالمین کی عظمت و صفت، تربیت کی گواہی دے رہے ہیں۔

"فَذٰلِکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ"

لفظ ربّ ایسا پیارا لفظ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی دعاؤں میں لفظ رب استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی جتنی دعائیں اور پکاریں ہیں، سب لفظ ربّ سے شروع ہوتی ہیں۔ خاصانِ خدا کی ہر مناجات ہر دعا میں ابتدائی لفظ رَبَّنَا یا رب آیا ہے۔ اگر ذکر کریں تو بہت طویل ہو جائے گا۔ خواہشمند اصحاب خود قرآن مجید کا مطالعہ کریں۔ تلاوت کلام کا ثواب اور مناجات و دعا کی لذت اور ربّ کی معرفت حاصل کریں۔

یوں تو ہر پیغمبر نے مناجات اور دعا کی ہے، مگر قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعائیں کثیر ہیں اور ہر دعا میں لفظ ربّ سے پکارا ہے۔ چنانچہ جب مصر سے فرعونیوں کے ڈر سے بھاگے ہیں، ڈرتے گھبراتے مصر سے ہجرت کی ہے، خداوند عالم نے

ان کی ہجرت اور دعا کا ذکر کیا ہے:

"فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفاً يَتَرَقَّبُ وَ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ".

یہی قرآن مجید کی آیت ہے۔ جو کربلا کے مسافر مولائے مظلومؑ نے مدینہ سے نکلتے وقت تلاوت فرمائی۔ ۲۸ رجب کی رات کا آخری حصہ تھا کہ علیؑ و بتولؑ کی اولاد نے اشکبار آنکھوں اور بیقرار دلوں سے مدینہ سے کوچ کیا۔

امام حسین علیہ السلام کی تیاری اور مسافرت کوئی خفیہ نہ تھی۔ کئی روز تیاری میں لگ گئے۔ مدینہ کے ہر شخص کو روانگی کا علم تھا۔ البتہ سفر رات اندھیرے میں کیا۔ عام طور کہا جاتا ہے کہ فرزند رسول کی زندگی میں شب عاشور سخت تھی کیونکہ اس رات میں آپؑ اپنے اہلبیتؑ و اصحاب کے ساتھ ایک لق ودق اور بے آب و گیاہ صحراء میں زغۂ اعداء میں گھرے ہوئے تھے۔ ہر چہار طرف سے دشمنوں کا ہجوم تھا۔ پیاس کا غلبہ تھا۔ راہیں مسدود تھیں۔ زندگی کی آخری رات خیال کی جاتی تھیں۔ مستورات سراسیمہ تھیں۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ مگر جس رات کی صبح کو بتولؑ کے بیٹے نے مدینہ سے سفر اختیار کیا، اس رات کی پریشانی، بے چینی اور گریہ و بکا کی صدائیں کچھ کم نہ تھیں۔

جن گھروں میں زندگی بسر کی ہو، جس شہر میں شہزادگی اور فرزندِ رسولؐ کی حیثیت سے زندگی گزاری ہو، جس شہر میں نانا، ماں اور بزرگوں کے روضے ہوں، اس کو چھوڑنا اور ہمیشہ کے لیے چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں۔ پھر مستقبل ہولناک نظر آرہا ہو، راستے پر خطر ہوں، دشمن کا ہر وقت خوف ہو۔ ان بیبیوں سے پوچھیے جو اپنے ہاتھوں سے گھروں کے دروازے بند کر کے تالے لگا رہی ہیں، کس دل سے گھروں سے باہر آئی ہوں گی؟ محلہ کی عورتیں ملنے آئی ہوں گی، کس طرح گلے لگ کر روئی ہوں گی؟

جناب زینبؑ و اُمّ کلثومؑ نے کس طرح نانا کے مزار اور ماں کی قبر، بھائی حسنؑ کی لحد سے وداع کیا ہوگا؟ پھر پر آشوب دور ہے، امن نہیں، چین نہیں، سفر خطرناک ہے، زندہ واپسی کا یقین نہیں، گرمی کا موسم ہے، چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں، وہ سفر کی رات کس طرح رنج و الم میں گزری ہوگی؟ یہ خوشی کا سفر تو نہیں تھا، مصیبت و غم کا سفر تھا، موت کا سفر تھا، آبادی کا نہیں، بربادی کا، بسنے کا نہیں، اُجڑنے کا، امن کا نہیں، خوف کا، راحت کا نہیں، رنج کا سفر، ہر منزل اور ہر موڑ پر خوف و خطر استقبال کرتے تھے۔

ہاں! مدینہ سے نکلے تو پردے محفوظ تھے، کیونکہ باپردہ محمل اپنے ساتھ تھے جو ہر منزل پر باعزت و احترام محملوں سے اتارتے اور سوار کرواتے۔ پانی کی ضرورت ہوتی تو مشکیں بھری ہمراہ تھیں۔ جوانانِ بنی ہاشم کے پہرہ میں زہراؑ جائیاں باپردہ عماریوں میں سفر کر رہی ہیں۔ بچوں سے دل بہلا رہی ہیں، جھولیاں آباد ہیں، اکبرؑ کی جوانی، قاسمؑ کا شباب، عباسؑ دلاور کی کمر، یہ

باعثِ راحت و سکون ہیں۔ کچھ گھبراہٹ ہوتی تو تسلیاں دیتے۔ اقرباء و ورثاء، جوانانِ بنی ہاشم ساتھ ہیں۔

جن عورتوں کے ساتھ اپنے مرد سفر میں ہوں، انہیں پریشانی اور خوف نہیں رہتا لیکن قربان جائیں سیدانیوں کی اس بیکسی اور اس غربت پر اور اس بیچارگی اور حسرت پر۔ جب کربلا سے شام کو چلیں، گودیں خالی ہو چکی ہیں، سہاگ اجڑ گئے، سہارے جاتے رہے، جھولے جل گئے، جھولوں میں سونے والے تہہ خاک سو گئے۔

بچوں کے سروں پر باپ کا سایہ نہ رہا، ماؤں کے سروں پر چادریں نہ رہیں، اب نہ پردے رہے نہ محمل رہے نہ وارث رہے۔ سفر طویل ہے، اجنبی ملک ہے، اپنا کوئی ساتھ نہیں، غیروں کے پہرے ہیں۔

جنابِ امامِ مظلومؑ کے اس سفرِ ہجرت کی جنابِ موسیٰ کی ہجرت کے ساتھ مثال دی جاتی ہے۔ لیکن مؤمنین! ان کی ہجرت اور مولائے مظلومؑ کی ہجرت میں بہت بڑا فرق ہے۔ بیشک جنابِ موسیٰ فرعونیوں کے خوف سے پیادہ بھاگے تھے۔ بے تحاشا دوڑے، جان کا خطرہ تھا۔ لیکن مدائن میں پہنچے تو سہارا مل گیا، خوف جاتا رہا، امن نصیب ہوا، چین سے رہنے لگے۔ لیکن مولائے مظلومؑ کے سفر کی ہر منزل درد و آشوب کی منزل تھی، ہر گھڑی دکھ کی گھڑی تھی۔ جوں جوں سفر بڑھتا جاتا، مصیبت و پریشانی بڑھتی جاتی۔

جنابِ موسیٰ وطن سے نکلے تھے تو اکیلے تھے، خالی ہاتھ نکلے تھے۔ لیکن جب واپس آئے تو عیال کے ساتھ آئے، پھر کنبہ ساتھ لے کر آئے۔ میرے مولاؑ پورے خاندان کو لے کر نکلے تھے، مگر واپس نہ آئے، نہ خود آئے، نہ اقرباء آئے۔ بنی ہاشم کے اٹھارہ فرد نہ آئے، ماؤں کے ساتھ بچے نہ آئے۔ گئی تھیں تو جھولیاں بچوں سے بھری ہوئی تھیں، آئیں تو گودیں خالی تھیں، سہاگ اجڑے ہوئے تھے، بھائی، بیٹے، شوہر شہید کروا کر آئیں، گھر بار لٹا کر آئیں۔

اٹھائیسویں رجب ۶۰ ھ کی رات ختم نہ ہوئی تھی کہ محلّہ بنی ہاشم سنسان ہو گیا کیونکہ گلیوں میں چلنے والے مرد نہ رہے، گھروں میں عورتیں نہ رہیں، آوازیں دینے والے بچے نہ رہے۔ پورا بھرا ہوا محلّہ خالی ہو گیا۔ گلیاں اُجاڑ ہیں، مسجد و منبر اداس ہیں۔ جنت البقیع سوگوار ہے۔ قبرِ رسولؐ بے چراغ ہے، کہ اس کا نورِ دیدہ صحرائے غربت میں گامزن ہے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق ہے، اسلئے کہ اس کا آفتابِ حقیقی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ منبرِ رسولؐ اشکبار ہے کہ اس کا صحیح جانشین رنج مسافرت میں ہے۔

ہر مسافر واپس آنے کی آس رکھتا ہے، مدینہ سے نکلتے وقت بچے ماؤں سے پوچھتے ہوں گے: ''اماں! ہم کب واپس آئیں گے؟'' مدینے کی عورتیں آئی ہوں گی اور انہوں نے پوچھا ہوگا: ''شہزادیاں! کب واپس آؤ گی؟'' لیکن درد ستائیاں کیا

جواب دیتی ہوں گی؟ تقدیر کیا سن رہی ہوگی؟ اور کیا کہہ رہی ہوگی؟

موسیٰ واپس آ گئے، یعقوبؑ کو یوسفؑ مل گیا، مگر آلِ محمدؐ کے بچھڑے ایسے بچھڑے کہ واپس وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ اُجڑے گھر آباد نہ ہو سکے اور بنی ہاشم کے اٹھارہ تارے یوں آسمانِ مدینہ سے ٹوٹے کہ زمینِ کربلا میں مدفون ہو کر رہ گئے۔

اَلا لَعنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی قَومِ الظّٰالِمِین

✿✿✿

سفیر حسینؑ شہید کوفہ

بنی ہاشم کا پہلا شہید

اٹھائیسویں رجب کو مدینہ سے ہجرت کی اور تین شعبان کو وارد مکہ معظمہ ہوئے۔ جب مکہ میں آئے تو آپؑ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے جو جناب موسیٰ کا مدین جانے کا حال بیان کرتی ہے۔

"فَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ".

"جب جناب موسیٰ مدین کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا عنقریب میرا رب مجھے سیدھے راستے کی رہنمائی فرمائے گا"۔

مکہ چونکہ حرم اور جائے امن ہے جہاں کسی جانور کا مارنا بھی جائز نہیں اس واسطے اُمت کے ستائے ہوئے شہزادے امام عالی مقام نے مکہ میں قیام فرمایا۔ آپؑ کوئی معمولی شخصیت نہ تھے۔ فرزندِ رسولؐ، امامِ زمانہ اور وارثِ دین تھے۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو صبح و شام اور شب و روز لوگ خدمتِ جنابؑ میں حاضر ہوتے۔ عبداللہ بن زبیر مکہ میں اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر میں تھے اور لوگوں سے بیعت لینے کا قصد رکھتے تھے۔ امامِ مظلوم مکہ میں پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے، نہ سلطنت قائم کرنے کا ارادہ تھا اور نہ فوجی طاقت بڑھانے اور اسلحہ جمع کرنے کی غرض تھی اور نہ لڑائی کا ارادہ تھا۔ اگر لڑنے کا ارادہ ہوتا تو ملائک اور جنوں کی پیشکش قبول فرما لیتے۔ یہ وہ طاقت تھی کہ جس کا مقابلہ تمام روئے زمین کے انسان مل کر بھی نہ کر سکتے۔

منقول ہے کہ مدینہ و مکہ کے درمیان، دورانِ سفر راستہ میں فرشتوں کے گروہ جنت کی اونٹنیوں پر سوار، ہاتھوں میں خنجر لئے خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے اور بعد سلام عرض کیا:

"يَا حُجَّةَ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ بَعْدَ جَدِّهٖ وَ اَبِيْهِ وَ اَخِيْهِ اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ اَمَدَّ جَدَّكَ بِنَافِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَدَّكَ بِنَا".

"اے اللہ کی مخلوق پر اللہ کی حجت! اپنے جدِ امجد اور اپنے باپ و برادر کے بعد خداوند عالم نے ہمارے ذریعے آپؑ کے جدِ امجدؐ کی بہت سی جگہوں پر امداد فرمائی، اب خدا ہمارے ذریعہ آپؑ کی مدد کرنا چاہتا ہے، کیا آپؑ ہماری مدد قبول فرمائیں گے؟"

امامِ عالی مقامؑ نے فرمایا:

"اَلموعدُ حضرتی و بُقعتیَ الّتی اَستشھدُ فِیھا وَ ھِیَ کَربَلا فَاِذَا وَرَدتُھا فأتُونِیْ".

"تمہاری اور میری وعدہ گاہ اور میرا مقامِ شہادت کربلا ہے۔ جب میں وہاں پہنچ جاؤں تو وہاں میرے پاس آجانا۔"

ملائکہ نے عرض کی:

"یَا حُجَّةَ اللّٰہِ مُرنَا نَسمَعُ وَ نُطِیعُ فَھَل تَخشٰی مِن عَدُوٍّ یَلقَاکَ فَنَکُونَ مَعَکَ".

"اے حجتِ خدا! ہمیں حکم دیجئے، ہم حکم مانیں گے۔ اگر دشمن سے خوف ہو تو ہم آپ کے ساتھ رہیں۔"

آپؑ نے فرمایا:

"سَبِیلَ لَھُم عَلَیَّ وَلَا یَلقُونِیْ بِکَرِیھَةٍ وَ اَصِلَ اِلیٰ بُقعَتِیْ".

"جب تک میں سرزمین کربلا تک نہ پہنچ جاؤں یہ لوگ مجھے کوئی اذیت نہیں پہنچا سکتے"۔

اس کے بعد مسلمان جنوں کے چند گروہ حاضر ہوئے اور بعد سلام عرض کی:

"یَا سَیِّدَنَا نَحنُ شِیعَتُکَ وَ اَنصَارُکَ فَمُرنَا بِاَمرِکَ بِمَا تَشَاءُ فَلَو اَمَرتَنَا بِقَتلِ کُلِّ عَدُوٍّکَ وَ اَنتَ بِمَکَانِکَ فَکَفَینَاکَ".

"اے ہمارے آقا! ہم آپؑ کے شیعہ اور مددگار ہیں، آپؑ جو حکم دیں ہم مانیں گے۔ اگر آپؑ ہمیں حکم دیں کہ آپ سارے دشمن تہہ تیغ کردیں تو آپؑ اپنی جگہ رہیں، ہم آپ کے تمام دشمنوں کا صفایا کردیں گے۔"

مولاؑ نے ان کو جزائے خیر کی دعا دی اور فرمایا کہ خدا نے قرآن نے جو میرے جدِ امجد پر نازل ہوا فرمایا ہے:

"یُدرِککُّمُ المَوتُ وَلَو کُنتُم فِی بُرُوجٍ مُشَیَّدَةٍ".

"موت تمہیں ہر حال میں قابو کرلے گی اگر تم مضبوط قلعوں میں بند ہو۔"

اس کے بعد فرمایا: "اگر میں یہیں رہ جاؤں تو پھر اس بدبخت مخلوق کا امتحان کیسے لیا جائے گا؟ اور کربلا میں میری قبر میں آرام کون کرے گا؟ جسے خدا نے اس روز سے میرے لئے منتخب کر رکھا ہے جس روز سے فرشِ زمین بچھایا ہے اور اسے ہمارے شیعوں کیلئے جائے پناہ اور دنیا و آخرت میں امن و امان کی جگہ قرار دیا ہے"۔

پھر فرمایا: "البتہ تم عاشور کے دن کربلا میں حاضر ہونا جس کے آخر میں میں شہید کردیا جاؤں گا اور میرے خاندان

میں سے کوئی ایسا شخص باقی نہ رہ جائے گا، جسے قتل کرنے کیلئے طلب کیا جائے اور میرا سر یزید ملعون کے پاس بھیجا جائے گا۔"

جنوں نے عرض کی: "اے خدا کے پیارے! اور محبوب خدا کے فرزند! اگر آپ کی اطاعت لازم اور مخالفت حرام نہ ہوتی تو ہم آپ کے تمام دشمنوں کو آپ کو اذیت پہنچانے سے پہلے ہلاک کر دیتے"۔

آپ نے فرمایا: "ہم آپ سے زیادہ ان دشمنوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن اس میں مصلحت ہے۔ جو ہلاک ہو وہ حجت اور دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے، وہ دلیل سے زندہ رہے"۔

جناب مسلم بن عقیل علیہم السلام کو لشکر جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ اُمورِ دین اور حفاظتِ شریعت کیلئے کوفہ روانہ کیا تھا، جس غرض سے مدینہ سے رخصت ہوئے۔ جناب [illegible] کے بھیجنے کے اسباب ہم نے تاریخ الشہید میں تفصیلا

ان اسباب کی تفصیل چاہے، وہاں ملاحظہ فرمائے۔:

"یَا عینُ جُودِی المسلم بن

بین الأعادیٔ لقتِیلِ لنصر خو

"اے آنکھ! کھل کر آنسو بہا! مسلم بن

بہترین شہید قتل کیا گیا۔"

کوفہ کے صحیح حالات کا جائزہ لینے اور پھ

علیہم السلام کا انتخاب کیا اور کوفہ والوں کو لکھا:

"اِنِّی بَاعِثٌ اِلَیْکُمْ اَخِیْ وَ ابنِ

الغرض جناب مسلمؑ آپؑ سے رخصت ہو کر

مسجد نبوی میں چند رکعت نماز پڑھی۔ جو افراد بنی ہاشم

۳

جناب مسلمؑ منازل سفر طے کرتے ہو۔

جناب مسلمؑ کے کوفہ آنے کی خبر شہر بھر میں مشہور ہو

بظاہر لوگوں کا اشتیاق شدید تھا۔ جب کافی مجمع ہو گیا ..

لوگوں نے بڑا اچھا اثر لیا اور بعض لوگ تو شدتِ تاثر اور فرطِ محبت سے رونے لگے اور اسی جوش وخروش کے عالم میں بعض افراد نے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار بھی کیا۔

چنانچہ عابس بن شبیب شاکری نے حمد وثنا خدا کے بعد مجمع عام میں اُٹھ کر کہا:

''میں دوسرے لوگوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ میں تو آپ کو صرف وہ بات بتاتا ہوں جس کا میں نے پکا ارادہ کر رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی قسم آپ جب بھی مجھے بلائیں گے تو میں لبیک کہتا ہوا حاضر ہو جاؤں گا اور آپ کے دشمنوں سے لڑوں گا، یہاں تک کہ آپ کے ہمراہ شمشیر زنی کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں پہنچ جاؤں اور اس سے میرا مقصد صرف خوشنودئ خدا حاصل کرنا ہے۔''

اس کے بعد جناب حبیب ابن مظاہر نے کھڑے ہو کر عابس کو داد دیتے ہوئے کہا: 'خدا تم پر رحم کرے، تم نے بہت مختصر اور عمدہ الفاظ میں اپنے دل کی بات بیان کی ہے'۔

پھر فرمایا: ''اس خدا کی قسم! جس کے بغیر کوئی معبود نہیں، میرا بھی یہی نظریہ ہے''۔

اس کے بعد عبداللہ بن سعید حنفی نے بھی ایسے ہی پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا۔ ان تقریروں کے بعد بیعت کا سلسلہ شروع ہوا اور چند ہی دنوں میں اٹھارہ ہزار کوفیوں نے جنابِ مسلمؑ کے ہاتھ پر حضرت امام حسین علیہ السلام کیلئے بیعت کی۔

جب جنابِ مسلمؑ نے اٹھارہ ہزار اور بروایت ۲۵ ہزار آدمیوں کے بیعت کرنے اور اشتیاقِ محبت کے جذبات دیکھے اور حالات اور فضا سازگار نظر آئی تو جنابِ سید الشہداؑ کی خدمت میں خط تحریر کیا جس کا مضمون تھا: ''بعد حمد وثناء، اے خدا کے پیشرو! کبھی میں اپنے اہل وعیال سے جھوٹ نہیں بولتا۔ تمام اہل کوفہ آپ کے ساتھ ہیں۔ اٹھارہ ہزار افراد نے میرے ہاتھ پر آپ کی بیعت کر لی ہے۔ یہ خط پڑھتے ہی آپ جلد تشریف لے آئیں۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔''

یہ خط جنابِ مسلمؑ عابس بن ابی شبیب شاکری اور قیس بن مسہر صیداوی کے ہاتھ روانہ کیا۔ حضرت مسلمؑ کی شہادت سے ۲۷ روز قبل کا یہ واقعہ ہے۔

عبید اللہ ابن زیاد کی کوفہ میں آمد

اہل کوفہ کا میلان دیکھ کر بنی امیہ کے ہوا خواہوں نے یزید کو خط لکھا کہ کوفہ کے موجود گورنر کو تبدیل کر کے کوئی طاقتور، سخت گیر اور جابر آدمی مقرر کرو۔ یزید نے نعمان بن بشیر کو معزول کر عبید اللہ ابن زیاد ملعون کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ عبید اللہ بن زیاد

بصرہ میں تھا۔ حکم نامہ پہنچتے ہی ۵۰۰ آدمیوں کے ہمراہ منازل سفر طے کرتا ہوا اور حالات کو مخفی رکھتا ہوا رات کے وقت کوفہ شہر میں داخل ہوا۔

ابن زیاد کے آنے کے بعد کوفہ کی فضا بدل گئی۔ لوگوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ پورے ۲۰ سال عبید اللہ اور اس کے باپ زیاد کی ظلم و جور کی چکی میں لوگ پس چکے تھے۔ عام لوگوں میں پریشانی اور خوف کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ابن زیاد نے صبح ہوتے ہی لوگوں کو کوفہ کی جامع مسجد میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو ابن زیاد بدنہاد نے لوگوں کو ڈرایا دھمکایا اور حکومت وقت کی اطاعت کرنے کی ترغیب دی۔ وہی حکومت کا ساتھ دینے والوں کو انعام و اکرام کا لالچ دیا اور مخالفت کرنے والوں کو سخت دھمکیاں دیں۔ اس نے جاسوس مقرر کیے جو حکومت کے مخالف لوگوں کی فہرستیں تیار کروائیں۔ اس تقریر سے لوگ بے حد خائف و ہراساں ہو گئے اور ان کے لیے کسی جگہ اکٹھا بیٹھ کر تبادلۂ خیال کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

اب تک جناب مسلمؑ مختارؒ کے گھر میں قیام فرما تھے۔ ابنِ زیاد کی اس سخت گیری اور ظلم و تشدد کا حال سن کر آپؑ ہانی بن عروہؓ کے گھر منتقل ہو گئے کیونکہ مختارؒ کے پاس رہنے کا ہر خاص و عام کو علم ہو چکا تھا۔

ابن زیاد نے خفیہ طریقوں اور جاسوسوں کے ذریعے ہانی کے گھر میں حضرت مسلمؑ کا پتہ لگا لیا اور ہانی کو گرفتار کر کے بہت تشدد کیا اور جناب مسلمؑ کو حاضرِ دربار کرنے پر بہت اصرار کیا۔ جنابِ ہانیؓ صاحب وجاہت و جلالت قدر تھے، قبیلہ مراد و مدحج کے سردار تھے۔ جب کسی مہم کے لیے نکلتے تو چار ہزار زرہ پوش سوار اور آٹھ ہزار پیادے ہمراہ ہوتے۔ جنابِ امیر المومنین علیہ السلام کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ محبِ اہلبیتؑ اور غیور جسور مومن تھے۔ کس طرح معزز مہمان اور سفیر حسین علیہ السلام کو ایک ظالم حکمران کے پیش کر دیتے۔ ضربِ تازیانہ سہتے رہے۔ بدن زخمی ہو گیا۔ قید خانے میں بھیج دیئے گئے۔ دروازے پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ جنابِ مختارؒ ابن زیاد کی قید میں تھے، اب جنابِ ہانیؓ بھی گرفتار ہو گئے۔

حالات یکسر بدل گئے۔ مخلص و باوفا مومن اسیرِ زنداں ہو چکے تھے۔ ہانیؓ کے گھر میں جو مومن خفیہ آتے، ہانیؓ کی گرفتاری پر وہ بھی روپوش ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ساتھیوں کی تعداد گھٹتی گئی۔

کوفیوں کی بیوفائی اور جنابِ مسلمؑ کی تنہائی

اب کوفہ بالکل بدل چکا تھا۔ اقبال نے منہ پھیر لیا اور ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں۔ مشتاقانِ زیارت منحرف ہو گئے۔ حلقہ یاران نے بیعت کا قلادہ توڑ دیا۔ سیم و زر کے سکوں نے لوگوں کے ضمیر خرید لئے اور جابر و ظالم حاکم کی تشدد آمیز دھمکیوں نے کوفیوں کو گھروں میں محبوس کر دیا۔ بیعت کرنے والوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کوفہ کی فضا اس قدر بدل گئی کہ مائیں اپنے بچوں

کے ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے جاتیں۔ بہنیں بھائیوں کو کھینچتیں۔

"بھائی! شام سے لشکر آرہا ہے، ابن زیاد قتل کردے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ واپس چلو لوگ کافی ہیں"۔

عورتیں اپنے شوہروں کو باہر نکلنے سے روکتیں۔ مرد اپنے بیٹوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر لے آتے۔

مومنین! اب فرزندِ عقیلؑ تنہا ہیں۔ آٹھ ذی الحجہ کو دامادِ علیؑ نے نمازِ مغرب پڑھی تو کل تیس آدمی ساتھ تھے اور جب مسجد کے دروازے سے نکلے تو دس آدمی ہمراہ رہ گئے تھے۔ بنی کندہ کے دروازے کا قصد کیا۔ جب دروازے سے برآمد ہوئے تو تنہا رہ گئے۔ مڑ کے دیکھا تو تنہائی نظر آئی۔ رات کا وقت، بیکسی کی حالت، تنہائی کا عالم، کہاں جائیں؟ کوئی راہ بتانے والا نہیں، کوئی پناہ دینے والا نہیں، کوئی مونس و غمگسار نہیں، عقیلؑ کا چاند مصیبت کے بادلوں میں گھر گیا ہے۔ پریشانی اور گھبراہٹ نے سفیرِ حسینؑ کے قدم روک دیئے ہیں۔ غربت برس رہی ہے۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ کوفہ کی گلیاں ہیں اور بے وطن پردیسی۔ گلیاں سنسان ہیں، دروازے بند ہیں، مدینے کا بلایا ہوا مہمان دائیں بائیں حسرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کوئی جائے پناہ نہیں ملتی۔

اسی اُداسی کے عالم میں چلتے چلتے ایک دروازے پر لڑکھڑاتے ہوئے قدم رک گئے۔ کیا دیکھا کہ خلافِ امید گھر کا دروازہ کھلا ہے اور ضعیفہ در پہ کھڑی اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی ہے۔ جنابِ مسلمؑ نے سلام دیا، ضعیفہ نے جواب دیا۔ امید بھری نگاہوں سے ضعیفہ (جس کا نام طوعہ تھا) سے پانی مانگا۔ "میں پیاسا ہوں۔ اے کنیزِ خدا! مجھے پانی پلا دے"۔

طوعہ نے پانی کا پیالا پیش کیا۔ یثرب کے پیاسے مسافر نے پانی پیا۔ مسلمؑ وہیں بیٹھ گئے۔ طوعہ پانی دے کر اندر چلی گئی۔

باہر آئی تو پیاسے مسافر کو دروازے پر بیٹھا دیکھ کر کہا: "اے عبدِ خدا! آپ نے پانی نہیں پیا؟" جواب دیا: "پی لیا ہے۔" طوعہ بولی: "تو آپ اپنے گھر چلے جائیں"۔

جنابِ مسلمؑ خاموش رہے۔ کوئی جواب ہوتا تو دیتے۔ طوعہ نے پھر فقرہ دُہرایا۔ پریشان حال مسافر پھر بھی خاموش رہا۔ بے آس اور بے سہارا، کیا جواب دیتا؟ سر جھکا لیا، حسرت کی نظر سے زمین کی طرف دیکھا۔ ضعیفہ کی آواز بلند ہوئی: "عبدِ خدا! اپنے بال بچوں کے پاس چلے جاؤ۔ خدا تمہیں عافیت دے، یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں اور نہ میں اجازت دیتی ہوں۔ حکومت کی کڑی نگرانی ہے"۔

عزادارو! جب مسلمؑ نے یہ الفاظ سنے، بیچارگی کے عالم میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بتایئے اب مسلمؑ سے زیادہ بھی کوئی غریب ہے؟ سردارِ کوفہ، امیر المومنینؑ کا داماد، یثرب کا مسافر، بلایا ہوا مہمان۔

"پہلے تو ہزاروں میزبان تھے، اب سب نے جواب دے دیا ہے۔ کہاں جاؤں؟ غرض مند ہوں۔ اگر آج رات آپ

مجھے ٹھہرنے دیں تو شاید آج کے دن کے بعد اس کا نیک بدلہ دوں گا"۔

طوعہ نے کہا: "اے بندۂ خدا! تو کون ہے اور کیا پریشانی ہے؟"

جواب دیا: "میں مسلمؑ بن عقیلؑ ہوں، مجھے اس قوم نے بلایا اور بلا کر دھوکہ دیا، آج میں پردیسی ہوں، کوئی ٹھکانہ نہیں رکھتا"۔

اس عورت نے کہا: "کیا آپ ہی مسلمؑ ہیں؟"

جواب دیا: "میں ہی مسلمؑ ہوں"۔

طوعہ نے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ جنابِ مسلمؑ گھر میں داخل ہوئے ایک کمرے میں ان کے لئے فرش بچھایا گیا اور رات کا کھانا پیش کیا۔ لیکن بیقرار مسافر کھانا نہ کھا سکا۔

اسی اثناء میں اس کا بیٹا، بلال نامی، گھر میں آیا اور اپنی ماں کا آنا جانا جو اس کمرے میں دیکھا، اس کی دریافت کی۔ پہلے تو ماں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ پھر بیٹے نے جب بار بار پوچھا تو ماں نے اس سے سخت قسمیں لیں کہ اس خبر کو ظاہر نہ کرے۔ اس وقت تو وہ لعین خاموش رہا۔

جنابِ مسلمؑ نے وہ رات جنابِ طوعہ کے گھر میں گریہ وزاری، عبادت و مناجات اور تلاوتِ قرآن میں گزاری۔ ادھر صبح سویرے اس کے بیٹے نے ابن زیاد کو جا کر بتا دیا کہ مسلمؑ تو میرے گھر میں ہے۔

جنابِ مسلمؑ کی رات، جس طرح گزری سو گزری، صبح کے وقت طوعہ نے وضو کیلئے پانی پیش کیا اور عرض کی:

"مولاؑ! میں نے دیکھا کہ ساری رات آپ سوئے نہیں"۔

جنابِ مسلمؑ نے فرمایا: "بے چین مسافر، زمانہ جس کا دشمن ہو، موت اس کا تعاقب کر رہی ہو، ظلم وجور کے بادل چھائے ہوئے ہوں، اسے کس طرح نیند آ سکتی ہے؟ رات کو تھوڑی دیر جب میں سویا تو عالمِ خواب میں اپنے چچا امیر المومنینؑ کو دیکھا کہ وہ مجھے فرما رہے ہیں کہ بیٹا! جلدی آ! ہم تیرے مشتاق ہیں۔ میں یہی سمجھا کہ زندگی کی آخری رات ہے"۔

جنابِ مسلمؑ نے وضو کیا اور صبح کی نماز پڑھی۔ ابھی دعا میں ہی مشغول تھے کہ باہر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اور لوگوں کا شور سنا۔ جنابِ مسلمؑ سمجھ گئے کہ یہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے ہیں۔ جلدی سے دعا ختم کی۔ زرہ پہنی، ہتھیار لئے اور اپنے آپ سے کہا:

"اے نفس! موت کی تیاری کر، جس سے فرار نہیں"۔

ضعیفہ نے کہا: "میرے سردار! میں کیا دیکھتی ہوں کہ آپ تو موت کی تیاری کر رہے ہیں"۔

فرمایا: "ہاں موت ضروری ہے۔ تُو نے نیکی اور بھلائی کا حق ادا کر دیا اور جناب رسولؐ کی شفاعت کی حقدار ہوگئی۔"

اسی اثناء میں تین سو سپاہیوں نے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ جناب مسلمؑ تلوار لے کر باہر نکلے اور ان کے حملے کا دفاع کرنے لگے۔ ابن زیاد کے فوجیوں اور جناب مسلمؑ میں لڑائی شروع ہوگئی۔

جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کی شجاعت

ایک طرف سینکڑوں مسلح افراد اور مقابلے میں تنہا مظلوم مسافر، ستایا ہوا مہمان، پریشان مجاہد، مگر شجاعت ہاشم کا ورثہ دار اس دلیری سے لڑا کہ اکتالیس اور بروایتے ایک سو اسی سواروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

باوجود اس بیکسی کے، طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک مرد کو ہاتھ سے پکڑتے اور مکان کی چھت پر پھینک دیتے۔ بنی ہاشم کا شیر تلوار کھینچ کر نعرہ تکبیر لگا کر جب دشمنوں پر حملہ کرتا تو بزدل فوج بھاگتی نظر آتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بھیڑ بکریوں میں شیر گھس آیا۔

محمد بن اشعث جو اس دستے کا سالار تھا، اپنے آدمیوں کو کٹتے دیکھ کر فوراً ابن زیاد سے کمک کا طالب ہوتا ہے۔ ابن زیاد کہلا بھیجتا ہے:

"ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ وَ عَدِمُوْکَ قَوْمُکَ".

تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے اور تیری قوم تجھے نیست نابود کرے، ایک مرد اتنا عظیم قتال کر رہا ہے؟ وہ پردیسی مسافر ہے، اس سے تو عاجز آگیا ہے؟ تو حسینؑ بن علیؑ سے کس طرح لڑ سکے گا؟

ابن اشعث نے لکھ بھیجا کہ تو کیا سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے کس کے مقابلے میں بھیجا ہے؟ کیا وہ کوفہ کا سبزی فروش ہے؟ وہ تو ایک بہادر جوان، شیر، دلیر، شجاعت کا پیکر ہے۔ بنی ہاشم کا مانا ہوا بہادر جرنیل ہے۔

پھر ابن زیاد نے مزید فوج بھیجی اور کہا کہ اسے امان کا فریب دے کر اس پر قابو پاؤ۔ چنانچہ اشعث نے جناب مسلمؑ کو امان کا وعدہ دے کر لڑائی رکوانا چاہی۔ لیکن جناب مسلمؑ نے ان کی جھوٹی امان پر بھروسہ نہ کیا اور جنگ جاری رکھی۔

لڑائی کا نقشہ یہ تھا کہ گلیاں خالی تھیں۔ سامنے آنے کی کوئی جرأت نہ کرتا تھا۔ کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر شیاطین پتھر برساتے اور عقیلؑ کا لال پتھروں کی برسات میں زخمی ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ آگ روشن کر کے ہاشمی جوان پر پھینک رہے تھے۔ اس لڑائی میں جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کا بالائی ہونٹ کٹ گیا، نچلے ہونٹ کو بھی زخم پہنچا اور اگلے دو دانت اکھڑ گئے۔

آخر سفیرِ حسینؑ تھک گئے اور ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس حالت میں بھی ظالم برابر اور پتھر مار رہے تھے اور جناب مسلم بن عقیلؑ کہہ رہے تھے کہ ظالمو! میں خاندانِ رسالت کا فرد ہوں تم اس طرح پتھر مار رہے ہو کہ جس طرح کفار کو مارے جاتے ہیں۔

ھاشمی شیر گرفتار ھو گیا

آخر کار پھر اصرار کر کے قسمیں کھا کر امان کا وعدہ دیا۔ ان کی قسموں اور امان کے وعدہ پر جنابِ مسلمؑ نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تلوار نیام میں ڈال دی اور اپنے آپ کو ان ظالموں کے سپرد کر دیا۔ فوج اشقیاء آپؑ کو ایک سواری پر سوار کر کے دارالامارہ لے چلی اور تلوار چھین لی۔ جنابِ مسلمؑ نے فرمایا کہ یہ تمہاری قسمیں کھانے کے بعد پہلی غداری اور پہلا دھوکہ ہے۔

جناب مسلم نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور گریہ فرمانے لگے۔ عبیداللہ بن عباس سلمی نے کہا:

''تم جیسا شخص جو ایسے کام کیلئے کھڑا ہو اور جب ایسے حالات پیش آئیں تو اسے رونا نہیں چاہئے''۔

جنابِ مسلمؑ نے فرمایا: ''نہ میں اپنی جان کیلئے رو رہا ہوں اور نہ قتل سے ڈرتا ہوں، میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ فرزندِ رسولؐ اور ان کے اہل وعیال اس طرف آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ کاش کوئی جا کر فرزندِ رسولؐ سے کہتا کہ مولاؑ کوفہ کا رخ نہ کیجئے گا، تیرا سفیر گرفتار ہو گیا ہے''۔

جب حضرت مسلمؑ بن عقیلؑ گرفتار ہو کر دارالامارہ میں پہنچے، چونکہ شدتِ پیاس اور زخموں کی کثرت سے نڈھال تھے، پانی طلب فرمایا۔ مسلم بن عمرو باہلی نے گستاخانہ جواب دیا: ''دیکھتے ہو کیسا ٹھنڈا پانی ہے! لیکن بخدا تم اس کا ایک قطرہ بھی نہیں چکھ سکتے''۔

یہ کیفیت دیکھ کے عمرو بن حریث نے اپنے غلام کو حکم دیا اور وہ پانی کی صراحی اُٹھا کر لایا، جس پر رومال ڈالا ہوا تھا، پیالہ بھی ساتھ تھا۔ اس نے پیالہ بھر کر جنابِ مسلمؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ جونہی آپؑ نے پینے کا ارادہ کیا، دہن سے خون جاری تھا، پیالہ خون سے رنگین ہو گیا۔ جنابؑ نے وہ پیالہ اُنڈیل دیا، دوسرا پیالہ پینا چاہا، پھر بھی ایسی ہی ہوا، اس بار خون کے ساتھ دو دانت بھی نکل کر پیالے میں گر گئے۔

یہ حال دیکھ کر جنابِ مسلمؑ نے فرمایا: ''ہر حال میں خدا کی حمد ہے، اب زندگی میں پانی میرے نصیب میں نہیں رہا'' اور پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا۔

فرزندِ عقیلؑ دربارِ ابنِ زیاد میں

اب تک یہ اسیر کوفہ دارالامارہ کے باہر گرفتار کھڑے تھے، اب اندر لانے کا حکم ہوا۔ ہاشمی غیرت کے پیکر نے ابن زیاد بدنہاد کو سلام نہ کیا۔ ساتھ والے سپاہیوں نے کہا:

''آپ امیر کو سلام کیوں نہیں کرتے؟'' ہاشمی نے جواب دیا:

''مَا لِیْ اَمِیْرٌ سِوَی الْحُسَیْنِ''۔

''سوائے فرزندِ رسولؐ حسینؑ کے، میرا کوئی امیر نہیں''۔

دربارِ ابن زیاد لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا ہے۔ دارالامارہ کے آس پاس خلقِ خدا جمع ہے۔ بنوہاشم کا پہلا مجاہد گرفتار ہو کر دربار میں پہنچتا ہے۔ جس شہر میں امیرالمومنینؑ کی حکومت تھی، جس شہر کے علیؑ سردار تھے، اسی شہر میں اس سردار کا داماد کڑیوں میں جکڑا، ایک مجرم کی حیثیت سے ابن زیاد کے روبرو پیش ہوتا ہے۔

چہرہ لہولہان ہے، بدن زخموں سے چور ہے، اہل عیال سے دور ہے۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ اب مسلمؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ کوئی کہتا ہے: ''دمشق میں یزید کے پاس بھیجا جائے گا۔'' کوئی کہتا ہے: ''یہیں دربار میں قتل کیا جائے گا۔'' کوئی کہتا ہے: ''یزید کو لکھا جائے گا، وہاں سے حکم آنے تک زندان میں قید رہے گا۔''

اسی اثناء میں حاکمِ کوفہ کی طرف سے سزائے موت کا امر صادر ہوتا ہے۔ جنابِ مسلم بن عقیل علیہم السلام نے کہا: ''اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو اتنی مہلت دے کہ میں کچھ وصیتیں کرلوں''۔

دربار میں عمر بن سعد بیٹھا ہوا تھا۔ جنابِ مسلمؑ نے اس کو بلایا اور علیحدہ لے گئے جہاں ابن زیادہ بھی ان کو دیکھتا تھا اور فرمایا:

1۔ جب سے میں کوفہ وارد ہوا ہوں، میں سات سو درہم کا مقروض ہو چکا ہوں۔ میری زرہ اور تلوار بیچ کر میرا قرضہ ادا کر دینا۔

2۔ جب میں قتل ہو جاؤں تو میری لاش ابن زیاد سے لے کر دفن کر دینا۔

3۔ امام حسین علیہ السلام کی طرف کوئی آدمی بھیجنا جو اُن کو کوفہ آنے سے روکے کیونکہ جب میں کوفہ آیا تھا تو ان کا استقبال اور سلوک دیکھ کر میں نے امامؑ کو خط لکھا تھا کہ مولا اہلِ کوفہ آپ کے بیحد مشتاق ہیں، جلد کوفہ تشریف لے آئیں۔ میرے لکھنے

کے بعد وہ کوفہ آ رہے ہوں گے جبکہ ان کا آنا مناسب نہیں۔ان کے ساتھ چھوٹے بچے اور اہلِ پردہ مستورات ہیں۔کوفہ کی فضا بدل چکی ہے۔ان کو روک دیں۔مولاؑ کوفہ ہرگز نہ آئیں۔

عمر بن سعد نے کمینگی کا ثبوت دیتے ہوئے وصیتیں بتا دیں۔اس کے بعد جناب مسلمؑ اور ابن زیاد میں کچھ سلسلہ کلام جاری رہا۔سوال و جواب ہوتے رہے۔جناب مسلمؑ کے حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ جوابات سے ابن زیاد کو مزید سوال و جواب کی تاب نہ رہی۔ایک ظالم کو حکم دیا کہ دارالامارہ کی چھت پر لے جا کر شہید کر دیا جائے۔

عزادارو! بنی ہاشم کے پہلے شہید کی یہ نرالی موت ہے۔زنجیروں میں گرفتار مسلم کو محل کے چھت پر لے جایا گیا۔اس وقت سفیرِ حسینؑ کی زبان پر تسبیح و تکبیر اور استغفار و صلوٰۃ جاری تھی اور یہ بھی کہتے جاتے تھے:

''اَللّٰهُمَّ احْكُمْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمٍ غَرُّوْنَا وَ كَذَّبُوْنَا وَ خَذَلُوْنَا''.

''خدایا! ہمارے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کر! جس نے ہمیں دھوکہ دیا اور جھٹلایا اور کوئی مدد نہ کی۔''

زخمی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ سر بند سے قلم کر دیا گیا اور زخمی بدن محل کی بلندی سے فرشِ زمین پر گرایا گیا۔بدن کا کوئی جوڑ سلامت نہ رہا۔عربی شاعر نے جناب مسلمؑ کی موت پر مرثیہ لکھا ہے۔

بَكتك وَمَا يَاابْنَ عَمَّ الحسين

مَدامعُ شيعتك السَّافِحة

ولا بِرَحت هَا طِلاتُ الغمام

تُحيّكَ غَاريةً رائحة

''اے حسینؑ کے چچازاد! تجھ پر تیرے شیعہ خون کے آنسو روئیں! اور ہمیشہ صبح و شام کے بادل موسلا دھار بارش بطور ہدیہ پیش کریں''۔

لِأنّكَ لَم تروَمن شربة

ثنايَاكَ فيها غَرَت طائحة

أتقضِي ولم تبككَ الباكيات

أمالك فِي المصر من نائحة

''کیونکہ آپؑ کے اگلے دانت کٹ گئے، پانی کا پیالہ خون آمیز ہو گیا، آپؑ پانی نہ پی سکے، آپؑ پیاسے رخصت ہو

گئے۔ ارمان ہے کہ آپ پردیس میں مارے گئے اور آپؑ کی لاش پر کوئی گریہ نہ کر سکا۔ کیا کوفہ کے بھرے شہر میں کوئی نوحہ کرنے والی نہ تھی؟

رَمَوکَ مِنَ القَصرِ اذوثقوک
فھل سَلِمت فیکَ من جارحة
وبالحبل فی السُّوق جرّا سُحِبتَ
الستَ امیرَھُم البارحة

"قربان جاؤں آپ کو باندھ کر محل کے اوپر سے فرشِ زمین پر گرایا گیا۔ آپ کا کوئی عضو سلامت رہ گیا؟ آپ کی لاش کو کوفہ کے بازار میں پھرایا گیا۔ اس سے پہلے آپ کو امیر نہیں مان لیا گیا تھا؟"

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

قصرُ الامارةِ لا بنیتَ وَ لَیتَما
نَسَفتکَ غاشِیَةٌ فَعُدتَ مَھِیلاً

"ظالم حکومت کے محل! تیری بنیاد نہ پڑتی اور تجھے حوادث گرا کر ایک ٹیلہ بنا دیتے۔"

و یَعند ماسَحبُوہُ فی اسرافھم
سَحبوا عَلیّ ابنُ الحُسَینِ عَلیلاً

"جناب مسلم تیری (دارالامارہ) بلندی سے منہ کے بل فرشِ زمیں پہ گرائے گئے، اسی طرح جنابِ مظلومِ امام سیدالشہدا ؑ زخمی ہو کر رخسار کے بل خاک کربلا پر گھوڑے سے گرے۔ جب آپؑ کو کوفہ کے بازاروں میں تشہیر و توہین کے لیے پھرایا تو جنابِ سیدِ سجادؑ کو قیدی بنا کے اسی کوفہ کے بازاروں میں تشہیر کیا گیا۔"

فرق صرف اتنا ہے کہ آپؑ کے ساتھ جنابِ ہانی بن عروہ تھے۔ اور سیدِ سجادؑ کے ہمراہ ان کی پھوپھیاں، مائیں اور بہنیں تھیں۔

جنابِ ھانی بن عروہ کی شھادت

فان کُنت فا تدرِینَ مَاالموتُ فَانظُری
اِلی ھانی فی السُّوقِ وابن عقیل

''اگر تمہیں پتہ نہیں کہ موت کیا چیز ہے تو جناب ہانی و مسلم بن عقیل علیہم السلام کی طرف بازار میں نظر کرو''۔

الی بطل قد هشّم السّیف وَجهه
وَاٰخر یهوىٰ مِنْ طِماءٍ قتیل

''دیکھ! ایک بہادر دلیر کو! تلوار نے جس کی ہڈیاں توڑ دی تھیں اور دوسرے شہید کو قتل کرنے کے بعد بلندی سے گرایا گیا ہے۔''

اَصٰابَهُمَا فرخُ البغيِ فَاَصْبَحا
اَحادِيثُ مَنْ يسری بِكُلِّ سَبيل

''ایک فاحشہ کے فرزند نے ان کو بے دردی سے قتل کیا اور اب ان کی موت کا افسانہ ہر راہ چلتے مسافر کی زبان پر ہے''۔

تری جسداً قد غیر الموت لونه
ونَضَحَ دَمٍ قَدْ سَالَ كُلَّ مَسِيْل

''تو دیکھے گا ایسے جسم کو کہ موت نے اس کا رنگ بدل دیا ہے اور اس بدن پر خون کی دھاریں بہتی رہیں۔''

جناب ہانی بن عروہ اشراف کوفہ اور بزرگانِ شیعہ میں سے تھے۔ قبیلہ بنی مراء کے سردار تھے۔ روایت کی گئی ہے کہ جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا شرف بھی حاصل کیا۔ جنگِ جمل میں امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ۹۸ سال زندگی بسر کی۔ سعادت مند اور صالح تھے۔

جب امام حسین علیہ السلام کو مسلم اور ہانی علیہما السلام کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے ''**اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ**'' پڑھا اور کئی مرتبہ ''**رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمَا**'' فرمایا۔ جب لوگوں کے سامنے رقعہ نکالا اور اسے پڑھ کر سنایا تو بیان فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَمَّا بَعْد فقد اتانا خبر نظيعٌ قتل مسلم بن عقيل و هانی بن عروة و عبداللّٰه بن يقطر ثمَّ دعا عليه السلام لهم بقول اللّٰهم اجعل لنا و لشيعتنا منزلاً كريماً و جمع بيننا و بينهُمْ فی ستقرِ رحْمَتِكَ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شیءٍ قدير''.

"بعد حمد وصلوٰۃ کہ ہمارے پاس ایک دردناک خبر آئی ہے۔ مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن یقطر شہید کر دیئے گئے ہیں" اور پھر ان کیلئے یہ دعا فرمائی:

"اے اللہ! ہمارے اور ہمارے شیعوں کے واسطے کریم منزل بنا اور ان کو ہمارے ساتھ اپنی رحمت کی قرارگاہ میں جمع کر۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

جناب ہانی کے شرف وفضل اور بلند رتبے میں یہی بات کافی ہے کہ انہوں نے جناب مسلمؑ کو اپنے گھر میں پناہ دی اور اپنی مدد ان کیلئے پیش کی۔ آدمی اور ہتھیار ان کیلئے مہیا کئے اور ابن زیاد کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ ظلم وتشدد اور عذاب زندان منظور کر لیا لیکن اپنے مہمان کو ایک ظالم کے سپرد کرنا گوارا نہ کیا۔ بے شک جناب ہانی شہداء میں سے ہیں۔

قبل ازیں جناب ہانی کی گرفتاری اور دارالامارہ کے زنداں میں ان کی قید بیان کی جا چکی ہے۔

جب ہانی پر ابن زیاد نے دباؤ ڈالا کہ مسلمؑ کو پیش کرو ورنہ تیری گردن ماردی جائے گی۔ اس وقت جناب ہانی نے جواب دیا:

"اور پھر کثرت سے تلواریں تیرے آس پاس چمکیں گی"۔

ابن زیاد نے کہا: "تو مجھے تلواروں سے ڈراتا ہے؟ میرے قریب ہو!"

جب قریب ہو گئے تو ابن زیاد نے ان چہرۂ اقدس پر اسقدر چھڑی کی ضربیں لگائیں کہ ان کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی، پیشانی اور رخسار زخمی ہو گئے، چہرہ لہولہان ہو گیا، کپڑے خون سے تر ہو گئے اور پیشانی اور رخساروں کا گوشت ان کی ریش پر گرنے لگا۔ چھڑی ٹوٹ گئی۔ جناب ہانی نے ایک سپاہی کے قبضہ تلوار پر ہاتھ مارا۔

پس ابن زیاد چلایا اور کہا: "ارے جلدی پکڑ لو!" لوگوں نے آپؑ کو پکڑا اور کھینچ کر کمرے میں بند کر دیا۔ عمر ابن حجاج کو خبر پہنچی کہ ہانی قتل ہو گئے ہیں۔ عمر بن حجاج کی عزیزہ ہانی کی زوجہ تھیں۔ اس نے مذحج قبیلے کے لوگ اکٹھے کئے اور ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کر لیا اور عمر ابن حجاج نے پکار کر کہا: "یہ مذحج کے سوار اور سردار ہیں اور ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ہمارا ساتھی ہانی قتل کر دیا گیا ہے"۔

جب عبیداللہ بن زیاد کو ان کا اجتماع اور باتیں معلوم ہوئیں تو اس نے فوراً قاضی شریح کو بلایا اور حکم دیا کہ تو ہانیؓ کے پاس جا، اسے دیکھ اور قوم کو اس کی صحت وسلامتی کی خبر دے۔ قاضی شریح نے محل پر چڑھ کر ہانیؓ کے قبیلے کو اطلاع دی کہ ہانیؓ زندہ ہیں اور صحیح وسلامت ہیں۔

قاضی شریح نے نہایت غلط بیانی سے کام لیا اور حکومتِ وقت کی خوشامد، چاپلوسی میں ہانیؓ کے صحیح حالات نہ بتائے۔ جس طرح کہ ہانیؓ کے قبیلے کے ہزاروں افراد مسلّح ہو کر آئے تھے اور بھرے ہوئے شیر طرح حملہ کرنے پر تیار تھے، اگر قاضی شریح جھوٹ نہ بولتا تو دارالامارہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور سپاہ ابن زیاد گاجر مولی کی طرح کٹتے نظر آتے۔ کوفہ کی گلیاں خون سے لالہ زار بن جاتیں اور واقعہ کربلا کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ نہ ابن زیاد رہتا نہ اس کی ظالم فوج۔ کوفہ مسمار ہو جاتا اور آلِ محمدؐ کو یہ دکھ نہ دیکھنے پڑتے۔ قاضی شریح کی بددیانتی اور کذب بیانی سے ہانیؓ کی قوم متفرق ہوگئی۔ ابن زیاد اور اس کا محل بچ گیا۔

جنابِ ہانیؓ امیر مسلمؑ کی شہادت تک زندان میں رہے اور ان کی شہادت کے بعد ابن زیاد نے حکم دیا کہ ہانیؓ کو بھرے بازار میں لے جا کر قتل کر دو۔ پس ہانیؓ کو اس جگہ لے گئے جہاں بھیڑ بکریاں فروخت جاتی تھیں۔ جنابِ ہانیؓ کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ یہی کہتے جا رہے تھے: "**وَامذحجاہ**" "میرا قبیلہ مذحج! آج کہاں ہو؟" اگر دس آدمی بھی قبیلہ مذحج کے آ جاتے تو مجھے چھڑا کر لے جاتے۔ اب کوئی مددگار نہیں ہے۔ اپنا ہاتھ کھینچا اور رسیوں سے جدا کر لیا۔ پھر فرمایا: "مجھے کوئی لاٹھی دے دو، کیا کوئی چھری نہیں؟ کیا کوئی پتھر نہیں؟ کوئی ہڈی نہیں؟"

باوجود ضعیفی کے شجاعت اور رعب وجلال کا یہ عالم تھا کہ سپاہی دور ہو گئے۔ سب نے مل کر انہیں پکڑا اور مضبوطی سے انؓ کے ہاتھ باندھے اور ہانیؓ سے کہا: "اپنی گردن دراز کر"۔

جنابِ ہانیؓ ان کے قابو میں نہ آئے۔ عبیداللہ کا ایک ترکی غلام تھا جسے رشید کہتے تھے۔ اس نے بندھے ہوئے ضعیف اور مظلوم ہانیؓ پر وار کیا۔ لیکن یہ وار بے اثر گیا۔ جنابِ ہانیؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"الی اللہ المعاد اللّٰھمّ الی رحمتک رضوانک"۔

پھر اس لعین نے دوسرا وار کیا۔ جنابِ ہانیؓ کا سر کٹ گیا۔ عبداللہ بن زیاد نے جنابِ مسلمؑ اور ہانیؓ علیہم السلام کے سروں کو دمشق بھیج دیا اور یزید ملعون نے دونوں سروں کو دمشق کے ایک بازار میں لٹکا دیا۔

پھر ابن زیاد ملعون نے جنابِ مسلم اور ہانی کے پیروں میں رسیاں باندھیں اور کوفہ کے بازاروں میں ان دونوں شہداء کی لاشوں کو پھرایا گیا۔

جب بنی مذحج کو ان کے قتل اور لاش کی بے حرمتی کی خبر پہنچی تو وہ ہتھیار لگا کر، گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے اور لڑائی کے بعد مسلمؑ اور ہانیؓ کی لاشوں کو ان سے لے لیا اور غسل اور کفن کے بعد دفن کر دیا۔

یتیمانِ مسلمؑ

جناب مسلم بن عقیل علیہم السلام کے دو شہزادے کوفہ میں نہایت بے دردی اور بے رحمی سے شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کا دردناک واقعہ کتب تاریخ و مقاتل میں مذکور ہے۔ زندان میں قید ہونا اور حارث کے ہاتھوں فرات کے کنارے شہید ہونا۔ باتفاق مورخین منقول ہے۔ لیکن کس طرح گرفتار ہوئے اور کس طرح ابن زیاد کے قبضے میں آئے، اس میں اختلاف ہے۔

تاریخ اعثم کوفی اور ناسخ التواریخ وغیرہ میں مکتوب ہے کہ مکہ سے جناب مسلم بن عقیل علیہم السلام کی روانگی کے وقت یہ کمسن شہزادے باپ کے ہمراہ تھے اور والد بزرگوار کے ساتھ وارد کوفہ ہوئے۔

شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے عمالی میں اور دیگر مورخین نے نقل کیا ہے کہ بعد شہادتِ حسین علیہ السلام جب خیام کو آگ لگائی گئی اور اہلبیت کے بچے گھبرا کر صحراء میں نکل گئے، مائیں اپنا پردہ بچاتے ہوئے جنگل میں دوڑیں، سہارا تلاش کرتی تھیں، مگر منہ چھپانے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ مائیں بچوں سے غافل اور بچے ماؤں سے غافل۔ بے تحاشا صحراء کی جانب بھاگے۔ آخر یہ دونوں کمسن صاحبزادے لشکرِ ابن زیاد کے سردار کے ہاتھ میں آئے جس نے اسیر کر کے کوفہ میں ابن زیاد کے پاس پہنچا دیا۔

ابن زیاد نے داروغہ قید خانہ کو بلایا۔ ان دونوں بچوں کو اس کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ انہیں قید خانہ میں رکھنا۔ نہ ٹھنڈا پانی دینا نہ اچھی غذا اور نہ ہی ان پر رحم کرنا۔

ناسخ التواریخ کے مطابق یہ دونوں بچے باپ کے ہمراہ کوفہ میں آئے۔ جب جناب ہانیؓ، میزبانِ جنابِ مسلمؑ گرفتار ہو گئے اور جنابِ مسلمؑ جنابِ ہانیؓ کا گھر چھوڑ دیا تو اپنے دونوں بچوں کو قاضی شریح کے سپرد کر دیا۔ یہ دونوں صاحبزادے قاضی شریح کے گھر میں رہے۔ جب حضرت مسلمؑ شہید ہو گئے اور جنابِ ہانیؓ بھی مرتبہ شہادت پا گئے، عبیداللہ بن زیادہ کو خبر مل چکی تھی کہ مسلمؑ کے ہمراہ ان کے صاحبزادے بھی تھے۔ اس ملعون نے صاحبزادوں کی خبر دینے کا اعلان کروایا۔

قاضی شریح نے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ ان بچوں کو اس قافلے ہمراہ کر دے جو مدینہ جانے والا ہو۔ قاضی کے بیٹے، جس کا نام اسد تھا، نے ان بچوں کو رات کے وقت کوفہ سے باہر نکالا مگر قافلہ پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔ بہر حال وہ بچے رات بھر پھرتے رہے لیکن راہ نہ چل سکے اور کوفہ سے باہر سفر نہ کر سکے۔ آس پاس ہی رہے۔ کوفہ کے کچھ آدمیوں نے انہیں ابن زیاد کے پاس پہنچا دیا اور ابن زیاد نے قید کر دیا اور داروغۂ زندان کو سختی کرنے کا حکم دیا۔

بہر حال ہر دو روایات کے مطابق یہ کمسن یتیم شہزادے وطن سے مجبور و محزون و رنجوار، ماں باپ سے دور، اپنے نانا کے

دارالخلافہ کوفہ میں محبوسِ زندان ہیں۔ داروغہ ابن زیاد کے حکم کے مطابق سختی کرتا ہے۔ صرف ایک کوزہ پانی اور آٹھویں پہر دو روٹیاں ان یتیموں کو پیش کرتا ہے۔ قید کی مدّت طویل ہوتی گئی اور بچے ماں، باپ، عزیزوں سے جدائی، وطن سے فراق کے صدمہ میں شب و روز مصروف گریہ و بکا رہتے۔ مدینہ کی طرف رخ کر کے کبھی جدّ امجد کو پکارتے اور کبھی اماں اماں کر کے روتے رہتے۔ کبھی ماموں حسینؑ کو کبھی ماموں عباسؑ کو یاد کرتے۔

پردیس میں طاقتور جوان بھی کمزور ہو جاتا ہے، یہ تو پھر کمسن بچے تھے۔ پہلا اتفاق تھا کہ گھر سے نکلے اور یہ ایسا سوءِ اتفاق تھا کہ پھر گھر جانا، ماں کو ملنا، عزیزوں کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پردیس اور مسافرت بھی ایک ہے اور قید ایک مزید مصیبت۔ شہزادوں کا دستور تھا کہ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سوتے۔ جب چھوٹا شہزادہ بیقرار ہو جاتا اور غمگین ہو کر ماں کو یاد کرتا تو بڑا شہزادہ تسلیاں اور دلاسے دیتا۔ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا۔

ایک دن شہزادوں نے یہ مشورہ کیا کہ کب تک قید کی صعوبتیں اور زندان کی گرمی برداشت کریں گے، داروغہ کو اپنے نسب اور جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ قرابت کا ذکر کر دیں۔ شاید داروغہ ہمارے ساتھ کچھ رحم دِلانہ سلوک کرے اور ہم اس تنگی سے نجات پا جائیں۔

حسبِ معمول داروغہ، جس کا نام مشکور بیان کیا جاتا ہے، شام کے وقت دو روٹیاں اور کوزہ پانی کا لایا اور شہزادوں کو دیا۔ چھوٹے شہزادے جنابِ ابراہیم نے گلوگیر آواز میں مشکور سے کہا:

"یَا شیخ اَتعرفُ محمّدَنِ الْمُصطفیٰ".

"کیا تو محمد مصطفیٰؐ کو جانتا ہے؟"

اُس نے کہا: "کیوں نہیں پہچانتا، وہ تو میرے نبیؐ ہیں، میں ان ہی کا تو کلمہ پڑھتا ہوں"۔

پھر شہزادے نے پوچھا:

"اَفتَعرِفُ جعفرَبنَ ابیطالبؑ".

"کیا تو جنابِ جعفر کو پہچانتا ہے؟"

داروغہ نے کہا: "ہاں! پہچانتا ہوں۔ خدا نے ان کو دو پر بازوؤں کے بدلے عطا فرمائے ہیں جن کے ساتھ وہ جنت میں ملائک کے ساتھ پرواز کرتے ہیں"۔

بعد ازاں شہزادے نے دریافت کیا:

"اَفَتَعْرِفُ علی بن ابیطالبؑ".

"کیا تو علی بن ابیطالب علیہ السلام کو جانتا ہے؟"

کہا: "کیوں نہیں! وہ ہمارے پیغمبرؐ کے بھائی ہیں، ان کے وصی اور میرے امامؑ ہیں"۔

اس کے بعد شہزادوں کے آنسو ابل پڑے کہا: "شیخ جس پیغمبرؐ کا تو کلمہ پڑھتا ہے، ہم اسؐ کے ہی اہل بیتؑ ہیں۔ جس علیؑ کو تو امام مانتا ہے ہم اسی علیؑ کے نواسے ہیں، ہم مسلمؑ بن عقیلؑ کے شہزادے ہیں۔ غریب الوطن، یتیم سید ہیں۔ مشکور! تو بھی صاحب اولاد ہوگا! تیرے دل میں اولاد کی محبت ہوگی، تو دروازے سے ہم کو کھانا اور پانی پہنچاتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے تو زندان میں داخل نہیں ہوتا"۔

"آخر ہم بھی کسی کی اولاد ہیں۔ ہم بھی کی ماں کے لخت جگر اور کسی باپ کے نور نظر ہیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے، تیرے زندان میں اسیر جفا ہیں۔ کسی یتیم اور پردیسی پر اتنی سختی جائز ہے؟ جتنی تو نے اولاد رسولؐ پر روا رکھی ہے۔ یتیم پر رو رحم کرنے کا حکم ہے۔ تو ستم کرتا ہے؟ ہم آل محمد علیہم السلام یتیم ہیں اور اہل کوفہ کے بلائے ہوئے مہمان کے فرزند ہیں"۔

داروغہ زندان نے جب یتیم شہزادوں کی فریاد سنی، اندرونی طور پر وہ محبّ خاندانِ رسولؐ تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ قیدی جناب مسلمؑ کے یتیم اور جناب علی علیہ السلام کے نواسے ہیں۔ اُس کا رنگ بدل گیا۔ شہزادوں کے قدموں پر گر پڑا، قدموں کے بوسے لئے، آنکھیں ملیں، ہاتھ جوڑ کر گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگی، بہت رویا اور کہا: "آقا زادو! مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ فرزندانِ جناب مسلمؑ ہیں، حسینؑ کے بھانجے اور علیؑ کے نواسے ہیں"۔

"شہزادو! یہ زندان کا دروازہ کھلا ہے، جس طرف چاہیں آپ نکل جائیں، میرا ضمیر مجھے کوس رہا ہے، میری ایمانی غیرت مجھے ملامت کر رہی ہے۔ آپ آزاد ہیں، آپ باہر چلے جائیں۔ آپ کو رہا کرنے میں ابن زیاد کی سختیوں کو میں کھلے دل سے قبول کرتا ہوں اور مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے منظور کروں گا۔ میری جان آپ کی حفاظت کیلئے قربان ہو جائے تو میرے لئے سعادت ہے۔ خدا مجھے توفیق نہ دے کہ سادات کے یتیموں کے ہاتھوں میں رسیاں باندھوں اور اہل بیتؑ رسولؐ کے بچوں کا داروغہ زندان بنوں"۔

معصوم بچے تو زندان سے آزاد ہو کر چلے گئے، رات بھر پھرتے رہے، مدینہ کا راستہ نہ پایا۔ معصوم شہزادے سفر سے نا آشنا تھے، نہ راستہ چلنے کے عادی تھے۔ رات بھر چلتے رہے مگر کوفہ سے باہر نہ جا سکے۔ دن کو سفر خطرے سے خالی نہ تھا، اسی خوف سے دن کو سفر نہ کر سکے اور ایک باغ میں چھپنے میں مجبور ہو گئے۔ دن کے وقت چھپ رہے۔

بنا بر روایت ناسخ التواریخ، ایک باغ میں چھپ رہے جس میں ایک تالاب تھا۔ کوفہ کی ایک کنیز عورت پانی بھرنے گئی تو صاف پانی میں دو حسین وجمیل صورتیں نظر آئیں۔ ننھے شہزادوں کے نورانی چہروں کا عکس تالاب کا شفاف پانی لے رہا تھا۔ عورتیں عموماً نرم دل ہوتی ہیں، جب پردیسی بچے اور بے وارث یتیم انہیں نظر آتے ہیں تو ان کی خستہ حالی پر انہیں رحم آجاتا ہے اور ہر ممکن مدد کرتی ہیں۔

چنانچہ جب اس کنیز نے ان معصوم شہزادوں کو دیکھا تو نہایت نرمی کے ساتھ ان سے حالات دریافت کیے۔ معصوم شہزادوں نے کنیز کے سامنے اپنی کیفیت بیان کر دی۔ اس عورت نے کہا: ''میری مالکہ خاندانِ رسالت کے ساتھ بہت محبت رکھتی ہے۔ امید ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کرے گی اور تم غریب الوطن مظلوموں کو پناہ دے گی۔''

شہزادے اس کنیز کے دلاسہ دینے پر اس کے ساتھ اس کی مالکہ کے گھر میں آئے۔ کنیز نے ان یتیموں کی سرگزشت بیان کی۔ اس صاحب خانہ عورت نے بچوں کو گلے لگایا اور ان کے بوسے لیے۔ ان کی عزت وتکریم کی۔ کھانا پیش کیا اور اپنی کنیز کے اس حسنِ عمل پر بہت خوش ہوئی۔ بچوں کو کھانا کھلا کر اس نے انہیں گھر میں چھپا دیا اور کنیز کو اس بات کے چھپانے کی تاکید کی کیونکہ اس گھر کی مالکہ کا شوہر سنگدل ظالم تھا۔

جنابِ مشکور کی شہادت

جب ابن زیاد کو مشکور کے ان شہزادوں کے رہا کرنے کی خبر ملی تو اس نے مشکور کو دربار میں بلایا اور رہا کرنے کی وجہ پوچھی تو مشکور نے جواب دیا: ''میں نے قرابتِ رسول کا پاس کیا اور ان یتیموں کو قید میں رکھنے کی ہمت نہ رکھ سکا۔''

ابن زیاد نے کہا: ''کیا تو نے میرے غضب کی کوئی پرواہ نہ کی اور میرے حکم کی نافرمانی کی؟'' مشکور نے جواب دیا: ''میں تیرے غضب سے تو نہ ڈرا بلکہ قہرِ الٰہی سے خوف کھایا۔ تو نے ان کے باپ کو قتل کیا اور ان یتیموں کو بھی قتل کرتا ہے۔ کیا تجھے ان کی کمسنی پہ رحم نہیں آتا؟''

یہ جواب سن کر ابن زیاد غضبناک ہو گیا اور جلاد کو حکم دیا مشکور کو پانچ سو کوڑے مارے جائیں اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔ مشکور نے جب اپنی سزا کا حکم سنا تو تسبیح وتقدیس باری تعالیٰ بجا لایا۔ جنابِ مشکور کے یہ الفاظ تھے:

''هٰذَا فِیْ لِلّٰهِ وَ فِیْ حُبِّ اَهْلَبَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ قَلِیْلٌ''۔

''اللہ اور رسولؐ کے اہل بیتؑ کی محبت میں یہ سزا بہت کم ہے''۔

پھر آپ نے یہ دعا پڑھی:

"اَللّٰھُمَّ اَسْتَعِینُ بِکَ وَ اَطْلُبُ مِنْکَ الْفَرَجَ وَ رُوْحُ وَالْقَبْرَ فَاِنِی قُتِلْتُ فِیْ حُبِّ اَھْلِبَیْتِ نَبِیِّکَ اَللّٰھُمَّ اَلْحِقْنِیْ نَبِیِّکَ وَ آلِہٖ".

اس کے بعد یہ محبِ یتیمانِ مسلمؑ خاموش ہوگیا۔ اس سرشار محبت خاندانِ رسالت اور طالبِ شہادت کا بدن تھا اور کوڑوں کی ضربیں تھیں۔ جب پانچ سو کوڑے سعادتمند فدائی کا جسم کھاچکا تو اس نے نہایت کمزور آواز کے ساتھ پانی طلب کیا مگر ابن زیاد نے پانی دینے سے روک دیا اور حکم دیا کہ اسے پیاسا قتل کردو۔ عمرو بن حارث آگے بڑھا، اس کے حق میں سفارش کی اور گھر اٹھا کر لے گیا۔ تاکہ دوا دارو کرے لیکن بدن صحت پانے کے قابل نہ رہا۔ مشکور نے آنکھ کھول کر کہا: "اب مجھے پانی کی ضرورت نہیں رہی۔ ساقی کوثر نے مجھے آبِ کوثر سے سیراب کردیا۔"

اس کے بعد یتیمانِ مسلمؑ کے حال پر رحم کرنے والا، حق خاندانِ رسالت پہچاننے والا اور اپنی جان یتیمانِ آلِ محمدؐ پر قربان کرنے والا سعادت پاکر شہادت کا مرتبہ حاصل کرگیا اور جوارِ رحمت، صحبتِ جنابِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچ گیا۔ مشکور کی شہادت کے بعد ہم یتیمانِ جنابِ مسلمؑ کی شہادت لکھتے ہیں۔

شہزادے دن بھر تو مکان میں چھپے رہے، جب رات چھا گئی تو اس عورت کا شوہر جس کا نام حارث تھا، اور بروایت اس کا داماد، تھکا ماندہ غصے اور پریشانی کی حالت میں گھر لوٹا۔ اس کی زوجہ نے رات گئے باہر رہنے اور پریشانی اور تھکاوٹ کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا:

"مشکور داروغہ زندان نے مسلمؑ کے صغیر السن بچے قید سے رہا کردیے تھے۔ وہ کہیں چلے گئے۔ ابن زیاد نے ان کی گرفتاری کی منادی کروائی تھی اور پکڑ کر لانے والے کیلئے خلعت اور بہت سے انعامات کا اعلان کیا تھا۔ میں اس خلعت اور انعام کے لالچ میں ان کی تلاش میں سرگرداں پھرتا رہا۔ تمام راہیں چھان ماریں، تمام گلیاں اور سڑکیں دیکھیں مگر ان کا سراغ نہ پاسکا۔ پریشان حال اور تھکا ماندہ ناکام ہوکر واپس آیا ہوں۔ تمنا تھی اگر وہ یتیم مل جاتے تو ان کی گرفتاری پر انعام حاصل کرتا"۔

اس کی نیک دل زوجہ نے اسے ملامت کی: "چند سکوں کے عوض آلِ رسولؐ کے یتیموں کو قتل کرنے کے درپے ہوتا۔ جس رسول کا کلمہ پڑھتا ہے، اسی کی اہلبیت کے یتیموں، معصوم بے گناہوں کے ناحق خون میں ہاتھ رنگین کیوں کرتا ہے؟"

اس کی زوجہ کی نیک نصیحت کا اس بدشعار اور سنگدل جفاکار پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس مومنہ نے منافق شوہر کے سامنے کھانا رکھا۔ کھانا کھا کر وہ شقی نابکار بستر پر دراز ہوگیا۔ یتیم شہزادے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوفِ حاکم سے سہمے ہوئے

سو رہے تھے۔ بڑے شہزادے کا نام محمد ہے، چھوٹے کا ابراہیم۔ بڑا شہزادہ عالم خواب سے گھبرایا ہوا بیدار ہوا۔ چھوٹے بھائی سے کہتا ہے:

''اماں جایا! موت ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ہماری زندگی کے ایام ختم ہوتے ہیں''۔

اس نے ننھے بھائی کو گلے لگایا۔ بے وطن شہزادوں کے آنسو بہنے لگے۔ اب چھوٹے بھائی کو بڑا شہزادہ خواب سنا رہا ہے:

''میرے بھائی! میں نے خواب میں دیکھا ہے، جدامجد جناب محمد مصطفےٰ، نانا علی المرتضیٰ، جناب فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا، ماموں حسن مجتبیٰ اور بابا مسلمؑ کو جنت میں دیکھا ہے۔ جدامجد جناب محمد مصطفیٰ بابا مسلمؑ کو فرما رہے ہیں: مسلمؑ! تو نے معصوم یتیموں کو کس طرح بے وارث کر کے دشمنوں میں چھوڑ دیا ہے؟ بابا مسلمؑ نے عرض کی: یا رسولؐ اللہ! وہ کل ہمارے پاس پہنچ جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کل صبح ہم اپنے بابا کو جا ملیں گے''۔

چھوٹے شہزادے نے کہا: ''اماں جایا! میں نے بھی یہ خواب دیکھا ہے۔ آ بھائی! گلے لگ جا، مجھے گلے لگا لے!''

دونوں بھائی دبی آواز میں ایک دوسرے کو گلے لگا کر رو رہے تھے کہ سنگدل ملعون نے بچوں کی آہستہ آہستہ رونے کی آوازیں سنیں، اس نے جان لیا کہ میرے گھر میں کچھ غیر موجود ہیں۔ اپنی بیوی سے اس نے دریافت کیا۔ اس نیک دل مومنہ نے تو کوئی جواب نہ دیا۔ یہ ملعون خود بستر سے اٹھا۔ رات کی تاریکی میں لڑکھڑاتا ہوا چلا اور دیواریں پکڑ کر آنے والی مدھم آوازوں کی طرف لپکا۔

معصوم شہزادوں کو اس سنگدل کی آمد اور حال کا پتہ نہ تھا اور نہ یہ جانتے تھے کہ قاتل کے گھر میں پوشیدہ ہیں اور یہی قاتل ہمارے تلاش میں سارا دن سرگرداں رہا۔ وہ ملعون لڑکھڑاتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں یتیم بیقرار بیٹھے تھے۔ بے رحم کا ہاتھ معصوم کی چوٹی پر پڑا۔ صغیر شہزادے کے بالوں کو پکڑ کہا:

''مَنْ اَنْتُما؟ وَمَا تَصْنَعَانِ فِیْ هٰذَا الْمَکَانِ؟''۔

''تم دونوں کون ہو اور اس جگہ کیا کام ہے؟ کیوں آئے ہو؟''

یتیموں نے جواب دیا:

''نَحْنُ اَضْیَافُکَ وَمِنْ عِتْرَتِ نَبِیِّکَ وَ وَلَدَا مُسْلِمِ بْنِ عَقِیْلٍ''

''ہم تیرے مہمان ہیں اور تیرے پیغمبرؐ کی عترت و اہل بیتؑ سے ہیں اور مسلم بن عقیلؑ کے فرزندوں میں سے ہیں''۔

اس ملعون نے کہا: "تمہارے تلاش میں میں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھوڑے کو خراب وتباہ کیا اور سارا دن سرگرداں رہا اور تم میرے گھر میں ہو؟"

وہ ملعون غریب الوطن شہزادوں کو طمانچے مارنے لگا اور معصوم شہزادے دہائی دینے لگے۔ اس کے بعد اس نے ان یتیموں کے ہاتھ باندھ دیئے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک ستون کے ساتھ باندھ دیئے۔ خود تو اپنے بستر پر لیٹ گیا مگر یہ شہزادے ساری رات بندھے رہے اور بابا اور ماموں کو یاد کر کے روتے رہے۔ کس قدر مصیبت کی گھڑی اور درد والم کی رات تھی! کہ عالمِ غربت میں بیکسی کی حالت میں فریاد کرتے تھے اور کوئی ناصر ومددگار نہ تھا۔ شدت درد سے چلاتے تھے مگر کوئی ہمدرد نہ تھا۔ بندھے ہوئے ہاتھوں کی وجہ سے باہم گلے نہ مل سکتے۔

پردیس میں جوان آدمی کا دل بھی گھبرا جاتا ہے اور یہ صغیر السن بچے اپنے دکھوں، مصیبتوں اور زندگی کی آخری رات میں کبھی نانا کو پکارتے، کبھی بابا کو اور کبھی ماموں حسینؑ اور ماموں عباسؑ کو یاد کرتے۔ بار بار اماں اماں کہتے مگر نہ وہاں نانا، نہ باپ، نہ ماں، نہ ماموں، کس حالت میں وہ رات انہوں نے گزاری، اس کو یتیموں کے دل یا حارث کی زوجہ سے پوچھئے۔ وہ نیک دل عورت اور تو کچھ نہ کر سکتی تھی، ان کے قریب آ کر ان کے دست وپا کو بوسے دینے لگی۔

اس عورت کا پیار دیکھ کر ان معصوموں کو ماں کا پیار یاد آ گیا۔ ماں کی طرف دھیان پھر گیا، لمّاں لمّاں کہتے لیکن ماں سے دور، ماں کی جدائی ان کی مصیبت بڑھا رہی تھی۔

عزادارو! جب کسی ماں کا لختِ جگر گم ہو جائے تو اُسکی ماں کو چین نہیں آتا۔ کھانا نہیں کھا سکتی، نیند نہیں آتی، بستر پر سو نہیں سکتی، بار بار اٹھ کر نورِ نظر کو پکار کر فریاد کرتی ہے۔ نہ معلوم کیا حال ہوا ہوگا اجڑی رقیہ کا؟ جب مسلمؑ کی شہادت کی خبر سن کر یتیموں کے گم ہو جانے کی خبر سنی ہوگی۔ مگر کس سے فریاد کرے؟ کسے یاد کرے؟ یہاں تو بھری گودیں اجڑ رہی تھیں اور کوئی نورِ نظر آنکھوں سے غائب ہو رہے تھے۔

بچہ جب گم ہو جاتا ہے تو کس قدر بیقرار ہو جاتا ہے۔ وطن کو یاد کرتا ہے، ماں باپ کو یاد کرتا ہے، عزیزوں کو یاد کرتا ہے۔ کیا اس کے آنسو تھم جاتے ہیں؟ کیا اس کے دل کی دھڑکنیں رک سکتی ہیں؟ کیا اسے چین نصیب ہوتا ہے؟ اور جب بچھڑے ہوئے لال ماں کو مل جاتے ہیں تو کون آنسو ضبط کر سکتا ہے۔

مگر یہ فراق ایسا تھا جو ملاپ سے بے نصیب رہا۔ ماں کو پتہ نہیں میرے لال کہاں ہیں اور بچوں کو خبر نہیں ماں کہاں ہے۔ بہر حال یہ دکھ بھری رات درد ماری رقیہ کی جوڑی نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ گزار دی۔

جب سحر نمودار ہوئی اور صبح کی سفیدی شہزادوں کے خون کا پیام لائی۔ وہ شقی نابکار بستر سے اُٹھا، ہتھیار لگائے، بچوں کو پکڑا، نہایت سنگدلی کے ساتھ معصوموں کی چوٹیوں میں ہاتھ ڈالا۔ بچے شدّتِ درد اور ظالم کی مہیب صورت سے چلّا اٹھے۔ بچے روتے تھے، لیکن ظالم کو ترس نہ آتا تھا، بے رحمی کے ساتھ بچوں کو کھینچتا تھا۔

حارث بچوں کو دریائے فرات کے کنارے ذبح کرنے کے لیے لے گیا اور اس کی بیوی اس کے پیچھے دہائی دے رہی تھی: "یہ بچے یتیم ہیں، بے قصور ہیں، ہمارے مہمان ہیں، کمسن ہیں، عترتِ رسولؐ ہیں، چند سکوں کے عوض انہیں قتل نہ کر۔" مگر اس پاک دل مؤمنہ کی فریاد پر اس شقی نے توجہ نہ کی۔ غلام کو حکم دیا کہ ان بچوں کے سر قلم کرے۔ غلام نے انکار کر دیا کہ میں عترتِ رسولؐ کے ناحق خون میں ہاتھ رنگین نہیں کرتا۔

ایک روایت میں ہے کہ غلام نے تلوار پکڑی تو بچوں نے کہا: "اے غلام! تو شکل میں بلال مؤذنِ رسولؐ کے کس قدر مشابہ ہے۔ ہم عترتِ رسولؐ اور ذریتِ علیؑ ہیں۔ ہمارے قتل سے کنارہ کر۔"

غلام نے یتیمانِ عترتِ پیغمبرؐ کے دست و پا چومے۔ تلوار ہاتھ سے پھینک دی۔ ایک روایت ہے کہ وہ غلام اپنے مالک حارث ملعون کے ہاتھ قتل ہو گیا تھا، ایک روایت بتاتی ہے کہ وہ دریا میں کود پڑا اور تیر کر دوسرے کنارے جا لگا۔ اس طرح وہ سنگدل مالک کے ظلم سے بچ گیا۔

پھر اس نے اپنے لڑکے سے کہا: "یہ تمام دنیا و دولت، زر و مال جائز و ناجائز طریقے سے تیرے لیے ہی جمع کر رہا ہوں۔ تلوار لے اور ان کمزور و ناتواں بچوں کے سر جدا کر۔" اس کے بیٹے نے بھی اس عظیم جرم کے ارتکاب سے انکار کر دیا۔

آخر اس بے رحم بد بخت دین و دنیا نے کہا: "یہ کام سوائے میرے کوئی اور نہیں کر سکتا۔"

تلوار خود پکڑی۔ بچوں نے سمجھ لیا کہ یہی ہمارا قاتل ہے اور یہ درگزر نہ کرے گا۔ اس واسطے اِلتجا کر کے کہا:

"یا شیخ! ہمیں قتل نہ کر! ہمیں غلام بنا بازار میں بیچ دے۔ تجھے انعام کے برابر مال مل جائے گا۔ روزِ محشر محمد مصطفےٰؐ کو ہمارے خون کا مدعی نہ بنا"۔

حارث نہ مانا۔ بچوں نے کہا: "ہمارے ماموں تجھے تیرے متوقع انعام سے زیادہ مال دیں گے۔ ہمیں قتل نہ کر۔ ہماری ماں کی اُمنگیں برباد نہ کر۔ ہماری بہنوں کو سوگوار نہ کر"۔

حارث نہ مانا۔ بچوں نے کہا: "ہمیں زندہ ابن زیاد کے پاس لے چل، وہ خود ہی فیصلہ کر لے گا۔"

چونکہ اس ملعون پر بدبختی چھا چکی تھی، شقاوت غالب آ چکی تھی، اس لئے اس نے کمسن مظلوموں کی التجاؤں کو ٹھکرا دیا۔

اس نے کہا: ''میں تمہارے قتل سے ابن زیاد کا تقرب اور تمہارے سروں سے انعام وخلعت حاصل کرنا چاہتا ہوں''۔
شہزادوں نے کہا: ''اگر تو ہمارے قتل سے باز نہیں آتا اور ضرور ہمیں ذبح کرنا چاہتا ہے تو ہمیں اتنی مہلت دے کہ زندگی کے آخری لمحوں میں چند رکعت نافلہ ادا کرلیں''۔
حارث نے مہلت دی۔ بچوں نے چار رکعات نماز پڑھی۔ پھر دستِ دعا جانب آسمان ہاتھ اٹھا۔ رو رو کر قاضیُ الحاجات کی بارگاہ میں ٹوٹے ہوئے دل، لرزتے ہوئے ہاتھوں اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ دعا کی:
''یَا حَیُّ یَا عَلِیْمُ یَا اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ اُحْکُمْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَهٗ بِالْحَقِّ''۔
بعد نماز بڑا شہزادہ محمد اٹھا، ملعون نے تلوار ماری، سر جدا ہو گیا۔ چھوٹے شہزادے نے بڑے بھائی کا خون منہ پر مل لیا۔ سر اس نے تھیلی میں رکھا اور لاش دریا میں پھینک دی۔ لاش پانی پر تیرتی رہی اور اپنے چھوٹے بھائی کا انتظار کرتی رہی۔
اس کے بعد اس نے چھوٹے بھائی کا سر قلم کیا۔ سر تھیلی میں رکھا اور لاش دریا میں پھینک دی۔ سر اس نے ابن زیاد کے پاس لے جانے کے لیے اپنے پاس تھیلے میں رکھ لیے تھے اور لاشیں دریا کے سپرد کر دیں۔ جب دوسری لاش اُس نے دریا میں پھینکی، پہلی لاش انتظار میں تھی، دونوں لاشیں باہم بغلگیر ہو گئیں اور دونوں زیرِ آب چلی گئیں۔
اس جرمِ عظیم کا مرتکب ہو کر، زمین تھرا کر، عرش لرزا کر، قبرِ رسولؐ ہلا کر، علیؑ و بتولؑ کو رُلا کر، مقدس سروں کو تھیلے میں لے کر، سوئے دربارِ ابن زیاد، انعام کے لالچ میں چلا۔ در قصرِ امارہ میں پہنچتے ہی اس نے سر نکال کر ابن مرجانہ کے پیش کر دیے۔
ابن زیاد نے پوچھا کہ یہ کن کے سر ہیں؟ حارث نے جواب دیا کہ یہ یتیمانِ مسلمؑ کے سر ہیں۔
چاندی صورتیں خاک وخون میں غلطاں تھیں۔ کس ماں کے لختِ جگر اور کس باپ کے نورِ نظر تھے؟ سیاہ زلفیں، دو ننھے ننھے مہ پاروں پر لہرا رہی تھیں۔ اہلِ دربار کتنے ہی سنگدل تھے مگر معصوم ومظلوم چہروں کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ خاندانی وجاہت اور ہاشمی شباہت دعوتِ نظارہ دینے لگی۔ خون کے قطرے اور خاک بھری زلفیں، ظالم سنگدل کی بے رحمی اور شقاوت کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ کٹی ہوئی گردنوں سے لہو کی بوندیں، اور مسلمؑ کے دو ننھے ننھے چاندوں پر طمانچوں کے داغ خود ابن زیاد جیسے شقی القلب کو رونے پر مجبور کر رہے تھے۔
ابن زیاد کتنا ہی سنگدل تھا مگر معصوم ومظلوم چہروں کو دیکھتے ہی بیقرار ہو گیا۔ وہ ظالم کرسی پر بیٹھا تھا، تین بار اٹھا اور بیٹھا۔ اس نے حکم دیا کہ ان سروں کو نہلا دھلا کر طشت میں لے آؤ۔ شہزادوں کے سروں کو دھویا گیا۔ زمینِ کوفہ کی گرد بالوں میں جمی ہوئی تھی، صاف کیا گیا۔ معلوم نہیں کب شہزادوں نے غسل کیا تھا اور کتنا عرصہ کتنی خاک سر میں پڑی رہی؟ اے ننگے سر

عزادارو! تم سر دھونے اور خاک نکالنے کیلئے کتنی جلدی کرتے ہو؟ مگر مسلمؑ اور رقیہؑ کے یتیموں سے پوچھو، کتنی مدت تک سر میں رہی؟ مرنے کے بعد سرِ دھلائے گئے۔ آخر ایک طشت میں رکھ کر ابن زیاد کے سامنے رکھے گئے تو یہ ملعون خود بھی آبدیدہ ہوگیا اور بھری کچہری آنسو بہانے لگی۔

حارث ملعون ابن زیاد سے انعام وخلعت طلب کر رہا تھا اور لوگوں کی نفرت بھری نگاہیں لعنت ملامت کر رہی تھیں۔ رقیہؑ کے لال ابن زیاد کے دربار میں زبانِ حال سے اپنی شہادت کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ فضا سوگوار تھی، ہر دل غمگسار اور آنکھ اشکبار تھی۔ آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے، آہیں تھیں کہ رُکتی نہ تھیں۔ ابن زیاد نے حارث ملعون سے یہ قصہ درد بیان کرنے کو کہا۔ ابن زیاد دریافت کرتا ہے اور حارث جواب دیتا ہے۔

ابن زیاد: تو نے انہیں کہاں پایا؟

حارث: میری عورت نے انہیں گھر میں مہمان رکھا۔

ابن زیاد: تو نے پھر حق مہمانی کا کچھ پاس نہ کیا؟ عربی غیرت کے مطابق تو نے انہیں پناہ نہ دی؟

حارث: میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور انعام حاصل کرنے کی کوشش کی۔

ابن زیاد: میں نے زندہ پکڑ لانے کو کہا تھا کیونکہ میں نے یزید کو ان دونوں بچوں کے حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اگر وہ مجھ سے انہیں طلب کرے تو میرے پاس کیا جواب ہوگا؟

حارث: میں زندہ پکڑ کر اس لئے نہیں لایا کہ کوفہ میں دبے دبے شیعہ ہیں، ہوسکتا ہے کوئی گروہ یا چند آدمی مجھ سے چھین لیتے اور میں تیرے تقرب وانعام سے محروم رہ جاتا۔

ابن زیاد: جب تو انہیں قتل کرنے لگا تو کچھ کہتے بھی تھے؟

حارث: یہ کہتے تھے ہمیں بازار میں بیچ کر اپنی دنیا کا لالچ پورا کرلے، ہمیں قتل نہ کر۔

ابن زیاد: تو نے کیا کہا؟

حارث: میں نے کہا میں تمہیں بیچتا نہیں، میں تمہیں قتل کر کے تمہارے سر پیش کروں گا۔

ابن زیاد: اور کیا کہا؟

حارث: انہوں نے کہا ہمیں زندہ ابن زیاد کے پاس لے چل۔ وہ خود جو چاہے فیصلہ کرے گا۔

ابن زیاد: اگر تو زندہ پیش کرتا تو تجھے دوگنا انعام دیتا، اور کیا کہا؟

حارث: انہوں نے قرابتِ رسول کا واسطہ دیا اور اپنی صغیر سنی کا واسطہ دیا۔

ابن زیاد: پھر تو نے کچھ رحم نہ کیا؟

حارث: میں ان کے خون بہانے پر تیار ہو چکا تھا۔ ان التجاؤں نے میرے دل پر کوئی اثر نہ کیا اور نہ میرے دل میں رحم آیا۔

ابن زیاد: دیکھ کیسے حسین وجمیل شہزادے ہیں۔ کیسی چاند سی شکلیں ہیں۔ بتا تو سہی کہ ان کی زلفوں کے بال ٹوٹے ہوئے کیوں ہیں؟ اور ان چاند سے رخساروں پر نیلے داغ کیسے ہیں؟

حارث: جب میں انہیں قتل کرنے کیلئے دریائے فرات کی طرف لے چلا، یہ التجائیں کرتے اور رحم طلب نظروں سے دیکھتے۔ میں ان کے بالوں کو پکڑ کر گھسیٹتا تھا، جس کی وجہ سے ان کے سروں کے بال ٹوٹ کر میرے ہاتھوں میں رہ جاتے اور جب یہ مجھ سے رحم کی اپیل کرتے، انہیں طمانچے مارتا اور یہ نیلگوں داغ میرے طمانچوں کے نشان ہیں"۔

حارث سمجھتا تھا کہ ابن زیاد خود سنگدل اور شقی ہے۔ میں جس قدر ظلم کی داستان سناؤں گا وہ خوش ہو کر مجھے قریبی بنائے گا اور میری خلعت وانعام بڑھائے گا۔ مگر اس ملعون کو خبر نہ تھی کہ مظلوموں کا ناحق خون فوراً رنگ لائے گا اور یتیم کی آہ وزاریاں، ان کے نالے اور ان کے سروں سے گرتے ہوئے قطرے عرشِ خدا کو لرزا رہے ہیں اور قہار و جبار خدا کو غضبناک کر رہے ہیں۔ معصوموں کے ننھے ہاتھوں کا دعا کیلئے جانب آسمان اُٹھنا فضا کو غضب آلود کر دے گا۔

اشکبار آنکھوں، درد بھری آہوں اور جگر فگار سسکیوں کے ساتھ ننھی ننھی زبانوں سے غریب الوطن مظلوم، یتیموں کے حسرت بھرے دل سے نکلی ہوئی دعا آسمانوں سے گزرتی ہوئی، عرش کو ہلاتی ہوئی فوراً بابِ اجابت سے جا ٹکرائی اور قہر وغضب خدا نے اس ظالم دشمن کو سنگدل قاتل سے انتقام لینے پر مجبور کر دیا۔

ابن زیاد نے پھر پوچھا: "آخری بار کیا کہا؟"

حارث نے کہا: "انہوں نے نماز کیلئے مہلت مانگی۔ میں نے اجازت دے دی۔ فراغتِ نماز کے بعد انہوں نے دعا مانگی:

"يَا حَيُّ يَا عَلِيمُ يَا اَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ اَحْكُمْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُ بِالْحَقِّ".

"اے زندہ، اے سب کچھ جاننے والے، اے تمام حاکموں کے حاکم اعلیٰ، ہمارے درمیان اور ظالموں کے درمیان

حق کے ساتھ فیصلہ فرما"۔

اس وقت ابن زیاد نے غضبناک ہو کر کہا: "خدا نے فیصلہ کر دیا ہے جو میں تجھے سناتا ہوں"۔ پھر کہا: "کون ہے؟ جو اس مردود کو اُسی جگہ لے جا کر قتل کرے"۔

ایک مرد شامی اٹھا، اس نے کہا: "میں حاضر ہوں"۔

ایک روایت میں ہے کہ اس کا نام مقاتل تھا اور وہ در پردہ محبِ اہل بیت تھا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ اس مردود کو اس مقام پر لے جا کر قتل کر جہاں اس نے ان بچوں کو قتل کیا ہے۔ لیکن خیال رکھنا کہ جہاں ان بچوں کو خون گرا ہے، وہاں اس نجس و ناپاک کا خون نہ گرے اور اس کا خون ان کے خون میں شامل نہ ہو۔

اس مرد نے حارثِ ملعون کی مشکیں باندھیں اور کشاں کشاں جانبِ فرات لے چلا۔ وہ شخص (مقاتل) کہتا ہے: "اگر مجھے روئے زمین کی سلطنت مل جاتی تو میں اتنا خوش نہ ہوتا، جتنا یتیموں کے قاتل کے قتل کرنے سے خوشی ہوئی"۔

جس گلی اور بازار سے یہ حارثِ ملعون گزرتا، لوگ اسے پتھر مارتے اور لعنت ملامت کرتے۔ آخر وہ شخص اسے لبِ فرات لے گیا اور عذاب دے کر اسے قتل کیا۔ پھر اس کی لاش دریا میں پھینکی مگر دریا کی لہروں نے اس نجس لاش کو قبول نہ کیا اور ساحل سے باہر پھینک دیا۔ دوسری بار اس نے لاش کے ساتھ بھاری پتھر باندھے مگر فرات کے پانی نے نفرت کرتے ہوئے اسے پھر باہر پھینک دیا اور تین مرتبہ ہی ایسا ہوا۔ ایک گڑھا کھود کر اسے مٹی میں چھپانے کی کوشش کی مگر اس کے منحوس مردے کو زمین نے بھی قبول نہ کیا، آخر اس کی لاش جلائی گئی۔

اس کے بعد ابن زیاد نے حکم دیا کہ ان سروں کو دریا میں اُس جگہ ڈال دو جہاں ان کی دو لاشیں ڈالی گئیں۔ چنانچہ جب ان پاک سروں کو اس جگہ دریا کے پانی میں ڈالا گیا تو لاشیں سطحِ آب پر آئیں اور ہر سر اپنی لاش کے ساتھ مل گیا۔ یہ دونوں شہزادوں کی لاشیں سروں کو ملا کر پانی کے اندر چلی گئیں۔

رحمٰن اور رحیم کی تشریح

حضرات مومنین! اس مجلس میں اللہ کے دو بزرگ ناموں کی تشریح کی جاتی ہے۔

ان دو ناموں کی عظمت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ بسم اللہ میں ذاتی نام "اللہ" بعد کے جو نام اسماء حسنہ میں سے کلام پاک میں وارد ہیں وہ "الرحمٰن الرحیم" ہیں۔ جو اللہ کی صفت بنتے ہیں۔ یعنی اوصاف خدا میں رحمان اور رحیم پہلی صفت ہے۔ اس ذات نے جو مخلوق پر اپنی شان کی جلوہ گیری کی وہ رحمت کی تجلی ہے۔

مصدر فیض سے مخلوق کے لئے رحمت کا چشمہ جاری ہوا۔ رحمت کو عذاب پر سبقت حاصل ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جب جسد جناب آدمؑ میں روح پھونکی گئی۔ دماغ میں روح مبارک کا دخول ہوا تو جناب آدمؑ کو چھینک آئی۔ انہوں نے پڑھا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہ" عبد کے اس جملے کے جواب میں معبود نے کہا "یَرحَمُکَ اللّٰہُ" پھر آواز قادر کریم آئی "سَبَقَتْ رَحْمَتِی غَضَبِی" میری رحمت میرے غضب سے بڑھ گئی، اسی کی وجہ سے یہ عادت سنت میں داخل ہے کہ جب کسی آدمی کو چھینک آئے تو کہے "اِلْحمدُاللّٰہ" ساتھ بیٹھا ہوا آدمی کہے "یَرْحَمُکَ اللّٰہ"۔

علمی تشریح

"**رحمٰن اور رحیم**" یہ دونوں اسم "رحمت" سے نکلے ہیں، یہ دونوں اسم مشتق ہیں۔ ان کا مصدر "رَحْمَة" ہے۔ اسم فاعل کے معنی میں مبالغہ کے صیغے ہیں جن کا مفہوم ہے، بہت رحم کرنے والا۔

ان سے پہلے "رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کا ذکر ہے رب وہ ہے جو رحیم ہے۔ بغیر جذبہ رحم کے تربیت ہو ہی نہیں سکتی۔ جن کی تربیت مقصود ہے، انسان ہوں یا حیوان یا نبات و جماد، تربیت جسمانی ہو یا روحانی علمی ہو یا عملی بغیر رحم و محبت کے کوئی مربی تربیت دے نہیں سکتا۔ اس واسطے "رَبُّ الْعَالَمِین" نے ماں کے دل میں محبت اولاد اور رحم و پیار کے جذبات بھر دیئے ہیں تا کہ اولاد کی تربیت کا ہر دم خیال رکھے۔

بچے کی بیقراری ماں سے دیکھی نہیں جاتی، جانوروں کو دیکھو، پرندوں کو دیکھو، کس قدر اولاد سے محبت رکھتے ہیں، جس قدر ماں کو اولاد سے محبت ہے۔ اس سے بڑھ کر خدا کو اپنی مخلوق سے محبت ہے، ماں کے اس پیار سے جو اولاد سے ہے، خدا کا پیار مخلوق پر زیادہ ہے۔ خدا نہیں چاہتا کہ میرا بندہ عذاب میں گرفتار ہو۔

بیشک اس نے جہنم بنائی ہے لیکن وہ بندوں کا جہنم میں داخلہ پسند نہیں کرتا۔ جنت کے دروازے کھلے ہیں۔ داخلے کے لئے بھی صدائے عام ہے۔ لیکن کیا کہئے کہ یار لوگ جہنم کا داخلہ پسند کرتے ہیں اور ہر قیمت پر پسند کرتے ہیں۔

رحمت کی اقسام

رحمت کی تعریف عام طور پر اُردو زبان میں مہربانی، ترس، پیار کو رحمت کہتے ہیں، یہ اس کی اصطلاحی تعریف ہے۔

ایصال خیر و دفع شر، خیر پہنچانا اور شر ہٹانا، خیر سے محظوظ اور شر سے محفوظ رکھنا۔ جو چیز خیر کے مفہوم داخل ہے وہ عطا کرنا اور جو شر کے مفہوم میں ہے، اس سے بچانا، یہ ہے رحمت کی تعریف۔

رحمت کی دو قسمیں ہیں۔ وہ رحمت کہ جس کا تعلق دوران پرورش ہے، کہ مربی کے جذباتِ رحم پرورش کا تقاضا پورا کرتے ہیں، ضروریات مہیا کرنا اور تربیت کے موانع دور کرنا، اس قسم کی رحمت کا تعلق اسم "رحمٰن" کے ساتھ ہے۔ یہ رحمتِ معاشی کہلاتی ہے۔

رحمت کی دوسری قسم یہ ہے کہ پرورش پانے والی چیز کو اس کے درجہ کمال تک پہنچا کے اس سے انجام اور اس کے پھل کا حاصل کرنا۔ یعنی تربیت کا مقصد اور غرض کا حصول۔ کیونکہ کسی چیز کی بے مقصد تربیت اور بے غرض پرورش لہو ولعب میں شمار ہوتی ہے اور خلاقِ عالم رب العالمین نے کوئی چیز بے فائدہ اور بے مقصد نہیں پیدا کی۔ اس واسطے پروردہ چیز سے فائدہ حاصل کرنا یہ پرورش کا مقصد ہوتا ہے۔

چونکہ خداوند عالم "غَنِیٌّ عَنِ الْعالَمِین" ہے۔ اس واسطے کسی مخلوق کا فائدہ اس کی ذات حاصل نہیں کرتی۔ مخلوق کا فائدہ مخلوق ہی میں گردش کرتا ہے لیکن اس کا انجام ضروری ہوتا ہے۔ اس رحمت کا تعلق کسی چیز کے معاد سے ہے اور اس کا مظہر اسم رحیم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ معاش عالم سے جس رحمت کا تعلق ہے وہ اسم رحمٰن سے متعلق ہے اور جس رحمت کا تعلق معادِ انجام، غایت اور آخرت سے ہے، وہ اسمِ رحیم سے متعلق ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے:

"یا رَحْمٰنَ الدُّنیا و رَحِیمَ الآخِرَةِ".

جو رحمت کی بارش اس دنیوی عالم اور اس مادی گلشن کو سیراب کرتی ہے۔ اس کے فاعل کو لفظ "رحمٰن" سے تعبیر کرتے ہیں اور آخرت کے گلزاروں کی جس رحمت سے آبیاری ہوتی ہے اس کے فاعل کو "رحیم" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ فاعل ایک ہے اور نام الگ

الگ ہیں۔

اس رحمٰن کی گھٹا سے جو مینہ برستا ہے اس سے ہر شخص ادنیٰ و اعلیٰ، نیک و بد، مومن و مشرک، مسلم و منافق، موحد و ملحد، پاک و نجس اور ہر چیز اچھی و بُری پاک و پلید مضر و مفید خوبصورت و بدصورت سیراب ہوتی ہے۔ غذا حاصل کرتی اور پرورش پاتی ہے۔

لیکن اسم رحیم کے بادل سے جو بارش ہوتی ہے، اس سے خاص اہلِ ایمان، اہلِ توحید، مومنین رسالتؐ اور صاحبانِ ولائے آئمہ علیہم السلام، نیکوکار، متقی اور اصحابِ جنت بہرہ مند ہوتے ہیں۔ رحیمی رحمت کے انعام عالم مادی کے ہر باشندہ کیلئے عام ہیں۔

رحمتِ خدا کی وسعت

اس کی رحمت کا دریا بہت وسیع ہے تمام عالمِ امکان اس کے گھیرے میں ہے۔ اگر کوئی شخص گناہوں کے زنجیروں میں گرفتار چلنے سے معذور ہو کر لب دریا پہنچنے کی طاقت نہیں رکھتا مگر اپنے جُرم پر پشیمان ہو اور نگاہ سوئے لطفِ رحمٰن ہو تو رحمت کا بحرِ ذخار موجزن ہو کر اپنی موجوں میں بندۂ گنا ہگار کو لپیٹ لیتا ہے۔ بندے کا احساسِ ندامت رحمت کے ریلے کو دعوت دیتا ہے اس کے بندھن کھل جاتے ہیں اور رحمت کا پانی اس کے عصیان کی میل کچیل دور کر دیتا ہے۔ کس کمال مہربانی سے فرماتا ہے:

"قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِينَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيْعاً اِنَّهُ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ".

"اے پیغمبر! میرے ان بندوں سے کہہ دو جنہوں نے میری نافرمانی میں اپنے نفسوں پر بہت زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ یقیناً خدا تمہارے تمام گناہ بخش دے گا، بے شک وہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔"

یہ اس کی رحمت ہے کہ بندہ برائی کرے تو ایک برائی کے بدلے میں ایک ہی برائی کی سزا پائے گا لیکن اگر نیکی کرے تو صرف ایک نیکی نہیں بلکہ دس نیکیوں کی جزا پائے گا۔

اگر نیکی کرے تو اس کی نیکی لکھنے والے فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ اس کی نیکی فوراً اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دو لیکن اس کی بدی جلدی نہیں لکھی جاتی بلکہ وقفہ رکھا جاتا ہے کہ شاید اسے احساسِ ندامت دامن گیر ہو اور توبہ کرے کہ اس کا اعمال نامہ برائیوں سے داغدار نہ ہو۔

اس کی رحمت ہمارے قریب آتی ہے لیکن ہم خواہشات کے پجاری اور نفس پرست اس کی رحمت سے خود دور بھاگتے ہیں۔ "کِرَاماً کَاتِبِیْن" تو ہمارے ساتھ بحکم خدا رعایت کرتے ہیں۔ ہمیں توبہ کی مہلت دیتے ہیں، لیکن ہم ہیں کہ انہیں ہمہ

وقت لکھنے میں مصروف رکھتے ہیں۔نیکیاں لکھنے میں نیکیوں والے فرشتے تو عموماً فارغ رہتے ہیں اور بدیاں لکھنے میں برائی نویس فرشتے ہروقت مشغول، ہم نافرمان بندے انہیں فرصت ہی نہیں دیتے۔

مگر غفورُالرحیم خالق اپنے بندے کا جہنم میں جانا گوارا نہیں کرتا اگر بندے کا دل سلیم ہو، اپنے کئے پر پچھتا کر خوف خدا سے روئے تو اس کے آنسوؤں کے قطرے نامہ اعمال کی تمام برائیوں کو دھو دیتے ہیں۔جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

جناب میر انیس اعلیٰ مقامہٗ کی رباعیاں نہایت مناسب مقام ہیں فرماتے ہیں:

ممکن نہیں عبد سے عبادت تیری
خلق و کرم و جود ہے عادت تیری
گو صحرا صحرا ہیں عصیان میرے
پر دریا دریا ہے رحمت تیری

لفظ رحمٰن اللہ کے لئے مخصوص ہے خدا کے سوا کسی کو رحمٰن نہیں کہہ سکتے۔لیکن لفظ رحیم خدا کے سوا استعمال ہو سکتا ہے۔ قرآن میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رؤف و رحیم کہا گیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے:

"لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ".

"تمہارے پاس تمہارے نفسوں سے رسول آیا ہے، تمہارا رنج اور محنت اُسے گوارا نہیں، تم پر اُسے حرص ہے، ایمان کے متعلق مومنین پر ترس کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر قرآن مجید جابجا موجود ہے۔اُس کی رحمت کے آثار اطراف عالم میں بکھیرے ہوئے ہیں۔ ہر چیز اپنی قابلیت کے مطابق رحمت کا حصہ پا رہی ہے۔اس کے پاس رحمت کا بے کنار سمندر ہے۔دینے والا بخیل نہیں کریم ہے لینے والے میں لینے کی اہلیت ہونی چاہئے۔اُس کی رحمت کے چند واقعات جو قرآن مجید میں مذکور ہیں۔قارئین کی بصیرت کیلئے ہم درج کرتے ہیں:

"كهيعص ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا".

"تیرے رب کی رحمت کا ذکر جو اس نے اپنے بندے (زکریا) کو عطا فرمائی"۔

یعنی جناب یحییٰ علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا۔

جناب ایوب علیہ السلام کے متعلق رحمت کا ذکر یہ ہے

"وَاَیُّوبَ اِذْنَادیٰ رَبَّهُ اَنِّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِینَ. فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَکَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَیْنَاهُ اَهْلَهُ وَ مِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَذِکْریٰ لِلْعَابِدِیْنَ".

"اور ایوبؑ کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری اور مصیبت لاحق ہو گئی ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کر لی اور اُن کا دُکھ اور تکلیف اُن سے دور کر دی اور اُن کے اہل وعیال زندہ کر دیئے اور اتنے ہی اور ساتھ دیے۔ یہ ہمارے پاس سے رحمت کے سبب اور عبادت گزاروں کی یادداشت کے لئے تھا"۔

ایک مقام پر ارشاد ہے:

"اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ".

"بے شک اللہ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں کے قریب ہے۔"

جناب عیسیٰؑ کے متعلق ذکر ہے:

"وَلِنَجْعَلَهُ آیَةً لِلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِنَّا".

"تا کہ ہم اس کو لوگوں کے لیے خاص نشانی اور اپنی رحمت بنائیں۔"

اور اپنی رحمت کا ذکر ہے۔

"وَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِیْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ اُولٰئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَّ اُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ".

"اور وہ لوگ جن پر کوئی مصیبت پڑی اور انہوں نے کہا ہم خدا ہی کے ہیں اور خدا ہی کی طرف واپس جانے والے ہیں تو ان پر ان کے رب کی طرف سے صلوٰۃ اور رحمت ہے اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

ہر شخص نے، ہر نبی نے، ہر ولی نے اپنی قابلیت کے مطابق رحمت کا حصہ پایا۔ مگر مخلوقِ اوّل سردار کائنات مجسّم رحمت بن کر آئے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ".

"اے پیغمبرؐ! ہم نے تمہیں عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔"

جناب کا وجودِ ذی جود ہر شے، ہر شخص اور ہر قسم کی مخلوق کیلئے رحمت ہے۔

ان کا وجود منبع فیض معدنِ رحمت اور باعث خلقت کائنات ہے۔ ان کے اور ان کی معصوم اولاد کے ذریعہ مخلوق میں رحمت تقسیم ہوتی ہے۔ عالم ان سے رحمت حاصل کرتا ہے ان ہی کے ذریعہ تمام جہان وجود میں آئے ان کا وجود بنیادِ عالم ہے۔ انہی ذواتِ مقدسہ، انوارِ ربانیہ کے وجود کی برکت سے ہر شے کو وجود ملا۔ انہی کے ذریعہ بقائے عالم ہے۔ انہی کے ساتھ دنیا کی انتہا ہے۔ یہ اصل زمانہ ہیں اور زمانہ ان کی فرع ہے۔

درخت کی مثال

درخت میں دو چیزیں ہوتی ہیں:

۱۔ اصل یعنی جڑ۔

۲۔ فرع یعنی شاخیں۔

جو چیز پہلے پیدا ہوتی ہے وہ اصل کہلاتی ہے۔ اور جو بعد میں پیدا ہو وہ فرع ہے۔ جو زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے وہ اصل زمانہ اور جو زمانہ ان کے بعد بنا، وہ فرع ہے۔

جو زمانہ سے پہلے بنے وہ صاحب زمانہ اور جو زمانہ کے بعد بنے وہ محکوم زمانہ، پہلے والے حاکم اور بعد میں بننے والے محکوم، چونکہ ان کی ارواح نورانیہ بغیر بدنوں کے عالم انوار میں زمان و مکان سے پہلے خلق ہوئی تھیں اس واسطے یہ حضرات زمانہ کی اصل اور زمانہ، عالم، ان کی فرع ہے۔

اگر عالم ان سے پہلے پیدا ہوتو وہ اس عالم کے لئے رحمت نہیں قرار پا سکتے کیونکہ وہ وجود اور پیدائش میں مقدم ہے۔ چونکہ یہ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں اس لئے ان کا وجود مبارک تمام جہانوں سے پہلے ہے۔ اس واسطے عرش، کرسی، لوح و قلم، ملائکہ وحوریں، بہشت کے باغات، آسمانوں اور زمینوں کے طبقات، کراتِ عالم، دریا و ہوا غرض یہ کہ تمام جہان اور ان میں

رہنے والے رحمۃ للعالمینؐ کی برکت سے عالمِ وجود میں آئے۔

انوارِ پنجتن پاکؑ اصل یعنی جڑ اور عالمین ان کی فرع ہے۔

جب درخت کو سیراب کرنا اور غذا دینا مقصود ہو تو غذا جڑ کو دی جاتی ہے۔ شاخوں (فرع) کو نہیں دی جاتی۔ شاخیں جڑ سے غذا حاصل کرتی ہیں اور جڑ اپنے مربی سے غذا حاصل کرتی ہے۔ جڑ کے ذریعہ غذا تنوں، شاخوں، پتوں، پھولوں، پھلوں میں سرایت کرتی ہے۔

اسی واسطے رحمٰن ورحیم نے اپنے پیغمبر اکرمؐ کو عالمین کی اصل بنایا اور جہانوں کی جڑ قرار دیا۔ اس نے جہانوں میں رحمت پھیلانے کے لئے عالم کی جڑ کو رحمت کی غذا دی اور اس جڑ کے ذریعہ زمانے کو جو اس اصل کی فرع ہے، رحمت کی غذا مہیا کی۔

اس واسطے مصدرِ فیض رحمت بحرِ جود و کرم سے جو فیض و رحمت جاری ہوتی ہے وہ وجودِ ذی جود پیغمبر اکرمؐ اور ان کی پاک اولاد کو حاصل ہوتی ہے اور ان کے ذریعہ تمام جہانوں میں پھیلتی ہے۔ یہ رحمت کے دریا ہیں جن سے گلشنِ عالم سیراب ہو رہا ہے، یہ شجرِ رحمت کی جڑیں ہیں جن سے عالمین کی شاخیں شاداب ہو رہی ہیں۔ یہ صاحبِ زمانہ اور حاکمِ زمانہ ہیں، زمانہ ان کا محکوم ہے۔ جب یہ ثابت ہے کہ شاخیں جڑ سے غذا حاصل کرتی ہیں تو وہی شاخیں سر سبز رہیں گی جو جڑ سے تعلق اور رابطہ قائم رکھیں گی۔

اگر اصل سے وابستہ رہیں اصل کا دامن فرع کے ہاتھ میں رہا تو غذا بھی حاصل کریں گی، تر و تازہ بھی رہیں گی، برگ و بار بھی ان پر آئیں گے اور پھولیں گی بھی، پھلیں گی بھی۔ لہٰذا فرع کا اصل کے ساتھ اور شاخوں کا جڑ کے ساتھ تولّی ضروری ہے۔ اگر تعلق نہ رہا تو، تولّی ختم ہو گیا۔ غذا سے محروم ہو کر خشک ہو جائیں گی۔

حضرات! آپ نے دیکھا ہوگا کہ سر سبز و شاداب درخت میں دو تین شاخیں خشک بھی ہوتی ہیں۔ جونہی آپ نے ان کو خشک دیکھا، آپ نے یقین کر لیا کہ ان شاخوں کا اصل کے ساتھ تعلق اور واسطہ برقرار نہیں رہ سکا۔ اگر اصل سے واسطہ رکھتیں تو کیوں خشک ہو جاتیں۔ جن شاخوں نے اصل کا دامن مضبوطی سے پکڑ رکھا، پر بہار ہیں۔ صاحب نکھار ہیں یا برگ و بار رہیں اور جن شاخوں نے اصل سے تولّی ختم کر لیا جڑ سے تعلق نہ رہا، غذا سے محروم ہو کر خشک ہو گئیں۔ پتے جھڑ گئے۔ ٹوٹ کر گر پڑیں اور آگ کا لقمہ بن گئیں۔

تو رحمۃ اللعالمین اصلِ زمانہ ہیں۔ جن کا تعلق رحمۃ اللعالمین سے مضبوط رہا، ان سے وابستہ رہے، بقدرِ اہلیت رحمت کا حصہ پاتے رہے اور جنہوں نے آپؐ سے تعلق قطع کر لیا، اصلِ رحمت سے تولّی نہ رہا، آخر وقت رحمۃ اللعالمین کو ناراض کر دیا،

صحبت ختم ہوگئی، تعلق ٹوٹ گیا، دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، دربار رحمۃ اللعالمین سے باہر کر دیئے گئے اور رحمت حق سے محروم ہو گئے۔

حضرات مومنین! آپ نے یہ سمجھ لیا کہ تنے، شاخیں، پتے وغیرہ (فرع) اصل (جڑ) سے غذا حاصل کرتے ہیں لیکن اصل زیر زمین پنہاں ہوتی ہے۔ موجود ہے لیکن نظروں سے غائب ہے، قائم ہے مگر پوشیدہ ہے، اپنا کام کر رہی ہے، غذا فرع میں پہنچا رہی ہے۔ خود زندہ ہے اور فرع کو زندہ رکھ رہی ہے۔

آپ نے تو فرع دیکھی، شاخوں اور پتوں کا حسن وجمال دیکھا، پھولوں کی خوشبو سونگھی، پھلوں کا ذائقہ چکھا، درختوں کی تر وتازگی دیکھ کر آپ غائب جڑ اور نظروں سے اوجھل اصل کے وجود پر ایمان لے آئے۔ کوئی پوچھے کہ "آپ نے جڑ تو دیکھی نہیں! اس کے وجود پر کیوں یقین کرتے ہیں؟" آپ جواب دیں گے کہ اگر جڑ زیر زمین موجود نہ ہوتی تو درخت ہرا بھرا کس طرح رہتا؟ اس کی ٹہنیاں سرسبز کیوں ہوتیں؟ ڈالیاں پھولوں سے جھکی کیوں نظر آتیں؟ پھول مہکتے اور غنچے چٹکتے کیوں دکھائی دیتے؟ شاخوں کی زندگی جڑ کے وجود پر شہادت دے رہی ہے۔

اسی طرح زمانہ جو فرع ہے، صاحب الزمان کے وجود کی گواہی دے رہا ہے۔ اصل کے بغیر درخت نہیں رہ سکتا اور صاحب الزمان کے بغیر زمانہ نہیں رہ سکتا۔ شاخوں کی تازگی اصل کے وجود کا پتہ دیتی ہے اور زمانے کا وجود، صاحب زمان کے وجود کا پتہ دیتا ہے۔ رحمۃ اللعالمین، پہلا محمدؐ ہے، جس کے وجود سے عالم سے افتتاح ہوا اور آخری محمدؑ جو رحمۃ اللعالمین پہلے محمدؐ کا آخری جانشین ہے۔ اس کی وجہ سے بقائے عالم ہے، اسی واسطے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ اَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ کُلُّنَا مُحَمَّدٌ".

آخری محمدؑ کے وجود کی برکت سے عالمین کو رحمت کی غذا مل رہی ہے۔

قدم سے مہدیؑ دیں کے زمیں پانی پہ قائم ہے
قرار کشتی دنیا کے لنگر ایسے ہوتے ہیں

انہیں کے ذریعے کائنات کی ابتداء ہوئی اور انہیں پہ اختتام ہوگا۔ چنانچہ یہی جملے جناب امام حسین علیہ السلام نے ولید بن عتبہ کے جواب میں ارشاد فرمائے:

"اَیُّهَا الْاَمِیْرُ اِنَّا اَهْلُ بَیْتِ النُّبُوَّةِ وَ مَعْدِنُ الرِّسَالَةِ وَ مُخْتَلَفُ الْمَلَائِکَةِ بِنَا فَتَحَ اللّٰهُ وَ بِنَا خَتَمَ".

''آہ! اے حاکم مدینہ! ہم اہل بیتِ نبوتؑ اور معدنِ رسالت ہیں ہمارے گھر میں فرشتے آتے جاتے ہیں، ہم ہی سے خدا نے عالم کا آغاز کیا اور ہمارے ساتھ ہی اس دنیا کا خاتمہ ہوگا۔''

آہ! فرزندِ رسولؐ! محمد مصطفیٰؐ کے تیسرے جانشین، محمدؐ کے حصے، تیسرے محمدؐ نے وطن چھوڑ کر کھلے میدان میں قربانیاں پیش کرنے کا دستورالعمل بنایا۔

مکہ میں قیام اور مکہ سے رخصت

امامِ مظلوم علیہ السلام نے ۲۸ رجب نصف رات کے بعد مدینہ سے کوچ فرمایا اور ۳ شعبان کو مکہ میں ورود فرمایا۔ ۳ رشعبان سے ۸ رذی الحجہ تک مکہ میں قیام پذیر رہے۔ کوفیوں کے خطوط اور قاصدین کے اصرار پر جنابِ مسلمؑ ماہِ رمضان المبارک میں مکہ سے کوفہ روانہ ہوئے۔ شعبان، رمضان، شوال، ذیقعدہ، امامؑ نے مکہ میں گزارے۔ ذی الحج کا چاند طلوع ہوا۔ مختلف شہروں سے لوگ حج کیلئے مکہ میں وارد ہونے لگے۔

آپؑ نے حرمِ خدا مکہ کیوں چھوڑا؟

مکہ کو حرم خدا اور جائے امن سمجھ کر وارد ہوئے۔ اُمتِ جد کے ستائے ہوئے امامِ امن و سکون کی تلاش میں مکہ آئے لیکن یہاں سُکھ نہ ملا۔ حرمِ خدا میں جہاں معمولی جانور کا مارنا حرام ہے، فرزندِ رسول کو جان کا خطرہ پڑ گیا کیونکہ یزید نے حاجیوں کے لباس میں بنی اُمیہ کے چنے ہوئے بدکردار اس مقصد کیلئے بھیجے کہ فرزندِ رسولؐ کو مکہ میں حج کے دوران قتل کر دیا جائے۔

یزید کی سیاست اس میں تھی، کہ حسینؑ تو قتل ہو جائیں گے اور اس قتل کا الزام میں عبداللہ بن زبیر پر لگا کر اس کو قتل کے بدلے قتل کرا دوں گا۔ کیونکہ عبداللہ بن زبیر یزید کا مخالف تھا۔ اس نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور خود مکہ میں اپنی حکومت قائم کرنے کی تمنا میں لوگوں سے بیعت لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسی بنا پر تیس آدمی اسی مقصد کے لئے حاجیوں کے لباس میں مکہ بھیجے اور انہیں تاکید کی ہر حال میں حسینؑ بن علیؑ کو قتل کر دیا جائے۔

یہ خبر پا کر فرزندِ رسولؐ نے مکہ میں مزید قیام مناسب نہ سمجھا، کہ اس طرح میری موت غیر مؤثر ہو جائے گی۔ میرا قتل مخفی ہو جائے گا۔ یزید کی سیاست کارگر ہو جائے گی۔ میں مارا جاؤں گا لیکن یزید بدنام نہ ہوگا۔ میری وجہ سے کعبہ کی حرمت زائل ہو جائے گی۔ حق و باطل میں فرق نہ ظاہر ہوگا۔

میں تو کھلے میدان میں قربانیاں پیش کروں گا۔ میری قربانیاں بے مقصد نہیں ہوں گی۔ میری شہادت کا مقصد کربلا میں واضح ہوگا۔ حق و باطل میں امتیاز ظاہر ہوگا اور شہیدوں کا لہو حق کے خاکے میں رنگ بھرے گا اور غازہ بن کر دینِ اسلام کو سرخرو

کرے گا۔

آٹھویں ذوالحجہ کو سبطِ نبیؐ امامِ امتؑ نے حج کو عمرہ سے بدل کر احرام کھول دیئے۔ لوگ چاروں اطراف سے کعبہ کی زیارت کو آ رہے ہیں اور امام حسینؑ مجبوراً کعبہ سے جدا ہو رہے ہیں۔ خیال ہے کہ وقتِ وداع کعبہ کی دیواروں کو مل کر روئے ہوں گے اور کعبہ بھی بتولؑ کے لعل کی غربت و بیکسی پر ضرور رویا ہوگا۔ صرف کعبہ نہیں حجر اسود بھی رویا ہوگا۔ صفا اور مروہ بھی روئے ہوں گے، مشعر و منیٰ نے بھی جدائی شبیرؑ میں گریہ کیا ہوگا کیونکہ یہ تمام قدیمی حاجی سے مانوس تھے۔ ۲۵ حج فرزندِ رسولؐ نے پیادہ کئے تھے۔ اب یہ آخری حج تھا، آخری زیارت تھی، فضاء مکہ سوگوار زمین حرم بیقرار اور دیوار کعبہ اشکبار تھی کہ اولادِ رسولؐ بنات بتولؑ پناہ لینے کیلئے آئیں اور میں پناہ نہ دے سکی۔

حرمِ خدا سے روانگی کے وقت چونکہ تمام سربرآوردہ شخصیات حج کے لئے مکہ میں موجود تھیں۔ عین ایام حج میں فرزندِ رسولؐ کی تیاری سن کر حیران رہ گئے اور روانگی کی وجہ دریافت کرنے اور مشورہ دینے کے لئے حاضر ہوئے۔ ان میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، ابوبکر بن حارث بن ہشام، محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن جعفر طیار تھے۔

ان تمام حضرات نے اپنی اپنی عقل و دانش کے مطابق مشورے دیئے۔ ان میں تمام کی یہ رائے تھی کہ آپؑ عراق نہ جائیں اور حرمِ خدا میں رہیں۔ ان کے جواب میں مولا حسینؑ نے کئی باتیں ارشاد فرمائیں۔

1۔ بنواُمیہ مجھے حرمِ خدا میں فریب و مکاری سے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے مکہ میں قتل ہونا پسند نہیں، اس طرح میرا قاتل چھپ جائے گا۔ حرمِ خدا کی حرمت ضائع ہوگی۔

2۔ اگر میں مکہ سے جلدی نہ نکلوں تو گرفتار کیا جاؤں گا۔

3۔ عبداللہ بن عمر کے جواب میں فرمایا: بنواُمیہ میرے خون کے پیاسے ہیں مجھے خانہ خدا میں نہ بیٹھنے دیں گے اور اگر میں کسی نامعلوم جگہ چلا جاؤں تو بھی یہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور بیعت یزید کے لئے مجبور کریں گے انکار پر مجھے قتل کر دیں گے۔ بہر حال انہیں میرا قتل مقصود ہے۔

پھر ابن عمر سے یہ بھی فرمایا کہ: ''بنی اسرائیل نے پو پھٹنے سے پہلے ستر پیغمبروں کو قتل کیا اور اس کے بعد باطمینان بازاروں میں جا بیٹھے تھے اور اپنے لین دین میں مصروف ہو گئے گویا انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ خدا نے ان کے بڑے گناہ کی سزا دینے میں جلدی نہیں فرمائی۔ خدا علیم ہے۔ مگر انجام کار ان کو پکڑ لیا اور سخت سزا دی۔ خدا ہی سب سے بہتر بدلہ لینے والا ہے''۔

ابن عمر کے جواب میں کیا بہترین اور مناسب جواب دیا ہے۔ ان صاحب نے جناب امامؑ کو یزید کی بیعت کر لینے کا

مشورہ دیا تھا، جس کے جواب میں میرے امام جناب حسینؑ نے بنواُمیہ کے ظلم وستم اور شرارتوں کو بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ساتھ مشابہت اور اپنی اور اپنے رفقاء کی شہادت ومظلومی کو پیغمبرانِ بنی اسرائیل کی شہادت اور فی سبیل اللہ موت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ یعنی پیغمبرانِ ماسلف نے فریضہ ہدایت اور وظیفہ تبلیغ کے سلسلے میں موت گوارا کرلی۔ لیکن بنواسرائیل کی ہاں میں ہاں ملانے ان کے بدکردار کی تصدیق کرنے اور ان کو حکمران مان لینے سے صاف انکار کردیا۔ انہی پیغمبرانِ ماسلف کے طریقہ کو اشرف الانبیاء کے صحیح جانشین نے اپنایا۔ بہتر ساتھیوں سمیت موت گوارا کرلی۔ مگر بنواسرائیل کے ہم مثل بنوامیہ کے آگے جھکنا گوارا نہ کیا۔

عبداللہ بن زبیر درحقیقت جناب امام حسینؑ کے مکہ سے خروج پر راضی تھا۔ اس کی حکومت کے قیام میں جو مانع تھا وہ حسینؑ ابن علیؑ تھے۔ چونکہ ابن زبیر مکہ میں اپنی حکومت قائم کرنے اور لوگوں سے بیعت لینے کی تیاری میں تھا اور حسینؑ ابن علیؑ کی موجودگی میں لوگوں کا میلان کسی صورت میں عبداللہ بن زبیر کی طرف ہو نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا وہ دل چاہتا تھا کہ حسینؑ یہاں سے چلے جائیں۔ لیکن بظاہر اس نے نہ جانے کی صلاح دی اور قیام کا مشورہ دیا۔ جس کے جواب میں وہی فرمایا جو پہلے نمبر پر درج ہو چکا ہے۔

محمد بن حنفیہ اور جناب عبداللہ بن جعفر طیار کے مشورہ کے جواب میں فرمایا:

"مجھے نانا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حکم ہے اور عالمِ خواب میں انہوں نے سب کچھ فرمادیا ہے۔ اس واسطے میں وہی کچھ کروں گا جو انہوں نے فرمایا ہے۔ اس واسطے اب تو جو ارادہ کرچکا ہوں عراق جاتا ہوں جو خدا کو منظور ہوگا ہو کے رہے گا"۔

جناب عبداللہ بن عباس نے جب دیکھا کہ امام حسینؑ نے سفرِ عراق کا پختہ ارادہ کرلیا ہے تو عرض کی:

"اگر سفرِ عراق ضروری ہے تو ایسے سفر میں اہل وعیال کو ساتھ نہ لے جائیں۔"

حضرت امام حسینؑ فرمایا: "میں ان کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں جب کہ میرے نانا نے ان کو اپنے ساتھ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ میں ان کو کس کے سپرد کروں یہ میرے نانا کی امانت ہیں اور میرے مقصد میں شریک کار ہیں اور یہ خود میرے ساتھ اس قدر مانوس ہیں کہ میری جدائی گوارا نہ کرسکیں گی۔ یابن عباس اللہ تعالیٰ مجھے مقتول دیکھنا، میرے نانا کی ان امانتوں کو اسیر دیکھنا چاہتا ہے، میری گردن پر تلوار اور ان کے ہاتھوں میں رسیاں دیکھنا چاہتا ہے۔ میری لاش بے گور وکفن اور انہیں عریاں سر، مجھے صحرائے کربلا میں بے وارث اور انہیں کوفہ وشام کے بازاروں میں قیدی دیکھنا چاہتا ہے۔

گو میرا سفر رنج و بلا کی گھٹاؤں سے گھرا ہوا ہے، فضا مکدر ہے، زمانہ دشمن ہے، سفر پُر خطر ہے۔ لیکن میں ان کے بغیر اور یہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

جنابِ عباسؑ کہتے ہیں: ''میرا مظلوم امامؑ کے ساتھ یہ مکالمہ ہو رہا تھا کہ اسی اثنا میں پردے کے پیچھے سے آواز آئی! اے عبداللہ یہ مشورہ مناسب نہیں۔ اب سوائے حسینؑ کے ہمارا کون رہ گیا ہے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ جس معظمہ کی آواز تھی وہ دکھیاری بہن اُمّ المصائب شریکۃ الحسینؑ جناب زینبؑ تھیں۔''

عزادارو! جناب زینبؑ صحیح فرماتی تھیں کیونکہ جنابِ رسولؐ خدا کے بعد جناب امیر المومنینؑ، جناب سیدہؑ اور جناب امام حسنینؑ سے ان کا سہارا تھا۔ جناب امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد جناب حسنینؑ کا سہارا تھا جناب امام حسنؑ کی شہادت کے بعد پیارے بھائی حسینؑ کی ذات تھی۔ لیکن جناب حسینؑ کے بعد ان دکھیاری بہنوں کو کس کا سہارا تھا؟ کس کے آسرے مدینہ میں رہتیں؟ کیا حسینؑ کے بعد مدینہ رہنے کے لائق تھا؟ ان اجڑے گھروں میں بغیر حسینؑ و عباسؑ کے رہ سکتیں؟ آخر مظلوم مسافر مکہ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

مکہ پر رونق ہے۔ چہار طرف سے لوگ مکہ میں حج کے لئے داخل ہو رہے ہیں لیکن مکہ کا وارث مکہ سے باہر جا رہا ہے۔ آج شہنشاہِ حجاز کو کہیں پناہ نہیں مل رہی۔ دنیا جن کے سائے میں پناہ لیتی تھی آج ان پر زمین تنگ ہو رہی ہے۔ جہاں پرندے تک امان میں رہتے تھے آج فرزندِ رسول کو وہاں امن نہیں۔ اُمتِ جد کا ستایا ہوا مسافر اطراف عالم پر نظر ڈالتا ہے، مگر ہر طرف سے موت کی صدا استقبال کرتی ہے۔

ایک شاعر نے مناسبِ حال کہا ہے:

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج و مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر
لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرے عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشک بار اَٹے ہیں غبار سے

مقصدِ سفر

مکہ سے کربلا تک منازِل سفر کے اہم واقعات

مسافر کربلا جناب امام مظلوم حسینؑ نے حرم رسولؐ اور حرم خدا بادلِ ناخواستہ چھوڑا اور سفرِ عراق اختیار کیا۔ جب کہ مدینہ اور مکہ میں حجاز کی اہم شخصیتیں اور اقربائے بنی ہاشم یہ سفر نہ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے اہلِ عراق کی بے وفائی تھی اور کوفہ والوں کی غداری۔ وہ آزما چکے تھے جس بنا پر وہ امام مظلومؑ کو اہل کوفہ پر اعتماد نہ کرنے کی نصیحتیں کر رہے تھے۔ جناب امام حسینؑ کے پیش نظر لشکر یا اسلحہ کی فراہمی نہ تھی اور نہ اس سفر کا مقصد لڑائی تھا۔ اس سفر کے دو مقاصد تھے:

۱۔ حفاظتِ جان اور با امن زندگی

اس واسطے حرم خدا مکہ میں پناہ لی اور جب تک خطرہ لاحق نہیں ہوا اور مکہ کی فضا پُر امن رہی مکہ نہیں چھوڑا۔

کوفہ کا رُخ اس غرض سے نہیں کیا کہ وہاں سے لشکر فراہم کر کے چڑھائی کروں گا اور ملک گیری کے لئے حملہ کروں گا۔

بلکہ ان کے آمدہ خطوط کے پیشِ نظر کہ ہدایتِ اسلام و تبلیغ دین کی خاطر انہیں امام حق مطلوب ہے اور جناب حسینؑ کے زیر سایہ وہ اسلامی و شرعی زندگی بسر کر سکیں گے۔ جناب امامؑ نے کوفہ کا قصد کیا کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور یہ امتحان باعث ہدایت قرار پائے۔

اتنی تعداد مجھے مل جائے کہ میں بنواُمیہ کے حملہ سے محفوظ رہوں اور ان کی زیادتیاں و مظالم مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرتے ہوئے پُر سکون زندگی بسر کر سکوں۔ آخر حفاظت جان و عزت کیلئے بھی کچھ سامان و تعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب زمانہ دشمن ہو جائے۔ ہر طرف خوف و خطر کے بادل منڈلا رہے ہوں اور قبل ازیں بنواُمیہ کی سفاکیاں اور خونریزیاں منظر عام پر آ چکی ہوں اور شیعانِ علیؑ کے خون سے اموی تلواریں سیراب ہو چکی ہوں۔ پھر یزید کے نامہ طلب بیعت میں اس کے مذموم ارادے آشکار ہو گئے ہوں تو ان حالات میں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لئے جو قدم اٹھایا جائے وہ مبنی برحق اور تقاضائے دانش ہوتا ہے۔ اسے خروج یا فوج کشی پر محمول نہیں کیا جاتا بلکہ حفاظتِ خود اختیاری یا دفاعی انتظام کہا جاتا ہے اور یہ نہ مدینہ میں حاصل تھی نہ مکہ میں۔ چنانچہ اسی چیز کی تصدیق کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

مدعائش سلطنت بودے اگر | خود نہ کردے با چنیں ساماں سفر

''اگر آپ کا مقصد سلطنت حاصل کرنا ہوتا تو اس طرح بال بچوں اور پردہ سرا بیبیوں کو ساتھ لے کر سفر نہ کرتے''۔

۲۔ حفاظتِ اسلام

جان سے زیادہ اسلام کی حفاظت پیش نظر تھی۔ کیونکہ جو طاغوتی طاقتیں برسر اقتدار آچکی تھیں وہ آلِ پیغمبرؐ کی بھی دشمن تھیں اور دین پیغمبرؐ کی بھی بلکہ آلِ رسولؐ کی دشمن بھی اسی وجہ سے تھیں کہ وہ دین کے رہبر، اسلام کے ہادی اور شریعت کے مبلغ تھے۔

اگر صحیح دین ملتا تھا تو انہی کے پاس، شریعت کے درس انہی سے ملتے تھے، اسلامی تعلیمات اور ہدایاتِ پیغمبرؐ اگر صحیح حالت میں تلاش کرنا ہو تو اسی خانوادہ کے پاس یہ سرمایہ محفوظ تھا۔

یزید چاہتا تھا کہ دین محمدؐ کو بھی ختم کروں اور آلِ رسولؐ کو بھی۔ ایک تو پرانے قتلوں کا انتقام لے لوں گا اور پرانی خاندانی عداوت کے ارمان نکالوں گا۔ اس چیز کی طرف جناب سبطِ رسولؐ نے ایک مقام پر ایک مشورہ کے جواب میں اشارہ فرمایا:

''میں کسی سوراخ میں بھی چھپ جاؤں تو بنوامیہ مجھے وہاں سے برآمد کر کے اپنی انتقامی پیاس بجھائیں گے''۔

دوسرا یہ کہ ہادیٔ اسلام اور جانشین رسولؐ کے خاتمہ کے ساتھ دین بھی ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ جب تک دین پیغمبرؐ زندہ رہے گا آلِ پیغمبرؐ معزز اور باوقار رہے گی۔ جب دین ہی نہ رہے گا تو آلِ پیغمبرؐ کی توقیر بھی ختم ہو جائے گی۔

فرزندِ رسولؐ کو اپنی جان پیاری نہ تھی بلکہ دین رسولؐ پیارا تھا، اسلام جان سے عزیز تھا۔ تعلیماتِ پیغمبرؐ سابقہ حکومتوں نے متغیر کر دیے تھے۔ سلطان جور اولی الامر اور غاصب حکمران امیر المومنین بن گیا تھا۔

'' اَلنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلُوکِھِم'' کے مصداق لوگ سیم و زر کے پرستار بن کر فاسق حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کلمۃ الحق اور قولِ مصدق سینوں میں دب کے رہ گئے۔ زبانیں ضمیروں کے خلاف تھیں حکومتیں مضبوط تھیں، دین کمزور تھا، اسلامی معاشرہ بگڑ چکا تھا، ظلم و جور اور فسق و فجور کا دور دورہ تھا۔

ایسے میں اسلام کو ایک غمخوار کی ضرورت تھی۔ گلشنِ اسلام فسق و فجور کی خزاں کے جھونکے سے مُرجھا چکا تھا، وہ خون سے سیرابی مانگتا تھا، وہ شادابی کے لئے قربانی چاہتا تھا۔ اور قربانی بھی معمولی نہیں عظیم قربانی۔

بے شک امام حسین علیہ السلام اسلام کیلئے قربانیاں دینا چاہتے تھے۔ قربانیاں دینے کا جو طریقہ کار آپؑ نے بنایا تھا، اس کیلئے مدینہ و مکہ مناسب نہ تھے: اس کیلئے ایک کھلے میدان کی ضرورت تھی جہاں حق و باطل میں فیصلہ کن لڑائی ہو سکے۔ حق جدا ہو جائے اور باطل الگ۔

ظاہر بین نگاہیں مدینہ سے مکہ میں قیام کا مشورہ دیتی تھیں لیکن امورِ باطنیہ سے واقف امامؑ اور اسرار نہانی سے مطلع وحق اپنی شہادت کو رائیگاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جنابِ مظلومؑ کے سامنے دو باتیں تھیں، شہادت اور مقصدِ شہادت کا پرچار۔ ان دونوں مقاصد کیلئے دانائے زمانہ امام حسینؑ نے صحیح افراد منتخب کر لئے تھے۔ امام علیہ السلام کا مقصدِ سفر پر، جو کہ حفاظتِ اسلام تھا، وہ صیت نامہ کافی روشنی ڈالتا ہے، جو رخصت مدینہ کے وقت برادر عزیز جناب محمد بن حنفیہؒ کو لکھ کر دیا تھا۔

وصیت نامه

آپؑ نے جناب محمد بن حنفیہؒ کو مکتوب ذیل وصت نامہ تحریر فرما کر مہر لگا کر دیا تھا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

هٰذَا مَا اَوۡصٰی بِهِ الحسینُ بن علی بن ابی طالب الی اخیه المعروف با بن الحنیفه انَّ الُحسین یشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لا شریک لهٗ و ان محمداً صلی اللّٰه علیه و آلهٖ عبدهٗ وَ رسولهٗ جاءَ بالحق من عند الحق و اِنَّ الجنةَ وَالنَّار حقٌّ و انَّ السَّاعَة اتیةٌ لا ریب فیها وَاَنَّ اللّٰهَ یبعث من فی القُبور و انی لم اخرُج اشرًا ولا بطراً ولا مُفسِداً ولا ظالماً و انما خرِجتُ لِطلب الاصلاح فی اُمَةِ جَدِّیْ صلَّی اللّٰه علیه و آلهٖ وسلَّم اُرِیدُ ان امربالمعروف وانھٰی عَن المنکر و اسیرُ بسِیرة جدّی و ابی علیٰ بن ابیٰ طالب علیه السلام فمن قَبلنی بقبول الحق فاللّٰهُ اُولٰی بالحق و مَنۡ رَدَّعلیَّ هٰذَا اَصبر حتٰی یقضی اللّٰه بینی و بین القوم بالحق و هُوَخیر الحاکمین وهٰذا وصیّتی یا اخی اِلَیۡکَ وما توفیقی الاباللّٰه علیه توکلت و علیه اُنیب".

"یہ وہ وصیت نامہ ہے جو حسین بن علی علیہم السلام نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام لکھا ہے۔ حسینؑ گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور جنابِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے خاص بندے اور رسولؐ ہیں، جو حق کے ساتھ من جانب اللہ مبعوث ہوئے اور بے شک جنت اور دوزخ حق ہیں اور بے شک

قیامت آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ مردوں کو قبروں میں سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔

اس کے بعد واضح ہو کہ میں کسی قسم کا فساد پھیلانے یا غرور و تکبر کی خاطر یا ظلم و ستم کیلئے نہیں نکلا بلکہ میں تو اپنے جدّ امجد کی امت کی اِصلاح کیلئے نکل رہا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ نیکی کی تبلیغ کروں اور برائی سے روکوں اور اپنے جد امجد اور پدر بزرگوار علیہ السلام کی سیرت پر چلوں پس جو شخص مجھے برحق سمجھ کر قبول کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے حق کو قبول کرنے کا زیادہ سزاوار ہے اور جس نے میرا قول ردّ کر دیا تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ خدا میرے اور قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے ولا ہے۔ اے بھائی! یہ میرا وصیت نامہ ہے۔ خدا ہی کے قبضہ میں میری توفیق ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

اس وصیت نامہ اور دوسرے خطبوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے اس اقدام سے حفاظت دین اور اصلاح امت کا کام نہایت ہی اہم اور بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ بگڑے ہوئے معاشرہ کو درست کرنا کتنا دشوار کام ہے۔ انبیاء علیہم السلام جو مصلحین خلق تھے، کتنے مصائب و آلام میں گھر کر اصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہے اور کتنی قربانیاں انہیں دینی پڑیں۔

فساد پیدا کرنا آسان ہے اور اصلاح بہت دشوار ہے۔ لائق صد تحسین ہیں وہ مقدس افراد جو ظلم و تشدد اور قید و بند کی صعوبتوں کو گلے لگا کر اصلاحِ خلق کا فریضہ ادا کرتے رہتے ہیں۔ قابلِ داد ہیں ان کے حوصلے جو اس مقدس فرض کی ادائگی کیلئے قدم میں لغزش، زبان میں سکوت، ارادوں میں کمزوری اور پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دیتے۔

وہ عظیم نصب العین اور مقدس مقصد کی خاطر ہر مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں۔ وہ پتھروں کے مینہ، تیروں کی بارش، نیزوں کی نوک اور تلواروں کے سائے، زندان کی تاریک و تنگ کوٹھڑیوں میں کلمہ حق کی آواز بلند کرتے ہیں۔ تلواروں کی باڑھیں کند، تیروں کی نوکیں ٹوٹ جاتی ہیں مگر ان کے حوصلے پست نہیں ہوتے۔ ان کی گردنیں کٹ جاتی ہیں مگر باطل کے سامنے ان کے سر نہیں جھکتے۔ خوف و خطر کی گھٹاؤں میں ان کے ولولے ماند نہیں پڑتے اور ظلم و جور کی آندھیوں سے ان کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔

دراصل ایسے ہی محسن قوم افراد کی بدولت حق زندہ رہتا ہے اور انہی کے دمِ قدم سے اسلام کا پیغام باقی ہے۔ اسی کا بے مثال عملی درس اور لازوال کارنامہ فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کربلا کے ریگزار میں انجام دیا۔ اسی عظیم الشان قربانی کیلئے نہ حرمِ رسولؐ سازگار تھا، نہ حرمِ خدا۔ یہ شرف ارضِ کربلا کے حق میں کاتب تقدیر نے تحریر کر دیا تھا جو بہتر (۷۲) منتخب افراد

کے پاک خون کی رہین تھی۔

قارئین کرام کیلئے مقصدِ سفر، مختصر بیان ہم نے واضح کر دیا ہے اب مکہ اور کربلا معلی کی درمیانی منزلوں کے اہم واقعات قلمبند کرتے ہیں۔

واقعاتِ منزل

ملک حجاز کے جغرافیہ دان اور حدود اربعہ سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ مکہ مدینہ سے جنوب کی طرف واقع ہے اور عراق مدینہ سے شمال کی جانب۔ جب حضرت امام حسین علیہ السلام مکہ سے عازمِ عراق ہوئے تو مکہ سے جانبِ شمال سفر کیا اور مدینہ بھی مکہ سے شمال میں ہے، اس واسطے مدینہ کے قریب سے گزر ہوا۔ گو بعض کتب میں دوبارہ داخلِ مدینہ ہو کر مزاراتِ مقدسہ سے وداع کے واقعات ملتے ہیں اکثر کتب سے دوبارہ دخولِ مدینہ ثابت نہیں ہوتا، البتہ اس راہ سے مدینہ قریب پڑتا ہے جس راہ سے جنابِ مسافرِ کربلا مکہ سے واپس ہوتے ہوئے کربلا گئے۔

جنابِ مسلم بن عقیل علیہم السلام کو جب آپ نے کوفہ روانہ فرمایا تو جنابِ مسلم مکہ سے واپس مدینہ آئے اور مدینہ سے جانبِ کوفہ روانہ ہوئے۔ مسجدِ نبوی میں نماز بھی پڑھی۔

بہر حال، جنابِ امامؑ مکہ سے روانہ ہوئے اور سب سے پہلی منزل یم پر جو مکہ سے چند فرسخ پر واقع ہے، جنابِ عبداللہ بن جعفرِ طیارؑ کے دونوں فرزند جنابِ عون و محمد اپنے والدِ ماجد کا خط لے کر خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے۔

اس خط کا متن یہ تھا:

"اَمّا بعد فانّی اسئلکَ باللّٰہ لمن انصرفت حین تقرأ کتابی فانی مُشفقٌ علیکَ مِن ھذا لُوجہ ان یکونَ فیہ ھلاککَ واستیصالُ اھل بیتک ان ھلک الیوم طفٰی نُورالارض فانکَ عَلم المھتدین و رجاءُ المؤمنین فلا تعجل بالمسیر نانی فانی اثر کتابی والسلام".

"بعد حمد و صلوٰۃ کے، خدارا جب میرا خط پڑھیں تو اس سفر سے واپس لوٹ آئیں کیونکہ مجھے اس سفر سے آپؑ کی اور آپؑ کے اہلِ بیتؑ کی موت کا اندیشہ ہے۔ اگر آپؑ کی موت واقع ہوگئی تو زمین کا نور بجھ جائے گا۔ کیونکہ آپؑ ہدایت پانے والوں کے نشانِ راہ اور مومنین کی اُمید گاہ ہیں۔ آپؑ چلنے میں جلدی نہ کریں کیونکہ میں خود بھی اس مکتوب کے بعد آ رہا ہوں"۔

جنابِ عبداللہ اس منزل پر جنابِ امام علیہ السلام سے ملے اور اس سفر سے روکنے کی کوشش کی، لیکن مولاؑ نے وہی جواب دیا کہ میرے نانا کا یہی حکم ہے اور یہ سفر ضروری ہے۔

جنابِ عبداللہ تو کچھ مجبوریوں کی بناء پر نہ جا سکے مگر اپنے دونوں فرزندوں کو جنابِ امام حسین علیہ السلام کے ہمراہ روانہ کر دیا اور تاکید کی کہ ہر وقت خدمتِ امام میں موجود رہیں اور وقتِ جہاد اپنی جانیں امامِ مظلومؑ پر قربان کر دیں۔

جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کی شہادت

۸ ذی الحجہ کو جنابِ حسین علیہ السلام مکہ سے روانہ ہوئے اور ۹ ذی الحجہ کو جنابِ مسلم بن عقیل علیہم السلام کوفہ میں شہید ہوئے۔ ۱۵ ماہِ رمضان کو جنابِ مسلمؑ بن عقیلؑ مکہ سے سفیرِ حسینؑ بن کر کوفہ کو روانہ ہوئے اور صعوبت کے ساتھ یہ سفر طے کرتے ہوئے ۵ شوال کو کوفہ پہنچے۔

حالات کی سازگاری اور اہلِ کوفہ کا میلان دیکھ کر جنابِ مسلم نے ۱۱یا۱۲ ذی قعدہ کو جنابِ امام حسین علیہ السلام کو خط تحریر کیا جس میں انہوں نے کوفہ کے پہلے حالات اور اہلِ کوفہ کا اشتیاق ذکر کرنے کے بعد جنابؑ سے کوفہ میں تشریف لانے کی استدعا کی۔ یہ خط جنابِ مسلم نے عابس بن ابی شبیب شاکری اور قیس بن مسہر صیداوی کے ہاتھ روانہ کیا۔

درمیانی منزل میں ایک منزل وادیٔ رُمہ جسے حاجز بھی کہا جاتا ہے، وہاں پہنچ کر امام حسینؑ نے اہلِ کوفہ کو ایک خط تحریر کیا۔ چونکہ جنابِ مسلمؑ کے پہلے خط سے مطلع ہو کر امام علیہ السلام نے کوفہ کا قصد کیا مگر دل میں قلق تھا، پریشانی تھی، بیقراری تھی۔ اس خط کے بعد کوئی خط جنابِ مسلم کی جانب سے نہیں آیا۔ بدلی ہوئی فضا اور پرآشوب حالات کی بناء پر کوفہ کی طرف سے مطمئن نہ تھے۔ نگاہیں کوفہ کی جانب ہی رہتی تھیں۔

اس مقام پر پہنچ کر جنابؑ نے اہلِ کوفہ کو ایک خط تحریر کیا جس کا مضمون یہ تھا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کا اپنے دینی بھائیوں کے نام۔ حمدِ خدا اور سلامِ مسنون کے بعد مسلمؑ بن عقیلؑ کے خط سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے حالات درست ہیں اور تمہارے درمیان ہماری نصرت اور طلبِ حق پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ میں نے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی ہے کہ وہ انجام بخیر کرے اور تمہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ میں مکہ سے آٹھویں ذی الحجہ کو تمہاری طرف روانہ ہو چکا ہوں۔ جب میرا قاصد پہنچے تو تم جلدی اپنے انتظامات مکمل کر لو کیونکہ میں انہی دنوں تمہارے ہاں پہنچنے والا ہوں"۔

یہ خط جناب عبداللہ بن یقطر کے ہاتھ روانہ کیا۔

ادھر یہ حالات ہیں، ادھر جب ابن زیاد ملعون جناب مسلم بن عقیل علیہم السلام اور جناب ہانیؓ بن عروہ کے شہید کر دینے کے بعد کوفہ پر مکمل طور پر قابض ہوا اور کوفہ پر اس نے خوف و لالچ سے پورا تسلط کر لیا تو حضرت امام حسین علیہ السلام کے سد راہ ہونے کی اس نے فکر شروع کر دی۔

اس بندوبست سے اس کی اصل غرض یہی تھی کہ جناب امام حسین علیہ السلام کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیے جائیں یا کم از کم اس راہ کے سوا جو وہ مکہ سے اختیار فرما چکے ہیں، کوئی دوسری راہ اختیار نہ کر سکیں اور کسی قوم و قبیلہ کے لوگ ان سے مل نہ سکیں کیونکہ مدینہ کے گورنر نے اور اُموی جاسوسوں نے ابن زیاد کو امام حسین علیہ السلام کی مکہ چھوڑنے اور عازمِ عراق ہونے کی خبر پہنچا دی تھی۔ اس واسطے ابن زیاد ملعون نے حصین بن نمیر کو کافی تعداد پر مشتمل ایک جماعت دے کر راہ کی حفاظت اور حراست کے تمام ضروری انتظامات سپرد کر دیئے اور قادسیہ سے خفان اور خفان سے قطقطانہ تک عراق سے واقصہ اور وہاں سے بصرہ کے راستہ تک ناکہ بندی کر کے وہاں اپنی پولیس متعین کر دی۔

جنابِ عبداللہؓ بن یقطر کی شہادت

جنابِ عبداللہؓ بن یقطر اور بعض روایات کے مطابق قیسؓ بن مسہر صیداوی، جناب امامؑ کے قاصد کوفہ جاتے ہوئے حصین بن نمیر ملعون نے گرفتار کر لیا۔ جب حصین نے جناب عبداللہ کی تلاشی لینا چاہی تو جناب عبداللہؓ نے راز کو مخفی رکھنے کیلئے وہ خط پھاڑ ڈالا۔

حصین نے انہیں گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ جنابِ عبداللہؓ جب ابن زیاد کے سامنے پیش ہوئے تو مکتوبِ ذیل مکالمہ ہوا:

ابن زیاد: تو نے خط کیوں پھاڑا؟

عبداللہ بن یقطر: اس واسطے کہ تو اس کے مندرجات سے مطلع نہ ہو سکے۔

ابن زیاد: بتاؤ اس میں کیا کیا لکھا تھا اور کن کن اشخاص کے نام مکتوب تھا؟

عبداللہ بن یقطر: میں نہیں بتاتا!

ابن زیاد نے بہت اصرار کیا مگر قاصدِ حسینی نے صاف انکار کر دیا۔

ابن زیاد: منبر پہ چڑھ کر حسینؑ بن علیؑ پر (العیاذ باللہ) تبرا کرو۔

عبداللہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے آمادگی ظاہر کی۔ جنابِ عبداللہؓ بن یقطر منبر پر آئے، خدا کی حمد وثناء اور پیغمبرِ اسلام پر درود وسلام بھیجنے کے بعد کہا:

"لوگو! حسینؑ ابن علیؑ تمام مخلوق سے بہتر اور دخترِ رسولؐ جنابِ فاطمۃ الزہراءؑ کے فرزند ہیں۔ میں ان کا قاصد ہوں۔ تم پر لازم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہا جائے"۔

اس کے بعد جناب امیر المومنینؑ علیہ السلام پر درود وسلام بھیجا اور ابن زیاد اور اس کے باپ پر لعنت کی۔

ابن زیاد غصہ سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ عبداللہؓ بن یقطر کو فوراً منبر سے نیچے اتارو اور محل پر لے جا کر نیچے گرا دو۔ چنانچہ سپاہِ ابن زیاد نے جنابِ عبداللہؓ بن یقطر کو منبر سے نیچے اتارا اور ان کے ہاتھ پسِ پشت باندھ کر محل کی چھت سے نیچے گرا دیا۔

گرتے ہی جنابِ عبداللہؓ بن یقطر کے بدن کے تمام اعضاء اور جوڑ چور چور ہو گئے۔ ابھی جان بدن میں باقی تھی کہ عبدالملک بن عمیر ملعون نے آگے بڑھ کر سر کاٹ دیا۔

"اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"۔

بعض روایات میں جنابِ قیس بن مسہر صیداوی اور عبداللہ بن یقطر دونوں کی نامہ بری کے جرم میں شہادت درج ہے۔ اس طرح کوفہ میں شہادت پانے والوں کی تعداد چار ہو جاتی ہے۔

جنابِ زہیرؓ بن قین کی ملاقات

مسافرِ کربلا صعوبت اور دکھ کی منزلیں طے کرتے ہوئے جب منزلِ واقصیہ یا زرود پر پہنچے تو شہداءِ کربلا کی فہرست میں مکتوب ایک شخص کا اضافہ ہوا۔ یہ شخص زہیر بن قین خوش قسمتی سے سید الشہداء علیہ السلام کے جانثاروں میں شامل ہو گیا۔ خلیج کے اس انمول موتی کو تقدیر نے اس مقام پر سلکِ شہادت میں پرو دیا اور امامؑ کی نگاہِ انتخاب نے جنابِ زہیر کو اپنے باوفا اصحاب اور معتمد ساتھیوں میں ملا لیا۔

اس واقعہ کی تفصیل مؤرخین نے اس طرح لکھی ہے کہ جنابِ زہیرؓ بن قین مکہ سے جنابِ حسین علیہ السلام کے ساتھ شریکِ سفر تھے مگر وہ اپنا خیمہ جنابِ حسین علیہ السلام کے خیام سے دور نصب کرتے تھے۔ مگر منزلِ واقصیہ پر پہنچ کر چشمہ آب کے قریب ہونے کی وجہ سے اپنا خیمہ امامؑ کے خیام کے قریب لگایا۔ امامؑ کی چشمِ بصیرت نے جوہرِ قابل کو پہچان لیا۔

امام حسین علیہ السلام نے زہیر کو بلانے کیلئے اپنا قاصد بھیجا۔ زہیر اس وقت اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قاصد نے پیام امامؑ سنایا۔ جناب امامؑ کی طلبی کا پیام سن کر بنوامیہ کے خوف سے تمام مجمع میں سخت انتشار پیدا ہو گیا اور وہ سوچ و بچار میں گرفتار ہو گئے۔ جماعت کی جماعت نے تشویش کی وجہ سے اپنے سر زانو پر جھکا لیے اور "**کَاَنَّهُمْ عَلٰی رُؤُسِهِمُ الطَّیْرُ**" کا مصداق بن گئے۔ اسی غور و فکر اور پس و پیش کی حالتوں میں ویلم بنت عمر، زہیر بن قین کی زوجہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے شوہر کو مخاطب کر کے کہنے لگیں: "سبحان اللہ! فرزند رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا خاص آدمی تیرے پاس بھیجیں اور تجھے شرف حضوری سے سرفراز فرمانا چاہیں اور تو ان کی دعوت قبول نہ کرے؟ **اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ**"۔

عورت کی تنبیہہ نے شوہر کے بدن میں غیرت کا خون گرما دیا۔ آپ بے اختیار ہو کر اٹھے اور امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک امامِ وقت، سالارِ قافلۂ عشق کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ گفتگوئے امامؑ، زہیرؓ کے خانۂ دل میں اُتر گئی اور محبت کے مقناطیس نے قلبِ زہیر کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

جب اپنے خیمے میں واپس آئے تو مطمئن، مسرور اور فرحاں تھے۔ آتے ہی حکم دیا کہ ہمارے خیام اور برداری کے تمام سامان جنابِ امامؑ کے خیام کے متصل قائم کیے جائیں۔ اس کے بعد وہ اپنی خوش عقیدہ زوجہ کے پاس گیا اور کہا:

"میں نے تجھے طلاق دی، تجھے اجازت ہے کہ تو اپنے میکے چلی جا، میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد تو گرفتار ہو جائے اور لوٹے جانے کی مصیبت میں تو پڑے۔ میں نے پاکدامن امامؑ مضبوطی سے پکڑ لیا ہے کہ قیامت تک ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے"۔

یہ کہہ کر زہیر نے اپنا مال اسباب اپنے قریبی رشتہ داروں کے سپرد کر دیا اور اپنی نیک بخت بیوی کو بھی ان کے ساتھ کر دیا کہ اس کو اس کے میکے پہنچا دیں۔ اس کی نیک طینت بیوی اس کا یہ حال دیکھ کر بہت روئی۔ جناب زہیر کو الوداع کہا اور یہ دعا کی:

"كَانَ اللّٰهُ عَوْناً وَ مُعِيناً وَ خَارَ اللّٰهُ لَکَ"۔

"اللہ تیرا ناصر و مددگار ہو اور تیرے نصیب میں خیر عطا فرمائے۔"

"اَسْئَلُکَ اَنْ تَذْكُرَنِیْ فِی الْقِيٰمَةِ عِنْدَ جَدِّ الْحُسَيْنِ"۔

"میری تم سے یہی التجا ہے کہ روزِ قیامت جناب حسین علیہ السلام کے جدِ امجد کے پاس مجھے بھی یاد کرنا"۔

بعض کتب میں مرقوم ہے جیسا کہ اعثم کوفی کی فتوحات میں اور مقتل میں بھی یہ روایت ہے کہ ویلم زوجہ زہیر بن قین

نے شوہر کی یہ تقریر سن کر جواب دیا کہ: "تم تو فرزندِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رکاب میں حاضر رہ کر اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤ اور میں کیوں نہ دخترانِ محمد کی خدمت میں رہ کر سعادتِ ابدی حاصل کروں؟"

اپنی خالص الایمان اور کامل الاعتقاد بیوی کا ایسا پر اثر جواب سن کر زہیر کو سوائے سکوت کے اور کچھ جواب نہ بن پڑا چنانچہ کربلا میں جنابِ زہیر کی زوجہ ہمراہِ زہیر تھیں۔

منزلِ ثعلبیه

جنابِ مسلمؑ بن عقیلؑ و ھانیؓ بن عروہ کی شہادت کی خبر

یہ وہ منزل ہے جس میں خیامِ اہلِ بیتؑ میں کہرامِ ماتم بپا ہوا۔ اسی منزل پہ قافلہ بنی ہاشم کے جوانوں کو عقیلؑ و ہانی بن عروہؓ کی موت کی خبر پہنچی۔ مکہ سے رخصت ہونے کے بعد جو آنسو تھم گئے تھے، منزلِ ثعلبیہ میں یکبار بہنے لگے۔ مسافروں کے دل سینوں میں تڑپنے لگے اور چہرے اشکبار ہو گئے۔

بنی اسد کے دو شخص ہیں۔ عبداللہ بن سلیمان اور منذر بن مشمعل۔ جب یہ فریضہ حج سے فارغ ہوئے تو تیزی سے چلے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جلد ہی حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ مل جائیں اور حقیقتِ حالات سے آگاہی حاصل کریں۔ چنانچہ یہ بڑی سرعت کے ساتھ منازلِ سفر طے کرتے ہوئے منزلِ خزیمیہ پر امام علیہ السلام کے ساتھ مل گئے۔

اسی اثناء میں ایک آدمی کوفہ سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی امامؑ رُک گئے۔ چاہتے تھے کہ اسے کوفہ کے کچھ حالات معلوم کریں مگر اس شخص نے امام علیہ السلام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور راستہ چھوڑ کر دوسری طرف کا رخ اختیار کیا۔

امام علیہ السلام تو آگے نکل گئے۔ یہ دونوں اشخاص بیان کرتے ہیں:

ہم نے باہم مشورہ کیا کہ اس شخص سے ضرور کوفہ کے حالات معلوم کریں۔ چنانچہ ان دونوں ساتھیوں نے اپنے ناقے اس کے پیچھے دوڑا دیے اور بہت جلد اس کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے سلام کیا اور اس نے جواب دیا۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے اس کا نام و نسب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ: ''میں قبیلہ بنی اسد سے ہوں اور میرا نام بکر ہے۔''

ہم نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا ہم بھی بنی اسد قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اس سے کوفہ کی تازہ صورتحال دریافت کی۔ اس نے کہا:

''جنابِ مسلمؑ و ہانیؓ بیدردی کے ساتھ قتل کر دیے گئے ہیں اور میں اس وقت تک کوفہ سے باہر نہیں نکلا جب تک اپنی آنکھوں کے ساتھ یہ دردناک منظر نہیں دیکھا۔ جنابِ مسلمؑ و ہانیؓ کے پاؤں میں رسیاں بندھی ہوئی تھیں، کوفہ کے بازار تھے اور ان دونوں کی لاشیں تھیں۔ ظالم بے حرمتی کے ساتھ ان لاشوں کی تشہیر کر رہے تھے۔''

یہ خبرِ موت سن کر ہم واپس آ کر قافلۂ امامؑ میں شامل ہو گئے۔ دوسرے روز جب امام علیہ السلام نے منزلِ ثعلبیہ میں

قیام فرمایا تو ہم آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت کچھ خاص اصحاب بھی وہاں موجود تھے۔ ہم نے سلام عرض کیا۔ امامؑ نے سلام کا جواب دیا۔ ہم نے عرض کی: ''ہم ایک خبر گوش گزار کرنا چاہتے ہین۔ اگر آپؑ حکم دیں تو سب کے روبرو ورنہ تنہائی میں عرض کریں؟''

یہ سن کر امامِ عالی مقامؑ نے ایک نظر ہم پر ڈالی اور ایک نظر حاضرین کو دیکھا۔ پھر فرمایا: ''ان سے راز داری کی کوئی ضرورت نہیں''۔

اس وقت ہم نے عرض کیا: ''کل شام کوفہ سے آنے والے آدمی کو آپؑ نے دیکھا تھا اور آپؑ اس سے حالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے اس سے حالات معلوم کر لئے ہیں۔ وہ ہمارے قبیلہ کا آدمی ہے اور بڑا سچا اور بڑا عقلمند ہے۔ اس نے ہمیں بتایا ہے کہ جناب مسلمؑ و ہانیؒ شہید کر دیئے گئے ہیں اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اس وقت تک کوفہ سے باہر نہیں نکلا جب تک اس نے اپنی آنکھوں سے یہ پُر درد نظارہ نہیں دیکھا کہ ان کے پاؤں میں رسی باندھ کر بازاروں میں گھسیٹا جا رہا تھا''۔

یہ وحشت اثر خبر امام علیہ السلام نے سن کر کئی بار فرمایا:

''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَیْهِمَا''۔

یہ غمناک خبر سنی تو دل دھڑک گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اولادِ عقیلؑ کے دل بیقرار ہو گئے۔ خون کھولنے لگا۔ جب امام علیہ السلام نے پوچھا کہ اب تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے عرض کی: ''جب تک مسلمؑ کے خون کا بدلہ نہ لے لیں واپس نہیں پلٹیں گے، یا ہم سب ہی قتل ہو جائیں''۔

مولا علیہ السلام نے فرمایا: ''بیشک! مسلمؑ کے بعد اب زندگی میں لطف نہیں رہا۔''

عزادارو! پردیس میں مسافروں کے دل گھبرائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وطن کی جدائی کا صدمہ، سفر کی تکلیف اور بچھڑے ہوؤں کی یاد ہر وقت ستاتی ہے۔ اس عالمِ غربت اور ہولناک ماحول میں رنج والم کی منزل میں جب جنابِ مسلمؑ کی موت کی خبر اہل بیتؑ نے سنی ہو گی تو ان کے دلوں پر کیا گزری ہو گی؟ فرزندِ رسولؐ، جن کی نگاہ بار بار کوفہ کی جانب اُٹھتی تھی اور حالات کے منتظر رہتے تھے، یہ وحشت ناک خبر سن کر انؑ کا کیا حال ہوا ہوگا؟

مایوسی کی گھٹاؤں میں صحابیوں کو دیکھا۔ بنی ہاشم کے جوانوں کو دیکھا۔ آنکھوں سے اشکوں کی برسات جاری ہو گئی۔ کلیجے پارہ پارہ ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

تاریخ اعثم کوفی اور دوسری مقاتل کی کتب میں مرقوم ہے کہ فرزندِ رسولؐ نہایت حزن وملال کے ساتھ خیمہ میں داخل

ہوئے اور جنابِ مسلم بن عقیل علیہما السلام کی ایک دختر تھیں، جن کا نام عاتکہ ہے، سات سال کی عمر تھی، اسے اپنے پاس بلا کے اس کے سر پہ شفقت کا ہاتھ پھیرا، پیار کیا اور معمول سے زیادہ محبت کا اظہار کیا۔ چونکہ اولادِ مسلمؑ اپنے بابا کی خبر کی منتظر رہتی تھی اور خصوصاً یہ بچی ہر وقت بابا کو یاد کرتی رہتی تھی، اس نرالے پیار کو دیکھ کر گلوگیر آواز میں کہنے لگی:

''ماموں جان! آج زیادہ پیار کیوں کر رہے ہیں؟ آپ تو میرے سر پر اس طرح ہاتھ پھیر رہے ہیں جس طرح یتیموں پر شفقت کی جاتی ہے۔ ماموں جان! کیا میرے بابا کی کوئی خبر آئی ہے؟ میں یتیم تو نہیں ہوگئی؟''

یہ سننا تھا کہ مولائے مظلومؑ کی آنکھیں بادل کی طرح برس پڑیں اور فرمایا:

''ہاں بیٹی! تو یتیم ہوگئی ہے۔ تیرا بابا کوفہ میں مارا گیا ہے۔ آج کے بعد مجھے باپ سمجھنا۔''

خیامِ اہلبیت میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہائے مسلمؑ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ بیبیوں نے سر پیٹ لئے۔ اولادِ مسلمؑ نے سروں سے عمامے اتار دیئے اور ماتم کا کہرام بپا ہوگیا۔ یقیناً زہراؑ کی بیٹیاں اور مستوراتِ بنی ہاشم تڑپ گئی ہوں گی۔ جب سنا ہوگا کہ کوفہ کے بازاروں میں لاش کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ آہ! سیدانیوں کو عالمِ غربت میں مدینہ یاد آیا ہوگا۔ گھروں کا خیال کیا ہوگا اور بنی ہاشم کے پہلے شہید کی دردناک موت کا حال سن کر کسقدر بے چینی اور بیقراری ہوئی ہوگی۔

یہ صرف جنابِ مسلمؑ کی شہادت کی خبر نہیں تھی بلکہ بنی ہاشم اور آلِ رسولؐ کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ اس وقت غریب الوطن کی موت بنی ہاشم کی موت کی خبر دے رہی تھی اور زوجۂ مسلمؑ کی بیوگی اور اولادِ مسلمؑ کی یتیمی تمام سیدانیوں کے بے وارث ہونے اور تمام بنی ہاشم کے یتیم ہونے کا وقت قریب کر رہی تھی۔

روایات میں لکھا ہے کہ جنابِ مسلمؑ کی وہی یتیم بچی روزِ عاشور بعدِ شہادت حسین علیہ السلام جب سادات کے گھروں میں آگ لگی اور مستورات کے سروں سے چادریں اتار لی گئیں تو چھوٹے چھوٹے بچے روتے ہوئے فریادیں کرتے ہوئے جنگل کی طرف بھاگ گئے۔ مائیں بچوں کو نہ سنبھال سکیں اور بچوں کے ہاتھ سے ماؤں کے دامن چھوٹ گئے۔ فوجوں کی گھمسان تھی، بے تحاشا گھوڑے دوڑ رہے تھے، گھبراہٹ کا عالم تھا۔ جنابِ مسلمؑ کی یہ بچی دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی زد میں آکر زندہ پائمال ہوگئیں اور دکھیاری ماں بچی کو سنبھال نہ سکی۔ ہاں! لاش دیکھی جس پر گھوڑوں کے سموں کے نشان تھے۔

❁❁❁

قیامت کا عقلی ثبوت
انبیاء کی تبلیغ، لواء الحمد اور اھلبیتؑ کا کربلا میں داخلہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ".

"جزاء (قیامت) کے دن کا مالک ہے"۔

جس دن تمام بندوں کا حساب و کتاب ہوگا۔ بندے اپنے خالق و مالک کے روبرو پیش ہوں گے اور اپنے اعمال کی جزا و سزا پائیں گے۔ "الـدِّیـن" دین کا معنی جزاء ہے۔ عمل کا بدلہ دین مذہب کو بھی کہتے ہیں جس میں کچھ نظریات (عقائد) ہوتے ہیں اور کچھ ہدایات (احکام)۔ نظریات اصول کہلاتے ہیں اور ہدایات واحکام فروع۔

"اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ".

"بیشک خدا کے نزدیک قابلِ قبول دین اسلام ہے۔"

بندہ جس مذہب کا پیرو بن کر عمل کرے اور اس مذہب کے مطابق زندگی بسر کرے گا جزاء کی خاطر خدا سے معاوضہ وصول کرنے کے لیے تو وہ مذہب صرف اسلام ہے۔ اسی واسطے اسے دین کہا گیا ہے کہ قابلِ جزاء، لائق معاوضہ ہے۔

"یـوم الـدِّیـن" ضروری ہے، قیامت یقینی ہے، حشر ونشر لازمی ہے۔ ہم عقل کی روشنی میں قیامت کو ثابت کرتے ہیں۔ اسے ہم تین مراحل میں بیان کریں گے:

عقلی استدلال

پہلا مرحلہ

جب ہم نے اس کائنات اور اشرف المخلوقات انسان کا ایک خالق تسلیم کر لیا جس نے مختلف قسم کے انسان پیدا کیے۔ طاقتور بھی، کمزور بھی، شریف بھی، شریر بھی، قناعت کرنے والے بھی اور حریص ولالچی بھی، ظالم بھی اور صابر بھی۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے مل جل کر رہنا پڑتا ہے۔ جسے مدنی الطبع کہتے ہیں۔ یعنی ہر بشر اپنی زندگی میں دوسروں

کامحتاج ہے۔ نظامِ معاشرہ کومل جل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ کسان ہل چلانے اور بیج بونے میں، لوہار بڑھئی اور دوسرے لوگوں کا محتاج ہے۔لباس میں غیروں کا لباس۔ مکان بنانے میں، یعنی روٹی، کپڑا اور مکان حاصل کرنے میں کتنے افرادِ معاشرہ کا محتاج ہے۔ بیماری میں، صحت میں، حتّٰی کہ مرنے کے بعد غسل و کفن اور لحد میں اتارنے میں بھی غیروں کا محتاج ہے۔

جب زندگی گزارنے میں انسان کا مل جل کر رہنا ضروری ہے اور انسان مختلف طبیعتیں، مختلف مزاج اور مختلف جذبات کا مالک بنے۔ اسی معاشرہ میں ظالم بھی ہیں، مظلوم بھی ہیں، قوی بھی ہیں، ضعیف بھی، قناعت پسند بھی ہیں اور حریص ولالچی بھی، صابر بھی ہیں، غاصب بھی۔ غرض یہ کہ مختلف مزاجوں اور جذبوں والے ہیں اور مل جل کر رہنا بھی ضروری ہے تو ایسے قوانین اور دستور العمل کی ضرورت ہے جو معاشرہ کے ہر فرد کی حفظ و امان کی ضمانت دے کر عدل و انصاف قائم کر کے پرامن اور باوقار زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ منازلِ ترقی کی رہنمائی کریں۔

انسان ان قوانین اور ہدایات کی پابندی کر کے باعزت زندگی گزارے۔ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے، کسی کا جانی و مالی نقصان نہ کرے، کسی کی ہتکِ عزت کا جرم نہ کرے، کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ بغیر کسی کو نقصان پہنچائے مادّی و روحانی زندگی کے مدارج طے کرے۔ ایسے قوانین ہوں کہ جو معاشرہ کو دکھ سے دور رکھ کر سکھ سے ہمکنار کریں۔ رنج و الم سے نجات دے کر راحت اور آرام کے سائے مہیا کریں۔

کوئی عقلمند کوئی فلسفی، کوئی سیاستدان ایسے آئین اور ایسے قوانین کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اگر اس قسم کا دستور اور ایسے قوانین نہ ہوں تو معاشرہ اپنے ہاتھوں ہی خون کی ندیوں میں ڈوب کر ختم ہو جائے اور انسانیت کی ناؤ قتل و غارت کے منجدھار میں غرق ہو جائے۔

دو چیزیں قوموں کی تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہیں۔ دستور و قانون کا نہ ہونا یا آئین و قانون تو ہوں مگر ان پر عمل نہ ہو۔

دوسرا مرحلہ

جب ثابت ہو چکا کہ بنی نوع انسان کیلئے دستور العمل کی ضرورت ہے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ یہ دستور العمل انسان خود بنائے اور اپنی کامیاب زندگی کے لیے معاشرہ خود قوانین وضع کرے یا خالق و مالک یعنی خداوند عالم اپنی اشرف المخلوقات انسان کو باامن و باوقار زندگی گزارنے کے لیے خود دستور العمل بنا کر دے اور اس کی مادّی و روحانی زندگی کی ارتقاء کے لیے خود قوانین و ہدایات اور احکام وضع کرے۔

عقل سلیم بتاتی ہے کہ جس نے انسان کو پیدا کیا اور جس نے انسان کو معاشرتی اور تمدنی زندگی دی، اسی کا حق ہے کہ کامیاب زندگی گزارنے کیلئے اسے دستور العمل بنا کردے اور اپنی جانب سے انسانی معاشرہ کو ہدایات واحکامات جاری کرے۔

انسان خود ناقص ہے۔ اسے ظاہر کا علم ضرور ہے مگر باطن کا نہیں۔ حال جانتا ہے مگر مستقبل سے ناواقف ہے۔ آج کوئی قانون بناتا ہے، کل اسی کی خامی ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ قانون واپس لے لیتا ہے۔ فردِ واحد بنائے یا کوئی انجمن و کمیٹی یا کوئی اسمبلی اپنے بنائے ہوئے قوانین وآئین کو مکمل نہیں کہہ سکتی۔ اپنی غلطی کے احساس پر اور معاشرے کے احتجاج پر اپنا بنایا ہوا دستور واپس لے لیتی ہے یا اس میں ترمیم کرتی ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے۔ وہ انسان کے ظاہر کو بھی جانتا ہے اور باطن کو بھی۔ ماضی، حال اور مستقبل سے بھی واقف ہے۔ وہ انسان کی نفسیاتِ روحانی و مادّی اور انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو خوب جانتا ہے۔ جس نے خود انسان میں جذبات و محرکات پیدا کیے، خواہشات اور ارادے پیدا کیے۔ گوشت و پوست بنایا، خون اور ہڈیاں بنائیں، دل و دماغ بنایا، وہ اس کے تقاضوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اس کے لیے اس کے زمانے کے حالات کے مطابق دستور العمل وضع کرتا ہے۔

لہٰذا اس کے دستور العمل اور قوانین حیات مکمل مطابق تقاضائے بشری اور دونوں جہان کی کامیاب زندگی کے ضامن ہوتے ہیں۔

اگر انسان قانون بنائے تو وہ خود غرض ہے، قانون بناتے وقت اس کی ذاتی اغراض قانون کے خلوص کو مکدّر کرتی ہے اور قانون تمام و عام معاشرے کے مفاد کے بجائے چند اشخاص کی مفادی کڑیوں میں پابند ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو انسان سے، اس کی زندگی سے اور اس کی زندگی کے قانون سے کوئی غرض، مطلب یا طمع نہیں۔ اس کی ذات اس قسم کے اغراض و مفادات سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔ اس دستور اور قوانین سے صرف انسانی معاشرہ کا مفاد اور انسانی معاشرہ کی بہبود مقصود ہے اور وہ جو قوانین وہدایات جاری فرمائے گا، اس میں کسی فردِ واحد یا کسی خاص قوم کی بہبودی و بھلائی مقصود نہیں ہوگی بلکہ جملہ افرادِ انسانی کا مفاد و شرف، انسانیت کا ارتقاء دونوں جہانوں کیلئے ملحوظ ہوگا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اجتماعی وانفرادی زندگی کے لیے ہدایات واحکام جاری فرمائے جس کا نام شریعت ہے۔ یہ صحیفوں اور کتابوں کی صورت میں آئے اور اپنی طرف سے حکام بھی بھیجے جو ان قوانین و دستور، یعنی احکام وہدایت کو اپنی اُمتوں میں نافذ کریں اور خود عمل کر کے دکھائیں۔ ان حکام کو نبی، رسول و امام کہتے ہیں۔

خدا کی جانب سے نازل کردہ دستور العمل واحکام کا نام اسلام ہے جو دین ہے اور اس کے تحت احکام وقوانین کو

شریعت کہتے ہے۔

تیسرا مرحلہ

جبکہ ثابت ہو چکا ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنی اشرف المخلوق کو خود دستور العمل اور قوانین بنا کے اپنے خاص نائبوں (انبیاء و رسل اور آئمہ) کے ذریعے بھیجے ہیں تا کہ ہر زمانے کا انسان ان قوانین کے مطابق زندگی گزارے اور ان احکام کی پابندی کرے تا کہ کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے اور کوئی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اپنے خالق کے حقوق پہچانے اور بندوں کے حقوق پہچان کر انہیں ادا کرے۔ یہ قوانین و احکام دونوں جہان کی کامیاب زندگی کے ضامن ہیں۔

یہ تمام قوانین و احکام بیکار ہو جاتے ہیں جب تک ان پر عمل نہ کروایا جائے اور ان ہدایات کی خلاف ورزی پر سزا نہ دی جائے۔

جب کسی ملک کی کوئی قانون ساز کمیٹی قانون وضع کرتی ہے تو اس پر عمل کروانے کی کوشش کی بھی کرتی ہے اور قانون بنا کر اس ملک کے حکام کے ذریعے ان قوانین کو ملک کے اندر نافذ کرواتی ہے اور قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں مختلف قسم کی سزائیں مقرر کرتی ہے۔

کیونکہ جب تک خلاف ورزی کرنے والوں کو، احکام کو قبول نہ کرنے والوں اور مجرموں کو سزائیں نہ دی جائیں تو قانون بے اثر ہو جاتا ہے اور معاشرہ بگڑ جاتا ہے، امن و سکون ختم اور قتل و غارت عام اور ملک برباد ہو جاتا ہے۔

قانون بنانے والے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کی خود سزا تجویز کرتے ہیں اور اپنے نمائندوں، نائبین اور کارندوں کے ذریعے سزا دلواتے ہیں۔

خداوندِ عالم نے انسان کو ہر زمانے میں دستور العمل اور ہدایات عطا فرمائیں اور تعمیل احکام کی صورت میں نیک بدلہ، جزا اور بدعملی، نافرمانی اور احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا کا وعدہ فرمایا ہے اور ہر زمانے کے انسان کے لیے حسنِ عمل کی صورت میں ثواب اور نافرمانی اور بدعملی کے بدلے میں عذاب کیلئے ایک دن مقرر فرمایا ہے، جس کا نام ہے "یوم الدین" روزِ جزاء، یعنی قیامت۔ اسی لئے فرمایا:

"مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ".

"روزِ جزاء کا مالک ہے"۔

اثباتِ قیامت کی دوسری عقلی دلیل

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دارِ دنیا میں کئی ظالم اشخاص اپنے ظلم کی سزا نہیں پاتے۔ چور، ڈاکو، قاتل اور بندوں پر ظلم کرنے والے، فساد برپا کرنے والے، قوانینِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والے، بیگناہ افراد کو بے دریغ قتل کرنے والے، امنِ عالم کو تباہ کرنے والے، دنیوی عدالتوں سے بری ہوجاتے ہیں اور اپنے کیے کی سزا نہیں ملتی۔

ظالم وسفاک بادشاہ ہوسِ ملک گیری اور کثرتِ فتوحات کی حرص میں ملکوں کو تباہ و برباد کردیتے ہیں۔ ہزاروں عورتوں کے سہاگ لٹ جاتے ہیں، ہزاروں بچے یتیم ہوجاتے ہیں، ان کے اموال لوٹ لئے جاتے ہیں اور بستیوں کی بستیاں ویران ہو جاتی ہیں لیکن ان خونریز اور سفاک حکمرانوں کو دنیا میں کوئی سزا نہیں ملتی۔

اگر خداوندِ عالم مالک الملک ان کو سزا نہ دے تو اس کو عادل نہیں کہہ سکتے اور اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ خدا نے ان ظالموں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اگر ان کا مواخذہ نہ کرے تو مطلب یہ ہے کہ خدا (معاذ اللہ) ان کے ظلم، قتل وغارت اور خونریزی پر راضی ہے (العیاذ باللہ) اس صورت میں خدا ظالم کہلاتا ہے۔ حالانکہ خدا عادل ہے، اس نے عدل کا حکم دیا ہے، وہ عدل کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا عدل کا تقاضا ہے کہ ظالم کو ظلم کی سزا دے اور مظلوم کو اس کی بے گناہی اور اس کے صبر پر اس کو نیک جزاء دے۔

لیکن اس دنیا میں اکثر ایسا نہیں ہوتا ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ خدائے قادر و قہار نے ایک دن مقرر فرمایا ہے جس دن ظالم و مظلوم، قاتل و مقتول، بدکار و نیکوکار کو اس دن اکٹھا کر کے عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور مجرموں کو سزا دے گا۔ اسی دن کو 'یوم الدین' کہا گیا ہے۔

جو احکام اس نے تعمیل کیلئے اپنے انبیاء و مرسلین کے ذریعہ بندوں تک پہنچائے ان احکام کی نافرمانی میں بہت کم اس دنیا میں سزا دی ہے۔ چونکہ تعمیل ہدایات کی صورت میں نیک جزاء اور خلاف ورزی کی صورت میں عذاب کی سزا ضروری ہے۔ ورنہ ہدایات واحکام کا بھیجنا فضول اور بیکار ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک ایسے دن پر ایمان لانا پڑتا ہے جس دن احکم الحاکمین بندوں کو اکٹھا کر کے ان سے باز پرس کرے گا اور ان کے اعمال کے بدلہ ثواب عقاب دے گا اور وہ "یوم الدین"، جزاء اور قیامت کا دن ہے۔

یہ دنیا دارالاعمال ہے اور اگلا جہان دارالجزاء ہے۔ اس نے دو جہان بنائے۔ ایک جہان کارکردگی کا اور دوسرا جہان

اس کارکردگی کے صلے کا۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

"اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ".

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

یہ دنیا اگلے جہان کی کھیتی ہے۔ جو اس دنیا میں اعمال کی زمین میں بوؤ گے، اسی کا پھل اگلے جہان جزاء کی صورت میں حاصل کرو گے۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید جو ز جو

"اے انسان! اپنے عمل کے بدلے سے غافل نہ ہو۔ گندم بونے سے گندم اور جو کاشت کرنے سے جو کاٹے گا۔"

جو بوئے گا اسی کا پھل کاٹے گا۔ نیکی کاشت کرے گا تو نیکی کا میٹھا پھل پائے گا۔ بدی بوئے گا تو بدی کا تلخ ثمر حاصل کرے گا۔

ایک اہم سوال اور اس کا تسلی بخش جواب

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر انسان کو نیکی کرنے کے بعد فوراً نیک اجر مل جاتا تو نیکی عام ہو جاتی۔ اور نیک بدلے کے طمع میں اسے نیکی کرنے کا شوق اور بھلائی کی عادت ہو جاتی۔ اور اس فوری جزا کی صورت میں پورا معاشرہ نیکیوں کی طرف سبقت کرتا۔

اسی طرح برائی کرنے کی صورت میں آدمی کو جب فوراً سزا مل جاتی تو فوری سزا کے خوف سے کوئی برائی نہ کرتا، اس طرح برائیاں ختم ہو جاتیں اور معاشرہ نیکیوں سے بھر جاتا اور یہ دنیا امن و سلامتی کا گہوارہ بن جاتی۔

بے شک یہ سوال اہم ہے۔ اب اس کا اہم اور معقول جواب بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اگر دنیا دار الجزاء بھی بن جائے کہ نیکوں کو ان کی نیکی کے بدلے دولت و مال، صحت و نعمتوں کی صورت میں ملنے لگے تو لوگ نیکیوں کو کاروبار کی حیثیت سے اختیار کر جائیں گے۔ از روئے ایمان اور حکم الٰہی امر مولا سمجھ کر نہ کریں گے اور اعمالِ صالحہ کی روحانی قدر تقرب خدا کا ذریعہ ہونے کی حیثیت ختم ہو جائے گی اب جتنی عبادات ہیں ان کی نیت میں "قُربۃً اِلَی اللّٰہ" کے الفاظ آتے ہیں۔

جب دینوی نعمات کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر عبادات بجالائی جائے گی تو "قُربةً اِلَی اللّٰہ" کی نیت ختم ہوجائے گی۔اس طرح لوگ نیکی کرنے پر مجبور ہوجاتے جس طرح پیٹ پالنے اور کسب و ہنر کی خاطر مجبور ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر کاروبار کے گزارہ نہیں ہوتا اسی طرح نیک امور، عبادات اور اعمال صالحہ بجالانے میں بااختیار نہ رہتے بلکہ دینوی نعمتوں کی لالچ میں بطور کاروبار کے استعمال کرتے، اس طرح یہ امور عبادت نہ قرار پاتے اور نیکیوں کو احکامِ خداوندی نہ سمجھا جاتا اور خدا کی عظمت دلوں میں نہ رہتی اور روحانی اقدار ختم ہوجاتیں اور عبد و معبود کے درمیان واسطہ اور تعلق پیدا نہ ہوتا۔

اسی طرح برائیوں کو حکم الٰہی سمجھ کر ان سے پرہیز نہ کی جائے بلکہ فوری سزا کے خوف سے ان سے دور رہا جائے تو یہ اپنی ذاتی حفاظت کا سامان ہوگا۔ جس طرح انسان خطرناک چیزوں سے ڈر کر کنارہ کش رہتا ہے۔ سانپ، بچھو، درندوں، موذی جانوروں اور مضرِ صحت و جان اشیاء سے پرہیز کرتا ہے۔ تو جسمانی صحت و حفاظت کے لئے یہ سب کچھ ہوگا۔ ایمان، خوفِ خدا، عظمتِ خالق، روحانی ترقی اور تقربِ خدا کا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔

اوامر و نواہی کو خدائی ہدایات نہ سمجھا جاتا اور تکلیف ختم ہوجاتی اور اعمال صالحہ اور معاصی، دینوی امور اور دنیوی زندگانی کا ایک حصہ بن جاتے۔

اطاعت اور عمل صالح تو یہ ہے کہ حکم خدا اور خوشنودیٔ خالق کا ذریعہ سمجھ کر کیا جائے اور اس کے بجالانے سے خدا کی رضا مقصود ہو۔ اسی طرح بدی سے بچنے کا بھی یہی مقصد ہونا چاہیے۔

اسی لئے خالق کائنات نے روز جزا کو روز عمل سے الگ بنایا ہے۔ بدلے کا دن کام کے دن سے جدا ہے اور پھل پانے کا وقت کاشت کرنے کے وقت سے علیحدہ ہے۔ اس نے دو جہان بنائے۔ یہ جہان عمل کا، محنت و مشقت کا اور کوشش و ہمت کا ہے، اگلا جہان اس محنت و عمل کے ثمر کا ہے، کوشش کے نتیجہ کا ہے، کام کی جزاء کا ہے، تاکہ اس دنیا میں کرنے کی باتیں امر خدا سمجھ کر کی جائیں اور نہ کرنے کی باتیں نہی سمجھ کر ان سے پرہیز کیا جائے۔

ان دونوں جہانوں کو "دارین" کہا گیا ہے۔ دارِ دنیا یہ جہان اور دارِ آخرت اگلا جہان ہے۔

انبیاء و مرسلین

مذکورہ بالا عقلی دلیلوں سے جب قیامت کا حق ہونا ثابت ہوگیا۔ تو ہمیں چاہیے کہ وہ امور تلاش کریں جن کے بجالانے سے خالق خوش ہوتا ہے اور اگلے جہان میں نیک بدلہ دے گا اور ایسے اُمور کی پہچان کریں جن سے رُکنا ضروری ہے اور

ان کے کرنے سے خدا ناراض ہوتا ہے اوران کے ارتکاب پر خدا بروز قیامت سزا دے گا۔

کچھ اُمور تو ایسے ہیں جن کی اچھائی و برائی عقل و دانش معلوم کرلیتی ہے۔ مثلاً سچ بولنا، بھلائی کرنا، والدین کی خدمت کرنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، دھوکہ نہ دینا، ظلم نہ کرنا، کمزوروں کی مدد کرنا، غریبوں اور بیماروں کیساتھ ہمدردی کرنا، بیماروں کی عیادت کرنا، کسی کی برائی نہ کرنا۔ مسافروں کے ساتھ حُسن سلوک کرنا، مہمانوں کی عزت کرنا، کسی کی جان وعزت پر حملہ نہ کرنا، کسی کا ناحق مال نہ چھیننا وغیرہ۔ ایسے امور ہیں جنہیں معاشرہ عقلِ سلیم کی روشنی میں اچھا یا برا کہتا ہے اور اس کے لئے ایک بہترین معیار ہے۔

جو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسروں کیلئے بھی پسند کر اور جو اپنے لئے پسند نہیں کرتا وہ دوسروں کیلئے بھی پسند نہ کر۔

یہ ایک ایسا عمدہ ضابطہ ہے جس پر عمل کرنے سے دنیا امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ لیکن اسلام چونکہ ایک روحانی مذہب ہے، مادّی مسلک نہیں ہے اور ہم خدا کو خالق و مالک جانتے ہیں۔ اس واسطے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کا تعلق بھی قائم ہے۔ اس واسطے اگلے جہان کی آبادی اور روحانی ترقی کے لئے خدا سے پوچھ سکتے ہیں۔ خدایا! تو نے ہمیں کیوں پیدا کیا؟ ہمارے پیدا کرنے سے تیرا کیا مقصد ہے؟ تو ہم سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا؟ جب تو نے دو جہان بنائے ہیں، یہ جہان عمل کا اور دوسرا جہان بدلے کا، تو ہم کیسے عمل کریں جس سے اگلے جہان کو آباد کریں۔ یہ اُمور ایسے ہیں جہاں ہماری عقلیں کند ہو جاتی ہیں، دانش ساتھ چھوڑ جاتی ہے، سمجھ کچھ کام نہیں کرتی، اس واسطے خالق تو ہی بتا ہمارے اس صحیح وفطری سوال کا جواب۔

خداوندِ عالم نے اس کا جواب پہلے ہی دے دیا۔ انہی باتوں کو بتانے اور پہنچانے کیلئے خداوندِ عالم نے ہم میں اپنے نمائندے بھیجے، جو ہیں تو انسان لیکن نمائندگی خدا کی کرتے ہیں، رہتے ہم میں ہیں لیکن نیابت خالق کی کرتے ہیں۔

ہم مادّی کثافت میں آلودگی کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ اس سے براہِ راست پوچھ سکیں اور وہ انتہائے تجرد کی بناء پر ہم سے بات نہیں کرتا۔ اس واسطے ہمارے اور اس کے درمیان ایسے وسائط اور وسائل ہیں جو ہم سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور اُس سے بھی۔ ہم سے بھی مانوس ہیں اور اُس کے بھی محبوب ہیں۔

ہم سے ہیں، لیکن ہم ایسے نہیں ہیں، اُس سے ہیں، لیکن اُس جیسے نہیں، نورانی وروحانی پہلو بھی رکھتے ہیں اور مادی و بشری پہلو بھی رکھتے ہیں، اگر روحانی ونورانی پہلو نہ ہو تو اس سے احکام وہدایت لے نہیں سکتے اور اگر مادی وبشری پہلو نہ ہو تو ہمیں ہدایات دے نہیں سکتے۔

ان دونوں جنبوں کے مالک وسائط کو اصطلاح اسلام میں انبیاء ومرسلین کہا جاتا ہے۔ خدا کی طرف سے خبریں دیتے

ہیں، اس واسطے ان کو نبی کہتے ہیں۔ خدا کے بھیجے ہوتے ہیں اس واسطے ان کو رسول کہا جاتا ہے۔ جو کرنے کی باتیں ہمیں بتاتے ہیں ان کو اوامر، امر کی جمع بمعنی حکم اور جو نہ کرنے کی ہیں ان کو نواہی کہتے ہیں۔ یعنی خدا کی جانب سے وہ اوامر و نواہی لاتے ہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں ان کو یوم الدین میں نیک بدلے کی بشارت اور خوشخبری دیتے ہیں۔ اس واسطے ان کو "مبشرین" کہا گیا ہے اور جو لوگ خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اس کے نافرمان بندے ہیں ان کو "یوم الدین" کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ اس واسطے ان کو منذرین کہا جاتا ہے:

"كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْن و اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزانَ".

جب ہمیں قیامت کے واقع ہونے کا یقین ہوگیا، جزاء و سزا کے دن کی آمد یقینی ثابت ہوگئی۔ اب اُمور کا پتہ بھی چل گیا جن کی تعمیل ہمیں جنت میں لے جائے گی، ان باتوں کا بھی علم ہوگیا جو ہمیں دوزخ میں لے جائیں گی، تو اب اس دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کو بجالانا ضروری ہے تاکہ روزِ قیامت جب ہم خدا کے روبرو پیش ہوں تو وہ راضی ہوتا کہ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ایسی باتوں سے پرہیز کریں جو خالق اور مالک یوم الدین کی ناراضگی کا باعث ہیں تاکہ ہم اس کے غضب سے بچیں اور سزا کے مقام دوزخ میں نہ جائیں۔

"فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيْشَةٍ رَاضِيَةٍ و اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُمُّهُ هَاوِيَةٌ".

"جس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا وہ پسندیدہ اور عیش و آرام کی زندگی میں ہوگا اور جس کا نیکیوں والا پلڑا ہلکا ہوگا اس کا ٹھکانہ "ہاویہ" ہوگا۔"

لواء الحمد

قیامت کا منظر سخت ہولناک ہوگا اور ایسے ہول و خطرہ کے موقع پر سہارا ڈھونڈا جاتا ہے۔ سورج کی دھوپ، سخت گرمی، لوگ پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ دھوپ سے بچنے کا سہارا سایہ ہوتا ہے۔ روزِ محشر سایہ کی تلاش ہوگی۔ ہاں! سایہ دستیاب ہوگا مگر جن کے ہاں سایہ ہوگا اگر دنیا میں ان سے عداوت رہی، ان کے حقوق نہ پہچانے اور پہچان کرادا نہ کئے گئے تو اس سایہ کی ٹھنڈک سے حرمان نصیب ہوگا۔

اے مسلمان! اگر جزا کے دن سورج کی گرمی سے بچنے کے لئے سایہ کا خواہش مند ہے۔ تو آ تجھے سائے کا پتہ دیتا

ہوں، مگر اس سایہ تک پہنچنے کے لئے بھی سایہ داروں کی معرفت کر لے، ان کی محبت کے سائے تلے آ جا اور ان کو پہچان۔ آ تجھے پہچان بھی کرا دوں۔

سایہ ایک علم کے پھریرے کا ہوگا۔ اس کا نام "لواء الحمد" ہے۔ قیامت اس کا اٹھانے والا وہی ہوگا جو زمانۂ رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تمام جنگوں میں علمبردارِ اسلام رہا جس کے ہاتھ میں ہر جنگ میں اسلام کا علم رہا اور اس نے علم کی لاج رکھی۔ جو میدانِ جنگ میں بلند کئے رہا اور اس وقت تک میدان سے واپس نہ پلٹا جب تک جنگ کو فتح نہ کر لیا۔ جو دنیا میں رسولؐ پاک کا علمدار رہا آخرت میں بھی وہی صاحبِ علم ہوگا۔

یاد رکھ! اس علم سے وہ قیامت کا علم بھاری ہوگا۔ جو اس دنیا میں علم کو نہ سنبھال سکے وہ قیامت کے روز اتنے بڑے علم کو کیسے اٹھا سکیں گے؟ علم ہر ہاتھ میں نہیں سجتا۔ علم اٹھانے کے لیے بھی ہاتھ چاہئیں اور وہ ہاتھ یداللّٰہی ہیں، فاتحِ خیبر، قاتلِ مرحب وعنتر، ابوطالبؑ کے دلبر، رسولؐ کے برادر، زہراؑ کے شوہر، والدِ شبیرؑ وشبرؑ، شیعوں کے رہبر، علی ابن ابیطالب علیہم السلام جیسا کہ کنز العمال، معجم کبیر طبرانی، فردوس الاخبار دیلمی اور مناقب خوارزمی میں ہے:

"عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ بِعَلِیٍّ اَنْتَ اِمَامِی فِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ فیندفع الی الِواءُ الحمد فارفعہٗ الیکَ وَاَنْتَ تَزُوْدُالنَّاسَ عَنْ حوضی".

"جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یا علیؑ تم قیامت کے روز میرے آگے آگے ہو گے، مجھے لواء الحمد دیا جائے گا اور میں وہ تمہیں دے دوں گا اور تم ہمارے حوضِ کوثر سے لوگوں کو ہٹاؤ گے۔"

"عن جابر بن سمرہ رضی اللّٰہ تعالی عنہ قالوا یا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم من یَحمل رایتکَ یوم القیامۃ قالَ من یخسن ان یحملھاالا من حملھَا فی الدنیا علی ابن ابیطالب علیہ السلام".

"جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ اصحاب نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے روز آپ کا لواء (علم) الحمد کون اٹھائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: اس کے سوا کوئی نہ اٹھائے گا جو دنیا میں اٹھاتا رہا اور وہ علیؑ ابن ابیطالبؑ ہے"۔

"عن ابن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلم بِعَلِیٍّ انت تغسل جثتی و تُوَدّی دینی وتوارینی فی حفرتی و تفی بذمتی و انت

صاحب لوائی فی الدنیا و الآخرۃ"۔

"جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یا علیؑ تو مجھے مرنے کے بعد غسل دے گا اور تو ہی میرا قرضہ ادا کرے گا اور تو ہی مجھے قبر میں دفن کرے گا۔ تو ہی میری ذمہ داری کو پورا کرے اور تو ہی میرے علم کو دنیا اور آخرت میں اٹھائے گا"۔

اس لوائے الحمد میں اتنی وسعت ہوگی کہ جتنے سچے حبدار ہوں گے سب اس کے سائے میں پناہ لے سکیں گے۔ اس واسطے مسلمانو! علیؑ کا حق پہچانو۔ جس مرتبے کا مالک ہے، اس مرتبے کے مطابق مانو، سایۂ علیؑ اس کو نصیب ہوگا جس کے ہاتھ میں ان کا دامن ہوگا، جس کی زبان پر انؑ کا ذکر ہوگا، جس کے دل میں انؑ کی محبت ہوگی، جن کے قدم انؑ کے نقش قدم پر چلیں گے۔

بیشک یومِ جزاء کا مالک خدا ہے لیکن اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے سید الانبیاءؐ، امام الاتقیاءؑ، سیدۃ النساءؑ، حسن مجتبیٰؑ، سید الشہداءؑ، خمسہ نجباءؑ، کشتی نجات کے ناخدا اور شیعوں کے رہنما ہیں۔

جنہوں نے دنیا کی تکلیفوں میں اس کا ساتھ دیا، دُکھ سکھ میں ان کے ساتھ رہے، سفر و حضر میں ان کے خدمتگزار رہے، محشر میں بھی ان کے ساتھ رہیں گے۔

حضراتِ مومنین! آپ نے زہیر بن قین کا حال تو سنا ہے۔ جب صحرائے غربت میں شمع امامت کو روشن دیکھا تو پروانہ وار آ کر گرد گھومنے لگے۔ اسی طرح اس سفرِ پُرخطر کی منزلوں میں سچے حبدار شامل ہوتے گئے۔ جو مالِ غنیمت اور دنیوی لالچ کے لیے جمع ہوئے تھے، وہ ساتھ چھوڑ گئے اور جو سچے فدائی اور کھرے شیدائی تھے، وہ گرد جمع ہونے لگے۔

حُرؑ کی ملاقات

قارئین کرام! آپ پڑھ چکے ہیں کہ ابن زیاد نے امام حسین علیہ السلام کو محصور کرنے کے لیے ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی تھی۔ ہر طرف سے راہیں بند ہیں۔ آپؑ منزل شراف میں پہنچے تو حر بن یزید الرّیاحی ایک ہزار سواروں کے ساتھ آپؑ کے مقابل آیا۔ دوپہر کا وقت تھا، سخت گرمی تھی، شدتِ پیاس سے گھوڑوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور سوار بدحواس تھے۔

ساقیِ کوثر کے فرزند نے، کریم ابن کریم نے جب ان کی بدحالی دیکھی تو غلاموں کو حکم دیا کہ پانی مشکیں جو ہمراہ ہیں، ان کے دہانے کھول دو اور اس لشکر اور ان کے گھوڑوں کو سیراب کر دو۔

حکم امام ملتے ہی تعمیل شروع ہوگئی۔ سواروں اور گھوڑوں نے سیر ہو کر پانی پیا۔ ساقیٔ کوثر کے فرزند کی اخلاقی فیض

رسائیوں سے حر کا تمام لشکر سیراب ہو گیا اور پیاس سے ان کے جلتے ہوئے دلوں اور دہکتے ہوئے کلیجوں کی آگ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔

اس اثناء میں ظہر کا وقت آ گیا۔ امام علیہ السلام نے نماز پڑھائی اور حر نے بھی امام علیہ السلام کی اقتداء میں نماز پڑھی۔

بعدِ نماز حر نے کہا: ''ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ کو گھیر کر ابن زیاد کے سامنے لے جا کر پیش کریں''۔

جنابِ امام حسین علیہ السلام نے اس طرح جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ:

''اہل کوفہ کی دعوت پر میں نے کوفہ کا قصد کیا ہے، اگر تمہیں میرا آنا پسند نہیں تو میں جہاں سے آیا ہوں واپس چلا جاتا ہوں''۔

اس کے بعد آپ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سوار ہو جاؤ۔ چنانچہ جب قافلہ تیار ہو گیا اور مستورات بھی سوار ہو گئیں تو آپ نے حکم دیا کہ واپس چلو۔ جب واپس چلنے لگے تو حر اپنی سپاہ کے ساتھ راستے میں حائل ہو گیا اور واپس جانے سے روکنے لگا۔ امام علیہ السلام نے حر سے فرمایا:

''ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ مَا تُرِیْدُ''.

''تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے! تو کیا چاہتا ہے؟''

حر نے جواب میں کہا: ''اگر آپ کے علاوہ کوئی اور شخص یہ کلمہ مجھے کہتا تو بھی ضرور اسے ویسا ہی جواب دیتا مگر آپ کی والدہ ماجدہ کا خیر و خوبی کے سوا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔''

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''آخر تو چاہتا کیا ہے؟''

حر نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ آپ کو عبید اللہ بن زیاد کے پاس لے جاؤں''۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''خدا کی قسم! میں اس طرح تیری بات نہیں مانوں گا''۔

حر نے کہا: ''خدا کی قسم! میں بھی آپ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا''۔

اسی طرح ہر دو جانب سے یہی خیالات ظاہر کیے گئے۔ اس کے بعد حر نے کہا:

''مجھے آپ سے لڑنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ مجھے تو صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ جب آپ مل جائیں تو جب تک آپ کو کوفہ نہ پہنچا لوں، آپ سے جدا نہ ہوں۔ لیکن آپ اگر ایسا نہیں کرتے تو پھر ایک اور طریقہ یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا راستہ اختیار کریں جو نہ کوفہ کو جاتا ہو اور نہ ہی مدینہ کو۔ اس کے بعد میں ابن زیاد کو صورتحال لکھوں گا، شاید خدا مجھے آپ کے ساتھ جنگ کرنے

سے بچائے"۔

امام علیہ السلام نے حر کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے عذیب وقادسیہ کی راہ سے ہٹ کر بائیں طرف مڑ کر سفر شروع کیا۔ حر بھی تھوڑے فاصلے پر ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ آپؑ جب منزل "عذیب الہجانات" پر پہنچے۔ آپؑ نے قیام فرمایا اور تھوڑ فاصلے پر حر نے بھی اپنے سپاہیوں سمیت قیام کیا۔

اسی منزل پر کوفہ سے چار آدمی اپنی اپنی سواریوں پر سوار وارد ہوئے۔ یہ چار شخص عمر بن خالد صیداوی، اس کا غلام، سعید مجمع بن عبداللہ مذحجی اور نافع بن بلال تھے اور پانچویں بزرگ ان کا راستہ بتانے والے طرماح بن عدی تھے۔ یہ لوگ قافلہ امامؑ میں شامل ہو گئے۔ حر نے انہیں گرفتار کرنا چاہا تو امامؑ نے فرمایا: "اب چونکہ یہ میرے پاس پہنچ گئے ہیں، لہذا یہ میرے پہلے ساتھیوں کی طرح میری حفاظت میں ہیں۔"

یہ سن کر حر خاموش ہو گیا۔ جب امام حسین علیہ السلام سرزمینِ نینوا کے قریب پہنچے اور حر بھی اپنی سپاہ سمیت ساتھ ساتھ تھا تو کوفہ کی طرف سے ایک مسلح ناقہ آتا ہوا دکھائی دیا اور اس کو دیکھ کر سب رک گئے۔ جب قریب آئے تو اس نے حر اور اس کے ساتھیوں کو سلام دیا اور امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب کو سلام نہ کیا۔

اس نے حر کو ابن زیاد کا خط دیا، جس میں لکھا تھا:

"جب تمہیں میرا یہ خط ملے تو وہیں حسینؑ کو روک لو۔ تو اس کو ایسی جگہ اترنے پر مجبور کرو جہاں پانی اور سبزہ نہ ہو۔ میں نے اپنے قاصد کو کہہ دیا ہے کہ تعمیل حکم کے لیے تمہارے ساتھ ساتھ رہے۔"

حر نے امامؑ کو خط کے مضمون سے آگاہ کیا اور تعمیلِ حکم کے لیے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا:

"مجھے غاضریہ، نینوا یا شفیہ میں اترنے کی اجازت دو۔"

حر نے کہا: "مجھے حکم ہے کہ آپؑ کو ایسی جگہ اتاروں جہاں پانی اور سبزہ نہ ہو۔ لہٰذا میں ایسا نہیں کر سکتا"۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے حر سے فرمایا: "ہمیں تھوڑا سا آگے چلنے دو"۔

تھوڑا آگے ہی چلے تھے کہ امام علیہ السلام کا گھوڑا چلتے چلتے رک گیا۔ ہر چند آپؑ نے راہوار آگے بڑھانے کی کوشش کی مگر اس نے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ اکثر تاریخوں سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ آپؑ نے متعدد سواریاں بدلیں مگر کسی نے بھی اپنے مقام سے آگے حرکت نہ کی۔

تب امام علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ اس جگہ کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اس زمین کو کربلا کہتے ہیں۔ اس

وقت امام علیہ السلام نے فرمایا:

''خدا کی قسم یہی زمین رنج ومصیبت کی ہے۔ یہیں ہماری سواریاں بٹھائی جائیں گی۔ اسی مقام پر ہماری قبریں بنیں گی اور اسی جگہ سے ہم قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے۔ ان تمام باتوں کی خبر مجھے جدِ بزرگوارؐ نے دے دی ہے''۔

یہ فرما کر آپؑ گھوڑے سے اتر پڑے۔ یہ دوسری محرم اور پنجشنبہ کا دن اور ۶۱ ہجری کا واقعہ ہے۔

امام ابواسحاق کا بیان ہے:

''سواری کے رُک جانے کے بعد آپؑ نے اس زمین سے ایک مشتِ خاک اٹھائی اور اس کو سونگھا۔ پھر آپؑ نے جیب سے خاک نکالی، اس کو بھی سونگھا۔ ان دونوں خاکوں کو ملایا۔ ان کا رنگ بھی ایک جیسا تھا اور خوشبو بھی ایک جیسی تھی۔ آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ مٹی ہے جو حضرت جبرئیلؑ نے میرے نانا محمد مصطفےٰؐ کو دی تھی''۔

جنابِ امامؑ نے قرینے سے معلوم کرلیا کہ اس مٹی کی خوشبو میری موت کا پیام ہے اور اپنی وعدہ گاہ کو پہچان گئے۔ ایک آہِ سرد کھینچی اور فرمایا:

''میرے قتل کا اور زینبؑ و ام کلثومؑ کی قید کا مقام آگیا ہے۔ بخدا میں اپنی وعدہ گاہ پر پہنچ گیا ہوں۔ یہیں ہماری قبریں بنیں گی۔ یہاں ہمارے گھر جلائے جائیں گے۔ بتولؑ زادیوں کے زیورات لوٹے جائیں گے۔ آلِ رسول کو قید کیا جائے گا۔ میرے گلے کی شہ رگ کاٹی جائے گی اور میری ڈاڑھی خون سے خضاب ہو جائے گی۔ اسی زمینِ کربلا پر میرے ناناؐ اور میرے ماں باپؑ کو آسمان کے فرشتے ہماری موت کا پرسہ دیں گے۔ اس مقام کا پروردگارِ عالم نے میرے ناناؐ سے وعدہ فرمایا ہے''۔

یہ فرما کر آپؑ ساتھیوں سمیت اتر پڑے اور اسی جگہ مستقل قیام فرمایا۔ بہر حال حُر نے ابن زیاد کے حکم کی تعمیل میں فرزندِ رسولؐ اور اولادِ بتولؑ کو پانی کے نزدیک قیام نہ کرنے دیا اور دریا و نہر علقمہ سے دور خیام لگانے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ امام پاک نے ہر چند کہا کہ بستی نینوا، غاضریہ، شفیہ میں کسی آبادی میں قیام کرنے دیا جائے تاکہ مستورات اور اطفالِ خورد سال کو پانی میسر آ سکے اور جنگل کی وحشت اور پانی کی تکلیف سے محفوظ رہیں۔

بالآخر فرمانِ امام علیہ السلام کے مطابق ایک غیر آباد اور سنسان جگہ پر خیام نصب کئے گئے۔

ارضِ مقدس کربلا

کوفہ سے کچھ فرسخ دور دریائے فرات کے کنارے غیر آباد ریگستان ہے جسے کربلا کہتے ہیں۔ اس ریگستان سے ملحق چند بستیاں آباد تھیں جن میں مختلف عرب قبائل بستے تھے۔ ان میں زیادہ تر قوم بنی اسد رہتی تھی۔ ان بستیوں کے نام نینوا، غاضریہ،

شفیہ، ماریہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی ہستی غاضریہ تھی۔

اے خاکِ کربلا تو اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشہ بتولؑ

اے زمین کربلا! تیرے شرف میں کوئی قطعہ زمین شریک نہیں۔ تیری آغوش میں بنت سید الانبیاءؐ کے گود کے پالے آرام فرما ہیں۔ تیری خاک میں اولادِ بتولؑ کا خون شامل ہے۔ تیری ریت پر ذریت بتولؑ چند دن مہمان رہی۔

اے زمین کربلا! کیسے شریف مہمان تجھ پر آ کر اترے۔ کیسی مقدس ہستیوں نے تجھ پر ڈیرہ ڈالا۔ تو نے مہمان نوازی نہیں کی۔ ذریت رسولؐ تیری خاک پر بھوکی پیاسی تڑپتی رہی۔ لیکن تیری گود میں نہر علقمہ بہتی رہی اور معصوم بچے بوند پانی کیلئے ترستے رہے۔ تو کس جگر کے ساتھ زہراؑ کی بیٹیوں کو اُجڑتے دیکھتی رہی۔ تیری گرم خاک پر اٹھارہ بنی ہاشم کی لاشیں بے گور و کفن تڑپتی رہیں۔

اے خاک! تو نے ان کی کوئی مہمانی نہیں کی لیکن بتولؑ کے لعلؑ نے تیری قدر بڑھا دی۔ تو ایک چٹیل میدان تھی۔ غیر آباد ریگستان تھی، لیکن فرزندِ رسولؐ نے اپنی اور اپنے اقرباء کے خون کی تجھ میں آمیزش کی۔ تیرا اتنا شرف بڑھایا کہ ملائکہ، انبیاء اور مرسلین تجھ پر نزول فرماتے ہیں۔ تجھ سے کسی کا گزرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ آنے والے آتے تھے، گھبرا کر چلے جاتے تھے لیکن بتولؑ کے لعلؑ نے تیری مٹی کو تربت مقدسہ اور خاکِ شفا بنا دیا۔ تیرے وحشت ناک خطہ کو بقعہ نور بنا دیا اور تیرے ٹیلوں کو رشکِ طور بنا دیا۔

ارضِ کربلا ایک پرہول اور درد خیز قطعہ ہے۔ اس زمین سے کئی انبیاءؑ و اوصیاءؑ گزرے مگر کوئی آرام و سکون کے ساتھ نہیں گزرا۔ ہر ایک کو کچھ صدمہ لاحق ہوا۔ کسی کو چوٹ لگی اور کسی کا دل غمناک ہوا۔ ہر ایک ذبح عظیم کے مصداق سید الشہداءؑ کی عظیم الشان قربانی اور دردناک شہادت سے مطلع ہو کر فرزندِ رسولؐ کی مصیبت میں چشم گریاں اور ان کے قاتلوں پر لعنت کرتے ہوئے رخصت ہوا۔

واقعہ شہادت سے سالہا سال قبل زمین کربلا پر شہید ہونے والوں کی جگر پاش داستان اوّلین کو رُلاتی رہی اور واقعہ کے بعد یوم قیامت تک ہر سننے والا آنسو بہاتا رہے گا۔ اس واسطے کربلا کی خونچکاں کہانی نے اولین و آخرین کو اشکبار کیا۔

طوالت کے خوف سے ہر بزرگ کا جو اس سرزمین پر وارد ہوا، کا واقعہ نہیں لکھتے۔ صرف والدِ امام حسین علیہ السلام، حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ورودِ کربلا کا واقعہ اور جنابِ مظلوم کربلا کا غم خیز قصہ تحریر کرتے ہیں۔ بہت سی معتمد اور

مستند تاریخوں میں یہ واقعہ درج ہے۔

جنگِ صفین کے دوران جناب امیر المومنین علیہ السلام اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کوفہ کی پل عبور فرما کر مسجدِ ابو سبرہ میں داخل ہوئے۔ وہاں نماز پڑھی اور:

"سُبْحَانَ مَنْ يُوْلِجِ الَّيْلَ فِيْ النَّهَارِ وَ يُوْلِجِ النَّهَارَ فِيْ الَّيْلِ"

کی تسبیح پڑھ کر آگے روانہ ہوئے اور منزلیں طے کرنے کے بعد بابل کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ پھر راہوار کو تیز کیا اور لشکر کو بھی تیز چلنے کا حکم دیا کہ بہت تیزی کے ساتھ اس زمین سے گزر جائیں کیونکہ خطرہ ہے کہ زندہ آدمی اس منحوس زمین میں نہ دھنس جائیں۔ اہلِ لشکر بسرعت تمام اس مقام سے گزر گئے۔ جب آپؑ خطہ کربلا میں پہنچے تو دریائے فرات کے کنارے جہاں کھجور کے درخت تھے، تشریف لے گئے اور عبداللہ بن عباس سے فرمایا:

"تم کچھ واقف ہو کہ یہ کون سا مقام ہے؟"

انہوں نے عرض کیا کہ وہ اس جگہ کو نہیں جانتے۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

"اے عبداللہ! تم کو معلوم ہو جائے کہ یہ کون سی اور کیسی زمین ہے تو بے اختیار رونے لگ جاؤ۔"

یہ فرما کر جناب امیر المومنین علیہ السلام اتنا روئے کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہو گئی اور فرمایا:

"میرے ساتھ اہلِ ابوسفیان نے کیسی عداوت اختیار کی۔" اس کے بعد جناب امام حسین علیہ السلام کو طلب فرمایا اور ارشاد کیا:

"اے فرزند! صبر اختیار کرو اور دیکھو کہ تمہارے باپ آج کے دن آلِ ابوسفیان کے ہاتھوں کیسے کیسے رنج اٹھا رہا ہے۔ کل تمہیں بھی ظلم برداشت کرنے ہوں گے۔"

اس گفتگو کے بعد جناب امیر المومنین علیہ السلام نے وضو کیا اور چند رکعات نماز پڑھ کر سو رہے اور جب بیدار ہوئے تو عبداللہ بن عباس کو طلب فرما کر کہا:

"اے ابن عباس! میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گروہ مردانِ نورانی چہرے کا نزول ہوا جن میں سب لوگ شمشیریں حمائل کئے ہوئے اور سفید علم ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس زمین کے اردگرد خط کھینچا۔ اس وقت ان خرموں کے درختوں کی یہ حالت دیکھی کہ اپنی شاخیں زمین پر پٹخ رہے ہیں اور ایک تازہ خون کی نہر بھری ہوئی ہے۔ حسینؑ فریاد کر رہے ہیں لیکن کوئی انؑ کی فریاد کو نہیں پہنچتا اور وہ مردانِ سفید بین کر رہے ہیں کہ اے آلِ رسولؐ! صبر

اختیار کرو اور آگاہ رہو کہ تم بدترین خلائق کے ہاتھوں سے قتل ہو رہے ہو اور اے حسینؑ! تمہیں بشارت ہو کہ بہشت تمہارے قدموں کی مشتاق ہے"۔

"وہ سب میرے پاس آئے اور رسمِ تعزیت بجالائے۔ یہاں تک خواب دیکھ کر میں بیدار ہو گیا۔ اے عبداللہ! قسم بخدائے کریم کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مطلع فرمادیا کہ میں ہنگامِ سفر کربلا پر یہ خواب دیکھوں گا"۔

یہ بھی لکھا ہے کہ جنابِ امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر اس زمین پر بیان کیا اور فرزندِ رسولؐ کی شہادت کا واقعہ وہ بھی یاد کر کے روئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جناب امیر المومنین علیہ السلام اپنی اولاد کا مقتل یاد کر کے اتنا روئے کہ غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مظلوم کا بابا روتا بھی جاتا تھا اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے مظلوم بیٹے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر کر صبر کی تلقین کی کرتا جاتا۔

عزادارو! مظلوم کا بابا اپنی اولاد کا مقتل اور اپنی بیٹیوں کا اسیر ہونا کس طرح برداشت کر سکتے۔ غالباً عاشور کا منظر آپؑ کی آنکھوں کے سامنے ہوگا کہ مظلوم بیٹا خون کے دریا میں تیر رہا ہے۔ "هَلْ مِنْ مُغِيثًا يُغِيثُنَا" کی آواز بلند کر رہا ہے۔ کوئی ناصر اور مددگار نہیں۔ زمین کربلا پر قرآنِ ناطق کے بکھرے اور پھٹے ہوئے پارے، زینبؑ کے بابا نے کس حال میں دیکھے ہوں گے! لیکن عاشور کی عصر کا منظر بھی دیکھا ہوگا کہ خیام میں آگ لگی ہے اور زینبؑ و اُمِّ کلثوم سر چھپانے کیلئے سہارا ڈھونڈ رہی ہیں۔

جمعرات کا دن ہے، محرم کی دوسری تاریخ، مدینے کے مسافر اپنی صحیح وعدہ گاہ پر پہنچ گئے۔ یثرب کے مسافر نے مستورات اور بچوں کے ساتھ بہت سفر کیا، اب مستقل قیام کا قصد ہے۔ حر کی نگرانی ہے۔ ابنِ زیاد کا حکم ہے کہ ایسی جگہ پر امامؑ پاک کو اتارو جہاں سے پانی دور ہو اور آبادی قریب نہ ہو۔

بعض ساتھیوں کے تیور بدلے۔ سپاہِ بے حیا کی ان گستاخانہ حرکات پر اصحابِ باوفا کا خون رگوں میں تیزی سے دوڑنے لگا۔ جانثاروں نے لڑائی کا مشورہ دے دیا۔ مگر صابر امامؑ نے یہ فرما کر انہیں روک دیا کہ میں لڑائی میں پہل نہیں کرنا چاہتا۔ چارو ناچار پانی سے دور خیام نصب فرمانے کا حکم دے دیا۔ تابع فرمان اصحاب نے فوراً تعمیلِ حکم کی اور اس چٹیل میدان میں اس ترتیب سے اپنے اپنے خیمے لگائے۔

سب سے پہلے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کے خیام نصب کئے گئے اور ان سے ملحق امامؑ کے اعزہ و اقرباء نے اپنے خیمے لگائے اور ان کے بعد آپؑ کے اصحاب و جانثاروں نے اپنی اپنی فرودگاہیں درست کیں۔ ان کے بعد راحلے اور دوسری سفری ضروریات کے لیے خادموں اور غلاموں نے اپنے اپنے پڑاؤ ڈال دیئے۔

خیمے اس قرینے سے یکے بعد دیگرے متصل لگائے گئے تھے کہ ایک خیمے سے دوسرے خیمے میں آسانی سے آ جا سکتے تھے اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے ساتھ آسانی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔

دوسری محرم سے دس محرم تک جب تک ظلم و نفاق کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے ان کو خاک سیاہ نہ کر دیا، اس وقت تک ان میں باہمی آمد و رفت اسی طرح قائم رہی۔ تمام اعزہ و اقارب اہل بیتؑ کی زیارت سے مشرف ہوتے رہے اور اسی طرح اصحاب و انصار کی عورتیں بھی مخدرات عظمیٰ کی زیارت سے فیضیاب ہوا کرتی تھیں۔

پردہ سرا مخدراتِ طہارت کو جنابِ مسافرِ کربلاؑ نے خاص عزت و احترام سے محملوں سے اتار کر خیام میں پہنچایا۔ ناقے بٹھائے گئے اور خاندانِ ابوطالبؑ کی شہزادیاں باپردہ و با احترام اپنے اپنے خیام میں جاگزین ہوئیں۔

سکونت تبدیل کرنے والے حضرات جانتے ہیں کہ نئے شہر اور نئے مکان میں داخل ہونے کے بعد پہلا گھر اور وطن یاد آتا ہے۔ نیا گھر مانوس نہیں ہوتا بلکہ وحشت ٹپکتی ہے۔ میں آپ حضرات سے پوچھتا ہوں کہ مخدراتِ عصمت مدینہ ایسے مانوس وطن سے بچھڑی ہوئی بیبیاں، سفر کی تھکی ماندی بے آرام و بے قرار شہزدیاں، قدم قدم پر گھروں کی بربادی کی خبریں سننے والی، موت اقرباء کی سہمی ہوئی زہراؑ جائیاں کس طرح خیام میں داخل ہوئی ہوں گی؟

اجنبی ملک، وحشت ناک جنگل، مسلح دشمنوں کے ہجوم اور پھر اپنے بھائی کے خطبوں میں مرنے اور اُجڑنے کی خبریں۔

میرا خیال ہے، صرف خیال ہی نہیں بلکہ حقیقت حال ہو گی کہ ہر خیمے میں مستورات پریشان حال اپنے بھائیوں اور بچوں کو گلے لگائے اس طرح رو رہی ہوں گی جس طرح مدینہ سے نکلتے وقت رو رہی تھیں۔ لیکن لاکھ جانیں قربان ہو جائیں ان کی اطاعت امامؑ پر اور ان کی وفا اور صبر و حیاء پر کہ اتنے بڑے سفر، اتنی بڑی منزلوں، اس قدر شدائد اور صعوبتوں، گھبراہٹوں اور پریشانیوں میں بھی کبھی اپنی تکلیف و گھبراہٹ، بھوک و پیاس کی پریشانی و تھکاوٹ کی امام علیہ السلام کے آگے شکایت نہیں کی۔ جس خلوص اور جذبہ ایمان کے تحت رفاقتِ امامِ عالی مقام علیہ السلام اختیار کی تھی، اس پر آنچ نہیں آنے دی۔

جب خیمے نصب ہو چکے تو سرکار سید الشہداء علیہ السلام نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تمام اقرباء اور اعزہ کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ جن میں آپؑ کے بھائی، اولاد، بھتیجے، بھانجے اور تمام مستورات شامل تھیں۔ جب سب جمع ہو گئے تو میرے مظلوم و مسافر آقا نے حسرت بھری نظر سے سب کو دیکھا۔ باغِ بتولؑ کے نہال سلامت ہیں، چمنِ زہراؑ بھی تازہ ہے۔ لیکن بادِ خزاں کے بگولے اٹھنے والے ہیں۔ کوئی بات مظلومِ کربلا کو یاد آئی۔

زہراؑ کے لال کی آنکھیں ساون کے بادل کی مانند برسنے لگیں۔ کوئی ایک بات تو نہ تھی، کئی ایک باتیں تھیں۔ عباسؑ

کے بھرپور شباب کو دیکھا، اکبرؑ کی نوجوانی کو دیکھا، حسنِ مجتبیٰؑ کے صحن کی آبادی دیکھی، جعفرؑ طیار کے پوتوں کے ولولے دیکھے، اولادِ عقیلؑ کے تیور ملاحظہ فرمائے، پھر یاد کیا ہوگا، یہ جوانیاں، یہ شباب چند روز کے بعد خاکِ کربلا میں مل جائیں گے۔

خیام کی ترتیب دیکھی ہوگی، ہر خیمہ میں ایک دروازہ تھا کہ بیبیاں ایک خیمے سے دوسرے خیمے میں باآسانی داخل ہو سکیں گی، خیموں کا نقشہ دیکھ کر عاشور کی عصر یاد آ گئی ہوگی اور واقعی بیبیاں ایک خیمہ جلنے کے بعد دوسرے خیمے میں جاتی تھیں لیکن خیام نے ساتھ نہ دیا۔ سب بیبیوں کو جنگل کی طرف رخ کرنا پڑا۔

پھر اہل بیتؑ پر ایک نظر فرمائی، روئے اور بارگاہِ قدرت میں عرض کیا:

''اے اللہ! ہم تیرے نبی محمد مصطفےٰؐ کی عترت ہیں۔ ہمیں زبردستی اپنے ناناؐ کے حرم سے نکالا گیا''۔

غالباً مدینہ اور نانا کا حرم یاد آیا ہوگا۔

''بنوامیہ نے ہم پر ظلم و ستم کیا، ہمارا حق لے دے اور ظالموں پر ہماری مدد فرما''۔

❁❁❁

تیسری محرم سے نو محرم
تک کے حالات
فوجوں کا کربلا میں داخلہ

نامہ و پیام، بندش آب، اھل بیتؑ کی پیاس

دوسری محرم کو جب امام حسین علیہ السلام نے اپنے خیام زمین کربلا پر نصب فرمائے اور مستقل قیام فرمالیا اور حر بن یزید الریاحی کو امام علیہ السلام کے قیام کا اطمینان ہو گیا اور اپنے طور پر حر نے ابن زیاد کے حکم کی تعمیل کر دی اور اپنے مقام پر حر نے کامیابی حاصل کر لی تو اس مضمون پر خط کربلا سے حر نے ابن زیاد کو تحریر کیا:

''میں امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کوفہ کی راہ سے پھیر کر کربلا تک پہنچا چکا ہوں اور ان کو بے آب وگیاہ میدان میں اتار چکا ہوں۔ اب امام حسین علیہ السلام مکمل طور پر محاصرہ میں ہیں۔ اب وہ یہاں سے کسی طور آگے نہیں جاسکتے''۔

حر کی یہ اطلاع ملتے ہی ابن زیاد جناب امام حسین علیہ السلام کی پابندی پر مطمئن ہو گیا اور یزید کی سلطنت کو مضبوط کرنے اور امام علیہ السلام کو قتل کرنے کا اہتمام کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے عمر بن سعد بن ابی وقاص کو فوجوں کی قیادت سنبھالنے اور فرزند رسولؐ کو قتل کرنے کے لیے بلایا۔

قبل ازیں ابن زیاد نے علاقہ قزوین کے مضافات میں دیلمیوں پر فوج کشی کیلئے عمر بن سعد کو ما مور کیا تھا کیونکہ دیلمیوں نے سرحدی علاقہ دستبیٰ پر قبضہ کر لیا تھا۔

جب امام علیہ السلام کی کربلا میں ورود کی خبر پہنچی تو اس نے وہ مہم اس وقت ترک کر دی اور کربلا کی طرف پوری طرح متوجہ ہوا۔ ابن سعد نے پہلے تو معذرت کی اور اس مہم سے گلوخلاصی چاہی۔ چونکہ ابن زیاد نے عمر سعد کو رّے کی جاگیر کا پروانہ لکھ دیا تھا، یہ ایک آباد علاقہ، زرخیز قطعہ اور پانی کے چشموں سے سیراب ہونے والی زمین تھی، ابن زیاد غضبناک ہوا اور رّے کی زمین واپس لینے کی دھمکی دی۔

عمر بن سعد نے ایک رات کی مہلت طلب کی۔ گھر آ کر اس نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے مشورہ کیا۔ وہ باتوں کے درمیان متردّد اور مضطرب تھا۔ ایک طرف سرسبز ولہلہاتے کھیت، بہتے ہوئے چشمے، وسیع رقبۂ زمین کی آمدنی اور دوسری

طرف فرزندِ رسولؐ دل بندِ بتولؑ کا ناحق قتل۔ خانۂ بتولؑ کی ویرانی اور کشتِ اسلام کی بربادی۔

عزیزوں نے مشورہ دیا: ''عمر اس کام کے نزدیک مت جانا۔ خبردار دنیا کے لالچ میں نواسۂ رسولؐ کے خون سے ہاتھ رنگین نہ کر۔ جاگیر کے طمع میں باغِ بتولؑ تاراج نہ کرے۔''

ابن سعد کے بھانجے حمزہ بن مغیرہ نے تو یہاں تک کہا کہ: ''اگر بادشاہی مل جائے تو ایسی بادشاہت سے دستبردار ہو جانا۔ کیا مناسب ہے تو فرزندِ رسولؐ کا قاتل بنے؟''

ابن سعد نے رات بے چینی کے ساتھ بستر پر کروٹیں بدلتے بسر کی۔ ہر دو پہلوؤں کو سوچتا۔ دل میں کہا: ''آج رے کی جاگیر مل رہی ہے۔ قیمتی جاگیر ہے''۔

پھر کہتا: ''اولادِ رسولؐ کو قتل کرنا ناقابلِ مغفرت گناہ ہے۔''

آخر اس پر شقاوت غالب آئی۔ بدبختی نے رے کی جاگیر کو ایک حسین خیال میں پیش کیا۔ اس کے نفسِ لوامہ نے اس خیال کو اس پر اس طرح مسلط کر دیا، رے کی جاگیر نقد ہے، جنت ادھار۔ نقد کو چھوڑ کر ادھار پر کیوں بھروسہ کرتا ہے؟ بالآخر اس نے کربلا جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ صبح اس نے جا کر ابن زیاد کے سامنے رضامندی ظاہر کر دی اور ابن زیاد نے ۴ ہزار کا لشکر دے کر اسے کربلا کی مہم پر روانہ کر دیا۔

چنانچہ ابن سعد چار یا چھ ہزار کا لشکر لے کر تیسری محرم کو کربلا پہنچ گیا۔

کوفہ کے حالات

ابن زیاد نے لوگوں کو کوفہ کی جامع مسجد میں بلایا اور درج ذیل تقریر کی:

''لوگو! تم نے آلِ ابوسفیان کو پوری طرح آزمایا ہے۔ وہ تمہارے امتحانوں میں ٹھیک اترے اور تم نے یزید کو بھی پہچان لیا ہے۔ وہ تمہاری بھلائی اور آسائش کے متعلق ہمیشہ کوشاں رہا۔ وہ سخی ہے، اس کی عادات شائستہ اور رعایا کا خیرخواہ ہے اور اس کا دورِ سلطنت نہایت امن و امان کا ہے۔ وہ اپنے زیرِ حکومت رعایا کے ساتھ اسی طرح سلوک کر رہا ہے جس طرح اس کا باپ معاویہ تم لوگوں کے ساتھ کرتا تھا۔ یزید اسی معاویہ کا بیٹا ہے، اس نے عوام الناس کے ساتھ اچھے سلوک قائم کر رکھے ہیں اور لوگوں کو مختلف طریقوں سے اموال عنایت کر کے غنی اور مالدار بنا دیا ہے۔ اس نے تمہارے عطیوں اور انعاموں میں اضافہ کر دیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے لیے مقرر عطیات میں مزید اضافہ کر دوں اور تمہیں حسینؑ بن علیؑ سے لڑنے کے لیے جو یزید

کا جانی دشمن ہے، روانہ کردوں۔ تم ان احکام کو سنو اور اس کی تعمیل کرو۔"

یہ ابن زیاد کی ترغیب وتحریص تھی۔ اس نے لوگوں کو مال و جائیداد کا لالچ دیا۔ اس نے قتل حسینؑ کے لیے بھاری معاوضے مقرر کیے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس نے خزانوں کے منہ کھول دیے اور مال و دولت کی تقسیم شروع کردی۔ پھر کیا تھا، دنیا پرست، دین فروش لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔

ہر شخص نے اپنی اوقات کے مطابق انعام پایا اور حریص ولالچی، سگانِ دنیا، امام علیہ السلام کے خونِ ناحق کا بیڑہ اُٹھا کر کربلا کی طرف روانگی پر کمر بستہ ہو گئے۔

گو ابن زیاد کی حرص ولالچ دلانے والی تقریر کام کرگئی اور جاہ پسند، حرص و ہوا کی اسیر طبیعتیں دامِ دنیا میں گرفتار ہو گئیں۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حرص کے جال میں پھنسنے سے کتراتے تھے اور کربلا جانا ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ ایسے افراد کے لیے ابن زیاد نے تشدد اور سخت گیری کا انتظام کیا اور کربلا روانہ ہونے میں پس وپیش کرنے والوں کے لیے اس نے بہت سخت بندوبست کیا۔ لالچ کے ساتھ ساتھ اس نے خوف بھی دلایا اور انعام کے ساتھ اس نے ظلم کا کوڑا بھی اٹھایا۔

ابن زیاد کی سخت گیری اور خوفناک دھمکیاں

ایک طرف تو کوفہ کے گورنر شقی ازلی، معذب ابدی، عبیداللہ بن زیاد بدنہاد نے لوگوں کے ضمیر وایمان خریدنے کیلئے مال و دولت کے خزانوں کے دہانے کھول دیے۔ دوسری طرف اس لعین نے دستِ استبداد بڑھایا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ لوگ اس خونیں معرکہ میں شرکت سے گریز کریں گے۔ اس واسطے قتلِ امامؑ کے لیے ایک لشکرِ عظیم فراہم کرنے کے لیے جبری بھرتی شروع کردی۔

اس کا منصوبہ تھا کہ کوفہ میں کوئی مرد رہ نہ جائے اور سب لوگ یزید کے ہوا خواہ بن کر اس کے لشکر میں شامل ہو جائیں۔ تاکہ اتنے بڑے لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر امام حسین علیہ السلام یزید کی بیعت کرنے پر مجبور ہو جائیں یا مقابلہ کی صورت میں یہ فوجِ عظیم ان کا صفایا کردے۔

ابن زیاد کی سخت گیری اور خوفِ ہلاکت سے لوگ دھڑا دھڑ کوفہ سے نکل کر جمعیتِ قاتلانِ حسینؑ میں شامل ہونے لگے۔ بعض لوگ ڈر کے مارے کوفہ سے تو نکلتے لیکن راستے سے واپس مڑ آتے۔

ابن زیاد نے ایسے لوگوں کیلئے جاسوس مقرر کردیے۔ جو واپس مڑتا ہوا ہاتھ آتا، اسے تہ تیغ کردیا جاتا۔ چنانچہ سعد

بن عبدالرحمٰن کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ جستجو کرے۔ اگر اسے کوئی ایسا شخص ملے تو اسے پکڑ کر دربار میں پیش کیا جائے۔

چنانچہ سعد مذکور نے ایک شامی سپاہی کو جو کسی کام کیلئے لشکر سے واپس کوفہ آیا تھا، کو پکڑ کر ابن زیاد کے روبرو پیش کیا۔ اس نے اس کے قتل کا حکم صادر کیا۔ اس کے قتل کے بعد لوگوں میں خوف وہراس پیدا ہو گیا اور پھر کسی شخص کو لشکر سے واپس آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ابن زیاد کی تحریفانہ اور تخویفانہ اقدام سے ایک بہت بڑا لشکر اولادِ رسول کا خون بہانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کم از کم اس لشکر کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے۔

کوفہ کے بے دین و بے وفا سرداروں کو انعام واکرام کا لالچ دے کر پہلے ہی اس نے قابو میں کر لیا تھا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل لوگوں کو فوج کا افسر بنا کر، ان کی ماتحتی میں درج ذیل فوج دے کر کربلا روانہ کیا:

1۔ شیث بن ربعی — ایک ہزار

2۔ کعب بن طلحہ — ایک ہزار

3۔ حجاز بن ابجر — ایک ہزار

4۔ محمد بن اشعث — ایک ہزار

5۔ یزید بن رکاب کلبی — دو ہزار

6۔ مضائیر بن رہنیہ مازنی — تین ہزار

7۔ نصر بن خرشہ — تین ہزار

8۔ عمر بن سعد — چار ہزار، چھ ہزار سوار اور پیادے

9۔ عروہ بن قیس — چار ہزار

10۔ سنان بن انس — چار ہزار

11۔ شمر بن ذی الجوشن — چار ہزار

12۔ حصین بن نمیر — چار ہزار

13۔ خولی بن اصبحی — کو بھی ایک جداگانہ علم آراستہ کر کے دیا اور کئی ہزار سوار اس کی ماتحتی میں دیے۔

اس کے بعد بھی ابن زیاد مختلف افسروں کی ماتحتی میں برابر لشکر پر لشکر بھیجتا رہا۔ گو لشکرِ اعداء کی تعداد کے تعین میں مؤرخین نے بہت کچھ اختلاف لکھا ہے، تاہم تیس ہزار سے کم جمعیت کسی نے نہیں لکھی۔ اس سے زیادہ تعداد بھی بیان کی گئی ہے۔

افواجِ ابن زیاد کی کثرت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ قادسیہ سے کربلا تک فوجوں سے کل میدان بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، سپاہ ہی سپاہ نظر آتی تھی۔

عمر بن سعد تیسری محرم الحرام کو کربلا پہنچا۔ اس کے بعد مختلف افسر اپنی فوج کے ساتھ ابن سعد کے ساتھ شامل ہوتے چلے گئے۔ اس کثرتِ لشکر کی بناء پر ابن زیاد نے عمر بن سعد کو خط لکھا: ''سواروں اور پیادوں کی کثرت کے معاملے میں میں نے تیرے لیے کوئی عذر نہیں چھوڑا۔ اب صبح و شام اپنی کارکردگی کی اطلاع مجھے پہنچاتا رہ۔''

لشکر کی جمع و ترتیب کے بعد اب ہم میدانِ کربلا کا حال درج کرتے ہیں۔

نامۂ و پیام

جب ابن زیاد لعین کو حر کی اطلاع پہنچی تو اس نے امام حسین علیہ السلام کو درج ذیل خط لکھا:

''اما بعدُ فقد بلَغنی یا حسینٌ نزولک بکربلا وقد کتب الی امیر المومنین یزید ان لا اتوسد الوثیر ولا اشبع مِن الخمیر وُالحقک باللطیف الخبیرا و ترجع الی حکمی و حکم یزید''۔

''اے حسینؑ! کربلا میں آپؑ کے ورود کی خبر مجھے پہنچی اور مجھے یزید ملعون نے لکھا ہے کہ میں اس وقت تک نرم تکیہ پر سر نہ رکھوں اور نہ سیر ہو کر عمدہ غذا کھاؤں جب تک آپؑ کو خدا کے پاس نہ پہنچا دوں، یعنی قتل نہ کرا دوں یا آپؑ میرا اور میرے امیر یزید (لعین) کا حکم تسلیم نہ کرلیں یعنی بیعت کرلیں''۔

جنابِ امام علیہ السلام نے یہ خط پڑھ کر پھینک دیا اور فرمایا:

''لَا اَفْلَحَ قَوْمَ اشْتَرَوْا وَامَرْضَاتَ الْمَخْلُوقِ بِسَخطِ الْخَالِقِ''۔

''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جو خالق کو ناراض کر کے مخلوق کی رضا جوئی کرے۔''

جب قاصد نے جواب کا تقاضا کیا تو فرمایا:

''مَالَهٗ عِنْدِیْ جَوَابٌ فَقَدْ حَقَّتْ عَلَیْهِ کَلِمَةُ الْعَذَابِ''۔

''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ وہ خدا کے عذاب کا حقدار بن چکا ہے''۔

عمر بن سعد اور امام حسین علیہ السلام کے درمیان بات چیت

عمر بن سعد جب نصب خیام اور فرودگاہ کے ضروری انتظام سے فارغ ہوا تو اس نے عمرہ بن قیس خمسی کو بلا کر خدمت امام میں بھیجنا چاہا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے سوا کسی اور کو بھیجا جائے۔ چونکہ تمام اشراف کوفہ نے امام حسینؑ کو دعوتی خطوط بھیج کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا، اس واسطے وہ بے حیاء مارے شرم کے امام کے پاس جانا نہیں چاہتے تھے۔

یہ رُوسیاہ اپنا منہ چھپاتے تھے۔ آخر بمشکل کثیر بن عبداللہ شعبی تیار ہوا۔ یہ بدترین خلائق، نہایت جسور، گستاخ اور خونریز آدمی تھا۔ کہنے لگا: ''میں جاتا ہوں! اگر حکم ہو تو ان کا سر بھی لے آؤں؟''

بہر حال کثیر خدمت امامؑ میں چلا۔ جناب ابوثمامہ صیداوی نے اس کو آتے دیکھ کر امام علیہ السلام سے عرض کی:

''اَصۡلَحَکَ اللّٰہُ یَا اَبَاعَبۡدِاللّٰہِ''۔

''کثیر بن عبداللہ جو کوفیوں میں سب سے زیادہ مفسد اور بنیادِ ظلم و جور ہے، آپؑ کی خدمت میں آنا چاہتا ہے''۔

یہ کہہ کر جناب ابوثمامہؓ باہر چلے آئے اور کثیر کو روک کر کہنے لگے: ''اگر تیرا ارادہ خدمتِ امام علیہ السلام میں جانے کا ہے تو ہتھیار کھول کر رکھ دے''۔

اس نے ہتھیار کھولنے سے انکار کرتے ہوئے کہا: ''میں عمر بن سعد کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر وہ سنیں گے تو عرض کر دوں گا، ورنہ واپس کر دوں گا۔''

جناب ابوثمامہؓ نے کہا: ''اپنی تلوار مجھے دیدے اور بغیر تلوار لئے اپنا پیغام پیش کر۔ کیونکہ جس طبیعت کا تو آدمی ہے، ہم خوب سمجھتے ہیں۔''

دیر تک کثیر کج بحثی کرتا رہا مگر ابوثمامہؓ نے اسے بغیر ہتھیار کھولے جانے نہ دیا۔ آخر کار کثیر واپس چلا گیا۔

کثیر کے واپس جانے کے بعد عمر ابن سعد نے قرۃ بن قیس حنظلی کو خدمتِ امامؑ میں روانہ کیا۔ جب وہ خیمۂ مقدس کے قریب پہنچا اور جناب امام حسین علیہ السلام کی نظر پڑی تو فرمایا: ''تم میں سے کوئی اسے پہچانتا ہے؟''

جب حبیبؓ ابن مظاہر نے کہا: ''حضور! یہ شخص بنی حنظلہ سے ہے اور قرابت میں میرا بھانجہ ہے اور اس وقت تک وہ ہمارے ساتھ خلوص اور حسنِ عقیدت سے پیش آتا ہے''۔

جب بالکل قریب آ گیا تو جناب زہیرؓ بن قین نے اسے روک کر پوچھا: ''تیرے آنے کی غرض کیا ہے؟''

اس نے نہایت نرمی سے جواب دیا: ''عمر بن سعد کی طرف سے کچھ پیام لے کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں

حاضر ہوا ہوں، اگر حضوری کا شرف مل گیا تو عرضِ خدمت کر دوں گا۔"

زہیر ابن قین نے فرمایا: "اچھا ہتھیار کھول کر یہاں رکھ دو۔" قرة بن قیس نے اسی وقت "حُبّاً وَّ کَرَامَةً" کہہ کر ہتھیار کھول دیے اور خدمتِ امام علیہ السلام میں حاضر ہو کر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ آداب بجالایا۔

امام حسین علیہ السلام نے جوابِ سلام دے کر اسے اپنے قریب بٹھایا، اس کے آنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا: "مجھے عمر بن سعد نے آپؑ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپؑ کے یہاں آنے کی غرض پوچھوں۔"

جنابِ امام علیہ السلام نے فرمایا: "میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ سردارانِ کوفہ اور اشراف و عمائد نے مجھے دعوتی خطوط بھیجے ہیں۔ میں نے ان کی دعوت قبول کی اور چلا آیا۔ اب اگر میرے آنے سے ان کی رائے بدل گئی ہے اور میرے آنے کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تو میں جہاں سے آیا ہوں واپس چلا جاؤں گا"۔

قاصد امام حسین علیہ السلام کا مصلحانہ جواب لے کر واپس ابن سعد کے پاس چلا گیا۔ ابن سعد یہ جواب سن کر کسی قدر خوش ہوا کہ اس طرح امام حسین علیہ السلام کو جانے کی اجازت مل جائے گی اور میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جنگ کرنے سے بچ جاؤں گا۔

عمر ابن سعد کا ابن زیاد کے نام خط

عمر بن سعد نے اسی وقت گورنر کوفہ ابن زیاد بدنہاد کو اس مضمون کا خط تحریر کیا:

"بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ہ اما بعد فانّی حیث نزلت بالحسینؑ بعثت الیہ رسولی فسئلۃ عمّا اقدمہ وما ذا تطلبُ فقل کتب الی اہل ھذا البلا و اتتنی رسلُھم وفسئلُونی القدوم فامّا اذاکر ھموتونی وبدانھم غیر ما اتتنی بہٖ کتھم فانا منصرف عنھم"۔

"میں جس وقت وارِدِ کربلا ہوا، میں نے امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں قاصد بھیج کر ان سے یہاں آنے کی وجہ پوچھی اور انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ اہلِ کوفہ کے میرے پاس بہت سے خطوط آئے۔ یکے بعد دیگرے انہوں نے میرے پاس قاصد بھیجے اور مجھے کوفہ آنے کی دعوت دی۔ میں ان کے بلانے پر چلا آیا۔ اَب اگر وہ اپنے قول سے پھر گئے ہیں اور میرا آنا اچھا نہیں سمجھتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں"۔

حسان بن قائد عبسی بیان کرتا ہے کہ جس وقت قاصد ابن سعد کا یہ مکتوب لے کر ابن زیاد کے پاس آیا تو، اس وقت میں ابن زیاد کے پاس دربار میں موجود تھا جب ابن زیاد نے ابن سعد کا خط پڑھا تو متکبرانہ انداز اور کافرانہ آواز میں یہ شعر پڑھا۔

اَلآنَ اِذْ عَلِقَتْ مَخَالِبُنَا بِہٖ
یَرجُو النَّجاۃَ وَلاتَ حُسَینَ مَنَاص

''اب جب کہ حسینؑ ہمارے مضبوط پنجوں میں پھنس گئے ہیں رہائی کی امید رکھتے ہیں۔ اب چھٹکارے کا کوئی وقت نہیں رہا''۔

ابن زیاد کا عمر ابن سعد کے خط کا جواب

اس جواب میں ابن زیاد نے عمر بن سعد کو مکتوب ذیل خط لکھا:

''اما بعد بَلَغنِی کتابک و فھمت ما ذکرت فاعرض علی الحُسینؑ ان یبائع لیزید بن معاویہ ھو و جمیع اصحابہ فاذافعل ذالک رَاَینا رَاْیَنَا''

''تمہارا خط ملا اور اس میں جو کچھ ذکر تھا میں نے سمجھ لیا ہے۔ تم امام حسینؑ پر یہ بات پیش کرو کہ پہلے وہ خود اور ان کے ساتھی بیعت یزید قبول کرلیں۔ پھر اس کے بعد جو ہماری رائے ہوگی دیکھی جائے گی۔''

عمر بن سعد کو ابن زیاد کا یہ مفسدانہ جواب ملا تو بہت پریشان ہوا اور کہا: ''مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ ابن زیاد مصلحانہ بات قبول نہ کرے گا۔ عمر بن سعد نے ابن زیاد کا نامہ امام حسین علیہ السلام کے سامنے پیش کرنے کی اس بنا پر جسارت نہ کی کہ امام علیہ السلام ابن زیاد کے اس ناروا مطالبہ کو منظور نہ کریں گے۔

تیسری تاریخ کو عمر بن سعد داخل کربلا ہوا اور چوتھی کو دوسرے افسر اپنی ماتحتی میں ہزاروں کا لشکر ساتھ لے کر میدان کربلا میں داخل ہونے لگے اور میدانِ کربلا افواج اشقیاء سے بھر گیا۔ خود ابن زیاد کوفہ سے باہر مقام ''نخیلہ'' میں قیام کرکے فوجیں بھیجنے اور جنگی اُمور کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

عمر بن سعد کی دوبارہ مصالحانہ کوشش

گو ابن زیاد کی طرف سے جنگ کرنے میں کوئی تاخیر نہ تھی۔ مگر افواج ابن زیاد کا سربراہ جنگ ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ابن سعد چاہتا تھا کہ رے کی جاگیر بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے اور نواسہ رسولؐ کے ساتھ جنگ سے بھی چھٹکارا مل جائے اس

واسطے اس نے دوبارہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ مصلحانہ کوششیں شروع کر دیں۔ لکھا ہے کہ ایک یا کئی راتوں کو دونوں لشکروں کے درمیان، امام علیہ السلام اور ابن سعد کے مابین گفتگو ہوتی رہی۔ ایک رات کا واقعہ ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

عمر بن سعد نے جناب امام حسین علیہ السلام سے مصالحانہ گفتگو کی استدعا کی جسے امامؑ نے قبول فرمالیا۔ ابن سعد وقت مقرر پر بیس سواروں کے ساتھ مقررہ جگہ پر پہنچ گیا، ادھر امام حسین علیہ السلام بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس جگہ پر پہنچ گئے۔ قریب پہنچ کر امام حسین علیہ السلام نے ہمراہیوں کو الگ کر دیا سوائے جناب عباسؑ علمدار اور شہزادہ علی اکبرؑ کے اور ابن سعد نے بھی سوائے اپنے غلام اور بیٹے حفص کے سب کو جدا کر دیا۔ اس شب کے وقت عالمِ تنہائی میں امام حسین علیہ السلام اور افواج اشقیاء کے انچارج ابن سعد کے درمیان رات گئے تک سلسلہ کلام جاری رہا۔

امام علیہ السلام:

"وَيلَکَ يا بنَ سَعد! اَمَا تَتَّقِی اللّٰهَ الذی اِلَیهِ مَعادُکَ؟ وتُقَاتِلُنِی وانَا ابنُ مَن عَلِمتَ ذَرهٰولاءِ القَوم وكُنْ مَعِی فَاِنَّهٗ اَقرَبُ لکَ اِلیٰ اللّٰهِ"۔

"افسوس ہے ابن سعد! جس خدا کی بارگاہ میں تجھے حاضر ہونا ہے اس سے نہیں ڈرتا تو میرے ساتھ جنگ کرتا ہے، باوجودیکہ تو جانتا ہے کہ میں کس کا فرزند ہوں، ان لوگوں کو چھوڑ دے اور میرے ساتھ ہو جا۔ یہ بات تیرے خدا کی خوشنودی کے زیادہ قریب ہے"۔

عمر بن سعد:

"اَخافُ ان یُهدَمَ دَارِی".

"مجھے خوف ہے کہ میرا گھر گرا دیا جائے گا۔"

امام علیہ السلام:

"اَنَا اَبنِیهَا لَکَ".

"تو اس صورت میں تجھے نیا گھر بنا دوں گا۔"

عمر بن سعد:

"اَخَاف انْ تُو خَذَ ضَیعَتی".

"مجھے خطرہ ہے کہ میری جائداد چھین لی جائے گی"

امام علیہ السلام:

"اَنَا اَخلِفُ عَلَیکَ خیراً مِنْ مَالِی بِالْحجاز".

"میں اپنے حجاز کے مال میں سے اس سے بہتر تجھے جائداد دوں گا۔"

عمر بن سعد:

"لِیْ عَیالٌ وَ اَخافُ عَلَیهِم".

"میرے اہل و عیال ہیں، اُن کی تباہی و بربادی کا مجھے ڈر ہے"۔

اس کے بعد ابن سعد نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

امام علیہ السلام:

"مالَکَ ذَبَحکَ اللّٰہ علیٰ فراشِکَ عاجلاً و لا غفر لک یومَ حشرِکَ فو اللّٰہِ اِنّی لَاَ رْجُوانْ لّا تاکُلَ مِنْ بُرِّ العراقِ اِلّا یَسیراً".

"جلد خدا تجھے بستر پر قتل کرے اور روزِ حشر تیری ہرگز بخشش نہ کرے خدا کی قسم میں امید کرتا ہوں کہ تو زیادہ دیر عراق کی گندم نہ کھائے گا"۔

عمر بن سعد:

"فِی الشَّعیر کِفایَۃٌ مِنَ الْبُرِّ قالَہٗ مُستَھزِءاً".

"تمسخر کے طور پر کہنے لگا کہ گندم نہ ملی تو جو پر کفالت کر لوں گا۔"

خولی کی ابن سعد کے خلاف شکایت

خولی بن یزید اصبحی عداوت خاندانِ رسالت میں سب سے آگے تھا۔ وہ ابن سعد اور جناب امام حسین علیہ السلام کی مصلحانہ گفتگو کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر حال میں میدانِ کارزار گرم ہو اور جنگ کے شعلے بھڑکیں۔ وہ اولادِ رسولؐ کے ساتھ ہر حال میں لڑائی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ابن سعد کی ملاقات کی شکایت ایک خط میں لکھ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دی۔ اس کے خط کا مضمون یہ ہے:

"اَمّا بعدُ اَیُّھا الامیرانّ عمر بن سعدٍ یَخرجُ کلَّ لَیلَۃ و یبسط بساطاً و یدعو الحسین و یتحدثانِ حتّٰی یمضی من اللیل شطرہ و قد ادرکتہ علیٰ

الرّافة و الرحمة فامُره ان ینزلَ عن حُکمک و یصیر الحکم لی و انا اکفیک اَمره".

"اے امیر! عمر سعد ہر رات لشکر سے باہر نکلتا ہے اور فرش بچھا کر امام حسینؑ کو بلاتا ہے اور دونوں مل کر باتیں کرتے ہیں یہاں تک کہ رات کا ایک حصہ ان باتوں میں گذر جاتا ہے۔ میں ابن سعد کو دیکھتا ہوں کہ وہ جناب امام حسین علیہ السلام سے نہایت شفقت و نرمی سے پیش آتا ہے۔ پس آپ اس کو لکھ بھیجیں کہ وہ اس خدمت سے علیحدہ ہو جائے اور اس معاملہ کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں دی جائے میں اس کام کو خوب انجام دوں گا۔"

خولی کا یہ شکایت نامہ جب ابن زیاد کے پاس پہنچا تو وہ سخت برہم ہوا اور اسی وقت اس نے ابن سعد کو یہ خط لکھا:

"اما بعد فقد بلغنی یا بن سعد انک تخرجُ فی کلّ لیلۃٍ و تبسطُ بِساطاً تدعُو الحسین وتتحدث معہٗ حتٰی یمضی اللیل شطرہٗ فاذا قرأت کتابی ھذا فامُرہ ان ینزلَ علیٰ حکمی فان اَطاعَ اولیٰ والّا امنعہٗ مِن الماء فانّی حللتہٗ علیٰ الیھود وَ النّصاریٰ و حرمتہٗ علیہ وعلیٰ اھل بیتہٖ فحل بین الحسین و اصحابہ وَبَین الماءِ فلا یَذ و قوامنہ قطرۃ کما صنع بالتقی النقی عثمان امیر المومنین المظلوم".

"اے پسر سعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ہر رات لشکر سے باہر فرش بچھا کر حسینؑ کو بلاتے ہو اور ان کے ساتھ رات گئے تک محو گفتگو رہتے ہو۔ جب تم میرا خط پڑھو تو انہیں حکم دو کہ ہماری اطاعت کر لیں اور ہمارا حکم مان لیں تو بہتر ورنہ آب فرات ان پر بند کر دو کیونکہ فرات کا پانی میں نے یہود و نصاریٰ وغیرہ پر تو حلال کیا ہے مگر حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ و اصحاب پر حرام کر دیا ہے۔ پس پوری نگرانی کرنا کہ حسینؑ اور ان کے ساتھی پانی تک نہ پہنچ سکیں اور پانی کا ایک قطرہ بھی خیموں تک نہ جا سکے جس طرح کہ مظلوم و متقی امیر المومنین عثمان کے ساتھ کیا گیا"۔

ساتویں محرم، بندش آب اور فرات کی نگرانی

ابن زیاد کا یہ حکم نامہ پہنچتے ہی ساتویں محرم سے جناب امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند ہو گیا۔ اولادِ رسولؐ اور ذریت بتولؑ کو پیاسا تڑپانے کا اُمت نے زبردست انتظام کر لیا۔ ابن سعد مصالحانہ کوشش سے تا حال دست بردار نہیں ہوا لیکن اس کی شکایت دربار ابن زیاد میں پہنچنے سے اور ابن زیاد کی خوفناک دھمکیوں سے مرعوب ہو کر اس نے دریائے فرات پر

مکمل پہرہ بٹھا دیا۔ عمرو بن حجاج کی سرکردگی میں ۵۰۰ سوار دریا کے گھاٹ پر نگرانی کیلئے بٹھا دیئے تا کہ آلِ رسولؐ میں پانی نہ جانے پائے۔

لکھا ہے کہ عمر بن سعد نے پھر ایک بار جناب امام حسین علیہ السلام سے مصلحانہ گفتگو کر کے ابن زیاد کو خط لکھا اور اپنی طرف سے ابن زیاد پر مصالحت کے لئے بہت زور دیا اور اپنے آپ کو ابن زیاد کا خیر خواہ ظاہر کیا۔

جب ابن سعد کا یہ خط ابن زیاد کے دربار میں پہنچا تو شمر بن ذوالجوشن (لعین) بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے ابن زیاد کو وہی مشورہ دیا جو مروان بن حکم لعین نے مدینہ میں عقبہ بن ولید کو دیا تھا۔ اس شقی ازلی، ملعون ابدی نے ابن زیاد کو جنگ پر بھڑکایا، فرزندِ رسول کو فوراً قتل کر دینے کا مشورہ دیا اور عمر بن سعد کی شکایت کی اور کہا:

''اس کی نرمی جنگ کرنے میں تاخیر کا سبب ہے اور اب حسینؑ تیرے محاصرے اور قابو میں ہیں اگر یہاں سے نکل گئے تو تُو کمزور ہو جائے گا اور وہ طاقت پکڑ جائیں گے''۔ ابن زیاد خود بھی یہی چاہتا تھا اور اسے اس جیسے بدفطرت و بدذات ساتھی کی رائے مل گئی۔

چنانچہ اس نے اسی وقت غیظ و غضب میں لوٹتے ہوئے آئندہ خط و کتابت کا سلسلہ بند کرتے ہوئے آخری حکم نامہ خود شمر لعین کے ہاتھ روانہ کیا۔ اس کا مضمون یہ تھا:

''اے پسر سعد! میں نے تجھے اس واسطے نہیں بھیجا ہے کہ تو وہاں بیٹھ کر لڑائی سے اپنی جان بچائے اور نہ ہی اس واسطے کہ تو سستی راہ اختیار کرے، حسینؑ کو سلامتی اور بقا کی امید دلائے اور نہ ہی اس لئے کہ ان کی نسبت مجھ سے عذر خواہی کرے اور مجھ سے ان کی سفارشیں کرے۔

پس یہ جان لے کہ اگر حسینؑ اور ان کے ساتھی میرا حکم مانیں اور ہماری اطاعت اختیار کر لیں تو ان کو صحیح و سلامت میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو پے در پے حملے کر کے ان کو قتل کر دے اور ان کو قتل کر دینے کے بعد ان کی لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کیونکہ یہ سب میرے نزدیک اسی کے قابل ہیں اور لاش حسینؑ کو گھوڑوں کے سموں تلے پامال کر دینا۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد لاشوں کے ساتھ یہ باتیں کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن منہ سے نکلی ہوئی بات کو پورا کرتا۔

اے ابن سعد! اگر تو نے میرے ان تمام احکامات کی بے چون و چرا تعمیل کی تو ہم تم کو ضرور انعام سے سرفراز کریں گے اور اگر تجھے ان باتوں سے انکار ہے تو ہماری فوجوں کی سرداری چھوڑ دے اور اس کام سے علیحدہ ہو جا اور تمام فوجوں اور جنگ

کا کام شمر بن ذوالجوشن کے سپرد کردے۔ہم نے اسے مناسب احکام دے دیے ہیں۔"

مؤرخین کا بیان ہے کہ جب شمر لعین ابن زیاد بدنہاد کا یہ مکتوب لے کر پہنچا تو وہ بھانپ گیا کہ مصالحت میں رکاوٹ کا باعث ابن زیاد کی شقاوت کے ساتھ اس بدبخت کی منحوس سازش بھی ہے۔چنانچہ ابن سعد نے شمر کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا:

وَیلکَ لاقرب اللّٰہ دارکَ وقبح اللّٰہ مَا قدمت بہٖ علی و اللّٰہ انی لا ظنکَ انکَ نہیتہٗ ان یقبل ماکتبت بہٖ الیہ.

"وائے ہو تم پر اور خدا تجھے تیرے گھر سے قریب نہ کرے۔خدا برا کرے تیرے اس خط کا، بخدا میں گمان کرتا ہوں کہ ابن زیاد کو تو ہی نے میرا مشورہ قبول کرنے سے روکا ہے۔"

شمر نے کہا: "ان باتوں کو چھوڑیے آپ ان احکام کی تعمیل کریں ورنہ جنگ کی ذمہ داری اور فوجوں کی قیادت میرے ہاتھ میں دے دیجیے"۔

ابن سعد رَے کی جاگیر کو کب چھوڑنے والا تھا اور اب اس عہدہ سے برطرفی اس کی شیطانی "میں" کو ٹھیس پہنچاتی تھی۔آخر اس نے آخرت کو دنیا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔رَے کا نقد سودا پسند کرتے ہوئے قتل حسینؑ پر کمربستہ ہو گیا۔بدبختی نے اس پر غلبہ پالیا اور حرص و ہوا کے پنجے میں گرفتار ہو کر اپنے یزیدی منصب پر برقرار رہ کر فرزند رسولؐ کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔اب اس نے جناب امام حسین علیہ السلام کے امور میں نہایت سختی اور ظلم سے کام لینا شروع کر دیا۔

بندش آب پر کڑی نگرانی اور آلِ رسولؐ کی تشنہ دھانی

ساتویں محرم سے اولادِ ابوطالب علیہ السلام، فرزند رسولؐ اور اولاد بتولؑ اصحاب حسین علیہ السلام اور ان کے راہواروں پر پانی بند کر دیا گیا۔حر نے ابتداء سے ہی دریا کے قریب ڈیرہ ڈالا تھا۔اہل بیتِ رسولؐ دریا سے دور تھے اور سپاہ بدنہاد دریا کے نزدیک۔

چھ محرم تک تو اصحاب و خادمانِ حسینؑ دریا سے پانی لاتے رہے۔اب ساتویں سے گھاٹ پر پہرہ لگا دیا گیا اور پانچ سو سوار عمرو بن حجاج کی قیادت میں فرات کے کنارے نگران مقرر کر دیے گے جنھیں تاکیدی حکم تھا کہ حسینؑ، انؑ کے اقرباء، مستورات بنی ہاشم اور اطفالِ خوردسال پیاس سے گرم ریت پر تڑپتے رہیں مگر ایک قطرہ پانی کا ان کے خیام میں نہ جانے پائے۔

ایک طرف ساقی کوثر کی اولاد گرم ملک اور گرم موسم میں پانی سے محروم ہے اور پاک خیام سے "العطش" کی صدائیں

بلند ہورہی ہیں اور دوسری طرف سنگدل اور بے رحم اشقیاء سیر ہو کے دکھا دکھا کے پانی پی رہے ہیں اور دشمنانِ دین نے اس پر بس نہیں کی بلکہ طنزیہ فقرے اور شماتت آمیز باتیں کر کے پیاسوں کا دل دکھا رہے ہیں۔ چنانچہ عمرو بن حجاج لعین نے بلند آواز سے مظلوم کربلا کا دل دکھاتے ہوئے یہ گستاخانہ کلمات کہے:

"یا حُسینُ ھٰذا الْماءُ تَلغُ فِیہ الْکِلابُ و تَشرَبُ منہُ الْخنازیرُ و اھلُ السّوادِ وَالْحمرِ والذّئابُ وما تذوقُ منہُ الْماءُ وَاللّٰہِ قَطرۃً حتیٰ تذُوقَ الْحمیمَ فِي نارِ الْجَحیم".

"اے حسین علیہ السلام! یہ فرات کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی کس شان سے بہہ رہا ہے، کتے اور خنزیر اس سے پانی پی رہے ہیں، جنگل کے جانور سور، بھیڑیے اور گدھے سب سیراب ہو رہے ہیں، لیکن حسینؑ! تم اس سے ایک قطرہ بھی نہیں پی سکتے۔ یہاں تک (معاذ اللہ) تم جہنم میں دوزخ کا گرم پانی پیو"۔

ملعون کے اس کلام نے فرزندِ رسول کا دل زخمی کر دیا۔ بندش آب سے اس کا کلام زیادہ اذیت رساں تھا۔ اسی طرح ایک اور کمینے بدفطرت عبداللہ بن حصین ازدی نے قلبِ اطہر پر طنزیہ زبان درازی کا تیر چلاتے ہوئے کہا:

"یَاحسینُ اَلا تنظُروَن اِلیٰ الْماءِ کَانَہٗ کبد السَّماءِ واللّٰہِ لا تَذوقُون منہُ قَطرۃً واحدۃً حتیٰ تموتوا عطشا ناً فقال الحسین علیہ اسلام اَللّٰھم اقْتُلہٗ عطشا و لا تغْفر لہٗ ابداً".

"حسینؑ! کیا آپ فرات کو نہیں دیکھتے؟ گویا آسمان کا جگر ہے بخدا تم اس سے ایک قطرہ پانی کا بھی نہیں پی سکتے، یہاں تک کہ شدت پیاس سے مر جاؤ گے"۔

جنابِ امام حسینؑ نے اسے بددعا دی اور کہا: "خدایا اسے پیاسا ہلاک کر اور اسے کبھی نہ بخش۔"

اس ملعون کی زبان درازی سے قلبِ امامؑ کو اس قدر اذیت پہنچی کہ صابر امامؑ بددعا دینے پر مجبور ہو گئے اور بارگاہِ الٰہی میں التجا کی کہ خدایا اس کو پیاسا ہلاک کر۔ مظلوم امامؑ کی دکھی دل سے نکلی ہوئی آواز قبول ہوئی۔

حمید بن مسلم بیان کرتا ہے: "میں نے اس ملعون کو دیکھا کہ شدت پیاس سے فریاد کرتا تھا۔ لوگ اسے پانی پلاتے تھے اور وہ فوراً قے کر دیتا تھا اور اس کی پیاس ویسی کی ویسی ہی تھی۔ فریاد کرتا پانی پیتا مگر فوراً قے کر دیتا اس کی پیاس نہ بجھتی یہاں

تک کہ اسی حالت میں واصلِ جہنم ہو گیا"۔

فرات کا ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بہنا اور سادات بنی ہاشم کی تشنہ لبی پر ایک عربی شاعر نے اپنے درد بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے جسے ہم درج کرتے ہیں:

وَیلُ الفُراتِ اَبادَ اللّٰہُ غامِرَہُ
وردٌ وَارِدَہ بالرغم ظمآنا

"ہائے افسوس ہے فرات پر! خدا اس کی گہرائی کو تباہ کر دے اور اس کے گھاٹ پر وارد ہونے والے ظالموں کو سدا پیاسا ہی رکھے"۔

لَم یُطفٔ حَرّ غَلیل السّبطِ بَارِدہُ
حتیٰ قضیٰ فی سبیل اللّٰہِ عطشانا

"فرات کے ٹھنڈے پانی نے سبطِ رسول کی پیاس نہ بجھائی، یہاں تک وہ مظلوم راہِ خدا میں پیاسا مارا گیا"۔

فحذٌ اَنْ تتلظّیٰ بَینَھُم عطشاً
وَ الماءِ یَصدرُ عنہُ الوحشُ رَیّانا

"کس قدر گراں اور سخت بات ہے کہ فرزندِ رسولؐ پیاس کے مارے بیقرار ہوں اور جنگلی جانور اس کے گھاٹ سے سیراب ہو کر لوٹیں"۔

ایک اور عربی شاعر کہتا ہے:

بِنَفسی شَفَاھاًذَا بلاتِ مِنَ الظَماء
ولم تُحظ مِن ماءِ الفُراتِ بقَطرۃِ

"قربان جائیں ہماری جانیں پیاس سے کملائے ہوئے ہونٹوں پر جنہیں فرات کے پانی سے ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہوا"۔

بِنَفسی عُیوناً غا ئراتٍ سَواھِراً
اِلیَ الماءِ مِنھا نظرۃٌ بَعدَ نَظرۃِ

''قربان جائیں ہم ان آنکھوں پر جو بھوک و پیاس کی وجہ سے دھنس چکی تھیں اور بیدار رہ کر روتی تھیں اور پانی کی طرف لگاتار اٹھتی رہتی تھیں۔ معصوم بچے ہاتھوں میں کوزے لئے خیام کے دروازے پر پانی کے منتظر رہتے تھے''۔

اسی طرح ایک اور شاعر نے اہلبیت علیہم السلام کی تشنہ دہانی سے متاثر ہو کر لکھا ہے:

بَابی الامامُ الُمُستظامُ بکربلا

یَدعُوا ولَیسَ لما یقُولُ مُجیب

''میرا باپ قربان ہو اس پر! جو کربلا میں پیاسا رہا، مدد کے لئے پکارتا تھا لیکن کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔''

بَابی الُوحیدُو مَا لَہٗ مِنُ راحِمِ

لَیشکُوالظّماءَ وَالُماءُ مِنہُ قَریب

''میرا باپ قربان ہو جائے اس یکہ وتنہا مظلوم پر جس کی غریبی اور مظلومی پر کوئی رحم کرنے والا نہ تھا۔ وہ پیاس کی شکایت کرتا تھا حالانکہ پانی اس کے قریب بہہ رہا تھا۔''

بَابی الُحبیبُ الیٰ النّبی محمّدِ

ومُحمدٌعِندَاللّٰہِ حَبیب

''میرا باپ قربان ہو اس نبی محمد مصطفےٰ کے پیارے پر اور محمدؐ خدا کے پیارے نبی ہیں۔''

یاکربلا افِیکَ یقُتلُ جَھرۃً

سِبطُ المطَھرِانَّ ذالعَجیبٌ

''اے کربلا تیری زمین پر ہزاروں کے سامنے برملا، پاک رسول کا فرزند قتل ہو رہا ہے اور تمام لوگ جانتے ہیں کہ فرزندِ رسولؐ ہیں، تعجب اور حیرت کی بات ہے''۔

مَا اَنتِ الا کربۃٌ وبلیّۃٌ

کُلُّ الامامَ بھَولِھَا مَکروب

''اے کربلا! تو مصیبت ہی مصیبت اور دُکھ ہی دُکھ ہے۔ تمام دنیا تیری ہولناکی سے غمزدہ ہے''۔

یَا مَنُ اِذَا ذُکِرَتُ لَدَیہِ کَربَلا

لَطَمَ الُخُدورَا وَ مَعہُ قَدُ اَھمَلا

مَمَّا تَمُرُّ عَلَى الْفُرَاتِ فَقُلْ اَلَا
بُعْدًا الشَّطِّکَ يَا فُرَاتُ فَمَرٌّ لَا
تَحلُوا فَاِنَّکَ لَا هَنِيٌّ وَّلَا مَرِیٌ

''اے عزادارو! جس کسی کے پاس کربلا کا واقعہ بیان کیا جائے تو وہ رخسار پیٹ کر آنسو بہاتا ہے۔ جب تیرا گزر فرات کے پاس سے ہو تو فرات سے مخاطب ہو کر کہنا:

اے فرات! تجھے دوری ہو اور تو کڑوا ہو اور تیرا پانی میٹھا نہ ہو اور نہ مبارک و خوشگوار ہو''۔

اَيُذَادُ نَسلُ الطَّاهِرِيْنَ اَباً وَّجَد
عَنْ وِرْدِمَاءٍ قَدْ اُبِيحَ لِمَن وَرَد
لَوْ كُنْتَ يَا مَاءَ الْفُرَاتِ مِنَ الشَّهد
اَيَسُرَغُ مِنکَ الْوُرُود وَعَنکَ قَد
صَدُ الْاِمَامِ سَلِيْلُ سَاقِی الکوثر

''فرات کا پانی ہر شخص کیلئے، جو گھاٹ پر پہنچے مباح تھا لیکن جو ماں باپ کی طرف سے طاہر النسل تھے، انہیں پینے سے روکا گیا۔ اے فرات تیرا پانی اگر شہد بھی بن جائے تو مجھے پینا خوشگوار نہیں کیونکہ ساقی کوثر کی اولاد تجھ سے رَدکر گئی''۔

پانی بند ہو جانے سے آلِ رسولؐ و اصحابِ حسینؑ پر جب پیاس کا غلبہ ہوا تو حضورؑ کے اصحاب میں سے یزیدؒ بن حصین ہمدانی یا بریرؒ بن خضیر ہمدانی نے خدمتِ امام علیہ السلام میں عرض کی: ''فرزندِ رسولؐ! اگر اجازت ہو تو میں حصولِ آب کے لیے عمر بن سعد سے کچھ گفتگو کروں؟ شاید اس کی سنگدلی پر کچھ اثر ہو جائے''۔

امام علیہ السلام نے اجازت دی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر عمر کے پاس گیا لیکن ابنِ سعد کو سلام نہ کیا۔ ابن سعد نہ کہا:

''اے ہمدانی! کیا تو مجھے مسلمان نہیں سمجھتا؟ کیا میں خدا اور رسولؐ کو نہیں پہچانتا؟ تو نے مجھے سلام نہیں کیا''۔

جنابِ ہمدانیؒ نے جواب دیا: ''اگر تو مسلمان ہوتا اور تجھے خدا اور رسول کی معرفت ہوتی تو عترتِ رسولؐ کے قتل کے ارادے سے کربلا میں نہ آتا''۔

اس کے بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا:

اے پسر سعد! تجھے شرم نہیں آتی؟

"فَهٰذَا مَعَ الْفُرَاتِ یشرب کلابُ السّواد وخنازیرها وَ هٰذَا الحسین بن علی علیهم السلام وإِخْوانهُ و نسائهُ واهلبیةٍ یَمُوتُون عَطْشاً قَدْحُلْتَ بَیْنَهُمْ وَبَیْنَ مَاءِ الْفُرَاتِ اَنْ یَّشْرَبُوهُ وَ تزعَمُ اَنَّکَ تعرفُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ".

"یہ فرات کا پانی بہہ رہا ہے، صحراء کے کتے اور خنزیر اس سے سیراب ہو رہے ہیں اور ادھر حسین ابن علی علیہ السلام، ان کے بھائی، مستورات اور اہلبیت شدت پیاس سے بیقرار ہیں۔ تو نے ان کے لیے فرات کا پانی بند کر رکھا ہے اور اس کے باوجود تو گمان رکھتا ہے خدا اور رسولؐ کو پہچانتا ہے"۔

شرم کے مارے ابن سعد نے سر جھکا لیا۔ اس کے بعد بولا: "بے شک ان کی عزت و حرمت جانتا ہوں لیکن میرا نفس مجھے رَے کی جاگیر ترک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ حسینؑ کیلئے میں رَے کی جاگیر کیوں ترک کر دوں؟"

ابن سعد پر اس مخلص و وفادار صحابی کے کلام کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے فرات پر مزید فوج بھیج کر سخت پہرا لگا دیا۔ اس نے چار ہزار آدمی غاضریہ کی گھاٹ پر مقرر کر دیے۔ کیونکہ یہی گھاٹ اس وقت تک خالی تھا جس کی طرف سے لشکر گاہِ حسینؑ میں پانی پہنچنے کی اُمید تھی۔ شیث بن ربعی کو ایک ہزار سواروں کے ساتھ ان چار ہزار کا نگران بنایا اور سخت تاکید کی کہ خیام اہلبیتؑ حسین علیہم السلام میں بوند بھر پانی بھی نہ جانے پائے۔

ظلم و ستم کے اس مضبوط انتظام سے جاں نثارانِ حسینؑ کو اضطراب و پریشانی لاحق ہوئی بیان سے باہر ہے۔ ہر شخص اپنی اور اہل و عیال کی جانوں سے قطعاً مایوس ہو گیا تھا۔

ایک تو مکمل طور پر فوج اشقیاء میں گھر گئے تھے۔ چاروں طرف سے ناکہ بندی تھی اور پیاس کی شدت دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ کسی طرف سے غذائی رسد بھی ممکن نہ تھی۔ صرف پانی بند نہ تھا بلکہ غذائی خوراک کی بھی قلت تھی۔ امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی صرف پیاسے ہی نہ تھے بلکہ بھوکے بھی تھے۔ اس واسطے بھوک اور پیاس دونوں کی شدت تھی۔ ان کے ساتھ ان کی سواری کے جانوروں کا بھی یہی حال تھا۔

اعجاز امامت

ساتویں محرم کو جب امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر نہر فرات سے پانی حاصل کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی اور شدت پیاس سے اہل بیتؑ و اصحاب، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی حالتیں بدل گئیں اور تشنگی کی وجہ سے نڈھال ہو گئے تو

امام حسین علیہ السلام نے اپنی شانِ امامت اور اعجازِ ولایت سے معرفت کروانے کے لیے اصحابِ باوفا، بلکہ فوجِ اشقیاء کو بھی دکھا دیا کہ تم نے تو پانی بند کر دیا ہے۔ میں حسینؑ اس وقت امتحان میں ہوں۔ میں چاہوں تو پاؤں کی ٹھوکر سے ہزاروں چشمے پانی کے پیدا کر سکتا ہوں۔ چنانچہ آپؑ نے اعجازی طاقت دکھاتے ہوئے اپنے خیام سے انیس قدم کے فاصلے پر جانب قبلہ، بیلچے سے تھوڑی سی زمین کو کھودا، پانی کا ٹھنڈا اور میٹھا چشمہ ظاہر ہوا اور آپؑ اور آپؑ کے تمام ہمراہیوں نے پانی پیا۔ اس کے بعد وہ چشمہ بے نام ونشان ہو گیا۔

یہ ایک معجزہ تھا جو وقتی طور پر ظاہر کیا گیا۔ ورنہ زمین کربلا میں اس وقت کنواں کھودنے سے بھی پانی نہ نکلتا تھا۔ یہ چشمہ کیا تھا؟ صحرائے کربلا میں اعجازِ امامت اور مرتبہ ولایت کا ظہور تھا۔

اصحاب باوفا کو اپنی شان دکھانا مقصود تھا تا کہ ان کے درجاتِ یقین اور مراتبِ عرفان میں اضافہ ہو۔ وہ سمجھ لیں کہ جس کی رفاقت میں جانیں قربان کرنے کے لیے آئے ہیں، وہ اس شان کا مالک ہے۔ اعدائے اشقیاء جان لیں کہ جس کے ساتھ لڑنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، وہ اس قدر اعجازی اور روحانی طاقت کا مالک ہے کہ ایک ٹھوکر سے چشمہ آب جاری کر سکتا ہے۔ جس کے باپ اور نانا نے جس طرح کفار و منافقین کو اپنی اعجازی طاقتیں دکھائی تھیں اور اپنی نبوت و امامت کے اعجازی ثبوت پیش کیے تھے، اسی طرح فرزندِ رسولؐ اور ساقی کوثرؑ نے عالمِ غربت میں صحرائے کربلا میں اپنے آپ کو نمائندۂ خدا، محافظِ دین و پاسبانِ شریعت، امامِ حق ثابت کرنے کے لیے کئی اعجاز دکھائے تا کہ پوری طرح پہچان کر لڑیں اور عذابِ ابدی میں گرفتار ہوں۔

صرف ایک بار یہ اعجاز دکھایا۔ کیونکہ یہ امتحان تھا اور بحیثیت ایک انسانِ کامل کے اس امتحان کا بار اٹھایا۔ اس واسطے دنیوی اسباب اور بشری تقاضوں کے مطابق امتحان دیا۔ اگر اس طرح بار بار اعجازی شان سے خورد و نوش کرتے تو ان کا کمال اور کامیابی قرار نہ پاتی اور نہ ان کا کارنامہ عالمِ انسانیت میں بطور نمونہ پیش کیا جاتا۔ اگر آج دنیائے انسانیت کو ان کے اس بے مثال اور لازوال کارنامے پر فخر ہے تو انسانِ کامل کی حیثیت سے ہے۔

اس کے بعد چشمہ تو ختم ہو گیا اور گھاٹ پر سخت پہرے تھے۔ پیاس کی شدت آٹھویں تاریخ سے مزید بڑھ گئی تھی۔ نویں محرم سے تو یہ حال تھا کہ خیامِ حسینیؑ میں العطش العطش کی جگر گداز آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور امامؑ اور ان کے تمام اقرباء و انصار قطرۂ آب کے لیے ترس رہے تھے کہ نویں تاریخ محرم سے تو شدتِ پیاس کی وجہ سے اطفالِ خورد سال مرنے کے قریب ہو گئے۔ خیام میں قحطِ آب تھا۔ سب برتن خالی تھے۔ اہلبیت علیہم السلام کے کم و بیش بیس کمسن بچے تھے۔ سب پیاس سے بے حال

تھے۔ گرم ریت پر شدید پیاس سے تڑپتے تڑپتے جب بیہوشی کی حالت طاری ہوتی تو دکھیاری مائیں بچوں کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھتیں کہ پیاس کی شدت سے میرا لال مر تو نہیں گیا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

بچھونوں پر بیہوش بچے پڑے تھے
حرم ہاتھ رکھ رکھ کے دم دیکھتے تھے

دستور ہے کہ گرمی کے موسم میں جب کمسن بچہ سو کر اٹھتا ہے تو پیاسا ہوتا ہے۔ پانی مانگتا ہے۔ ماں بچے کی منتظر رہتی ہے کہ اٹھے تو فوراً پانی پیش کروں۔ وہ خوش نصیب مائیں ہیں جنہیں ٹھنڈا پانی میسر آتا ہے اور بچوں کو پانی سے سیراب کر کے ترو تازہ چہرے اور ہنستا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ دل بہلاتی ہیں، لوریاں دیتی ہیں۔

لیکن قارئین! کربلا میں بیس کمسن بچے تھے۔ ان کی ماؤں کا کیا حال ہوگا؟ جب کھلی ہوئی چوٹیاں، میلے کرتے، پیاس سے مرجھائے ہوئے چہرے، سوکھے ہوئے ہونٹ اور خشک گلہ دیکھتی ہوں گی۔ العطش العطش کی جگر پاش صدائیں سنتی ہوں گی تو ان کے دلوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ بچے امید کی نگاہیں ماں کے چہروں پر ڈالتے ہوں گے۔ لیکن مائیں حسرت و یاس کی نظر سے اپنے کملاتے ہوئے پھولوں کو دیکھتی ہوں گی۔ معصوم بہنیں کیا جواب دیتی ہوں گی؟ کس طرح تسلیاں دیتی ہوں گی؟ اس سلسلہ میں جناب سکینہ بنت الحسین علیہم السلام کی زبان سے ایک روایت قلمبند کرتے ہیں۔ جناب سکینہ فرماتی ہیں:

نویں محرم سے اطفال اہل بیت مرنے کے قریب ہوگئے تھے، مشکیں سوکھ گئی تھیں اور چمڑے میں جو رطوبت ہوتی ہے، وہ بھی خشک ہوگئی تھی۔ میں اور میرے ساتھ چند بچے پیاس سے بیتاب تھے۔ میں پھوپھی زینبؑ کے خیمے میں اس خیال سے گئی کہ شاید کچھ پانی مل جائے۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا۔ میں پھوپھی کے خیمے میں داخل ہوئی۔ بنی ہاشم کے دوسرے بچے بھی میرے ساتھ شامل ہوگئے کہ سکینہ سردار کی بیٹی ہیں، انہیں پانی مل جائے گا اور اس کی وجہ سے شاید ہم بھی پیاس بجھا لیں۔

جناب سکینہ کا بیان ہے کہ جب میں خیمے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ میری پھوپھی خیمہ میں تھیں اور ان کی گود میں میرا چھوٹا بھائی علی اصغر تھا۔ وہ پیاس سے اس قدر بے چین تھا کہ میری پھوپھی کبھی بیٹھ جاتیں اور کبھی کھڑی ہو جاتیں۔ اصغر مچھلی بے آب کی طرح تڑپتا تھا اور چلا چلا کر روتا تھا۔ پھوپھی کہتی تھیں کہ بیٹا اصغر ٹھہر جا اور چپ ہو۔ بھلا تجھ سے کیسے ٹھہرا جائے جبکہ تو ایسی سخت حالت میں گرفتار ہے۔ تیری پھوپھی پر سخت ناگواری ہے۔

تیرا چلا کر رونا؟ آہ! جناب زینبؑ پر کتنی غربت چھائی ہوئی تھی اور کس قدر دلگیر تھیں کہ ساقی کوثر کی دختر آج اپنے ششماہے بھتیجے کو پانی پلانے سے مجبور تھیں، جناب سکینہ کہتی ہیں کہ یہ حالت دیکھ کر میں رونے لگی اور پانی مانگنے کی جرأت نہ کر سکی۔

پھوپھی نے میرے رونے کی آواز سنی تو زیادہ بیتاب ہوگئیں۔

میں نے کہا: ''پھوپھی اماں آپ کسی کو انصار کے خیمے میں بھیج دیں۔ شاید وہاں سے پانی مل جائے۔''

میری پھوپھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ علی اصغرؑ کو ہاتھوں پہ لیا اور دوسری پھوپھیوں کے خیمے میں گئیں مگر پانی وہاں بھی نہ ملا۔ آپ ذریت جناب امام حسین علیہم السلام کے پاس بیٹھ گئیں اور انصار کے ہاں آدمی بھیجا مگر وہاں بھی قحطِ آب تھا۔ جب پانی سے مایوس ہوگئیں تو اپنے خیمے میں پلٹ گئیں۔

اس واسطے بنی ہاشم کے بیس بچے ہاتھوں میں کاسے لئے موجود تھے۔ مگر پانی نہ ملنے سے یہ معصوم بچے حسرت و یاس کے ساتھ اپنے خیام میں لوٹ گئے۔ ادھر اہل بیتؑ کے بچوں کی تشنہ دہانی کا یہ حال تھا، اُدھر سنگدل ظالم دکھا دکھا کر پانی پیتے تھے اور العطش کی دل دہلا دینے والی آوازیں سن کر ہنستے تھے۔

شیعو! خدا تمہیں کبھی پیاسا نہ رکھے۔ سدا ٹھنڈا پانی پیتے رہو، لیکن جب ٹھنڈا پانی پینا تو کربلا والوں کی پیاس کو بھول نہ جانا۔ ہمارے امامؑ نے تمہیں تاکید کی ہے:

''شِيْعَتِيْ مَا اِنْ شَرِبْتُمْ مَاءَ عَذْبٍ فَاذْكُرُنِيْ''.

''میرے شیعو! جب ٹھنڈا پانی پینا تو میری پیاس کو یاد کر لینا''۔

✿✿✿

قابلِ جزاء اعمال
مرضی خالق کے مطابق عمل
آئمۂ ضلال و آئمۂ ھدیٰ

نویں محرم اور شبِ عاشور کے واقعات

"مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ".

"جزاء کے دن کا مالک ہے"۔

انبیاء ومرسلین کے ذریعہ جو احکام اس نے بندوں کو عمل کرنے کیلئے دیئے ہیں اور جن چیزوں سے بندوں کو دنیا میں روکا ہے، ان کے حساب وکتاب، بازپرس، جزاء وسزا کیلئے ایک دن مقرر فرمایا ہے، اس دن کا نام "یوم الدین" ہے اور وہ اس دن کا واحد مالک ہے۔ اس کی ملکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ تمام دنوں میں جزاء کا دن اہم اور سخت ہے۔ ویسے وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ لیکن یہ دن ثواب وعذاب، حساب وکتاب ہے، جس میں ہر ادنیٰ واعلیٰ، نیک وبد، مطیع وعاصی جوابدہی کے لیے اور جو کام اچھے یا برے دنیا میں کیے ہیں، ان کی جزاء وسزا کے لیے خالق ومالک کے روبرو حاضر ہوں گے۔ اس واسطے اس دن کی خصوصیت کا ذکر فرمایا ہے۔

وہ اس دن کا مالک بھی ہے اور بادشاہِ مطلق بھی ہے۔ چنانچہ روزِ قیامت آواز آئے گی:

"لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمِ"

"آج کس کی بادشاہی ہے؟" جواب آئے گا:

"لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ"

"اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ہے جو ہر چیز پر غالب ہے۔"

روزِ جزاء (قیامت) کے ثابت کرنے کے بعد ہم اس دن ہونے والے واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

کن اعمال کی جزاء ملے گی؟

عادلِ حقیقی رحم آمیز عدالت کرے گا اور ان اعمال کی جزاء دے گا جو بندوں نے حکمِ خدا سمجھ کر اور مرضی خدا کے مطابق

عمل کیے۔ لہٰذا اس دنیا میں عمل کرتے وقت انسان کو نہایت غور وفکر کرنا چاہئے کہ واقعی خالق کا حکم ایسا ہی ہے اور اس نے اسی طرح اس کے بجالانے کا حکم دیا ہے؟ اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء وائمہ علیہم السلام کی ہدایات کے مطابق نہیں تو وہ اس عمل کی جزاء کا حقدار نہیں۔ جیسا کہ ارشادِ مالک ہے:

"قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعاً".

"آپ کہہ دیں کہ کیا ہم تمہیں وہ لوگ بتائیں جن کے اعمال خسارے میں ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی محنت وکوشش دنیا میں ضائع ہوگئی، اکارت ہوگئی اور گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔"

لوگ اپنی نظروں میں اپنی آراء اور سمجھ کے مطابق انہیں اچھا سمجھ کر کرتے رہے لیکن خدا کے نزدیک وہ سب ضائع اور بیکار گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احکامِ شریعت اور اعمالِ دین بندوں کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ قابلِ جزاء وہ اعمال ہیں جو واقعی احکامِ خدا ہیں اور اس کے بھیجے ہوئے ہادیوں اور راہبروں کے ذریعے بندوں تک پہنچے ہیں۔

پس اے مسلمان! ذرا سوچ کہ جو عمل تو کر رہا ہے کیا وہ قابلِ قبول بھی ہے؟ کیا اسلام کے رہنماؤں کی ہدایت کے مطابق ہے؟ پس جو تو نماز پڑھ رہا ہے، ہادی اسلام کے فرمان اور طریقے کے مطابق ہے؟

اگر تو نے اپنی سمجھ اور رائے کے مطابق نماز پڑھی تو اس کی جزاء تو اپنے آپ سے لے گا۔ خدا سے اس کی جزاء لینے کا حقدار نہ ہوگا۔ اسی طرح جو عمل بھی کرے گا، اس میں تیری رائے کا کوئی دخل نہ ہو۔ اپنی طرف سے احکامِ شریعت میں تجھے کمی بیشی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جس طرح خالق نے حکم دیا اور ہادی نے پہنچایا، اس کے مطابق ہی تو نیک بدلے کا مستحق ہوگا۔

عموماً لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ میری سمجھ کے مطابق نہیں۔ میری عقل میں یہ بات نہیں آتی، میں تو اس کو اس طرح سمجھتا ہوں۔ اے بندۂ خدا! احکامِ شریعت تیری سمجھ کے پابند نہیں۔ تیری رائے کے مطابق نہیں۔ شریعت تیرے دماغ کے تابع نہیں۔ تو اپنی رائے احکام اسلام کے تابع کر، اسلام کو اپنا ہم خیال نہ بنا۔ اپنے خیال کو اسلام کے موافق بنا۔ ہاں! اسلام کو سمجھنے میں ضرور غور وفکر کر لیکن یہ خیال کر کہ تیری عقل کامل نہیں۔ تیرا خیال ہر حال میں صحیح نہیں اور ہر شے تیری سمجھ میں آنے والی نہیں۔ ہاں! اتنا سمجھ کہ یہ حکمِ اسلام ہے اور پیغمبرؐ کا فرمان ہے۔ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر جا، گو تیرے دل پر گراں گزرے۔ اسی چیز کا نام ہے تسلیم اور حکمِ اسلام سے اتفاق نہ کرنا ہے "بغاوت"۔

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ"

"اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔"

کیا پیغمبرؐ نے ایک طریقہ سے نماز پڑھی یا چار طریقوں سے؟ یہ چار طریقے اس وقت وجود میں آئے جب لوگوں نے اپنی رائے اور قیاس کو دین میں داخل کر دیا۔ چونکہ روزِ قیامت اعمال میں سب سے پہلے نماز کی پرسش ہوگی اس واسطے اگر نماز قبول ہوئی تو دوسرے اعمال بھی قبول اور اگر نماز رد کر دی گئی تو دوسرے اعمال بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے جائیں گے۔

میں نہیں کہتا اس طرح پڑھو۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس طرح نماز پڑھو جس طرح امیر المومنین علیہ السلام کے بھائی، اہل بیت کے بزرگ، جناب فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا کے بابا اور جناب حسنین علیہم السلام کے نانا نے نماز پڑھی اور ان حضرات کی نماز بھی انہی کی طرح ہے۔ لہٰذا اسی طرح نماز پڑھ جس طرح بعدِ رسولؐ، رسولؐ کے اہل بیتؑ اور رسولؐ کی آلؑ نے پڑھی۔

"اِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاھَا وَاِنْ رُدَّتْ رُدَّ مَاسِوَاھَا".

اسی طرح ہر عقیدہ اور ہر عمل ہادیانِ اسلام کے مطابق ہو۔ قیامت کے روز سب سے بڑا مفلس اور بے سرمایہ وہ شخص ہوگا جو دُنیا میں عمل کرتے کرتے تھک گیا لیکن جزاء سے محروم ہو گیا۔

"عَامِلَۃٌ نَاصِبَۃٌ تَصْلٰی نَارًا حَامِیَۃً".

مریض کی مثال

1۔ مریض کوشش کرتا ہے کہ صحیح اور لائق طبیب سے علاج کروائے۔ اس کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک تو لائق اور ماہر طبیب کی پہچان اور دوسری اس کی ہدایات پر عمل۔ مریض اگر اپنی رائے اور ناقص و گھٹیا سمجھ پر بھروسہ کر کے طبیب کی طرف رجوع نہ کرے تو اس کا مرض بڑھتا جائے گا اور ہلاک ہو جائے گا کیونکہ مریض ہوتے ہوئے اس نے طبیب کا دامن نہ پکڑا اور اس کے دروازے پر نہ گیا۔ اگر غلط طبیب کے دروازے پر گیا جو طبیب تو نہ تھا، طبابت کا لباس پہن رکھا تھا، بورڈ لگا رکھا تھا، حکیم نہ تھا مگر حکیم کی مسند پر بیٹھ گیا۔ ایسے خود ساختہ طبیب کی چوکھٹ پر جانے سے بھی مریض شفا نہ پا سکے گا بلکہ اس کا مرض سخت ہو جائے گا۔ غلط طبیب کے علاج سے بیماری پیچیدہ ہو جائے گی۔

2۔ طبیب کی پہچان تو اس نے کر لی، اس کی خوش قسمتی کہ لائق اور ماہر طبیب کے دروازے پر پہنچ گیا، مرض تشخیص کروالیا، نسخہ بھی لکھوالیا اور ہدایات بھی لے لیں۔ مگر بدقسمتی سے اس نے طبیب کے کہنے کے مطابق دوا استعمال نہیں کی اپنی

رائے اور سمجھ کے مطابق استعمال کرنے لگا۔ مثلاً طبیب نے کونین وغیرہ ایسی دوا کھانے کے کچھ دیر بعد استعمال کرنے کو کہا اس نے خالی پیٹ لے لی، حکیم کے کہنے کے مطابق اس نے پرہیز نہ کیا تو مریض اپنی سمجھ کے موافق ہزار بار دوا استعمال کرے صحت یاب نہ ہو سکے گا بلکہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مصداق ہو کر رہ جائے گا۔

وہی مریض صحت یاب ہوگا اور تندرستی کا لطف اٹھائے گا جو طبیب کی کڑوی دوا استعمال کرے گا گو یہ دوا اس کے دل پر گراں گزرے گی اور اس کی طبیعت پر بوجھ بھی ہوگا۔ مگر فطرت سلیمہ والا سمجھ دار مریض حکیم کے فرمان اور طبیب کی ہدایت کے آگے سرنگوں ہو گیا، منزل تسلیم میں آ کے اس نے دل و جان سے احکام کی تعمیل کی۔ دولت صحت سے مالا مال ہو گیا۔

لیکن وہ مریض بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ جس میں بغاوت کا مادہ پایا جائے، بجائے اس کے الٹا طبیب کو غلط کہے، اس کی ہدایات کو صحیح ماننے کے برعکس طبیب کو یاوہ گوئی اور ہذیان کا طعنہ دے، وہ نسخہ لکھنے کو کہے اور مریض اس کی طرف ہذیان کی نسبت دے۔

عمل مرضئ خالق کے مطابق ہو

بہر حال انسان کو جب علم ہو جائے کہ خدا اور رسول کا حکم ہے اور اس طرح حکم ہے۔ تو اس حکم کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

اسی طرح ایک عمل خیر ہے لیکن اس کے بجالانے کا طریقہ غلط ہے۔ مثلاً نماز ہے کوئی شخص صبح کے دو فرضوں کی چار فرض پڑھ لے یا رکوع و سجود نہ کرے، صرف تصور کے ساتھ کچھ پڑھتا رہے، وضو نہ کرے۔ اسی طرح روزہ سورج نکلنے سے شروع کرے اور نصف رات تک لے جائے، روزہ کی مدت میں تو کمی نہیں مگر مرضی خدا کے مطابق نہیں، حج ہے اس کے مناسک ادا کرنے میں تبدیلی کر دے، زکوٰۃ ہے، مقررہ حصہ نکالتا ہے لیکن یار دوستوں کو دیتا ہے وہ امیر ہیں یا عیاشی میں زکوٰۃ کا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اس طرح وہ نیک عمل تو کرتا ہے لیکن ضائع کر دیتا ہے۔

مرضی خدا اور رسولؐ و آئمہ علیہم السلام کے مطابق نہیں کرتا۔ باوجود ان نیک کاموں کی ادائیگی کے "یوم الجزا" کے دن وہ ثواب سے محروم ہے۔ اسی طرح مجالس اور مراسم عزا، اسی طرح بجالانے چاہئیں جس طرح جناب امام حسینؑ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی مرضی ہو اور اس طریقہ پر خوش ہوں اور مجالس کا وہی طریقہ کار ہو جو ان کی مرضی کے مطابق ہو۔

مجالس منعقد کرنے سے پہلے یہ سوچ سمجھ لیں کہ جس طرح مجالس کراتا ہوں، میرا جو طریقہ کار ہے کیا وہ آئمہؑ کو پسند ہے؟ کیا دین و شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی تو نہیں ہوتی؟ اس طرح امام حسین علیہ السلام کو پسند ہے؟ یہ نہ ہو کہ

ہزاروں روپے بھی خرچ کرے اور ثواب سے محروم رہ کر الٹا ان کی ناراضگی بھی مول لے لے۔

اسی طرح ذکر امام کرنے والے! وہ بیان کر جو خوشنودئ خدا اور سولؐ آئمہ طاہرین علیہم السلام کا باعث ہو، تیرے بیان سے وہ خوش ہوں، ایسا نہ ہو کہ تو اپنی کامیابی اور دنیوی لالچ میں ایسا ویسا بیان کرے اور ان کی روحیں نفرین کر رہی ہوں تو مستی اور وجد میں مصروف مجلس ہو اور وہ تجھ سے اظہار بیزاری کر رہے ہوں۔

اسی طرح سننے والے حضرات احکامِ دین، قرآن وحدیث، مسائل شریعت، تذکرۂ معصومین علیہم السلام سن کر مجلس کو درسِ ہدایاتِ آلِ محمدؐ جان کر سن، لذتِ نفس اور مشغلہ طرب بنا کر نہ سن۔ سامعین یہ معمولی بات نہیں نہایت صدمہ کی بات ہے کہ جب تک آواز اور لہجہ کی لذت رہے تو سننے میں مگن رہے، جب سادہ آواز میں قرآن اور معصومینؑ کا فرمان آئے تو ان کو پشت کر کے منہ پھیر کے حقیر جان کر نفرت کر کے چلا جائے تو قرآن اور معصومین علیہم السلام تجھ پر راضی ہوں گے؟ کیا تیرے اس سننے کے طریق پر معصومینؑ راضی ہیں؟ مجلس کرانے والے! مجلس پڑھنے والے! اور مجلس سننے والے حضرات! غور فرمائیں۔

صحیح ھادی کی پھچان اور سچے رھنما کی پیروی

دنیا میں انسان جو عمل کرتا رہا اسی کی جزا روزِ جزا پائے گا۔ دنیا کی کھیتی میں جس قسم کا بیج بویا، اسی کا پھل روزِ قیامت پائے گا، جن احکام کی تعمیل کرے گا انہی احکام کا بدلہ حاصل کرے گا۔ اس واسطے یہ معرفت اور علم ضروری ہے کہ واقعی یہ احکام خداوندی ہیں؟ یہی پسندیدہ دین کی ہدایات ہیں۔

یہ احکام لینے والے اعمال کرنے والے مکلف کی معرفت پر منحصر ہے، اگر سچے امام اور سچے ہادئ اسلام سے احکام دین لئے تو سچے اور قابل جزا اور اگر جھوٹے نقلی رہنما، جعلی پیشوا کی اطاعت کر کے غلط رہنمائی حاصل کی تو محنت ضائع، عمل بیکار، کوشش اکارت اور بجائے ثواب کے الٹا مستحق عذاب ہوا۔

اُمت نبی سے بنتی ہے اور فرقہ امام سے بنتا ہے۔ نبی ایک، امت بھی ایک لیکن بعد نبی امام کئی، فرقے بھی کئی کیونکہ فرقے باہمی فرق سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تقسیم اور تفریق پیدا کرنے والے جھوٹے رہنما اور جھوٹے امام ہوتے ہیں۔

اگر اُمت فرقوں میں تقسیم نہ ہوتی اور بعد رسولؐ پاک اُمت کے کئی غلط رہنما نہ پیدا ہوتے، تو پھر احکام صحیح تھے، ہدایات صحیح تھیں، رہبر بھی سچے تھے، صرف پیروی نہ کرنے والوں اور صحیح راہ پر نہ چلنے والوں کی غلطی تھی۔ اب جب رہنما غلط ہوں، امام جھوٹے ہوں تو ان کے احکام کس طرح صحیح اور قابلِ جزا ہو سکتے ہیں؟ ایسے غلط رہنماؤں کی ہزار پیروی کی جائے اور ان کے غلط کو احکام کی لاکھ تعمیل کی جائے، روزِ قیامت جزا سے محرومی اور بدنصیبی کے سوا کیا ملے گا۔

"عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ تَصْلَىٰ نَاراً حَامِيَةً". (غاشیہ پارہ ۳۰)۔

"بہت سے عمل کرنے والے نفوس مشقت اٹھانے والے دہکتی آگ میں داخل ہوں گے"۔

محنت و کوشش برباد" جہنم لازم" یہ بچی معرفت سے محرومی اور سچے امام کی پہچان نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

آدمی روزِ محشر قبر سے تو تنہا اٹھے گا لیکن تنہا نہ پکارا جائے گا، اسے ایک زُمرہ میں شامل ہونا پڑے گا، ہر زُمرہ کا ایک رہنما ہوگا جو دُنیا میں اس زُمرے کا پیشوا تھا۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندِ عالم ہے:

"يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ". (بنی اسرائیل:۱۵)

"روزِ جزاء ہم ہر شخص کو اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے"۔

حدیث مبارکہ میں آیا ہے۔

"الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّهُ".

"ہر آدمی قیامت کے سے اسی کے ساتھ محشور ہوگا جسے دنیا میں دوست رکھتا تھا"۔

سچے امام کی معرفت ضروری ہے۔

"قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وآلِهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ مَاتَ مِيتَةَ الْجَاهِلِيَّةِ".

"حضور پاک نے فرمایا کہ جو شخص مر گیا اور اس نے سچے امام زمانہ کو نہ پہچانا وہ جہالت کی موت مرا"۔

حقیقت یہ ہے کہ سچے امام کی معرفت کے بغیر خدا اور رسولؐ کی بھی صحیح معرفت نہیں ہو سکتی، رسول اللہ کے سچے دین، ان کی صحیح تعلیمات، صحیح احکامِ شریعت، سچے امام اور سچے نائب رسولؐ کے پاس صحیح و اصلی حالت میں محفوظ رہتے ہیں۔

غلط جانشین کے پاس دین و شریعت میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور اسلام کی تعلیمات اصلی صورت میں نہیں رہتیں، ذاتی اغراض اور جانشین کی جہالت کے باعث تعلیمات دین بگڑ جاتی ہیں اور ان کا عامل جزا کا حقدار نہیں رہتا۔

امامِ حق و امامِ باطل

"وَجَعَلْنَا هُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا".

"ہم نے ان کو ایسا امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں جب کہ وہ صابر ہیں"۔

"وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ"

''ہم نے ان کو ایسا امام بنایا جو لوگوں کو جہنم میں پہنچاتے ہیں۔''

معرفت کا معیار

امام حق کی معرفت بھی ضروری اور امام حق کے ساتھ امام باطل بھی ہیں اور روزِ حشر زُمرۂ امام میں داخلہ بھی ضروری ہے۔ اگر حلقہ امام حق میں داخلہ ملا تو کامیابی اور جنت ٹھکانا اور اگر حلقہ امام باطل کی جماعت میں داخلہ ہوا تو ناکامی، ذلت اور جہنم میں رسائی۔ لہٰذا بعد از رسول اُمت کیلئے۔

امام حق اور امام باطل کی معرفت کا کوئی معیار بھی تو ہو۔ ان دونوں میں تمیز کرنے کیلئے کوئی کسوٹی بھی ہونی چاہئے۔ اس کی تفصیل ہم ''الصراط المستقیم'' کی تفسیر میں لکھیں گے۔ اس وقت ''یوم الدین'' کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

دنیا میں اپنے پیشواؤں پر اعتماد کر کے جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا تھا آخرت میں ان سے نفع اور فیض وثواب کے اُمیدوار ہوں گے۔ اور نجات کی امید پر ان سے وابستہ ہوئے تھے، ان سے نجات دلانے کی خواہش کریں گے۔ چنانچہ ان پیروں، مریدوں، رہنماؤں اور پیروکاروں کی حالت یوم قیامت ہم قرآن کی زبانی بیان کرتے ہیں، (پارہ ۲ سورہ بقرہ، رکوع ۴)

"اِذْتَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ. وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ".

''جب پیشوا لوگ اپنے پیروکاروں سے تبرا یعنی بیزاری کر جائیں گے اور عذاب کو دیکھیں گے (بچشم خود) اور ان کے باہمی تعلقات پیری مریدی والے پیشوائی اور پیروکاری والے ختم ہو جائیں گے۔ جب پیشوا اپنا حشر دیکھ کر عذاب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ کر سکیں گے تو پیروکاروں کو کہاں سے بچا سکیں گے، ہاں اپنے ساتھ رکھ سکیں گے۔

پیروکار جب اپنے جھوٹے رہنماؤں کا قطع تعلق دیکھیں گے تو کہیں گے اگر ہم دنیا میں پلٹ کر جائیں اور ایسا ایک بار موقع ملے تو ہم بھی (ان نامرادوں) سے ایسی ہی بیزاری کریں گے جیسی انہوں نے ہم سے عین وقت پر بیزاری اختیار کی ہے۔ یونہی خدا ان لوگوں کو ان کے اعمال حسرت اور ناامیدی کی صورت میں دکھائے گا اور یہ کم بخت آگ سے نہ نکل سکیں گے۔ یہ ان آئمہ ضلال اور پیشوانِ باطل کا ذکر ہے، جو خود جہنم میں جائیں گے اور نجات نہ پاسکیں گے۔ بھلا وہ اپنے پیروکاروں کو کس طرح

جہنم سے بچا سکیں گے؟

اس واسطے مسلمانو! ایسے آئمہ ہدیٰ کی پیروی کرو اور ان کے زمرہ میں داخل ہو جو "قسیم النّار و الجنّہ" ہیں۔ جن کی تعلیمات بعینہٖ تعلیمات رسول صلی اللہ وآلہ وسلم ہیں جو صحیح وارثان رسولؐ ہیں۔

ہم یہاں صرف ایک معیار معرفت پیش کرتے ہیں کہ خدا وہ ہے جو خدائی کے کام کرے، صرف دعوائے خدائی کرنے سے خدا نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص اُس وقت تک نبی نہیں بن سکتا جب تک نبوت کے فرائض نہ ادا کرے، وہ شخص خلافت اور امامت کا منصب نہیں سنبھال سکتا جب تک مسندِ امامت پر بیٹھ کر اُمورِ امامت نہ سرانجام دے اور امام والے کام کر کے نہ دکھائے۔

حضرات! غور فرمائیں کہ زبانی دعویٰ کرنے والے اگر عملی ثبوت نہ دیں تو جھوٹے ہیں۔ خدائی کا زبانی دعویٰ کرنے والے خدائی کام نہ کر سکیں تو وہ خدا جھوٹے۔

نبوت کا دعویٰ کرنے والے نبی والے کام نہ کر کے دکھائیں تو وہ جھوٹے نبی ہیں۔

امامت کا دعویٰ کرنے والے امامت کے کام نہ کریں تو وہ امام جھوٹے۔ اسی طرح شیعہ اور مولائی ہونے کا دعویٰ کرنے والے اگر شیعوں اور مولائیوں والے کام کر کے نہ دکھائیں تو وہ جھوٹے شیعہ ہیں۔ سچے شیعہ وہ ہیں جن کے عمل سے ان کا شیعہ ہونا ثابت ہو، جو نشانیاں اور اوصاف شیعوں کے معصوم علیہ السلام نے فرمائے ہیں اگر وہ ان میں پائے جائیں تو سچے شیعہ اور اگر نہ پائے جائیں تو وہ جھوٹے شیعہ ہیں۔

جس طرح زبانی دعویٰ کرنے سے کوئی نبی یا امام نہیں بن سکتا اسی طرح زبانی دعویٰ کرنے سے ہر کوئی شیعہ نہیں ہو سکتا عملی ثبوت چاہیے۔

ایک شخص مدرس والے مقام پر بیٹھ تو جاتا ہے لیکن تدریسی امور سرانجام نہیں دے سکتا وہ مدرس نہیں، طبیب کے مقام پر بیٹھنے والا تشخیص مرض اور اس کے علاج سے قاصر ہے وہ طبیب نہیں کہلا سکتا۔ تو جو شخص مسند امامت و خلافت پر بیٹھ کر شانِ امامت کے مطابق علمی مسائل حل نہیں کر سکتا، قرآن کے اسرار و رموز فقہ کے مسائل نہیں سمجھ سکتا، مشکل سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا، مقدمات کا فیصلہ قرآن اور سنت کی روشنی سے نہیں کر سکتا، امت کے عقدے حل نہیں کر سکتا، اسے کون سچا امام کہہ سکتا ہے۔ سچا امام تو وہ ہے جو مسند رسولؐ پر بیٹھ کر جن وانس کے مسائل حل کرے، آنِ واحد میں ان کے سوالوں کے جواب دے۔ جو انسانوں کو انسانوں کی زبان میں اور جنوں کو جنوں کی زبان میں سمجھا سکے۔ یہودیوں کو تورات کے حوالے سے

عیسائیوں کو انجیل سے اور مسلمانوں کو قرآن سے جواب دے سکے۔ جو کسی مقام پر اہل اسلام اور غیر مسلموں کے جواب سے عاجز نہ ہو بلکہ "سَلُونِیْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ" کے اعلان سے اقوام عالم کو ہر چیز پوچھنے کی دعوت عام دے۔

اب خود سمجھ لو کہ اس معیار پر اترنے والا کون ہے؟ کیا کوئی قریش کا فرد ہے؟ کسی قبیلہ کا بزرگ ہے؟ مسلمانو! کوئی نہیں سوائے رسولؐ کے برادر، شوہر بتولؑ، حسنینؑ کے پدر اور ابوطالبؑ کے جگر امیر المومنین علی علیہ السلام کے۔

پس لوگو! باطل کے اماموں سے منہ موڑو، آئمہ حق کے ساتھ تعلق جوڑو، غیروں کا واسطہ چھوڑو اور آل محمدؐ کی طرف دوڑو۔

ساقئ کوثر

روز قیامت کی گرمی ہوگی، گھبراہٹ کا عالم ہوگا، ایسی سخت گرمی اور دھوپ میں عموماً دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ کی اور پیاس کی شدت میں پانی کی۔ قیامت میں دھوپ بھی ہوگی اور پیاس بھی، تو اے مسلمان! ایسے امام کا دامن کا پکڑ جو دھوپ سے بچا کر سایہ میں پناہ دے سکے اور پیاس کے لئے کسی حوض کے کنارے پانی پلا سکے۔

پچھلی مجلس میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ "لواالحمد" جناب امیر علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو دنیا میں علمبردار رسولؐ رہے۔ ایسی گرمی میں پیاس ضرور لگے گی، پانی کہاں سے ملے گا؟ حوض کس کے قبضہ میں ہوگا؟ کاسہ کس کے ہاتھ میں ہوگا؟ اور ساقی کون ہوگا؟

سن اور پیغمبر اسلام جناب محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی سن:

"عن ابی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی علیه و آله وسلم فی علی خمسة امور احبّ الیّ من الدنیا و مافیها اماواحدةٌ فهر تکائی بین یَدَی عزّوجل حتٰی یفرغ من الحساب اما الثانیه فلواءُ الحمد بیده آدم ومن ولده تحتهٔ اما الثالثة فواقف عقب حوضی یسقی من عرف من اُمتی امّا الرابعة فساتر عورتی ومسلمی الی ربی عزوجل اماالخامسة فلست اخشیٰ علیه ان یرجع زانیا بعدحصانٍ ولا کافرا بعدایمان".

"حضرت ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ میرے بھائی علیؑ میں پانچ باتیں ایسی ہیں جو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں:

پہلی وہ خدا پر تکیہ لگائے رہے گا، یہاں تک کہ حساب سے فارغ ہو جائے گا۔

دوسری یہ کہ لواء الحمد اس کے ہاتھ میں ہوگا، آدمؑ اور اس کی اولاد اس کے سایہ کے میں جمع ہوگی۔

تیسری یہ کہ میرے حوض کے پیچھے کھڑا رہے گا اور جس کو میری امت سے پہچانتا ہوگا، اُسے سیراب کرے گا۔

چوتھی یہ کہ مجھے کفن پہنانے والا اور اللہ کے سپرد کرنے والا ہوگا۔

پانچویں یہ کہ مجھے اس کی نسبت یہ خوف ہرگز نہیں کہ پاکدامنی کے بعد کوئی غلط کام کرے گا اور نہ ایمان کے بعد کفر کی طرف رجوع کرے گا"۔ (مناقب احمد بحوالہ ارجح المطالب)۔

لو مسلمانو! پیاس کا مسئلہ بھی حل ہو گیا جس کے پاس سایہ ڈھونڈا اسی کے ہاتھ میں پیالہ ہوگا۔ ایسے ہولناک مقام پر ٹھنڈا اور میٹھا شربت بھی مل جائے تو ہول عظیم سے بچت تو ہوگی مگر یہ امام شیعوں کا ہے۔

یہ نہیں کہ سب اس حوض پر وارد ہو کر سب ہی سیراب ہوں گے، نہیں حقدار سیراب ہوں گے۔ کچھ ایسے بغض رکھنے والے، عداوت و کینہ رکھنے والے بھگائے بھی جائیں گے۔ جہاں موالی سیراب ہوں گے، وہاں سے دشمن لاٹھی کے ساتھ ہٹائے بھی جائیں گے۔

"عن ابی سعید الحذری قال قال رسولُ اللّٰہ یا علیٰ معک یومَ القیٰمۃِ عصا من عصّی الجنۃ تزو دبھاالمنافقین عَنِ الحوض"۔

"ابو سعید حذری بیان کرتے ہیں کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علی علیہ السلام تیرے پاس جنت کی لاٹھیوں میں سے ایک لاٹھی ہوگی جس کے ساتھ تو منافقوں کو حوض سے ہانکے گا"۔ (معجم طبرانی بحوالہ ارجح المطالب)

"عن ابن عباسؓ قال، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم لعلّی اَنْتَ اِمَامِیْ یَومَ الْقِیَامَۃِ فَیُدْفع الیّ لَواءِ الحمد فادفعہ الیک وانت تذود الناس عن حوضی" (کنز العمال)۔

"عن علی قال لَاذُورَن بیدی ھاتین القصیرتین عن حوض رسول اللّٰہ رَایاتِ الکفارو المنافقین کما یذارُالابل الغریبُ عن حَیا مِنُھا"۔

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "میں ان دو ننھے ننھے ہاتھوں سے کفار اور منافقین کو اس طرح ہانک دوں گا جس طرح پرنیا اونٹ اپنے حوض سے ہانکا جاتا ہے"۔

ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ "لواء الحمد" بھی مولا امیر علیہ السلام کے ہاتھ میں ہوگا اور حوضِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختار اور ساقی بھی مولا علی علیہ السلام ہوں گے۔ جو امام روزِ قیامت اپنے پیروکار کو فائدہ نہ پہنچا سکے، اس کے ماننے والے کتنے بدنصیب ہیں اور کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں علیؑ جیسا امام ملا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ علیؑ "امام المتقین" ہیں جو اُن کے نقش قدم پر نہ چلے، جو اُنؑ کی پیروی عملاً نہ کرے، انؑ کی بتائی ہوئی راہ پر نہ چلے، نہ وہ پیروکار ہے اور نہ علیؑ اُس کے امام ہیں۔ جس طرح زبانی دعوائے امامت کرنے سے کوئی امام نہیں بن سکتا، اسی طرح زبانی شیعہ کہلانے والا پیروکار اور شیعہ علیؑ نہیں بن سکتا جب تک شیعہ والے عمل کر کے نہ دکھائے۔

علیؑ ساقی ہے۔ مولائیوں کو سیراب کریں گے۔ کتنے پینے والے ہوں گے اور پیالے کتنے ہوں گے۔ اتنی پیاسی دنیا، ایک پیالہ، ہو تو باری کب آئے گی اور انتظار میں ان کی جان بھی نکل جائے گی۔

لواء الحمد کا طول و عرض اتنا ہوگا کہ ماپ کا شمار نہیں اور حوض کا طول و عرض ہزاروں میلوں میں ہوگا۔ پیالے کتنے ہوں گے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی سنئے:

فردوس الاخبار دیلمی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "اس حوض پر آسمان کے تاروں جتنے پیالے ہوں گے جن سے حسنینؑ و زینبؑ کے بابا پیاسی اُمت کو سیراب کریں گے، جن کی اولاد فرات کے کنارے پیاسی قتل ہوئی، جن کی بیٹیاں لبِ فرات پیاس سے بے حال رہیں، جن کے معصوم بچے ہاتھوں میں پیالے لئے خیموں کے دروازوں پر مشکیزوں کے منتظر رہے اور سنگدل کوفی و شامی مٹی اور شیشوں کے برتنوں میں دکھا دکھا کے سیراب ہوتے۔

روکے ہوئے تھی نہر کو اُمت رسولؐ کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتولؑ کی

عزادارو! نو محرم کو زہراؑ کا لال ابن زیاد کی فوجوں میں گھر گیا۔ فوجوں کی تعداد کتنی تھی؟ تیس ہزار سے لے کر دو لاکھ تک لکھی گئی ہے۔

ان میں تیس ہزار والی روایت پر زیادہ اعتماد کیا گیا ہے کیونکہ امام علیہ السلام سے تیس ہزار مروی ہے۔ ویسے ناسخ التواریخ میں پچاس ہزار سے اوپر مذکور ہے۔

کوفہ بالکل خالی ہو گیا۔ حاکم کا حکم تھا کہ کوفہ میں کوئی جوان مرد نہ رہ پائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ کوفہ کے بازاروں میں تین محرم سے چھ محرم تک ہتھیار فروخت کرنے والی دکانوں پر بڑی بھیڑ رہی اور ہتھیار خریدنے والوں سے بازار بھر گیا۔

کوئی تلوار خرید رہا ہے، کوئی نیزہ کوئی تیر کمان۔ کچھ نئے خرید رہے ہیں اور کچھ پرانے ہتھیاروں کو تیز کروا رہے ہیں۔

کہیں خنجر کی دھار تیز کی جارہی ہے، کہیں نیزے کی انّی درست ہورہی ہے۔ کہیں تیروں کی نوکیں درست ہورہی ہیں۔ تیر بھی مختلف قسم کے تھے۔ کسی کی ایک نوک اور کسی کی تین نوکیں تھیں، اور نوکیں اس قدر تیز تھیں کہ بدن کے ایک طرف سے جو پیوست ہوتا تو نوک دوسری طرح سے نکل جاتی اور بدن سے نکالنے کے لیے اپنے ہاتھ سے یہ نہ نکلتے۔

قربان جاؤں! میرے مظلوم امامؑ نے بعض تیر نکالنے میں دونوں ہاتھوں کا زور لگایا ہے۔

عزادارو! یہ تمام ہتھیار کس کیلئے اکٹھے کیے جارہے ہیں؟ کن کیلئے دھاریں اور نوکیں تیز کی جارہی ہیں؟ ذرّیتِ رسولؐ کیلئے، اولادِ بتولؑ کے واسطے۔ آلِ ابیطالبؑ کے واسطے۔ بنی ہاشم کی مستورات نے جن کو محبت و شفقت سے پالا تھا، انہیں نیزوں اور تیروں کا نشانہ بنانے کیلئے سامان تیار کیا جارہا تھا۔ بوسہ گاہِ رسولؐ کو، نازپروردۂ بتولؑ کو، امّ البنینؑ کے لاڈلے شیروں کو، عقیلؑ کے گھرانے کو برباد کرنے کیلئے، ابوطالبؑ کا چراغ بجھانے کیلئے، رسولؐ کی اُمت ہتھیار جمع کررہی ہے۔

لیلیٰ کی اٹھارہ برس کی کمائی خاک وخون میں غلطان کرنے کے لیے، امّ رباب کی گود خالی کرنے کے لیے، حسنِ مجتبیٰؑ کا صحن سنسان کرنے کے واسطے، اقرباء حسینؑ وصحابہ وانصار کو پیاسا ظلم وجور سے شہید کرنے کے لیے، ہتھیار والوں کی بازار میں بھیڑ ہے۔ اے کوفہ! تیرے ان بازاروں پہ لعنت!! جن میں خاندانِ رسولؐ کو قتل کرنے کے لیے ہتھیار فروخت ہورہے ہیں۔ خدا تیرے ان بازاروں کو تباہ کرے! جن میں بتولؑ زادیاں ننگے سر پھرائی گئیں۔ اے کوفہ! کاش تو آباد نہ ہوتا۔ تو کھنڈروں میں بدل جاتا۔ مسلمؑ وہانیؓ کی لاشیں اور مستوراتِ ہاشم کو رسیوں میں برہنہ سر نہ دیکھتا۔

نہم محرم

شیعو! یہ کوفہ کے بازاروں میں ہتھیاروں کا ذکر تھا۔ اب میدانِ کربلا کا حال سنئے! لشکرِ خونخوار سے میدانِ کربلا بھر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص بلند ٹیلے پر چڑھ کر دیکھتا تو آدمی ہی آدمی نظر آتے یا آسمان دکھائی دیتا اور جہاں تک نظر کام کرتی، گھوڑے سوار فوج، پیادہ فوج اور نیزے اور تلواریں ہی نظر آتیں۔

ایسے ہی لشکر کو ٹڈی دَل اور سیلِ رواں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ زمین کربلا باوجود کشادگی کے تنگ نظر آتی تھی۔ چونکہ ہر دستۂ فوج کا اپنا ایک الگ علم تھا، اس واسطے آسمان کے کنارے، جھنڈوں کی قطاروں اور خیام کی کثرت کی وجہ سے نظر نہ آتے تھے۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ''نویں محرم کو جناب امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی سپاہ ابن زیاد ملعون کے مکمل محاصرے میں آ گئے تھے۔ ابن زیاد اور ابن سعد فوجوں کی کثرت سے خوش تھے۔ انہیں توقع بلکہ یقین تھا کہ اب حسینؑ کی مدد کو نہ ہی کوئی آ سکتا ہے اور نہ ہی وہ خود یہاں سے نکل کر کہیں جا سکتے ہیں۔ امامؑ کو اپنی شہادت کا یقین ہو گیا تھا''۔

سعد بن عبیدہ کا بیان ہے:

شدید گرمی کی وجہ سے ہم پانی میں گھسے ہوئے تھے تو ابن زیاد کا پیغام آیا کہ اب جب کہ تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں تو لڑائی میں دیر کیسی؟ چنانچہ اسی وقت ابن سعد گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکر میں منادی کروا دی کہ گھوڑے سوار سوار ہو کر جنگ کی تیاری کریں۔ چنانچہ عمر بن سعد اپنے نائب شمر لعین کے ساتھ ایک دستۂ فوج کے ہمراہ خیامِ حسینیؑ کی طرف بڑھا۔

ادھر فرزندِ رسولؐ، بتولؑ زادیوں کا واحد سہارا، یثرب کا مسافر، تلوار کا سہارا لئے، گھٹنوں پر سر جھکائے، خیمے سے باہر غمگین بیٹھے ہیں۔ غالباً فرزندِ رسولؐ پر غنودگی طاری ہوئی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اور ہتھیاروں کی جھنکار کی صدا زہراؑ کی بیٹیوں نے خیمے میں سنی، تڑپ کر اٹھیں اور خیمے کے دروازے کے قریب آ کر کہا:

''اماں جایا! لشکر تو قریب آ گیا ہے، کیا گھوڑوں کی آواز آپؑ نے نہیں سنی؟ بھائی دیکھو تو سہی! دشمن تیار ہو کر قریب آ گیا ہے''۔

امام حسین علیہ السلام نے سر زانو سے اٹھایا اور بہن کی طرف آبدیدہ ہو کر کہا:

''اماں جائی! ابھی ابھی میری آنکھ لگی تھی، نانا کو دیکھا، فرماتے ہیں بیٹا! تم عنقریب میرے پاس آنے والے ہو۔ تمہارا بابا علیؑ، ماں زہراؑ اور بھائی حسنؑ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اماں جائی! معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کا سفر ختم ہونے والا ہے''۔

یہ سننا تھا کہ جنابِ زینبؑ کو تاب نہ رہی۔ جب بھائی کی زبانی اس دنیا سے رخصت ہونے کی خبر سنی، سر پیٹ لیا اور کہا:

''ہمارا کون ہوگا؟ نہ وطن نہ گھر، پردیس۔''

یہ حالت تھی کہ بتولؑ کی بیٹی منہ پیٹ رہی تھی اور آنے والے دکھوں پر بے ساختہ آنسو بہا رہی تھی۔ میرے مظلوم آقا اُٹھے، بازو پکڑا اور خیمے میں گئے اور کہا:

''اماں جائی! دشمن قریب آ گیا ہے۔ طعنہ دے گا: زینبؑ بچا لے بھائی کو، میں ان کے سامنے تیری گریہ و زاری دیکھ نہیں سکتا''۔

حسین علیہ السلام خیمہ سے باہر آئے۔ جنابِ عباسؑ نے عرض کیا: ''مولاؑ! لوگ تو آ گئے ہیں۔'' مولاؑ اٹھے اور فرمایا:

''عباسؑ! آپ ان کے پاس جا کر پوچھیں کہ تم کیوں آئے ہو؟ تمہارے دلوں میں کیا ہے اور اس طرح تمہارے آنے کی غرض کیا ہے؟''

جنابِ عباسؑ رہوار پر سوار ہوئے اور ان کے ساتھ تقریباً بیس سوار ہو لئے جن میں زہیر بن قین اور حبیبؓ بن مظاہر بھی تھے۔ جنابِ عباس علیہ السلام نے ان سے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ: ''عبیداللہ بن زیاد اب دیر نہیں چاہتا۔ آج پھر اس کا حکم آیا ہے کہ حسینؑ یا تو ہمارا حکم مان کر ہماری اطاعت کرلے اور اس صورت میں اسے کوفہ میرے پاس پہنچا دو نہیں تو جلد ہی فیصلہ کن جنگ کی جائے۔''

جنابِ عباسؑ نے فرمایا: ''میں جا کر امامؑ سے یہ واقعہ عرض کرتا ہوں اور اس کا جواب فوراً تمہیں پہنچاتا ہوں''۔

جنابِ عباس علیہ السلام گھوڑا دوڑاتے ہوئے واپس حاضر خدمتِ امامؑ ہوئے اور دشمنانِ دین کا ماجرا پیش کیا۔ جنابِ عباسؑ تو خدمتِ امامؑ میں پیغام لے کر آئے، ادھر جنابِ حبیبؓ اور زہیرؓ نے گروہِ اشقیاء کو ناصحانہ خطاب کیا اور جنگ سے باز رکھنے اور امامِ معصومؑ اور ان کے ہمراہیوں سے قتال کرنے سے ڈرایا۔ لیکن سیاہ دلوں پر ضلالت اور شقاوت کی مہریں لگ چکی تھیں۔ وہ کب ماننے والے تھے۔

اسی اثناء میں عزرہ بن قیس نے جنابِ زہیرؓ سے کہا:

''آپ اپنے نفس کو پاک بنائیں''۔

جنابِ زہیرؓ نے فرمایا: ''خدا نے میرے نفس کو پاک بنایا ہے اور اس کو ہدایت کی ہے، تو خدا سے ڈر، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں، ان لوگوں کا مددگار نہ بن جو پاک نفوس تہجد گزاروں، کثرت سے خدا کا ذکر کرنے والوں اور اپنے پیغمبر کی ذریت و عترت کا ناحق خون بہانے پر آمادہ ہیں۔''

یہ سن کر عزرہ بن قیس نے کہا:

"يَا زُهَيرِ مَا كُنتَ عِندَنَا شِيعَةَ اَهلِ هٰذَا البَيتِ اِنَّمَا كُنتَ عُثمَانِيًّا".

''اے زہیر! تجھے ہم اس خاندان کا شیعہ تو نہیں سمجھتے تھے، تو تو عثمانی تھا!''

جنابِ زہیر نے جواب دیا:

"اَفَلَستَ تَستَدِلُّ بِمَوقِفِي هٰذَا اَنِّي مِنهُم"

''کیا میرے اس جگہ کھڑے ہونے سے تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں انہی میں سے ہوں؟''

یہ تو جناب حبیبؓ اور زہیرؓ کا ان سے مکالمہ تھا، ادھر جناب عباس علیہ السلام نے ان بے دینوں کا پیغام خدمت امامؑ میں پہنچایا۔ امام علیہ السلام نے جناب عباسؑ سے فرمایا:

''تم واپس ان کے پاس جا کر کہو کہ حسینؑ ایک رات کی مہلت طلب کرتے ہیں تا کہ ہم آج رات دل کھول کر خدا کی عبادت کر لیں۔ کیونکہ میں کثرتِ دعا، نماز، تلاوتِ قرآن اور استغفار کو دوست رکھتا ہوں۔''

جناب عباسؑ نے واپس آ کر ابن سعد سے یہ ذکر کیا۔ ابن سعد تو خاموش ہو رہا، شمر نے انکار کیا۔ لیکن عمرو بن الحجاج زبیدی نے کہا: ''اگر ترک و دیلم کے لوگ بھی یہ سوال کرتے ہو ہم مان لیتے۔ یہ تو آلِ محمدؐ ہیں! تم انہیں ایک رات کی مہلت نہیں دے سکتے؟''

عمر بن سعد شرمندہ ہوا تو ایک شب کی تاخیر پر رضامند ہو گیا۔ جناب عباسؑ کے ساتھ اس نے اپنا ایک قاصد بھی بھیجا۔ اس نے اس مقام پر کھڑے ہو کر کہا جہاں سے اس کی آواز جنابِ امام علیہ السلام تک پہنچ سکتی تھی: ''ہم نے تمہیں کل صبح تک مہلت دے دی، اگر آپ نے ہماری بات مان لی تو ہم آپ کو ابن زیاد کے سپرد کر دیں گے، ورنہ کل ہم تم سے ضرور جنگ کریں گے اور ہرگز نہ چھوڑیں گے''۔

یہ کہہ کر قاصد واپس چلا گیا۔ جنابِ امام حسین علیہ السلام نے اصحابِ باوفا کو حکم دیا کہ خیام بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا لیں۔ ہر خیمہ کی طنابیں دوسرے کے ساتھ باندھ دی جائیں تا کہ دشمنوں کا مقابلہ ایک طرف اور ایک رخ سے کیا جا سکے اور خیام کی پشت کی جانب اور دائیں بائیں خندق کھودی گئی جو لکڑیوں سے بھر دی گئی۔

شبِ عاشور کے واقعات

یہ رات بیداری کی ہے۔ عبادت، دعا، تلاوت قرآن اور استغفار کی ہے۔ مومنین کو چاہئے کہ بیدار رہ کر یہ رات عبادت، تلاوت، استغفار اور شہدائے کربلا علیہم السلام کی یاد تازہ کر کے گریہ وزاری میں گزاریں۔

یہ شب جنابِ مظلومِ کربلا اور ان کے اصحاب واقرباء علیہم السلام کی آخری شب ہے۔ کیونکہ ان سب کو یقین ہو گیا تھا کہ کل صبح جنگ کے شعلے بھڑکیں گے اور مظلومِ کربلا اور ان کے ساتھی سفر کی صعوبتوں اور دنیا کی تکلیفوں، پیاس و بھوک کی سختیوں سے ہمیشہ کیلئے نجات پا جائیں گے۔

سیدانیوں اور مستورات کو بھی اپنے ورثاء کے باقی رہنے کی امید نہ تھی۔ اس واسطے ہر بی بی اپنے شوہر، برادر، پسر اور

قریبی رشتہ دار کو شب بھر دیکھتی رہیں اور غالباً ان کی تمنا بھی ہوگی کہ یہ رات لمبی ہو جائے تا کہ ورثاء کا منہ دیکھتی رہیں۔ یہ آخری رات جو تھی۔

آج تو سب زندہ ہیں۔ بہنوں کا بھائی زندہ ہے۔ حرموں کے شوہر زندہ ہیں۔ ماں کے فرزند زندہ ہیں۔ گودیں آباد ہیں۔ گو غنچے مرجھائے ہوئے ہیں، کلیاں کملائی ہوئی ہیں، مایوسی و پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔

عاشور کی شب کا سناٹا جب اشکوں کی برسات رہی
لیلیٰ نے نظر کی اکبرؑ پر جب کچھ کچھ باقی رات رہی

شیعو! یہ حسین مظلومؑ اور ان کے ساتھیوں کی آخری رات ہے۔ ہاں! آخری ہی رات ہے۔ کل حسینؑ نہ ہوں گے، زینبؑ بے بھائی ہو جائے گی۔

کل گنج شہیداں سج جائے گی
ہمشیر جدا ہو جائے گی

عباسؑ نہ رہے گا، فضل یتیم ہو جائے گا، ام کلثوم کا مان ٹوٹ جائے گا، اکبرؑ نہ رہے گا، لیلیٰ کا واحد سہارا ختم ہو جائے گا، ربابؑ کی گود برباد ہو جائے گی، ہاں! جھولا خالی ہو جائے گا، سہاگ اجڑ جائیں گے اور بنی ہاشم کا بھرا خاندان کربلا کی ریت میں ویران ہو جائے گا۔ آگے بیان کرنے کی جرأت نہیں کہ کیا کیا ہوگا۔

اس رات کو خیامِ حسینی میں ذکر، تلاوت، صلوٰۃ اور استغفار کی آواز ایسے تھی جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آتی ہے۔ کوئی رکوع میں ہے تو کوئی سجدہ میں۔ کوئی قیام میں ہے تو کوئی دعا مانگ رہا ہے۔ کوئی تسبیح پڑھ رہا ہے تو کوئی تلاوتِ قرآن میں مشغول ہے۔ جیسا کہ میر انیس نے کہا:

یا حی یا قیوم کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں کہیں تحلیلِ کردگار

جنابِ سید الشہداء علیہ السلام کا خطبہ

اس رات کا وہ مشہور خطبہ جو سید الشہداء علیہ السلام نے اقرباء واصحاب باوفا میں پڑھا ہے، ہم ذکر کرتے ہیں۔ جس میں اپنے اہل بیت اور اصحابِ خیر کا فخر ومباہات کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:

"اُثْنِیْ عَلَی اللّٰہِ اَحْسَنَ الثَّنَاءِ وَ اَحْمَدُہٗ عَلَی السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ اَللّٰھُمَّ اِنِّی

اَحمدکَ عَلٰی اَنْ اَکرَمْتَنَا بِالنُّبُوَّةِ وَ عَلَّمْتَنَا الْقُرْآنَ وَ فَقَّهْتَنَا فِی الدِّیْنِ وَ جَعَلْتَ لَنَا اَسْمَاعاً وَ اَبْصَاراً وَ اَفْئِدَةً فَاجْعَلْنَا مِنَ الشَّاکِرِیْنَ اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ لَاَعْلَمُ اَصْحَاباً اَوْفٰی وَلَا خَیْراً مِنْ اَصْحَابِیْ وَلَا اَهْلَ بَیْتٍ اَبَرَّ وَ لَا اَوْصَلَ وَلَا اَفْضَلَ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ فَجَزَاکُمُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَیْراً فَلَقَدْ بَرَزْتُمْ وَعَاذَنْتُمْ اَلَا وَاِنِّیْ لَاَظُنُّ یَوْماً لَنَا مِنْ هٰؤُلَاءِ الْاَعْدَاءِ اِلَّا غَداً اَلَا وَاِنِّیْ قَدْ اَذِنْتُ لَکُمْ فَانْطَلِقُوْا جَمِیْعاً فِیْ حِلٍّ مِنْ بَیْعَتِیْ لَیْسَ عَلَیْکُمْ مِنِّیْ حَرَجٌ وَلَا ذِمَامٌ وَ هٰذَا اللَّیْلُ قَدْ غَشِیَکُمْ فَاتَّخِذُوْهُ جَمَلاً. وَلْیَاْخُذْ کُلُّ رَجُلٍ مِنْکُمْ بِیَدِ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ وَ تَفَرَّقُوْنِیْ سَوَادِ هٰذَا اللَّیْلِ وَذَرُوْنِیْ وَهٰؤُلَاءِ فَاِنَّهُمْ لَا یُرِیْدُوْنَ غَیْرِیْ"۔

''میں اللہ کی بہترین ثناء کرتا ہوں، خوشی اور غمی میں اس کی حمد کرتا ہوں، خدایا میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے خاندان کو نبوّت کے ساتھ سرفراز فرمایا۔ تو نے ہمیں قرآن کا علم اور دین کی معرفت فرمائی۔ تو نے ہمیں سننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے دل عطا فرمائے۔ پس ہمیں شکرگزاروں میں سے کر۔ امّا بعد میں اپنے اصحاب سے زیادہ وفادار و بہتر کسی کے اصحاب نہیں جانتا اور نہ کوئی ایسے اہل بیت جانتا ہوں جو میرے اہل بیت سے بہتر، صلہ رحمی کرنے والے اور نہ فضیلت والے دیکھتا ہوں۔ پس تم سب کو اللہ تعالیٰ میری طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ بیشک تم نے بھلائی کی اور مدد کی۔ آگاہ رہو، میں گمان کرتا ہوں کہ کل ان اعداء سے جنگ ضرور ہوگی۔ میں تمہیں راضی ہو کر اجازت دیتا ہوں کہ تم سب جاسکتے ہو میں اپنی بیعت کا قلاوہ تمہاری گردنوں سے اتار لیتا ہوں۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں، بلکہ آزاد ہو۔ یہ رات کا پردہ چھا گیا ہے، اسے سواری بنا کر چلے جاؤ اور تم میں سے ہر شخص میرے اہل بیتؑ میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر چلا جائے اور اس رات کی تاریکی میں منتشر ہو جاؤ۔ مجھے ان لوگوں کے پاس چھوڑ دو کیونکہ انہیں صرف مجھ سے غرض ہے اور وہ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں''۔

مولائے مظلوم کا یہ خطبہ سن کر آپؑ کے اقرباء بے قرار ہو گئے اور خلوص و استقلال کے ساتھ اٹھ کر کہا: ''مولاؑ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ہم آپ کو نرغۂ اعداء میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ خدا ہمیں آپ کے بعد کبھی باقی نہ رکھے۔''

مؤرخین کا بیان ہے کہ سب سے پہلا کلام جناب ابوالفضل العباسؑ کا تھا۔ اس شیر جری کے سینے میں ارمان مچل رہے

تھے۔ ان کے بعد جناب کے دوسرے اقرباء، بھائیوں، بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں نے بھی ایسا ہی ایمان افروز دردمندانہ اور مخلصانہ جواب دیا۔ اس خلوص ومحبت کے جذبات نے ہاشمی جوانوں کی رگوں میں دورانِ خون تیز کر دیا۔

اس کے بعد جنابِ مظلومِ کربلا علیہ السلام نے اولادِ عقیلؑ کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر فرمایا: "تمہارے لیے تو مسلمؑ کی غریب الوطنی کی موت ہی کافی ہے۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم چلے جاؤ"۔

جنابِ عقیلؑ کے فرزندوں اور جنابِ مسلمؑ کے صاحبزادوں نے تڑپ کر جواب دیا: "یا ابن رسول اللہ! لوگ ہمیں کیا کہیں گے اور ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟ کہ ہم نے اپنے سردار اور بزرگ، امام عالی مقام، فرزندِ رسولؐ علیہ السلام کو دشمنوں کے گھیرے میں تنہا چھوڑ دیا۔

مولاؑ! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ہم آپؑ سے ہرگز جدا نہ ہوں گے بلکہ اپنی جانیں، اپنے مال اور اپنے اہل وعیال سب آپؑ پر قربان کر دیں گے اور آپؑ کے ہمراہ ہو کر لڑیں گے۔ جو آپؑ کا انجام ہوگا وہی ہمارا بھی ہوگا۔ خدا برا کرے اس زندگی کا جو آپؑ کے بعد ہو"۔

یہ تو بنی ہاشم کے جوانوں کی وفاداری، غمگساری اور عزمِ شہادت اور ولولۂ جہاد کا اظہار تھا۔ اس کے بعد اصحاب وانصار نے یکے بعد دیگر امامِ علیہ السلام کو جرأت مندانہ اور والہانہ انداز میں اپنی نصرت اور قربانیوں کا یقین دلایا۔

سب سے پہلے جنابِ مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے اور اپنے محبت بھرے جذبات کا ان لفظوں میں اظہار کیا:

"فرزندِ رسولؐ! اب آپؑ جبکہ دشمنوں میں گھر چکے ہیں اور ظلم وجور سے فضا بھر چکی ہے، آپؑ کو اکیلا چھوڑ دیں اور اپنی جانیں بچا کر چلے جائیں؟ نہیں ہرگز نہیں! خدا کی قسم ہرگز نہیں! خدا مجھے آپؑ کے بغیر زندہ نہ رکھے۔ مولاؑ! میں تو آپؑ کے ساتھ ہو کر لڑوں گا اور اپنی قوت کو اس جہاد میں خرچ کروں گا۔ میں ان دشمنانِ دین کے سینوں میں اپنے نیزے توڑ دوں گا اور جب تک میرا ہاتھ قبضۂ تلوار پر رہے گا، دشمن کی گردنوں پر چلاتا رہوں گا اور اگر میرے پاس ہتھیار نہ رہے تو پتھروں سے اعداءِ دین پر حملہ کروں گا۔ جب تک آپؑ کی رفاقت میں شہادت نہ پالوں گا، آپؑ سے جدا نہ ہوں گا۔"

جنابِ مسلم کی جوشیلی اور محبت بھری تقریر کے بعد جنابِ سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے اور کہا:

"یا ابن رسول اللہ! ہم آپؑ کو ہرگز نہ چھوڑیں گے، جب تک بارگاہِ خداوندی میں یہ نہ ثابت کر دیں کہ ہم نے وصیتِ رسولؐ کی حفاظت کی ہے اور اس کے غائبانہ حق کی پاسداری کی ہے۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہو کہ میں آپؑ کی رفاقت شہید ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گا، پھر مجھے زندہ جلا کر میری راکھ کو ہوا میں بھی اڑا دیا جائے اور ستر مرتبہ میرے ساتھ یہی سلوک کیا

جائے تب بھی میں آپؑ کا ساتھ نہ چھوڑوں اور اب جب کہ ایک ہی مرتبہ قتل ہونا ہے اور اس کے بعد دائمی عزت و کرامت حاصل ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں، بھلا میں کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں؟''

اس کے بعد جناب زہیرؓ بن قین نے کھڑے ہو کر کہا: ''خدا کی قسم! میں تو اس بات کو دوست رکھتا ہوں کہ مجھے قتل کرنے کے بعد زندہ کیا جائے اور پھر قتل کیا جائے اور ہزار مرتبہ اسی طرح قتل ہوتا رہوں اور خداوندِ عالم میرے اس قتل سے آپؑ کی اور آپکے اہلبیتؑ کے جوانوں کی جانیں بچالے۔''

اس کے بعد باقی اصحاب نے انہی جاں نثاریوں اور ہمدردیوں کا ذکر کیا۔ اصحابِ اہل بیتؑ کرام اور اصحابِ باوفا کی حوصلہ افزائی اور تسلی بخش باتیں سن کر امامؑ دعا دیتے ہوئے اپنے خیمے میں تشریف لائے۔

بعض کتب میں منقول ہے: ''شبِ عاشور، فخرِ مخدرات، شریکۃ الحسینؑ، جنابِ زینب سلام اللہ علیہا بیان فرماتی ہیں کہ میں اپنے خیمے سے باہر نکلی، اپنے بھائی حسینؑ مظلوم اور ان کے اصحاب کے حالات دریافت کرنے کے لیے۔ کیا دیکھتی ہوں کہ حسینؑ اپنے ایک علیحدہ خیمے میں مناجات اور تلاوتِ قرآن میں تنہا مشغول ہیں۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ ایسی ہول بھری رات میں حسینؑ تنہا بیٹھے ہیں جبکہ ظالموں کا وہی مطلوب و مقصود ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی شقی اچانک حملہ کر دے۔ میں اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کے پاس جا کر انہیں حسینؑ کے پاس رہنے کی تاکید کروں۔ میں اپنے دل کے سہارے، بھائی عباسؑ کے خیمے میں گئی۔

جب میں خیمہ عباسؑ کے قریب گئی تو کانوں میں کچھ آوازیں آئیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ جوانانِ بنی ہاشم حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور درمیان میں جنابِ عباسؑ اس طرح ہیں جس طرح ستاروں میں چاند ہوتا ہے۔ وہ مثلِ شیر گھٹنے ٹیک کر بیٹھے ہیں اور اپنے جوانوں سے خطاب فرما رہے ہیں کہ کل صبح جب میدانِ کارزار گرم ہو تو اصحاب سے پہلے تم لڑائی کی طرف سبقت کرنا اور پہلے اپنی قربانیاں پیش کرنا، تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بنوہاشم نے اصحاب کو آگے کر دیا اور خود جانیں بچانے کے لیے رک گئے۔

یہ سننا تھا کہ جب جنابِ عباسؑ کے روبرو جوانانِ ہاشم نے اپنی تلواریں برہنہ کر لیں، ہاشمی خون جوانوں کی رگوں میں دوڑنے لگا اور کہنے لگے کہ ہم آپ کے فرمان کے مطابق ایسا ہی کریں گے۔''

جنابِ زینب سلام اللہ علیہا نے جب ہاشمی جوانوں کے یہ ولولے اور جذبات دیکھے، ایک گونہ سکون ہوا اور بنتِ زہراؑ کے دل سے ان جوانوں کیلئے دعائیہ کلمات نکلے۔

ثانیِ زہراؑ بیان فرماتی ہیں: ''واپسی پر میں انصار و اصحاب کے خیام کے پاس سے گزری تو حبیبؓ بن مظاہر کے خیمے

سے ہمہمہ و دمدمہ کی صدا آ رہی تھی۔ میں خیمہ کی پشت پر کھڑی ہوگئی۔ میں نے سنا کہ جناب حبیبؓ اصحاب کے حلقے میں بیٹھے فرما رہے ہیں: اے اصحابِ باوفا! کل لڑائی ضرور ہوگی، تلواریں چمکیں گی، نیزے لہرائیں گے، گردنیں کٹیں گی، تم لوگ جنابِ بتولؑ کے غریب و مظلوم فرزند کی حمایت کے لیے اکٹھے ہوئے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ تم قربانیاں ضرور دو گے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ بحرِ شہادت کے سب سے پہلے شناور تم ہو۔ بنی ہاشم سے پہلے جہاد کے لیے تم بڑھو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سلامت رہیں اور بنی ہاشم خون میں غلطاں تڑپتے نظر آئیں۔

بنی ہاشم کا بہتا ہوا خون اور تڑپتی لاشیں ہم آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اچھے مددگار تھے؟ ابوطالبؑ کا خاندان کشتار ہا اور اصحاب اپنی جانوں کی حفاظت کرتے رہے۔

جنابِ حبیبؓ کا کلام سن کر اصحاب کا خون کھول اٹھا۔ مثلِ بنی ہاشم اصحاب نے بھی تلواریں برہنہ کرلیں اور جنابِ حبیب کو میدانِ قتال میں سبقت کرنے کا یقین دلایا''۔

جنابِ شریکۃ الحسین، ثانیٔ زہراء سلام اللہ علیہا کے دل پر ان دونوں جماعتوں کا بہت بڑا اثر ہوا۔ بتولؑ کی بیٹی کے بیقرار دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی اور اقرباء و اصحاب کے ایثار بھرے بیانات سے علیؑ کی بیٹی کے دل کی دھڑکنیں قدرے کم ہوئیں اور چہرے پر سکون و اطمینان کے آثار ظاہر ہوئے۔

جنابِ زینب سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں: ''میں ان واقعات کا ذکر کرنے اپنے بھائی حسینؑ کے پاس گئی اور بنو ہاشم اور اصحاب کے عزائم اور پیشکشوں کا ذکر کیا۔

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: بہن زینبؑ یہ عالمِ ذر سے میرے صحابی ہیں اور عالمِ ارواح کے میرے رفیق ہیں''۔

امام حسینؑ کا اصحاب کو جنت میں ان کے مکان دکھانا

امام علیہ السلام نے بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''انہی کی رفاقت و ہمراہی کا میرے نانا رسولؐ اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ اماں جائی! کیا آپ چاہتی ہیں کہ ان کی ثابت قدمی اور پختہ ارادوں کا آپ کو منظر دکھاؤں؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

پھر فرمایا: بہن آپ خیمہ کی پشت پر تشریف لے جائیں۔ میں خیمہ کی پشت پر چلی گئی۔ مولاؑ نے اپنے اعزہ و اقرباء کو بلایا۔ سب حاضر ہوگئے۔ انہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ پھر اصحاب کو بلایا، وہ بھی سب حاضر خدمت ہوگئے۔

امام علیہ السلام نے مثلِ سابق ایک بلیغ خطبہ پڑھ کے دوبارہ انہیں رخصت دی اور چلے جانے کو کہا۔ انہوں نے مثل

سابق وفادارانہ اور مخلصانہ جوابات دیئے اور شہادت کے خون سے سرخروئی کا پختہ ارادہ ظاہر کیا۔

امام عالی مقام علیہ السلام نے جب ان کا پختہ عہد، پکا قول اور عزمِ شہادت دیکھا تو معجز نما امام اور وارثِ جنت نے ازراہِ اعجاز فرمایا: اپنے سر اوپر اٹھالو، آسمان کی جانب نظر کرو اور جنت میں اپنی منازل و مراتب دیکھو۔ پردے ہٹائے گئے، اعزہ و اصحاب کی آنکھیں تھیں اور جنت کی منزلیں۔ ہر صحابی جنت میں اپنا مقام دیکھ رہا تھا اور ساکنینِ خلد و حور و غلمان کی محبت بھری صدائیں استقبال کر رہی تھیں۔ کربلا کے پیاسوں کے لیے کوثر کی نہریں چھلک کر بیتاب ہو رہی تھیں۔ جنت خوشامد کہنے کے لیے محوِ انتظار تھی اور کوثر و تسنیم کے ساغر وفورِ شوق میں اچھل رہے تھے"۔

معتبر روایات میں آیا ہے کہ امام علیہ السلام نے مطمئن ہو کر فرمایا: "بیشک میں کل قتل کر دیا جاؤں گا اور تم بھی سب کے سب میرے ساتھ قتل کیے جاؤ گے۔"

جب شہادت کی بشارت اقرباء و انصار نے سنی تو جنابِ حسنؑ مجتبیٰ کے تیرہ سالہ شہزادے، جنابِ قاسمؑ نے شوقِ شہادت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا:

"کیا میرا نام بھی شہیدوں کی فہرست میں ہے؟"

مولاؑ نے ازراہِ شفقت و امتحان پوچھا: "بیٹا! موت کو کیسا سمجھتے ہو؟"

جاں نثار شہزادے نے جواب دیا: "چچا جان! میں موت کو شہد سے بھی زیادہ میٹھا سمجھتا ہوں۔"

فرمایا: "بیٹا! تو بھی شہیدوں میں ہے اور میرا ننھا بیٹا اصغرؑ بھی جامِ شہادت حاصل کرے گا"۔

جب جنابِ اصغرؑ کی موت کا ذکر غیور شہزادے نے سنا تو تڑپ کر کہا: "ہائے چچا جان! ہمارے خیام بھی ظالموں کے ظلم سے محفوظ نہ رہیں گے؟ کیا ظالم ہمارے پردوں میں گھس آئیں گے؟"

مولاؑ نے فرمایا: "بیٹا! تیرا بھائی اصغرؑ موت سے بہت بیتاب ہوگا۔ خیموں میں پانی نہ ہوگا۔ یہ معصومؑ کلی پیاس سے مرجھا جائے گی۔ میں پانی پلانے کے لیے اپنی امت سے سوالِ آب کرنے کے لیے اس معصومؑ کو میدان میں لاؤں گا۔ میرے نانا کی امت بے زبان شیر خوار کو تیر کا آب پلائے گی، جس کی نوکوں سے معصومؑ کا گلا چھد جائے گا اور بچہ میرے ہاتھوں پہ تڑپ کر شاملِ شہداء ہو جائے گا"۔

بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شبِ عاشور جو ضعیف الایمان اور طمعِ زندگانی رکھتے تھے، امام علیہ السلام کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ صرف مخلص و وفادار و جانثار باقی رہ گئے تھے۔

چنانچہ ایک شب کی مہلت طلب کرنے کی مصلحتوں میں سے ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ کھوٹے کھرے الگ ہو جائیں اور میں اپنے انصار و اصحاب کا امتحان لے لوں اور حقیقتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ تا کہ کوئی صحابی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہ جائے اور جو شہادت پائے، بصیرت حاصل کرے اور سوچ سمجھ کر یہ مرتبہ پائے اور جو جانا چاہے، انتہائی سوجھ بوجھ سے قدم اٹھائے۔

جیسا کہ ایقاد القلوب میں بروایت کتاب نور العین یہ روایت درج ہے جسے صاحب معالی السبطین نے وقائع لیلۃ العاشور میں ذکر کیا ہے۔

جناب سکینہ بنت الحسین علیہم السلام فرماتی ہیں:

میں اس چاندنی رات میں اپنے خیمے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے خیمے کے پیچھے رونے کی آواز سنی۔ میں خاموشی سے اپنے خیمے سے نکلی اور اس پریشانی میں مجھے خیر نظر نہیں آتی تھی۔ میں گھبراہٹ میں بابا کے خیمے کے قریب گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میرے مظلوم بابا خیمے میں پریشان بیٹھے ہیں اور اصحاب ارد گرد جمع ہیں۔ میرے بابا اصحاب سے یہ خطاب فرما رہے تھے:

"لوگو جان لو! تم میرے ہمراہ آئے ہو، اس وجہ سے کہ میں ایک ایسی قوم کے پاس جا رہا ہوں جنہوں نے زبان و دل سے میری بیعت کر لی ہے۔ اس خیال سے تم میرے ساتھ آئے تھے کہ وہ قوم میری حمایت کرے گی اور بظاہر مجھے کامیابی ہوگی۔ لیکن معاملہ برعکس ہے، حالات بدل گئے ہیں۔ جنہوں نے بلایا اور بیعت کی تھی، وہ شیطان کے غلبہ میں آگئے ہیں۔ دنیا کے پرستار بن کر خدا کو بھول گئے ہیں۔ آخرت کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دنیا پسند کر لی ہے۔ میں تمہیں حقیقتِ حال ظاہر کئے دیتا ہوں۔ اب ان لوگوں کا قصد میرے اور میرے ساتھیوں کے قتل کے سوا کچھ نہیں۔ میری شہادت کے بعد یہ میرے اہلِ حرم کو قید بھی کریں گے اور ہمارے خیام کو لوٹ لینے کے بعد جلا ڈالیں گے۔ وہ ہر قسم کا ظلم و ستم کریں گے۔

میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں، تم جانتے ہو یا نہیں جانتے اور اگر جانتے ہو اور حیا، اور شرم کی وجہ سے مجبور ہو کر رکے ہوئے تو میں تمہیں کسی دھوکہ میں نہیں رکھنا چاہتا۔ صاف بتائے دیتا ہوں اور حالات کو پردہ میں مخفی نہیں رکھتا۔ کل یہ نہ کہنا کہ ہم حسینؑ کے ساتھ دھوکہ میں آ کر مارے گئے۔ جو ہمارے ساتھ رہنا چاہے، ان حالات کو سامنے رکھ کر رہے اور جو جانا چاہے، رات کا پردہ ہے، راستہ صاف ہے اور وقت بھی ہے، چلا جائے"۔

بعض روایات میں ہے کہ چراغ جل رہا تھا، مولاؑ نے چراغ بجھانے کا حکم دیا کہ روشنی میں جانے سے شرم کریں گے اور تاریکی میں جانے سے کوئی ہچکچاہٹ نہ رہے گی۔ روایت ہے کہ ادھر کلامِ امام ختم ہوا ادھر دس دس اور بیس بیس افراد کا گروہ تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکلنے لگا۔ صرف وہی باقی رہ گئے جو وفا کے پیکر، ایمان کے پختہ اور عزم کے پہاڑ تھے۔

جنابِ سکینہؑ بیان فرماتی ہیں:

میں نے بابا کو دیکھا کہ سر کو جھکائے، اُمت کی بے وفائی اور اپنی بے بسی اور مظلومی اور ہماری غریبی وتشنہ دہانی پر آنسو بہا رہے تھے۔ میں نے بابا سے تو کچھ نہ کہا کہ اس دکھ ودرد کے عالم میں بابا مجھے دیکھ کر زیادہ بیتاب ہوجائیں گے۔ ہاں! میں نے آسمان کی طرف نظر کی، تاروں کو دیکھا، عبرت گلوگیر ہوئی، اتنا کہا: ''الٰہی! ان لوگوں نے ہمیں بلا کر پردیس میں بے مدد چھوڑ دیا اور دشمنوں کے حوالے کر دیا، ہر طرف سے راستے بند کر دیے، ہم زغۂ اعداء میں گھر گئے ہیں، نہ گھر جا سکتے ہیں اور نہ یہاں کوئی مددگار پاتے ہیں۔

خدایا! جس طرح ان لوگوں نے ہماری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا، تو بھی ان کی مدد نہ کرنا۔ ان کی دعا نہ سننا اور زمین میں انہیں سکھ کی تا دیر سکونت بھی نہ دینا۔ ان پر فقر وفاقہ مسلط کر دے۔ جس دنیوی لالچ پر انہوں نے یہ اقدام کیا ہے، اس سے انہیں محروم رکھ اور میرے جدِ امجد کی شفاعت روزِ قیامت انہیں نصیب نہ کر''۔

بعض روایات میں وارد ہے کہ امام علیہ السلام نے اصحاب کا امتحان لے لیا۔ بدنصیب جانے والے جا چکے اور کامیاب ہونے والے خوش نصیب کامیاب ہوگئے تو امام علیہ السلام خیام میں تشریف لے گئے۔ جنابِ زینب سلام اللہ علیہا نے دریافت کیا: ''بھیا! آپؑ نے باقی ماندہ اصحاب کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں؟''

امام علیہ السلام نے دکھی بہن کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا: ''میں نے اپنے سچے ساتھیوں کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے، وہ حق کی حمایت میں مجھ پر پوری طرح جانثار ہیں اور موت سے اس طرح مانوس ہیں جس طرح بچہ ماں کے دودھ کے ساتھ مانوس ہوتا ہے''۔

جنابِ نافع بن ہلالؓ درِ خیمہ پر، بہن بھائی کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے اصحابِ باوفا کے پاس جا کر کہا: ''اٹھو! اور رسولؐ زادیوں کو اپنی قربانیوں اور وفاداریوں کا یقین دلاؤ تاکہ تمہارے پرخلوص اور پختہ ارادوں کو جان کر بتولؑ کی بیٹیاں خیام میں مطمئن ہو جائیں''۔

یہ سن کر حبیبؓ بن مظاہر اور دوسرے اصحابِ باصفا خیمہ کے دروازے پر حاضر ہوئے اور مخلصانہ جواب اور مضبوط ارادوں اور جانثاریوں کا پرزور الفاظ میں یقین دلایا۔ بیبیوں نے روتے ہوئے اور دعا دیتے ہوئے فرمایا: ''اے پاکیزہ نفس صحابیو! اولادِ نبیؐ اور ذریتِ علیؑ کی خوب حمایت کرو، اللہ تمہیں اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے''۔

اصحابِ حسینیؑ کی قدرو منزلت

جنابِ آدم علیہ السلام سے لے کر آخرِ زمانہ تک ہر دور میں انبیاء و مرسلین اور اوصیاء مقربین کے صحابی گزرے ہیں لیکن امام حسین علیہ السلام کے اصحاب اپنے عزم و یقین اور خلوص و وفا میں سب سے ممتاز ہیں۔ تعداد میں تو قلیل تھے، لیکن صدق و صفا اور ایمان و عمل میں یہ سب پر وزنی تھے۔ ایمان و یقین ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ حق کی حمایت اور نصرتِ دین میں انہوں نے زندگی سے تعلق ختم کر لیا تھا۔

موت کی تمنا میں اور شوقِ شہادت میں رات بیقراری کے ساتھ کاٹی۔ ایک بوڑھے صحابی کا ذکر ہے۔ ضعیفی کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی پلکیں بڑھ آئی تھیں۔ جب دیکھنا ہوتا تو پلکیں اٹھا کر دیکھتے۔ لیکن عزم و ہمت میں منزلِ شباب پر تھے۔ جسمانی طور پر ضعیف تھے، لیکن حوصلے کے لحاظ سے جوان تھے۔

چنانچہ وہ صحابی شبِ عاشور کو اپنی تلوار کو تیز بھی کر رہے ہیں اور دوسرے ساتھی سے پوچھتے ہیں صبح کب ہوگی؟ رات کتنی باقی رہ گئی ہے؟ میری تلوار میرے ہاتھ میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔

چنانچہ روزِ عاشور جبکہ میدانِ کربلا میں گھوڑوں اور پیادوں کی دوڑ سے غبار بلند ہوا، نیزے ہوا میں لہرانے لگے، تیر کمانوں میں رکھے گئے، تلواریں نیام سے باہر آ گئیں تو یہ لوگ مردانہ وار فرزندِ رسولؐ پر جانیں قربان کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے اور میدانِ کارزار میں اس شوق سے داخل ہوتے تھے جس طرح مچھلی پانی میں جاتی ہے اور لشکرِ اعداء پر اس دلیری کے ساتھ حملہ کرتے تھے کہ جس طرح شیر شکار پر جھپٹتا ہے۔

رفاقتِ امامؑ کے مزے میں انہیں دنیا کی تلخیاں اور شہادت کے شوق میں زخموں کے درد محسوس نہ ہوتے تھے۔ جب تیر آتے تو گریبان کھول کر برہنہ سینوں کے ساتھ ان کا استقبال کرتے۔ نیزوں کے وار دوڑ کر اپنے بدنوں پر لیتے۔ تلواروں کی تیز دھاریں اور تیروں کی نوکیں انہیں شہد سے زیادہ شیریں لگتیں۔

یہ بحرِ شہادت کے شناور تھے۔ جو کامیابی کے ساتھ اس کو عبور کر کے جنت کے کنارے جا لگے۔ انہوں نے خون کی مہندی لگا کر عروسِ موت کو گلے لگایا۔ آلائم و مصائب کی چٹانوں سے ٹکرا کر انہیں پاش پاش کر دیا۔ رنج و غم کی آندھیوں کے ساتھ ان کی ہمت کا چراغ لڑ کر لو دیتا رہا۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب تک ایک صحابی بھی زندہ رہا، اہلبیتؑ کے کسی فرد پر آنچ نہیں آنے دی۔ یہ لوگ آسمانِ صدق و

صفا کے تارے اور معدنِ خلوص و وفا کے آبدار موتی تھے۔ میدانِ کارزار کے سرفروش مجاہد، بیشۂ شجاعت کے شیرِ دلیر اور عزم و ہمت کے پہاڑ تھے۔ اسی لیے تو جناب سید الشہداء علیہ السلام ان کی بےمثال وفاؤں اور بےنظیر قربانیوں پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "جیسے میرے اصحاب ہیں، ایسے کسی کے اصحاب نہیں"۔

جنابِ امامِ زمانہ حجت علیہ الصلوٰۃ والسلام ان لفظوں میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

"بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَاُمِّیْ طِبْتُمْ وَ طَابَتِ الْاَرْضُ الَّتِیْ فِیْهَا دُفِنْتُمْ وَ فُزْتُمْ وَاللّٰهِ فَوْزاً عَظِیْماً"۔

"میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں! تم خود بھی پاک ہوگئے اور وہ زمین بھی پاک ہوگئی جس میں تم دفن کیے گئے، بخدا تم نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے"۔

شبِ عاشور کا ایک خاص واقعہ

گو بعض مؤرخین مثلاً صاحبِ لہوف وغیرہ نے اس واقعہ کو جنابِ امام علیہ السلام کے ورودِ کربلا کے بعد کے کسی دن کا واقعہ تحریر کیا ہے مگر اکثر مؤرخین نے شبِ عاشور کے واقعات میں درج کیا ہے۔ ہم انہی کے مطابق اسے اس شب کے واقعات میں درج کرتے ہیں۔

جنابِ سید سجاد علیہ السلام بیان کرتے ہیں:

میں دسویں کی رات اپنے بسترِ علالت پر بیٹھا تھا اور میری پھوپھی جنابِ زینبؑ میری تیمارداری کر رہی تھیں۔ اسی اثناء میں میرے والدِ بزرگوار ایک علیحدہ خیمے میں تشریف لے گئے تھے جو میرے خیمے کے نزدیک تھا۔ اس وقت جنابِ ابوذرؓ غفاری کا غلام جون جنابؑ کی خدمت میں موجود تھا جو آپؑ کی تلوار کو صیقل کر رہا تھا۔ بعض روایات کے مطابق امام علیہ السلام اپنی تلوار کو درست کر رہے تھے۔

اس وقت زمانہ کی بیوفائیوں اور دہر کا شکوہ فرماتے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

یَا دَهْرُ اُفٍّ لَکَ مِنْ خَلِیْلٍ
کَمْ لَکَ بِالْاِشْرَاقِ وَالْاَصِیْلِ

بطورِ مجاز زمانہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اے بےوفا زمانہ تیری دوستی پر تف ہے۔ تو وفادار ساتھی نہیں

ہے۔ تجھ پر بھروسہ نہیں۔ صبح وشام تیرے ہاتھ کٹتے''۔

مِنْ طَالِبِ وَ صَاحِبِ قتیل
وَالدَّهرُ لَا یَقْنَعُ بالْبَدِیل

''طالب حق اور ساتھی قتل کیے جاتے ہیں اور زمانہ مطلوب ہی کو قتل کرتا ہے۔ اس کے بدل پر قناعت نہیں کرتا''۔

کُلِّ حَيٍّ سَالِکٌ سبیل
مَا اَقْرَبُ الْوَاعِدُ مِنْ رَحِیل

''ہر زندہ موت کی راہ پر چلنے والا ہے، اسے ایک دن مرنا ہے، ہاں! دنیا سے کوچ کرنے کا وعدہ کس قدر قریب ہے''۔

اِنَّما الْاَمرُ اِلَی الْجَلیل

''تمام معاملات رب جلیل کے قبضہ قدرت میں ہیں''۔

جب بابا نے یہ اشعار بار بار پڑھے تو میں سمجھ گیا کہ بابا کو موت کا یقین ہو گیا ہے اور مصیبت نازل ہو چکی ہے اور ہمارے گھر کی بربادی اب یقینی ہو چکی ہے۔ کیونکہ اشعار کا مطلب ہی یہ تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے اور اس نے مصیبتوں کا رخ ہماری طرف پھیر دیا ہے۔

بستر بیماری پر دردناک حالات اور آنے والے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے، تاہم میں ضبط کر لیا، آنکھوں کو قابو میں کر کے آنسوؤں کو روک لیا مگر میری پھوپھی مخدرۂ عصمت یہ اشعار سن کر ضبط نہ کر سکیں۔ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں۔ بھائی کے دردناک اشعار سن کر بہن کا دل بھر آیا اور میری تیمارداری بھول گئیں اور بیقرار ہو کر اٹھیں اور اس طرح بیتاب ہو کر اٹھیں کہ چادر کے کونے زمین پر خط دے رہے تھے۔ اپنے بھائی کے خیمے میں جا کر بھائی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا: ''اماں جائے! ایسی بات تو وہ کرتا ہے جو زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔ بھائی کیا موت کا یقین ہو چکا ہے؟ اماں جائے! آپ کے اس کلام نے بہن کو دلگیر کر دیا ہے''۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''نَعَمْ یَا اُخْتَاہ'' ''ہاں بہن! تیرا سہارا ختم ہونے والا ہے۔ تیرا بھائی زندگی سے بے آس ہو چکا ہے''۔

مظلوم و پریشان برادر کا یہ کلام سن کر زہرا کی جائی زیادہ بیقرار ہو گئیں اور کہا:

''وَ اَثْكَلاهُ لَيْتَ الْمَوْتُ اَعْدَمَنِی الْحَيٰوةَ الْيَوْمَ مَاتَتْ اُمِّی فَاطِمَةُ وَ اَبِی عَلِیٌّ

وَ اَخِیْ الْحَسَنُ یَا خَلِیْفَةَ الْمَاضِیْنَ وَ ثِمَالَ الْبَاقِیْنَ".

"ہائے افسوس! کاش موت میری زندگی آپ سے پہلے ختم کر دیتی۔ اے شہادت پانے والوں کے جانشین! اور باقی زندوں کے سہارے! میں تو سمجھی کہ آج میری ماں زہراؑ اس دنیا سے اٹھی ہیں، بابا علیؑ بھی آج ہی رخصت ہوئے ہیں، بھائی حسنؑ نے آج ہی شہادت پائی ہے کیونکہ ان کی شہادتوں کے بعد آپؑ ہی سہارا تھے۔ اماں جایا! جب آپ کو دیکھتی تو ان کی شہادت کا صدمہ کم ہو جاتا اور تیری زندگی سے ان کی شہادت کا غم ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر جب آپ بھی ہمیں بے آسرا، بیگانے ملک، جنگ بیابان اور بے رحم دشمنوں میں چھوڑ کر نانا، بابا، اماں اور بھائی علیہم السلام کے پاس جا رہے ہیں اور ہم بے آسرا رہ گئے ہیں تو اب ان کی شہادت کا صدمہ بھی تازہ ہو گیا ہے اور ان کی جدائی بھی اب یاد آ گئی ہے۔ میرے نزدیک تو پنجتنؑ پاک کی شہادت تو اب واقع ہو رہی ہے"۔

امام علیہ السلام نے جب بہن کی اسقدر بیتابی دیکھی تو شفقت بھرے لہجے میں تسلی دی مگر خود بھی کسی قدر بے قابو ہو گئے اور آنکھیں مثلِ ابر آنسو برسانے لگیں۔ بہن بھی رو رہی تھیں اور بھائی بھی رو رہے تھے۔

بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا: "اماں جائی! ہر زندہ کو ایک دن مرنا ہے۔ آپؑ ایسا صبر کریں کہ قیامت تک آپؑ کے صبر کی مثال نہ پیش ہو سکے۔"

جنابِ سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ سن کر پھوپھی اماں نے پوچھا:

"یَا وَیْلَتَاہ اَفَتُغْصِبُ نَفْسُکَ اغْتِصَابًا فَذَالِکَ اَقْرَحُ لِقَلْبِیْ وَ اَشَدُّ عَلٰی نَفْسِیْ".

"ہائے افسوس! کیا آپؑ ہم سے چھین لئے جائیں گے؟ یہ بات تو میرے دل کو مجروح کر دینے والی ہے اور مجھ پر سخت گراں ہے"۔

بہن بھائی کی یہ غمناک باتیں، زندگی کی آخری رات میں موت کی باتیں، سارے خاندان کی تباہی، سارے گھروں کی بربادی کا منظر اور مستقبل کا بھیانک تصور چاہنے والی بہن کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

یہ صرف حسینؑ کی شہادت کی تصور نہ تھا، بلکہ بنی ہاشم اور آلِ محمدؐ کی بربادی کا نقشہ سامنے تھا۔ صرف کربلا کا خاکہ نہ تھا، بلکہ کوفہ و شام کے بازاروں اور درباروں کی بھیانک تصویریں سامنے تھیں۔

پڑھنے والے پڑھ دیتے ہیں اور سننے والے سن لیتے ہیں، لکھنے والے لکھ جاتے ہیں، لیکن اصل حقیقت تو بہن بھائی ہی

سمجھتے ہیں۔ بھائی بہن کو اپنی شہادت کی یقینی خبر سنا رہا ہے اور ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی کر رہا ہے۔ بتولؑ کی بیٹی شیر دل تھی، ماں کی طرح صابرہ تھی، مگر بات معمولی نہ تھی، ہزار ضبط کیا، لیکن اب تاب ضبط نہ تھی۔

سر سے چادر گر پڑی، منہ پیٹ لیا اور زہراؑ کی پیاری غش کھا کر گر پڑی۔ جناب زینبؑ کا بیہوش ہو کر گرنا تھا کہ جناب سجاد کے بابا علیہم السلام بھی بیتاب ہو گئے۔ طبیعت بے چین ہو گئی۔ جناب سجاد علیہ السلام نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بیماری سے اٹھا نہ گیا۔ مولاؑ نے افاقہ میں لانے کی بہت کوشش کی۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ علیؑ کی بیٹی سنبھل نہ سکی اور غش کھا گئی۔ آخر کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلی۔

مولاؑ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ میں زندہ رہوں گا۔ کیونکہ یہ تو یقینی بات تھی۔ ہاں تسلیاں دینے کی مولا نے پوری کوششیں کیں۔ شفقت و پیار کے لہجے میں پاؤں کی تلیاں بھی مل رہے ہیں، اور ان لفظوں سے تسلیاں بھی دے رہے ہیں:

"یَا اُخْتَاهُ تَعَزِّیْ بِعَزَاءِ اللّٰهِ وَ اعْلَمِیْ اَنَّ اَهْلَ الْاَرْضِ یَمُوْتُوْنَ وَ اَنَّ اَهْلَ السَّمَاءِ لَا یَبْقُوْنَ وَ اِنَّ کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَ اللّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِهٖ وَ یَبْعَثُ الْخَلْقَ وَ یُعِیْدُهُمْ وَ هُوَ فَرْدٌ وَّ جَدِّیْ خَیْرٌ مِّنِّیْ، وَ اَخِیْ خَیْرٌ مِّنِّیْ لِکُلِّ مُسْلِمٍ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ".

"بہن! اللہ کی رضا پر راضی رہ کر صبر و ضبط سے کام لو اور جان لو کہ تمام اہل زمین مر جائیں گے اور آسمان والے بھی باقی نہ رہیں گے۔ ہر شے فنا ہونے والی ہے سوائے ذات خدا کے، جس نے مخلوق کو اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ پیدا کیا اور پھر وہی مخلوق کو دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے اٹھائے گا۔ وہ اکیلا لاشریک ہے۔

اماں جائی! میرے نانا، میرے بابا اور بھائی مجھ سے بہتر تھے، وہ سب کے سب چلے گئے، میں بھی چلا جاؤں گا اور ہر مسلمان کو جناب رسولؐ اللہ کی سیرت کو اپنانا چاہیے"۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ".

احوالِ قیامت، روزِ عاشور
امام علیہ السلام کا خطبہ، جنگ کا آغاز
شہادت حضرت حرؑ

"مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ".

"روزِ جزاء کا مالک ہے۔" روزِ جزاء کیا ہے؟ اس کی اہمیت کے متعلق سورۂ انفطار میں ہے:

"وَمَا اَدۡرَاکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ. ثُمَّ مَا اَدۡرَاکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ".

"اے مخاطب! تو کیا جانے کہ یوم الدّین کیا ہے۔ پھر تجھے کیا خبر کہ یوم الدّین کیا ہے۔"

کسی چیز کی عظمت، اہمیت اور شان ظاہر کرنے کے لیے قرآنِ پاک کا اسلوبِ بیان ہے کہ اس سے پہلے "مَا اَدۡرَاکَ" کا جملہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ

"مَا اَدۡرَاکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ"

"تو کیا جانے کہ لیلۃ القدر کیا ہے"۔

"وَمَا اَدۡرَاکَ مَا الطَّارِقُ" "وَمَا اَدۡرَاکَ مَا عِلِّیُّوۡنَ" "وَمَا اَدۡرَاکَ مَا الۡقَارِعَۃُ".

خداوندِ عالم یوم الدّین کی اہمیت وعظمت بیان کر رہا ہے اور اس دن سے بڑھ کر کون سا دن ہوگا کہ تمام لوگ حضرت اسرافیل کے دوبارہ صور پھونکنے سے قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

"یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَھُمۡ".

"اس دن لوگ قبروں سے میدانِ حشر میں مختلف صورتوں میں بکھرے ہوئے نکلیں گے تا کہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں۔"

"فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ".

''پس جو شخص ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا، اسے دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ بھر بھی بدی کرے گا، اسے دیکھ لے گا۔''

ہر شخص کی نیکیاں اور برائیاں اس کے سامنے ہوں گی۔ اس وقت انسان حیرت سے کہے گا کہ ''کاش! میں زیادہ نیکیاں کرتا اور برائیاں نہ کرتا۔'' لیکن اس وقت پچھتانے سے کیا ہوگا؟؟ عمل کا وقت تو گزر چکا۔ وہ تو بدلے کا وقت ہوگا۔

انسان! ابھی دنیا عمل کا وقت ہے۔ خوابِ غفلت سے ہوشیار ہو! تیرے اعمالِ دُنیا کا حساب سرکارِ احدیت میں محفوظ ہے اور سرکارِ وحدانیت کے اہلکاروں نے تیرے کردار کا دفتر تیار کر رکھا ہے جو قبر سے اٹھنے کے وقت تیرے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ سورۂ اسراء پارہ نمبر ۱۵ میں ہے:

''وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ. وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا. اِقْرَاْ كِتٰبَكَ. كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا''.

''ہم نے ہر انسان کی گردن میں اس کا طائر (نامہ اعمال) لازمی کر دیا ہے، ملا دیا ہے، اور روزِ قیامت ہم اس نامہ اعمال کو ایک کتاب کی صورت میں نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔ لے پڑھ لے اپنے لکھے ہوئے اعمال کو! آج تیرا نفس ہی تیرے لیے حساب کرنے والا کافی ہے۔''

یعنی تیری دنیوی زندگی کی کارگزاری تیرے سامنے ہے۔ اب سمجھ لے کہ تو کس قسم کے بدلے کا مستحق ہے۔ اسی واسطے حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے:

''حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسِبُوْا''

''تم خود اپنا حساب لے لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔''

احوالِ قیامت کو ایک شاعر نے بہترین نظم میں پیش کیا اور آیاتِ قیامت کا شعروں میں بہترین ترجمہ کیا ہے۔

پھونکے گا جب کہ صُور اسرافیلِ نامدار
اس وقت اے محبو قیامت ہو آشکار
زندہ کوئی رہے گا نہ باقی جہان میں
ہر شخص کو فنا ہے بجز ذاتِ کردگار
لرزہ ہو اس زمیں کو ایسا کہ الحذر
اور یوں اڑیں پہاڑ کہ جیسے اڑے غبار

شمس و قمر سیاہ ہوں اور گر پڑیں نجوم
اور آسمان کے ٹکڑے ہوں پھٹ کر کئی ہزار
یہ ذکر پہلے صُور کا ہے تم نے جو سنا
شدت سے جس کی ، زیر و زبر ہوئیں کہسار
اور بعد اس کے صُور وہ پھونکے گا دوسرا
مرنے کے بعد زندہ ہو ہر اک جاندار
وہ دن ہے تُرش اور نہایت اداس ہے
ہولوں سے اور سختیوں سے پُر ہے وہ نہار
ہو گی خبر کسی کو کسی نہ ہول سے
کام آئے گا کسی کے نہ اس دن عزیز و یار
بھاگے گا بھائی بھائی سے اور باپ سے پسر
زوجہ سے اور پسر سے کرے گا ہر اک فرار
اس دن کی سختیوں سے بہت خوف ہے مجھے
کیا جانئے؟ کیسی مصیبت میں ہو گزار
صدقہ رسولؐ پاک کی عترتؑ کا اے خدا!
اس دن مجھے علیؑ کے محبوں میں کر شمار

لکھا ہے کہ اس روز لوگ قبروں سے مختلف ٹولوں اور مختلف شکلوں میں نمودار ہوں گے۔ایک روز حضوؐر اکرم حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر تشریف فرما تھے۔معاذ بن جبلؓ نے آپؐ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی:

"اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتاً ہ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجاً".

"تحقیق وہ فیصلہ کرنے اور خلائق کو اعمال کی جزاء دینے کا دن ہے جو خدا کے نزدیک مقرر ہے۔جس دن صُور پھونکا جائے گا،اس دن تم گروہ در گروہ ہو کر آؤ گے۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:"اے معاذ!تو نے امر عظیم کے متعلق دریافت کیا ہے"۔

اس کے بعد آپ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا: ''میری اُمت میں سے دس قسم کے لوگوں کو مؤمنین سے جدا کر کے میدانِ حشر میں پیش کیا جائے گا:

1۔ بندروں کی صورت میں ہوں گے۔

2۔ خنزیروں کی صورت میں ہوں گے۔

3۔ اُلٹے سر کے بل چلتے ہوں گے۔

4۔ اندھے ہوں گے۔

5۔ گونگے اور بہرے ہوں گے۔

6۔ ایک گروہ ہوگا جو اپنی زبانوں کو چباتا ہوگا اور ان کی زبانیں ان کے سینوں تک بڑھ آئی ہوں گی اور ان سے گندا پانی اور پیپ جاری ہوگی کہ قیامت کے لوگ اس کی بدبو سے اذیت پائیں گے۔

7۔ ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے۔

8۔ آگ کی سولی پر لٹکتے ہوں گے۔

9۔ ایک گروہ اس قسم کا ہوگا کہ ان کے بدنوں سے مردار کی بو آئے گی۔

10۔ قطران ایک گندہ روغن ہے، جس کے جبے (ایک قسم کے چغے) پہنے ہوئے ہوں گے اور وہ جبے ان کے بدنوں پر چپٹے ہوئے ہوں گے''۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر ان گروہوں کی تفصیل بتائی:

1۔ جو لوگ سخن چین اور چغلیاں کھاتے تھے، وہ بندروں کی صورت میں محشور ہوں گے۔

2۔ خنزیروں کی شکل میں وہ لوگ ہوں گے جو دنیا میں حرام کھاتے تھے، حلال و حرام کے درمیان تمیز نہ کرتے تھے۔ حرام ذریعہ سے کمانے اور حرام کھانے والے لوگ ہوں گے۔

3۔ اُلٹے چلنے والے وہ لوگ ہوں گے جو سُود خوار ہوں گے۔ سود حرام ہے اور سود کھانے والے روزِ محشر سر کے بل چل کر آئیں گے۔

4۔ ظالم اور ظلم کا حکم دینے والے اندھے محشور ہوں گے۔

5۔ اپنے اعمال پر ناز کرنے والے اور ریاکار لوگ گونگوں اور بہروں کی شکل میں ہوں گے۔

6۔ جو گروہ زبانیں چبانے والا ہوگا وہ قاضی اور وہ فیصلہ کرنے والے جو جان بوجھ کر طمعِ دنیا میں یا جانبداری کی بناء پر غلط فیصلہ کریں گے اور وہ علماء و واعظین اور مجمع عام میں بیان کرنے والے لوگ جن کا عمل ان کے قول کے خلاف ہے، لوگوں کو نیکی کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور خود نیکی نہیں کرتے۔

7۔ ہاتھ اور پاؤں ان لوگوں کے کٹے ہوئے ہوں گے جو ہمسایہ اور پڑوس میں رہنے والے لوگوں کو ناحق اذیت دیتے تھے۔

8۔ آگ کی سولی پر وہ لوگ ہوں گے جو بادشاہوں، امیروں اور حاکموں کے پاس نیک اور دیانتدار شریفوں کی شکایات کرتے تھے اور علماء و رؤساء کی خوشامد میں حق کو چھپاتے تھے اور حق والوں کے خلاف باتیں کرتے تھے۔

9۔ جن لوگوں کے بدنوں سے مردار سے زیادہ بو آئے گی، وہ وہ لوگ ہوں گے جو خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کرتے تھے۔ اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے اور نفسانی لذت کے واسطے ناجائز باتیں کرتے تھے اور حقوق خدا کو ادا نہ کرتے تھے۔

10۔ قطران کا لباس پہننے والے مغرور و متکبر ہوں گے۔

علاوہ ازیں احادیثِ مبارکہ میں اس قسم کے دوسرے گروہوں کا ذکر بھی ہے جن میں مختلف قسم کی بدکاریاں پائی جاتی ہیں اور جنھوں نے دنیا میں ہر قسم کا فسق و فجور کیا۔ حقوقِ خدا ضائع کیے، حقوقِ بندگان پامال کیے۔ یہ لوگ کافر و مشرک نہیں، اُمتِ رسولؐ کے بدکار آدمی ہوں گے جو اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے قبروں سے اٹھیں گے اور ان شکلوں میں نمودار ہوں گے۔

ایک معقول سوال اور اس کا معقول جواب

عام طور پر سوال کیا جاتا ہے کہ جو لوگ قبروں میں دفن ہوئے، وہ تو روزِ قیامت قبروں سے اٹھائے جائیں گے، لیکن جن لوگوں کو قبریں نصیب نہیں ہوئیں، مثلاً دریا میں غرق ہوئے اور آبی جانوروں کی غذا بنے یا درندوں نے انہیں چیر پھاڑ کر کھایا اور وہ درندوں کے پیٹ میں چلے گئے یا وہ جو زندہ و مردہ آگ میں جلائے گئے اور جس طرح کہ کفار اپنی رسموں کے مطابق اپنے مردوں کو آگ میں جلاتے ہیں اور ان کی قبریں نہیں ہوتیں وہ کہاں سے مبعوث کیے جائیں گے۔

اس کا جواب قدرے تفصیل سے ہم نذرِ قارئین کرتے ہیں:

انسان تین چیزوں سے مرکب ہے۔ بدن، نفس ناطقہ اور روح۔ بعض کے نزدیک روح ہی نفس ناطقہ ہے۔ اس طرح انسان دو چیزوں "روح اور بدن" سے مرکب ہے۔ گو ثواب و عقاب کی موردِ روح ہے، مگر تنہا روح نہیں۔ اسلامی نظریے کے مطابق روح خالی از بدن جزاء و سزا کی مستوجب نہیں بلکہ روح مع جسم موردِ ثواب و عتاب ہے۔ اس لئے بدنِ انسانی کو زندہ کر کے روح اس میں داخل کر کے اسے ثواب یا عذاب دیا جائے گا۔

انسان قبر میں دفن ہونے کے بعد قبر میں بھی صحیح وسالم نہیں رہتا بلکہ گل سڑ کر مٹی ہو جاتا ہے اور مٹی میں مل جاتا ہے اور اس بدن کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں لیکن وہ اجزاء اجزاء کی صورت میں باقی رہتے ہیں۔ شکلیں معدوم ہو جاتی ہیں، صورتیں مٹ جاتی ہیں۔

انسان اربع عناصر سے مرکب ہے، خاکی اجزاء خاک میں، ہوائی اجزاء ہوا میں، آبی آب میں اور ناری نار میں مل جاتے ہیں۔ اس طرح آدمی قبر میں دفن ہو جائے یا جل جائے یا کسی جانور کے پیٹ میں چلا جائے تو اس کا بدن گھل مل جائے گا، ترکیب ختم ہو جائے گی، مواد تحلیل ہو جائے گا، مگر اس کے ذرات عنصری اجزاء کی حالت میں باقی رہ جائیں گے اور جسم انسان کے اجزائے اصلی جوں کے توں اس دنیا میں باقی رہ جائیں گے اور روزِ قیامت خالق علیم انہی اجزائے اصلی کو، وہ جہاں بھی ہوں گے، اکٹھا کر کے وہی سابق اور اصلی بدن بنا کر اس کی روح اس میں داخل کر کے زندہ کرے گا اور میدانِ محشر میں اسے لائے گا۔

خداوند عالم قادر ہے، اسے طاقت ہے کہ ان اجزاء کو، چاہے کہیں بھی ہوں، اکٹھا کر کے وہی سابق بدن بنائے۔ جس ذات قادر و علیم و حکیم نے انسان کو عدمِ محض یعنی بالکل نیست سے پیدا کیا، کیا وہی اجزاء کو اکٹھا کر کے وہی سابق بدن نہیں بنا سکتا؟

قبر میں بھی تو انسان کا بدن سالم نہیں رہتا۔ وہ بھی مٹی میں گھل مل جاتا ہے۔ اسی طرح دریا برد، جانوروں کا نوالہ، آگ میں جلا ہوا بدن ختم ہو جاتا ہے مگر اس کے اجزائے اصلیہ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس ذات کا علم وسیع ہے۔ اسے علم ہے کہ فلاں ڈوب جانے والے آدمی، جانوروں کے پیٹ میں چلے جانے والے، آگ میں جل کر راکھ ہو جانے والے آدمی کے اجزاء کہاں ہیں۔ اپنے علم و قدرت سے انہیں اکٹھا کر کے بدن کی صورت میں جوڑ کے، ان کی روحیں ان میں داخل کر کے مبعوث فرمائے گا اور حساب و کتاب کے لیے عرصاتِ محشر میں لا کھڑا کرے گا۔

"وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ".

''وہ ہر ایک شے پر قادر ہے''۔

جو ذات پاک تمام جہانوں کو پیدا کر سکتی ہے اور اس میں ہر قسم کی مخلوق کی پرورش کر سکتی ہے۔ جب کہ سارے جہان اور جو کچھ ان میں ہے۔ اس کے قبضہ قدرت و وسعت علم میں ہیں اور جو قیامت قائم کر سکتی ہے وہ ہر قسم کے مردہ کو زندہ نہیں کر سکتی۔

جناب عزیر علیہ السلام کا ایک مردہ بستی کے پاس سے گزرنا اور حیران ہو کر کہنا:

"بارالٰہا! ان پرانی گلی سڑی ہڈیوں کو کیونکر زندہ کرے گا" اور وہیں جناب عزیر علیہ السلام کو سو سال تک مردہ رکھ کر دوبارہ زندہ کرنا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پرندوں کے ذبح کرنے اور ان کے گوشت کو قیمہ کر کے جدا جدا پہاڑوں پر رکھنا پھر حضرت خلیلؑ کا ان کو بلانا، ان کے اجزاء کا باہم مل کر پرندوں کی صورت اختیار کر کے دوڑ کے اتباعِ حکم جلیل میں حضرت خلیلؑ کے پاس جانا اس کی قدرت کی واضح نشانیاں ہیں۔ اس کی قدرت سے کون سی چیز باہر ہے!

"تَبَارَکَ الَّذِی بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر".

"بابرکت ہے وہ ذات ہر چیز کی سلطنت اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

شکم مادر میں رحم کی تاریکیوں میں نطفہ انسانی داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک نطفہ ہے، لیکن اس میں پورا انسان پوشیدہ ہے۔ کس حکمت و قدرت سے رحم مادر کے اندھیروں میں جسم انسانی تیار ہوتا ہے۔ اسی پانی کے اجزاء مرحلہ وار ارتقائی درجات طے کرتے ہوئے، بازو والے اجزاء بازوؤں میں، پاؤں والے پاؤں میں، دل والے دل میں، جگر والے جگر میں، ناک والے ناک میں، کان والے کان میں، آنکھ والے آنکھ میں اور دماغ والے دماغ میں چلے جاتے ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد رحم مادر کے قدرتی کارخانے میں کیمیائی تبدیلیوں کے بعد ایک صحیح تندرست و سالم بچہ بن کر شکم سے باہر آجاتا ہے۔

بالکل اسی طرح روزِ جزا اس کے بکھرے ہوئے اجزاء قادر و حکیم کی قدرت و حکمت سے اپنے اپنے صحیح مقام پر پہنچ کر بدن انسانی کی سابق صحیح شکل اختیار کر لیں گے۔

اے معترض انسان! اگر تو اپنی پیدائش پر غور و فکر کرے تو معادِ جسمانی تیری سمجھ میں بآسانی آجائے گا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"کُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ".

"تم مردہ تھے، پس تمہیں زندہ کیا گیا پھر وہ تمہیں مار دے گا، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف پلٹ جاؤ گے"۔

تم مردہ تھے، پیدائش سے قبل بھی تم مردہ تھے، کونسی قبر میں تھے، کس جانور کے پیٹ میں تھے، کہاں تھے، کہاں جلائے گئے تھے، صرف اجزاء تھے، پس تمہیں زندہ کیا (اکٹھا کر کے بدن بنا کے اس میں روح ڈالی، وہ پھر تمہیں مارے گا، پھر دوبارہ زندگی دے گا۔ پھر حساب کتاب کے لیے تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

"کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ".

"جس طرح تم کو پیدا کیا گیا، اسی طرح مرنے کے بعد تمہارا اعادہ بھی ہوگا"۔

جس بدن کے ساتھ دنیا میں روح نے گناہوں کی لذت حاصل کی اسی بدن کے ساتھ دوزخ میں سزا کا درد بھی محسوس کرے گی اور جس بدن کے ساتھ روح نے اطاعت اور عبادت خدا کی مشقت و محنت اٹھائی، اسی بدن کے ساتھ جنت میں اجر و ثواب کا لطف بھی حاصل کرے گی۔

"مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْن" "روز جزا کا وہ واحد مالک ہے۔" اس کی ملکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ "یَغْفِرُ مِنْ یَشَاءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَشَاءُ" "جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے" کوئی اسے روکنے والا نہیں، نہ کسی کی مجال ہوگی کہ چوں چراں کر سکے اور اس کے حکم و فیصلہ میں مداخلت کر سکے۔

"یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَیْئًا وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِلّٰہِ".

جس دن کوئی نفس کسی نفس کا مالک نہ ہوگا، نہ کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گا اور نہ نقصان اور حکم اس روز خدا ہی کا ہوگا، تمام اُمور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے۔ بے شک اس کی عدالت رحم آمیز ہوگی، تخت عدالت سے قادر و کریم آقا کے احکام و فیصلے جاری ہوں گے۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا، نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا پورا اجر ملے گا، برائیوں کی معافی کا امکان ہوگا۔

اعمال کا وزن

چونکہ وہ رحیم عادل ہے اس واسطے کسی کی نیکی کو ضائع نہ کرے گا۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ".

"بے شک اللہ تعالیٰ نیکوں کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔"

البتہ بدکاروں کی بعض بدکاریاں معاف کرنے میں مالک کُلی۔ جن لوگوں نے حقوق العباد کی رعایت نہیں کی وہ قابلِ مغفرت نہیں اور جن لوگوں نے حقوقِ خدا ضائع کیے، چونکہ اس کے اپنے حقوق ہیں، ان میں سے کسی میں بھی درگزر کر سکتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی طرف سے معافی ہے، کسی کی حق تلفی نہیں۔ لہٰذا اس کی عدالت رحمی پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

لوگوں کے اعمال گنے نہیں بلکہ تولے جائیں گے کہ ان کے اعمال میں وزن کتنا ہوگا۔

"فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ. وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ".

"پس جس کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا وہ پسندیدہ زندگی یعنی جنت میں ہوگا اور جس کا نیکیوں والا پلڑا ہلکا ہوگا اس کا

ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ "ہاویہ" کیا ہے؟ دہکتی ہوئی آگ"۔

علاوہ نامہ اعمال کے، خود بدکاروں اور کفار کے اعضاء بدن ان کے کفر اور بدعملیوں کی گواہی دیں گے۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ حَتّٰى اِذَا مَا جَآئُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ".

"جس دن دشمنانِ خدا اکٹھے کیے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گے جو کچھ وہ دنیا میں برے اعمال کرتے رہے۔" وہ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی تو وہ اعضاء کہیں گے کہ ہم کو تو اس خدا نے بولنے کی طاقت دی ہے جس نے ہر چیز کو قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے۔

"وَ دُنِيَتْ كُلُّ نَفْسٍ..."

"اور ہر نفس کو اس کا بھرپور بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

بہرحال مالک اور عادلِ حقیقی ہر انسان کو اس کے تمام اعمال اچھے و برے دکھا کے فیصلہ کرے گا۔

حقِ شفاعت

ہاں! شفاعت کی گنجائش ضرور ہے۔ مقربین خدا، انبیاء و مرسلین اور آئمہ معصومین علیہم السلام کو اذن عطا ہوگا۔ اس کے بعد وہ گناہگار مومنین کے حق میں شفاعت فرمائیں گے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کا ذکر ہے:

"مَنْ ذَالَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ"

"کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر شفاعت کر سکے؟"

"لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا"

"کوئی شفاعت کرنے کا ملک نہیں، مگر وہ جس نے خدا کے ہاں شفاعت کا عہد لے لیا ہے۔"

"مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ"

"کوئی شفاعت کرنے والا نہیں مگر اس کے اذن کے بعد۔"

"یَوْمَئِذٍ لَا یَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهُ قَوْلًا".

"اس دن کسی کو کوئی شفاعت فائدہ نہ پہنچائے گی مگر اس کی جسے رحمٰن نے اذن دیا ہے اور اس کی بات کو پسند کرلیا ہے"

جب انسان کسی ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو تو اس سے نجات حاصل کرنے کا چارہ تلاش کرتا ہے۔ کسی مصیبت میں اور سختی میں گرفتار ہو، کسی قصور اور جرم میں ماخوذ ہو تو اس سے چھٹکارا کرنے کا وسیلہ ڈھونڈتا ہے۔ قیامت سے بڑھ کر اور کوئی ہولناک دن نہیں اور مجرموں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شدّت و پریشانی نہیں۔

نامہ اعمال اور اعضاء بدن گواہی دے چکے ہیں۔ اعمال بھی سامنے ہیں اور ان کی سزا بھی سامنے ہے۔ اس وقت انسان کو سفارش کرنے والے کی کتنی ضرورت ہوگی اور کس قدر وہ محتاج شفیع ہوگا۔ لیکن اسی پر سفارش کی امید ہوتی ہے جس کے ساتھ کوئی وسیلہ و تعلق ہو اور بھی اس کی خوشنودی حاصل کی ہو۔

شفیع کیلئے دو چیزیں ضروری ھیں

شفیع (شفاعت کرنے والے) کیلئے دو پہلو ضروری ہیں۔

1۔ ایک تو اس حاکم کا مقرب ہو جس کے پاس سفارش کرنی ہے تاکہ اس کی بات مانی جائے۔ اس کی قدر و منزلت حاکم کے اس اتنی ہو کہ اس کی سفارش مقبول ہو جائے۔

اگر وہ خود ہی بیچارہ ہو، اس کی کوئی وجاہت نہ ہو اور بارگاہِ حاکم تک اس کی رسائی ہی نہ ہو، نہ ہی اسے حاکم کا قرب حاصل ہو تو وہ کیا سفارش کر سکے گا؟ لہٰذا مسلمانو! روزِ قیامت تمہیں شفاعت کی ضرورت ہوگی۔ سمجھ اور پہچان لو کہ کون شفاعت کر سکے گا۔ دیکھ لو کہ کون وسیلہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شفیع کا یہ پہلو خداوند تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

2۔ شفیع کا دوسرا پہلو بندۂ گنہگار کے متعلق ہے۔ آیا بندۂ گنہگار اس قابل ہے کہ اس کے پاس جا سکے، اپنا دُکھ اُسے سنا سکے۔ آیا بندۂ گناہگار نے اس شفیع کے ساتھ کوئی تعلق استوار کر رکھا ہے؟ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا کوئی عمل بھی کیا ہے؟ اس کا دامن پکڑا ہے؟ کیا وہ اس کے گروہ میں شمار ہوتا ہے؟ کیا شفیع اس بندۂ گناہگار کو اپنا سمجھتا ہے؟

اگر یہ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں تو وہ بندہ کامیاب ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک بات یا دونوں حاصل نہیں تو خسران مبین اور بدبختی کے سوا کیا ملے گا؟؟

"اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ"۔

''آدمی اسی کے ساتھ محشور ہوگا جس کے ساتھ وہ محبت کرتا ہوگا۔''

اے مسلمان! خیال کر، اسی سے محبت کر جس کی محبت تجھے روزِ قیامت فائدہ پہنچائے گی۔

قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ روزِ قیامت لوگوں کے کئی پیشوا ایسے ہوں گے کہ جب وہ دردناک ماحول میں جائیں گے تو اپنے پیروکاروں سے بیزاری اور قطع تعلق کر جائیں گے۔ پیروکاران کے دامن پکڑیں گے لیکن وہ ان سے اپنا دامن چھڑائیں گے۔

ایسے امام بنا جو اپنے پیروکاروں کو ان کی علامات سے پہچان کر اپنے سایہ میں پناہ دیں۔ ایسے شفیع بنا جن کے پاک دہن سے نکلے ہوئے شفاعت کے الفاظ کا باب اجابت خود استقبال کرے۔ ایسے کریم اور شفیق سرداروں کی رعایا بن کہ جن کی نگاہیں اپنے ماننے والوں کو تلاش کریں۔ جو اپنے محبوں کو سنبھال کر اپنے ہمراہ لے چلیں۔ ان کا دامن پکڑ! جن کے بدنوں پر جنت کا لباس ہو۔ ایسے کریم اور بندہ نواز آقاؤں کی اطاعت کر! جو جنت کے دروازے پر پہنچ کر کہیں:

''میں اس وقت تک جنت میں قدم نہ رکھوں گی جب تک میرے مظلوم وغریب بیٹے حسینؑ کے سوگوار جنت میں داخل نہ ہو جائیں''۔

اپنے مریدوں، مقتدیوں اور پیروکاروں سے وہ بھاگیں گے جو تہی دامن ہونگے، جن کے پاس کچھ نہ ہوگا، بارگاہِ احدیت میں رسائی نہ ہوگی، وہاں کچھ قدر و منزلت نہ ہوگی، روزِ محشر جنہیں خداوند عالم کی طرف سے کچھ اختیار نہ ملے، گو عرصاتِ محشر سے تو بھاگیں گے ہی مگر دوزخ میں پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ پیر و مرید ایک ہی مقام میں ہوں گے۔ ہاں! جھوٹے پیروں اور جھوٹے پیشواؤں کو دوزخ میں مریدوں سے بھی برا مقام ملے گا اور جہنم سے زیادہ حصہ ملے گا، پیشوا جو تھے۔

محبت اھلبیت علیھم السلام کا افادہ

مگر جن کے دامن اختیارات سے مالا مال ہوں گے، جن کا مرتبہ خداوند عالم کے یہاں اتنا بلند ہوگا کہ انبیاء و مرسلین بھی رشک کریں گے، جنہیں "قَسِیْمُ النَّارِ وَالْجَنَّۃ" کا عہدہ تفویض ہوگا، جنہیں "اَلْقِیَا فِی الْجَھَنَّمَ کُلَّ کُفَّارٍ عَنِیْد" کا امر ملے گا، جن کے معصوم ہاتھوں پر کوثر و تسنیم کے ساغر چھلکتے دکھائی دیں گے، نہر کوثر کی لہریں جن کے استقبال میں بیتاب ہوں گی، جنت جن کے قدموں کی منتظر ہوگی، پل صراط پر جن کو پروانہ راہداری عطا کرنے کا منجانب اللہ اختیار مل چکا ہوگا، شفاعت کا عہدہ جنہیں عطا ہوگا، وہ اپنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے ساتھ رکھیں گے، نیکوکار تو قبروں سے اُٹھتے ہی ان کے ہمراہ

ہوں گے اور وہ گناہگاروں کو دوزخ سے یوں اُٹھالیں گے جس طرح کہ مرغ مٹی میں سے دانہ چن لیتا ہے۔

آؤ مسلمانو! میں اپنے رہنماؤں کی کرم فرمائیاں گنواؤں! کہاں کہاں کام آئیں گے! ادھر دنیا سے تعلق ختم ہوگا، زندگی کے آخری لمحات ہوں گے اور ہمارے معصوم آقا ہماری خبر گیری، ہماری دیکھ بھال اور ہماری دستگیری کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔

فردوس الاخبار دیلمی میں مذکور ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کی محبت سات جگہ کام آئے گی:

"عن ابن مسعود رضی اللّٰہ تعالی عنه قال قال رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہُ علیه وآلہٖ وسلم حُبُّ اَهْلِ بَیْتِیْ نَافِعٌ فِیْ سَبْعِ مَوَاطِنَ اَهْوا لُهُنَّ عَظِیْمَةٌ عِنْدَ الْوَفَاتِ وَ عِنْدَ الْقَبْرِ وَ عِنْدَ النُّشُوْرِ وَ عِنْدَ الْکِتَابِ وَ عِنْدَ الْحِسَابِ وَ عِنْدَ الصِّرَاطِ".

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میرے اہل بیت علیہم السلام کی محبت سات مقامات پر فائدہ دے گی۔"

یہ سات مقامات بہت پر ہول، پر خطر، ڈراؤنے اور وحشت ناک ہیں اور ایسے ہی مقامات پر تسلی، امداد اور شفقت و مہربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

وہ سات مقامات یہ ہیں:

1۔ وفات کا وقت، جانکنی کا ہنگام، دنیا سے منہ موڑنے اور آخرت کی طرف منہ پھیرنے کا وقت ہوتا ہے۔

2۔ قبر کی تنگ کوٹھڑی اور تاریک لحد میں، جہاں کوئی مونس و غمگسار نہ ہوگا۔

3۔ قبروں سے اُٹھنے اور میدانِ محشر میں جمع ہونے کے وقت۔

4۔ نامۂ اعمال ہاتھ میں دینے کے وقت۔

5۔ نیکیوں اور بدکاریوں کا حساب لینے کے وقت۔

6۔ اعمال تولنے اور پرکھنے کے وقت۔

7۔ آخری منزل، پل صراط عبور کرنے کے وقت۔

یہ محبت اہل بیتؑ دنیا سے رخصت ہونے کے وقت بندۂ مومن کو اپنی آغوش میں لے گی اور پل صراط سے پار کر کے

منزلِ مقصود، جنت کے دروازے پر آ پہنچائے گی۔

اب ذرا تفصیلاً بھی سن لیں: حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''جب ہمارا کوئی دوست اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کی رحلت کے وقت اس کے پاس حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین وحسنین شریفین علیہم السلام تشریف لاتے ہیں۔''

مشکل کے وقت، تلخی کے دوران اور گھبراہٹ کے ہنگام ایسا دوست مل جائے اور ایسا مہربان پہنچ جائے جو مشکل کشاء اور ہمدرد ہو تو تمام تلخیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ گھبراہٹ سکون وراحت سے بدل جاتی ہے۔ ہنگامِ نزع حضرت معصومین علیہم السلام کی اشباح کا آنا متعدد احادیث میں موجود ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا یہ شعر بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے:

يَا حَارُ هَمْدَان مَنْ يَمُتْ يَرَنِي

مُؤمِنَاً أَوْ مُنَافِقَاً قُبُلَا

''اے حارثِ ہمدانی! جو کوئی مومن یا منافق مرتا ہے وہ مرنے سے پہلے مجھے دیکھتا ہے''۔

اسی طرح قبر کی وحشت ناک تنہائی میں اور اندھیری وتنگ کوٹھڑی میں، جبکہ مونس واقرباء لحد کے سپرد کر کے چلے جائیں گے اور منکر ونکیر سوال وجواب کے لیے قبر میں آجائیں گے تو توحید ونبوت اور دوسرے عقائد کے علاوہ امامت کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔ "مَنْ إِمَامُكَ" "تیرا امام کون ہے؟" جس امام کا ماننے والا ہوگا، اسی کا نام بتائے گا۔ لیکن قبر میں سوائے نامِ علی ابن ابیطالب علیہم السلام، کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

ہاں! ابوتراب کا نام سنتے ہی قبر کی دیواریں وسیع ہو جائیں گی، قبر کی تراب سے ارض جنت کی خوشبو آئے گی، تاریک لحد میں ایمان کی روشنی جگمگا اٹھے گی، روح علیین میں ہوگی اور نسیم جنت کے جھونکوں سے مردِ مومن محظوظ ہوگا۔

قبر سے اُٹھنے کے وقت محبوں کی زباں پر نعرۂ حیدری ہوگا، زُمرۂ آئمہ معصومین علیہم السلام میں شامل ہوگا اور لواء الحمد کا سایہ نصیب ہوگا۔ "يَوْمَ نَدْعُوْ كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ" کے مطابق صحیح اور باعمل شیعہ اپنے امام کے پیچھے قطاروں میں شامل ہوں گے۔

حساب وکتاب کے وقت اور میزان کے وقت ان کے اعمال مقبول ہوں گے، جن میں ولائے علی کا وزن اور محبت اہل بیت کی خوشبو آئے گی۔ کتنی ہی نیکیاں اور کتنے ہی اعمال رائیگاں ہو جائیں گے کیونکہ وہ صحیح جانشین رسول کی ہدایات کے مطابق نہ ہوں گے۔ وارثانِ رسالتؑ، محافظانِ شریعت کے اقوال واعمال کے خلاف کوئی عمل بھی قابل قبول نہ ہوگا اور نہ ہی ان اعمال کی

بندے جزا پائیں گے جو نمائندگانِ خدا کے احکام کے مطابق نہ ہوں گے۔

چنانچہ فردوس الاخبار دیلمی میں معاذ بن جبل سے روایت ہے:

"عَنْ مَعَاذ بِنْ جبل قَال قَال رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّمَ حُبُّ عَلِي بنِ اَبِيْطَالِبِ عَلَيْهِم السَّلام حَسَنَةٌ لا تُضِرُ مَعَهَا سَيِّئَةٌ وَّ بُغْضُهٗ لا يَنْفَعُ مَعَهَا حَسَنَةٌ".

"حضرت معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علیؑ کی محبت ایسی نیکی ہے، جس کی موجودگی میں کوئی برائی نقصان نہیں پہنچاتی اور علیؑ کی عداوت ایسی برائی ہے، جس کی موجودگی میں کوئی نیکی نفع نہیں پہنچاتی"۔

اسی طرح کسی کتاب میں مذکور ہے: "اگر بندہ حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کے برابر عبادت کرے، پہاڑ کے برابر سونا راہِ خدا میں خیرات کرے، ہزاروں حج پیادہ کرے، صفا و مروہ کے درمیان ظلم و جور سے قتل کیا جائے، اگر اس کے دل خانہ میں ولائے علیؑ کا ٹھکانہ نہیں تو وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکتا۔"

جب علیؑ کی مے نہیں جس گل کے جام میں
جنت کی بو نہ آئے گی اس کے مشام میں

چنانچہ حساب و کتاب کے وقت خصوصیت کے ساتھ ولایت علی علیہ السلام کا سوال کیا جائے گا۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُوْلُوْنَ".

"ان کو روک لو، ان سے پوچھا جائے گا۔" (صافات رپ ۲۳)

اس آیت کی تفسیر میں ابو سعید خدری اور سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ولایت علی علیہ السلام کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ (تفسیر واحدی، فردوس الاخبار دیلمی)۔

آخری اور سخت مرحلہ "پل صراط" کا ہے کہ جسے عبور کر کے جنت میں داخل ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، بھلا اسے کیونکر عبور کیا جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راہ بھی جنت میں جانے کا نہیں اور لازماً ہر شخص کو وہاں سے گزرنا ہے۔

"وَ اِنْ مِنْكُمْ اِلَّا وَ اَرِدُهَا وَ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْماً مَقْضِيّاً".

"تم میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ جہنم کی پل صراط سے ضرور گزرے گا اور یہ تیرے رب کا لازمی اور یقینی فیصلہ ہے۔" (مریم/پ ۱۶)

لیکن حساب وکتاب سے فراغت کے بعد ہر شخص کو اس پل پر سے گزرنے کی اجازت نہیں ہوگی، بلکہ وہاں "**قَسِيْمُ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ**" سے پروانہ لینا پڑے گا۔

"عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّمَ اِذَا جَمَعَ اللّٰهُ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ نَصَبَ الصِّرَاطَ عَلٰى حَفِيْرِ جَهَنَّمَ مَا جَازَهَا اَحَدٌ حَتّٰى كَانَتْ مَعَهٗ بَرَاءَةٌ بِوِلَايَةِ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْطَالِبٍ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ".

"حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب روزِ قیامت اوّلین وآخرین کو جمع کرے گا اور جہنم پر پل صراط قائم کرے گا تو اس پر سے کوئی شخص نہ گزر سکے گا جب تک اس کے پاس ولایت علیؑ کا پروانہ راہداری نہ ہوگا"۔

قیس بن حازم سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر، حضرت علی علیہ السلام سے ملے اور آپؑ کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ حضرت علی علیہ السلام نے مسکرانے کی وجہ دریافت فرمائی تو کہا:

"میں نے جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن علیؑ کے پروانہ راہداری کے بغیر کوئی شخص پل صراط عبور نہ کر سکے گا۔"

اسی قسم کی کافی حدیثیں صواعق محرقہ اور مناقب خوارزمی وغیرہ میں موجود ہیں۔ جن کے پاس والایت علیؑ کا پروانہ ہو گا، وہ کس طرح آئیں گے؟ ان کے متعلق بھی زبانِ رسالتؐ ہی سے سنئے:

تفسیر درالمنثور، مناقب خوارزمی اور صواعق محرقہ وغیرہ میں ہے کہ جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اے علیؑ! آپؑ کے شیعہ روزِ قیامت راضی وخوش ہوں گے۔ ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور وہ جنت کے بلند مقامات پر فائز ہوں گے"۔

(اسی قسم کی حدیثیں ہم نے "تاریخ الشیعہ" میں کافی درج کی ہیں، وہاں سے ملاحظہ فرمالیجئے)۔

ہاں! شیعہ خوشحال ہوں گے۔ ان کے ہاتھوں میں ولایت علیؑ کا پروانہ ہوگا اور موتیوں کی لڑیاں ہوں گی، محبت علیؑ بھی ہوگی اور عزائے حسین علیہ السلام بھی۔ علیؑ کے فضائل بیان کرنے اور سننے والے اور غم امام مظلوم علیہ السلام میں آنسو بہانے والے بروز قیامت کامیاب ہوں گے۔ پیاسوں کا تذکرہ کرنے والے، کوثر سے سیراب ہوں گے، جناب زہراء سلام اللہ علیہا اپنے مظلوم بیٹے کے غم میں رونے والوں کے لیے سفارش کریں گی، جنہوں نے ہمیشہ دنیا میں یادِ امام علیہ السلام تازہ رکھی اور ذکرِ امام علیہ السلام سے مجلسوں کو بارونق بنایا۔ جنہوں نے واقعات کربلا سن کر ماتم کیا۔ دسویں کے دن مظلومِ کربلاؑ کی غربت وبیکسی اور اہل بیت علیہم السلام کی تشنہ لبی، خاندانِ رسالت کی تباہی اور اہلبیتؑ کی تاراجی کا ذکر سنا اور برہنہ سر ہو کر ماتم بپا کیا۔

عزادارو! آج روزِ عاشور کے واقعات سن لو! کس طرح اہلبیت علیہم السلام پر دسویں کا دن طلوع ہوا۔

روزِ عاشور

ہاں غازیو! یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آلؑ کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہراؑ کے لعل کا
گزری شب فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

شبِ عاشور عبادت، اذکار اور قلق و اضطراب کے ساتھ ختم ہوئی۔ مشرقی اُفق پر سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اوران کے باوفا، پرخلوص ساتھیوں کو عرش کے نیچے سے ندا آئی:

"یَا خَیلُ اللّٰہِ اِرْکَبِیْ".

''اے اللہ کے سوارو! گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ۔''

امام علیہ السلام نے اصحاب کو نماز کے لیے آواز دی۔ بعد از اذان و اقامت مولائے مظلوم علیہ السلام نے ساتھیوں کے ساتھ نمازِ صبح پڑھی۔

نرالے مجاہدین نے کس خشوع و خضوع کے ساتھ فریضہ سحری ادا کیا!

سبحان اللہ! کائنات کے ان برگزیدہ نمازیوں اور ممتاز غازیوں نے صفیں باندھیں، ان کی تکبیر و تسبیح و تحلیل و حمد و ثناء پر ملائک کی لاکھ عبادتیں نثار! ساکنانِ عرش ان صحرائی عبادت گزاروں پہ قربان ہو رہے تھے، جن کا خشوع و خضوع یادگار تھا اور خلوص و عرفان میں ڈوبی ہوئی تسبیح و تقدیس کی آوازیں صحراء میں گونج رہی تھیں۔

اس نماز میں ان رشکِ قدسیوں کے امام، مولا حسین علیہ السلام نے بعد سورۂ حمد کے سورۂ ''صف'' تلاوت فرمائی جس میں مجاہدین کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ".

''بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں (جہاد) میں یوں پرا باندھ کر لڑتے ہیں کہ جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں''۔

بعداز فراغتِ نماز مولائے مظلوم علیہ السلام نے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی:

اَنْتَ ثِقَتِیْ فِیْ کُلِّ کَرْبٍ وَ اَنْتَ رَجَائِیْ فِیْ کُلِّ شِدَّةٍ وَ اَنْتَ لِیْ فِیْ کُلِّ اَمْرٍ نَزَلَ بِیْ ثِقَةٌ وَ عِدَّةٌ کَمْ مِنْ کَرْبٍ یَضْعَفُ فِیْهِ الْفُؤَادُ وَ تَقِلُّ فِیْهِ الْحِیْلَةُ وَ یَخْذُلُ فِیْهِ الصَّدِیْقُ وَ یَشْمَتُ فِیْهِ الْعَدُوُّ اَنْزَلْتُهُ بِکَ وَشَکَوْتُهُ اِلَیْکَ رَغْبَةً مِنِّیْ اِلَیْکَ عَمَّنْ سِوَاکَ فَفَرَّجْتَهُ عَنِّیْ وَ کَشَفْتَهُ فَاَنْتَ وَلِیُّ کُلِّ نِعْمَةٍ وَ صَاحِبُ کُلِّ حَسَنَةٍ وَ مُنْتَهٰی کُلِّ رَغْبَةٍ".

"اے اللہ! تو ہر مصیبت میں میرا بھروسہ اور ہر شدت میں میری اُمید گاہ ہے اور ہر اس مصیبت و پریشانی میں جو مجھے لاحق ہو، مجھے تجھ پر ہی بھروسہ و اعتماد ہے۔ بہت سی ایسی مصیبتیں ہیں جن میں دل بیٹھ جاتا ہے، تدبیر ناکام ہو جاتی ہے، دوست چھوڑ جاتے ہیں، دشمن خوش ہوتے ہیں، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور تیری بارگاہ میں ان کی شکایت کی۔ کیونکہ میں نے تیرے غیر سے تعلق نہیں رکھا اور صرف تجھ ہی سے لگاؤ رکھا۔ تو نے اپنے فضل اور کرم سے مصیبتوں کو ٹال دیا اور دکھ دور کر دیئے۔ تو ہی ہر نعمت کا ولی، ہر نیکی کا مالک اور ہر رغبت و امید کا مرجع ہے"۔

خیامِ مطہرہ کے تینوں اطراف جو خندق کھودی گئی تھی اور لکڑیاں اس میں بھر دی گئی تھیں، ان میں آگ جلائی گئی تا کہ دشمن ان تین اطرف سے خیامِ مقدسہ پر حملہ نہ کر سکیں اور لڑائی کا رُخ ایک طرف ہی رہے۔

شمر ملعون ہتھیار اپنے ناپاک بدن پر سجا کر ادھر سے گزرا اور جلتی ہوئی آگ دیکھ کر بے ادب زبان دراز کر کے بلند آواز سے امام علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"یَا حُسَیْنُ! تَعَجَّلْتَ بِالنَّارِ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ".

"یا حسینؑ! آپ نے قیامت قائم ہونے سے پہلے ہی آگ روشن کرنے میں جلدی کی ہے۔"

امام علیہ السلام نے اس لعین کا کلام سن کر دریافت فرمایا:

"مَنْ هٰذَا کَاَنَّهٗ شِمْرُ ابْنُ ذِی الْجَوْشَنِ".

"یہ کون ہے؟ غالباً شمر بن ذی الجوشن ہے؟"

اصحاب نے عرض کی: "ہاں وہی ہے"۔

آپؑ نے فرمایا: ''او بکریاں چرانے والی عورت کے بیٹے! تو آگ کا مزہ چکھنے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔''
جناب مسلم بن عوسجہؓ نے اسے تیر کا نشانہ بنانا چاہا مگر آپؑ نے روک دیا۔ جناب مسلم بن عوسجہؓ نے عرض کی:
''یا بن رسولؐ اللہ! یہ دشمن خدا بڑا فاسق اور جابر و سرکش ہے اور اس وقت وہ میرے تیر کی زد میں ہے۔ میں اسے اسی وقت انجام کو پہنچا دوں؟''

چونکہ اس وقت ابھی لڑائی شروع نہ ہوئی تھی، اس لئے امام مظلوم نے یہ فرما کر:

''فَاِنِّیْ اَکْرَہُ اَنْ اَبْدَئَهُمْ بِالْقِتَالِ''.

''میں پسند نہیں کرتا کہ جنگ کی ابتداء اپنی طرف سے کروں''۔

جناب مسلم کو منع فرما دیا۔

ہر دو جانب سے لشکروں کی ترتیب

عمر ابن سعد نے اپنے لشکروں کو اس طرح مرتب کیا کہ میمنہ (دائیں) پر عمرو بن حجاج زبیدی کو اور میسرہ (بائیں) پر شمر بن ذی الجوشن کو، سواروں پر عزرہ بن قیس کو اور پیادوں پر شیث بن ربعی کو افسر مقرر کیا اور اس لشکر کا علم اپنے غلام درید کے سپرد کیا۔

عمر بن سعد کا تو لشکر تھا، لشکرِ اشقیاء، جسے مؤرخین نے تیس ہزار سے دو لاکھ تک تحریر کیا ہے۔ روایاتِ متواترہ تیس تیس ہزار اور پچاس پچاس ہزار سے اوپر تک ہیں۔

اس کے مقابلے میں امامِ مظلوم جناب سید الشہداء علیہ السلام کے لشکر کی تعداد بہتر (۷۲) سے لے کر ایک سو پینتالیس ہے۔ کم از کم بہتر (۷۲) اور زیادہ سے زیادہ ایک سو پینتالیس۔

حضرت امامِ مظلوم علیہ السلام نے اپنی مختصری جماعت کو اس طرح منظم کیا کہ میمنہ پر زہیر بن قینؓ اور میسرہ پر حبیبؓ بن مظاہر کو افسر مقرر کیا اور اس قدسی جماعت کا علمبردار جناب ابا الفضل العباس علیہ السلام کو قرار دیا۔

ایک اور شقی کی بے ادبی اور امام علیہ السلام کی بددعا

ایک بد باطن شقی جس کا نام جویریہ مزنی تھا، گھوڑے پر سوار، خندق کے قریب آیا اور اس طرح اپنی شقاوت کا اظہار کرنے لگا:

"یَا حُسَیْنُ وَ اَصْحَابَ الْحُسَیْنِ! اِبْشِرُوْا بِالنَّارِ فَقَدْ تَعَجَّلْتُمُوْهَا فِی الدُّنْیَا".

"اے حسینؑ و اصحابِ حسینؑ! تمھیں آتشِ جہنم کی خوشخبری ہو کہ تم نے اسی دنیا میں اسے حاصل کرنے کی جلدی کی"۔

امام علیہ السلام نے دریافت فرمایا: "یہ کون ہے؟"

عرض کیا گیا: "یہ ابن ابی جویریہ ہے"۔

آپؑ نے اس دریدہ دہن گستاخ کے جواب میں فرمایا:

"اَتُعَیِّرُنِیْ بِالنَّارِ وَ اَنَا قَادِمٌ عَلٰی رَبٍّ کَرِیْمٍ".

اس کے بعد آپؑ نے یوں بددعا دی:

"اَللّٰهُمَّ اَذِقْهُ عَذَابَ النَّارِ فِی الدُّنْیَا".

"خدایا! اس ملعون کو دنیا ہی میں آگ کا مزہ چکھا"

اسی اثناء میں اس کا گھوڑا بدکا اور وہ گھوڑے کی پشت سے اس طرح گرا کہ اس کا ایک پاؤں رکاب میں الجھ گیا اور گھوڑا اس کو گھسیٹتے ہوئے خندق کے کنارے لے آیا اور وہ ملعون اس خندق میں گر کر لقمہ آتش بن گیا اور امام علیہ السلام کی دعا کا مستوجب ہو کر آگ میں جل کر مر گیا۔

روزِ عاشور اِتمامِ حجت کیلئے امام علیہ السلام کا خطبہ

عمر ابن سعد نے شبِ عاشور سردارانِ لشکر کو بلایا اور صبح کے لیے طریقِ جنگ پر غور کیا۔ تمام سردار مع ابن سعد اس بات پر متفق ہوئے کہ دن کو یکلخت حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب و خیام پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا اور ان کے حرم اور مخدراتِ عصمت کو قید کر لیا جائے۔ چنانچہ صبح کے بعد یہ اشقیاء گھوڑوں پر سوار خیامِ مقدسہ کی جانب اس ارادے سے بڑھے لیکن تینوں جانب خندق اور اس میں بھڑکتی ہوئی آگ کی وجہ سے حملہ نہ کر سکے اور اس ارادے میں ناکام رہے۔

اب عمر ابن سعد بالکل آمادۂ جنگ ہو گیا تھا۔ لشکر منظم ہو چکا تھا، اس وقت جنابِ امام حسین علیہ السلام سے پہلے بریرؓ بن خضیر ہمدانی نے قومِ اشقیاء سے خطاب کیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

''اے گروہِ مردم! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، فرزندِ رسولؐ ثقلین تمہارے سامنے ہے، ان کی ہمراہی میں اس کی اولاد، عترت اور حرمِ محترم ہیں۔ ان کے بارے میں رسولؐ خدا کی وصیت یاد کرو۔ اب وضاحت سے بیان کرو کہ تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟''

ان لوگوں نے جواب دیا: ''ہم یہ چاہتے ہیں کہ حسینؑ کو عبید اللہ ابن زیاد کے قابو میں دے دیں، اس کی جو رائے ہوگی وہ سلوک کرے گا''۔

جنابِ بریرؓ نے کہا: ''تم اس بات کو قبول نہیں کرتے کہ یہ جہاں سے آئے ہیں، واپس وہاں سلامتی کے ساتھ لوٹ جائیں۔ اے اہلِ کوفہ! تم پر سخت افسوس ہے! کیا تم اپنے خطوط بھول گئے ہو اور تم نے اپنے وہ عہد توڑ دیئے ہیں جن پر تم خداوند تعالیٰ کو گواہ بنایا تھا؟ تم پر افسوس ہے کہ تم نے اہلِ بیتؑ کو بلایا اور تمہارا گمان تھا کہ ہم اہلِ بیتِ رسولؐ کی حفاظت میں جانیں قربان کر دیں گے۔ جب وہ تمہارے پاس آ پہنچے تو تم ان کو ابن زیاد کے پاس پہنچانے کی باتیں کرتے ہو اور تم نے ان پر فرات کا پانی بند کر دیا۔ واقعی تم اپنے رسولؐ کی بدترین اُمت ہو۔ ان کی ذُرّیت کے ساتھ تم ایسا سلوک کرتے ہو؟ خدا تمہیں روزِ قیامت تمہیں کبھی سیراب نہ کرے! تم بدترین قوم ہو!''

جنابِ بریرؓ کا یہ کلام سن کر چند لوگوں نے جواب دیا:

''ہم نہیں سمجھتے آپ کیا کہہ رہے ہیں!''

جناب بریرؒ نے جواب دیا: ''الحمد للہ! خدا نے تمہارے مقابلے مجھے بصیرت عطا فرمائی ہے۔ خدایا! میں اس قوم کے افعال سے بیزار ہوں۔ پروردگار! اس شقی جماعت کو آپس میں ٹکرا اور اس حالت میں تیرے پاس آئیں جب کہ تو ان پر سخت غضب میں ہو''۔

کہا جاتا ہے کہ اس کا جواب کوفیوں نے تیروں کے ساتھ دیا۔ جب امام حسین علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ بریرؒ کا کلام ان پر اثر انداز نہیں ہوا تو امام علیہ السلام نے سواری منگوائی۔ ناقہ پر سوار ہوئے، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عمامہ مبارک سر پر رکھا، آپؑ کی چادر زیب تن کی اور آپ کی تلوار پہلو میں لٹکائی، عصاء کے مشابہ جناب رسولؐ پاک کا نیزہ ہاتھ میں لیا جو عموماً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سفر میں اور روز عید اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ تبرکات لے کر ناقہ پر سوار ہوئے۔

بعض روایات میں گھوڑے پر سواری لکھی ہوئی ہے مگر اکثر مؤرخین ناقہ پر سواری لکھتے ہیں اور اس میں یہ مسئلہ تحریر کرتے ہیں کہ گھوڑے کی نسبت اونٹ بلند ہوتا ہے اور ہر شخص آسانی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ چونکہ یہ لشکر عظیم تھا اس وجہ سے گھوڑے کی بجائے ناقہ پر سوار ہوئے۔ تا کہ ہر شخص کانوں سے میرا کلام سن اور اپنی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر پہچان لے تا کہ روزِ قیامت کوئی عذر نہ کر سکے اور ہر شخص تک میرا کلام پہنچ جائے۔

"یا ایھا الناس اسمعوا قولی ولا تعجلوا حتی اعظکم بما یحق لکم علی و حتی اعذر الیکم فان من مقدمی الیکم اعطیتمونی النصف کنتم بذالک اسعد و ان لم تعطونی النصف من انفسکم فاجمعو رایکم ثمّ لا یکن امرکم علیکم غمۃً قضولی ولا تنظرون اِنّ ولی اللہ الّذی نزل الکتٰب و ھو یتولی الصّالحین".

''لوگو! میری بات سنو اور جلدی نہ کرو! تا کہ وعظ ونصیحت کا جو حق میرے ذمہ ہے، اسے پورا کرلوں اور اپنے آنے کی وجہ وضاحت سے بیان کروں۔ پس اگر تم نے انصاف سے کام لیا تو سعادتمند ہو جاؤ گے اور اگر تم نے میری بات نہ مانی اور انصاف سے کام نہ لو گے تو اپنی قوت جمع کرلو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو تا کہ تم پر تمہارا کام اور اس کی حقیقت پوشیدہ نہ رہ جائے۔ میرا نگران وہ اللہ ہے جس نے کتاب نازل فرمائی اور نیک لوگوں کو دوست رکھتا ہے''۔

اس کے بعد آپؑ نے حمد وثنائے خدا بیان کی اور خدا کا ان اوصاف کے ساتھ ذکر کیا جن کا وہ مستحق ہے۔ بعدازاں

پاک پیغمبرؐ، ان کی آلؑ، ملائکہ مقربین اور انبیاء ومرسلین پر درود بھیجا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ فصیح وبلیغ خطبہ اس کے بعد کسی سے نہیں سنا گیا۔ اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

"امابعد! یا اهل الکوفه! فانسبونی فانظروا من انا! ثم ارجعوا الٰی انفسکم و عاتبوها فانظروا اهل یصلح لکم قتلیٰ و انتهاکُ حرمتی الستُ ابن نبیکم و ابن وصیه و ابن عمّهٗ و اول المومنین المصدّق لرسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله وسلم بما جآء بهٖ من عند ربّه اولیس حمزه سید الشهدا عمّ الیٰ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آله وسلم اولَیسَ جعفر الطیار فی الجنة بجناحین عمّی اولم یبلعکم ما قال لی و لاخی هٰذانِ سید اشباب اهل الجنّة فان صدقتمونی بما اقولُ و هو الحق و اللّٰهُ ما تعمدت کذباً مند علمت ان اللّٰه یمقُتُ علیه اهلهٗ ف ان کذبتمونی فان فیکم من ان اسئلتموهٗ عن ذالک اخبر کم سلُوا جابر بن عبداللّٰه انصاری و ابا سعید الخدری وَ سهل ابن سعد الساعدی و زید بن ارقم و ان بن مالک یخبرو کم انهم سمعوا هذا المقالة من رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و آلهٖ وسلّم لی و لاخی اما فی هٰذا حاجز لکم عن سفک ومی".

اے اہل کوفہ! میرے نسب پر غور کرو! اور دیکھوں میں کون ہوں اور پھر اپنے آپ کی طرف خیال کرو۔ یعنی مجھے کہ میں کون ہوں اور اپنے آپ کو دیکھو کہ تم کون ہو۔ پھر اپنی آپ ملامت کرو۔ کیا میرا قتل اور میری ہتک حرمت تمہیں روا ہے؟ کیا میں تمہارے پیغمبرؐ کا فرزند نہیں؟ کیا اس کے وصی اور چچازاد بھائی کا بیٹا نہیں؟ کیا میں اس کا فرزند نہیں جو سب سے پہلے رسولؐ اللہ پر ایمان لایا اور جو کچھ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کی؟ کیا جناب حمزہؓ جو اپنے زمانے کے سید الشہداء ہیں میرے والد کے چچا نہیں؟ کیا جعفر طیارؓ جو جنت میں اپنے دونوں پروں کے ساتھ پرواز کرتے ہیں، میرے چچا نہیں؟ کیا تمہارے کانوں میں رسولؐ خدا کی یہ حدیث نہیں پہنچی جو انہوں نے میرے اور میرے بھائی حسنؑ کے حق میں فرمائی تھی کہ یہ دونوں جنت کے جوانوں کے سردار ہیں؟

اگر تم اس کی تصدیق کرتے ہو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، جبکہ وہ بالکل حق ہے اور میں نے کبھی بھی دروغ گوئی نہیں کی،

اور اگر تم مجھے ان باتوں میں سچا نہیں سمجھتے تو ابھی وہ لوگ موجود ہیں اور زندہ ہیں وہ تمہیں بتا دیں گے اور میرے قول کی تصدیق کریں گے جنہوں نے خود رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ باتیں سنی ہیں۔ مثلاً جابر بن عبداللہ انصاریؓ، ابوسعیدؓ خدری، سہلؓ بن سعد ساعدی، زیدؓ بن ارقم اور انسؓ بن مالک سے دریافت کرو، وہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے یہ حدیث جنابِ رسولؐ خدا سے سنی ہے۔ جو انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے حق میں ارشاد فرمائی ہے۔

کیا اس میں میرے خون بہانے سے روکنے والی کوئی چیز نہیں؟ اس کے باوجود تم میرا قتل جائز جانتے ہو؟"

"یَا قَوْمِ فَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِنْ ذَالِکَ اَفَتَشُکُّوْنَ اِنِّیْ ابْنُ بِنْتِ نَبِیِّکُمْ فَوَاللّٰہِ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ابْنُ بِنْتِ نَبِیٍّ غَیْرِیْ فِیْکُمْ وَلَا فِیْ غَیْرِکُمْ وَ یُحکم اَتُطَالِبُوْنِیْ بِقَتِیْلٍ مِنْکُمْ قَتَلْتُہٗ اَوْ مَالٍ اِسْتَمْلَکْتُہٗ اَوْ بِقِصَاصٍ مِنْ جَرْحٍ. فَاَخَذُوْا لَا یکلمونہٗ".

"اے لوگو! اگر تمہیں میری ان فضیلتوں کے بارے میں شک ہے تو اس بارے میں تو کوئی شک نہیں کہ میں تمہارے پیغمبرؐ کی دختر کا بیٹا ہوں۔ خدا کی قسم! اس وقت مشرق و مغرب میں یعنی سارے جہان میں میرے سوا کوئی سبطِ نبی نہیں ہے۔ نہایت افسوس ہے۔ کیا میں نے تمہارا کوئی آدمی قتل کیا ہے یا کوئی مال غصب کیا ہے۔ جس کا مجھ سے مطالبہ کرتے ہو یا کسی کو زخمی کیا ہے۔ جس کا مجھ سے قصاص طلب کرتے ہو؟"

جب امام علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے تو فوجِ اشقیاء پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور لوگ ہمہ تن گوش ہو کر محوِ سماعت تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے قرآن مجید کھول کر سامنے رکھا ہوا تھا۔

ادھر تو خاموشی طاری تھی، مگر خیام میں کہرام مچا ہوا تھا کیونکہ امام علیہ السلام کا احتجاج اس قسم کا تھا کہ جس سے صاف معلوم ہوتا تھا آپؑ اب قتل کر دیے جائیں گے۔ کیونکہ اس قدر دلائل و ثبوت پیش کئے اور ایسا احتجاج کیا کہ اگر پتھر بھی کان اور دل رکھتے تو یہ کلام سن کر پانی ہو جاتے۔ یہود و نصاریٰ بھی ہوتے تو وہ بھی اس فعلِ شنیع سے باز آجاتے، لیکن یہ شام و عراق کے مسلمان ہی تھے جو بے رحمی اور سنگدلی میں بے مثال تھے۔

عاشور کا دن شہیدوں کی اللہ سے ملاقات کا پیغام لا چکا تھا اور ہر بی بی اپنے وارث، بھائی، بیٹے، بھتیجے اور بھانجے کے نورانی چہرے کو دیکھ کر آنسو بہا رہی تھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے قمرِ بنی ہاشمؑ اور حضرت علی اکبرؑ کو خیموں میں مخدرات

عصمت کو تسکین دینے کیلئے بھیجا کہ ان کے رُخِ انور دیکھنے سے بیبیوں کے بے چین دلوں کو قرار آ جاتا تھا۔ دراصل فوج میں یہی دو نوجوان ان کے اضطراب کا سہارا تھے۔ ان کی امنگوں کا مرکز اور حفاظت، عزت و ناموس کا اعتماد تھے۔ علاوہ ازیں ایک صورت پیغمبرؐ کی شبیہ تھی تو دوسرا ہمشکل علیؑ تھا۔ ان دونوں کی صورتیں خیام میں مخدرات کی تسکین کا باعث تھیں۔

یہ دونوں جوان گئے اور فرمانِ امام علیہ السلام خیام میں پہنچایا کہ ابھی رونے کا وقت بہت پڑا ہے، خاموشی و سکون اختیار کیجئے۔ یہ سنتے ہی سب پر خاموشی طاری ہوگئی اور امام علیہ السلام نے خطبہ جاری رکھا۔

آفرین ہے کہ پیاسی زبان سے اور بھوکے حلقوم سے اسی طرح بارعب الفاظ نکل رہے ہیں کہ ہزاروں کے مجمع میں ہر شخص امام علیہ السلام کا کلام سن رہا ہے اور سمجھ رہا ہے۔

امام علیہ السلام یہ خطبہ دونوں صفوں کے درمیان فوجِ اشقیاء کی طرف رخ کر کے بیان فرما رہے تھے۔ جب امامؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ کسی صورت میں بھی میرے قتل سے باز نہیں آتے، یہ دین فروخت کر کے دنیا خرید چکے ہیں، زر و دولت اور طمع جاگیر، ان کو میرے خون بہانے پر مصر کئے ہوئے ہے، تو آپؑ نے قرآن مجید کھول کر ان کے سامنے کیا اور فرمایا: ''میرے اور تمہارے درمیان یہ کتابِ خدا ہے۔ تم میں اس کے پڑھنے والے موجود ہیں۔ قرآن کی کس آیت سے میرا قتل روا سمجھتے ہو؟''

اس مقام پر شمر لعین نے کچھ نازیبا الفاظ کہے جس کا جواب مولا نے خاموشی سے دیا۔ البتہ حبیب ابن مظاہرؓ نے کہا کہ تو بڑا مکار و عیار ہے۔ تیرے دل و دماغ پر نفاق و ضلالت کی مہر لگ چکی ہے، تو امامِ عالی مقام علیہ السلام کا کلام سن رہا ہے لیکن سمجھتا نہیں۔

حضرت امام علیہ السلام نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے چند اشقیاء کو نام لے کر پکارا:

"یا شبعث بن ربعی یا حجارَ ابن ابحر یا قیس ابن الْاَشْعَث و یا یزیدَ بن الحارث اَلَمْ تَکْتُبُوْا اِلَیَّ اَنْ قَ اینعتِ الثمار وَ احضَر الجنانِ و اِنَّما تقدم علٰی جندلکَ مجنّد فاقبل".

''اے شبعث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث! کیا تم نے مجھے متواتر یہ خطوط نہ لکھے تھے کہ پھل پک چکے ہیں اور باغات سرسبز ہیں۔ آپ جلد تشریف لے آیئے، آپؑ کی حمایت کیلئے لشکر تیار ہو چکے ہیں''۔

شبعث بن ربعی نے جواب دیا:

''میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپؑ کیا کہہ رہے ہیں''۔

تاریخیں بیان کرتی ہیں کہ ان عہد شکن اور بے وفا کوفیوں نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ ہم نے ایسے کوئی خطوط نہیں لکھے تھے۔

شبعث بن ربعی نے یہ بھی کہا: ''آپ یزید بن معاویہ کی اطاعت کیوں قبول نہیں کر لیتے؟''

آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"لَا وَ اللّٰهِ لَآ اُعْطِيْكُمْ بِيَدِىْ اِعْطَآءَ الذَّلِيْلِ وَلَا اُقِرُّ لَكُمْ اِقْرَارَ الْعَبِيْدِ".

''خدا کی قسم! میں اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں ذلیل ہو کر بطور بیعت ہرگز نہ رکھوں گا اور نہ ہی غلاموں کی طرح اقرار کرنے کو گوارا کروں گا''۔

اس کے بعد آپ نے پھر پکار کر فرمایا:

"يَا عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَ رَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنَ وَ اَعُوْذُ بِرَبِّىْ وَ رَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ".

''میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ مانگی ہے کہ تم مجھے پتھروں کا نشانہ بناؤ اور اپنے اور تمہارے رب کی پناہ میں آتا ہوں ایسے متکبر کے شر سے جو روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتا''۔

اتنا فرما کر آپ نے عقبہ بن سمعان کو بلایا اور ناقہ بٹھا کر مہار اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اب آپ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے جس کا نام مرتجز ہے اور ذوالجناح کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد جناب زہیر بن قین نے خطبہ پڑھا اور اس میں کافی وعظ و نصیحت کی، مگر ان ازلی بدبختوں اور خبیث روحوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ فوجیں جنگ پر آمادہ ہوئیں۔

ہاں! اگر اثر ہوا تو اس سعید روح پر جو فوج ابن سعد میں جنت و دوزخ کے درمیان کھڑا کانپ رہا تھا اور دین یا دنیا میں کسی ایک کو اختیار کرنے کی سوچ رہا تھا۔ آخر کار اس کا ستارۂ اقبال چمکا اور سعادت نے اسے نصرت امامؑ پر آمادہ کر لیا۔

خدمتِ امامؑ میں جنابِ حرؑ کا حضور

اب ابن سعد نے جب دیکھا کہ زیادہ تاخیر کرنے سے فوج بگڑنے کا احتمال ہے تو اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرزند رسولؐ کی تقریر سے کچھ افراد متاثر ہو کر ہمیں چھوڑ جائیں۔ چنانچہ اس نے بلند آواز سے پکار کر اپنی فوج کو حملہ کرنے کا حکم

دے دیا۔

حر یزیدی لشکر کی تنظیمِ آمادگی قتال دیکھ چکا تھا اور خود بھی ایک دستہ کا افسر مقرر ہو چکا تھا۔ حضرت بریرؓ و زہیرؓ اور امام علیہ السلام کے خطبے بھی سن چکا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان مصلحانہ کوششوں اور ناصحانہ باتوں کا جواب طعنوں، گالیوں اور تیروں سے دیا جا رہا ہے اور اب حسینیؑ جماعت پر حملے کی پوری تیاری ہو چکی ہے۔ زیادہ ضبط نہ کر سکا۔ عمر بن سعد کے پاس جا کر پوچھنے لگا:

''اَتُقَاتِلُ اَنْتَ هٰذَا الرَّجُلَ''.

''کیا واقعی تم ان سے جنگ کرنا چاہتے ہو؟''

عمر بن سعد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

''اِیْ وَاللّٰہِ قتالاً اَیْسَرُہٗ اَنْ تَسْقُطَ الرُّؤُس و تطیح الْاَیْدِیْ''.

''ہاں خدا کی قسم! ضرور لڑوں گا اور ایسا لڑوں گا کہ سر کٹ کر گر پڑیں گے اور ہاتھ بدنوں سے جدا ہو جائیں گے''۔

اس کے بعد حُر واپس آ گئے اور دوزخ کو چھوڑ کر جنت میں جانے، باطل سے علیحدہ ہونے، حق کی رفاقت، ظلم سے کنارہ کر کے مظلوم کی نصرت کا آپ نے پختہ ارادہ کر لیا۔ حُر کی روحِ سعید اسے مکمل فیصلہ سنا چکی تھی اور اس حُر اس فیصلے پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس نے دل میں خیال کیا کہ اگر اسی وقت، اسی جگہ اپنے فیصلے کا اظہار کر دوں تو ہو سکتا ہے یہ لوگ مجھے یہیں سے گرفتار کر لیں اور میں نصرتِ امام علیہ السلام اور رتبہ شہادت سے محروم رہ جاؤں۔

اسی اثناء میں اس کے قبیلہ کا ایک آدمی قرۃ بن قیس اس کے قریب آیا۔ حُر نے اس سے کہا: ''تو نے گھوڑوں کو پانی نہیں پلایا؟'' اس نے کہا: ''نہیں'' حر نے کہا: ''کیا پانی پلانے کا ارادہ نہیں ہے؟'' قرۃ یہ سمجھ گیا کہ حُر کو میرا قریب رہنا گوارا نہیں، وہ ہٹ گیا۔ حُرؓ نے اپنا گھوڑا الگ کر لیا۔ قرۃ سمجھا کہ شاید پانی کیلئے جا رہا ہے۔

مہاجر بن اوس ابن سعد کا ایک آدمی ہے، اس کا بیان ہے کہ: ''میں نے دیکھا، حُر کا بدن کانپ رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ جنگ کا نقشہ دیکھ کر ڈر گیا ہے۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھا:

''حر! خلافِ معمول آج میں تمہاری کیا حالت دیکھ رہا ہوں؟ تم تو شجاعانِ عرب کے سرمایہ ناز اور دلیرانِ عراق کے مایہ اعزاز ہو۔ کئی لڑائیوں میں آپ کے ساتھ شامل رہا مگر کسی معرکے میں آپ کی ایسی حالت میں نے نہیں دیکھی جیسی آج دیکھ رہا ہوں؟''

حُر کچھ آگے بڑھ گئے اور وہیں سے جواب دیا: ''میرے قلبی انتشار اور ذہنی اضطراب کی وجہ یہ ہے کہ میں حق و باطل اور

جنت وجہنم اختیار کرنے میں متردد تھا۔ اب میں نے حق کی حمایت اور نصرتِ امام علیہ السلام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ دوزخ کا کنارہ چھوڑ کر جنت کی طرف جارہا ہوں، ظالموں سے الگ ہوکر مظلوموں کی صف میں مل رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر حُر آگے بڑھ کر رفیقانِ امام حسین علیہ السلام میں شامل ہوگئے۔ ملاح کو انتظار تھا، اب کشتی نجات کا آخری سوار بھی شامل ہوگیا۔ جنابِ حُر بارگاہِ امام علیہ السلام کی طرف جارہے تھے۔ انہیں اپنی بے اعتدالیاں یاد آرہی تھیں، جو جو زیادتیاں حُر نے امام علیہ السلام پر ابن زیاد کے خوف سے کی تھیں، ان پر پشیمان ہورہے تھے۔ چنانچہ گھوڑے پر سوار جارہے تھے، سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور یہ الفاظ ان کی زباں پر جاری تھے:

"اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَنَبْتُ فَتُبْ عَلَیَّ فَقَدْ اَرْعَبْتُ قُلُوْبَ اَوْلِیَائِکَ وَ اَوْلَادِ بِنْتِ نَبِیِّکَ".

''اے اللہ! میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، میری توبہ قبول فرما۔ کیونکہ میں نے تیرے اولیاء کے دل اور تیرے پیغمبرؐ کی بیٹی کی اولاد کے دل ڈرائے ہیں''۔

سپاہِ حسینؑ کے قریب پہنچ کر حُر نے ڈھال بدل دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ جنگ کے ارادے سے نہیں آرہے، چنانچہ کسی نے رکاوٹ نہ کی۔

جب حُرؑ امامؑ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو گھوڑے سے اتر کر امام علیہ السلام کے قدموں پر گر پڑے اور عرض کی: ''مولاؑ! معافی کا طلبگار ہوں، میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ آپ کریم ابن کریم ہیں، میں سچے دل سے اپنے مظالم کی معافی کا طالب ہوں۔ کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟''

مولاؑ نے بہ کمالِ شفقت ورحمت فرمایا:

"مَنْ تَکُوْنُ اِرْفَعْ رَاسَکَ؟"

''تو کون ہے؟ اپنا سر تو اونچا کر!''

حُر نے سر اٹھایا، آستانِ مقدس کے بوسے لئے اور عرض کیا:

''فرزندِ رسولؐ! آپ پر قربان ہوجاؤں، میں وہی حُر ہوں جس نے آپ کا راستہ روکا اور آپ کو واپس نہ جانے دیا''۔

حُر سر کو جھکائے ہوئے اپنی غلطیاں بھی شمار کررہا تھا اور زاروقطار رو بھی رہا تھا۔ اپنے جرائم پر پشیمان ہوکر کہہ رہا تھا:

''مولاؑ! آپ کی شانِ کریمی یہ ہے کہ آپ نے مجھے اور میرے لشکر کو ہمارے گھوڑوں سمیت پانی سے سیراب کیا لیکن

میری گستاخی یہ ہے کہ میں نے آپؑ کو دریا کے نزدیک نہ اُترنے دیا، جس کی وجہ سے آلِ رسولؐ پیاس سے بیتاب ہے۔ میں نے آپؑ کو گھیر کر کربلا کے چٹیل میدان میں اتارا۔ میں نے بتولؑ زادیوں کے دل ڈرائے، بنی ہاشم کی مستورات اور کمسن بچوں کو جنگل میں اتارا، میری وجہ سے ان کے دل گھبرائے۔ اگر میں آپؑ کا راستہ نہ روکتا تو اولادِ رسولؐ بیابانوں میں پریشان حال اور پیاسی نہ رہتی۔

مولاؑ! آپؑ میری وجہ سے دشمنوں میں گھر گئے ہیں۔ میں اپنے جرائم کا اقرار کرتا ہوں۔ مولاؑ! میں اس لائق نہیں کہ آپؑ کو دیکھ بھی سکوں۔ میرا خیال تھا کہ لڑائی تک نوبت ہی نہ آئے گی اور مصالحانہ تجویزیں کامیاب ہو جائیں گی۔

مولاؑ! کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟"

مولاؑ نے فرمایا:

"نَعَمْ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَيْكَ".

"ہاں اللہ تیری توبہ کو قبول فرمائے گا"۔

مثیر الاحزان کی ایک روایت ہے کہ حُرؑ نے خدمتِ امام علیہ السلام میں یہ بھی عرض کیا:

"یا فرزندِ رسول اللہ! جس روز عبید اللہ ابن زیاد نے مجھے آپؑ کی طرف روانہ کیا اور میں اس کے محل سے باہر نکلا تو میرے پیچھے سے آواز آئی: اے حُر! تجھے خیر و خوبی کی خوشخبری ہو! میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کسی کو نہ پایا۔ میں حیران ہوا کہ یہ خوش خبری کیسی؟ میں تو فرزندِ رسولؐ کے ساتھ لڑنے جا رہا ہوں۔ اس وقت مجھے آپؑ کی اطاعت و نصرت کا کوئی خیال نہ تھا۔ لیکن اب اس خوشخبری کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میرے اقدام کا آغاز برا تھا لیکن انجام اچھا نکلا"۔

امامِ عالی مقام علیہ السلام نے فرمایا:

"لَقَدْ اَصَبْتَ اَجْراً وَّ خَيْراً".

"یقیناً تو نے اجر اور بھلائی کو حاصل کر لیا ہے۔"

کسی شاعر نے جنابِ حُرؑ کے متعلق کیا ہی خوب کہا ہے:

نار سے نوری ہوئے اللہ رے واہ نصیبِ حُر
خوبیِ قسمت کو اکسیر طلاء ملتا نہیں

حضرتِ حُرؑ کا فوجِ یزید کو نصیحت کرنا

حُرؑ نے خطائیں معاف کروانے کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام سے اذنِ جہاد طلب کیا اور عرض کی:

''مولاؑ! سب سے پہلے میں نے ہی آپؑ کا مقابلہ کر کے راستہ روکا ہے۔ اب چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے میں ہی آپ پر جان قربان کروں۔''

مولاؑ نے اجازت عطا فرمائی۔ حُر لشکرِ ابن سعد کی طرف بڑھے اور اہلِ کوفہ کو یوں خطاب کیا:

''اے اہلِ کوفہ! تمہاری مائیں تمہارے سوگ میں بیٹھیں اور تم پر روئیں۔ تم نے اس عبدِ صالح کو بلایا، جب وہ تمہارے پاس آگئے تو تم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کے دشمنوں کے مددگار ہو گئے۔ حالانکہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر جہاد کرو گے۔ اب وہ تمہارے ہاتھوں اسیر ہیں اور تم نے ان کے تمام اہلِ بیت اور ساتھیوں کو فرات کے بہتے ہوئے پانی سے روک دیا ہے، جس سے تمام یہود و نصاریٰ اور مجوس سیراب ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کتے اور سور بھی اس کا پانی پیتے ہیں اور ایک آلِ محمدؐ غریب ہیں کہ پیاس کے صدموں سے گرے پڑتے ہیں۔ تم نے جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ان کی اولاد سے بہت برا سلوک کیا ہے۔ خدا تمہیں قیامت کے پیاس والے دن سیراب نہ کرے گا''۔

عمر بن سعد کی طرف سے جنگ کا آغاز اور افواج امام حسینؑ پر پہلا حملہ

جب حُر کا پہلا کلام ختم ہوا تو لوگوں نے جواب میں تیر چلائے۔ یہ حالت دیکھ کر حُرؒ نے تقریر بند کر دی اور واپس آ کر خدمت امام علیہ السلام میں کھڑے ہو گئے۔

سورج کافی بلند ہو چکا تھا اور دھوپ تیز ہو چکی تھی۔ عمر بن سعد جنگ چھیڑنے میں جلدی کرنا چاہتا تھا۔ جنابِ حُرؒ کی پرجوش تقریر سن کر اس نے اپنے غلام درید کو حکم دیا:

"یَا دُرِیْدُ! اُدْنِ رَایَتَکَ".

"اے درید لشکر کا علم قریب لاؤ۔"

اس نے علم قریب کیا۔ پھر پسر سعد نے اپنا تیر کمان کے چلّہ پر چڑھایا اور زور سے اصحابِ حسینؑ کی طرف پھینکا اور ساتھ ہی اپنی فوج کو کہا:

"اَشْهِدُوْا اِنِّیْ اَوَّلُ مَنْ رَمَا".

"تم گواہ رہنا کہ سب سے پہلے تیر میں نے چلایا ہے۔"

عمر ابن سعد کا تیر پھینکنا تھا کہ سینکڑوں کمانیں کڑکیں، ہزاروں تیر چلّوں پر چڑھے اور تیروں کی بارش ہونے لگی۔ یہ پہلا حملہ تھا جس کا آغاز عمر ابن سعد نے تیر چلا کر کیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب باوفا سے کہا:

"قُوْمُوْا رَحِمَکُمُ اللّٰهُ اِلَی الْمَوْتِ الَّذِیْ لَا بُدَّ مِنْهُ فَاِنَّ هٰذِهِ السِّهَامَ رُسُلُ الْقَوْمِ اِلَیْکُمْ".

"خدا تم پر رحمت کرے! موت کی طرف بڑھو، موت سے کوئی چارہ نہیں۔ یہ تیر درحقیقت قومِ اشقیاء کے قاصد ہیں جو تمہاری طرف موت کا پیغام لائے ہیں"۔

تیروں کی اس برسات کا اصحابِ حسینؑ نے سینہ تان کر مقابلہ کیا اور اذنِ جہاد ملتے ہی تیروں کا جواب تیروں سے دیا۔

ایک گھنٹہ تک یہ جنگ جاری رہی۔ انصارِ حسینی کی تعداد تھوڑی تھی اور اس طرف سے ہزاروں کمانیں تیر برسا رہی تھیں۔ جب جنگ کا پہلا مرحلہ ختم ہوا اور غبارِ جنگ چھٹا تو معلوم ہوا کہ پچاس کے قریب اصحاب امام حسین علیہ السلام جامِ شہادت نوش فرما چکے ہیں۔

یہ کیفیت دیکھ کر سرکار سید الشہداءؑ نے اپنی ریشِ مقدس پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''خدا کا غضب یہودیوں پر اس وقت سخت ہوا جب کہ انہوں نے حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا بنایا اور نصرانیوں پر جب انہوں نے تین خدا بنائے اور خدا کو تیسرا قرار دیا اور مجوسیوں پر اس کا قہر اس وقت شدید ہوا جب کہ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر سورج اور چاند کی عبادت کی اور خدا کا قہر و غضب اس قوم پر سخت ہوا جس نے اپنے نبی کے فرزند کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ خدا کی قسم! جو بات یہ چاہتے ہیں میں ہرگز قبول نہ کروں گا یہاں تک کہ اپنے بالوں کو خون کا خضاب لگا کر بارگاہِ خدا میں حاضر ہو جاؤں''۔

مبارز طلبی کی جنگ
(عبداللہ بن عمیر کلبی)

حملہ اولیٰ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد باقاعدہ مبارز طلبی ہوتی رہی اور ایک ایک کا مقابلہ ہوتا رہا۔ سپاہِ ابن سعد سے سب سے پہلا لعین جو میدانِ کارزار میں مبارز طلب ہو کر نکلا وہ یسار، زیاد بن ابی (عبید ابن زیاد کے باپ) کا غلام تھا۔ وہ میدان میں آ کر للکارنے لگا۔ اس کے جواب میں حسینی جماعت سے جنابِ عبداللہ بن عمیرؓ امام علیہ السلام سے اذنِ جہاد لے کر اس کے مقابلہ پر نکلے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ عبداللہ بن عمیرؓ کے مختصر حالات قارئین کی معلومات میں اضافہ کیلئے درج کر دیئے جائیں۔

اس پاک طینت صحابی کا نام عبداللہ بن عمیرؓ ہے، خاندان کے لحاظ سے کلبی کہلاتے ہیں اور کنیت ان کی ابو وہب ہے۔ کوفہ میں محلہ بنی ہمدان کے قریب رہائش تھی۔

ایک روز کوفہ سے باہر مقام نخیلہ پر لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا۔ جنابِ عمیرؓ نے دریافت کیا کہ اس قدر کثیر تعداد میں لوگوں کے اجتماع کا کیا مقصد ہے۔ کیا کوئی معرکہ آرائی ہے۔ جواب ملا:

''ہاں! ایک جنگ کی مہم درپیش ہے، اس کے لیے ایک لشکر جرار اکٹھا کیا جا رہا ہے''۔

عبداللہؓ نے دریافت کیا: ''کس کے خلاف اور کس کے مقابلے کے لیے؟'' جواب ملا:

''دخترِ رسولؐ جنابِ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کے فرزند حسین ابن علی علیہما السلام کربلا میں گھر گئے ہیں، ان کے

مقابلے کے واسطے، اولادِ رسولؐ کو قتل کرنے اور باغِ بتولؑ تاراج کرنے کیلئے۔"

عبداللہ بن عمیرؓ جنابِ امیر المومنین علیہ السلام کے مخلص صحابی تھے اور پہلے بھی ان کے ساتھ کئی لڑائیوں میں رفاقت کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ یہ سن کر دم بخود رہ گئے۔ قرار نہ رہا اور بے چین ہو کر گھر کی طرف پلٹے۔ خاندانِ رسالت کا یہ شیدائی اور امیر المومنینؑ کا فدائی دل میں خیال کرتا ہے کہ سعادت نے یہ موقع بخشا ہے اور خوش نصیبی نے یہ دن دکھایا ہے۔ آج فرزند رسولؐ کی حمایت اور اولادِ بتولؑ کی نصرت میں جان پیاری نہ کر!

گھر آئے اور اپنی نیک بخت بیوی ام وہب سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس سعادت مند زوجہ نے اس کے ارادے کی تائید کی اور اس کے نیک اقدام کو سراہتے ہوئے اپنی ہمراہی کی بھی خواہش کی کہ حسینؑ تنہا نہیں، مخدراتِ طہارت بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ اس واسطے تو حسین علیہ السلام پر جان قربان کر اور میں بتولؑ زادیوں کی خدمت کا شرف حاصل کروں گی۔ چنانچہ جنابِ عبداللہؓ اپنی نیک شعار بیوی کو ہمراہ لے کر آٹھویں محرم کی شب کو امام حسین علیہ السلام کی خدمت مبارک میں پہنچ گئے۔

زیاد کے غلام یسار نے جب سپاہِ حسینیؑ کو للکارا اور مقابلہ کیلئے مقابل طلب کیا تو اس کے مقابلہ میں امام علیہ السلام سے اذنِ جہاد لے کر یہ اپنے لشکر سے نکلے۔

یسار نے ابن عمیرؓ سے حسب و نسب دریافت کر کے غرور و نخوت کے نشہ میں کہا:

"میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ تم چلے جاؤ اور اپنی جگہ زہیرؓ بن قین یا حبیبؓ بن مظاہر کو بھیجو۔"

عبداللہ بن عمیرؓ نے کہا: "او پسر زانیہ کے غلام!"

سالم نے جب یہ حال دیکھا تو یسار کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ اتنے میں انصارانِ حسین علیہ السلام نے جنابِ عبداللہ کو آواز دی: "حریف تیرے پیچھے سے آتا ہے، ہوشیار ہو جا!"

سالم نے قریب آتے ہی جنابِ عبداللہؓ پر حملہ کر کے ان کی انگلیاں کاٹ دیں۔ جنابِ عبداللہؓ نے پلٹ کر زخمی حالت میں سالم پر ایسا وار کیا کہ وہ ملعون مقتول ہو کر زمین پر آ رہا۔ جب یہ دونوں نابکار غلام، ایک باپ (زیاد بن ابیہ) کا اور دوسرا بیٹے (عبیداللہ بن زیاد) کا، راہیِ جہنم ہو گئے تو جنابِ عبداللہؓ رجز یہ اشعار پڑھنے لگے۔ آپؓ کی زوجۂ گرامی یہ اشعار سن کر گرز ہاتھ میں لے کر یہ کہتی ہوئی نکلیں:

"فِدَاکَ اَبِیْ وَ اُمِّیْ! قَاتِلْ دُوْنَ الطَّیِّبِیْنَ ذُرِّیَّتَ مُحَمَّدٍ".

"میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں! ذریتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے خوب لڑو"۔

جب ان کی زوجہ میدانِ جنگ میں آئیں تو عبداللہؓ نے ہر چند انہیں واپس کرنا چاہا مگر وہ نہ مانیں اور جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر یہ کہا:

''تیرے ساتھ ہی میں بھی جامِ شہادت نوش کروں گی''۔

مگر امام علیہ السلام کی نصیحت سے وہ پاکباز مؤمنہ واپس خیمے میں لوٹ آئی۔ جنابِ عبداللہؓ کے مقابلے میں جب کوئی مبارز نہ نکلا تو آپ بھی واپس خدمتِ امام علیہ السلام میں آگئے۔

تھوڑی دیر کے بعد شمر بن ذی الجوشن نے فوج کے میسرہ سے سپاہِ حسینیؑ پر حملہ کیا۔ جس کا مقابلہ اصحابِ امام علیہ السلام نے نہایت دلیری اور جوانمردی کے ساتھ کیا۔ اس جنگِ مغلوبہ میں جنابِ عبداللہ بن عمیرؓ نے پھر خوب دادِ شجاعت دی۔ دشمنِ بے دین کے دو سپاہیوں کو واصلِ جہنم کیا اور خود ہانی بن ثبیت حرزمی اور بکر بن حی تیمی کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

جنابِ حُرؓ بن یزید الرّیاحی کی جنگ اور شہادت

جنابِ حُرؓ امام علیہ السلام سے اذنِ جہاد لے کر میدانِ کارزار میں جہاد کیلئے نکلے۔ چونکہ دستور تھا کہ جو بہادر میدانِ جنگ میں نکلتا تھا، اپنی شجاعت اور خاندان پر فخر کرتا ہوا رجز یہ اشعار پڑھتا تھا۔ حضرتِ حُرؓ اس وقت یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

انی انا الحرّ و ماوىٰ الضَّيفِ
اَضرِبُ فی اَعْناقِکُم بِاالسَّیفِ
عَنْ خیرمَنْ حَلَّ بِاَرْضِ الْخَیفِ
اَضرِبکم وَلا اَریٰ مِنْ خَیفِ

''میں ہی حُر ہوں اور مہمان کی پناہ گاہ ہوں۔ تمہاری گردنوں پر تلوار چلاؤں گا اور پوری طرح دفاع کروں گا اس سے جو خوفناک زمین پر اترا ہوا ہے، میں تمہیں تلوار کی ضرب لگاؤں گا اور کوئی خوف محسوس نہ کروں گا''۔

جنابِ حُر نرغۂ اعداء میں تنہا، جہاد کر رہے تھے، گھوڑا زخموں سے چور ہو چکا تھا، اس وقت آپؓ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

مَاذِلْتُ اَرْمِیھِم بثغرَۃِ نَحرِہٖ
وَلبانِہٖ حتیٰ تُرمّلُ بالدّمٖ

''میں دشمنوں کو اپنے گھوڑے کی گردن اور سینے سے برابر تیر مارتا رہا۔ یہاں تک کہ گھوڑا خون سے نہلا گیا''۔

جنابِ حُرؒ نے تقریباً چالیس ناریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حصین بن تمیم نے یزید بن ابوسفیان تمیمی سے کہا: "یہی حُرؒ ہے جس کے قتل کی تم آرزو رکھتے ہو؟"

یہ سن کر یزید حُرؒ کے مقابلے کو نکلا۔ یزید نے از راہِ غرور و تکبر جنابِ حُرؒ سے کہا: "کیا تم میرے مقابلہ کرو گے؟" جنابِ حُرؒ نے کہا: "ہاں! کروں گا۔" اس کے بعد حُرؒ نے ایسا وار کیا کہ یزید اپنے خون میں لوٹنے لگا۔ حصین بن تمیم کا بیان ہے: "یزید کو موت ہانک کر حُرؒ کے سامنے لائی تھی"۔

جب کافی دیر تک حُرؒ کے مقابلے کے لیے کوئی میدان میں نہ آیا تو حُرؒ واپس آئے اور جنابِ امام حسین علیہ السلام کے انصاران کی صف میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

ابن سعد نے حصین بن تمیم کو آواز دی اور اس کی مدد کے لیے پانچ سو تیر انداز روانہ کئے۔ وہ جماعت حسینی کی طرف بڑھے اور تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اصحابِ حسینؑ نے بھی کمانیں سنبھال لیں اور تیروں سید ھا دشمن کی طرف کر دیا اور ان شیرانِ بیشہ شجاعت نے وہ تیر اندازی کی کہ دشمنوں کے گھوڑے آگے نہ بڑھ سکے۔

جنابِ حُرؒ دوبارہ جذبہ شہادت سے سرشار ہو کر میدانِ جہاد میں نکلے۔ اس وقت تک جنابِ حُرؒ چالیس اور ایک روایت کے مطابق اسی آدمیوں کو واصل جہنم کر چکے تھے۔ ایوب بن مشرح حیوانی نے آگے بڑھ کر حُرؒ کے گھوڑے کی باگیں کاٹ دیں۔ جنابِ حُرؒ بپھرے ہوئے شیر کی مانند جست لگا کر گھوڑے سے کود پڑے اور پیادہ پا لڑنے لگے۔ کچھ دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ جنابِ حُر کی شجاعت اور فنِ حرب کا منظر دیکھ کر عمر بن سعد کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے فوراً کمانداروں کے دستے بلائے اور اشقیاء پُرا باندھ کر حضرتِ حُرؒ پر تیر چلانے لگے۔

حضرتِ حُرؒ نرغۂ اعداء میں گھر گئے۔ تیروں کی برسات میں حضرتِ حُرؒ کا بدن زخموں سے چور اور لہولہان ہو گیا۔ آخر یہ مردِ غازی زخموں سے بیتاب ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اصحابِ امام علیہ السلام یہ منظر دیکھ کر حُرؒ کی جانب دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ خاک و خون میں غلطاں امام کا یہ فدائی زندگی کی آخری منزل میں ہے۔ اصحابِ امام حُرؒ کو اٹھا کر جناب آقائے مظلومؑ کی خدمت میں لے آئے۔ ابھی جان باقی تھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے خاص مہمان کے چہرے کو اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے اور روتے ہوئے فرماتے ہیں: "حُرؒ! تیری ماں نے تیرا نام صحیح رکھا۔"

"وَاللّٰهِ مَا اَخْطَئَتْ اُمُّکَ حَیْثُ سَمَّتْکَ حُرًّا وَاللّٰهِ اِنَّکَ حُرٌّ فِی الدُّنْیَا

والآخِرَة".

"حُر! تیری ماں نے تیرا نام حر رکھنے میں غلطی نہیں کی، تو دنیا و آخرت میں حر ہے، تو نارِ جہنم سے آزاد ہے"۔

یہ تائب اور لحظہ بھر کا ساتھی اپنی جان قربان کر کے راہیٔ جنت ہوا۔

جنابِ وہبؓ بن حباب الکلبی

بعض مؤرخین نے وہبؓ بن عبداللہ کلبی تحریر کیا ہے، مگر اکثر مؤرخین نے ان کے والد کا نام حباب لکھا ہے۔ یہ میدانِ کربلا میں انصارِ امام حسین علیہ السلام میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ اور زوجہ بھی تھیں۔ ان کی شادی کو صرف سترہ دن ہوئے تھے کہ یہ سعادتمند جوان ناصرانِ امام علیہ السلام میں شریک ہو گیا۔

یہ جاں نثار جب نصرتِ امام علیہ السلام کے لیے آمادۂ قتال ہوا تو ان کی زوجہ دامن گیر ہوئیں اور کہا:

"جب تو میدانِ جنگ میں جانثاری کے لیے آمادہ ہے تو میں کہاں جاؤں گی؟"

اس نے کہا: "تو موت کے منہ میں نہ جا اور مجھے بے وارث نہ کر!"

وہبؓ کی والدہ ولائے اہلِ بیتؑ سے سرشار تھیں اور محبت اولادِ علیؑ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر کے سرخروئی حاصل کرنا چاہتی تھیں اور وہب کو تلقین کر رہی تھیں:

"بیٹا خبردار! بیوی کی باتوں میں نہ آ جانا! ایسا زریں موقع کسی خوش نصیب کو حاصل ہوتا ہے۔ بیٹا! دیکھ رہے ہو کہ شدتِ پیاس اور اعداء کے ہجوم سے آلِ رسولؐ کا کیا حال ہو رہا ہے۔ ہمارے آقا اس وقت سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔ یہ جان چرانے کا وقت نہیں بلکہ جان قربان کرنے کا وقت ہے"۔

بہر حال وہبؓ کی والدہ انہیں جان قربان کرنے کی نصیحت کر رہی تھیں اور زوجہ ان کی زندگی کی آرزومند تھیں۔ آخر کار جناب وہبؓ نے والدۂ مہربان کی نصیحت پر عمل کیا اور رُتبہ شہادت پانے کیلئے آمادہ ہو گئے۔ ان کی زوجہ نے جب اپنے شوہر کے عزم بالجزم کو دیکھا تو ان کا دامن پکڑ کر کہا: "مجھے یقین ہے کہ تُو نصرتِ امام علیہ السلام میں شہید ہو جائے گا اور میرا سہاگ اجڑ جائے گا۔ تو راہیٔ جنت ہوگا مگر میں بے وارث رہ جاؤں گی۔ اس واسطے تو خدمتِ امام علیہ السلام میں چل کر دو باتوں کا مجھ سے وعدہ کر!"

چنانچہ ان کی زوجہ ان کو لے کر خدمتِ امام علیہ السلام میں حاضر ہوئیں اور آپؑ سے عرض کی: "حضور! میں دو باتیں

چاہتی ہوں۔ ایک تو یہ کہ میرا شوہر عنقریب مجھے داغِ مفارقت دے جائے گا۔ یہ تو بحرِ شہادت عبور کر کے سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ نیزوں اور تلواروں کے زخم کھا کر خدمتِ رسولؐ میں پہنچ جائے گا، مگر میرا اس غریب الوطنی میں کون مونس و غمگسار ہوگا؟ اس واسطے حضور مجھے اہلِ حرم کی کنیزی کا شرف بخشیں۔ میں ان کی خدمت میں رہ کر ان کی رفاقت کی سعادت حاصل کروں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ میرا شہید شوہر داخلِ بہشت ہو کر حورانِ جنت کی صحبت میں مجھ کو بھول جائے گا۔ اس سے یہ اقرار لیا جائے کہ مجھے بہشت میں فراموش نہ کرے گا''۔

جب مولا علیہ السلام نے اس بی بی کی باتیں سنیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: ''اے نیک بی بی! تیری یہ دونوں باتیں پوری ہوں گی''۔

ماں پہلے ہی آمادۂ جہاد کر چکی تھی اور اب بیوی کی طرف سے بھی رضامندی ظاہر ہو گئی۔ اس سے قول و قرار کر کے یہ تازہ شادی شدہ جوان ابھی بہاروں سے سیر نہ ہوا تھا کہ عروسِ موت کو گلے لگانے کے لیے ہتھیار بدن پر سجا کر اذنِ امامؑ لے کر میدانِ کارزار کی طرف بڑھا۔ میدانِ کارزار میں ان کا رجز یہ تھا:

ان تنکرونی فانا بن الکلب
سَوف ترونی و ترون الضربی
وَحَملتی و صولتی فی الحرب
اَدرکُ ثارِی بعد ثار صحبی

یہ اشعار پڑھ کر وہبؓ نے فوجِ اشقیاء پر اپنی تلوار سے حملہ کیا اور بہت سے ملاعین کو فی النار کیا۔ اس کامیاب لڑائی کے بعد اپنی مہربان ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''اماں! میری ان خدمتوں سے آپ راضی ہیں؟ میری اس لڑائی پر آپ خوش ہیں؟'' خوش عقیدہ اور محبِ اہلبیتؑ ماں نے جواب دیا:

''مَا رَضِیتُ اَوْ تُقْتَلُ بَیْنَ یَدَیِ الْحُسَیْنِ عَلَیْهِ السَّلَام''.

''بیٹا! میرا مقصد یہ تو نہیں تھا کہ تو چند ملاعین کو مار کر زندہ واپس آ جائے۔ بیٹا! میں تو اس وقت خوش ہوں گی جب تو لڑتے لڑتے امام علیہ السلام پر اپنی جان قربان کر دے۔ بیٹا! میری آنکھیں تو اس وقت ٹھنڈی ہوں گی جب تیری خون آلود لاش دیکھوں گی اور میں شہید کی ماں کہلاؤں گی''۔

جنابِ وہبؓ دوبارہ میدانِ جنگ میں رجز پڑھتے ہوئے داخل ہوئے اور دائیں بائیں پر زور حملے کرنے لگے۔ اصحابِ حسین علیہ السلام اس شان سے میدانِ جہاد میں قتال کرتے تھے کہ بڑے بڑے دلیروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ بھوک اور پیاس کی شدت کے باوجود اس طرح فوجِ اشقیاء پر حملے کرتے جس طرح گرسنہ شیر شکار پر جھپٹتا ہے۔

یہی حال جنابِ وہبؓ کا تھا۔ گو بدن متواتر بھوک و پیاس سے کمزور تھا، مگر دل طاقتور تھا، حوصلہ بلند تھا، ارادہ مضبوط تھا۔ دم کے دم میں بارہ پیادوں اور تیس سواروں کو بے دم کر دیا۔ اسی اثناء میں ایک شخص نے وہبؓ کا دایاں بازو قلم کر ڈالا۔ وہبؓ نے بائیں ہاتھ میں تلوار سنبھال کر حملہ کر دیا اور استقلال سے یہ مردداد شجاعت دیتا رہا۔ اس دوران ایک ظالم نے وہبؓ کا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا اور وہبؓ دونوں ہاتھوں سے محروم ہو گئے۔

وہبؓ کی زوجہ اپنے شوہر نامدار کی لڑائی دیکھ رہی تھیں۔ جونہی انہوں نے اپنے شوہر کو دونوں ہاتھوں سے محروم دیکھا اور وہبؓ کی بے بسی اور اس خونیں منظر پر نگاہ کی، جوشِ محبت اور شوہر کی نصرت میں خیمہ کی چوب لے کر نکلیں۔ اپنے سرتاج کا حوصلہ بڑھاتی جاتیں اور کہتی جاتیں: ''جس قدر ہو سکے نصرتِ امامؑ کیے جاؤ اور ان ظالموں کو اہل بیتِ پیغمبرؐ کے نزدیک نہ آنے دو''۔

سبحان اللہ! کیا حق رفاقت اور جذبہ محبت گامزن ہے کہ ایک وقت تو میدانِ جنگ میں جانے سے روکتی ہیں اور اب جہاد پر اُبھار رہی ہیں۔ چنانچہ وہبؓ نے یہی کہا۔ اس اطاعت شعار بی بی نے جواب دیا:

''میں نے آلِ رسولؐ کی غربت اور مظلومی دیکھی۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ امامِ مظلوم علیہ السلام کا استغاثہ، خورد سال بچوں کی پیاس، اہلِ حرم کے پریشان بال اور غمناک صورتیں دیکھیں تو زندہ رہنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ نصرتِ اہلِ بیتؑ میں لڑ کر شہید ہو جاؤں۔ میں بھی تیرے ساتھ اس خاک و خون میں لوٹوں گی''۔

جنابِ وہبؓ نے غیرت کے مارے بی بی کو واپس خیمہ میں جانے کو کہا کہ تجھے لڑائی کی اجازت نہیں۔ جب وہبؓ نے بی بی کا اصرار دیکھا تو امام حسین علیہ السلام کو آواز دی۔ آقائے مظلومؑ نے زوجہ وہب کو بلایا اور فرمایا:

''جُزِیْتُمْ مِنْ اَهْلِبَیْتٍ خَیْرَ الْجَزَاءِ اِرْجِعِیْ اِلَی النِّسَآءِ بَارَکَ اللّٰهُ فِیْکِ فَاِنَّهٗ لَیْسَ عَلَیْکُنَّ قِتَالٌ''.

''تمہیں اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے نیک جزاء حاصل ہو، اللہ تجھے برکت عطا فرمائے، تو زنانِ اہل بیتؑ کی طرف لوٹ جا اور انہیں میں جا کر بیٹھ کیونکہ عورتوں پر جہاد نہیں۔''

آخر کار اس نیک دل خاتون کے جذبات کم ہوئے اور شہادت کی آرزومند خاتون واپس ہوئیں، لیکن اس بیقرار بی بی

کی نگاہ میدان کی طرف ہی رہی۔ جب اپنے شوہر کو خاک وخون میں لوٹتے اور اپنے سہاگ کو اجڑتے دیکھا تو خیمہ میں ٹھہر نہ سکیں۔ بیتاب ہو کر خیمہ سے نکلیں اور شوہر کی لاش پر پہنچ کر نئے دولہا کا سر آغوش میں لیا۔ جس چہرے پر کبھی پھولوں کی بہار تھی، اب خاک وخون میں غلطاں تھا۔ پریشان بال خاک آلود تھے۔

سترہ روز کی بیاہی دلہن نے کس دل سے شوہر کی لاش دیکھی ہوگی؟ اپنے ارمانوں کا خون کس طرح برداشت کیا ہوگا؟ ہاں! نصرتِ امامؑ، حمایتِ خانوادۂ رسولؐ اور شہادت کی موت کی وجہ سے تسکین تھی۔ زوجۂ وہبؓ اپنے شہید دولہا کے چہرے سے خاک وخون صاف کر رہی تھیں کہ ناگاہ شمر لعین کا غلام آگے بڑھا اور مصروفِ نوحہ وبکا زوجۂ وہبؓ کے سر پر ایک آہنی گرز مارا کہ زوجۂ وہبؓ کی زندگی ختم ہوگئی اور یہ نو بیاہتا جوڑا خونِ شہادت سے سرفراز ہو کر ایک ساتھ ہی راہی ملکِ بقا ہوا۔ زوجۂ وہبؓ کے مچلتے ارمان پورے ہوگئے اور رفاقتِ جنت کی خواہش مند زوجہ شوہر کے ہمراہ جنت میں خدمتِ پیغمبرؐ میں پہنچ گئی۔

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ نصرت امام علیہ السلام اور حمایت آلِ رسولؐ میں یہ پہلی عورت ہیں جو اپنے شہید شوہر کی لاش پر قتل کی گئیں۔ حضرت وہبؓ کا سر تن سے جدا کر کے عمر بن سعد کے پاس لے جایا گیا تو اس نے جناب وہبؓ کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

"مَا اَشَدُّ صَوْلَتَکَ".

''تیرا حملہ کس قدر شدید تھا؟''

پھر کوفیوں نے اس سر کو امام حسین علیہ السلام کی طرف پھینک دیا۔

وہبؓ کی ستم رسیدہ والدہ قریب ہی کھڑی تھیں۔ دوڑ کر اپنے بیٹے کے سر پر گر پڑیں اور فرزندِ ارجمند کے کٹے ہوئے خون آلود سر کو سینے سے لگا کر محبت مادری نے ماں کے ارمان پورے کرنے والے اور حق نصرت ادا کرنے والے شہید فرزند کے سر کو چوما اور کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بَیَّضَ وَجْهِیْ بِشَهَادَتِکَ بَیْنَ یَدَیْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ ثُمَّ قَالَتْ اَلْحُکْمُ لِلّٰهِ یَا اُمَّةَ السَّوْءِ اَشْهَدُ اَنَّ النَّصَارٰی فِیْ بِیَعِهَا وَ الْمَجُوْسَ فِیْ کَنَسِیْهَا خَیْرٌ مِّنْکُمْ".

حمد اور شکر ہے اس خدا کا جس نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے روبرو تیری شہادت سے میرے چہرے کو روشن

کیا۔ اے بدکردار اور روسیاہ اُمت! فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ نصرانی اپنے گرجوں میں اور مجوسی اپنی عبادت گاہوں میں تم سے بہتر ہیں"۔

یہ کہہ کر اس جذبۂ عقیدت ومحبت سے سرشار خاتون نے اپنے فرزند وہب کا سر اعدائے دین کی طرف ہی پھینک دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سر اس زور سے اس دشمن خدا اور قاتلِ وہب کو لگا کہ وہ ملعون اسی وقت کیفرکردار کو پہنچ گیا۔ قاتل لعین مقتول کا سر لگنے سے واصلِ جہنم ہوگیا۔ اس کے بعد مادرِ وہبؓ خیمہ کی چوب لے کر میدان میں نکلیں اور فوج مخالف پر حملہ کردیا اور اس چوبِ خیمہ سے دو ملعونوں کو جہنم پہنچادیا۔ اس قدر اس زنِ مومنہ کا جوش وخروش تھا کہ امام علیہ السلام نے بمشکل اس کو سمجھایا اور فرمایا:

"یَا اُمَّۃَ اللّٰہِ اِجْلِسِیْ فَقَدْ مُنِعَ الْجِھَادُ مِنَ النِّسَآءِ فَاِنَّکَ وَ ابْنَکَ مَعَ جَدِّیْ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّمَ فِی الْجَنَّۃِ".

"اے کنیز خدا! گھر میں جا بیٹھ! کیونکہ جہاد سے عورتوں کو روکا گیا ہے۔ بیشک تو اور تیرا فرزند میرے نانا محمد مصطفیؐ کے ساتھ جنت میں رہو گے"۔

جنابِ وہبؓ کی والدہ نے جب فرزندِ رسولؐ سے جنت کی بشارت سنی تو کہا:

"اِلٰھِیْ لَا تُقْطَعْ رَجَائِیْ".

"بار الٰہا! میری امید منقطع نہ کرنا۔" حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

"لَا یَقْطَعُ رَجَاکِ یَا اُمَّ وَھَبَ".

"اے مادرِ وہبؓ! حق تعالیٰ تیری امید کبھی قطع نہ کرے گا"۔

دوسری جنگِ مغلوبہ

روزِ عاشور میدانِ کربلا میں اصحابِ حسینیؑ اور افواجِ کوفہ کے درمیان دو قسم کی جنگیں ہوئیں۔ ایک یکبارگی حملہ کرنے سے فوجوں کا دستوں اور گروہوں کی صورت میں امام حسین علیہ السلام پر حملہ کرنا، جس طرح عمر بن سعد کے تیر پھینکنے سے جنگ کا آغاز ہوا اور عمر بن سعد کی تیراندازی کے بعد ہزاروں تیر کمانوں سے نکلے، یہ جنگ گروہی حملہ کی صورت میں تھی، اس جنگ کو جنگِ مغلوبہ کہا جاتا ہے۔

مبارز طلبی کی جنگ

یہ وہ جنگ ہے۔ جس میں افواجِ کوفہ وشام سے ایک ایک لعین باہر نکلتا تھا۔ میدان میں مقابل کو للکارتا تھا اور اس کے مقابلے میں جماعتِ امام علیہ السلام سے ایک ایک مجاہد میدانِ کارزار میں مقابلہ کرتا، اسے مبارز طلبی کی جنگ کہتے ہیں۔

روزِ عاشور جب سورج کافی بلند ہو چکا تھا، عمر بن سعد کی طرف سے "حملۂ اولیٰ" ہوا اور جنگِ مغلوبہ کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد مبارز طلبی کی لڑائی شروع ہوئی، جس کا آغاز عمر بن سعد کی طرف سے زیاد بن ابیہ کے غلام یسار اور عبیداللہ بن زیاد کے غلام سالم نے کیا۔

انصارانِ امام حسین علیہ السلام کی طرف سے عبداللہ بن عمیرؓ اور حضرت حُرؓ اس جنگ میں مبارز طلبی کے سلسلے میں میدانِ قتال میں اترے۔ اس انفرادی جنگ میں اصحابِ باوفا میں سے جناب عبداللہ بن عمیرؓ، حضرت حُرؓ، حضرت بریرؓ بن خضیر، حضرت وہبؓ، عمرؓ بن خالد الازدی، خالدؓ بن عمر، سعدؓ بن حنظلہ، عمیرؓ بن عبداللہ مذحجی، مسلمؓ بن عوسجہ، جنابِ مسلمؓ بن عوسجہ کے فرزند، بلالؓ بن نافع، باری باری جہاد کرتے ہوئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

اصحابِ امامِ حسینؑ کی شجاعت اور افواجِ کوفہ کی تباہی

ان نیک طینت و پاک سرشت اصحاب کی تعداد تو بالکل قلیل تھی، مگر ایمان، ثابت قدمی، خلوص ویقین، عزم وہمت اور شوقِ شہادت کے جذبات کا ان پاک بدنوں میں وزن بہت زیادہ تھا۔ ان میں سے ایک ایک مقابل کے سینکڑوں افراد پر بھاری تھا۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جس نے تنہا سپاہِ شامِ بدانجام کے بیسیوں اور سینکڑوں فی النار نہ کیے ہوں:

پیدا نہ کیے مالکِ تقدیر نے ایسے
دیکھے نہ جواں پھر فلکِ پیر نے ایسے

ان میں سے بہت سے بزرگ وضعیف بھی تھے، لیکن پیرانہ سالی کے باوجود ان کے حوصلے عین شباب پر تھے۔ بدن لاغر تھے لیکن دل قوی اور اعصاب مضبوط۔ روحانی طاقت درجۂ کمال پر تھی۔ میدانِ جنگ میں ان کے قدم زمین پر پہاڑ کی مانند گڑ جاتے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، پیچھے نہ ہٹتے تھے، جبکہ افواجِ اشقیاء میدان چھوڑ کر یوں بھاگتی تھی جس طرح بھیڑ بکریاں جنگل کے شیر سے بھاگتی ہیں۔ بعض اوقات مجاہدِ حسینیؑ جنگ میں مقابل کا منتظر رہتا اور میدان خالی رہتا اور ڈر کے مارے کوئی شخص بھی مقابلہ کیلئے نہ نکلتا۔

یہ بھوکے پیاسے تھے، گرسنگی اور تشنگی نے ان کے جسموں کو کمزور کر رکھا تھا، جبکہ سپاہِ کوفہ وشام کھانے سے سیر اور ہر وقت سیراب رہتی تھی۔ ان کے پاس سامانِ حرب کی کمی تھی، جبکہ کوفیوں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار تھے۔

ان مادّی وسائل کی کمی اور مادّی کمزوریوں کے باوجود یہ روحانی طاقتوں کے مالک اور قدسی قوتوں کے حامل مقدس نفوس اس طرح جان توڑ کر لڑتے کہ کوئی پہلوانوں کے پنجے پانی ہو جاتے اور اس طرح جوش وخروش سے دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتے کہ اچھے اچھے دلیروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔

انہیں حق پر ہونے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی امامت، حقانیت اور صداقت پر یقین تھا۔ اس واسطے جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر میدانِ قتال میں یوں بے جگری کے ساتھ لڑتے کہ فوج کی کثرت کا ذرہ بھر خیال نہ کرتے۔ انہوں نے جی بھر کے دادِ شجاعت دی اور حق تو یہ ہے کہ دل کے خوب ارماں نکالے۔ بہت سے ناریوں کو واصلِ جہنم کرنے کے بعد مسکرا کر موت کو گلے لگایا اور اس طرح انہیں مرنے کا کوئی افسوس نہ تھا۔

فولاد کے سینے تھے تو شیروں کے جگر تھے
خود تیغ تھے اور سبطِ پیمبرؑ کی سپر تھے

اس مبارزطلبی کی لڑائی میں عمر بن حجاج، جو فوج عمر بن سعد کا ایک تجربہ کار افسر تھا اور دریائے فرات کے گھاٹ پر اسی کا پہرہ تھا، نے چلّا کر اپنی فوج کو آواز دی:

"اس طرح لڑ کر تم اس مہم کو سر نہیں کر سکتے۔" اس نے کہا: "ان شیرانِ بیشۂ شجاعت اور پیکرانِ عزم وہمت سے مبارزطلبی کی صورت میں تم کامیاب نہیں ہو سکتے"۔

اس نے رائے دی کہ تمام لشکر یکبارگی ان پر حملہ کر دے اور چاروں طرف سے گھیر کر ان کو قتل کر دیا جائے۔

حسینیؑ جماعت پر لشکر ابن سعد کا حملہ

عمر بن سعد کو عمرو بن حجاج کی یہ تجویز پسند آئی، اس نے تمام لشکر کو مل کر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ عمرو بن حجاج نے اصحابِ امام حسین علیہ السلام کے بائیں حصہ پر حملہ کیا اور اس کی امداد کیلئے شمرلعین بھی اپنی فوج لے کر آگے بڑھا۔ خود عمر بن سعد نے اپنی جمعیت کے ساتھ خیامِ حسینیؑ کو آگ لگانے کی نیت کی مگر خیام کے تینوں اطراف خندق میں آگ روشن تھی۔ صرف ایک ہی طرف سے مقابلہ ہو سکتا تھا۔ اس واسطے شیث بن ربعی کے منع کرنے پر ابن سعد اس ناپاک ارادے میں ناکام رہا۔

تمام لشکر اشقیاء اکٹھا ہو کر امام حسین علیہ السلام کی قلیل جماعت پر ٹوٹ پڑا۔ قربان جائیں اصحاب حسین علیہ السلام کی ہمت پر اور ہزاروں آفرین و تحسین ہے ان مجاہدین پر جنہوں نے اس پامردی اور بے جگرے اس لشکرِ کثیر کا مقابلہ کیا کہ مادرِ گیتی ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

دونوں جانب سے تلواریں چلنے لگیں، گھمسان کا رن پڑا۔ زمین کربلا خون سے لالہ زار بن گئی۔ تلواریں بجلی کی طرح افواج شام پر گرنے لگیں۔ مقتولین کے خون کا دریا بہنے لگا اور ملاعین سپاہ ابن سعد کے سر مثل حباب دریائے خون میں ابھرنے اور ڈوبنے لگے۔ یہ ایسا ہولناک و قیامت خیز منظر تھا کہ بڑے بڑے دلیر و جنگجو لوگوں کے بدنوں میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔

سبحان اللہ! مجاہدین حق جذبۂ شہادت میں اس طرح سرشار و محوِ قتال تھے کہ تلواروں کی تیز دھاروں اور نیزوں کی اَنیوں سے زخموں کا درد تک محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس قلیل سی جماعت نے لشکرِ کثیر کو ناکام کر دیا اور اہلبیت علیہم السلام کے خیام تک ان جفاشعاروں کو پہنچنے نہ دیا۔

جب عمر بن سعد نے اپنی ناکامی دیکھی تو اس نے اپنی فوج کے میمنہ اور میسرہ کے سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ادھر سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے بتیس سواروں نے ان ہزاروں سواروں کے منہ موڑ دیئے اور عذرا ابن قیس نے تھک ہار کر ابن سعد سے کہا:

''تو دیکھ رہا ہے، اس مختصر سی جماعت نے میرے سواروں کو کس طرح بدحواس کر دیا ہے؟ اس واسطے پیادہ سپاہ اور تیر اندازوں کو میری کمک کیلئے بھیج۔''

عمر بن سعد نے مزید پیادہ فوج اور حصین بن نمیر کو ۵۰۰ تیر اندازوں کے ساتھ عزرہ بن قیس کیلئے بھیجا۔ اب تیروں کی برسات شروع ہو گئی اور تیروں کی اس موسلادھار بارش میں اصحاب باوفا نے اپنے آپ کو تو کسی حد تک بچا لیکن ان کے راہوار تیروں کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے اور سب کے سب زخموں سے چور چور ہو گئے۔ آخر ان ہمت کے پہاڑوں نے پیدل ہو کر معرکہ قتال جاری رکھا۔

چونکہ یہ مقدس افراد تعداد میں کم تھے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی شہید ہو جاتا تو کمی محسوس ہوتی تھی، جبکہ فوج اشقیاء میں سینکڑوں بھی مارے جاتے تو کوئی فرق نظر نہ آتا۔

اس جنگ میں جماعت حسینؑ کے پندرہ سوار اور پندرہ ہی پیادے درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ ادھر عمر بن سعد نے خیامِ امام علیہ السلام کی رخ کیا تو بیس غلاموں نے پوری ہمت سے مقابلہ کیا۔ یہ غلامانِ اہل بیتؑ اس طرح جان توڑ کر لڑے کہ

عمر بن سعد کو خیام پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ یہ جانثار دفاع کرتے کرتے خود تو جامِ شہادت نوش فرما گئے مگر اپنے بدنوں کو خیام کی سپر بنائے رکھا۔

اس جنگِ مغلوبہ میں جانثارانِ حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے حقِ نصرت ادا کر دیا۔

حق ان کا طرفدار تھا وہ جانبِ حق تھے
سب مصحفِ ناطق کے صحیفے کے ورق تھے

تیروں کی بوچھاڑ میں سید الشھدا علیہ السلام کی نماز

اسی اثناء میں عاشور کا سورج ڈھل گیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے اصحاب باوفا میں سے ایک صحابی جن کا نام عمرو بن عبداللہ ہے اور کنیت ان کی ابوثمامہ صیداوی ہے، خدمتِ امام علیہ السلام میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے:

"یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ نَفْسِیْ لِنَفْسِکَ فِدَاءٌ هٰؤُلَاءِ اقْتَرَبُوْا مِنْکَ لَا وَاللّٰهِ لَا تُقْتَلُ دُوْنَکَ اُحِبُّ اَنْ اَلْقَی اللّٰهَ رَبِّیْ وَ قَدْ صَلَّیْتُ هٰذِهِ الصَّلٰوةُ دَنَا وَقْتُهَا یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ"۔

"یا ابا عبداللہ! میں آپ پر قربان! یہ ظالم آپ کے قتل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ خدا کی قسم! جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں آپ کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ میری زندگی میں آپ تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ یہ نماز جس کا وقت ہو چکا ہے آپ کی اقتداء میں پڑھ کر خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں"۔

سبحان اللہ! یہ غازی بھی نرالے تھے اور نمازی بھی نرالے ہی تھے۔ ابوثمامہ کی یہ درخواست سن کر امام حسین علیہ السلام نے جانبِ آسمان نگاہ فرمائی اور فرمایا:

"ذَکَرْتَ الصَّلٰوةَ جَعَلَکَ اللّٰهُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ نَعَمْ هٰذَا اَوَّلُ وَقْتِهَا"۔

"تو نے (ایسے شدید حالات میں) نماز کو یاد کیا ہے، خدا تجھے روزِ قیامت نماز گزاروں میں اٹھائے، ہاں! یہی اول وقتِ نماز ہے"۔

پھر آپ نے فرمایا: "ان جفاکاروں سے سوال کرو کہ ہمیں نماز کی مہلت دیں اور اس وقت تک جنگ روک لیں"۔

آپ کے صحابیوں نے اشقیاء سے یہ کہا تو حصین بن نمیر نے جواب دیا:

"تمہاری نماز قبول نہیں"۔

اس دریدہ دہن کا یہ گستاخانہ کلام جناب حبیبؓ بن مظاہر سے نہ سنا گیا اور آپؓ نے اس ملعون کو ڈانٹ کر کہا:

"لَا تُقْبَلُ الصَّلٰوۃُ مِنْ آلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَ اَنْصَارِھِمْ وَ تُقْبَلُ مِنْکَ یَا خَمَّارُ"۔

"اے شراب خور! تیرا کیا گمان ہے کہ فرزندِ رسولؐ اور ان کے انصار کی نماز قبول نہیں اور تیری نماز قبول ہے؟"

اتنا سننا تھا کہ حصین بن نمیر نے جناب حبیبؓ پر حملہ کرنا چاہا۔ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام حبیبؓ کے آگے کھڑے تھے اور نماز ظہر کی تیاری کر رہے تھے۔ حصین بن نمیر کو تیزی سے آتے دیکھ کر جناب حبیبؓ نے باقاعدہ مقابلہ کی تیاری کر لی اور حصین بن نمیر کے گھوڑے کے منہ پر ایسی تلوار ماری کہ اس کا گھوڑا بدک گیا اور وہ ملعون گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور اس کے ساتھیوں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ اس طرح حضرت حبیبؓ بن مظاہر نے جہاد شروع کیا۔

حضرت حبیبؓ بن مظاہر کے مختصر حالاتِ زندگی

قبل اس کے کہ ہم حضرت حبیبؓ کی مجاہدانہ و جانثارانہ کارروائی کا ذکر کریں، جنابِ حبیبؓ کے مختصر حالات قلمبند کرتے ہیں۔

نام و نسب

حبیبؓ بن مُظاہر یا مظہر۔ اسدی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی کنیت ابو القاسم ہے اور آپ کا شمار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اصحاب میں ہوتا ہے۔ بعض حضرات انہیں تابعی قرار دیتے ہیں۔ جنابِ امیر المومنین علیہ السلام کے مخلص اور باوفا صحابی ہیں۔ جنگِ جمل، صفین اور نہروان میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھی رہے ہیں اور آپؓ کے علوم و آثار کے حامل ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت میثم تمارؓ اور حضرت حبیبؓ ابن مظاہر گھوڑوں پر سوار مخالف سمتوں سے آ رہے تھے کہ ایک مقام "مجلس بنی اسد" کے پاس دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ دونوں باہم اس قدر قریب آئے کہ دونوں کے راہواروں کی گردنیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ جنابِ حبیبؓ ابن مظاہر نے حضرت میثم کو دیکھ کر کہا:

"گویا میں ایسے بزرگ کو دیکھ رہا ہوں کہ اس کے سر کے اگلے حصے کے پر بال نہیں ہیں اور وہ محبت اہل بیتؑ کے جرم میں سولی پر لٹکایا جائے گا"۔

ان کا اشارہ جناب میثم تمار اور ان کی شہادت کی طرف تھا۔ اس کے جواب میں حضرت میثم نے کہا:
''میں بھی ایسے ہی شخص کو دیکھ رہا ہوں جس کا رنگ سفید و سرخ ہے، اس کے سر پر دو گیسو ہیں، وہ اپنے رسولؐ کے نواسہ کی نصرت میں جامِ شہادت پیئے گا اور قتل کیے جانے کے بعد اس کا سر کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جائے گا۔''
وہ ہر دو تو یہ گفتگو کر کے چلے گئے، لیکن سننے والے لوگ ان کی ان پیشگوئیوں پر اظہارِ تعجب ہی کرتے رہے۔ اسی اثناء میں حضرت رشید ہجری ان دونوں اصحاب کو تلاش کرتے ہوئے وہاں سے گزرے اور ان دونوں کے متعلق لوگوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی یہاں سے چلے گئے ہیں اور ان دونوں بزرگوں کا مکالمہ بیان کیا۔ رشید ہجریؓ نے یہ سن کر کہا:
''حضرت میثم یہ بات کہنا بھول گئے ہیں کہ اس ناصر عترتِ رسول کا سر دربار میں پیش کرنے والے کو دوسروں سے ایک سو درہم زیادہ انعام دیا جائے گا''۔
لوگوں نے انہیں جھوٹا قرار دیا مگر حاملین اسرار امیر المومنین علیہ السلام کی پیشگوئیاں کب صداقت سے خالی ہوتی ہیں؟ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ کوفہ میں عمرو بن حریث کے دروازہ پر میثم تمار کو سولی پر لٹکا شہید کر دیا گیا اور حضرت حبیبؓ بن مظاہر کا سر کوفہ کے بازاروں میں پھرتے انہی لوگوں نے دیکھا۔ جنابِ مسلم جب کوفہ تشریف لائے تو جنابِ مسلمؓ بن عوسجہ اور حضرت حبیبؓ ان کے سرگرم کارکن تھے اور سید الشہداء علیہ السلام کی بیعت لینے میں پیش پیش تھے۔

حبیبؓ ابن مظاہر کا خدمت امام علیہ السلام میں آنا

جنابِ حبیب کس طرح، کس وقت اور کس جگہ ناصرانِ امام علیہ السلام میں شامل ہوئے؟ اس کے متعلق ''معالی السبطین'' میں ایک روایت لکھی ہے اور عام طور پر مشہور بھی ہے اور کتبِ مقاتل میں پائی جاتی ہے۔
حضرت حبیبؓ بن مظاہر کوفہ کے بازار میں ریش کو خضاب کرنے کیلئے مہندی خرید رہے تھے کہ جنابِ مسلمؓ بن عوسجہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ حضرت حبیبؓ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''بھائی مسلم! میں دیکھ رہا ہوں کہ اہل کوفہ گھوڑے اور مختلف قسم کے ہتھیار اکٹھے کر رہے ہیں''۔
جنابِ مسلمؓ نے آبدیدہ ہو کر کہا: ''کوفیوں نے فرزندِ رسولؐ کے قتل کا پختہ ارادہ کر لیا ہے اور وہ اولادِ رسول کا خون بہانے پر تیار ہو گئے ہیں۔''
یہ سن کر حبیبؓ بن مظاہر نے مہندی بازار میں ہی پھینک دی اور کہا: ''اب میری یہ ریش اس خضاب سے نہیں بلکہ میرے اس خون سے رنگین ہوگی جو فرزندِ رسولؐ کی نصرت میں بہایا جائے گا۔'' یہ کہہ کر جنابِ حبیب گھر آ گئے۔

ادھر امامِ مظلوم علیہ السلام نے جب مسلمؑ بن عقیل علیہم السلام کی شہادت کی خبر سنی اور افواجِ کوفہ کی تیاری کی خبر پہنچی تو ایک منزل سے جنابِ حبیبؓ بن مظاہر کو اس مضمون کا خط تحریر کیا:

"مِنَ الْحُسَيْنِ ابْنِ عَلِيٍّ اِلَى الرَّجُلِ الْفَقِيْهِ حَبِيْبٍؓ ابْنِ مَظَاهِرٍ. اَمَّا بَعْدُ يَا حَبِيْبُؓ فَاَنْتَ تَعْلَمُ قَرَابَتَنَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ اَنْتَ اَعْرَفُ بِنَا مِنْ غَيْرِكَ وَ اَنْتَ ذُوْ شِيْمَةٍ وَ غَيْرَةٍ فَلَا تَبْخَلْ عَلَيْنَا بِنَفْسِكَ يُجَازِيْكَ جَدِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ".

"حسین بن علی علیہم السلام کی طرف سے مردِ فقیہ حبیبؓ ابن مظاہر کے نام۔

اما بعد! اے حبیبؓ! جنابِ رسولِ خدا سے ہماری قرابتداری تمہارے علم میں ہے اور دوسروں کی نسبت تمہیں ہماری معرفت زیادہ ہے۔ آپؓ صاحب غیرت وحمیت ہیں۔ پس ہماری مدد میں جان کی بازی لگانے سے دریغ نہ کیجئے۔ آپ کو اس کی جزا میرے جدامجد روزِ قیامت دیں گے"۔

قاصد یہ خط لے کر جنابِ حبیبؓ بن مظاہر کے پاس پہنچا۔ آپؓ اس وقت اپنی زوجہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ اتفاقاً کھانا کھاتے ہوئے ان کی زوجہ کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ انہوں نے کہا:

"حبیبؓ! معلوم ہوتا کہ کسی مردِ کریم کا کرم نامہ آیا ہی چاہتا ہے"۔

اسی اثناء میں دق الباب ہوا۔ حبیبؓ باہر نکلے اور پوچھا۔ جواب ملا: "میں حسین ابن علی علیہم السلام کا قاصد ہوں"۔ حبیبؓ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور کہا: "جو میری زوجہ نے کہا، اس کی تصدیق ہوگئی"۔

خط لے کر گھر میں داخل ہوئے، خط کھولا، پڑھا۔ نیک بخت زوجہ نے دریافت کیا، حبیبؓ نے خط کے متن سے انہیں آگاہ کیا۔ سعادت مند بیوی نے جب غربتِ حسین علیہ السلام اور آلِ رسول علیہم السلام کے صحراؤں کا سفر اور بیچارگی کا حال سنا تو بے اختیار رونے لگیں۔ آخر کیوں نہ روتیں؟ آلِ محمد علیہم السلام کی حبدار تھیں اور محبت کی یہی علامت ہے کہ محبوب کے دکھوں کا حال سن کر محب غمگین ہو جاتے ہیں۔ جب انہوں نے سنا ہوگا کہ اسلام کی شہزادیاں، علی و بتول علیہم السلام کی بیٹیاں عراق کے صحراؤں کے ریگزاروں میں سفر کی تکلیف میں پریشان ہیں اور فرزندِ رسول علیہ السلام دشمنوں میں گھر گئے ہیں، نصرت طلبی کے خطوط آ رہے ہیں اور مولاؑ کی فوج قلیل ہے، جبکہ دشمن کثیر تعداد میں ہے، بیچاری کے دل پر صدمہ ہوا اور رو کر کہنے لگیں:

"حبیبؓ! میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ فرزندِ رسولؐ علیہ السلام کی نصرت سے جی نہ چرائیے گا۔ دیکھیں تو سہی کس پیار اور مظلومی سے آپ کو بلایا ہے! یہ آپ کی خوش بختی کی علامت ہے۔ جائیں اور فرزندِ رسولؐ علیہ السلام پر جان قربان کر دیں"۔

حبیبؓ نے زوجہ کا امتحان لینے کیلئے کچھ پس و پیش کیا اور کہا:

"میں مارا جاؤں گا، تو بیوہ ہو جائے گی اور بچے یتیم ہو جائیں۔ کیا بنے گا؟"

زنِ مؤمنہ نے جواب دیا: "جب آلِ محمد علیہم السلام کی مستورات بیوہ ہو جائیں گی، ان کے سرتاج ان کے سروں پہ نہیں رہیں گے، آلِ محمد علیہم السلام کے بچے یتیم ہو جائیں گے، تو میں اپنے سہاگ کو کیا کروں گی؟ حبیبؓ! ہم تو پھر بھی وطن میں ہیں، ہمارا قبیلہ ہمارا معاون ہے، بنو ہاشم کی مخدراتِ عصمت و طہارت پردیس میں ہیں، ان کے بچے صحرائے غربت میں یتیم ہو جائیں گے تو کون ہے جو ان کی مدد کر کے انہیں وطن پہ پہنچائے گا؟ کون ان کی خبر لے گا؟ میرے لئے تو فخر ہے کہ ان کی بیوگی میں میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں اور میرے بچے ان کے یتیموں کی تاسی میں یتیم ہو جائیں تاکہ روزِ قیامت ہم جناب رسولِ خدا اور جنابِ بتولِ عذرا کے حضور میں سرخرو ہوں۔

حبیبؓ! یہ سوچنے کا نہیں، تاخیر نہ کریں، فرزندِ رسول آپ کے انتظار میں ہوں گے۔ جس کے ساتھی تھوڑے ہوں، اس کو ایک ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے جانے سے فرزندِ رسولؐ اور اولادِ رسولؐ کے دل مطمئن ہو جائیں گے۔ آپ ہمارے فکر نہ کیجئے اور جا کر حسین علیہ السلام کی نصرت کیجئے"۔

حبیبؓ پہلے ہی آمادہ تھے اب سعادت مند رفیقہ کی گفتار نے ان کا خون اور بھی گرما دیا۔ غلام سے کہا کہ یہ میرا گھوڑا ہے اور اسے لے جا کر فلاں جگہ پر میرا انتظار کرو۔ کیونکہ حبیبؓ علانیہ نہ جا سکتے تھے اور انہوں نے اپنے ارادے کو مخفی رکھا ہوا تھا اور غلام کو بھی تاکید کی کہ کسی کو خبر نہ کرنا۔ غلام گھوڑا لے کر چلا گیا۔

زوجہ اور اولاد سے رخصت ہو کر حبیبؓ جب عازمِ سفر ہوئے تو وداعی ملاقات میں ان کی زوجہ نے گریہ و زاری کرتے ہوئے کہا: "جب خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوں تو میری طرف سے امام علیہ السلام کی دست بوسی کیجئے اور کہیئے گا: کنیز سلام کہتی تھی"۔

الغرض حضرت حبیبؓ چھپتے چھپاتے گھر سے روانہ ہوئے۔ غلام معین مقام پر گھوڑے کے پاس کھڑا اپنے آقا کی انتظار میں تھا۔ کچھ دیر جو ہوئی تو غلام گھوڑے کے گردن میں بانہیں ڈال کر کہنے لگا: "راہوار! تیرا سوار نہ آیا تو تیری زین خالی نہ

رہے گی۔ میں تیری پشت پر سوار ہو کر مولائے مظلوم امام حسین علیہ السلام کی نصرت کو جاؤں گا اور فرزندِ رسولؐ کے قدموں میں اپنی جان قربان کر دوں گا۔"

جنابِ حبیبؓ بھی اتنے میں نزدیک پہنچ گئے اور غلام کا والہانہ کلام سن کر کہا: "فرزندِ رسولؐ! قربان جاؤں! غلاموں کی محبت کے یہ انداز ہیں کہ وہ آپؐ کی نصرت کیلئے بے چین ہیں تو آزاد مردوں کا فرض تو ان سے بھی بڑھ کر ہے"۔

بہر حال حبیب نصرتِ امام علیہ السلام کے ارادے سے کربلا میں پہنچ گئے۔

دستور ہے کہ مشکل وقت اگر کوئی مخلص دوست ساتھ آملتا ہے تو غم ہلکا ہو جاتا ہے، کوفت کم ہو جاتی ہے اور دل کو یک گونہ راحت ملتی ہے۔ حبیب آئے، گھوڑے سے اُترے، امامؑ کے ہاتھوں اور پاؤں کے بوسے لئے، اپنی زوجہ کے سلامِ عقیدت پہنچائے۔ مولاؑ نے قدیمی دوست کو گلے لگایا، بیکسی کے آنسو بہائے، انصارانِ امام علیہ السلام کے حوصلے بلند ہو گئے۔ مخدراتِ عصمت وطہارت نے جب حبیبؓ کی آمد سنی ہوگی تو یقیناً ان کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے ہوں گے، تڑپتے ہوئے دلوں کو قدرے سکون ملا ہوگا اور بتولؑ کی بیٹیوں کے دکھی دلوں سے کیا کیا دعائیہ جملے نہ نکلے ہوں گے۔

جنابِ حبیبؓ اگرچہ سن رسیدہ پیر مرد تھے لیکن دل جواں، حوصلہ بلند، ارادہ قوی، اعصاب مضبوط اور دلیر مثل شیر تھے۔ چنانچہ یومِ عاشور کی صبح جب مولا مظلوم علیہ السلام نے جب اپنے لشکر کی صفیں منظم کیں تو میسرہ (بائیں بازو) پر جنابِ حبیب کو مقرر فرمایا۔

اصحاب کے الوداعی سلام کا طریقہ

اصحابِ باوفا میں سے جب کوئی موت کے بازار میں جاتا، آقائے مظلومؑ سے اذنِ جہاد مانگتا، مولاؑ اسے اجازت دیتے، تو جاتے وقت اس طرح سلام کرتا:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا ابْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ".

"فرزندِ رسولؐ! آپؐ پر میرا آخری سلام ہو۔" مولا جواب میں فرماتے:

"وَ عَلَیْکَ السَّلَامُ. وَ نَحْنُ خَلْفَکَ".

"میرا بھی تجھ پر سلام ہو! ہم بھی تمہارے پیچھے (آرہے) ہیں۔"

جب کوئی مجاہد شہید ہوتا تو وہ مولاؑ کو آواز دیتا۔ جنابِ مظلومِ کربلا اپنے صحابی کی لاش پر جاتے، گریہ وزاری کرتے،

دعا دیتے اور یہ آیت تلاوت فرماتے:

"فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا". (پ۲۱ر رکوع ۱۹)

"بعض وہ ہیں کہ جو اپنا وعدہ پورا کر گئے اور منزل کو جا لئے اور کچھ انتظار میں ہیں اور انہوں نے عہدِ وفا میں کوئی تبدیلی نہ کی"۔

جب جنابِ مسلمؓ بن عوسجہ اسدی کی لاش پر امامِ مظلوم علیہ السلام پہنچے، حضرت حبیبؓ بن مظاہر ان کے ہمراہ تھے۔

آپ اس شہید کی لاش پر آئے اور فرمایا:

"رَحِمَكَ اللّٰهُ يَا مُسْلِمُ".

اور آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔ حضرت مسلمؓ بن عوسجہ کے جسم میں قدرِ زندگی باقی تھی۔ حبیبؓ ان کے قریب گئے۔ لاش پر بیٹھ کر گرد و غبار صاف کرتے جاتے ہیں۔ اپنے برادر کی لاش پر فرقت کے آنسو بہا کر کہتے ہیں:

"اِبْشِرْ يَا مُسْلِمُ بِالْجَنَّةِ".

"مسلمؓ! تجھے جنت کی خوشخبری ہو۔"

جنابِ مسلمؓ کی لاش سے ہلکی سی آواز آئی: "بھائی حبیبؓ خدا تمہیں بھلائی کی بشارت دے"۔

پھر جنابِ مسلمؓ کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ کر کے جنابِ حبیبؓ کہتے ہیں:

"اگر مجھے تمہارے بعد زندہ رہنا ہوتا تو ضرور وصیت کی آرزو کرتا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ آپؓ کے بعد بہت جلدی میں بھی آپؓ کے ساتھ آملوں گا۔ اس واسطے میں وصیت پوری نہ کر سکوں گا۔"

جنابِ مسلمؓ بن عوسجہ نے عالمِ نزع میں فرزندِ رسولؐ کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"فرزندِ رسولؐ کی نصرت میں اپنی جان قربان کر دینا"۔

حبیبؓ نے جواب دیا: "اس بات کا غم نہ کر! یہ وصیت جلد پوری ہو گی"۔

جنابِ حبیبؓ کی شجاعت و شہادت

حضرت حبیبؓ بن مظاہر حضرت امام علیہ السلام سے اذنِ جہاد لے کر میدانِ قتال کی طرف رجز پڑھتے ہوئے روانہ ہوئے۔ حصین بن نمیر کے جواب میں حضرت حبیبؓ نے تلوار کا وار کیا۔ ان کی ضرب سے حصین کو معمولی سا زخم لگا لیکن وہ بزدل

نابکار اس کا بھی متحمل نہ ہو سکا اور میدانِ جنگ سے بھاگ گیا۔

اس کے بعد اس سن رسیدہ بزرگ نے اپنی شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ جو سامنے آتا، بچ کر نہ جاتا۔ اس ضعیف العمر شیر دلیر نے فوجِ مخالف پر پے در پے حملے کئے اور باسٹھ بے دینوں کو واصلِ جہنم کیا۔ آخر بنی تمیم کے ایک لعین نے کمین گاہ سے ایسا نیزہ مارا کہ جنابِ حبیبؓ زمین پر گر پڑے۔ اٹھنا چاہتے تھے مگر حصین بن نمیر نے حبیبؓ کے سر پر تلوار ماری، حبیبؓ نڈھال ہو کر گر پڑے۔ پھر بدیل بن حریم نے گھوڑے سے اُتر کر امام علیہ السلام کے اس بزرگ رفیق کا سر قلم کر دیا۔

حضرت امام مظلوم علیہ السلام اپنے باوفا ساتھی کی شہادت کی خبر سن کر فوراً ان کی لاش پر پہنچے اور فرمایا:

"عِنْدَ اللّٰهِ اَحْتَسِبُ نَفْسِيْ وَ حُمَاةَ اَصْحَابِيْ".

"میں اپنے نفس اور مددگار صحابیوں کی جزاء کا بارگاہِ خدا سے امیدوار ہوں۔"

اس کے بعد کئی بار امام علیہ السلام نے "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کی تلاوت فرمائی۔ اس مختصر قافلہ کا سالار اپنے ساتھیوں میں سے ایک ایک فرد کی کمی محسوس کرتا تھا۔ امام علیہ السلام کی مختصر سی فوج کا ایک ایک مجاہد باری باری رخصت ہو رہا تھا اور آپؑ کے انصار ان کی تعداد گھٹتی چلی جا رہی تھی۔

جنابِ حبیبؓ کی شہادت سے امامِ مظلوم علیہ السلام کا دل ٹوٹ گیا اور چہرۂ مبارک پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہوئے۔ پہلے جب کسی شہید کی لاش پر جاتے تو یہ بزرگ صحابی آپ کے ہمراہ ہوتا۔ اب وہ بھی ہمراہی چھوڑ گئے تھے۔

عزادارو! مظلوم آقا کے دل پر کیا گزری ہوگی جب حبیبؓ کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا ہوگا؟ عموماً قافلہ سالار آگے ہوتا ہے اور قافلہ پیچھے۔ مگر یہ قافلہ پہلے سوئے جنت سدھارا اور سالار آخر میں پہنچا۔ قربان جاؤں! سالار تو قافلہ کے ہر فرد کی لاش پر پہنچا مگر سالار کی لاش اکیلی ہی پڑی رہی اور کوئی جا کر لاش سنبھالنے والا نہ تھا! کوئی ہوتا تو لاش پر جاتا۔

جنابِ حبیبؓ کی لاش پر درد بھرے دل اور خشک زباں سے امام علیہ السلام نے یہ آخری جملہ کہے:

"لِلّٰهِ دَرُّکَ يَا حَبِيْبُ لَقَدْ كُنْتَ فَاضِلاً تَخْتِمُ الْقُرْآنَ فِيْ لَيْلَةٍ وَاحِدَةٍ".

"بھائی حبیبؓ! بخدا کیا خوبی تھی تمہاری کہ ایک رات میں پورا قرآن ختم کر لیا کرتے تھے"۔

عین لڑائی میں نمازِ عشق

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

جنابِ حبیب تو عہدِ وفا پورا کر کے اور بحرِ شہادت عبور کر کے حوضِ کوثر کے کنارے پہنچ گئے۔ اب امامِ مظلوم علیہ السلام نے نمازِ ظہر ادا کرنے کا قصد فرمایا۔ اعداء و اشقیاء نے جنگ نہ روکی اور نہ ہی امن کے ساتھ نماز پڑھنے کی مہلت دی، لیکن جہاں یہ نرالے غازی تھے وہیں یہ نرالے نمازی بھی تھے۔ جو عشق شہادت سے تھا، وہی عشق عبادت سے بھی تھا۔

بہر حال ان مجاہد نمازیوں نے تلواروں کے سائے اور تیروں کی بوچھاڑ تلے، گرم زمین پر عین گرمی کی حدت اور بھوک و پیاس کی شدت میں امام علیہ السلام کے پیچھے صفیں درست کیں۔ پیکرانِ خلوص کی خشک زبانوں سے "اللہ اکبر" کی صدائیں نکلیں۔ آسمانوں پر ملائک کی قطاریں ان نمازیوں کی صفوں پر جاں نثار تھیں اور ان کی سجدہ گاہوں پر بیت المعمور کو رشک تھا اور ان نمازیوں کی زخمی جبینوں پر ملائک کے سجدے فدا تھے۔

عرشِ معلّی پر اور سماوی طبقات میں رکوع و سجود وہ شان نہیں رکھتے تھے جو فرشِ کربلا اور ریت کے مصلوں پر ان پیکرانِ صدق و صفا اور ابدانِ عشق و وفا نے برستے تیروں اور لپکتے نیزوں میں خون آلود جبینوں کے ساتھ سجدوں میں تھی۔ ملائک کے لاکھوں سجدے ان کی ایک ایک تسبیح و تہلیل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مولائے مظلوم نے اپنے چند مجاہدوں کے ساتھ نمازِ خوف ادا کی۔

کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ
دل بھی جھک جاتا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ

جب صفیں درست ہو چکیں، نمازیوں نے تیمم کر لئے تو امام علیہ السلام نے جنابِ سعیدؓ بن عبداللہ اور حضرت زہیرؓ بن قین کو حکم دیا:

"تم ہمارے آگے کھڑے ہو جاؤ اور تیروں اور نیزوں کو روکنا۔"

یہ باوفا جاں نثار لشکروں کے تیروں کی زد میں کھڑے ہو گئے اور سینے تان کر تیروں اور نیزوں کو روکنے لگے۔ جو تیر آتا دوڑ کر اپنے سینوں اور بازوؤں پر روک لیتے اور نمازیوں کی سپر بن کر ان کی محافظت کرتے رہے۔ ان بے دینوں نے ہنگامِ نماز بھی لڑائی سے ہاتھ نہ اٹھایا، بلکہ برابر کمانیں کڑکتی رہیں اور تیروں کا مینہ برستا رہا۔ ان دونوں جانثاروں کی یہی کوشش رہی کہ کوئی تیر ہم سے بڑھ کر نمازیوں تک نہ پہنچ پائے۔

ادھر امام علیہ السلام نے نماز تمام کی، ادھر جنابِ سعیدؓ بن عبداللہ زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر گر پڑے۔ زمین پر گرتے وقت اس مجاہد شہید کی زباں پر یہ الفاظ تھے:

"اَللّٰھُمَّ الْعَنْھُمْ عَادٍ وَ ثَمُوْدَ. اَللّٰھُمَّ اَبْلِغْ نَبِیَّکَ عَنِّی السَّلَامَ وَ اَبْلِغْهُ مَا لَقِیْتُ

مِنْ اَلَمِ الْجِرَاحَ فَاِنِّیْ اَرَدْتُ نُصْرَۃَ ذُرِّیَّۃِ نَبِیِّکَ"۔

"اے اللہ! اس قومِ اشقیاء پر مثلِ قومِ عاد و ثمود لعنت بھیج اور میرا سلام اپنے پیغمبرؐ کو پہنچا اور جو کچھ زخموں کا درد مجھے پہنچا ہے، اس سے اپنے پیغمبرِ خدا کو باخبر کر کیونکہ میں نے تیرے پیغمبرؐ کی ذریت کی نصرت کے قصد سے یہ سب کچھ کیا ہے"۔

مورخین بیان کرتے ہیں کہ جنابِ سعید شہید کے جسم پر علاوہ تلواروں اور نیزوں کے، تیرہ تیر پیوست تھے۔ حضرت امام علیہ السلام اپنے رفیق سعیدؓ کی لاش پر گریہ وزاری بھی کر رہے ہیں اور لاش پر بیٹھ کر زخمی بدن سے تیر بھی نکال رہے ہیں۔

قربان جاؤں مولاؑ! آپؑ سے سعید کی لاش پر تیر دیکھے نہ گئے لیکن اس سے کہیں زیادہ تیر آپؑ کے جسمِ اطہر پر تھے۔ زخم بھی زیادہ تھے لیکن کون تھا جو آپؑ کی لاش پر جا کر تیر نکالتا؟

جب سعیدؓ نے امام علیہ السلام کو اپنی لاش پر دیکھا تو نحیف سی آواز میں کہا:

"یَا ابْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوَفَیْتُ؟"

"یا فرزندِ رسولؐ! کیا میں نے عہدِ وفا پورا کر دیا؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"نَعَمْ"۔ "ہاں!"

"وَاَنْتَ اَمَامِیْ فِی الْجَنَّۃِ"۔

"اور تو جنت میں مجھ سے پہلے پہنچے گا"۔

اس کے بعد سعید کی روحِ نورانی پرواز کر گئی اور مظلوم آقا کی جمعیت مزید کم ہو گئی۔

✿✿✿

عبادت کی تعریف، عبادت کی اقسام
معرفت و اخلاص
شہادت حضرت علی اکبرؑ

"ذکرِ علی عبادت ھے"۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ہ

"اِيَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاکَ نَسۡتَعِيۡنُ".

"ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔"

ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

قوائدِ عربی کے لحاظ سے مفعول فاعل اور فعل کے بعد آتا ہے مگر جہاں مفعول فاعل سے پہلے آجائے وہاں عربی گرائمر کے لحاظ سے فعل مفعول میں منحصر ہوتا ہے۔ عربی مقولہ ہے:

"تَقۡدِيۡمُ مَا حَقُّهُ التَّاخِيۡرُ يُفِيۡدُ الۡحَصۡرُ".

"جس کا حق پیچھے آنے کا ہے، اسے پہلے لانا مفیدِ حصر ہے۔"

یعنی فعل اس مفعول کے ساتھ مخصوص ہوجاتا ہے۔ اس مقام پر چونکہ مفعول، فاعل اور فعل سے پہلے آیا ہے، اس واسطہ عبادت اور استعانت ذاتِ خدا کے ساتھ مخصوص ہوگئی ہیں۔ یعنی اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ یعنی نہ تیرے غیر کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی تیرے غیر سے مدد مانگتے ہیں۔

غائب سے مخاطب کی طرف رجوع

اس آیت سے پہلی آیات میں صیغہ غائب سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ دستور ہے کہ غائب بار بار ذکر کرنے سے وہ ذہن کے خانوں سے جب سما جائے تو حاضر کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔ قاری جب ذکرِ خدا کرتا ہے تو اس کا پورا ذہن خداوند

عالم کی طرف پھر جاتا ہے۔ جب قاری مالکِ یوم الدین تک پہنچتا ہے تو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف اس حالت میں متوجہ ہو جاتا ہے کہ خدا کے حضور میں پہنچ چکا ہوتا ہے اور بار بار ذکر کرنے سے وہ ذاتِ پاک اب غائب کے پردوں میں پنہاں نہیں رہی بلکہ نمازی کے قلب وذہن کو جلا بخشی اور حجابِ غائب دور ہو گیا، قرب کی منزل حاصل ہو گئی، خیال نے پلٹہ کھایا اور **نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ** کا نقشہ سامنے آگیا۔

چونکہ سابقہ صفات کا موضوع سوائے خدا کے کوئی نظر نہ آیا، عرفان کی وادی میں ذاتِ ذوالجلال کو لاشریک دیکھا، اخلاص کے مقام کا وصال ہوا، ہدایت ربانی نے اس کا ہاتھ تھام لیا، مقامِ عبادت میں معرفت کا نور القا ہوا، پکار کے کہتا ہے: **اِیَّاکَ نَعْبُدُ** ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تیرے غیر کی عبادت سے بیزار ہیں۔ اس طرح اسلام کے بنیادی کلمہ "**لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ**" کے قول کو حالت نماز میں عملی صورت میں دکھا رہا ہے یہی کلمہ دین کی اساس ہے اور ہر پیغمبر کی اسلامی تعلیم کی بنیاد ہے اور اسی بنیاد پر عمارت اسلام استوار ہے۔

عبادت کی تعریف

اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے سامنے تذلل کی اس صورت میں پیش کرنا جو سوائے خدا کے کسی کے سامنے وہ صورت روا نہ ہو۔ دوسرے معنی میں "انتہا تعظیم"، تعظیم کی آخری صورت کہ اس سے بڑھ کر تعظیم ہو نہیں سکتی اور عبد کی ذلت کی وہ شکل کہ اس سے بڑھ کر ذلت اور انکساری کی اور شکل ناممکن ہو۔

تعظیم اور عبادت میں فرق

تعظیم کا معنی ہے کسی کی عظمت کا قول وعملی صورت میں اظہار کرنا اور تکریم کا معنی ہے کسی بزرگ اور قابل احترام ہستی کی عزت کرنا۔ یہ دونوں "غیر اللہ" کے لئے جائز ہیں اور یہی تعظیم وتکریم جب اپنی آخری صورت اور اپنی انتہا کو پہنچتی ہیں تو عبادت بن جاتی ہیں۔ وہ پھر خداوند عالم کے لیے مخصوص ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

"وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" (حج، پارہ ۱۷)۔

"جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہے، بیشک یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔"

انسان جب کسی قابل قدر اور لائق تعظیم انسان کو دیکھتا ہے تو ازراہ کھڑا ہو جاتا ہے اور جب اس کے سامنے بیٹھتا ہے تو احتراماً دوزانو ہو کر بیٹھتا ہے اور جب اس سے ملتا ہے تو تعظیماً سر جھکا لیتا ہے۔ یہ تمام احترام اور تعظیم کی صورتیں ہیں۔ یعنی قیام،

بدن کا کسی قدر جھکانا اور دوزانو بیٹھنا۔ یہ صورتیں غیر اللہ اور قابل قدر انسان کیلئے روا ہیں۔ لیکن تعظیم کی انتہائی صورت رکوع اور سجود ہے۔ یہ صرف ذاتِ پاک باری تعالیٰ کیلئے ہی مخصوص ہے۔

عبادت کی صورت

نمازی نماز میں تعظیم کی تمام صورتیں اختیار کرتا ہے۔ تکبیرۃ الاحرام کے بعد دنیا و مافیہا سے منقطع ہو کر اپنے آپ کو بارگاہِ واحدیت میں حاضر جان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حالتِ قیام اس کی تعظیم کی پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد تعظیم کی دوسری صورت، رکوع، بجالاتا ہے اور پھر تعظیم کی تیسری اور آخری صورت سجود کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔

چونکہ تعظیم کی یہ تمام صورتیں وہ خدا کے لیے ظاہر کرتا ہے، اس واسطے ان تینوں منزلوں میں ذکرِ خدا ہی کرتا ہے۔ پھر سجدوں سے فراغت کے بعد تشہد اور سلام کی حالت میں دوزانو ہو کر بیٹھتا ہے۔ یہ ہے اسلامی عبادت اور شرعی بندگی۔

نماز میں اس کی تعظیم کی جملہ صورتیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مخصوص ہوتی ہیں۔ وہ زبان سے ذکرِ خدا کرتا ہے، عمل سے آدابِ عبادت بجالاتا ہے اور دل سے اس کی یاد میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ اس معبودِ حقیقی کی تعظیم ہے کہ اس کی عبادت اسی طرح کی جائے۔ اس کے بعد عبد کے تذلل اور خداوند عالم کی انتہائے عظمت کے اقرار کا طریقہ کوئی نہیں۔

گو ہر مذہب میں اور ہر ملت میں اس کی بندگی اور عبادت کے طریقے رائج ہیں، مگر اسلام نے اس کی عبادت کا جو طریقہ سکھایا ہے، وہ لاثانی اور بینظیر ہے۔ جب انسان اسلام کی اس تعلیم کے مطابق آدابِ عبادت بجالاتا ہے تو وہ عبد اس وقت بارگاہِ خدا میں حاضر ہو کر اس کے ذکر کی چاشنی سے زبان تر کر کے لذتِ وصال کے مزے لوٹتا ہے۔ جس انسان کی احکم الحاکمین کی بارگاہ میں مقبول رسائی ہو جائے، اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس واسطے حدیث میں ارشاد ہے:

"اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنْ".

"نماز مومن کی معراج ہے"۔

عبادت کی اقسام

گو عبادت کی جامع و اکمل و اصل صورت نماز ہے، مگر پھر بھی عبادت کی کئی قسمیں ہیں۔ عبادت ظاہر ارکان کے ساتھ، زبان کے ساتھ ذکر خدا کرنا، تسبیح، تہلیل، حمد و ثناء، دعائیں مانگنا، دعاؤں کا پڑھنا، مقربین، معصومین، انبیاء و مرسلین اور آئمہ طاہرین صلوٰۃ اللہ والسلامہ علیہم کا ذکر خیر کرنا۔

کان کی عبادت، ذکرِ خدا کا سننا، قرآن کا سننا، ذکرِ انبیاء و آئمہ معصومینؑ سننا۔ آنکھ کی عبادت، قرآنِ مجید کا دیکھنا، کعبہ مقدسہ، انبیاء و مرسلین، آئمہ مقربین علیہم السلام کو دیکھنا۔ مشاہد مقدسہ، شعائر اللہ وغیرہ کی طرف نظر کرنا۔

دست و پا کی عبادت

شعائر اللہ، مقدس مقامات، قرآن مجید کو مس کرنا، مسجد کی طرف چل کر جانا، بیت اللہ کی طرف حج کے لیے چلنا، مقاماتِ مقدسہ، مزاراتِ متبرکہ کی طرف جتنے قدم چلیں گے، عبادت میں شمار ہوں گے۔

دل کی عبادت

محبت خدا اور محبت محبوبانِ خدا و بغض مغضوبانِ خدا۔ یعنی خدا کے دشمنوں کے ساتھ بغض رکھنا بھی عبادت ہے۔

عقل کی عبادت

آیاتِ خداوندی اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر کرنا، اس کے مظاہرِ قدرت کا مطالعہ کرنا اور اس کی عجیب و غریب مخلوقات میں غور و فکر کرنا، جس سے بندہ مومن کا ایمان بڑھے۔ بلکہ یہ تمام عبادتوں سے افضل عبادت ہے۔ عبادت کی اقسام شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی تفسیرِ عزیزی میں ذکر کی ہیں۔

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

مشہور و مسلمہ حدیث ہے کہ:

"ذِكْرُ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ".

"علی علیہ السلام کا ذکر عبادت ہے"۔

"اَلنَّظَرُ اِلٰى وَجْهِ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْطَالِبٍ عِبَادَةٌ".

"علی ابن ابیطالب علیہما السلام کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔"

یہ مشہور احادیث ہیں، جو کتب احادیث کے اوراق کی زینت بھی ہیں اور منبر کے واعظین اور ذاکرین کے بیان کا نمایاں حصہ بھی ہیں۔ بعض مخالف حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ جب ذکر علیؑ عبادت ہے تو علیؑ معبود ٹھہرے۔ اسی طرح نظر کرنا عبادت، تو بھی علیؑ معبود ٹھہرے۔ جس کا ذکر عبادت ہو وہ معبود ہوتا ہے۔ جب علیؑ معبود بن گئے تو دین اسلام کی بنیاد کلمہ طیبہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" ختم ہو گیا، بنیاد گر گئی اور جملہ اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" "خدا

کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔'' مگر شیعوں نے اس کی تردید کردی، اساسِ اسلام پر ضرب کاری لگادی اور "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ" کی تردید کردی حالانکہ یہ کلمہ شیعہ بھی پڑھتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر یہ احادیث اس کی سخت تردید کرتی ہیں کیونکہ یہ دونوں احادیث علیؑ کو معبود قرار دیتی ہیں۔

قارئین کرام! یہ اعتراض ہم نے مفصل تحریر کردیا ہے، اب اس کا جواب بھی مفصل سنئے۔

الجواب بالصواب

اس میں شک نہیں کہ ذکر خدا عبادت ہے۔ ذکرِ خدا دو طرح کا ہے۔ ایک بلاواسطہ اور دوسرا بالواسطہ۔ بلاواسطہ تسبیح، تحمید، تہلیل و تکبیر مثلاً "سُبۡحَانَ اللّٰه"، "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰه"، "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه"، "اَللّٰهُ اَکۡبَر" وغیرہ۔

ذکر

اور بالواسطہ اس کے مقربین خاص مثلاً انبیاء، اوصیاء اور اس کے اولیاء کا ذکر۔ چونکہ انبیاء اس کے بھیجے ہوئے ہیں، اولیاء اس کے اولیاء ہیں، اوصیاء اس کے انبیاء و رسل کے وصی ہیں، ان سب کا خدا کے ساتھ تعلق ہے اور اسی کے نمائندہ ہیں، اسی کے برگزیدہ ہیں، اسی کے پیغام رساں اور اسی کے احکام و ہدایت کے مبلغ ہیں۔ اس واسطے اس حیثیت سے ان کا ذکر خدا کا ذکر ہے۔

اگر یہ نفوسِ قدسیہ اس کے نمائندے نہ ہوتے، اس کے پیغامبر نہ ہوتے، اس کے دین کے مبلغ نہ ہوتے تو ہم اپنی مجالس و محافل میں ہرگز ان کا ذکر نہ کرتے۔ ہم اسی لیے ان کے ذکر سے اپنی مجالس کو زینت دیتے ہیں کہ یہ اسی کے ہیں اور ان کے ذکر سے اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کا ذکر منتہی ہوتا ہے ذکرِ خدا پر، اور ان کے واسطے سے ان کا ذکر، ذکرِ خدا تک پہنچتا ہے، اس واسطے ان کا ذکر عین ذکرِ خدا ہے۔

جس طرح ان کے فرمودات، فرمودات خدا ہیں، ان کے احکام، احکامِ خدا ہیں، ان کے اقوال، اقوالِ خدا ہیں، اسی طرح ان کا ذکر ذکرِ خدا ہے۔

یہ یاد رہے کہ ان مقدس و پاک افراد کا ذکر ان کی عبادت نہیں بلکہ عبادت خدا ہے۔ ذکر ان کا ہے لیکن ان کا ذکر عبادت خدا ہے۔ اس واسطے یہ معبود قرار نہیں پاتے۔

اسی طرح سرتاج اوصیاء، سرخیلِ اولیاء حضرت علی ابن ابیطالب علیہم السلام کا ذکر عبادت خدا ہے۔ کیونکہ جناب

امیر المومنین علیہ السلام برگزیدہ خدا، ولی اللہ، وصی رسولؐ اور اس کے خلیفۂ بلا فصل ہیں اس واسطے جناب امیر المومنین علیہ السلام کا ذکر بحیثیت وصی وخلیفہ کے ذکرِ خدا ہے اور بلحاظ امامِ معصوم اور ولیٔ خاص ذکرِ خدا ہے۔ چنانچہ اس مطلب کی وضاحت خود جناب پاک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثِ مبارکہ میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"زَيِّنُوا مَجَالِسَكُمْ بِذِكْرِ عَلِيِّ ابْنِ اَبِطَالِبٍ فَاِنَّ ذِكْرَهُ ذِكْرِيْ وَ ذِكْرِيْ ذِكْرُ اللّٰهِ وَ ذِكْرَ اللّٰهِ عِبَادَةٌ".

ذکر علیؑ عبادتِ علیؑ نہیں بلکہ عبادتِ خدا ہے

''علی ابن ابیطالب علیہم السلام کے ذکر سے اپنی مجالس کو زینت دو کیونکہ ان کا ذکر میرا ذکر ہے، میرا ذکر خدا کا ذکر ہے اور خدا کا ذکر عبادت ہے''۔

پس ذکرِ علیؑ عین ذکرِ خدا ٹھہرا اور ذکرِ خدا عبادت ہے، پس ذکرِ علیؑ عبادت ہے، تو جناب علی علیہ السلام کے ذکر سے علیؑ معبود قرار نہیں پاتے بلکہ خدا معبود قرار پاتا ہے۔ اس طرح نہ تو متعدد ہی معبود بنتے ہیں اور نہ ہی کلمۂ توحید پر زد پڑتی ہے اور نہ ہی **"اِیَّاکَ نَعْبُدُ"** کی تکذیب ہوتی ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی حسین و جمیل صنعتوں میں غور و فکر عبادت ہے کہ ان کے دیکھنے سے خدا کے وجود کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس کی عجیب و غریب خلقت سے اس کے کمالِ قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آسمان و زمین کی پیدائش سے خالق کریم کا پتہ چلتا ہے اور غور و فکر کرنے والا پکار اٹھتا ہے:

"مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً"

''تو نے اس کو بیکار پیدا نہیں کیا۔''

وہ خود اپنی آیات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ آیاتِ خداوندی میں غور و فکر کرنے سے ایمان و یقین میں زیادتی ہوتی ہے۔

"اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ"

''کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا۔'' زمین کس طرح بچھائی گئی ہے، آسمان کس طرح بلند کیا گیا ہے، پہاڑ کس طرح گاڑے گئے ہیں۔

یہ سب آیاتِ الٰہی ہیں۔ جب ان میں غور و فکر اور اس لحاظ سے ان کا ذکر عبادت ٹھہرا تو امیر المومنین علیہ السلام تو آیتِ کبریٰ ہیں، انسان شاہکارِ قدرت ہے۔

علیؑ کی طرف محبت سے نظر کرنا عبادتِ خدا ہے

جنابِ رسالت مآبؐ، امیر المومنینؑ اور آئمہ معصومین علیہم السلام آیاتِ عظمیٰ، اسماء حسنیٰ اور مظاہر قدرت ہیں اور فخرِ بنی نوعِ انسان ہیں اور تمام کائنات و مخلوقات سے افضل ہیں تو ان کا ذکر کیوں نہ عبادتِ خدا ٹھہرا۔ جس طرح کہ خانہ کعبہ کی طرف

دیکھنا اور قرآن مجید کی طرف نظر کرنا عبادت ہے کہ وہ اللہ کا خاص گھر اور اللہ کا خاص کلام ہے، تو یہ اللہ کے خاص بندے، اس کے مقربین بارگاہ اور اس کے خاص اور اشرف نمائندے ہیں تو ان کی طرف اس لحاظ سے دیکھنا کیوں نہ عبادتِ خدا قرار پائے؟

پس ان کا ذکر خیر اور ان کی طرف پُر خلوص ایمانی نگاہ عبادتِ خدا ہے۔ ان کی عبادت نہیں خدا کی عبادت ہے۔ خدا معبود ہے، یہ حضرات معبود نہیں۔ لہٰذا "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـه" بھی صحیح اور "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" بھی درست اور ان کا ذکرِ خیر بھی باعثِ اضافہ ایمان، زیادتی یقین، بالیدگی رُوح، جلائے قلب اور روشنی چشم بینا ہے۔ اسی کے خلاصہ اور مطلب پر شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی تفسیر عزیزی میں زیرِ آیت "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" روشنی ڈالی ہے، خواہش مند حضرات ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

دستور ہے کہ جب انسان کسی شے سے محبت کرتا ہے تو زبان پر اکثر اسی کا ذکر رہتا ہے اور خیال میں بھی محبوب ہی سمایا رہتا ہے۔ ہم چونکہ ان سے محبت کرتے ہیں اسی واسطے ہماری زبانیں ان کے ذکرِ پاک سے تر رہتی ہیں، خیال میں یہی بستے ہیں اور دلوں کے خانے انہی کی یاد سے معمور رہتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر کوئی محبوب خدا نہیں، لہٰذا جس طرح ان کا ذکر، ذکر خدا ہے، ان سے محبت بھی عینِ محبت خدا ہے۔ اسی لیے ان کی مودت کا حکم صادر فرمایا کہ ان کی مودت سے نہ صرف یہ کہ مودتِ خدا دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے بلکہ ان کی محبت کے بغیر محبت خدا ہو ہی نہیں سکتی۔

ان کی محبت، محبتِ خدا اور ان سے بغض، بغضِ خدا ہے۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یَا عَلِیُّ حُبُّکَ اِیْمَانٌ وَّ بُغْضُکَ نِفَاقٌ".

"اے علیؑ! آپ کی محبت ایمان ہے اور آپ سے بغض منافقت ہے۔"

صرف علیؑ سے محبت رکھنا ہی عبادت نہیں بلکہ علیؑ کے دشمن سے نفرت و بیزاری کرنا بھی عبات ہے۔

معرفت و اخلاص

عبادت میں دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اگر وہ نہ ہوں تو عبادت نہ صرف محض بیکار محنت اور بے فائدہ مشقت بن کر رہ جاتی ہے بلکہ بعض اوقات عابد بجائے ثواب کے عقاب کا مستحق بھی ہو جاتا ہے۔ وہ بیچارہ بیحد مفلس اور بے مایہ ہے کہ عبادت کرتا ہے، محنت و مشقت سے تھک جاتا ہے لیکن صلہ سے محروم رہتا ہے۔

معرفتِ معبود

انسان کی فطرت میں عبادت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور انسان مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں سے متعدد چیزوں کے

سامنے سر کو جھکا تا رہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، آگ، درخت، مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے بت کئی زمانوں میں انسان کے معبود رہے ہیں۔ فطری کشش نے انسان کو پرستش پر مجبور کیا لیکن باطنی ہادی، عقل اور ظاہری ہادی نبی کی ہدایت سے محروم رہنے کی وجہ سے پرستش کرنے والا انسان عبادت کی محنت کا ثمرہ نہ پا سکا۔ عبادت تو کرتا رہا مگر جن کی عبادت کی وہ صحیح معبود اور عبادت کے لائق نہ تھے۔ جب وہ نفع ونقصان کے مالک ہی نہ تھے تو وہ کیا صلہ دیتے؟

اس واسطے اے عزیز انسان! عبادت سے پہلے معبود کو پہچان!

"اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ".

"دین کی پہلی اینٹ اس کی پہچان ہے"۔

سورج، چاند، ستارے، درخت، آگ، انسان اور بت وغیرہ خود مخلوق ہیں، زوال پذیر ہیں۔ اگر ان میں خوبیاں ہیں تو ان کی بناء پر وہ قابلِ مدح تو ہو سکتے ہیں، قابلِ عبادت نہیں۔

قابلِ عبادت وہ ہے جس نے ان کو وجود بخشا۔ ان کو چمک، دمک، روشنی اور نور عطا فرمایا۔ انسان مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر بھٹک گیا اور ان کو کمال کی وجہ سے معبود سمجھ بیٹھا اور ان سے آگے نہ بڑھا۔ آگے بڑھتا تو کمال بخشنے والے خالق تک پہنچ جاتا اور معبودِ حقیقی کا پتہ حاصل کر لیتا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ".

"سورج اور چاند کو سجدہ مت کرو۔ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا، اگر تم خاص اس کی عبادت کرنا چاہتے ہو"۔ (فُصِّلَت)

تو معلوم ہو گیا کہ صحیح معبود کے بغیر عبادت باطل، اسی طرح صحیح ہادی کی معرفت کی بغیر اطاعت باطل۔ کیونکہ جس معبود کی تو عبادت کر رہا ہے اگر نا اہل ہے تو عبادت باطل ہے اور جس امام کی تو اطاعت کر رہا ہے اگر غلط ہے تو اطاعت بیکار۔ اس واسطے عبادت واطاعت سے پہلے معبود اور مطاع کی پہچان لازمی ہے۔ جب عرفان حاصل ہو جائے تو عبادت میں عابد کو مزہ حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح صحیح امام کی معرفت سے اطاعت کا لطف حاصل ہوتا ہے کیونکہ عبادت واطاعت کرنے والے کو صلہ کی اُمید اور ثواب کا یقین ہوتا ہے۔

اخلاص

کمالِ معرفت اللہ کو واحد ماننا اور شرک کی آمیزش سے پاک جاننا۔ جب اس کی کسی قدر معرفت ہو جائے تو غیر کو اس جیسا نہیں مانا جاسکتا کیونکہ اس کے سوا باقی تمام مخلوق ہے اور مخلوق خالق کے برابر کہاں ہو سکتی ہے۔ اگر کسی اور کو اس کے برابر یا اس جیسا مان لیا تو اس کی معرفت سے بیگانہ رہا۔ اسی واسطے حکم ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ"، "ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔

تیرے غیر کی عبادت نہیں کرتے۔ چونکہ وہ تنہا عبادت کے لائق ہے اور غیر عبادت کے لائق نہیں اس واسطے غیر کو عبادت میں شریک کرنا، نااہل کو اہل کے برابر سمجھنا ہے اور یہ شرک ہے۔ اس طرح اہل کی عبادت بھی ضائع ہو جاتی ہے۔

جس طرح عبادت میں نااہل کو اہل کے برابر سمجھنا عبادت کو باطل کر دیتا ہے، اسی طرح نااہل کی اطاعت سے اہل کی اطاعت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ جھوٹے نبی کو مان لینے سے سچے نبی کو مان لینا بے فائدہ ہے۔ اسی طرح جھوٹے امام کو ماننے سے سچے امام کو ماننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

توحید سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اہل کے اقرار سے پہلے نااہل کا انکار ضروری ہے۔ اسی لیے کلمہ توحید یہ سبق دیتا ہے کہ پہلے نااہل کا انکار کرو پھر اہل کا اقرار کرو۔

"لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ"۔

"حق میں باطل کو نہ ملاؤ۔" حق و باطل میں تمیز کرو۔ حق کو حق اور باطل کو باطل، سچ کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا سمجھو۔ حق کو حق سمجھ کر اس کی پیروی کرو اور باطل کو باطل سمجھ کر اس سے بیزاری اختیار کرو۔

عبادت میں خلوص

ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیا جاتا ہے اور جس کا مقصد تقرب بارگاہِ خدا ہے، وہ عبادت ہے۔ عبادت کوئی اور کسی طرح کی بھی ہو، اس میں صرف اور صرف خدا کی رضا و قربت مقصود ہے۔ اگر عبادت میں غیرِ خدا کی خوشنودی کا ذرا بھی خیال دل میں آیا تو خلوص جاتا رہے گا، ریاکاری آجائے گی اور وہ اس کا صلہ خدا سے مانگنے کا حقدار نہ رہے گا۔ خدا سے تو وہ صرف اسی صورت میں اجر لینے کا حقدار ہوگا جب اس نے عبادت خالص رضائے خدا کے لیے کی ہوگی۔

ایک عبادت ہے حصولِ جنت اور نعماتِ اُخروی کیلئے۔ یہ عبادت تاجروں کی ہے کہ تاجر حصولِ نفع کے شوق میں خرید و فروخت کرتا ہے اور کوئی بھی کاروبار کرتا ہے تو نفع حاصل کرنے کے لیے۔ گو یہ عبادت بھی صحیح ہے مگر کامل نہیں ہے۔

ایک عبادت ہے عذابِ آخرت سے بچنے کے لیے کہ گر بندہ عبادت نہ کرے تو اسے عذاب ملے گا۔ وہ عذاب کے ڈر

سے عبادت کرتا ہے۔ یہ غلاموں اور نوکروں کی عبادت ہے کہ آقا کی غلام ونوکر فرمانبرداری تو کرتے ہیں لیکن آقا کی سزا سے ڈر کر کہ اگر اطاعت نہ کی جائے اور تعمیل حکم نہ کریں تو آقا سزا دے گا۔ عبادت تو صحیح ہے مگر کامل نہیں۔

تیسری عبادت یہ ہے کہ نہ تو جنت کا لالچ ہے اور نہ ہی دوزخ کا ڈر۔ بندہ صرف اس لیے عبادت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ عبادت کے لائق ہے۔ یہ آزادوں کی اور کامل وافضل عبادت ہے۔ اسی لیے جناب امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مَا عَبَدْتُکَ طَمَعاً لِلْجَنَّةِ وَ لَا خَوْفاً مِنَ النَّارِ بَلْ وَجَدْتُکَ اَهْلاً لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ".

"بارالٰہا میں نے تیری عبادت جنت کے شوق میں نہیں کی اور نہ ہی دوزخ کے خوف بلکہ تجھے عبادت کے لائق پایا تو تیری عبادت کی"۔

جب عابد معرفت معبود حاصل کر لیتا ہے تو اسے عبادت میں مزہ آتا ہے کہ وقتِ عبادت، خیالِ معبود میں یوں محو ہو جاتا ہے کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کا دنیا سے تعلق کٹ جاتا ہے اور معبود کے دھیان میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ یہی حال جناب امیر المومنین علیہ السلام کا حالتِ نماز میں ہوتا تھا کہ پاؤں سے حالتِ نماز میں تیر نکال لیا جاتا اور عابدِ عارف کو درد تک محسوس نہ ہوتا اور نہ ہی پتہ چلتا کہ پاؤں سے تیر نکال لیا گیا ہے۔

یہی حالت تھی عارفانِ حق کی میدان کربلا میں کہ حمایت حق کے خیال اور وصال خدا کے شوق میں پیاس کی شدت، بھوک کی تکلیف اور زخموں کے درد والم کا احساس تک نہ رہا۔ احساس تھا تو اہلبیتؑ رسولؐ کی حفاظت کا۔ حق کی نصرت اور فرزندِ رسولؐ کی حمایت کا۔ وہ موت کی طرف یوں دوڑ کے جاتے جس طرح پیاسا چشمہ آب کی طرف دوڑتا ہے۔ انہیں نیزوں اور تیروں کے زخموں میں لذت محسوس ہوتی تھی اور شوقِ شہادت میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے۔ جس طرح شیر خوار بچے کو ماں کی چھاتی سے اُنس ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر انہیں موت کی رغبت تھی۔

نماز ظہر کے بعد میرے مظلوم امام کی جمعیت گھٹ گئی۔ اکثر رفقاء جامِ شہادت پی کر رخصت ہو گئے۔ جو باقی رہ گئے وہ بھی باری باری اجازت لے کر راہیٔ جنت ہونے لگے۔ جب اصحابِ باوفا اور انصار خیر خواہ اپنا عہد وفا کر چلے تو رفاقتِ امامِ مظلومؑ کا حق ادا کر کے حسینؑ کے نانا کے یہاں پہنچ گئے تو بنی ہاشم کی باری آئی۔

بنی ہاشم کے شہداء کی تعداد میں اختلاف ہے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ اٹھارہ تھے مگر اس سے زیادہ تعداد بھی تواریخ ومقاتل میں مرقوم ہے۔ اسی طرح بنی ہاشم کے سب سے پہلے شہید کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر مورخین کی رائے یہ ہے کہ بنی ہاشم

میں سب سے پہلے شہید حضرت علی اکبر علیہ السلام ہیں۔

شہادتِ حضرت علی اکبر علیہ السلام

میر انیس جوان بیٹے کے متعلق کہتے ہیں:

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرامِ جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں یہی روح یہی رَوح یہی ہے
یارب! کوئی فرزند جدا ہو نہ پدر سے
موت آکے نہ لے جائے یہ دولت کسی کے گھر سے
اٹھ جاتا ہے جینے کا مزہ مرگِ پسر سے
جاتا نہیں یہ داغ موئے پر بھی جگر سے
اس غم میں کرے صبر نہیں دل یہ کسی کا
ہاں! سبطِ پیمبرؐ کا ، حسینؑ ابن علیؑ کا

نام ونسب

آپؑ کا نام علیؑ اور لقب اکبرؑ ہے۔ چونکہ امامِ مظلومؑ کے شہید ہونے والے دو فرزند شہیدوں میں سے یہ بڑے ہیں۔ اسی لیے انہیں اکبر کہا جاتا ہے۔ گو بعض تاریخیں انہیں امام حسین علیہ السلام کا فرزندِ اکبر قرار دیتی ہیں اور انہیں جنابِ امام علی زین العابدین علیہ السلام سے بھی بڑا تحریر کرتی ہیں۔ مگر جناب شیخ مفید طاب ثراہ اور جنابِ ابن شہر آشوب ماژندرانی اور جناب علامہ جناب حسنین کشوری اعلی اللہ مقامہٗ انہیں جنابِ زین العابدین علیہ السلام سے چھوٹا قرار دیتے ہیں۔ جنابِ علی اکبرؑ کے بارے میں بار بار لفظ غلام آیا ہے اور غلام کمسن نوجوان کو کہتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ امام سجاد علیہ السلام سے چھوٹے تھے۔

اس لحاظ سے جنابِ امام حسین علیہ السلام کے فرزندوں میں علیؑ اوسط ہیں اور شہادت پانے والوں میں اکبر ہیں۔ جناب شیخ مفید کے مطابق ہم ان کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔

جنابِ علی اکبرؑ کے پدر بزرگوار حسین بن علی علیہم السلام ہیں اور والدہ جنابِ لیلیٰ بنت ابی مرۃ بن عروۃ بن مسعود ثقفی ہیں۔ حضرت علی اکبرؑ، جنابِ جعفر بن حسینؑ (ان کی وفات مدینہ میں ہوگئی تھی اور وہ کربلا میں نہ تھے) اور حضرت علی اصغرؑ جو پدر کے ہاتھوں پر شہید ہوئے سے بڑے ہیں۔

جنابِ لیلیٰ کے دادِ طائف کے مشہور سردار عروۃ بن مسعود ثقفی تھے۔ جن لوگوں نے مدینہ میں اسلام قبول کیا تھا، ان میں زمانہ کفر و جاہلیت کے چار سردار تھے۔ بشر بن ہلال عبدی، عدی بن حاتم طائی، سراقہ بن مالک مدرجی اور عروۃ بن مسعود ثقفی۔ یہ عروۃ بن مسعود ثقفی مقامِ حدیبیہ میں قریش کے سفیر بن کر آئے جب صلح نامہ تیار ہوا تھا اور ۹ ہجری میں یہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔

جنابِ لیلیٰ کی والدہ ابوسفیان کی بیٹی میمونہ تھیں جن کی کنیت امّ شیبہ بیان کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے جنابِ لیلیٰ معاویہ کی بھانجی ہیں۔ اسی بناء پر یوم عاشور وقتِ قتال جناب علی اکبرؑ کو اس قرابت کی وہ امان پیش کی گئی تھی۔ جس طرح جنابِ عباس اور ان کے بھائیوں کو امان نامہ پیش کیا گیا تھا اور جس طرح انہوں نے امان نامہ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا، اسی طرح حضرت علی اکبرؑ نے بھی اس امان کو رد کر دیا تھا۔

حالاتِ جنابِ علی اکبر علیہ السلام

معاویہ بن ابوسفیان اکثر جنابِ علی اکبر علیہ السلام کی مدح کیا کرتا تھا۔ ایک دن امیر شام نے اپنے درباریوں سے کہا:

''اس امر خلافت کا حقدار کون ہے؟''

درباریوں نے ازراہِ خوشامد کہا: ''آپ ہیں۔''

معاویہ نے کہا: ''نہیں! خلافت کے حقدار حضرت علی اکبر علیہ السلام ہیں کہ ان میں بنی ہاشم کی شجاعت، بنی امیہ کی سخاوت اور بنی ثقیف کا حسن و جمال جیسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔''

یہ تو معاویہ کی زبان تھی مگر تمام اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ بنی ہاشم کی میراث تھے حضرت علی اکبرؑ جن کے ورثہ دار تھے۔ آپ جود و کرم اور مہمان نوازی میں ممتاز تھے۔ حسینیؑ لنگر کے ناظم اور مہمان خانہ کے منتظم تھے۔ عرب میں مہمان نوازی

نہایت عظیم الشان عادت اور قابلِ فخر صفت تصور کی جاتی تھی۔ جو مہمان نوازی سے کتراتا اس کی سخت مذمت اور مہمان نواز کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔

حضرت علی اکبر مہمانوں کی حد درجہ تواضع کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ امام حسینؑ کے مہمانوں کی میزبانی کے لیے علی اکبرؑ جیسا کوئی مہمان نواز نہ تھا۔ حضرت علی اکبر مہمان خانہ میں اعلیٰ قسم کے کھانے پکواتے۔ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور مہمانوں کو عزت واحترام کے ساتھ کھلاتے۔ چھتوں پر آگ روشن کرتے جو مہمان نوازی کی علامت اور مہمان خانہ کی طرف رہنمائی کرتی تھی تاکہ مہمانوں کو راہ ڈھونڈنے اور مہمان خانہ تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

قربان جاؤں! جس حسین نوجوان کی سخاوت اور مہمان نوازی کی یہ عادت ہو، روزِ عاشور کربلا میں ایک گھونٹ پانی مانگتا ہے مگر نصیب نہیں ہوتا۔ ہائے! انقلابِ زمانہ اور بیوفائی دنیا! ایسا سخی وکریم خشک ہونٹوں اور سوکھے گلے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

حضرت علی اکبر علیہ السلام علم وفضل میں اپنے بابا امام حسین علیہ السلام کے اور آدابِ حرب میں اپنے چچا ابوالفضل العباس علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ اخلاق وعادات، شکل وصورت اور رفتار وگفتار میں شبیہ محمد مصطفیٰؐ تھے۔ مدینہ کے لوگ دیدارِ پاک محمدؐ کے مشتاق ہوتے تو حضرت علی اکبر علیہ السلام کی زیارت سے وہ شوق پورا کر لیتے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کو اپنے ہمشکلِ پیغمبر فرزند سے بہت محبت تھی۔ انہیں دیکھ دیکھ کے خوش ہوتے۔ اس پیارے نازنین اور شبیہِ رسولؐ بیٹے کی ہر حاجت پوری کرتے خواہ اعجاز سے ہی ہو۔ ایک مرتبہ حضرت علی اکبر علیہ السلام نے اپنے بابا سے انگوروں کی خواہش کی۔ انگوروں کا موسم نہ تھا، امام حسین علیہ السلام نے مسجد کے ستونوں کو ہاتھ لگا کر اعجاز سے انگوروں کا گچھا اپنے پیارے دلبند کو عطا فرمایا اور ان کی خواہش رَد نہ کر سکے۔ مگر روزِ عاشور جب جنگ کرتے کرتے حضرت علی اکبرؑ واپس آئے اور ایک گھونٹ پانی کا مطالبہ کیا مگر امام علیہ السلام اس وقت ان کی خواہش کیوں نہ پوری کر سکے۔ اتنا کہا:

"بیٹا! کس قدر دشوار ہے کہ تم پانی مانگو اور میں نہ دے سکوں۔ ہاں! تھوڑی دیر صبر کرو! تمہارے جدِامجد تمہیں آبِ کوثر سے سیراب کریں گے"۔

اذنِ جہاد

انصار واصحاب کی شہادت کے بعد جناب علی اکبرؑ خدمتِ امامؑ میں حاضر ہوئے اور اذنِ جہاد چاہا۔ اٹھارہ انیس سال کا سن، آغازِ شباب، حسین وجمیل جوانِ رعنا، عصائے پیری، مسیں بھیگی ہوئی، سیاہ زلفیں لہراتی ہوئیں، نورانی چہرہ، سر پہ گیسوئے

دراز، رخِ انور سیاہ گیسوؤں میں یوں نظر آتا جس طرح بدرِ منیر سیاہ بادلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ میر انیس اس مقام پر فرماتے ہیں:

وہ شان وشوکت، وہ تیور، وہ جلالت چھپتے ہیں کہیں جوہرِ شمشیرِ رسالت

طینت میں کرم، طبع میں انصاف وعدالت اقبالِ علیؑ شانِ شہنشاہِ رسالتؐ

دیکھا جو رُخ، عرش کے سرتاج کو دیکھا

زلفوں کو جو دیکھا، شبِ معراج کو دیکھا

حضرت علی اکبرؑ کو اذنِ جہاد دینے میں امام علیہ السلام نے تاخیر تو نہ کی مگر دل پہلو میں بیٹھ گیا۔

"نَظَرَ اِلَیْهِ نَظَرَ آئسٍ مِنْهُ وَ اَرْخیٰ عَلَیْهِ السَّلَام عَیْنَیْهِ وَ بَکٰی".

"آپ نے وداع ہونے والے فرزند کو غمگین نگاہوں سے دیکھا اور گریہ فرمایا"۔

غمگین اس لیے کہ جو میدانِ جہاد میں جاتا اس کے زندہ رہنے کی اُمید نہ رہتی۔ اپنے نوجوان فرزند کی شہادت سے غمگین ہوگئے۔ گویا عصائے پیری ہاتھ سے گرا چاہتا تھا اور آنکھوں کو رونے کیلئے کھلا چھوڑ دیا۔ صرف معمولی نہیں روئے آنکھوں کو چھوڑ دیا۔ مثلِ ابر برسنے لگیں زخمی قلب وجگر کا لہو تھا جو بیقراری کے عالم میں آنکھوں میں سے پانی کی صورت میں بہہ رہا تھا، اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پسر کو گلے لگایا۔ بھیگی ہوئی مسوں کے بوسے لئے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ تبرک کے طور پر ہم شکلِ رسولؐ کے رُخِ انور کو چوما اور اپنے ہاتھوں سے شہزادہ علی اکبرؑ کو اسلحہ پہنایا، جسم کو زرہ پوش کیا، پہلو میں تلوار لٹکائی، کمر بند سے مضبوط کمر باندھی اور سر دستار اس طرح باندھی کہ اس کے پہلو کے کنارے کھلے چھوڑ کر تحت الحنک باندھی۔ جس طرح میت کو کفن دیتے وقت عمامہ، مولا نے اس طرح اس مجاہد کو اسلحہ سے سجایا اور ایک طرح کا کفن بھی تھا۔

زرہ پاک رسولؐ کی تھی، عمامہ بھی رسول کا تھا، گھوڑا بھی رسول کا تھا، کیونکہ شکل بھی رسولؐ کی تھی۔

میدانِ کارزار کی طرف روانگی

حضرت علی اکبر علیہ السلام کی آخری رخصت معمولی نہ تھی۔ قیامت کا منظر تھا۔ یہ بیس سالہ نوجوان عصمت سرا میں مخدراتِ اہل بیتؑ سے رخصت ہونے کیلئے آیا تو حرم سرا میں کہرام بپا ہوگیا۔ مستورات کی آہیں آسمان کو جاتی تھیں۔ درمیان میں حضرت علی اکبر علیہ السلام اور گرد مستورات نے حلقہ باندھا ہوا تھا۔ کوئی بی بی ہاتھوں کو چومتی تھی، کوئی رخِ انور کے بوسے لیتی تھی، کوئی زلفوں کو اور کوئی بی بی کمر کو دیکھ کر زمین پر گر پڑتی تھی۔

عزادارو! حضرت علی اکبر علیہ السلام کی رخصت کا حال حضرت زینبؑ کے دل اور حضرت لیلیٰؑ کے جگر سے پوچھیے، حضرت ام کلثومؑ کے نالوں، حضرت فاطمہ کبریٰؑ کے کھلے بالوں سے، معلوم نہیں حضرت امام سجاد بیمار علیہ السلام سے کس طرح ملے اور معصومہ حضرت سکینہؑ سے کس طرح رخصت ہوئے۔ خود امام حسین علیہ السلام کی یہ حالت تھی کہ جوان پسر کے چہرے کو بار بار دیکھتے اور آہ سرد کھینچ کر رہ جاتے۔ اپنے ہاتھوں سے عقاب نامی گھوڑے پر سوار کیا نوجوان پسر گھوڑے پر سوار ہیں، مجاہد میدان کارزار کی طرف بڑھ رہا تھا اور ضعیف العمر پدر بزرگوار چند قدم ساتھ چلنے کے بعد رخصت کرنے بعد بقلب بے قرار و بادیدہ اشکبار آسمان کی طرف منہ کر کے کہتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَيْهِمْ غُلَامٌ اَشْبَهُ النَّاسِ خَلْقاً وَّمَنْطِقاً بِرَسُوْلِكَ وَكُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰى نَبِيِّكَ نَظَرْنَا اِلٰى وَجْهِهٖ".

"اے اللہ! تو گواہ رہ کہ اب ان لوگوں کی طرف وہ جوان جا رہا ہے جو شکل وصورت، اخلاص وسیرت اور رفتار وگفتار میں تمام لوگوں سے زیادہ تیرے رسولؐ سے مشابہت رکھتا ہے۔ جب ہم لوگ تیرے نبی کی زیارت کے مشتاق ہو جاتے ہیں تو اس آئینہ جمال وکمال رسولؐ کے رخ انور کو دیکھ لیتے ہیں۔ شوق زیارت پورا ہو جاتا ہے۔"

امام مظلوم علیہ السلام کے ان فقروں سے ان کے دلی جذبات کا پتہ لگتا ہے کہ کس دل سے جوان پسر کو میدان میں بھیجا۔ چونکہ مقصد شریف اور ارادہ بلند تھا اس واسطے امام حسین علیہ السلام اپنے آپ پر قابو پا کر واپس آگئے اور جناب علی اکبرؑ میدان کارزار کو سدھارے۔

ہاں عمر بن سعد کو پکار کر کہا: "اے عمر! خدا تیرے رحم کو قطع کرے، اور یہ دنیا تیرے لئے مبارک نہ کرے اور خدا تجھ پر اس شخص کو مسلط کرے جو تجھ کو تیرے فراش پر ذبح کرے۔ جس طرح تو نے میرے رحم کو قطع کیا اور جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ میری قرابت کا کوئی خیال نہیں کیا۔

اس کے بعد مغموم امام علیہ السلام نے دکھے دل کے ساتھ یہ آیت تلاوت فرمائی:

"اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحاً وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَّ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ".

حضرت امام حسین علیہ السلام تو خاموش ہو کے بیٹھ رہے اور جناب علی اکبرؑ خیام حسینیؑ میں اس طرح برآمد ہوئے جس

طرح مشرقی افق سے خورشید طلوع ہوتا ہے۔ میدانِ جہاد میں جا کر یہ رجز پڑھا۔

شہزادۂ کی شجاعت

اَنَاعَلِیُ بُنُ الحسین بن عَلِی مِن عُصُبَةٍ جُدَّابَیْهِمُ النَّبِیُ وَاللّٰهِ لَا یَحْکُمُ نَیْنَا ابنُ الدَّعِي اَطْعَنُکُمْ بِالرُّمْحِ حَتّٰی یَنْثَنِیْ اَضْرِبُکُمْ بِالسَّیْفِ اَحْمِیْ عَنْ اَبِیْ ضَرْبَ غُلَامٍ هَاشِمِیٍ عَلَوِی.

''میں حسین بن علی علیہم السلام کا فرزند ہوں اور اس گروہ سے ہوں جس کے جدامجد رسول اللہ ہیں۔ خدا کی قسم! ولد الحرام ہمارا حاکم نہیں بن سکتا۔ میں تم پر نیزے سے وار کروں گا اور اپنے والد ماجد کی حمایت کرتے ہوئے ایسی تیغ زنی کروں گا جو ہاشمی اور حیدری جوانوں کی شان ہے''۔

اس کے بعد اس ہاشمی جوان نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ شجاعانِ کوفہ کے چھکے چھوٹ گئے اور حضرت علیؑ کے پوتے نے وہ دلیرانہ حملہ کیا کہ کوفیوں میں سے کوئی سامنے نہ آسکا۔ جس طرف رُخ کرتے کشتوں کے پشتے لگ جاتے اور حصہ میدان دشمنوں سے خالی ہو جاتا۔

جناب شیخ مفید لکھتے ہیں کہ:

''اَهْلَ الْکُوْفَةِ یَتَّقُوْنَ قَتْلَهٗ وقِتَالَهٗ''.

''ہم شکل پیغمبرؐ ہونے یا وارثِ شجاعتِ حیدریؑ ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ ان سے لڑنے اور قتل کرنے میں گریز کر رہے تھے''۔

باوجود بھوکا پیاسا ہونے اور درد والم سے دوچار اور دکھوں میں مبتلا ہونے کے شہزادے نے ہاشمی وحیدری شجاعت کے وہ کمال نمونہ پیش کیا کہ اشقیاء اپنے مقتولین کی کثرت سے گھبرا گئے۔ قوت ودلیری تو ہاشمی جوانوں کی مشہور ہے، آداب حرب ان بڑھ کر کون جانتا ہے۔ حیدر کرارؑ کے پوتے نے پہلے حملے میں ایک سو بیس ناریوں کو واصل جہنم کیا۔

اب شہزادے کا تن زخمی ہو چکا ہے۔ تیروں تلواروں اور نیزوں کے زخم کافی لگ چکے ہیں۔ گلشن رسالت کا پھول پیاس کی شدت اور دھوپ کی حدت کی وجہ سے کملا چکا ہے۔ یہ گل نازنین کئی روز سے بے آب تھا۔ دھوپ میں مجاہد کو پیاس لگتی ہے۔ اب زخموں کی کثرت سے پیکر دلربا نڈھال ہو چکا ہے۔

قربان جاؤں زخمی کو پیاس بہت لگتی ہے۔ لوہے کے ہتھیار جو زیب تن تھے گرم ہو گئے، انہوں نے پیاس کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ بدن کمزور ہو چکا ہے اور ہتھیار بوجھل ہو رہے ہیں۔ پانی کی تمنا میں شہزادے نے گھوڑے کی باگیں خیام کی طرف موڑیں۔ ادھر پیاس کا غلبہ تھا، اُدھر جذبہ غالب تھا۔ غیرت ہاشمی حملہ کرنے پر آمادہ کرتی اور جوشِ حیدری تلوار چلانے پر اُکساتا مگر زخموں کی کثرت خود، زرہ کی تپش اور پیاس کا غلبہ حائل ہو جاتا۔ باوجود اس کے کہ شہزادے کو علم تھا کہ پانی نہیں ہے، پھر بھی پیاس کا شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ بابا کی خدمت میں پہنچ کر عرض کی:

"یَا اَبَتِ اَلْعَطَشُ قَدْ قَتَلَنِیْ وَثِقْلُ الْحَدِیْدِ اَجْهَدَنِیْ فَهَلْ اِلٰی شَرْبَةٍ مِنَ الْمَآءِ سَبِیْلٌ من اتَقَوّیٰ بِهَا عَلَی الْاَعْدَآءِ".

"بابا جان مجھے پیاس نے مار ڈالا اور آہنی ہتھیاروں کے بوجھ نے تھکا دیا۔ کیا کسی صورت قدرے آب میسر ہو سکتا ہے تاکہ میں اسے پی کر تازہ دم ہو کر طاقت پکڑ کر دشمنوں کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاؤں"۔

ہو سکتا ہے کہ شہزادے نے ازراہِ اعجاز پانی طلب کیا ہو۔ چونکہ یہ وقت امتحان تھا اگر بطور معجزہ پانی پلاتے تو مقصدِ امتحان اور صبر میں خلل آتا۔

کتنی دردانگیز گھڑی تھی اور مظلوم پدر کے لئے کس قدر المناک تھا کہ زخموں سے نڈھال، خون میں نہایا ہوا جوان رعنا چند لمحوں کا مہمان اور پیاس سے بے تاب پسر پانی کا سوال کرتا ہے لیکن بے بس والد بیٹے کی خواہش کو پورا نہیں کر سکتا، بیٹا پیاس سے بے چین ہے اس لئے وہ سوال آب میں حق بجانب ہے۔

ادھر مجبور پدر پانی نہیں دے سکتا، کہاں سے پانی لائے، برتن خالی ہیں، مشکیں سوکھ چکی ہیں، گھاٹ پر پہرہ ہے۔

روکے ہوئے تھی نہر کو اُمت رسولؐ کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتولؑ کی

امام حسین علیہ السلام سے پوچھئے کس طرح بیٹے کو غمگین جواب دیا ہوگا، کتنا صدمہ ہوا ہوگا اس وقت امام علیہ السلام کو جب پیاسے بیٹے کو سیراب نہ کر سکے۔ جناب اکبرؑ آپ کی پیاس پر قربان اور مولا حسینؑ آپ کے صبر پر صدقے۔

مومنین! دل تھام کر صابر پدر بزرگوار کا جواب سنئے:

"یَا بُنَیَّ مِنْ اَیْنَ اٰتِیْ لَکَ بِالْمَآءِ قَاتِلْ قَلِیْلاً فَمَا اَسْرَعَ اَنْ تَلْقیٰ جَدَّکَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ یَسْقِیْکَ بِکَاسِهِ الْاَوْفٰی شَرْبَةً لَا تَظْمَاءُ بَعْدَهٗ اَبَداً".

"ہائے افسوس! بیٹا تیرے لئے کہاں سے پانی لاؤں؟ جان پدر! تھوڑی دیر اور جہاد کر لو۔ تم بہت جلد اپنے جد نامدار سے ملاقات کرنے والے ہو، وہ تمہارے اشتیاق میں منتظر ہیں۔ وہ تمہیں حوضِ کوثر کا جام طہور پلائیں گے۔ بیٹا! اس کے بعد تمہیں کبھی پیاس نہ لگے گی"۔

اس کے بعد فرمایا:

"یَابُنَیَّ یَعِزُّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنْ تَدْعُوْھُمْ فَلَا یُجِیْبُوْکَ وَ تَسْتَغِیْثُ بِھِمْ فَلَا یُغِیْثُوْکَ بُنَیَّ ھَاتِ لِسَانَکَ فَمُصَّہُ"۔

"بیٹا مجھ پر تیرے جد امجد محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی المرتضیٰ علیہ السلام پر یہ بات کتنی شاق ہے کہ تم انہیں بلاؤ اور وہ کوئی جواب نہ دے سکیں، تم انہیں مدد کیلئے پکارو اور وہ تمہاری مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ بیٹا! بے شک تو پیاس کا ستایا ہوا ہے اور میں اُمت جد کا ستایا ہوا ہوں، اور تو میرے پاس کچھ نہیں اپنی زبان میرے منہ میں دے دو اور میری زبان چوس لو"۔

جناب علی اکبر علیہ السلام نے پدر بزرگوار کے منہ میں اپنی زبان دی لیکن فوراً نکال لی اور کہا:

بابا جان! آپؑ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ خشک ہے معلوم ہوتی ہے کہ آپؑ تو مجھ سے بھی زیادہ پیاسے ہیں۔ اس کے بعد امام حسین علیہ السلام نے ایک انگوٹھی جناب علی اکبر علیہ السلام کو دی اور فرمایا کہ اسے منہ میں رکھ لو شاید تسکین ہو جائے۔

حضرت علی اکبر علیہ السلام وہ انگوٹھی منہ میں لئے واپس میدان قتال کی طرف لوٹے۔ اس وقت آپؑ کی زبان پہ یہ رجزیہ اشعار تھے:

اَلْحَرْبُ قَدْ بَانَتْ لَنَا الْحَقَائِقُ ۔۔۔ وَظَهَرَتْ من بَعْدِ هَا مَصَادِقُ

وَاللهِ رَبِّ الْعَرْشِ لَا نُفَارِقُ ۔۔۔ جُمُوعَكُمْ اَوْ تُغْمَدُ الْبَوَارِقُ

حالاتِ شہادت

گھمسان کا رن پڑا تلواریں چلنے لگیں اور دشمنان دین کی لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں۔ اب کی بار حضرت علی اکبرؑ نے اَسّی (۸۰) کے قریب ملاعین کو فی النار کیا۔

مرہ بن منقذ عبدی فوجِ مخالف کا ایک بد بخت فرد ہے۔ اس نے شہزادے کی شجاعت کو دیکھا اور اب جب زخموں سے

نڈھال اور کثرت سے خون بہ جانے کی وجہ سے بدن کی کمزوری دیکھی تو کہنے لگا کہ مجھ پر تمام عرب کے گناہوں کا بوجھ ہو اگر یہ شہزادہ اسی طرح حملہ کرتے ہوئے میرے پاس گزرے اور میں اس کے باپ کو سوگ میں نہ بٹھاؤں۔ جب جنابِ علی اکبرؑ طاقت میں تھے، اس وقت تو قریب نہ آیا۔

خون میں غلطاں، پیاسے اور زخمی نوجوان کو کمین گاہ سے چھپ کر نیزہ مارا کہ شہزادہ زین پر سنبھل نہ سکا۔ اتنے میں ایک ملعون نے شہزادہ علی اکبر علیہ السلام کے سر پر تلوار ماری کہ سر شگافتہ ہوگیا اور ہوا میں لہراتی زُلفوں سے خون زمین پر گرنے لگا۔ پشتِ فرس شہزادے سے خالی ہوگئی۔ حضرت علی اکبر علیہ السلام نے اپنی بانہیں گھوڑے کی گردن میں ڈال دیں۔ گھوڑے کا بدن اور سر شہزادے کے خون سے تر ہوگیا۔ خون گھوڑے کی آنکھوں پر گرا، گھوڑے کو خیام کا راستہ نہ ملا۔ گھبراہٹ کے عالم میں خیام کی بجائے لشکرِ اعداء میں چلا گیا۔

شہزادہ نہ گھوڑے کی زین پر ہے نہ فرشِ زمین پر، ہاں اتنا عرض کرتا ہوں کہ بانہیں گھوڑے کی گردن میں ہیں۔

بے دست و پا اور موت سے ہمکنار جنابِ علی اکبر علیہ السلام جب دشمنوں کے وسط میں پہنچے تو چاروں طرف سے زخمی بدن پر تلواریں چلنے لگیں اور تلواروں نے جنابِ علی اکبرؑ کی بانہوں کو گھوڑے کی گردن سے جدا کیا۔ فرشِ زمین پر گرتے ہوئے خیام کی طرف منہ کر کے کہا:

"یاابتاہ ادرکنی ابتاہ علیک منی سلام".

"بابا جلدی پہنچیں، بابا میرا آخری سلام ہو"۔

اس کے بعد کہا:

"هٰذا جَدّی رَسُولُ اللّٰهِ سَقَانِیْ بکا سہٖ الاوفیٰ شربةً لا اَظْمَاءُ بعدهٗ اَبَدًا وَهُوَ يَقْرَئُکَ السَّلَامَ ويقول لکَ عَجِّلِ الْقُدُوْمَ اَلَيْنَا".

"بابا! میرے جدِ امجد نے مجھے سیراب کردیا ہے۔ بابا! میں نے وہ جام پی لیا ہے جس کی آپ نے بشارت دی تھی۔ بابا! میں اب پیاس سے راحت پاچکا ہوں۔ اب میں کبھی پیاسا نہیں رہوں گا۔ جدِ امجد آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ بیٹا حسینؑ! تیری پیاس سے بہت بے چین ہوں، جلدی آؤ تم بہت پیاسے ہو۔ تمہارے لئے دوسرا جام تیار ہے"۔

قریب شہادت شہزادے کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی امام حسین علیہ السلام کے کانوں تک پہنچی۔

ضعیف العمر پدر کی جوان بیٹے کی لاش پر آمد

اس صدائے جانکاہ نے امام حسین علیہ السلام کے قلب کیا اثر کیا، اسے وہی جانے جس نے جواں پسر کے مرنے کا صدمہ برداشت کیا ہو۔ امام علیہ السلام اس صدا کو سن کر اٹھے۔ میں نہیں بتا سکتا کہ کس طرح اٹھے۔ دل تھام کر اٹھے یا کمر پر ہاتھ رکھ کے اٹھے یا عصاء کے بل زمین سے اٹھے۔ چہرے کی رنگت اور بدلی ہوئی حالت دیکھ کر اہل حرم نے اندازہ لگا لیا کہ جناب علی اکبر علیہ السلام بھی شہادت نوش کر چکے ہیں۔

مظلوم پدر بزرگوار مقتل کی طرف روانہ ہوئے۔ کبھی اٹھتے تھے، کبھی بیٹھتے تھے۔ گو تیزی سے جانب پسر چلے مگر راستے میں کئی بار بیٹھنا پڑا، دنیا اندھیر نظر آتی تھی۔ آواز دیتے تھے کہ بیٹا اکبر! کہاں ہو؟ جب آواز آئی اور لاش کے قریب پہنچے تو چلنے کی سکت نہ رہی۔

بیان کیا جاتا ہے۔ بیان کرنے والے بھی فاضل اجل ذمہ دار اہل علم وفضل ہیں کہ امام حسین علیہ السلام اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ چلا نہیں جاتا تھا۔ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چل کر جواں پسر کی لاش پر پہنچ جاتے ہی اپنا رخسار اکبرؑ کے رخسار پر رکھ دیا۔ چاند سا چہرہ خاک وخون میں غلطاں تھا، سیاہ زلفیں خاک پر پھیلی ہوئی تھیں، تصویر نبوی گرم ریت پر لہولہان تھی۔ اپنا رخسار اکبر کے رخسار پر رکھا اور آنکھوں کو رونے کیلئے چھوڑ دیا، آنکھیں روئیں رونے کا موقع تھا۔ آنسو کیا تھے؟ قلب وجگر کا خون تھا جو آنکھوں سے اشکوں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

امام حسین علیہ السلام روئے، جی بھر کے روئے کیونکہ انؑ کے رونے کا یہ موقع تھا۔ فطرت کا تقاضا تھا اور امام حسین علیہ السلام پر پابندی بھی نہ تھی۔ پابندی تھی تو ہمشیرہ حسینؑ پر، بتولؑ کی بیٹیوں پر۔ امام حسین علیہ السلام تو پسر کی لاش پر دل کھول کر روئے، مگر امام حسین علیہ السلام کی بہن بھائی کی لاش پر دل کھول کے نہ رو سکی۔

ہاں حسین علیہ السلام لاش پسر پر روئے فرمایا بیٹا!

"عَلَی الدُّنْیَا بَعْدَکَ الْعَفَاءُ".

"بیٹا! تیرے بعد زندگانی دنیا پر خاک ہے"۔ اس کے بعد فرمایا:

"یَا بُنَیَّ لَقَدِ اسْتَرَحْتَ مِنْ هَمِّ الدُّنْیَا وَغَمِّهَا وَبَقِیَ اَبُوْکَ فَرِیْدًا".

"لو بیٹا! تم تو دنیا کے دکھوں سے راحت پا گئے، اب تمہارا باپ دکھوں کے گرداب میں تنہا رہ گیا"۔

جناب علی اکبر علیہ السلام میں ابھی جان باقی تھی، آخری سانس تھی۔ امامؑ نے جوان بیٹے کا سر گود میں لیا، خون آلود چہرے کو صاف بھی کرتے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''خدا اُن لوگوں پر لعنت کرے جنہوں نے حرمت رسول کا بھی خیال نہ کیا اور تصویر نبویؐ خاک میں ملا دی''۔

کس درجے مشابہ تھے رسولؐ عربی کے
گویا کہ حسینؑ آج بچھڑتا ہے نبی سے

گو امام حسین علیہ السلام اس سے قبل بھی گریہ وزاری کرتے رہے اور کثرت سے روتے رہے لیکن بقول روضۃ الصفا اتنی بلند آواز سے کبھی نہ روئے تھے جس بلند آواز سے جواں بیٹے کی لاش پر بین کر کے روئے۔ پہلی مرتبہ امام حسین علیہ السلام کے رونے کی آواز آس پاس سنی گئی، کون رو رہا ہے، چھپن سال کا ضعیف باپ اٹھارہ سال کے جوان بیٹے کی لاش پر نوحہ کر رہا ہے۔ حضرت علی اکبر کا سر امام علیہ السلام کی گود میں تھا۔ سانس تیز ہوگئی، پدر کی گود میں روح جسدِ مبارک سے پرواز کر گئی۔

اوپر کے دم اس شیر کو بھرتے ہوئے دیکھا
بابا نے جوان بیٹے کو مرتے ہوئے دیکھا

جناب شیخ جعفر تستری مرحوم بیان کرتے ہیں کہ جناب علی اکبر علیہ السلام کی رخصت سے شہادت تک تین مرتبہ امام حسین علیہ السلام کی حالت متغیر ہوئی اور امام مظلومؑ بہت مضطرب و بیقرار ہوئے۔ قریب تھا کہ روح بدن سے جدا ہو جائے۔

ایک اس وقت جب اپنے ہاتھوں سے اسلحہ جنگ پہنا کر میدان کی طرف بھیجا۔ جناب اکبرؑ میدن کو سدھارے اور امام حسینؑ نے خیام کا رخ کیا۔

دوسرے جب زخموں سے نڈھال ہو کر خون میں نہا کر پانی مانگا۔

تیسری بار جب گھوڑے سے گرتے ہوئے بیٹے نے باپ کو پکارا اور کہا:

''یا ابتاہ علیک مِنّی سَلام''۔

''بابا! میرا آخری سلام ہو''، جلدی پہنچیے۔

جناب سکینہؑ بیان کرتی ہیں کہ جب بھیا اکبرؑ کی آواز کی پہنچی میں بابا کو دیکھ رہی تھی بابا کی آنکھیں پتھرا گئیں اور جس طرح میت پر جان کنی کا وقت ہوتا ہے بابا خیمہ کے آس پاس نظر کرتے اور ایسی حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کہ قریب تھا کہ روح جسد مبارک سے پرواز کر جائے۔ مگر امام حسین علیہ السلام نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے آواز دی:

"وَاوَلَدی وَاثَمْرَۃَ فُوادِیْ وَاقُرّۃَ عَیْنِیْ".

"ہائے او میرے پیارے لخت جگر، میرے دل کے میوے! میری آنکھوں کی ٹھنڈک بیٹا! میں آ رہا ہوں"۔

الغرض جواں سال بیٹے نے ضعیف باپ کی گود میں دم توڑ دیا۔ امام حسینؑ کہاں لاش اُٹھا سکتے تھے۔ بنی ہاشم کے چند بچوں نے امداد کی اور لاش اُٹھا کر خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے ادھر یہ حال ہے۔ اب ذرا خیام کا حال سنئے۔

جس وقت امام حسین علیہ السلام شہزادہ علی اکبر علیہ السلام کی جانب میدان روانہ ہوئے اور حرم سرا میں امام علیہ السلام کی متغیر حالت، اکبر کی صدا پہنچی تو کوئی بی بی قرار سے خیمہ میں نہ بیٹھ سکی۔ کیا یہ خبر سن کر وہ آرام سے بیٹھ سکتیں تھیں؟ اگر حجاب مانع نہ ہوتا تو یہ ستم رسیدہ بیبیاں امام حسین علیہ السلام سے پہلے شہزادہ علی اکبرؑ کی لاش پر پہنچتیں۔ خیام میں آرام نہیں، باہر قدم نہیں اُٹھ سکتے۔ باقی تمام خیام خالی ہو گئے تھے۔ قنات کے پیچھے ایک خیمہ میں تمام بنی ہاشم جمع تھیں۔ پاپوش کا ہوش نہ تھا، سروں پر چادروں کا دھیان نہ تھا، رنگ اُڑ گئے تھے، بدنوں میں لرزہ تھا، سروں کے بال کھل گئے تھے، غیرت ہاشمی غالب تھی، جس نے خیمہ میں روک رکھا تھا۔ قدم باہر اُٹھنے کیلئے بڑھتے مگر پردہ مجبور کر کے روک لیتا۔

ہاں! قنات کی چادر کے پیچھے سیدانیاں جناب علی اکبرؑ کی لاش کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ بار بار قنات کا پردہ کا اٹھتا اور بیبیوں کی نگاہیں میدان کی طرف جاتیں لیکن فوجوں کے گھمسان اور غبار جنگ کی وجہ سے نظر کچھ نہ آتا۔ امام حسینؑ کی رُخصت کے وقت سے لے کر آمدِ حسینؑ تک یہ دُکھیاری شہزادیاں بیقراری سے دامن قنات کے ساتھ وابستہ رہیں۔

امام حسین علیہ السلام ابھی خیمہ سے چند قدم دور تھے کہ بیبیوں کی نظر پڑی، کہرام بپا ہو گیا، رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جناب سکینہؑ سے نہ رہا گیا، آگے بڑھ کر عرض کی:

بابا جان! آپؑ کی حالت دگرگوں کیوں ہے؟ بابا! آپؑ غمگین اور حسرت سے ادھر اُدھر کیوں دیکھ رہے ہیں؟ بابا! اکبرؑ بھیا کہاں ہیں؟ امام حسین علیہ السلام نے اشارہ کیا: بیٹی! گیا تو تھا گھوڑے پر سوار ہو کر لیکن گھوڑا خالی آ رہا ہے۔ اسے بھائی اُٹھا کر لا رہے ہیں۔

بیٹی! فوج اشقیا نے تیرے بھائی کو شہید کر دیا ہے۔ جناب سکینہؑ بنت الحسینؑ نے اپنے سر پر ماتم کرنا شروع کیا۔ امام حسین علیہ السلام نے صبر کی تلقین کی، عرض کیا بابا بھیا اکبر علیہ السلام شہید ہو جائیں میں کیونکر صبر کروں۔ یہ تو جناب سکینہؑ کی حالت تھی۔

دوسری بیبیاں مجبور تھیں باہر نہ آ سکتیں تھیں۔ جوں ہی جناب علی اکبر علیہ السلام کی لاش قنات کے اندر آئی، سروں پر

ماتم کرتی ہوئی سیدانیوں نے برہنہ پاؤں اور کھلے ہوئے بالوں سے لاش کا استقبال کیا۔ دیکھا خون بدن سے بہہ رہا ہے، تمام بدن زخموں سے چور ہے۔ مگر تین زخم بڑے ہیں۔ پشت وسینہ پر سناں کا زخم، گردن پر تیر اور سر پر تلوار کا زخم۔

قنات کے باہر جناب علی اکبرؑ کی لاش تھی اور قنات کے اندر دامن قنات کے ساتھ زنان بنی ہاشم تھیں۔ ان دردرسیدہ بیبیوں نے درقنات پر جوانمرد شہید حضرت علی اکبرؑ کی لاش کا زخمی سینوں اور اور دردناک بینوں کے ساتھ استقبال کیا۔ ماتم کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ان کی پیشوا شریکۃ الحسینؑ جناب زینبؑ تھیں جنہوں نے اٹھارہ سال شہزادہ علی اکبرؑ کی پرورش کی تھی۔

قنات سے باہر مرد لاش کو اٹھا کر لائے تھے اور قنات کے اندر غم نصیب بیبیوں نے جناب علی اکبرؑ کا جنازہ اٹھالیا۔ درمیان میں جناب علی اکبرؑ کی خون آلود لاش تھی اور اردگرد سیدانیوں کا ماتمی حلقہ تھا۔ جگر خراش بینوں سے زمین کا کلیجہ پھٹتا تھا۔ فضا سوگوار تھی۔ آسمان کا جگر چاک تھا۔ اس اثنا میں جناب زینبؑ بے اختیار حضرت علی اکبرؑ کی لاش پر گر پڑیں۔ اس زور سے ماتم ہوا کہ مولائے مظلومؑ کو آ کر صبر کرنے کی تلقین کرنا پڑی۔

عزادارو! باپ سے زیادہ ماں کو محبت ہوتی ہے۔ الفت مادری محبت پدری سے بڑھ جاتی ہے۔ آپ نے امام حسین علیہ السلام کی حالت اور باپ کے رونے صدا تو سن لی ہے۔ جب یہ حالت گریہ وزاری اور صدائے بکا امام پدر کی ہے تو ماں کی کیا حالت ہوگی۔ نہ زبان بیان کر سکتی ہے نہ قلم لکھ سکتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک بار نہیں جناب لیلیٰؑ بار بار غش کھا کر جوں پسرؑ کی لاش گرتی ہوں گی۔

گود میں لیا ماں نے جو گھبرا کے پسر کو
غش آنے لگا مادر تعقیدہ جگر کو
رُخسار پہ جو منہ رکھ کے غش کر گئیں لیلیٰ
ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا کہ مر گئیں لیلیٰ

✿✿✿

معرفت و خلوص

انعقاد مجالس میں قصدِ قربت ودخلِ خلوصِ بانیانِ مجالس، واعظین، ذاکرین اور سامعین کی شرعی اور ایمانی ذمہ داریاں۔ اولادِ امام حسن علیہ السلام کی قربانیاں اور شہادت حضرت قاسم علیہ السلام۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اِیَّا کَ نَعۡبُدُ".

ہم تیری عبادت کرتے ہیں، عبادت کوئی ہو، کس طرح ہو، کسی وقت ہو، وہ ہی عبادت شرفِ قبول اور معبود سے اجر حاصل کرسکتی ہے جو مرضی معبود کے مطابق ہو، جس طرح معبود چاہتا ہے اسی طرح ہو۔ عبادت کے آداب واطوار اور طریق ہائے کار وہ ہوں جو معبودِ حقیقی کے نمائندے نے بتائے ہوں۔

اگر عبادت گزار اپنی مرضی سے طریقہ عبادت وضع کرے، اپنی رائے سے حدودِ عبادت متعین کرے اور اپنے خیال سے وہ عبادت کے آداب تجویز کرے تو اس عبادت کا ثواب وہ اپنے آپ سے طلب کرے، خدا سے اس کا صلہ لینے کا حقدار نہیں۔ کیونکہ اس نے اپنی مرضی اور خواہش کی پیروی کی ہے۔ خالق کی مرضی اور حکم کی تکمیل نہیں کی۔ عبادات جتنی بھی ہیں، ان کی مقدار، تعداد، حدود، اوقات اور آداب خود معبود نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ بنا کر بندوں کو بھیجے ہیں۔

بندگانِ خدا، امورِ خدا میں دخل دینے کے مجاز نہیں۔ اس کے احکام اور اوامر اور نواہی میں کوئی مشورہ اور رائے نہیں دے سکتے۔ ان کا کام ہے کہ بے چون وچرا دل سے مان لینا اور اعضاء سے عمل کرنا۔ ہاں! یہ یقین حاصل کرنا بندوں کا حق ہے کہ واقعی یہ حکمِ خدا ہے اور پیغمبرِ اسلام اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے واقعاً یہ فرمودات ہیں؟

اس عالمِ اسباب میں جو ذرائع یقین حاصل کرنے اور وسائل ان کے معلوم کرنے کے ہیں انہیں استعمال کرکے تحقیق کرنے کا حق ہر بندے کو ہے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد کہ یہ فرمانِ امامؑ یا حکمِ رسولؐ ہے۔ اس حکم کی شکل وصورت میں تغیر و تبدل کا حق کسی بندہ کو حاصل نہیں، لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ نماز اس طرح پڑھنی چاہئے، ہاتھ اس طرح ہوں، یہ مداخلتِ بے جا ہے۔

نماز اس طرح پڑھو، جس طرح ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھی یا اُن کے قریبی اعزہ نے اور

ان کے علوم کے وارث، اہل بیت علیہم السلام نے پڑھی۔

اگر کوئی شخص اپنی طرف سے دین میں کوئی نئی ایجاد کرتا ہے یا اسلام میں تحریف کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو نہ صرف یہ کہ معنوی پیغمبر کا درجہ دیتا ہے بلکہ خدا اور اس کے رسولؐ پر حملہ بھی کرتا ہے، کہ ان کے علم میں یہ خوبیاں اور یہ مصلحتیں نہ تھیں۔ یہ ان سے زیادہ مصلحت بین اور دانا ہے۔ کسی حلال کو حرام قرار دینا اور تراویح کو ماہِ رمضان میں با جماعت پڑھنا یہ نئی ایجاد ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ".

"نئی ایجادات سے بچو کیونکہ ہر نئی ایجاد دین میں بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

"حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ".

"محمدؐ کا حلال کردہ قیامت تک حلال ہے اور محمدؐ کا حرام کردہ قیامت تک حرام ہے"۔

ہر عبادت میں خلوص تقرب شرط ہے

ہر چیز کی افادیت اس وقت رخصت ہو جاتی ہے جب اس میں کسی چیز کی آمیزش کی جاتی ہے۔ ملاوٹ ایک ایسی منفرد مفسد شے ہے جو اصل شے کا اثر زائل کر دیتی ہے اور اس کے استعمال کرنے والے کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہے۔

دودھ میں پانی ملانے سے دودھ کا وہ اثر نہیں رہتا جو اس کے خالص ہونے کا تھا، اسی طرح آٹا، چائے یا نمک مرچ اور دوسری اشیاء خوردنی میں ملاوٹ سے وہ چیزیں نہ صرف بے کار ہو جاتی ہیں اور ان کا اثر ضائع ہو جاتا ہے بلکہ الٹا جسمانی صحت کو تباہ کر دیتی ہیں اور یہ وبا جتنی بری ہے اتنی ہی عام ہے۔ بلکہ معاشرہ کے قابو اور حکومت کے کنٹرول سے بھی باہر ہے۔

اسی طرح امور دین، اعمال صالح اور عبادات میں ذاتی اغراض کے تحت ملاوٹ، دین کی بربادی کا باعث ہے۔ جب دین خالص نہ رہے اور اس میں بیرونی اُمور داخل ہو جائیں اور داخلی امور خارج ہو جائیں تو اس بدلے ہوئے دین کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور متغیر و محرف دین کا عامل اجر اخروی سے محروم رہتا ہے۔ جس طرح ملاٹ والی خوراک صحت جسمانی کو ختم کر دیتی ہے اسی طرح ملاوٹ والی عبادت اور آمیزش والا عمل روحانی صحت کو برباد کر دیتا ہے۔

خواہشات دنیا، حرص زر اور دولت مند بننے کی تمنا جیسی اغراضِ فاسدہ کے تحت بد باطن افراد اشیاء خوردنی میں ملاٹ کر کے ملک و قوم کو تباہ کرتے ہیں۔ اسی طرح حبِ جاہ، پیشوائی باطل، ذاتی عزت و وقار اور نفسانی خواہشات کے تحت بد طینت اور

شقی افراد نے دین میں رد و بدل اور آمیزش کر کے وحدت اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دیا۔

اگر ذاتی اغراض، حرصِ حکومت، طمع امیری، حبّ جاہ، ان جیسے بے دین افراد پر غالب نہ آتی تو اسلام میں فرقے نہ بنتے اور اسلام ایک واحد جماعت رہتا۔ ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات مذہب کی تفریق کر کے گروہوں کی شکل میں تقسیم کر دیتی ہیں۔ اس باطل ارادہ اور بدنیتی پر پردہ ڈالنے کے لئے کبھی نبی کی ذات پر حملہ کیا، کبھی علیؑ کی عقل اور سیاست کو مورد طعن بنایا اور کبھی جزو رسولؐ، بضعۃ نبی، سیدۃ النساء کو حدیث سے بے خبر بتایا اور کبھی خطاء اجتہادی کی آڑ لے کر ہزاروں لوگوں کا خون بہایا اور کبھی حکومتوں کے اشاروں اور خود ستائی کے زعم باطل میں اپنے اجتہاد کی دکان کھول کر اپنے معصوم استاد کا مقابلہ کیا۔

دین اپنی وحدت کھو بیٹھا اور اسلام اپنی سالمیت سے محروم ہو گیا۔ پھر قابلِ ستائش ہیں وہ افراد اور لاکھوں ثناؤں کے مستحق ہیں وہ معصومین اور ان کی ہم نوا ہستیاں، جنہوں نے ہر قربانی دے کر اسلام کو اصلی صورت میں محفوظ رکھا، تغیر و تبدل کی آندھیوں کا مقابلہ کیا، تحریف کے زلزلوں سے اسلام کی عمارت کو گزند نہ پہنچنے دی اور اسلامی تعلیمات اور ہدایاتِ پاک پیغمبرؐ جوں کی توں اپنے سینوں میں سمیٹے، اوراق میں محفوظ کئے رہے۔

ہماری مجلسیں اور جلوس ہماری نیتیں اور خلوص

کوئی بھی عبادت کی جائے جس میں رضائے معبود مقصود نہ ہو تو وہ عبادت نہ صرف رائیگاں بلکہ اُلٹی ضرر رساں ہے۔ اس وقت ملک میں جلوس ہائے عزا اور مجالس عزا کی کمی نہیں، سارا سال مجالس منعقد ہوتی رہتی ہیں اور ان میں ہر قسم کے پڑھنے والے واعظ و ذاکرین عموماً اپنے فنِ ذاکری و بیان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جلوس بھی نکلتے رہتے ہیں۔ بانیان جلسہ و مجالس بیان و ذاکری کا ہی نہیں، فن بیان و فن ذاکری کا معاوضہ بھی خوب دیتے ہیں۔

لاکھوں روپے ہر سال خرچ ہوتے ہیں۔ مگر جس قدر خرچ ہوتا ہے، کیا اس قدر افادیت ہے؟ جس قدر اہتمام کیا جاتا ہے، کیا صحیح مقصد پورا ہوتا ہے؟ چونکہ مجالس ہمارے لئے مذہب کی ترقی، عمل خیر اور روحانی بالیدگی کا ذریعہ ہیں۔ اس واسطے جو خامیاں ان میں رونما اور خوبیاں عنقا ہو گئی ہیں ان کی نشان دہی ضروری سمجھتا ہوں۔

''شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات''

ہمارا دین، مذہب، ہماری شریعت سید الشہداء علیہ السلام کی شہادت اور جناب زینبؑ و ام کلثومؑ، بنات علیؑ و بتولؑ اور جناب علی بن الحسین سید سجاد علیہم السلام کی اسیری کے طفیل ہم میں موجود ہے۔ ان کی قربانیوں کے صدقہ میں ہم مسلمان ہیں۔ اس واسطے ان کی یاد منانا، ان کا تذکرہ کرنا، ان کی قربانیوں کا ذکر اور قربانیوں کے مقصد کو زندہ رکھنا ہمارے لئے فرضِ عین ہے،

لیکن ان کی یاد اس صورت میں منائیں کہ وہ اس صورت کو پسند کریں۔ ہماری مجالس وجلوس ان کی رضا کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور ان کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ ہمیں اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ جو مجالس ہم منعقد کرتے ہیں وہ اس پر راضی بھی ہیں؟ کہیں ناراض تو نہیں؟

ہم اس مجلس میں مجالس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں تاکہ سامعین آگاہ ہو کر خوبیوں کو بڑھانے اور خامیوں کو مٹانے کی کوشش کریں۔

مجالس کی خوبیاں

مجلس امام حسین علیہ السلام ایک بہترین درسگاہ ہے۔ شیعہ نہایت ذوق وشوق سے واقعات کربلا اور فضائل اہل بیت علیہم السلام سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ فضائل سن کر خوش ہونا اور مصائب سن کر گریہ کرنا بہترین عمل صالح اور باعث ثواب کثیر ہے۔ اس روحانی فضا میں مل جل کر بیٹھنے اور بلند آواز میں محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیجنے سے ایمان تازہ اور یقین بڑھتا اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ بار بار یہ قومی اجتماع اور اکثر ان مجالس وجلسوں کا انعقاد اور ذوق وشوق سے ان میں شرکت کے مواقع قومِ شیعہ کو ہی میسر ہیں۔

اگر ان مجالس میں توحید، نبوت، امامت اور قیامت کے مسائل، ٹھوس دلائل، مضبوط براہین اور مستند حوالوں کے ساتھ اور احادیثِ معصومین علیہم السلام، صحیح تاریخی اور فقہ جعفری کے مسائل دل نشین انداز میں اور واقعات کربلا وشام، مصائب آل محمدؐ صحت وروایات کے ساتھ بیان کئے جائیں تو یہ ذوق سماعت رکھنے والی اور دل کھول کر کثیر رقم خرچ کرنے والی قوم، اقوام عالم میں اپنے علم وعمل کے ساتھ بلند مقام پر نظر آئے اور اس نرالی تربیت گاہ میں آئمہ معصومین علیہم السلام کی پیروی کے سانچے میں ڈھل کر اقوام عالم کو اپنے علم وعمل کے ذریعہ راہ حق کی دعوت دے۔

اس قوم میں قربانی کا جذبہ دوسری اقوام سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ مقدس قوم مالی قربانی کے ساتھ جانی قربانی سے دریغ بھی نہیں کرتی۔ تعداد میں تو یہ ہر دور میں قلیل رہی ہے۔ جادۂ صداقت اور صراط حق پر چلنے والی اس قوم نے توحید کی امانتوں کو سینوں میں محفوظ رکھا ہے اور تعلیمات آئمہ علیہم السلام کو اپنے پاک قلوب میں جگہ دی ہے۔ اس قوم کے افراد نے دین اسلام اور فضائل آئمہ معصومین علیہم السلام کو درخت خرما کی سولیوں پر بیان کرتے ہوئے جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔

دست و پا قطع کئے گئے، لیکن فضائل آل محمد علیہم السلام ان کی زبانوں پر جاری رہے۔ زندانوں کی تاریک کوٹھڑیوں

میں ان کی عمریں بسر ہوئیں، دیواروں میں یہ زندہ چنے گئے، گردنیں زیر خنجر رہیں، نوک نیزہ پہ ان کے سر اٹھائے گئے، زہر کے پیالے انہیں پلائے گئے اور آزادی کی فضا سے انہیں محروم کیا گیا، لیکن اسلام کی صحیح تصویر اور آئمہ طاہرینؑ کی تعلیمات کو سینوں سے چمٹائے رہے اور یہ امانت نسلاً بعد نسل اصلی صورت میں اپنی آنے والی نسلوں کے سپرد کرتے رہے۔

ظلم وتشدد کے سیاہ ماحول میں ان کے حوصلے پست نہ ہوئے اور جور و جفا کی آندھیوں میں ان کے قدم نہ لڑکھڑائے۔ ان عاشقانِ پاک کی فدا کاریوں اور ان کی محنت اور کوششوں سے مذہب امامیہ ہم تک پہنچا جو خود تو ظلم وستم اور قیدو بند کی صعوبتوں میں راہی خلد بریں ہوئے لیکن تعلیمات آل محمدؐ، فقہ جعفری اور مذہب اہل بیت علیہم السلام ہمارے سپرد کر گئے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ صحیح تربیت اب ہم میں نہیں، مجالس اپنی افادیت کھو بیٹھی ہیں، زر پرستی دین پرستی پر غالب آگئی اور حب دنیا، جاہ طلبی نے مقصدِ مجلس کو فراموش کر دیا ہے۔

مجالس کے ساتھ تعلق رکھنے والے تین قسم کے لوگ ہیں

یہاں ان تین قسم کے گروہوں کے خلوص اور قصدِ قربت کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ تین قسم کے لوگ ہیں۔"بانیان مجلس" "بیان کرنے والے واعظین وذاکرین" اور "حضرات سامعین"۔

بانیٔ مجالس کی ذمہ داریاں

عموماً بانیان مجالس نام ونمود اور نمائش کی خاطر مجالس منعقد کرتے ہیں، تبلیغی مقصد کم اور تصنع وریاکاری کا جذبہ زیادہ۔ ان کی بنیادی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان افراد کو بیان کرنے کی دعوت دی جائے جن کے نام سے سامعین کھنچے چلے آئیں، ان کے سحر بیانی، شیریں مقامی، انداز خطابت، خوش نوائی، بذلہ سنجی اور سریلی آوازیں سامعین کو مسحور کر دیں۔ سامعین سے جلسہ گاہ بھر جائے اور لوگ عش عش کر اٹھیں، اور صدائے تحسین وآفرین سے بانیان کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے۔

اس بات سے نظر پھیر لی جاتی ہے کہ ان بیان کرنے والوں کا کردار کیسا ہے؟ آئمہ معصومین علیہم السلام کا ذکر کرنے والے خود ان کے فرمودات کے کس حد تک عامل ہیں؟ مقصد شہادت کی کس انداز میں تبلیغ کرتے ہیں اور مقصد مجالس کس حد تک پورا ہوتا ہے؟ قرآن وحدیث، مسائل دین اور صحیح واقعات بیان کرنے والے ان کی نظر میں کیا مقام رکھتے ہیں اور راگ ورنگ، غلط فضائل، غیر مستند مصائب اور خود ساختہ روایات بیان کرنے والوں کی قدر ان کے یہاں کتنی ہے؟

مقصدِ شہادتِ امام حسین علیہ السلام

ہم اس مقام پر مقصد شہادت سید الشہداء علیہ السلام ذرا وضاحت سے بیان کرتے ہیں تاکہ قارئین اس کی روشنی میں

اپنی راہ متعین کر کے منزل کی جانب بڑھیں اور یہ تینوں گروہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے وظائف انجام دیں۔

امام علیہ السلام، ان کے اہلبیت علیہم السلام اور اصحابؓ باوفا کا مقصد اس جہاد سے ملک گیری، مال غنیمت، ذاتی وجاہت اور انتقام وعداوت نہ تھا۔ ان کی عظیم الشان قربانیوں اور اہل حرم کی اسیری اور راہ شام کی کٹھن منزلوں، کوفہ وشام کے بازاروں میں تشہیر اور درباروں میں پیشی کی ذلت وہتک حرمت کا مقصد دین اسلام کی بقاء اور تعلیماتِ پیغمبر کی حفاظت تھا۔

یہی مقصد ہماری مجالس کی بنیاد ہے تو درحقیقت مجالس کامیاب ہیں۔ اگر اس مقصد کو پس پشت ڈال دیا جائے تو انتہاءِ ناکامی ہے اور لاکھوں کا خرچ رائیگاں ہے۔

دستور ہے اور عقل کا فیصلہ ہے کہ جب کوئی امر دو چیزوں میں سے کسی ایک کی قربانی چاہتا ہو تو جو زیادہ اہم اور ضروری ہوتا ہے اسے باقی رکھا جاتا ہے اور اس سے کم اہمیت والی چیز کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً مال اور جان کا معاملہ ہے، مال بچائیں تو جان جاتی ہے اور اگر جان محفوظ رکھیں تو مال جاتا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو قربان کرنا پڑتا ہے تب دوسرے کو بقاء ہوتی ہے۔ عقلاءِ زمانہ اور غیور انسان یہی پسند کریں گے کہ مال قربان کر دیا جائے جان بچالی جائے کیونکہ جان مال سے عزیز ہے۔

اسی طرح عزت ومال کا معاملہ درپیش ہے۔ کوئی غیرت مند شخص یہ گوارا نہ کرے گا کہ عزت قربان کر دے اور مال بچا لے، بلکہ عزت پیاری ہے اور عزت کے بدلے میں مال عزیز نہیں۔ مال قربان کر دیا جائے گا اور عزت محفوظ رکھی گا۔ غرض یہ کہ زیادہ عزیز چیز بچائی جاتی ہے، باقی رکھی جاتی ہے اور کم عزیز چیز قربان کر دی جاتی ہے۔

کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے سامنے ان کی عزیز جانیں اور عزت وناموس ہے اور دین اسلام۔ ان کی جانیں اور عزتیں اس صورت میں محفوظ رہ سکتی تھیں کہ بیعت یزید کر کے دین اسلام قربان کر دیا جائے۔ دین جاتا ہے تو جائے، اسلام مٹتا ہے تو مٹ جائے، تعلیماتِ پیغمبرؐ خاک کربلا میں دفن ہو جائیں مگر جان وعزت تو بچتی ہیں۔ دوسری صورت میں دین کی بقا اور اسلام کی حفاظت مطلوب ہے۔ تعلیمات پیغمبر کو اصلی صورت میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ جان جاتی ہے تو جائے، اقرباء واولاد کی موت گوارا ہے، مستورات کی بے عزتی اور قید وبند منظور ہے مگر دین بچ جائے۔

قارئین کرام! یہ دونوں صورتیں آپ کے مظلوم امام حسین علیہ السلام کے سامنے ہیں۔ دونوں اپنے مقام پر نہایت عزیز وگراں ہیں۔ ان میں سے ایک کی بقا دوسرے کی قربانی پر موقوف ہے۔ ہمارے مظلوم امامؑ نے کون سی چیز کو قربان کیا اور کس کو باقی رکھا۔

یہی جواب اور بلاشبہ وبے شک یہی جواب ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے دین کو زندہ رکھا، اسلام کو زندہ رکھا، اپنے

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو محفوظ رکھا۔ تو جس کو باقی رکھا وہ عزیز ہے اس پر جس کو قربان کردیا۔ امام حسین علیہ السلام نے دین کو اپنے اوپر قربان نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو دین پر قربان کردیا۔

تو دین اسلام اتنی اہمیت اور عظمت کا مالک ہے، جس پر فرزند رسولؐ امام علیہ السلام قربان ہوئے، جس کی بقا کی خاطر جناب علی اکبر علیہ السلام جیسی تصویر نبوی خاک میں مل گئی، جس کی زندگی پر بنی ہاشم اور ابو طالب علیہ السلام کی زندگیاں نثار ہوئیں، جس کی تقویت کی لئے جناب عباسؑ علمدار کے بازو کام آئے اور سقائے سکینہؑ نہر کے کنارے شہید ہوئے، جس کی آبیاری اولادِ بتولؑ کے خون سے ہوئی، جس کی سیرابی میں اٹھارہ بنی ہاشم کے مردوں اور سو سے زیادہ مقدس اصحاب کا خون خرچ ہوا۔ اسی اسلام کی خاطر مستورات بنی ہاشم کے گھر لٹے، خیمے جلے، پردے قربان ہوئے اور بنی عبدالمطلبؑ کی مستورات اور بتولؑ کی بیٹیوں نے عراق وشام کے جنگلوں کے سفر کئے اور کوفہ و دمشق کے بازاروں سے گزر کر درباروں کو پیشیاں بھگتیں۔

لہٰذا اے بانی مجلس! خدا تجھے توفیق دے اور تیری نیک کمائی نیک مقصد میں خرچ ہو، سوائے غم حسینؑ خدا تمہیں دنیا کے غموں سے محفوظ رکھے اور مصائب والم سے محفوظ رکھے، عظمت اسلام کی سمجھ اور اہمیت دین کا خیال رکھ۔ مجالس میں ان بنیادی مقاصد کو محفوظ رکھ اور شہادت امام حسین علیہ السلام، اسیری جناب زینبؑ وام کلثومؑ کے مقصد کو ذبح نہ کر، ان کے مقصد کا قتل خود ان کے قتل سے کم نہیں۔

مجالس کو تبلیغی مقصد کی خاطر برپا کر، بطور مشغلہ، نام ونمود کی خواہش اور دعوت احباب کے خیال سے جلسے نہ کر، حسینیؑ مجالس کو ذاکرین واعظین کا مقابلہ نہ قرار دے اور اختتامِ مجلس کے بعد موازنہ کر کے اوّل دوم اور سوم کا فیصلہ نہ کر۔

مجالس میں صحیح فضائل آل محمدؐ اور مصائب اہلبیت علیہم السلام بیان کرنے کے علاوہ دو اور بھی مقصد ہیں۔

پہلا مقصد

آئمہ معصومین علیہم السلام کا مرتبہ ومقام، ان کی امامت وخلافت، اس مہذب ودل نشیں پیرائے میں سامعین کے گوش گزار ہو کہ غیر اپنے ہو جائیں، مخالف موافق ہو جائیں، اہل بیت علیہم السلام کے فضائل سے متاثر ہو کر ان کی امامت وخلافت پہچان کر ان کا مذہب قبول کرلیں اور مذہب حق کی اشاعت وترقی ہو سکے۔

دُوسرا مقصد

اپنے وہ لوگ ہیں جنہوں نے زبانی مذہب اہلبیت علیہم السلام قبول کر لیا ہے اور ان کی امامت کا اقرار باللسان کیا ہے۔ عملی حیثیت سے بھی امامی وجعفری نظر آئیں۔ مان لینے کے بعد عملی پیروی کا مقام ہے۔ آئمہ کی سیرت وہدایات کا مطالعہ

کرنے بعد اپنی زندگیاں ان کی عملی پیروی کے سانچے میں ڈھال دیں اور اپنے کردار میں ان کی سیرت کا رنگ اور اپنے اعمال میں ان کے اُسوہ کی جھلک پیدا کریں۔

جو لوگ زبانی حسینیؑ کہلانا پسند کرتے ہیں ان کا عمل بھی حسینیؑ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زبان پر حسینؑ حسینؑ کا نعرہ ہو اور کردار یزید و شمر کی نمائندگی کر رہا ہو۔ اگر آپ کی مجالس میں یہ مقاصد شامل ہوں تو بے شک مجالس کامیاب ہیں اور اگر ان مقاصد کی نفی ہو تو یہ صرف مشاغل اور تفریحی سامان ہیں۔ تضیع اوقات کے علاوہ بے بہا خرچ بھی رائیگاں ہے۔

بانی مجلس وجلسہ اکیلا ہو یا چند افراد یا انجمن کے ارکان ان سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ مذکورہ مقاصد مجلس وجلسہ کی بنیاد ہوں۔ بانی مجلس کے ذوق پر کافی حد تک اصلاح قوم کا انحصار ہے۔

بانی حضرات! خدا تمہیں مجالس حضرت سید الشہداء علیہ السلام منعقد کرنے کی توفیق دے اور عزاداری امام مظلوم کربلا علیہ السلام قائم کرنے کی سعادت بخشے۔ انہی مجالس اور عزاداری کے سبب مذہب شیعہ کو وسعت اور ترقی نصیب ہوئی ہے۔ گو بنوامیہ کے دور میں اسلام کے پاک شجر کی شاخیں مرجھا گئی تھیں لیکن حیدریؑ جاں نثاروں اور حسینیؑ فداکاروں نے اپنے خون سے اسے اس قدر سینچا کہ مرجھائی ہوئی ٹہنیاں سرسبز ہو گئیں اور شاداب ڈالیاں بار از ہار و اثمار سے لد گئیں۔

لیکن وہ لوگ زبانی شیعہ نہ تھے۔ وہ ایسے باعمل اور پاکیزہ کردار تھے کہ آئمہ علیہم السلام ان کی ملاقات کا اشتیاق رکھتے۔ ان کا عمل امام علیہ السلام کی تعلیمات کی ترجمانی کرتا۔ اُس دَور کا شیعہ آج ہزاروں سے بہتر ہے۔

ہاں حضرات! جو صاحبان معاوضہ طے کر لیتے ہیں، ان کو تو اتنی فیس دے دیتے ہو لیکن جو مقرر نہیں کرتے قربۃً اللہ سمجھ کر پڑھتے ہیں ان کی ناقدری و حوصلہ شکنی کرتے ہو؟ انہیں معقول ہدیہ پیش کیا کریں اور ان کے جذبہ کی حوصلہ افزائی کیا کریں ٹھیس نہ پہنچائیں۔

مجالس قائم کرتے وقت بیان کرنے والوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کریں، بنیادی اصول، تبلیغی مقاصد ہوں، بلند کردار، نیک صورت اور پاک سیرت واعظین و ذاکرین منتخب کریں۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کا مقصد سامنے رکھیں اور یاری دوستی اور برادری کا ہرگز لحاظ نہ رکھیں، علم و عمل پیش نظر رکھیں، فن کو زیادہ اہمیت نہ دیں، تبلیغ کا احساس قرار دیں نیز آپ کی مجالس ارکان دین سے نہ ٹکرائیں بلکہ ان کو قوت پہنچائیں۔ مجالس میں نماز کی تائید کریں تردید نہ کریں، مجالس کا قیام ضیاع نماز کا باعث نہ بنے۔

اگر آپ کی مجالس ان مقاصد کی حامل ہیں اور یہ امور آپ کی مجالس کا حصہ ہیں تو مجالس سبب ہیں ترویج مذہب اہل

بیت علیہم السلام کا، امر بالمعروف نہی عن المنکر کا، تبلیغ مقاصد شہادت کا، تقویت دین اور شجاعت فضائل آلِ محمدؐ کا۔

آئمہ معصومین علیہم السلام کی ارواح طیبہ آپ پر راضی ہوں گی، سیدۃ النساء جناب بتولؑ آپ پر خوش ہوں گی اور آپ کا نام ناصران امام علیہ السلام کی فہرست میں شامل ہوگا اور آپ کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا۔ لیکن اگر ان مقاصد سے آپ کی مجالس محروم ہیں تو بانیانِ کرام! گستاخی معاف! حق بات تلخ ہوتی ہے۔

رکھیو غالب، مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

مجالس حسین علیہ السلام کا نام تو ہے، مگر یہ تفریحی مشاغل، وافر دولت کے خرچ کا بہانہ، دعوتِ احباب، نام ونمود، دین سے مذاق، شہدائے کربلا، اسیرانِ کوفہ وشام کی قربانیوں کی ناقدری ہے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام آپ کے ان اجتماعاتِ بے معنی سے خوش نہ ہوں گے بلکہ ان کی روح مجروح ہو جائے گی اور ان کے زخم ہرے ہو جائیں گے۔

مجالس عزا قائم کرنے کا مقصد تبلیغ دین اور تذکرہ شہداء کربلا ہے۔ جو اس وظیفہ کو سرانجام دے سکے، بانی کو چاہئے کہ اس کی قدر کرے اور ان حضرات کی حوصلہ افزائی کرے۔ اگر دین سے محبت اور اہل بیت علیہم السلام سے اُلفت ہے تو شخصیت پرستی کی بجائے اصول پسندی ہونی چاہئے۔ یہ ضروری نہیں کہ شہرت یافتہ ہی دین کے مبلغ اور مداح اہل بیت علیہم السلام ہو سکتے ہیں اور ان کے سوا کوئی غیر مشہور ذکر حسین علیہ السلام اور اس وظیفہ کو انجام دینے کا مجاز نہیں۔

اب دستور یہ ہو چکا ہے کہ ایک واعظ اور نامور ذاکر ایام محرم میں روزانہ سات آٹھ مجالس پڑھتا ہے اور دن بھر میں سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ حالانکہ انہی مجالس کے مقامات پر ایسے واعظ وذاکر میسر آ سکتے ہیں جو علم میں اس مشہور واعظ سے کم نہیں اور ذکر حسین علیہ السلام بھی احسن طریقے سے بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بانی حضرات کی نظروں میں اس لئے نہیں جچتے کہ یا تو مقامی وعلاقائی ہیں یا فن گویائی یا ہنر گویائی میں مشاہیر کے ہم پلہ نہیں اور اس طرح مجالس میں سامعین کی کمی نظر آ گئی تو لوگ تعریف نہ کر سکیں گے۔

لیکن بانی حضرات کی خدمت میں باادب عرض کروں گا کہ آپ کو کس امامؑ ونائب امام نے فرمایا ہے کہ غیر مشہور واعظ اور ذاکر سے مجلس پڑھوانا جرم ہے؟ اور ان کی مجلس ثواب سے محروم ہے یا اگر جہلاء، ریاکاروں اور شغلی لوگوں کی کمی سے عزاخانہ بھرا ہوا نہ ہو تو کیا امام علیہ السلام ناراض ہو جائیں گے؟ آپ کی مجلس قبول نہ ہوگی؟

مجلس اگر ثواب کی خاطر، خوشنودئ خدا، رسولؐ اور رضائے آئمہ معصومینؑ کیلئے منعقد کی گئی ہے تو اس میں مشہور اور

نا موزِ ذاکر کا ہونا شرطِ قبولیت ہے نہ سامعین کی کثرت اور نہ ہی لذتِ سماع ضروری ہے۔ شرط ہے تو بیان کرنے والے کا تقویٰ، کردار اور صحتِ روایات شرط ہے اور بانی کا خلوص شرط ہے۔

ایک مشہور واعظ و ذاکر کے پیچھے بانی حضرات کی قطاریں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ کوئی ادھر سے دامن پکڑ رہا ہے، کوئی اُدھر سے سرگوشی کر رہا ہے اور محرم کے دنوں اور مخصوص ایام کی مجالس میں ان حضرات کو متعدد مقامات پر جانا پڑتا ہے۔ اس وقت ان کا مقصد کاروباری ہوتا ہے، منہ مانگے دام مل جاتے ہیں اور کئی اہل حضرات محروم رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بھی حقوق ہوتے ہیں انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھنا ان کی حق تلفی ہے اور روزِ محشر بانی حضرات سے ان کی باز پرس ہوگی۔

چھوٹے بڑے پر موقوف نہیں دبیر

سرکارِ حسینؑ میں ہے حصہ سب کا

اس طرح مشاہیر واعظین و ذاکرین کو تاجر اور کاروباری بنانے میں بانیانِ مجلس کا بھی حصہ ہے اور آدابِ مجالس کو خراب کرنے اور ثواب کی بجائے لذت حاصل کرنے کے گناہ میں بانی صاحبان، ذاکرین کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ایک ذاکر یا واعظ سے آٹھ دس مجالس روزانہ پڑھوائیں اور دوسرا ایک آدھ سے بھی محروم رہے کیا اس کی حق تلفی نہیں؟ یہ ارتکازِ زر کے علاوہ ارتکازِ مجالس بھی ہے۔ دین اور ذکرِ حسین علیہ السلام صرف چند لوگوں میں گردش کر رہا ہے اور غیر مشاہیر مگر اہل حضرات کا استحصال کیا جا رہا ہے۔

آخر میں یہ ہی گزارش کروں گا کہ آپ حضرات جو مجالس و مواعظ منعقد کرتے اور جلسوں جلوسوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ سوچ کر نہایت غور کے ساتھ جائزہ لیں کہ کیا آئمہ معصومین علیہم السلام ہمارے اس طریق کار کو پسند فرمائیں گے؟ کیا اس میں جذبۂ خلوص کارفرما ہے؟ کیا ہمارے مراسمِ عزا، ارکانِ اسلام کے متضاد تو نہیں؟ کیا ان مجالس میں علماءِ دین اور فقہاءِ اسلام کی توہین تو نہیں ہوگی؟ کیا ان میں شریعت کا مذاق تو نہیں اُڑایا جائے گا؟ حرام چیزیں مجالس کی زینت تو نہ ہوں گی؟ دیکھ لیں کہ آپ کی مجالس گمراہی پھیلا رہی ہیں یا مقصدِ شبیرؑ اور امام علیہ السلام کی ہمشیرۂ دلگیر کی قربانیوں کی تشہیر کر رہی ہے؟

واعظین و ذاکرین حضرات

واعظین کرام و ذاکرین عظام کا بہت بلند مرتبہ ہے۔ یہ فضائل و مصائب اہلبیت علیہم السلام کے ناشر ہیں۔ جہاں مخالفین نے فضائل اہل بیت علیہم السلام کو چھپانے کی مذموم کوششیں کی وہاں انہوں نے ان کے فضائل و مناقب بڑھ چڑھ کر بیان کئے اور ان کی باطل کوششوں کو ان حضرات نے بیکار کر دیا اور ہر محفل و مجلس میں ان گرامی قدر حضرات نے آئمہ معصومینؑ کے

فضائل سے سامعین کو بہرہ ور کیا۔ انہی کی سعی جمیلہ سے ملک کے چپہ چپہ میں فضائل اور قربانیوں کے تذکرے پھیل چکے ہیں اور انہی حضرات کے زورِ بیاں سے مذہب شیعہ کو وسعت اور ارتقاء حاصل ہوا ہے۔

خود آئمہ معصومین علیہم السلام نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور اپنے عطیات وتحائف سے ان کی عزت فرمائی اور جناب سیدۃ النساء بنت رسولؐ اللہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور ان کی تائید سے انہیں روز افزوں ترقی حاصل ہوئی ہے۔ بے شک یہ خادمِ دین اور مداحِ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔ قوم شیعہ نے بھی انہیں اونچا مقام دیا ہے اپنا دیدہ ودل ان کیلئے فرشِ راہ کیا اور دل وجان سے ان کی خدمت کی، ان کی خاطر تواضع میں کبھی کوئی کمی نہیں کی، انہیں سرآنکھوں پر بٹھایا اور ہر قسم کا آرام بخشا، جس طرح بن پڑا، انہیں معقول ہدیہ پیش کیا اور مالی امداد سے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

شکل و صورت اسلامی

واعظین کرام دین کے رہنما اور احکام اسلام کے مبلّغ ہیں۔ انبیاء وآئمہؑ کے بعد دین کی رہنمائی اور ترویج واشاعت کے فرائض کے یہ ذمہ دار ہیں۔ اسلام کی حفاظت اور دین کی امانت کے یہ امین ہیں اور ہدایات کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ تربیت قوم کی ذمہ داری انہی پر عائد ہے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ان کا اولین فرض ہے۔

چند ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتا ہوں اور گستاخانہ کلمات سے معذرت خواہ ہوں۔

مجلس حسینیؑ اور منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام نہایت ضروری ہے۔ انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ کس مقام پر جلوہ افروز ہیں۔ یہ مقام انبیاء ومرسلین اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کا ہے۔ مجالس سیاسی اکھاڑہ نہیں، دینی تربیت گاہ اور اسلام کی تبلیغ ومصائب شہدائے کربلا واسیران کوفہ وشام بیان کرنے کا مقام ہے۔

ذاکرین! اس مقام پر آپ کا حلیہ اسلامی اور شکل وصورت دینی ہونی چاہئے۔ تاکہ آپ کے اسلامی رنگ کو دیکھ کر آپ کے سامعین آپ کے رنگ میں رنگے نظر آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی غیر اسلامی صورت سے وہ ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی شکلیں نہ بگاڑ لیں۔ تازہ صاف کی ہوئی ڈاڑھی، بڑھی ہوئی مونچھیں، شہدائے کربلا کا تذکرہ کرتے ہوئے زیب نہیں دیتیں۔

جن مقدس حضرات کی قربانیوں کا تذکرہ آپ کرتے ہیں، ان میں کسی ڈاڑھی مونڈھی ہوئی اور مونچھیں بڑھی ہوئی نہ تھیں، ان میں کوئی بے نماز نہ تھا اور احکامِ اسلام کا تارک نہ تھا۔ وہ حفاظتِ دین کی خاطر شہید ہوئے اور احکامِ شریعت کے قولی و عملی مبلّغ تھے۔

جب انہی بزرگوں کے نام سے آپ کو انعام ملا ہے، لوگ سیاسی لیڈروں اور بڑے آدمیوں اور حکمرانوں کی وضع قطع

اور شکل وصورت کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی اشکال ان کی شکل کے مطابق بناتے ہیں تو آپ جن کے نام لیوا ہیں، جن کی بدولت آپ کی اقتصادی ومالی حالت مضبوط واستوار ہے، آپ ان کی صورت کی پابندی کیوں نہ کریں؟ وہاں آپ کی صورت ان کی صورتوں کی ترجمانی کیوں نہ کرے؟ حالانکہ بجائے خود ملت اسلام کا فرد ہونے کے آپ پر احکام اسلام کی پابندی فرض ہے۔

جذبۂ خلوص

آپ دین اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں، لوگوں کو احکام اسلام سے متعارف کرواتے ہیں، فضائل ومصائب اہل بیتؑ بیان کرتے ہیں، تو اس مقدس فرض کی ادائیگی خلوص نیت اور خوشنودی خدا اور رسولؐ اور رضائے آئمہ علیہم السلام کے قصد سے کریں۔ اس نیک کام میں آپ کا جذبہ خلوص کارفرما ہو، یہ عبادت ہے اور عبادت اگر خلوص اور قربۃً اِلی اللّٰہ کی نیت سے خالی ہو تو عبادت باطل ہوتی ہے۔ اگر واعظ کرنے اور مجلس پڑھنے میں آپ خلوص سے تہی دامن ہیں تو ثواب آخرت اور خوشنودی معصومینؑ حاصل کرنے میں کتنے اُمیدوار ہیں؟

آپ ساری عمر واعظ وتقریر اور ذکر شہدائے کربلا کرتے رہیں، مگر جب روز محشر قبر سے اٹھیں تو بے سرمایہ اور خالی ہاتھ اٹھیں گے تو پوچھنے والا پوچھے گا کہ آپ کو کیا ملا؟

تو اس وقت کس قدر شرمندگی وندامت ہوگی۔ آپ معاوضہ لے کر دنیا تو بنالیں گے مگر مرنے کے بعد کفن میں محرومی آپ کے ساتھ جائے گی، نہ من جانب خدا ثواب ملے گا اور نہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے سامنے آپ سرخرو ہونگے۔

اگر بانیان مجالس کو تنگ نہ کریں اور جو کچھ ان سے بن پڑے، بطیب خاطر قبول کرلیں تو دونوں جہان میں آپ کو سرخروئی حاصل ہوگی اور دنیا وآخرت میں آپ کامیاب ہیں یہ کچھ کم سعادت ہے۔ امیر اور دولت مند تو آپ کو گراں قدر نیاز و تحائف دیں گے مگر غریب لوگ اتنی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ ان سے وہ توقع بھی نہ کیا کریں جو سرمایہ داروں سے آپ کو ہوتی ہے۔ آپ سب کو برابر نہ سمجھیں، ہر جگہ لذیذ کھانے میسر نہیں اور نہ ہر جگہ سہولتیں یکساں ہیں۔ امیروں کے ہاں تو آپ کو مرغن کھانے اور کثیر سرمایہ ملے گا لیکن غریب کے ہاں کی دال روٹی اور حقیر پونجی قبول کرلیں!

امیروں اور دولتمندوں کے ہاں ذوق وشوق سے جائیں اور غریبوں کی مخلصانہ دعوت بھی نہ ٹھکرائیں، یہ آپ کے شایان شان نہیں۔ خیال رکھیں کہیں مادر حسین علیہا السلام ناراض نہ ہوجائیں۔

ایامِ محرم کو تجارتی موسم نہ بنائیں

تبلیغ دین کا قصد ہدایت اسلام اور فضائل ومصائب اہلبیت علیہم السلام کی نشر واشاعت، مجلس حسین علیہ السلام کے

بنیادی مقاصد ہیں۔ انہیں مقاصد کو پیش نظر رکھ کر منبر پر جائیں۔ گھر سے خروج انہی مقاصد کے تحت ہو تو آپ کا سفر، آپ کی محنت و صعوبت، تعب و مشقت، گرد و غبار اور بال بچوں سے جدائی یہ تمام اُمور عبادت میں شمار ہوں گے۔

لیکن خدارا! شہدائے کربلا کے پاک خون کو مال تجارت نہ بنائیں اور عزاخانوں کو تجارتی منڈی نہ قرار دیں۔ سارا سال کمائی ہوتی رہتی ہے، مگر ایام محرم اور ایام غم میں آپ روزانہ سات آٹھ مجالس مختلف مقامات پر پڑھتے ہیں اور مختلف اضلاع میں سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے پڑھتے ہیں، آپ کی اس تگ و دو، دوڑ دھوپ میں کیسا جذبہ موجزن ہے؟ کیا کاروباری نقطہ نظر ہے؟ اتنی محنت و مشقت اور دور دراز سفر تبلیغ دین و کشتگانِ جور و جفا، پیاسے شہیدوں کی محبت کے تحت ہیں یا دولت سمیٹنے اور مال و زر کے حصول کیلئے؟ زبان سے آپ کچھ کہیں لیکن آپ کا طرزِ عمل، طریقِ کار اور آپ کا برتاؤ، آپ کے دلی ارادوں اور مخفی عزائم کی غمازی کرتے ہیں۔

آپ تو روزانہ آٹھ دس مجالس اپنے نام الاٹ کروا لیتے ہیں، جبکہ آپ جیسے اہلِ علم بھائی اور آپ ہی جیسے ذاکر محروم رہ جاتے ہیں۔ آپ کہیں ان کی حق تلفی تو نہیں کر رہے؟

بانیانِ مجالس کو اس بات کی ہدایت کرنا آپ کا فرض ہے کہ دوسروں کے بھی حقوق ہیں، انہیں بھی منبر پر بیان کرنے کا حق ہے۔

اگر آپ خود اس استحصال پر پابندی لگائیں اور حدِ اعتدال پر رہ کر اپنے نفوس کو بھی زیادہ مشقت سے بچا کر دو تین مجالس پر اکتفاء کر لیں تو بانیانِ کرام خود دوسرے حضرات کی طرف رجوع کریں گے۔ انہیں بھی صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کا موقع ملے گا۔ اس طرح ایک تو ان کا استحصال بھی ختم ہو جائے گا اور ان کو ان کے حقوق بھی مل جائیں گے اور دوسرے آپ غاصبینِ حقوق کی فہرست میں آنے سے بھی بچ جائیں گے۔

آج کل واعظین و ذاکرین کرام کے مدعو کرنے میں صرف اہلیت ہی پیشِ نظر نہیں ہوتی بلکہ ذاتی تعلقات، باہمی مراسم، برادرانہ اثرات اور یاری دوستی بھی ملحوظ ہوتی ہے۔ اس قسم کے بندھنوں کو توڑنا اور آدابِ مجالس کے مفاسد کو دور کرنا آپ کا فرض نہیں تو اور کون اسے انجام دے گا؟

دینی تبلیغ اور فضائل و مصائب کے بیان کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت ایسی معاشرتی و معاشی برائیوں کے قلع قمع کرنے کی کوشش کریں اور حقوق العباد خصوصاً حقوق الواعظین و ذاکرین کو پامال ہونے اور پامال کرنے سے بچائیں۔ ایک شخصیت میں ارتکازِ مجلس نہ ہونے دیں اور اوقات اور مجالس کی عادلانہ و منصفانہ تقسیم کریں۔

اگر آپ حضرات ایثار و قربانی سے کام لیں اور ایک مشہور و نامور واعظ و ذاکر کرم نوازی کرے تو کئی واعظین و ذاکرین کے کنبے مفلوک الحالی سے بچ سکتے ہیں۔ اس طرح آپ دینی و دنیوی سعادتوں سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

صحیح فضائل و مستند روایات

خدا نے آپ کو بلند مقام عطا فرمایا ہے اور قوم نے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ مجلس پڑھتے وقت آپ کی کیا شان ہوتی ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کان آپ کے دھیان میں مشغول ہوتے ہیں اور ہزاروں نگاہیں آپ کی ادائیں دیکھتی ہیں۔ منبر ذمہ دار مقام ہے۔ یہیں سے احکامِ شرع نشر ہوتے ہیں اور فضائل و مصائب بیان ہوتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی یہیں سے ادا کیا جاتا ہے۔ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، اکثر لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں۔ سب سامعین تاریخ دان اور اہل تو نہیں ہوتے کہ سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکیں اور سچ کو قبول کر کے ساتھ لیتے آئیں اور جھوٹ وہیں دفن کر آئیں۔

فضائل ہوں یا مصائب، تفسیرِ آیات ہو یا تشریح احادیث، تاریخی روایات ہوں یا فقہی مسائل، ان کی سند معتبر اور وہ مستند و صحیح کتب میں وہ مرقوم ہونا چاہئیں جن کو ذمہ دار علمائے کرام و فقہائے عظام کی تصدیق حاصل ہو۔

قانونی مسائل کا حل وکلاء اور قانون دان حضرات سے حاصل ہوتا ہے، امراض کی تشخیص اور ان کا علاج ماہرین طب اور مستند ڈاکٹروں سے کروایا جاتا ہے، امور زراعت ماہرین زراعت سے دریافت کئے جاتے ہیں۔ تعلیم ماہر اور مستند و تجربہ کار اساتذہ سے حاصل کی جاتی ہے، لیکن امور اسلام، مسائل دین، احکامِ شریعت، تفسیرِ قرآن، احادیث اور روایات ہر شخص سے سن کر قبول کر لی جاتی ہیں...

یہ امور اور مسائل و روایات بھی انہیں سے پوچھے اور دریافت کئے جانے چاہئیں جنہیں ان میں مہارت تامہ اور قابلیت کاملہ حاصل ہو، جو دین کے ذمہ دار اور حضرت قائم آلِ محمد علیہ السلام کے معتمد ہوں۔ جن پر اعتماد کر کے اور امانت اسلام جن کے سپرد کر کے امامِ آخر الزماں حضرت امام مہدی علیہ السلام نے غیبت کبریٰ اختیار کی، جن میں علم و فضل کے ساتھ تقویٰ اور دیانت داری کے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہر کتاب معتبر نہیں ہوتی اور ہر بیان صداقت پر مبنی نہیں ہوتا۔ کتاب اسی کی معتبر ہوتی ہے جو خود بھی قابلِ اعتبار اور ذمہ داری کا خیال رکھنے والا ہو اور بیان بھی اسی کا صحیح ہوتا ہے جو ذمہ دار، واقف کار، اہل علم و فضل اور دیانت دار ہو۔

لہٰذا کوئی واعظ وذاکر کسی غیر معتبر و غیر مستند کتاب یا واعظ کا حوالہ دے کر بری الذمہ نہیں ہوسکتا بلکہ وہ ہر غلط اور جھوٹی روایت اور غلط تشریح کا جواب دہ ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی اس سے جواب طلبی نہیں کرتا تو روزِ قیامت تو ضرور باز پرس ہو گی۔

اس واسطے منبر و اسٹیج پر ہر واعظ و ذاکر صاحب کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے صحیح اور مستند بیان کرنا چاہئے۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ آپ کی باتیں فضائی لہروں سے گزرتی ہوئی ہزاروں سامعین کے کانوں میں پہنچتی ہیں۔ یہی باتیں ان کے دل و دماغ میں معلومات کا ذخیرہ بنتی ہیں اور انہی سے وہ اپنے عقائد و نظریات قائم کرتے ہیں۔ آپ کی یہ باتیں اگر صحیح و مستند ہوں گی تو ان کے خیالات و عقائد بھی صحیح اور مستند ہوں گے اور اگر آپ کی یہ باتیں صداقت سے دور اور کذب سے بھرپور، خودساختہ یا غیر معتبر تحریروں و تقریروں سے ماخوذ ہوں گی تو سننے والوں کے پاس جو ذخیرہ معلومات آپ کی بدولت پہنچے گا اور جس سے وہ اپنے خیالات و نظریات تشکیل دیں گے، وہ بھی سب کے سب صداقت سے دور، کذب سے بھرپور اور خودساختہ اور غیر معتبر، باطل اور خالی از حق و صداقت ہوں گے۔

جس طرح آپ صحت بیانی کے سبب باعث ہدایت ہوں گے اسی طرح آپ غلط بیانی کی بدولت گمراہی پھیلانے والے ثابت ہوں گے۔

خدانخواستہ، العیاذ باللہ! آپ نے سامعین کو خوش کرنے کیلئے بے حقیقت فضائل بیان کئے یا رُلانے کے لیے غلط، ضعیف اور خودساختہ روایات بیان کیں تو اس کے بدلے میں آپ کو کچھ ذاتی مفاد تو پہنچ سکتا ہے، کسی قدر داد و تحسین تو مل سکتی ہے، شہرت و ناموری بھی حاصل ہو تو سکتی ہے، مگر قوم میں گمراہی پھیل جائے گی اور غلط روایات اور باطل خیالات قوم کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائیں گے اور اغلاط و اباطیل کا جما ہوا میل پھر کسی اصلاحی صابن سے دور نہ ہو سکے گا۔

دیکھئے! آپ کی غیر ذمہ داری کس قدر بگاڑ پیدا کرسکتی ہے، قوم بننے کی بجائے بگڑ جائے گی۔

مجلس جناب سید الشہداء علیہ السلام اور میلاد کی محافل ایک قومی تربیت گاہ ہے۔ واعظین و ذاکرین اس تربیت گاہ کے معلمین میں سے ہیں۔ اگر آپ صحیح تربیت دیں گے تو قوم سنور جائے گی اور غلط تربیت کریں گے تو قوم بگڑ جائے گی اور ایسی بگڑے گی کہ جس کی اصلاح ہی ممکن نہ رہے گی۔ پھر جب بھی درد دین رکھنے والے خیر خواہانِ قوم کوئی بھی اصلاحی حل پیش کریں گے تو وہ طعن و تشنیع کا مورد بن کر تبرّہ بازی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور قوم گالیوں سے ان کا استقبال کرے گی۔

جب ہمارے آئمہ معصومین علیہم السلام کے فضائل و مصائب کثرت سے ہیں تو ہمیں جھوٹے فضائل و مصائب بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جھوٹی روایت پر تو نہ رونا ثواب ہے اور نہ ہی رلانا۔

حُرمتِ غنا

ہاں! غناء ضرور منع ہے مگر قصیدہ خوانی، شیریں بیانی اور خوش الحانی منع نہیں۔ یہ چیزیں تو باعث ثواب ہیں۔ آپ بیشک پڑھیں، خداوند عالم بحق آئمہ معصومین علیہم السلام آپ کو نیکیوں اور اعمالِ خیر کی زیادہ توفیق عنایت فرمائے اور دین و نیا کی سعادتوں سے آپ کو مالا مال کردے۔ مجالس کا سلسلہ زور وشور سے جاری رکھیں، مگر غنا اور راگ ورنگ سے ضرور پرہیز کریں۔

ہمارے مذہب میں غنا مطلقاً حرام ہے۔ کسی صورت میں، کسی مقام پر، کسی وقت بھی جائز نہیں۔ قرآن وحدیث اور سیرتِ معصومین علیہم السلام اس کے حرام ہونے پر متفق ہیں اور تمام علمائے امامیہ کا اس کے ناجائز ہونے پر اتفاق ہے۔

غنا کی تشریح

غنا کی تشریح وحدود پر اکثر اوقات بحث کی جاتی ہے۔ جنہوں نے غناء حرام کیا ہے، انہوں نے اس کی تشریح بھی کردی ہے۔ کون سی چیز ہے جس کو شریعتِ اسلام نے حرام کیا ہو اور اس کی تشریح نہ کی ہو؟

1۔ غناء کی ایک قسم ہے: "تَرْجِیْعُ الصَّوْت"، "گرگری مارنا"، "تان پلٹنا" "گلے میں آواز کا لوٹانا" یہ معروف و مشہور چیز ہے۔ اسے ہر شخص جانتا ہے، قصائد اور مرثیہ خوانی میں اس کا استعمال حرام ہے۔

2۔ بے مقصد اور بغیر الفاظ کے صرف خالی سُر کو طول دینا۔ نہ کوئی الفاظ ادا ہو رہے ہیں، نہ کچھ پڑھا جارہا ہے بس کئی منٹ سریلی آواز کو چلائے رکھنا۔ یہ راگ ہے۔ بعض اوقات سُر کی طوالت لفظوں کو ذبح کر دیتی ہے۔

3۔ ماہرین غناء نے غناء کی طرزیں اور راگ کی قسمیں بنا رکھی ہیں۔ مثلاً بھیرویں، سندرہ، مال کونس، پہاڑی اور جنگلہ وغیرہ۔ ان سے واقف ہوتے ہوئے، ان کے مطابق آواز کو بلند کر کے اوران کی حدود متعین کر کے پڑھنا راگ ہے اور حرامِ مطلق ہے۔

4۔ خوش الحانی کا وہ طریقہ اور لہجہ کی وہ ادا جو باطل گانوں اور فلمی ترانوں میں استعمال کی جاتی ہے، جس کو سننے والا فلمی گانا تصور کرے، اسی طرح سازوں کی دھن پر گانا اور ڈھول کی آواز پر پیٹنا وغیرہ حرام ہے۔

یہ راگ کی قسمیں ہیں جنہیں پڑھنے والے جانتے اور سمجھتے ہیں مگر "خوے بدرا بہانہ بسیار" کے بطور بیہودہ عذر پیش کرتے ہیں اور طرح طرح کی باطل اور کمزور دلیلیں اپنے غلط فعل کو صحیح کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ مگر ان کی سخن سازی، حیلے بہانوں اور چرب زبانوں سے حرامِ محمدؐ حلال نہیں ہو جاتا۔ اگر اتباعِ شریعت کرتے ہوئے اس فعلِ حرام سے پرہیز کریں اور سادہ لہجہ میں بغیر راگ کے قصیدہ خوانی اور مدحِ آئمہ معصومینؑ بجالائیں تو انہیں ثواب بھی بے حساب ملے گا اور کسی

جرم میں پکڑے بھی نہیں جائیں گے۔ لیکن اگر اس جرم کے ساتھ ساتھ اس حرام محمدؐ کو حلال بنانے کی کوشش کریں اور ذاتی مفاد کی خاطر فرمانِ معصومین علیہ السلام اور شرع سے مذاق کریں تو یہ دوہرا گناہ ہے۔ ایک حرام کے ارتکاب کا، دوسرا حرام کو حلال بنانے، جو بدترین فعل ہے۔

چونکہ راگ ایک قسم کی پُر لذت حرام غذا ہے اور جادوئی اثر رکھتا ہے، اس لیے اس کے دلدادہ افراد پڑھنے اور سننے والے، اس کے جواز کی یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ ہم جو بات کرتے ہیں، جو سادہ لہجہ میں شعر پڑھتے ہیں وہ بھی راگ ہوتا ہے اور راگ کی کسی راگنی میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔

اصل تو ان میں رچ بس جانے والی راگ کی لذت اور ان کا بگڑا ہوا ذوقِ سماعت اور غناء کا عشق ان سے یہ باتیں کرواتا ہے۔ اوّل تو یہ بھی غلط ہے کہ ہر کلام و شعر، ہر نثر و نظم راگنی میں رنگی ہوتی ہے۔ سیکھنے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آواز کی ادا کو اس سُر تال کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ لہجے کو اس کی ادا کا بلندی پستی میں پابند کرنا ہوتا ہے۔ اس واسطے انسان کا ہر کلام راگ کا پابند نہیں ہوتا اور کسی راگنی کے تحت نہیں ہوتا۔

دوسرا یہ کہ اس میں راگ کا لطف اور غناء کی لذت نہیں ہوتی۔ اسے راگ نہیں کہا جا سکتا۔ تیسرا امر یہ ہے کہ بات کرنے والا اور سادہ لہجے میں شعر پڑھنے والا گو خوش الحانی میں بھی پڑھے، اسے راگ اور اس کی اقسام کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ راگنی سے واقف ہوتے ہوئے اس کے مطابق الفاظ ادا کرتا ہے اور نہ ہی اس کا یہ قصد ہوتا ہے کہ میں راگ پڑھوں اور نہ ہی وہ آواز کو گلے میں گھماتا ہے۔ اس لئے وہ راگ کے جرم سے بری اور غناء کے گناہ سے محفوظ ہے۔

ایک عام عذر اور اس کا ابطال

غناء کے شیدائی اور راگ کے فدائی ایک وجہ یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ راگ اور سر کی وجہ سے کئی غیر لوگ مجلس میں شرکت کرتے ہیں اور مذہب سے متعارف ہوتے ہیں اور انہی سریلی آوازوں کی وجہ سے وہ مذہب اہل بیت علیہم السلام سے قریب ہو جاتے ہیں۔ بالآخر وہ مذہب حق کو قبول کر لیتے ہیں اور اس طرح مذہب شیعہ ترقی کرتا ہے۔ یعنی مذہب شیعہ کی جانب لوگوں کو کھینچنے کیلئے راگ اور سُر تان بہترین ذریعہ ہیں۔

اس کا جواب

اس کا جواب یہی ہے کہ کسی مذہب کو موردِ طعن اور غلط ثابت کرنے کیلئے یہی کافی ہے کہ اس مذہب کی ترقی، اس کے اصول و فروغ، حقانیت اور تعلیمات صادقہ کی بناء پر نہیں ہوئی بلکہ اسباب باطلہ اور ناجائز ذرائع سے ہوئی ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ راگ وغناء اور سُریلی آوازوں اور تانوں نے ہمارے مذہب کو پھیلایا ہے تو اس سے بڑھ کر اس مذہب کے باطل ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ ناجائز ذرائع اور باطل اسباب کے ذریعہ وہ اپنا مذہب پھیلاتے ہیں جن کے مذہب کے اندر کچھ بھی نہ ہو۔ اس کے اصول وضوابط غلط ہوں، اس کے رہنما اور اس کے بانی حق سے دور ہوں اور وہ مذہب فریب و کذب سے معمور ہو، وہ الہامی وآسمانی مذہب نہ ہو بلکہ دنیوی و مادّی اغراض کے تحت ایک فرقہ ہو، تو اس کی اشاعت مادّی اور باطل اغراض کے تحت اور ناجائز امور سے کی جاتی ہے۔

شیعہ مذہب الہامی مذہب ہے۔ اس کا آئین قرآن وسنتِ نبویؐ ہے۔ اس کے رہبرؑ معصوم، اس کی تعلیمات خدائی ہیں اور اس کے احکام الٰہی ہیں۔ اس مذہب کو راگ وغنا سے نہیں بلکہ آئمہ معصومین علیہم السلام اور حق کی خاطر ان کی اور ان کے شیعوں کی قربانیوں نے ترقی بخشی ہے۔

جائز کی مدد ناجائز سے، حق کو طاقت باطل سے اور سچ کو ترقی جھوٹ سے نہیں دی جاسکتی۔ کیا شراب پی کر ایک بندہ مصلّی عبادت پر کھڑا ہو جائے اور سینکڑوں رکعتیں شراب کے نشہ کی وجہ سے پڑھ جائے تو کیا اس کی عبادت مقبول ہوگی؟

مذہب کے حقیقی اصول وفروغ اور تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کردو، اگر وہ قبول کریں تو آجائیں، ورنہ انہیں اپنے حال پہ چھوڑ دو۔ یہی طریقہ انبیاء ومرسلینؑ کا رہا ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے۔ انہوں نے لوگوں کو دعوتِ دین دی۔ مذہب اسلام کی طرف پکارا۔ ان کی پاک زبانوں سے نکلے ہوئے کلمات کے ساتھ انہیں تصدیقی معجزات دیئے اور تائید کے لیے آیات وبیّنات بھی خداوند تعالیٰ ان کو ساتھ دیں۔ روشن دلیلیں، عقلی ثبوت اور خارق العادات معجزات دیئے۔ یہ سب اسباب تبلیغ وہدایت کے لیے فراہم کئے۔ مگر کسی پیغمبر نے سوز خواں اور ہم نوا اپنے ساتھ نہیں رکھے!

کیا اس اسلام کی اشاعت اور دین کی ترقی پسند نہ تھی؟ انبیاء جو جواب میں پتھر برداشت کرتے رہے، گالیاں سنتے رہے، اذیتیں سہتے رہے اور مختلف طریقوں سے اپنی قوم کے ہاتھوں قتل بھی ہوتے رہے مگر انہوں نے کبھی راگ وغناء کو دعوت دین اور لوگوں کی کشش کے واسطے استعمال نہیں کیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام مناجات اور دعاؤں میں راگ وغنا نہیں گاتے تھے، وہ تو رقتِ قلب سے نکلی ہوئی صدا اور دلی محبت اور بندگی کا اظہار خوش الحانی اور جذب ودرد سے بھری ہوئی آواز کے ساتھ کرتے تھے۔ بیشک ان کی آواز میں درد تھا، سوز تھا، خوش الحانی تھی مگر راگ وتان نہ تھا۔ آپ جب قوم کو پکارتے، تعلیمات وہدایتِ خداوندی پیش کرتے تو سرتال کے ساتھ دعوت نہ دیتے تھے اور نہ ہی سریلی آوازوں کے بہانے قوم کو اکٹھا کر کے تبلیغ کرتے۔

حضرات! راگ کی حرمت اپنے مقام پر بجا ہے اور اسے کسی طور پر جائز نہیں کیا جا سکتا، ہاں! قصائد، اشعار، رباعیات، دوہڑے، راگ سے خالی سر میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

قارئین کرام! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کا سایۂ رحمت آپ کے سروں پہ قائم رکھے، آپ ذوق رکھتے ہیں۔ کسی قوم میں واعظ کی باتیں، مقرر کی تقریر اور ذاکر کا بیان سننے کا اشتیاق شیعہ مذہب کے برابر نہیں ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مقرر حضرات مساجد میں تقریر فرما رہے ہیں لیکن مسجد سامعین سے خالی ہے۔ چند ایک بے دلی سے سماعت کر رہے ہیں لیکن کیا کہنا شیعہ قوم کے ذوق و شوقِ سماعت کا؟ اُدھر کسی مشہور واعظ و نامور ذاکر کی مجلس کا اعلان ہوا، اِدھر وقتِ مقررہ سے پہلے ہی محبانِ اہل بیت علیہم السلام، حضرتِ شبیر علیہ السلام کے شیدائی مقامِ مجلس میں جمع ہونے شروع ہو گئے اور جلسے کا پنڈال یا عزاخانہ کھچا کھچ بھر گیا۔

آپ اپنا قیمتی وقت صرف کرتے ہیں، دور دراز سے پیدل چل کر یا پیسہ خرچ کر کے حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی مجلس سننے کے لیے آتے ہیں۔ یہ ایک تڑپ ہے جو آپ کو کھینچ کر فرزندِ بتولؑ کی صفِ ماتم میں پر لا بٹھاتی ہے۔

نیز شیعہ قوم بڑی مخیر قوم ہے۔ کھلے دل سے عزاداری پر لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے خرچ کر ڈالتی ہے۔ عظیم الشان عزاخانے آپ کی مالی قربانیوں کے مظہر ہیں اور مشہور خطباء، واعظین اور نامور ذاکرین کی قیمتی گاڑیاں و گھر آپ کی فراخدلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ کا جذبہ جود و کرم قابلِ ستائش ہے، لیکن برا نہ ہوگا کہ اگر چند ایک خامیاں بھی دور ہو جائیں۔ اگر یہ خامیاں دور ہو جائیں تو صدا بہار شجر دیمک سے بچ کر بابرگ و بار ہو جائے اور جذبہ محبت و ایثار سے سرشار قوم اپنے نظریات و عملیات کے اعتبار سے اقوامِ عالم کی مقتداء بن جائے۔

۱۔ جذبۂ خلوص

آپ خالص فضائل اور خالص مصائب سننے کی خاطر مجلس میں جائیں۔ آپ کے پیشِ نظر قرآن و حدیث اور فضائل و مصائب ہوں۔ اگر آپ لچھے دار تقریروں، ادبی زبان، لفاظی کا سحر بیان اور فلمی چالوں کے قصیدے، غنائی لب و لہجے سننے کیلئے جائیں گے تو آپ کا مقصد خالص فضائل و مصائب تو ہرگز نہ رہیں گے، بلکہ اس میں لذتِ سماع، اشتیاقِ فن اور حُبِ سرود و غنا کی آمیزش ہو جائے گی۔

ثواب تو ذکرِ فضائل و مصائب سننے سے ملتا ہے نہ کہ تقریروں کی چاشنیوں، لطیفوں کی سحر بیانیوں، الفاظ کی رنگینیوں، غنائی تانوں اور راگ آمیز سروں کے سننے سے۔ جس قدر آپ کے مقصد میں خلوص کم ہوتا جائے گا، آمیزش بڑھتی چلی جائے گی

اور اسی قدر ثواب بھی گھٹتا چلا جائے گا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مشہور واعظ و ذاکرین کے تو وقتِ مقرر سے پہلے آپ جائے مجلس پر پہنچ کر نشست محفوظ کر لیتے ہیں، لیکن غیر مشہور واعظ و ذاکر کی مجلس کے لیے بانی مجلس کی نگاہ آپ کی راہ تکتے تکتے تھک جاتی ہے۔ حاضری بہت کم ہوتی ہے اور وقتِ مقررہ سے کافی دیر کے بعد بانی بیچارہ مجلس شروع کرواتا ہے۔ آپ کی رفتار میں سستی، ذوق میں کوتاہی اور شوق میں نمایاں کمی نظر آتی ہے۔ آپ سنتے ہیں تو بے اعتنائی کے ساتھ اور دیکھتے ہیں تو لاپرواہی کے ساتھ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذوقِ سماعت اور جذبہ محبت خالص نہیں رہا۔ اس میں لذتِ شیریں بیانی وحظ غناء اور سرود کی آمیزش ہو گئی ہے۔ عبادت میں خلوص اور قربت نہیں تو آپ کے اس غیر خالص عمل کی اجرت نہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ اور سعادتمند ہیں وہ مومن جو مجلس کا اعلان سنتے ہیں تو یہ نہیں پوچھتے کہ ذاکر کون ہے؟ مشہور کی نسبت غیر مشہور کی مجلس میں ذوق وشوق سے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کوئی سامانِ لذت نہیں ہوا۔ نہ شیریں بیان، نہ پلٹے گرگری اور تان۔ خالص فضائل ومصائب آمیزش سے محفوظ جذبہ سماعت، یہ ہے خالص عبادت۔

۲۔ قرآن وحدیث سے گریز کیوں؟

جلسوں میں بیان کرنے والے متعدد حضرات و واعظین و ذاکرین مدعو ہوتے ہیں۔ خدا آپ کو جذبہ خلوص عطا فرمائے۔ جب تک ذاکر شیریں بیان، خوش الحان، سریلی آواز اور طرب انگیز غناء آمیز لہجے میں بیان کرتا رہے آپ اس قدر محو سماعت ہوتے ہیں کہ اس وقت آپ کا سب کچھ قربان بھی ہو جائے تو آپ کو احساس نہ ہوگا، لیکن اگر عالمِ دین، واعظ، نیک سیرت ناصح، قرآن وحدیث بیان کرنے آئے تو آپ اُٹھ کیوں آتے ہیں؟ پنڈال خالی ہو جاتا ہے۔ عزاء خانہ کی مُردم کی شکایت کرنے لگتا ہے اور واعظ بیچارہ حسرت سے جانے والوں کی بے رُخی اور پشت نمائی کو دیکھتا ہے۔

آپ اپنے طرزِ عمل سے کس قدر قرآن اور اسلام سے بے رخی کرتے ہیں؟ جتنی آپ کو راگ وسُر سے محبت ہے، اتنی ہی مسائل دین اور قرآنِ مبین سے غفلت کیوں نظر آتی ہے؟ جس قدر آپ سُر وتال کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، اسی قدر قرآن خوانی واحکامِ اسلام کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ کیا قرآن آپ کے اس طرزِ عمل کی شکایت نہ کرتا ہوگا؟ کہتا ہوگا:

''اے میرے خالق! تیرے بندوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ یا رسولؐ اللہ! تیری اُمت مجھے سننا نہیں چاہتی! یا علیؑ! تیرے شیعہ مجھ سے غفلت کرتے ہیں! یا حسینؑ! تیرے عزادار مجھ سے بے اعتنائی برتتے ہیں''۔

یہی حال احکامِ دین کا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے اور کتنی دکھ کی بات ہے کہ اکثر اوقات واعظ و عالم کو مشہور ذاکر سے اس لیے پہلے پڑھوایا جاتا ہے کہ لوگ سُروں کی لالچ میں بیٹھے رہیں گے اور گو بے رغبتی سے ہی سہی، کچھ تو سن ہی لیں گے۔

ایسے افراد کو مجالس میں جانا ہی نہ چاہیے جو قرآن سننا نہ چاہتے ہوں اور ان پر پند و نصائح کی باتیں اثر نہ کرتی ہوں کیونکہ قرآن کا سننا واجب اور احکامِ اسلام کو یاد کرنا فرض ہے۔ جس وقت یہ توہینِ قرآن اور تحقیرِ اسلام کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں، تو مجلس کی حرمت اور قوم کی عزت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

دوسرے لوگوں اور غیر قوموں کے سامنے شیعہ قوم کی قرآن سے بے رغبتی اور احکامِ اسلام سے بے اعتنائی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ مجالس کے انعقاد کا مقصد ہی تعلیمِ قرآن کی اشاعت اور احکامِ اسلام کی ہدایت ہے۔ ایسے وقت میں منہ اُٹھا کر آ جانے سے بہتر ہے کہ جایا ہی نہ جائے۔

ہاں! کسی مجبوری کے تحت اور ضروریات کے لیے اٹھ کر آنا اور بات ہے۔ البتہ عمداً سریلی آواز کو پسند کرنا اور قرآن سے بیزاری اختیار کرنا گناہِ عظیم ہے۔

۳۔ کھوٹے کھرے میں تمیز

قارئین کرام! آپ مجلس کے انعقاد میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ اصول پسندی اور غرض و غایتِ مجلس کی پابندی کریں تو بانی حضرات اور واعظین و ذاکرین کرام کو آپ سبق پڑھا سکتے ہیں اور اپنی اصلاح کر کے ان کے ہر دو گروہوں کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مجالس کی رونق آپ کے دم قدم سے ہے اور یہ دونوں صاحبان بانی و ذاکرین، مجالس کی کامیابی میں آپ کے محتاج ہیں۔

اگر آپ غلط سننا پسند نہ کریں تو وہ غلط پڑھنا بند کر دیں گے۔ اگر آپ ان راگ و رنگ سے پرہیز کریں تو وہ راگ چھوڑ کر سادہ آواز میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیں گے۔ اگر آپ چٹکلہ بازی، جاہلانہ لطیفے اور غلط بیانی سے کنارہ کریں گے تو وہ علمی، اصلاحی اور ٹھوس و مستند فضائل بیان کرنا شروع کر دیں گے۔ اگر آپ احکامِ اسلامی، فقہی مسائل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سننا چاہیں گے تو وہ بھی آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایسی کتابوں کے مطالعہ کی تکالیف گوارا کر کے آپ کے حسبِ منشاء مواد تیار کریں گے کیونکہ بانی حضرات وہی واعظ و ذاکر مدعو کریں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور واعظ و ذاکر وہی بیان کریں گے جو آپ سننا پسند کریں گے۔

اسی واسطے اصلاحِ مجالس کا زیادہ انحصار آپ پر ہے۔ یہ بھی سوچ سمجھ لیں کہ واعظین و ذاکرین میں آپ کا خیر خواہ کون

ہے اور آپ کی سادگی سے ناجائز فائدہ کون اُٹھاتا ہے؟ آپ کو یونہی خوش کر کے بلا عمل جنت کی ٹکٹ دے کر آپ کو بے وقوف بناتا ہے۔ آپ کو خوفِ خدا دلا کر عمل صالح اور تقویٰ کی رغبت دلا کر سچا مومن بنانے کی کوشش کون کرتا ہے؟

سچا دوست وہ ہوتا ہے جو دوست کو اس کی خامیوں سے آگاہ کر کے اسے خامیاں دور کرنے کی تلقین کرے کیونکہ جب اسے برائیوں کا احساس دلایا جائے اور ان کے انجام سے باخبر کیا جائے تو اسے برائیوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ برائیاں چھوڑ دیتا ہے۔

وہ شخص دوست نما دشمن ہے، جو دوست کی خامیاں جانتے ہوئے ان کو خوبیاں بتائے اور برائیوں کے انجام سے آگاہ نہ کرے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ برائیاں اس میں گھر کر جاتی ہیں، وہ نیکیوں سے عاری اور برائیوں کا عادی بن جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ آپ کو بیوقوف بنا کر اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ آپ ایسے لوگوں کو خیر خواہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ آپ کے بدخواہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کو ہدایت نہیں کرتے بلکہ الٹا گمراہ کر دیتے ہیں اور یہ لوگ بھی روزِ قیامت ان ہی باطل پیشواؤں میں شامل ہوں گے جو اپنے مریدوں اور پیروکاروں سے بیزاری اختیار کریں گے۔

آپ پرکھیں کہ آپ کو میٹھی نیند کون سلاتا ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کون کرتا ہے۔ آپ کو نیکی کی دعوت کون دیتا ہے اور آپ کو برائیوں میں گرفتار کون رکھتا ہے۔

آپ نیک و بد، کھرے کھوٹے اور سچ جھوٹ میں تمیز کریں۔ واعظ و ذاکر کی صورت و سیرت دیکھیں، گفتار و کردار کا موازنہ کریں، ان کا علمی مقام اور صلاح و تقویٰ دیکھیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ ان میں دردِ دین کتنا ہے، رغبتِ دنیا کتنی ہے، ان میں اطاعتِ چہاردہ معصومین علیہم السلام کتنی ہے اور حبِ جاہ و حشمت کس قدر ہے!

۴۔ حق کی حمایت اور باطل سے نفرت کے جذبہ کو بیدار کریں

آپ ایک عرصے سے انبیاء و مرسلین اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت اور شہداء کی قربانیوں کے واقعات سنتے آئے ہیں۔ اس لئے آپ ان واقعات سے درسِ بصیرت حاصل کریں۔ جب آپ کو یقین ہو جائے تو اس کی بھرپور حمایت اور باطل سے مکمل نفرت کریں۔ سچوں کا ساتھ دیں اور جھوٹوں سے بیزاری اختیار کریں۔ غاصب کو برا جان کر اس سے پرہیز کریں اور جس کا حق غصب ہوا ہے اس کی مدد کریں۔ مظلوم سے الفت اور ظالم سے نفرت کے جذبہ کو بیدار کریں۔

مظلوم سے پیدا الفت ہو اور روحِ یزیدی مٹ جائے
اس واسطے تیرے درد بھرے حالات سنائے جاتے ہیں

واقعہ کربلا ایثار وقربانی، حمایتِ اسلام، درد دین اور حفاظت واطاعت احکام شریعت کا درس دیتا ہے اور حق وباطل میں تمیز کرنے کا شعور اور اخلاقی جرأت پیدا کرتا ہے۔

اس قدر مجالس جناب سید الشہداء علیہ السلام سننے کے بعد اگر آپ میں جذبۂ ایثار وقربانی وحمایتِ حق کی اخلاقی جرأت پیدا نہیں ہوئی تو کانوں سے آپ نے جو واقعات سن کر دل میں نہیں اتارے، بس صرف ذوقِ سماعت پورا کیا۔ اخلاقی بصیرت اور حق گوئی کی عادت آپ نے حاصل نہیں کی، گویا آپ نے شہدائے کربلا علیہم السلام کی بےنظیر قربانیوں کی قدر نہیں کی۔ آپ صرف سامع رہے عامل نہیں بنے۔

۵۔ تشکیل سیرت و کردار سازی

ماتمی لاکھوں ہیں نفس بے ریا کس میں ہے
دیکھنا ہے تیرے اُسوہ کی ادا کس میں ہے

آپ ماشاء اللہ حسینیؑ ہیں۔ آپ میں حسینیتؑ کی جھلک نظر آئے۔ آپ دشمن یزید ہیں۔ آپ کی سیرت یزیدی کردار سے پاک دکھائی دے۔ مجالس میں آپ پاک بدن اور پاک لباس کے ساتھ باوضو شرکت کریں، کیونکہ یہ آپ کی عبادت ہے۔ یہاں قرآن کی تفسیر، احادیث کی تشریح اور معصومین وطاہرین علیہم السلام کے فضائل ومصائب بیان کئے جاتے ہیں۔ طاہرینؑ کی مجلس میں آپ ظاہر وباطن کو طاہر بنائیں۔ دل ودماغ کو طاہر رکھیں، نیت طاہر ہو، خیالات طاہر ہوں، طہارت ونجاست کے مسائل سے واقفیت حاصل کریں۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ طاہرین ومعصومین علیہم السلام کی محبت رکھیں اور کبرسن وضعیف العمر ہونے کے باوجود نجاست ومطہرات سے بےخبر ہوں۔ آپ صورت وسیرت میں حسینیؑ نظر آئیں۔ جہاں آپ محبتِ حسین علیہ السلام کے دعویدار ہیں، وہاں آپ کا کردار آپ کے حسینیؑ ہونے کی شہادت دے اور جہاں آپ یزید پر لعنت کرتے ہیں وہاں آپ کا کردار یزیدی افعال سے بھی بیزاری ظاہر کرے تاکہ غیر لوگ آپ کو دیکھ کر رشک کریں اور آپ کے حسن عمل کی تعریف کریں۔

یاد رکھئے! فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دین کی خاطر قربانی دی ہے۔ شریعت کی حفاظت کیلئے گھر لٹایا ہے۔ حق کی خاطر حضرت ابوطالب کا سارا کنبہ قربان ہوگیا، اس واسطے ان کی پیروی کرتے ہوئے دین اسلام اور شریعت کے احکام کی قول وعمل سے قدر کریں۔

جہاں شہادت کے واقعات سن کر آنسو بہائیں۔ وہاں مقصدِ شہادت کی اپنے عمل سے حفاظت کریں۔

قرآن حسینؑ پڑھتے تھے اس وقت بالیقین
سینے پہ جب سوار تھا وہ قاتل لعین
آواز دردناک سے کہتے تھے شاہِ دین
إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ
خونِ چکیدہ نے بھی رفاقت کی بات کی
ہر قطرہ سے صدا تھی "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" کی

اگر آپ مقصد شہادت حسین علیہم السلام کی حفاظت وحمایت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوں تو آپ شہدائے کربلا کی معیت میں محشور ہوں گے۔

قارئین، بانیانِ کرام، واعظین وذاکرین عظام ذوی الاحترام! آپ کی خیر خواہی اور اصلاح کیلئے یہ چند اوراق تحریر کئے ہیں۔نیت نیک ہے، مقصد شریف ہے۔ گو الفاظ تلخ ہیں مگر معانی شیریں ہیں، عبارت ترش ہے مگر مطالب میٹھے ہیں، گھونٹ کڑوے ہیں مگر اثر شفا ہے، بیان مزیدار نہیں مگر انجام خیر پرمنی ہے۔

ایک خیر خواہ دوست کی حیثیت سے آپ کو مفید مشورے دیئے ہیں اور آپ کی خامیاں دور کرنے کا دستور العمل پیش کیا ہے۔ بظاہر یہ کھری باتیں آپ کو ناگوار گزریں گی، مگر درحقیقت ان پر عمل آپ کی دین ودنیا کی سعادتوں کا ضامن ہے۔

میں بحیثیت ہمدردِ قوم چاہتا ہوں کہ حضرتِ مظلومِ کربلا علیہ السلام کے ذکر کی یہ عبادت ضائع نہ ہو جائے بلکہ رنگ لائے۔ خداوندِ عالم بحق چہاردہ معصومین علیہم السلام آپ کو سوائے غمِ شہداء کربلا، اسیرانِ رنج وبلا، ہر غمِ دنیا سے محفوظ رکھے اور عزاداریٔ سید الشہداء علیہ السلام کو قائم رکھنے اور شہدائے کربلا کی یاد منانے کی زیادہ توفیق مرحمت فرمائے، (آمین)۔

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ زہر بھی کرتا ہے کارِ تریاقی

✿✿✿

اولادِ حضرت امام حسنؑ کی قربانیاں

شہادتِ حضرت قاسم علیہ السلام

حضرت امام حسن علیہ السلام کا تقریباً پورا خانوادہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی رفاقت میں وارد کربلا ہوا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کا بھرا گھر کربلا میں اپنے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کے پورے گھر کے ساتھ اُجڑا۔ جس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کا آباد گھر کربلا میں برباد ہوا، اسی طرح حضرت امام حسن علیہ السلام کا پر رونق صحن کربلا میں تاراج ہوا۔ گلستانِ مجتبیٰ کے نونہال بادِ خزاں نے یوں ویران کیے کہ پتے جدا ہو گئے، شاخیں کٹ کر ریت پر بکھر گئیں اور تازہ پھول شاخوں سے جدا ہو کر کلیوں کی صورت میں منتشر ہو کر خاک میں مل گئے۔ یوں پھلتا پھولتا باغ خزاں نے تاراج کر دیا اور بیوہ مائیں نونہالوں پر ماتم کرنے کے رہ گئیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کے چھ فرزند اپنے چچا کی نصرت کے لیے میدان میں یکے بعد دیگرے نکلے، جن کی عمریں گیارہ سے بائیس سال تک تھیں۔ سوائے حضرت حسن مثنیٰ کے کہ وہ زخموں سے چور ہوئے مگر بچ گئے اور باقی پانچ نوخیز نوجوانوں کی لاشیں چچا کو میدان سے اٹھا کر لانا پڑیں۔ اسی طرح یہ پانچ چاند صحن امام مجتبیٰ علیہ السلام کی روشنی ختم کر گئے، بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ مدینے کے افق سے طلوع ہوئے اور کربلا کے افق میں غروب ہو گئے۔

۱۔ حضرت حسن مثنٰی علیہ السلام

آپ کی عمر کربلا میں بائیس سال تھی، آپ جناب سید الشہداء علیہ السلام کے داماد اور ان کی دختر حضرت فاطمہ کبریٰ علیہا السلام کے شوہر ہیں۔ آپ ہی سے حضرت امام حسن علیہ السلام کی نسل پاک بڑھی ہے۔

یہ واقعہ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ اذن لے کر میدانِ کارزار میں آئے، سترہ یزیدیوں کو واصل جہنم کیا، اٹھارہ زخم کھائے اور زخمی ہو کر گر پڑے، زندگی باقی تھی، امام علیہ السلام اس زخمی جوان کو اٹھا کر خیمہ میں لے آئے اور ہاشمی شہداء میں رکھ دیا۔

یہ مجروح مجاہد زخموں سے کراہتا رہا۔ اہل بیت علیہم السلام ان کے علاج سے بے بس تھے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں کس طرح ان کے زخموں پر مرہم لگا سکتے تھے، حتیٰ کہ پانی پلانے سے بھی عاجز تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زخمی جوان

بہت قوی القلب اور مضبوط اعصاب رکھتا تھا، کہ اٹھارہ شدید زخموں کے باوجود بغیر علاج اور پانی کے وقت گزارا۔ ہاشمی مستورات جہاں اس زخمی پہ گریہ وبکا کرتیں، وہیں اپنی غربت وعلاج سے بے بسی اور پانی نہ پلا سکنے پر بھی آنسو بہاتیں۔

گیارہویں کی رات جب باقی ماندہ افراد کو مستورات کو قید کیا گیا تو ان کو بھی قیدیوں میں شامل کرلیا گیا۔ ظالموں کو اتنا خیال نہ آیا کہ نہ یہ سواری پہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ ہی پیدل چل سکتے ہیں۔ کسی نے ان کے قتل کا ارادہ کیا، مگر اسماء بن خارجہ فزاری اس کے آڑے آگیا کیونکہ حضرت حسن مثنیٰ کی والدہ گرامی خولہ بنت منصورؒ، فزاری قبیلہ سے تھیں۔ اس نے ظالموں کے قبضہ سے اس زخمی کو لے لیا اور عمر بن سعد نے چھوڑ دینے کا حکم دے دیا اور اس کی وجہ سے جناب حسن مثنیٰ کی جان بچ گئی۔ اسماء بن خارجہ فزاری ان کو کوفہ لے آیا اور یہ علاج کرنے سے تندرست ہو گئے۔ آٹھ ماہ یا ایک سال تک کوفہ میں رہے، پھر مدینہ واپس آگئے۔

۲۔ حضرت احمد بن حسن علیہم السلام

ان کی عمر سولہ برس تھی۔ ابومخنف نے ان کی شہادت حضرت قاسمؑ کے بعد درج کی ہے اور اکثر کتب مقاتل میں ان کا حضرت قاسمؑ سے قبل کا شہید ہونا مسطور ہے۔ آپ نہایت شکیل ووجیہہ تھے، الحق جوانی، حشمت ووجاہتِ خاندانی تھی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا اسمِ گرامی ام بشر بنت مسعود الانصاری علیہا السلام ہے۔ آپ واقعہ کربلا میں اپنے فرزند کے ہمراہ تھیں۔ مقتل ابی مخنف میں ان کی شجاعت وشہادت کی کیفیت اس طرح درج ہے:

حضرت احمدؑ حضرت امام حسین علیہ السلام سے اِذنِ جہاد لے کر میدانِ کارزار میں یہ رجز پڑھتے جاتے تھے:

اِنِّیْ انا نجل الامام ابن علیٌّ
اَضْرِبُکُمْ بِالسَّیْفِ حَتّٰی یغلل
نَحْنُ وَ بَیْتِ اللّٰہِ اولٰی بِالنَّبِیِّ
اَطْعَنُکُمْ بِالرُّمْحِ وَ سَطَ الْقَسْطَل

''میں پسر حسنؑ فرزند علیؑ ہوں۔ تلوار سے تمہیں مارتا رہوں گا یہاں تک کہ تلوار کند ہو جائے گی۔ بیت اللہ کی قسم! ہم نبی پاک سے زیادہ قریبی ہیں''۔

نیزہ مارنے اور شمشیر زنی میں یہ نوجوان ماہر تھا۔ چنانچہ جب معرکہ آرائی شروع ہوئی تو اس شہسوار میدانِ شجاعت نے

اس زور سے حملے کئے کہ فوج کے دائیں اور بائیں حصہ میں سخت انتشار پیدا ہو گیا۔ میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ پر پلٹا دیا۔

بعض کتب مقاتل کے مطابق اسی سواروں کو ہلاک کیا مگر شدتِ پیاس سے شہزادے کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، گلا خشک ہو گیا تھا اور پھول سا چہرہ مرجھا گیا اور نرم و نازک ہونٹ کملا گئے تھے۔

واپس آکر خدمت امام علیہ السلام میں پیاس کی شکایت کی اور عرض کیا:

"یَا عَمَّاهُ هَلْ مِنْ شَرْبَةِ مَاءٍ اُبَرِّدُ بِهَا كَبِدِیْ وَ اَتَقَوّیٰ بِهَا عَلٰی اَعْدَاءِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ".

"چچا جان! کیا آپ تھوڑا سا پانی پلا سکتے ہیں جس سے میں اپنے جگر کو ٹھنڈا کر سکوں اور دشمنانِ خدا و رسولؐ پر غلبہ حاصل کر سکوں؟"

نوجوان بھتیجے کی خواہش سن کر حضرت امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا:

"یَابْنَ الْاَخِیْ اِصْبِرْ قَلِیْلاً حَتّٰی تَلْقٰی جَدَّکَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّم فَیَسْقِیْکَ شَرْبَةً مِنَ الْمَاءِ لَا تَظْمَأُ بَعْدَهَا اَبَداً"

"اے میرے بھائی کے بیٹے! تھوڑی دیر مزید صبر کر لو، عنقریب جدِ امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کرنے والے ہو۔ وہ تمہیں ایسا سیراب کریں گے کہ اس کے بعد کبھی پیاس نہ لگے گی"۔

اس کے بعد دوبارہ میدانِ جنگ میں دوسرا رجز پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوئے اور شمشیرِ شرربار سے پچاس سواروں کو جہنم میں پہنچایا۔ تیسری مرتبہ پھر رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے فوجِ مخالف پر اس شدت سے حملہ کیا کہ مزید ساٹھ سواروں کو تہِ تیغ کیا۔ آخرِ کار زخموں کی کثرت سے نڈھال ہو گئے اور اس طرح آپ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت عبداللہ اکبر ابن حسن علیہم السلام

آپ حضرت قاسمؑ سے بڑے تھے اور حضرت قاسمؑ کے مادری و پدری بھائی تھے۔ آپؑ کی والدہ کا نام رملہ ہے، جو امام حسن علیہ السلام کی کنیز تھیں۔ میدانِ جنگ میں ان کا یہ رجز تھا:

اِنْ تَنْكِرُوْنِیْ فَاَنَا ابْنُ حَیْدَرَه

ضِرْغَامُ آجَامٍ وَلَیْثُ قَسْوَرَه

عَلَی الْاَعَادِیْ مِثْل رِیْحٍ صَرصَرہ
اَکِیلُکُم بِا السَّیْفِ کَیْلِ السَّنْدَرہ

چودہ بے دینوں کو دار العذاب میں پہنچا کر ہانی بن ثبیت حضرمی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ بعض مؤرخین نے ان کی کنیت ابوبکر تحریر کی ہے اور بعض حضرات نے ابوبکر نامی، حضرت امام حسن علیہ السلام کا ایک اور فرزند تحریر کیا ہے، جس کا قاتل عبداللہ عقبہ غنوی ہے۔

شہادتِ حضرت قاسم ابن حسن علیہ السلام

آپ حضرت امام حسن علیہ السلام کی یادگار، ان کے صحن خانہ کی رونق اور اپنی بیوہ والدہ کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی والدہ بھی اپنے تینوں بیٹوں عمرو بن الحسنؑ، عبداللہ الاکبر بن حسنؑ اور قاسم بن حسنؑ کے ہمراہ میدانِ کربلا میں موجود تھیں۔

آپ کا تیرہ سال کا سن تھا، آغازِ شباب تھا، ابھی بلوغت کو نہ پہنچے تھے "لَمْ یَبْلُغِ الْحُلُمَ" کا مصداق بنے۔ باغِ حسن علیہ السلام کے اس نونہال زندگی کی صرف تیرہ بہاریں دیکھی تھیں کہ خزاں کی نذر ہو گیا۔

نصرت امام علیہ السلام اور تائید حق میں اس قدر موت کا اشتیاق تھا کہ شب عاشور خطبہ امام علیہ السلام کے بعد جب حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے جامِ شہادت پینے والوں کا تذکرہ کیا تو اس کم سن شہزادے نے موت کی تمنا کرتے ہوئے عرض کیا:

"چچا جان! کیا میں بھی کل روزِ عاشور شہادت پاؤں گا؟"

امام علیہ السلام نے ازراہِ امتحان دریافت کیا: "بیٹا! موت تمہارے نزدیک کیسی ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا: "چچا جان! موت میرے نزدیک شہد سے زیادہ شیریں ہے"۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: "بیٹا! تو بھی شہادت پائے گا"۔

یہ خاندانِ بنی ہاشم کا طرۂ امتیاز تھا کہ میدانِ حرب میں اس جذبہ کے ساتھ اترتے کہ جس طرح بچے کھیل کے میدان میں جاتے ہیں۔ چنانچہ پسرانِ جنابِ زینبؑ کی شہادت کے بعد جنابِ قاسمؑ نے میدانِ جنگ، بلکہ موت کی اجازت چاہی۔ مولاؑ نے تامل کیا۔

یاد رہے کہ اس یتیم بھتیجے سے امامِ مظلوم علیہ السلام کو بہت محبت تھی۔ ۵۰ ہجری میں حضرت امام حسن علیہ السلام زہر ظلم

سے شہید ہوئے تو شہزادہ قاسمؑ کی عمر دو سال تھی۔ شفقتِ پدری سے محرومی کا احساس چچا حسینؑ نے نہ ہونے دیا۔ مولائے مظلوم علیہ السلام اس یتیم شہزادے کو اپنی آغوشِ شفقت میں رکھتے اور انس و پیار سے یتیم شہزادے کا دل بہلاتے۔ اس طرح یہ یتیم شہزادہ اپنے کریم و شفیق چچا سے مانوس ہو گیا۔

روزِ عاشور جب یہ شہزادہ جہاد کی تیاری کر کے چچا سے اجازت کا طلبگار ہوا تو امام علیہ السلام کو اپنے مسموم بھائی حضرت امام حسن علیہ السلام کا زمانہ یاد آیا۔ اپنے بھائی کی یادگار اور برادرِ بزرگ کے چشم و چراغ کو وادیٔ موت کی طرف جاتے دیکھ کر اس کی پیاری صورت، آغازِ شباب کا حسن اور صحنِ مجتبیٰ کی بربادی کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اذن طلبی کے الفاظ نے دل پر ایسی چوٹ لگائی کہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے باہیں کھول کر شہزادے کے گلے میں ڈال دیں۔ دیر تک چچا بھتیجا گلے میں باہیں ڈالے روتے رہے اور اس قدر روئے کہ غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

بعد از افاقہ حضرت قاسمؑ نے پھر اذنِ جہاد چاہا مگر امام علیہ السلام نے برادرِ بزرگ کی نشانی کو موت کے بازار میں بھیجنے سے پس و پیش کیا، لیکن جذبۂ جہاد سے سرشار شہزادہ میدانِ جہاد میں جانے کے لیے بے قرار تھا۔ چنانچہ جنابِ قاسمؑ نے چچا بزرگوار کے دست و پا کو چوم چوم کر اذنِ جہاد کا تکرار کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا:

"يَا وَلَدِيْ! اَتَمْشِيْ بِرِجْلِكَ اِلَى الْمَوْتِ".

"بیٹے! خود اپنے پیروں سے موت کی طرف بڑھتے ہو؟"

یہ سن کر شہزادے نے جواب دیا:

"كَيْفَ لَا عَمِّ! وَ اَنْتَ بَيْنَ الْاَعْدَاءِ صِرْتَ وَحِيْداً فَرِيْداً لَمْ تَجِدْ مُحَامِياً وَلَا صَدِيْقاً رُوْحِيْ لِرُوْحِكَ الْفِدَاءُ وَ نَفْسِيْ لِنَفْسِكَ الْوِقَاءُ".

"چچا جان! اب میں کس طرح بیٹھا رہوں اور کیوں میدان میں نہ جاؤں جبکہ آپ نرغہ اعداء میں یکہ و تنہا گھر گئے ہیں؟ چچا جان! اب آپ کا کوئی حامی و مددگار نہیں رہا، آپ کے جملہ رفیق باری باری عہدِ وفا کر کے ذمہ داری نبھا کر رخصت ہو گئے ہیں۔ میری جان آپ پر قربان ہو جائے اور میرا بدن آپ پر نثار ہو جائے"۔

دراصل ہاشمی شجاعت کے ولولے اس تیرہ سالہ نوجوان کے پہلو میں کروٹیں لے رہے تھے، جہاد کا جذبہ مچل رہا تھا اور شہادت کی اُمنگیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اس جسور و غیور کے بدن میں غیرت کا خون کھول رہا تھا۔ شبیرؑ کی تنہائی، اہلِ حرم کی بیکسی، دشمنانِ دین کے طعنے اور بچوں کی پیاس اس غیرتمند نوجوان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس لیے بار بار امام علیہ السلام کے

ہاتھوں اور قدموں کو چوم چوم کر الحاح وزاری کے لیے اذنِ جہاد طلب کرتا تھا۔

مولائے مظلوم علیہ السلام نے اذنِ عطا فرمایا اور شہزادے کو اس طرح تیار کر کے میدان کی طرف روانہ کیا:

"ثُمَّ اِنَّ الْحُسَیْنَ اَزْیَاقَ الْقَاسِمِ وَ قَطَعَ عَمَامَتَهٗ وَ اَرْسَلَهٗ اِلَى الْمَعْرِكَةِ".

"پھر امامِ مظلوم علیہ السلام نے قاسم کو گریبان خود چاک کیا اور ان کے عمامہ کے دو حصے کر کے چہرے پہ لٹکا دیے اور مثلِ کفن ان کو لباس پہنایا، ان کی کمر میں تلوار لٹکائی اور میدانِ جنگ کی طرف روانہ کر دیا"۔

حضرت قاسمؑ یہ رجز پڑھتے ہوئے وارِدِ میدان ہوئے:

اِنْ تُنْكِرُوْنِيْ فَاَنَا ابْنُ الْحَسَنْ
سِبْطُ النَّبِيِّ الْمُصْطَفَى الْمُؤْتَمَنْ
هٰذَا حُسَيْنٌ كَالْاَسِيْرِ الْمُرْتَهَنْ
بَيْنَ اُنَاسٍ لَا سُقُوْا صَوْبَ الْمُزُنْ

"اگر تم مجھے نہیں پہچانتے تو آگاہ رہو! میں حسنؑ مجتبیٰ کا فرزند ہوں، جو نبیؐ کے نواسے ہیں۔ یہ حسینؑ ہیں جو لوگوں کے درمیان ایک اسیر کی طرح پابند ہیں۔ خدا تمہیں رحمت کے بادل سے کبھی سیراب نہ کرے"۔

حضرت قاسمؑ میدانِ جنگ میں آئے۔ حمید بن مسلم کا بیان ہے:

"میں عمر سعد کے لشکر میں موجود تھا کہ خیامِ حسینی کے افق سے ایک نوخیز نوجوان مثلِ چاند طلوع ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ تھی۔ قمیض پہنے اور چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ پاؤں میں جوتے تھے۔ ایک جوتے کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نہیں بھول سکتا کہ وہ بایاں جوتا تھا"۔

حیدری شجاعت کے وارث نے بڑھ چڑھ کر حملے کیے۔ شدتِ پیاس اور کمسنی کے باوجود پینتیس اور ایک روایت کے مطابق ستر بے دینوں کو قتل کیا۔ حمید بن مسلم کہتا ہے:

"شہزادہ مصروفِ جنگ تھا، عمر بن سعد نفیل ازدی فوجِ اشقیاء کا بہادر سپاہی میرے پاس کھڑا تھا، کہنے لگا کہ میں اس طفلِ شجاع پر ضرور حملہ کروں گا۔

میں نے کہا: تجھے اس پر حملہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ یہ فوجِ کثیر کیا کم ہے؟ اس شقی نے کہا: نہیں! میں ضرور ہی

حملہ کروں گا۔

اس دوران شہزادہ جنگ کرتے کرتے اس ملعون کے قریب پہنچا تو اس نے آگے بڑھ کر شہزادے کے سر مبارک پر اس زور سے تلوار چلائی کہ سر پھٹ گیا"۔

حسن مجتبیٰ کا چاند گہن میں آ گیا اور مسموم امام کا نور نظر بے بس ہو کر گھوڑے کی زین سے زمین پر گر پڑا۔ اس وقت اپنے مظلوم چچا کو آواز دی:

"یَا عَمَّاهُ اَدْرِكْنِیْ"۔ "چچا جان! مدد کو پہنچئے"۔

امام علیہ السلام پیارے بھتیجے کی صدائے استغاثہ سن کر نہایت بے تابی سے دوڑے اور اس طرح جھپٹ کر شہزادے کے پاس پہنچے کہ جس طرح باز شکار پر جھپٹتا ہے اور اس گروہ پر حملہ آور ہوئے جو قاسمؑ کی لاش کو گھیرے میں لئے ہوئے تھا۔ عمر ازدی حضرت قاسمؑ کا قاتل ابھی وہیں کھڑا تھا کہ امام علیہ السلام نے غضبناک شیر کی طرح حملہ کیا، اس نے اپنے ہاتھ سے امامؑ کے حملے کو روکنا چاہا، مگر اس کا ہاتھ کٹ گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس ملعون نے اپنی فوج کو مدد کیلئے پکارا، ابن سعد کے کئی ایک سوار اس کو بچانے کیلئے دوڑے۔

بعض روایتیں بیان کرتی ہیں کہ وہ قاتل ملعون گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل کر واصل جہنم ہوا اور اس کی لاش پامال ہو گئی۔ مگر علامہ مجلسیؒ "جلاء العیون" اور "بحار الانوار" میں نیز مہیج الاحزان، ناسخ التواریخ، ریاض الشہادۃ، مخزن البکاء کے مؤلفین نے شہزادہ قاسمؑ کی لاش کی پامالی لکھی ہے۔ چنانچہ علامہ مجلسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"آں طفل معصوم درزیر سم اسپاں کوفتہ شد"۔

"یہ معصوم بچہ گھوڑوں کی سموں کے نیچے پامال ہو گیا"۔

جب گرد و غبار جنگ چھٹا تو لوگوں نے دیکھا کہ مظلوم چچا اپنے بھتیجے کی لاش کے سرہانے کھڑا ہے اور قاسم زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ حضرت امام علیہ السلام پر گریہ و بکاء کی حالت طاری ہے، زار و قطار رو کر فرماتے ہیں:

"بیٹا قاسمؑ! خدا اس قوم کو ہلاک کرے جس نے تیری چاند سی صورت کو خاک میں ملا دیا۔ بخدا تیرے چچا پر کس قدر گراں ہے کہ تو چچا کو مدد کیلئے پکارے اور وہ مدد نہ کر سکے۔ آج تیرے چچا کے دشمن زیادہ ہیں اور مددگار کم"۔

گودی کا پلا پاؤں رگڑتا تھا زمیں پر
رو کر پسر فاطمہؑ نے پیٹ لیا سر

گو پامالی لاش کے متعلق اختلاف ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ جب فوج ابن زیاد کے گھڑ سوار عمرازدی، قاتل قاسمؑ کی مدد کرنے کے لیے آئے تو گھوڑوں کا گھمسان ہوا، تو جنابِ قاسمؑ بھی گھوڑوں کے ضرر سے نہیں بچ سکے۔ اگر حضرتِ قاسمؑ اس وقت گھوڑے کی زین پر ہوتے تو بے شک پامالی سے محفوظ رہتے، مگر شہزادہ تو اس وقت زین چھوڑ چکا تھا اور فرشِ زمیں پر بیہوشی کے عالم میں تھا۔

اگر قاسمؑ گھوڑوں کی ٹاپوں تلے کچلا گیا تو اسی جگہ حسنِ مجتبیٰؑ کا لعل بھی زخمی پڑا تھا اور گھوڑے بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ اگر بالکل پامال نہیں ہوئی تو اعضاء کے جوڑ اور بدن کے بند سلامت نہیں رہے۔ چنانچہ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ جب امامِ مظلوم علیہ السلام نے بھتیجے کی لاش اٹھائی تو بدن اس قدر دراز ہو گیا کہ جنابِ قاسمؑ کا سینہ امام حسینؑ کے سینے سے ملا ہوا تھا اور پیر زمین پر خط کھینچ رہے تھے۔ لاش کے دراز ہونے کا مطلب کیا ہے؟

حمید بن مسلم بیان کرتا ہے:

"كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلَى رِجْلَيِ الْغُلَامِ تَخُطَّانِ عَلَى الْأَرْضِ".

"گویا میں نے دیکھا کہ کمسن شہزادے کے پیر زمین پر خط کھینچ رہے تھے"۔

یعنی زمین سے بلند نہ تھے اور گھسٹتے جا رہے تھے۔ کس دل سے حسینؑ نے قاسمؑ کی لاش اٹھائی؟ جنابِ قاسمؑ، اکبرؑ کی طرح پیارے تھے اور گود کے پالے تھے۔ لاش کا وزن تو زیادہ نہ تھا، البتہ گھمسان کی وجہ سے بدن دراز ہو گیا تھا۔

خیمہ مقدس میں جنابِ علی اکبرؑ کی لاش کے ساتھ قاسمؑ کی لاش رکھ دی اور ستم رسیدہ بیبیوں نے بال کھول کر یادگارِ حسنؑ پر ماتم کیا۔

وہ جانباز بھتیجا جو کچھ دیر پہلے چچا کے دست و پا چوم چوم کر موت کی اجازت طلب کر رہا تھا، اب حسنِ مجتبیٰؑ کا گھر برباد کر کے، بیوہ ماں کا نورِ نظر سلب کر کے جنت کو سدھارا۔ اس جوانِ نوخیز کی لاش بنی ہاشم کے شہداء کی لاشوں میں رکھ کر مولائے مظلوم نے قومِ اشقیاء پر بددعا کی اور اہلبیت علیہم السلام کو صبر کی تلقین فرمائی۔ ایک شاعر مولائے حسین علیہ السلام کی زبانی لاشِ قاسمؑ پہ عربی میں مرثیہ کہتا ہے، جس کو مع ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

غَرِيْبُوْنَ عَنْ أَوْطَانِهِمْ وَ دِيَارِهِمْ
تَنُوْحُ عَلَيْهِمْ فِي الْبَرَارِيْ وُحُوْشُهَا

"غریب الوطن گھروں سے دُور صحرا میں شہیدوں کی لاشیں ہیں جن پر جنگل کے وحشی جانور نوحہ و گریہ کر رہے ہیں"۔

کَیْفَ وَلَا تَبْکِی الْعُیُوْنُ لِمَعْشَرٍ
سُیُوْنَ الْاَعَادِیْ فِی الْبَرَارِیْ تَنُوْشُھَا

"ایسے گروہ پر آنکھیں کیوں نہ اشک بہائیں کہ دشمنوں کی تلواریں جن کو جنگل میں قتل کرنے کیلئے طلب کرتی تھیں"۔

بُدُوْرٌ تَوَارِیْ نُوْرُھَا تَتَغَیَّرَتْ
مَحَاسِنُھَا تَرِبَ الْفَلَاۃُ نُعُوْشُھَا

"وہ ایسے ماہِ کامل تھے، جن کا نور چھپ گیا، یہ چاند گہن میں آ گئے اور ان کا حسن و نور بدل گیا اور جنگل نے ان کے لاشوں کو گرد آلود کر دیا"۔

جنابِ قاسمؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ شجرۂ نبوت کی شاداب شاخ تھے جو کربلا میں کٹ گئی اور ثمراتِ امامت کا ایک پھل تھے، جو خاک میں دفن ہو گیا۔ عرب کی لڑائیوں میں ایسے بڑے نوک دار تیر استعمال کیے جاتے تھے کہ ایک بھی جوان آدمی کی موت کا سبب بن سکتا تھا۔ دمعۃ الساکبہ میں ہے کہ حسن علیہ السلام کے لعل کو ایسے پینتیس تیر لگے تھے۔

حضرت عبداللہؑ الاصغر بن حسنؑ کی شہادت

گو کمسن شہزادے کی شہادت تمام شہدائے بنی ہاشم کے بعد ہوئی ہے، مگر اولادِ امام حسن علیہ السلام میں اس معصوم بچے کی شہادت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

یہ معصوم بچہ اس وقت موت کی آغوش میں پہنچا جب فرزندِ رسولؐ تمام رفقاء، انصار اور اقرباء کو راہِ خدا میں قربان کر چکے تھے اور خود خیام سے آ کر آخری بار وداع کر کے موت کے انتظار میں زندگی کے آخری لمحوں میں رحلِ زین کو چھوڑ کر فرشِ زمین پر آ چکے تھے اور ہر طرح زرغۂ اعداء میں گھر چکے تھے اور تیروں کی بارش اور پتھروں کا مینہ جاری تھا۔

یہ شہزادہ درِ خیمہ پر سراسیمہ یہ دردناک منظر دیکھ رہا تھا۔ گو کمسن بچہ تھا، مگر ہاشمی غیرت نے جوش مارا، چچا مظلوم کی بے کسی اور تنہائی عبداللہ سے دیکھی نہ گئی اور بیتابانہ خیمہ سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ جناب زینب سلام اللہ علیہا نے پس پردہ دامن پکڑنے کی کوشش کی۔ چونکہ امام علیہ السلام کی نگاہ خیام کی جانب تھی، اس لیے امام علیہ السلام نے بھی یہ منظر دیکھ لیا اور پکار کر کہا:

"اُخْتِیْ! اِحْبِسِیْہِ". "بہن! اسے روک لو"۔

بنتِ علیؑ شہزادے کا دامن پکڑتی رہ گئی، مگر غیور و جسور شہزادہ دامن چھڑا کر خیمے سے باہر نکل گیا اور کہتا گیا:

"وَ اللّٰهِ لَا اُفَارِقُ عَمِّیْ". "خدا کی قسم! چچا سے جدا نہ رہوں گا۔"

دوڑ کر امامِ مظلوم اور مجروح چچا کے پہلو میں پہنچ گیا۔

ایسی غمناک حالت میں کوئی عزیز قریب آئے تو دل بھر آتا ہے اور بے اختیار آنسو ابل پڑتے ہیں۔ چچا نے بھتیجے کو گلے لگایا ہوگا۔ حسینؑ بھی روئے اور معصوم شہزادہ بھی رویا۔ اسی اثناء میں ابجر بن کعب قتل کے قصد سے تلوار لے کر آگے بڑھا۔ معصوم شہزادے نے چلا کر کہا:

"وَیْلَکَ یَابْنَ الْخَبِیْثَةِ اَتَقْتُلُ عَمِّیْ".

"افسوس ہے تجھ زنِ خبیثہ کے بیٹے پر! تو میرے چچا کو قتل کرنا چاہتا ہے؟"

یہ سن کر اس خبیث کے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ اس زنِ خبیثہ کے ناہنجار فرزند نے تلوار کا بھرپور وار کیا، شہزادے نے اپنے بازو آگے بڑھائے اور اس کا ایک بازو کٹ کے لٹک گیا۔ دستور ہے کہ جب کسی بچے پر کوئی ظلم ہوتا ہے تو وہ ماں باپ کو پکارتا ہے۔ مجروح شہزادے نے مظلوم چچا سے فریاد کی اور بے ساختہ زبان سے نکلا: "یَا عَمَّاهُ"۔

اس وقت زخمی چچا نے بھتیجے کو گلے سے لگا لیا اور دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا:

"یَا ابْنَ اَخِیْ اِصْبِرْ عَلٰی مَا نَزَلَ بِکَ وَاحْتَسِبْ فِیْ ذَالِکَ الْخَیْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ یُلْحِقُکَ بِاٰبَائِکَ الصَّالِحِیْنَ".

"بھتیجے! اس نازل شدہ بلا پر صبر کرو اور خیر و ثواب کی امید رکھو کہ عنقریب خدا تجھے تیرے صالحین آباء و اجداد کے پاس پہنچا دے گا"۔

اسی حال میں شہزادہ مہربان چچا کی گود میں آرام کر رہا تھا کہ حرملہ بن کاہل اسدی ملعون نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ شہزادہ تڑپ کر آغوشِ امامؑ میں دم توڑ گیا۔ شہزادہ تیر کھا کر اپنے مسموم بابا امام حسن علیہ السلام کے پاس پہنچ گیا اور یوں امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بھرے گھر کا خاتمہ ہو گیا۔ امامِ مظلوم علیہ السلام نے آسمان کی طرف رُخ کر کے کہا:

"خدایا! ان لوگوں نے تو ہمیں اس لئے بلایا تھا کہ ہماری مدد کریں گے، مگر انہوں نے ہمارا سارا کنبہ شہید کر ڈالا ہے"

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے گھر کے یہ چار چاند خون کے دریا میں ڈوب گئے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

"اِيَّاکَ نَسۡتَعِيۡنُ".

"ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں"۔

تخصیص اعانت، غیر اللہ کی تشریح، یا علیؑ مدد و یا علیؑ اور کئی کہنا جائز ہے بلکہ علامتِ حب و ایمان ہے، توسّل کے بارے میں وہابیوں کا شیعوں پر اعتراض، اس کا جواب، مدد کی قسمیں، مزاراتِ مقدسات اور عتباتِ عالیات سے کرامات کا ظہور، حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کو باب الحوائج کا لقب عطا ہوا، شجاعت و شہادتِ حضرت عباس علمدار علیہ السلام۔

اس آیتِ مبارکہ کے پہلے حصے کی طرح اس میں بھی مفعول، فاعل اور فعل پر مقدم ہے جو 'حصر' کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی جس طرح عبادت منحصر ہے، ذاتِ باری تعالیٰ میں، اسی طرح استعانت "مدد مانگنا" بھی منحصر ہے اسی کی پاک ذات میں۔ جس طرح غیر اللہ عبادت کے لائق نہیں، اسی طرح غیر اللہ سے استعانت جائز نہیں۔ جس طرح "اِيَّاکَ نَعۡبُدُ" کا مفہوم ہے، "لَا نَعۡبُدُ اِلَّا اللّٰہ" اسی طرح "اِيَّاکَ نَسۡتَعِيۡنُ" کا مفہوم ہے، "لَا نَسۡتَعِيۡنُ اِلَّا اللّٰہ" "خدا کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتے"۔

یہ آیت بہت کچھ تشریح چاہتی ہے اس لئے ہم اس کی خاطر خواہ وضاحت کرتے ہیں۔ "اِسۡتِعَانَت" بابِ استفعال کا مصدر ہے اور اس کی خاصیتوں میں سے ایک خاصیت طلب بھی ہے، جس طرح "اِسۡتِغۡفَار"، "مغفرت چاہنا"، "اِسۡتِبۡدَال" "اِسۡتِقۡرَار"، "بدل اور قرار چاہنا"، "اِسۡتِعَانَت" میں یہی کیفیت موجود ہے، "مدد چاہنا"۔

غیر اللہ کی تشریح

"غَيۡرَ اللّٰه" اللہ کا غیر، اللہ کے سوا۔ ہم "استعانت" سے قبل "غیر اللہ" کی تشریح کرتے ہیں:

"غیر اللہ" وہ افراد یا اشیاء ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص اور خصوصی تعلق نہ ہو۔ یوں تو جو مخلوق کا عام تعلق خالق کے ساتھ ہے اور اس طرح عام مخلوق عمومی طور تعلق کی بناء پر "غیر اللہ" میں شامل ہے، لیکن جن کو خصوصی تعلق اور خاص نسبت خدا کے ساتھ ہے، وہ نمائندہ و کارندۂ خدا اور اس کے نائب خصوصی ہونے کی وجہ سے غیر اللہ میں شامل نہیں ہے، مثال کے طور پر انبیاء و مرسلین، ملائکہ مقربین، آئمہ معصومین صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہم اجمعین۔

ان کا قول، قولِ خدا، ان کا حکم، حکمِ خدا، حتیٰ کہ ان کی مشیت، مشیتِ خدا ہے۔ ہم ان کے احکام و فرمودات کو اس لیے

تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مقدس حضرات خدا کے نمائندے ہیں اور منجانب اللہ آئے ہیں اور اسی کے احکام لائے ہیں۔ خداوندِ عالم نے اُمورِ تکلیفیہ یعنی احکامِ شریعت انہی کے واسطے سے ہم تک پہنچائے ہیں۔ اسی لیے ہم ان کے لائے احکام کو احکامِ خدا سمجھتے ہیں۔ اگر انہیں غیر اللہ تصور کریں تو ہم ان کے احکام قبول نہیں کر سکتے اور ان کی اطاعت میں عینِ اطاعت ہے۔

"وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ".

"جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی"۔

خدا کی ہدایات و احکام اور اس کے فرامین و پیام اس کے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعے ہی ہم تک پہنچتے ہیں اور ہماری اطاعت و قربت ان ہی کے ذریعے سے اللہ تک پہنچتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ غیر اللہ نہیں اور غیر اللہ نہ ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ عین خدا یا جزوِ خدا ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کے نمائندے، نائبین اور اس کے برگزیدہ مقربین ہیں اور اس کے سفیر و پیامبر ہیں۔ ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہیں۔ جس طرح یہ امورِ تکلیفیہ کے امین ہیں، اسی طرح ملائکہ اس کے امورِ تکوینیہ کے امانتدار ہیں اور خدا اپنے بندوں کو امورِ تکوینیہ میں مدد ان ملائکہ کے ذریعہ کرتا ہے۔ جس طرح جنگِ بدر و حنین میں مسلمانوں کی مدد "ملائکہ مسومین" کے ذریعے کی، تو ملائکہ چونکہ نمائندۂ خدا، اسی کے موکل اور اسی کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں، اس واسطے ان کی مدد، مددِ خدا ہے بلکہ خدا کی مدد انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔

اسی طرح ان کے سپرد جو امورِ تکوینیہ یعنی معاش سے تعلق رکھنے والے امور، مثلاً ہوائیں چلانا، مینہ برسانا، رزق پہنچانا، بدنوں میں روح داخل کرنا اور بدنوں سے روح قبض کرنا، یہ امور ملائکہ انجام دیتے ہیں، روح ملائکہ قبض کرتے ہیں، مگر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مارتا ہے:

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا".

"اللہ نفسوں کو ان کی موت کے وقت مارتا ہے"۔

دوسری جگہ ارشادِ گرامی ہے:

"تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ".

"انہیں فرشتے مارتے ہیں"۔

تو ثابت ہوا کہ ملائکہ کا ہر کام خدا کا کام ہے۔

نظامِ کائنات، جسمانی و روحانی تربیت

اس کائنات و عالمِ ممکنات میں ''مرکزی حیثیت'' انسان کو حاصل ہے۔ اسی لیے اسے اشرف المخلوقات کا لقب زیبا ہے۔ اس انسان کے دو حصے ہیں۔ بدن اور روح۔ ان کا تعلق استوار رہے تو زندہ ہے، ورنہ مردہ۔ بدن تربیت کا محتاج ہے اور روح بھی۔ بدن کی غذا اور ہے اور روح کی اور۔ دونوں کی تربیت کا انتظام خالقِ حلیم و علیم نے کر دیا ہے۔

کچھ ایسے اسباب ہیں جو اسی مادّی کائنات کی تربیت، ترقی اور بقاء کے موجب ہیں۔ مثلاً پانی، ہوا، سورج کی ضیاء، چاند کی روشنی، رزق کی فراہمی اور غلّہ وغیرہ کا اگانا۔ ان اسبابِ حیات میں سے کچھ تو انسان کے اختیار میں ہے اور کچھ انسانی بس سے باہر ہیں۔ جو بشر کے بس سے بلند ہیں، وہ امور ملائکہ کے سپرد ہیں، مثلاً ہواؤں کا چلانا، بادلوں کا ہانکنا، مینہ کا برسانا، کھیتی کا اُگانا، رزق کی رسائی، دریاؤں کی روانی، سورج کی تابانی، بطنِ مادر میں جنین کے بدن میں روح کا داخل کرنا اور زندہ بدنوں سے روحوں کا قبض کرنا وغیرہ۔ ان امور کی انجام دہی ملائکہ کے سپرد ہے۔ انہیں ''اُمورِ تکوینیہ'' کہتے ہیں اور ان کا تعلق انسانی اجسام اور مادّی کائنات کے ساتھ ہے۔ یہ معاش سے متعلق ہیں۔ گویا فرشتے انسان اور دوسری مخلوقات کے ابدان و اجسام کی غذا کا سامان کرتے ہیں۔

اسی طرح کچھ ایسے اسباب ہیں جو انسانی ارواح کی تربیت و ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ مثلاً ذکرِ خدا، زبان اور عمل سے اس کی نشانیوں میں غور و فکر، تلاوتِ قرآن، آفاق کا مطالعہ، نماز، روزہ، حج، درود شریف وغیرہ۔ یہ روحانی غذائیں ہیں، جن سے روحانی تربیت و ترقی ہوتی ہے۔

خدائے تعالیٰ کے احکام کی اطاعت و تعمیل اور جن چیزوں سے اس نے روکا ہے، ان سے پرہیز، یہ سب معاد سے متعلق ہیں۔ انہیں امورِ تکلیف اور تشریع کہا جاتا ہے اور ان کے ذمہ دار انبیاء و مرسلین اور آئمہ طاہرین علیہم السلام ہیں۔

گو کہ ان دونوں اُمورِ معاش اور امورِ معاد کا مالکِ کلی خالقِ علیم و حکیم ہی ہے مگر اس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے اس کی تقسیم کر دی ہے۔ امورِ معاش کا تعلق جسمِ کائنات سے ہے اور اُمورِ معاد کا تعلق روحِ کائنات سے ہے۔

گویا ملائکہ جسم کی تربیت کے اسباب مہیا کرتے ہیں اور انبیاء و مرسلین و آئمہ روح کی بالیدگی اور پرورش کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ فرشتے مربیِ جسم و بدن ہیں اور انبیاء اور آئمہ علیہم السلام روح کی تربیت کرتے ہیں۔ جسم ادنیٰ ہے اور روح اعلیٰ ہے۔ ملائکہ چونکہ فضیلت میں انبیاء سے ادنیٰ ہیں، اس واسطے یہ ادنیٰ چیز کی پرورش کے موکل ہیں اور انبیاء و آئمہ علیہم السلام

فضیلت میں چونکہ ملائکہ سے افضل ہیں، اس واسطے یہ اعلیٰ چیز کی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی ملائکہ تربیت کرتے ہیں اس کی زندگی مختصر ہے، وہ فانی ہے اور جس کی انبیاء ومرسلین وآئمہ علیہم السلام تربیت کرتے ہیں، اس کی زندگی طویل ہے اور وہ باقی ہے۔

ربِّ مطلق اور خالق مدبر نے تربیتِ کائنات کا نظام اس طرح تقسیم فرما کر مختلف عوامل اور اسباب کے تحت اپنے نمائندوں اور کارندوں کے سپرد فرمایا۔ یہ تمام مربی ہیں لیکن مجازی ہیں اور ان تمام کا خالق و مالک حقیقی پروردگار، وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، جو ربّ العالمین ہے۔

یاعلیٌ مدد اور یا علیٌ ادرکنی کہنے کا جواز

جس طرح انبیاء ومرسلین، آئمہ طاہرین، اور ملائکہ مقربین علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا ہر قول قولِ خدا اور ہر کار، کارِ خدا ہے، ان کا ذکر، ان کے واقعات وکارنامے، ان کی تبلیغی سرگرمیوں اور قربانیوں کے تذکرے عبادتِ خدا ہیں، اسی طرح ان کی پکار، ان سے استمداد، ان سے رجوع بحیثیت نمائندگانِ خدا، برگزیدگانِ ربِ دوسرا، غیر اللہ کی پکار نہیں ہے اور نہ ہی غیر اللہ سے مدد طلبی ہے اور اس لحاظ سے "غیر اللہ" بھی نہیں ہیں بلکہ ان کو مشکل کے وقت پکارنا اور ان کی طرف رجوع کرنا خدا کی طرف رجوع کرنا اور خدا کو پکارنا ہے۔

ہاں! اللہ کو پکارنا اور اس کی طرف رجوع بطور اصل ہے اور ان کو پکارنا اور کی طرف رجوع بطور توسّل ہے۔ کیونکہ ہماری پکاریں مشکلات کے وقت، ہماری فریادیں مظلومی کے وقت اور ہمارے استغاثے بے بسی کے وقت ان کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں اور یہ ابواب الحوائج ہماری حاجات قاضی الحاجات، خلاقِ عالم، مالکِ کائنات اور ربّ العالمین کی بارگاہ میں اپنی سفارشات کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور وہاں سے منظور کرواسکتے ہیں اور منظور کرواتے ہیں۔ ان میں وسیلہ بننے کی صلاحیت ہے، بلکہ چہاردہ معصومین علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی اور وسیلہ ہے ہی نہیں۔ یہ تمام وسائل سے بہترین وسیلہ ہیں۔

لہٰذا "یاعلیؑ مدد" نہ صرف جائز اور صحیح ہے، بلکہ اظہارِ محبت، قلبی میلان اور علامتِ ایمان ہے۔ صرف یہی نہیں کہ "یا علیؑ مدد" جائز ہے، بلکہ ہر معصوم نبی وامام وملائکہ کرام کو پکارنا بھی جائز ہے، جن میں وسیلہ بننے کی صلاحیت ہے۔ جن کا ذاتِ خدا سے خاص تعلق اور واسطہ ہے۔ جن کا اس ذات سے لین دین ہے، وہ وسیلہ بن سکتے ہیں۔

توسّل کے متعلق وھابیوں کا شیعوں پر اعتراض اور اس کا جواب

کتبِ معتبرہ میں روایات سے ثابت ہے کہ کئی حاجتمندوں، دردمندوں، ستم رسیدہ لوگوں، مظلوم مومنوں (جن میں

عوام الناس، علماءِ صلحاء، اتقیاء اور مجتہدین کرام بھی شامل ہیں) نے دُکھ، درد اور رنج والم اور سخت مصیبتوں اور آفت کے وقت ان کی طرف رجوع کیا، ان کی مشکلات آسان ہوئیں، عقدے حل ہوئے اور حاجات روا ہوئیں۔

"اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ".

میں تخصیص عبادت، ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ یہ عبادت بلاواسطہ بھی ہے اور بالواسطہ بھی، لیکن ہر دو عبادتیں اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح استعانت بھی اسی ذاتِ پاک ذوالجلال والاکرام کے ساتھ مختص ہے۔ بلاواسطہ مدد مانگنا بھی استعانت ہے اور بالواسطہ بھی استعانت ہے۔ اس استعانت کا اختصاص تب ختم ہوتا، جب ہم چہاردہ معصومین علیہم السلام کو خدا اور ربِّ مطلق مان کر ان کو مدد کے لیے پکارتے یا ان کو بالاصل اور علی الاستقلال، قاضی الحاجات اور کائنات کے مختارِ مطلق مان کر حاجت روا سمجھتے۔ کوئی شیعہ مذکورہ صورت میں ان کو نہیں پکارتا، بلکہ واسطہ، وسیلہ اور ذریعہ نجاح ونجات سمجھ کر ان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ان معصومین علیہم السلام کی پاک ذات کا دربار خداوندی میں ہماری سفارش کرنا، ہماری ہمدردی کرنا اور اس قاضی الحاجات سے ہماری دعائیں قبول کروانا، حاجت روا کرنا اور روزِ محشر ہماری نجات ومغفرت کے لیے شفاعت کرنا، یہ بہت بڑی مدد اور مہربانی ہے۔ اس لحاظ سے "یاعلیؑ مدد" کہنا کس طرح ناجائز اور نادرست ہے؟

قرآن مجید میں جہاں خدا کے ساتھ یا خدا کو چھوڑ کر غیروں کو پکارنے کی ممانعت ہے، وہاں غیر اللہ سے مراد، معبودانِ کفار وقریش ہیں اور وہ بت ہیں۔ کیونکہ مشرکین عرب ان بتوں کو وسیلہ، قربتِ خدا کا ذریعہ اور سفارش کنندہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُ نَا عِنْدَ اللّٰهِ".

"اور مشرکینِ قریش، خدا کو چھوڑ کر ان (بتوں) کی عبادت کرتے جو انہیں نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتے اور کہتے ہیں کہ (یہ معبودانِ باطل) خدا کے نزدیک ہماری سفارش کرنے والے ہیں"۔ (یونس/۱۹)

"وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِیَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی". (زمر/۳)

"وہ لوگ جنہوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا سرپرست بنایا، کہتے ہیں کہ ہم تو ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں

کہ یہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیتے ہیں"۔

کفار اپنے معبود (بتوں وغیرہ) کو قربت خدا کا ذریعہ اور وسیلہ شفا سمجھتے تھے، جس کی پُر زور تردید کی گئی ہے کہ یہ نہ شفیع ہیں اور نہ ہی مقرب خدا، بلکہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

"فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَداً"۔

"خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو"۔ (سورۂ جن)

ان آیات مبارکہ اور اس مفہوم ومطلب کی دوسری آیات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بتوں میں شفاعت کرنے کی اہلیت اور وسیلہ بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس واسطے ان کو پکارنا منع ہے۔ لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ باذن اللہ شفاعت کرنے کی صلاحیت اور وسیلہ بننے کی اہلیت جن کے مقدس نفوس میں پائی جائے، ان کو بطور توسّل پکارنا منع اور حرام ہے؟

ہاں! نااہلوں کو وسیلہ بنانا، شفیع سمجھنا اور امام بنانا ضرور حرام ہے لیکن اہل توسّل حضرات علیہم السلام کو وسیلہ بنانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے:

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"۔

"اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور اس کی جانب وسیلہ تلاش کرو اور خدا کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔ (مائدہ/پ۶)

ایک صورت تو یہ ہے جو مذکور ہوئی ہے کہ براہ راست معصومین علیہم السلام کو توسّل کے قصد سے پکارا جائے کہ آپ ہماری حاجات بارگاہِ خدا میں سفارش کے ساتھ پیش کر کے منوائیں۔ جیسا کہ دعائے توسّل اور دوسری اس قسم کی دعاؤں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ براہ راست خدائے رحیم وکریم کو پکارا جائے اور ان معصومین حضرات علیہم السلام کا واسطہ دیا جائے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام نے مشکلات کے وقت خدا کو ان کے توسط سے پکارا۔

"یَا مَحْمُوْدُ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ، یَا اَعْلٰی بِحَقِّ عَلِیٍّ، یَا فَاطِرُ بِحَقِّ فَاطِمَةَ، یَا مُحْسِنُ بِحَقِّ الْحَسَنِ، یَا قَدِیْمَ الْاِحْسَانِ بِحَقِّ الْحُسَیْنِ"۔

یہ دونوں صورتیں "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے خلاف نہیں ہیں اور وہابیوں اور نجدیوں کا شیعوں پر اعتراض کہ "غیر اللہ" کو پکار کے شیعہ گناہِ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، باطل اور بے اصل قرار پاتا ہے۔

مدد کی اقسام

اِسْتِعَانَتْ: اس کا مادّہ عون ہے۔ مدد۔

نَصَرَ: اس کا معنی بھی مدد ہے مگر عموماً اس کا اطلاق مخالفین کے مقابلہ میں مدد پر ہوتا ہے۔

"اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ". "فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ". "هَلْ مِنْ نَّاصِرٍ یَّنْصُرُنَا".

عَوْن، اِعَانَت: مطلقاً ہر قسم کی مدد کو شامل کیا ہے۔ بالمقابل ہو، یا بجائے خود۔ مالی ہو یا زبانی مدد، مادّی ہو، یا روحانی، اسی سے تعاون ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

"تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ". (پارہ دوئم)

"نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور ناجائز زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو"۔

تعاون لازمۂ حیات اور شرطِ زندگی ہے

انسان کی زندگی اجتماعی تمدن اور امداد باہمی پر منحصر ہے۔ اُمورِ دنیا باہمی تعاون سے انجام پاتے ہیں۔ زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، غرضیکہ انسان کی تمام معیشت اس کے باہمی تعاون اور مل جل کر کام کرنے اور رہنے پر موقوف ہے۔ کوئی کام ایک دوسرے کی مدد کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اگر باہمی تعاون، مدد کرنے کا مانگنے کا سلسلہ رُک جائے تو انسانیت کی گاڑی چلنے سے رُک جائے اور نوعِ انسانی موت کی وادی میں گر پڑے۔

اس قسم کی مدد کرنا، مدد مانگنا لازمۂ حیات اور شرطِ زندگی ہے۔ جو مدد زیرِ بحث رہتی ہے اور جس پر مناظرے اور مباحثے ہوتے رہتے ہیں، وہ غائبانہ مدد ہے۔ جو عام انسان کے بس سے باہر اور بطور خارقِ عادت واز راہِ معجزہ و کرامت ہے۔

آئمہ علیہم السلام کے مزاراتِ مقدسات اور عتباتِ عالیات سے اس قسم کی استمدادی و امدادی کرامات ظاہر ہوتی رہتی ہیں اور حاجتمندان ابواب الحوائج کے ذریعے حاجات روا کرتے رہے ہیں۔ ویسے یہ کرامات تو بہت ہیں، خاص طور پر بیماروں کو

شفا، نابیناؤں کو چشم بینا اور فقیروں کو غنا اور ان کی حاجت کو روائی انہی مقدس آستانوں سے حاصل ہوئی ہے۔ ہم چند ایک نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

جناب فاضل اجل، الحاج شیخ عباس قمی اعلی اللہ مقامہ اپنی متبرک تالیف مفاتیح الجنان میں اعمالِ ستائیسویں شب و رجب کے ضمن میں روضہ اقدس اور ضریح اطہر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی برکات کے افاضے، حاجتمندوں کے استغاثے اور ان کی حاجت روائی، رجب کی ستائیسویں شب کو تحریر کرتے ہیں۔

تحریر فرماتے ہیں کہ یہ رات متبرک ہے۔ اسے لیلۃ المبعث کہا جاتا ہے۔ بعض اسے لیلۃ المعراج کہتے ہیں۔ اس رات کو عراق، خراسان، روم، عرب اور دوسرے ملکوں سے لاعلاج مریض، مایوس از بصارت اور کئی حاجت مند لوگ حرمِ مبارک امیر المومنینؑ کی ضریح مقدس کے سامنے الحاح وزاری کے ساتھ اپنی مناجات پیش کرتے اور دلی مرادیں پا کر لوٹتے ہیں۔

صاحب مفاتیح ابو عبداللہ محمد بن بطوطہ کی روایت بھی نقل کرتے ہیں۔ اصل عبارت فارسی میں ہے، ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ابن بطوطہ جو علماء اہل سنت میں اچھی شہرت رکھتے ہیں، سیاحت اور مختلف ممالک کے سفر میں انہیں خاصی دلچسپی تھی، اپنے سفرنامہ "رحلہ ابن بطوطہ" میں بیان کرتے ہیں کہ میں مکہ معظمہ سے نجف اشرف امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہم السلام کی زیارت کو گیا۔ اس شہر کے تمام باشندے رافضی ہیں اور روضۂ مقدسِ امیر المومنین علیہ السلام سے کئی کرامات ظاہر ہو چکی ہیں اور ہنوز کرامات کا سلسلہ جاری ہے۔

سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ماہِ رجب کی ستائیسویں تاریخ کو ضریح اقدسِ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے پاس اہل عراق، خراسان، بلادِ فارس اور روم سے مشلول، مفلوج، زمین گیر اور لاعلاج مریض جمع ہو جاتے ہیں۔ ذکرِ خدا، تلاوت قرآن اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی صحت وشفاء اور قضاء حاجات کے متعلق دعائیں مانگتے ہیں۔ نصف رات یا اس کے دو حصے گزرنے تک اسی حالت میں گریہ وزاری اور ذکر و دعاء میں مصروف رہتے ہیں اور بعد از نصف شب یا دو ثلث شب وہ مشلول و مفلوج و زمین گیر افرادِ خلاقِ کائنات، ربّ العالمین کی مہربانی اور امیر المومنین حضرت امام علی ابن ابیطالب علیہم السلام کی خاص کرم نوازی سے تندرست وصحت مند حال میں بدل جاتے ہیں۔ اس وقت ایک مجمع کثیر اس انقلابِ حال کو بچشم خود ملاحظہ کرنے کیلئے جمع ہو جاتا ہے۔

زمین پر لیٹا ہوا ہاتھ پاؤں سے معذور مریض، حسنین علیہم السلام کے بابا کی نگاہِ کرم سے دوڑنے لگ جاتا ہے۔

مشلول ومفلوج کے اعضاء والیٔ نجف کی دعا سے صحیح وسالم ہوجاتے ہیں۔ بصارت سے محروم شخص اپنے کاسہ گدائی میں چشم بینا لے کر جاتا ہے اور اس اس چشمہ فیض سے ہر پیاسا سیراب ہوجاتا ہے۔ صحت یاب افراد پر جب رحم وکرم کی بارش ہوتی ہے اور جب یہ اپنے جسموں میں آثار صحت محسوس کرتے ہیں تو ان کی زبان پہ کلمہ جاری ہوجاتا ہے:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَلِيٌّ وَّلِيُّ اللّٰه".

وہ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے مہمان خانہ میں تین افراد کو دیکھا جو چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے، ایک خراسان سے، دوسرا اصفہان سے اور تیسرا روم سے تھا۔ میں نے ان سے پوچھا: "تم اس جگہ تا حال اسی بیماری کی حالت میں پڑے ہو، تمہیں شفا کیوں نہ ہوئی؟"

کہنے لگے: "ہم ماہ رجب کی مقررہ ستائیسویں رات کو نجف اشرف میں نہیں پہنچ سکے اور اس کے بعد پہنچے ہیں۔ اب ستائیسویں تاریخ تک یہیں رہیں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ دامن مراد بھر کر واپس جائیں گے"۔

شیخ عباس قمی طاب ثراہ رقم فرماتے ہیں کہ اس قسم کی کرامات بسیار ظہور میں آتی رہتی ہیں۔

جناب شیخ حر عاملی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ ان برکات کے سلسلہ میں ایک رباعی تحریر فرماتے ہیں:

وَمَـا بَـدا مِنْ بَـرَكَـاتِ مَشْهَـدِهٖ
فِـیْ کُـلِّ یَـوْمٍ اَمْسُـهُ مِثْلُ غَـدِهٖ
وَ كَشِفَـاءِ الْعَمْـىٰ وَ الْمَرْضٰى بِهٖ
اِجَـا بَةُ الـدُّعَـاءِ فِـیْ اَعْتَـابِـهٖ

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے مرقد مطہر اور مزار انوار سے جو برکات وفیوض ظاہر ہوتے ہیں اور وہ متواتر جاری ہے۔ آج اور کل میں فرق نہیں۔ جیسے نابیناؤں کو بصارت اور مایوس العلاج مریضوں کو صحت کے خزانے ملتے ہیں، ان کے مقدس آستان میں دعا شرف قبول حاصل کرتی ہے، اسی طرح حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے مرقد مبارک کے بارے میں منقول ہے:

"اَلشِّفَاءُ فِیْ تُرْبَتِهٖ وَ اِجَابَةُ الدُّعَاءِ تَحْتَ قُبَّتِهٖ".

"ان کی قبر مبارک کی خاک میں شفا ہے اور ان کے قبہ مبارک کے نیچے دعا مقبول ہے"۔

حضرت امامِ ہفتم، اسیر بغداد، شہیدِ غربت، مسموم جور و جفا، حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کو "باب قضا الحوائج" کا لقب حاصل ہے۔ آپ کا روضۂ اطہر کاظمین شریفین میں ہے۔ عجیب و غریب قسم کی کرامات کا مظہر ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شفاء امراض کے لیے ان کا آستانِ مقدس پیچیدہ امراض کی شفا گاہ ہے۔

چنانچہ اخبار "انقلاب" لاہور، "اہل حدیث" امرتسر، مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۲۸ء اور اخبار پائیر، الٰہ آباد ۱۰ راگست ۱۹۲۸ء میں ضریحِ اقدسِ حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام "باب الحوائج" سے ایک کرامت عالیہ کے ظہور کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

ایک غریب و ضعیف سیّد آنکھوں کی بیماری میں مبتلا تھا۔ ہر چند اس نے مادّی طبیبوں اور ہسپتالوں کے ڈاکٹروں کی طرف رجوع کیا۔ اسے شفا نہ ملی۔ بیماری زور پکڑ گئی، آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، بغداد کے ہسپتال میں داخل ہوا، بے انتہا علاج کروایا، مگر مقصد سے محروم رہا۔ ڈاکٹروں نے آخر کار اسے لاعلاج قرار دے دیا۔

وہ مخلص و مفلس مومن علاج کے سلسلہ میں بینائی سے محروم رہنے کے علاوہ روپیہ پیسہ سے بھی محروم ہوگیا۔ قسمت نے یاوری کی، اس نے دل میں خیال کیا کہ اسباب دنیا قطع ہو جاتے ہیں، مگر رحمت کے دروازے بند نہیں ہوتے، مادّی علاج گاہوں سے اگر مایوس ہو گیا ہوں تو روحانی دار الشفاء کی طرف رجوع کروں۔ بغداد کے پہلو کاظمین میں سرکار امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا "باب الحوائج" کا شفاخانہ جو کھلا ہے، جا کر قسمت آزمائی تو کروں۔

چنانچہ وہ ضعیف و مفلس سیّد آخری علاج کیلئے بغداد کے قیدی، سرکار احدیّت کے روحانی اور اپنے عہد کے لاثانی طبیب کی بارگاہِ مقدس میں حاضر ہوا۔ بارگاہِ خدا میں بینائی واپس ملنے کی دعا کی۔ سرکار ولایت، امامت کے ساتویں تاجدار حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے توسّل کیا۔ تعویذِ قبر کو مس کیا۔ بخت بیدار ہو گیا، نصیب جاگ اٹھا، مقدر چمکا، ادھر دعا ختم ہوئی ادھر آنکھوں کے سامنے روشنی نمودار ہوء، نورِ بصارت واپس مل گیا، آنکھیں چندھیا گئیں، آواز آئی: "جاؤ! تمھیں پھر سے آنکھوں کی روشنی دے دی گئی ہے"۔

فرطِ مسرت سے وہ بوڑھا مومن چلاتا ہوا باہر نکل آیا: "مجھے روشنی مل گئی"، "مجھے بصارت مل گئی، میں بینا ہو گیا"۔

چونکہ لوگ جانتے تھے کہ یہ واقعی بینائی سے محروم تھا، اب دفعتاً اس کی بدلی ہوئی حالت، اللہ کے رحم و کرم کی بارش اور امام علیہ السلام کی پاکیزہ نگاہِ کرم کو ملاحظہ کیا تو لوگوں کا ہجوم اس کے گرد جمع ہو گیا۔ لوگ اس کی زیارت کو دوڑے اور اس کے کپڑے تبرک کے طور پر چھین جھپٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے گئے۔

بیان کیا گیا کہ تین بار اس کو کپڑے پہنائے گئے، لیکن لوگوں نے اس کے کپڑے تار تار کر کے بطور تبرک چھین لئے

اور بمشکل تمام، خدامِ روضہ شریف نے اس کو گھر تک پہنچایا۔

اسی طرح حضرت امام ثامن غریب الغرباء حضرت علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام کے روضہ اقدس واقع مشہد مقدس ایران سے بھی کرامات و معجزات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

چنانچہ مفاتیح الجنان میں اعمال شب 17 رجب کے ضمن میں منقول ہے کہ حضرت ابوالحسن، حضرت امام علی رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرقد منورہ سے ۱۳۴۳ ہجری میں مندرجہ ذیل کرامت ظہور پذیر ہوئی:

تین عورتیں مرضِ فالج اور شلِ اعضاء میں مبتلا تھیں۔ اطباء و ڈاکٹر ان کے علاج سے عاجز آ گئے تھے اور انہیں لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ ضریح مقدس حضرت امام علی رضا علیہ السلام لائی گئیں اور شفا پا کر واپس گئیں۔

قارئین! اس قسم کی کرامات اور اپنے شیعوں پر مہربانی کے واقعات ان کی حیاتِ طیبہ میں بھی تھے اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مقدس آستانوں سے بھی اپنے موالیوں کیلئے فیوض و برکات کے چشمے جاری ہیں۔

ہم آخر میں شہید کربلا، مقتول لب فرات، مقطوع الیدین، حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کی کرامت نقل کرتے ہیں۔ آپ کا لقب بھی باب الحوائج ہے۔ بعد ازاں ان کی شجاعت و شہادت کے تفصیلی واقعات پیش کریں گے۔

حضرت ابوالفضل العباسؑ کو سرکار احدیت اور بارگاہِ ذوالجلال والاکرام سے لقب "باب الحوائج" عطا ہوا۔ آپؑ کے روضہ اقدس سے بھی کرامات کا ظہور ہوتا رہتا ہے، جسے دیکھنے والوں نے بچشم خود دیکھا اور اہل قلم حضرات نے کتابوں میں ان کرامات کو درج کیا ہے۔

حالاتِ حضرت عبّاس علیہ السلام

حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کو یہ لقب ان خدماتِ اسلامیہ اور قربانیوں کی وجہ سے عطا ہوا ہے جو انہوں نے دینی جہاد، نصرتِ امام علیہ السلام اور حمایتِ مستوراتِ بنی ہاشم کے سلسلہ میں بارگاہِ ربّ العزت میں پیش کیں۔

آج کی مجلس میں اس باب الحوائج، مومنین کی آرزوؤں کی امیدگاہ، شجاعت ہاشمیہ کلابیہ کے وارث، حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے نورِ نظر، فرزندِ رسولؐ کے زورِ بازو، اُمّ البنین کی آنکھوں کا تارا، زینب و اُمّ کلثوم صلوٰۃ اللہ علیہما کے سفر کا سہارا، مجسمہ وفا و شجاعت، پیکرِ حیاء و غیرت، مجاہدین اسلام کا علمبردار، غازیانِ عشق و وفا کا سپہ سالار، آس و امید کا خزانہ، سقائے سکینہؑ، پیکرِ جلال و جمال، تصویرِ حسن و کمال، مالکِ رعبِ حیدری، وارثِ صولتِ صفدری، محامی فرزندِ رسولؐ، محافظ پردۂ بناتِ بتولؑ اور تشنہ دہن بچوں کی آس حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کے حالات اور واقعاتِ شجاعت و شہادت بیان کرتے ہیں۔

ولادت باسعادت

جنابِ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے بھائی حضرت عقیلؑ سے ایک مرتبہ فرمایا: "تم انساب و حالاتِ قبائلِ عرب سے بخوبی واقف ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ عرب کے اس خاندان میں شادی کروں جو سب قبائل سے زیادہ شجاعت رکھتا ہو تا کہ بہادر لڑکا پیدا ہو"۔

حضرت عقیلؑ نے اس مقصد کے لیے خاندانِ بنی کلاب کا انتخاب کیا اور اس خاندان کی ایک خاتون فاطمہ بنت خالد بن ربیعہ کو منتخب کیا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے اس سے شادی کی۔ اس خاتونِ گرامی قدر کا اسم مبارک فاطمہ تھا اور بعد میں "اُمّ البنین" کی کنیت سے مشہور ہوئیں۔

چنانچہ اس مبارک و اطاعت شعار خاتون کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں ۴ شعبان ۲۶ ہجری کو پیکرِ صفا و وفا سا بیٹا عطا کیا۔ اس مولودِ مسعود کا نام "عباسؑ" رکھا گیا۔

چودہ سال پدرِ مہربان کے سایۂ شفقت و عاطفت میں رہے۔ آپؑ کی زندگی میں بعض جنگوں میں شریک رہے اور آدابِ حرب اور فنونِ قتال اپنے باپ حیدرِ کرار سے فوجِ اسلام کے علمدار فاتح خیبر سے سیکھے۔ ہاشمی شجاعت والد کی جانب سے اور کلابی دلیری و ہمت کے اپنی والدہ کی طرف سے وارث ہوئے۔

شجاعت و دلیری تو پہلے ہی جسدِ اقدس میں ودیعت تھی اور اب اس کے اظہار کے طریقے بھی رہبرِ کامل اور استادِ ماہر سے سیکھ لئے۔ اس واسطے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے بعد یہ شجاعِ زمانہ اور بہادرِ روزگار تھے۔

۴۰ ہجری کو حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی کوفہ میں شہادت ہوئی تو اس کے بعد دس سال تک حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زیرِ تربیت رہے۔ ۵۰ ہجری میں حضرت امام حسن علیہ السلام شہید ہوئے اور ان کے بعد واقعہ کربلا تک حضرت سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہے اور یہ ساتھ ایسا تھا جو منقطع نہ ہوا۔ زندگی میں بھی ساتھ رہے اور موت کے بعد بھی رفاقت کی، بلکہ حقِ رفاقت ادا کر دیا۔

القاب و کنیّت

تقربِ خدا اور عظیم قربانی دینے کی وجہ سے انہیں "باب الحوائج" کا لقب عطا ہوا۔ علاوہ ازیں "الشہید، العبد الصالح، صاحبِ وفا" بھی آپ کے القابِ جلیلہ ہیں۔ حسن و جمال کی وجہ سے "قمر بنی ہاشم" پکارے جاتے تھے۔ کربلا میں

علمدارِ حسینیؑ اور سقائے سکینہؑ کے القاب انہیں حاصل ہوئے۔ان کی مشہور کنیت ابوالفضل اور ابوالقاسم ہے۔

شکل و شمائل

آپ کا قد دراز، اعضاء متناسب، رنگت سفید اور چہرہ خوبصورت تھا۔آپ کی شخصیت رعب وجلال کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔آپؑ کو دیکھ کر دشمنوں کے زہرے آب وتاب اور دل بیقرار ہو جاتے تھے۔آپ جہاں شجاعت وہمت میں بیمثال تھے، وہاں دولتِ حسن و جمال سے بھی مالا مال تھے۔مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں:

"اِنَّ الْعَبَّاسَ كَانَ وَسِيْماً جَسِيْماً جَمِيْلاً يَرْكَبُ الْفَرَسَ الْمُطَهَّمَ وَ رِجْلَاهُ يَخُطَّانِ عَلَى الْاَرْضِ وَ يُقَالُ لَهُ قَمَرُ بَنِيْ هَاشِمٍ".

"حضرت عباس علیہ السلام خوبصورت، قدآور اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔دورکابہ گھوڑے پر سوار ہوتے اور ان کے پاؤں زمین تک پہنچ جاتے تھے۔انہیں "قمر بنی ہاشم" کے لقب سے پکارا جاتا تھا"۔

اگر کبھی ہم شکل علیؑ حضرتِ عباس علیہم السلام اور ہم شکل نبیؐ حضرت علی اکبر علیہم السلام مل کر مدینہ کے کسی کوچہ وبازار سے گزرتے تو مدینہ کے زن ومرد حسن وجمال اور ہیبت اور وقار کا نظارہ کرنے کیلئے گھروں سے باہر نکل آتے اور شوقِ نظارہ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کیلئے مجبور کرتا۔اس واسطے یہ کہتا ہوں کہ مثلِ نبیؐ وعلیؑ حضرت عباسؑ اور علیؑ اکبر آسمانِ مدینہ کے چاند اور ارضِ یثرب کی زیب وزینت تھے۔

فضائل و مناقب

سیرت پاک مکارمِ اخلاق کا مجموعہ تھی۔ایمان وعمل میں بلند مرتبہ پر فائز تھے۔روحانیت درجۂ کمال پر تھی، عبادت و تقویٰ کی وجہ سے "اَلْعَبْدُ الصَّالِحُ" سے ملقب تھے۔کبریت احمر اور فرسان الهیجاء میں مذکور ہے:

"اِنَّ الْعَبَّاسَ مِنْ اَكَابِرِ الْفُقَهَاءِ وَ اَفَاضِلِ اَهْلِ الْبَيْتِ وَ كَانَ مِنْ فُقَهَاءِ اَوْلَادِ الْاَئِمَّةِ"

"حضرت عباسؑ بڑے فقہاء اور اہل بیت کے صاحبانِ علم وفضل میں سے تھے"۔

حضرتِ امام علی زین العابدین علیہ السلام آپ کے ایمان ویقین، علم وعرفان، عمل صالح اور جذبہ جہاد وخلوص کی بناء پر اس طرح تعریف فرماتے ہیں:

"رَحِمَ اللّٰهُ عَمِّی الْعَبَّاسَ فَقَدْ اٰثَرَ وَ اَبْلٰی وَ فَدٰی اَخَاهُ بِنَفْسِهٖ حَتّٰی قُطِعَتْ یَدَاهُ فَاَبْدَلَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْهُمَا بِجَنَاحَیْنِ یَطِیْرُ بِهِمَا مَعَ الْمَلَائِکَةِ فِی الْجَنَّةِ کَمَا جَعَلَهُ لِجَعْفَرِ بْنِ اَبِیْطَالِبٍ وَ اِنَّ لِلْعَبَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً عَظِیْمَةً یَغْبِطُهُ جَمِیْعُ الشُّهَدَاءِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ".

"اللہ تعالیٰ میرے چچا عباس علیہ السلام پر رحمت نازل کرے، وہ مصائب و آلام میں مبتلا رہے اور اپنے بھائی کے غمگسار و جانثار ہو کر اپنی جان کی قربانی راہِ حق میں دے دی۔ یہاں تک کہ ان کے دونوں بازو قلم کئے گئے، جن کے بدلے خدا نے انہیں دو پر عطا فرمائے جن کے ساتھ وہ جنت میں ملائکہ کے ہمراہ پرواز کرتے ہیں۔ جس طرح حضرت جعفرِ طیّار علیہ السلام کو دو پر عطا فرمائے تھے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت عباس علمدار علیہ السلام کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ روزِ قیامت سارے شہید ان پر رشک کریں گے"۔

اسی طرح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام آپ کی شان بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کَانَ عَمُّنَا الْعَبَّاسُ نَافِذَ الْبَصِیْرَةِ، صُلْبَ الْاِیْمَانِ جَاهَدَ مَعَ اَخِیْهِ الْحُسَیْنِ وَ اَبْلٰی بَلَاءً حَسَناً وَ مَضٰی شَهِیْداً".

"ہمارے چچا حضرت عباس علمدار علیہ السلام تیز بصیرت اور مضبوط ایمان والے تھے۔ آپ نے اپنے بھائی حسینؑ کی رفاقت میں جہاد کیا، مصائب و آلام میں آزمائے گئے اور اس آزمائش میں کامیاب اُترے اور شہادت کا بلند مرتبہ پایا"۔

عقیدۂ توحید میں بڑے راسخ تھے۔ صغرسنی کے عالم میں ایک مرتبہ بابا کی خدمت میں حاضر تھے، حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

"قُلْ وَاحِدٌ". "بیٹا کہو! ایک"۔

آپ نے فرمایا: "وَاحِدٌ".

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"قُلْ اِثْنَانِ". "بیٹے! کہو دو"۔

عرض کیا: "بابا جان، جس زبان سے ایک کہا، اس زبان سے دو کہتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے بیٹے کا یہ جواب سن کر آنکھوں کے مابین پیشانی پر بوسہ دیا جو کہ فرطِ محبت کی علامت ہے۔

حضرتِ عباسِ علمدار علیہ السلام کی اولاد

حضرت عباس علمدار علیہ السلام کی شادی حضرت عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب علیہم السلام کی دخترِ نیک اختر، حضرت لبابہؑ سے ہوئی تھی۔ ان سے دو صاحبزادے، حضرتِ فضل، جن سے آپؑ کی کنیت حضرت فضل ہے، اور دوسرے حضرتِ عبیداللہ، جن سے آپؑ کی نسل بڑھی۔

علاوہ ازیں آپؑ کی مزید اولاد بھی کتبِ معتبرہ میں مرقوم ہے۔ چنانچہ ایک کنیز کےبطن سے آپؑ کے فرزند پیدا ہوئے، جن کا نام حسن ہے۔ چوتھے قاسم، جن سے آپؑ کی کنیت ابوالقاسم بھی ہے۔ پانچویں ایک دختر بھی بیان کی جاتی ہیں، جن کا نام نہیں مل سکا۔ چھٹے فرزند محمد ہیں۔ اس طرح پانچ فرزند اور ایک دختر، چھ اولادیں ہے۔

ان میں سے دو حضرات قاسم ومحمد، بعض کتبِ مقاتل کے حوالے سے شہدائے کربلا میں شامل ہیں۔ آپؑ کی اولادِ امجاد بڑھی ہے۔ آپؑ کی اولاد میں سے بہت سے صاحب علم وفضل بزرگ ہو گزرے ہیں، چنانچہ آپؑ کی اولاد میں جنابِ حمزہ بن قاسم بن علی بن حمزہ بن حسن بن عبیداللہ بن عباس علمدار علیہم السلام، جلیل القدر، صاحب علم وفضل، ثقہ اور رفیع الشان بزرگ ہو گزرے ہیں۔ ان کی کنیت ابویعلی ہے اور ان کا مزارِ اقدس شہر حلّہ سے پانچ فرسخ دور، حمزہ نامی ایک گاؤں میں مرجع زیارت عام وخاص ہے اور اس مرقد منور سے کرامات اور خوارق عادات اُمور کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام کی خدمات اور آپؑ کی شخصیت کے اثرات

حضرتِ علی علیہ السلام کی شادی بنی کلاب کی خاتون سے کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ خدا ایک ذی حشم، طاقتور، صاحب رعب وجلال لڑکا عطا فرمائے جو مشکل حالات اور غم کی گھڑی میں اہل بیت علیہم السلام کا معاون وناصر ہو۔ اس شجاع اور دلیر فرزند کی وجہ سے اہل بیت علیہم السلام کے دُکھتے ہوئے دل سکون حاصل کر سکیں اور ان کے سہمے ہوئے بچے سایہ امن میں رہیں۔ خوف اعداء اور دشمنوں کی یورش سے مخدراتِ عصمت وطہارت محفوظ ومامون رہیں کیونکہ کسی خاندان اور کنبہ میں بہادر اور دلیر مرد مرکزِ امن وسکون ہوتا ہے اور اس کے سایہ عاطفت میں تمام افراد تحفظ اور قرار پاتے ہیں۔ اس کے وجود سے خوف، امن

کے ساتھ، اضطراب سکون کے ساتھ، رنج راحت اور دکھ سکھ کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ اس کے دیکھتے ہی بہتے ہوئے آنسو تھم جاتے ہیں، آہیں اور سسکیاں رک جاتی ہیں، جگر کے زخم بھر جاتے ہیں اور دل کی دھڑکنیں معمول پر آجاتی ہیں۔

یہ مقام اہل بیت علیہم السلام اور قافلہ مسافرین کربلا میں ہاشمی اطفال و مستورات، مرکزِ وفا و محبت، قرارگاہِ غیرت و شجاعت، حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام کو حاصل تھا۔ آپؑ کے نام سے دشمنوں کے بدن کانپتے، آپؑ کے تصور سے فوجِ اشقیاء کا خون خشک ہوتا، آپؑ کی پر رعب آواز سے اعصاب بے حس اور زہرے گداز ہو جاتے۔ آپؑ کی ہیبت و حشمت کی وجہ سے کسی شقی کو خیامِ اہلبیت علیہم السلام کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ تمام اہل بیت علیہم السلام و انصار و اصحاب کیلئے آپؑ ہی سایۂ امن و سکون تھے۔ اس سلسلہ میں حضرتِ عباس علیہ السلام کے اثرات و خدمات سے ہم قارئین کو مستفید کرتے ہیں۔

وطن مانوس سے کوچ کے وقت مسافروں کے دل گھبرائے ہوئے تھے، طبیعتیں غمگین اور چہرے اداس تھے۔ اسی طرح کسی اجنبی منزل پر قیام کے وقت یہی حالات پیش آتے ہیں۔ یعنی کوچ و قیام کے وقت گھبراہٹ و خوف دامن گیر ہوتے ہیں۔ کربلا کے مسافروں کیلئے باعثِ سکون و راحت کوئی چیز تھی تو حضرتِ عباس علمدار اور حضرتِ علی اکبر علیہم السلام جیسے مردانِ جری کا وجود تھا۔ چنانچہ کوچ و قیام کے وقت اطفالِ خورد سال اور ہاشمی مخدراتِ عصمت و طہارت کو محملوں پر سوار کرتے وقت اور اُتروانے کے وقت کی نگرانی حضرتِ عباس علمدار اور حضرتِ علی اکبر علیہم السلام کے سپرد تھی، جن سے اہل بیتؑ کے دل کی ڈھارس بندھی رہتی تھی اور اطمینانِ قلب حاصل رہتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کی بیٹیوں کی نظر حضرتِ عباس علمدار اور حضرتِ علی اکبر علیہم السلام کے چہرے پر پڑتی تو رسول زادیوں کے سفر کی تھکاوٹ دور ہو جاتی اور خوف و ہراس جاتا رہتا اور جب کسی جنگل میں شب کے وقت قیام ہوتا تو اسد اللہ کے لعل کا ہاتھ قبضہ تلوار پر ہوتا۔ اہل بیت علیہم السلام حالتِ خواب میں ہوتے اور علیؑ کا شیر جاگ کر خیموں کا پہرہ دیتا کیونکہ مدینہ اور مکہ سے رخصت کے وقت ہوا خواہانِ بنواُمیہ نے دمشق میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے سفر کی اطلاعات پہنچادی تھیں اور جوں جوں سفر کی منزلیں آگے بڑھتیں، خوف بڑھتا جاتا تھا۔

ہوتے تھے ادھر بھی شہ مظلوم کے انصار
پر جاگتے تھے حضرتِ عباسؑ خوش اطوار
پھرتے کبھی گردِ خیام شہ ابرار
ڈیوڑھی پہ کبھی آتے تھے باندھے ہوئے ہتھیار

یوں رات بسر ہوتی تھی اس عاشقِ رب کو

جس طرح سے جنگل میں اسد پھرتا ہے شب کو

اسدِ آلِ محمدؑ کی سقائی

ساتویں محرم سے اہلِ بیت علیہم السلام اور اصحاب و انصار پر مکمل طور پر پانی بند کر دیا گیا اور گھاٹ پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ ظالموں کے اس اقدام نے حضرت عباس علیہ السلام کی غیرت کو للکارا تھا اور شیر حیدرِ کرار آزمائش میں تھا۔ اس وقت پیاسی مستورات اور تشنہ دہان اطفال کی نگاہیں لازماً حضرت عباس علیہ السلام کی طرف اٹھی ہوں گی۔ العطش العطش کی صدائیں جب غیرتِ بنی ہاشم کے کانوں سے ٹکرائی ہوں گی اور کملائے ہوئے معصوم چہرے جب حیدرِ کرار کے فرزند اور ستم رسیدہ قافلہ کی اُمیدگاہ نے دیکھے ہوں گے تو اس غیور جوان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

کیا حضرت عباس علمدار علیہ السلام کی غیرت گوارا کر سکتی تھی کہ سکینہؑ پانی مانگے اور غازیؑ خیمہ کے سایہ میں بآرام بیٹھے؟ کیا مولائے مظلوم عباس علیہم السلام کے ارمانوں سے واقف نہ تھے؟ کیا امام علیہ السلام غازی کے جذبات اس وقت کچلنا چاہتے تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں! مولا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو بلا کے حضرتِ عباس علیہ السلام کو سیرابیِ اطفال و اہلِ بیتؑ کیلئے پانی لانے کا حکم دیا اور اس طرح مولاؑ نے عباس علمدار علیہ السلام کو اس خدمت کو بجالانے کا حکم دیا۔

واقعاتِ کربلا کے مؤرخین شیعہ و سنی و غیر مسلم بالاتفاق لکھتے ہیں کہ ساتویں محرم کو جب اہلبیتِ رسول علیہم السلام پر بندشِ آب ہوئی اور اہلبیت علیہم السلام پر پیاس کا غلبہ ہوا تو حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام کی قیادت میں تیس سوار اور بیس پیادے بیس مشکوں کے ساتھ پانی لانے کے لیے گھاٹ پر روانہ فرمائے جو کامیابی کے ساتھ مشکیں بھر لائے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے حضرت غازی عباس علمدار علیہ السلام کو بلا کر فرمایا:

"یَا اَخِیْ اِمْضِ اِلَی الْفُرَاتِ وَ اٰتِنَا الْمَآءَ. فَقَالَ طَعَةٌ".

''بھائی! فرات کی طرف جاؤ اور ہمارے لئے پانی لے آؤ''۔

حضرت عباس علیہ السلام نے حکم کی تعمیل خوش ہو کر قبول فرمائی اور اس خدمت کے بجالانے کا موقع پا کر "اسدِ آلِ محمدؐ" ہتھیار سجا کر گھاٹ کی طرف چلا جس طرح شیر شکار کی طرف چلتا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے:

جب اہل بیت علیہم السلام پر پیاس کا غلبہ ہوا تو آپ نے حضرت عباس علیہ السلام کو بلایا، تیس سوار، بیس پیادے، بیس مشکوں کے ساتھ ہمراہ کئے۔ حضرتِ عباس علیہ السلام کی قیادت میں یہ قافلہ تحصیل آب کے لیے جانب فرات روانہ ہوا۔ نافع بن ہلال آگے آگے تھے۔ جب حضرت نافع نہر میں داخل ہوئے تو پانچ سو پہرہ دار سواروں کے سردار عمرو بن حجاج نے آواز دی:

''کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

جنابِ نافع نے جواب دیا: ''میں نافع بن ہلال تمہارا چچازاد بھائی ہوں اور یہاں پانی لینے آیا ہوں''۔

عمرو بن حجاج نے کہا: ''بڑی خوشی سے پیو''۔

نافع نے کہا: ''نہیں! ہرگز نہیں! گو کہ پیاسا ہوں مگر جب تک فرزندِ رسولؐ سیراب نہ ہوں، میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ پیوں گا''۔

اسی اثناء میں عمرو کی نگاہ پڑ گئی کہ کئی آدمی نہر میں اتر کر مشکیزے بھرنا چاہتے ہیں۔ عمرو بن حجاج نے کہا: ''میں اسی کام پر مامور ہوں کہ خیامِ حسینی میں پانی نہ جانے پائے''۔

نافع نے اس کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پیادوں کو مشکیں پُر کرنے کا حکم دیا۔

ادھر عمرو بن حجاج نے اپنے فوجیوں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا اور ادھر سے حسینی سپاہ نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔ خاص طور پر اسدِ آلِ محمدؐ، ضرغامِ غازیانِ کربلا، حضرت عباس علیہ السلام نے دل کے ارمان نکالے، کھل کر دادِ شجاعت دی، گھاٹ خالی ہو گیا۔ کئی مردود مارے گئے، باقیوں نے راہِ فرار اختیار کی اور غازیانِ اسلام بیس مشکیں بھر کے سلامتی کے ساتھ خیامِ حسینی میں پہنچ گئے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام، اہل بیت علیہم السلام وانصاران رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے پانی پیا، مگر یہ پانی پوری طرح پیاس نہ بجھا سکا، کیونکہ پینے والے کافی تھے اور پانی کم۔ بیس مشکیں کیا کرتیں؟ اس کے بعد پیاس کا پھر غلبہ ہو گیا۔

اسی وجہ سے حضرتِ عباس علیہ السلام کا لقب سقائے سکینہ مشہور ہوا۔ بعض ساتویں کا دن اور بعض ساتویں اور آٹھویں کی درمیانی شب کا یہ واقعہ تحریر کرتے ہیں۔ اسی لئے سے یہ تاریخیں حضرت عباسؑ کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔

ایمان کی پختگی اور عزم و ثبات

شمر نے امان نامہ لکھوا کر حضرت عباس علیہ السلام کو حضرتِ امام حسین علیہ السلام کی رفاقت سے باز رکھنے کی کوشش

کی، مگر حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام نے شمر اور اس کے امان نامہ پر لعنت بھیجی۔ حضرتِ عباس علیہ السلام کے یہ الفاظ ہیں:

"تَبَّتْ یَدَاکَ وَ بِئْسَ مَا جِئْتَنَا بِهٖ اَمِنْ اَمَانِکَ یَا عَدُوَّ اللّٰهِ اَتَاْمُرُنَا اَنْ نَتْرُکَ اَخَانَا وَ سَیِّدَنَا الْحُسَیْنَ بْنَ فَاطِمَةَ وَ نَدْخُلَ فِیْ طَاعَةِ اللُّعَنَاءِ وَ اَوْلَادِ اللُّعَنَاءِ".

"تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں! بہت ہی برا ہے تیرا امان نامہ جو تو لایا ہے! اے دشمنِ خدا! تو ہمیں یہ کہنے کی جرأت کیسے کرتا ہے کہ ہم اپنے بھائی اور سردار، فرزندِ فاطمہؑ کو چھوڑ کر لعینوں اور ان کی اولاد کی اطاعت کرلیں؟"

حضرت عبدالرزّاق الموسوی المقرم اپنی کتاب "مقتل الحسینؑ" میں رقم طراز ہیں کہ جب عباس علیہ السلام شمر لعین کے امان نامہ کو مسترد کر کے واپس آئے تو زہیر بن قینؒ نے علم اٹھایا اور حضرت عباس علیہ السلام کے پاس جا کر کہنے لگے:

"یا ابن امیر المومنینؑ! میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے بنی کلاب کی خاتون اور آپ والدۂ ماجدہ سلام اللہ علیہا سے اس غرض سے شادی کی تھی کہ شجاع فرزند عطا ہو جو میرے بیٹے حسین علیہ السلام کا قوتِ بازو اور زورِ کرم ہو اور آپ ایسے ہی دن کے لیے ذخیرۂ قوت اور خزینہ طاقت ہیں۔ پس فرزندِ بتولؑ کی نصرت اور ہاشمی مخدرات کی حفاظت سے کوتاہی نہ کیجئے گا"۔

زہیر ابن قین کی اس تقریر سے حضرت غازی عباس علیہ السلام کے خون میں جوش پیدا ہو گیا۔ علیؑ کے شیر نے انگڑائی لی تو رکابوں کے تسمے ٹوٹ گئے اور فرمایا: "زہیر! ایسے دن میں میری شجاعت کو جوش دلاتے ہو؟ میری غیرت کے ارمانوں کو للکارتے ہو؟ زہیر! آج میں تمہیں شجاعت کے وہ جوہر اور قوت کے وہ کمال دکھاؤں گا جو تم نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے"۔

زہیر بن قین کی یہ بات حضرت عباس علیہ السلام کے ساتھ یومِ عاشوراء کو بیان کی جاتی ہے۔

چنانچہ فاضلِ مقرم مزید تحریر فرماتے ہیں کہ حضرتِ عباس علیہ السلام نے میدانِ کارزار میں فوجِ کوفہ وشام کے چھکے چھڑا دیے اور اشقیاء کے سر مثل گیند اڑتے اور بدن خون میں لوٹتے اور ان کے جھنڈے الٹے گرتے نظر آتے تھے۔ حالانکہ اس وقت حضرت عباس علیہ السلام کا مقصد جدال و قتال نہ تھا بلکہ اطفال کو پانی پہنچانا مقصود تھا۔

عمر بن سعد کے ساتھ مختلف راتوں میں گفت وشنید کے وقت حضرت عباس اور حضرت علی اکبر علیہم السلام ہمراہ تھے۔ نویں کے دن جب سپاہِ ابن سعد ہجوم کر کے حملہ کی نیت سے خیام حسینی کے قریب پہنچ گئی اس وقت حضرتِ امام حسین علیہ السلام نے حضرتِ غازی عباس علیہ السلام کو ان کا ارادہ معلوم کرنے اور جنگ ملتوی کرنے کے لیے بھیجا۔ مہلت طلب کرنے میں آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کے سفیر کی حیثیت سے ابن سعد وغیرہ سے گفتگو کرتے رہے اور اس کام کو نہایت حسنِ تدبر، حکیمانہ

اندازِ تکلم سے سرانجام دیا۔

شبِ عاشور خطبہ کے بعد امام حسین علیہ السلام نے اقرباء و انصار کو جانے کی رخصت دی اور بیعت کا قلادہ گردنوں سے اتارنے اور آزاد کرنے کا مشورہ دیا تو اہل بیت علیہم السلام میں سے سب سے پہلے اسی قمرِ بنی ہاشم اور اسدِ آلِ محمد علیہ السلام نے عزمِ وفا، مضبوط ایمان، دلیرانہ انداز اور مومنانہ و مخلصانہ اطوار کے ساتھ قربانیاں دینے اور نصرتِ امام اور حمایتِ اسلام کا اعلان کیا۔

روزِ عاشور حضرتِ سید الشہداء علیہ السلام کے ساتھ آپ سایہ کی طرح رہے اور اکثر شہداء کے لاشوں پر آپ امامِ مظلوم علیہ السلام کے ساتھ پہنچے۔ جیسا کہ کتبِ مقاتل میں مذکور ہے کہ عمرو بن خالدؓ، ان کے غلام سعدؓ، مجمع بن عبد اللہؓ اور جنادہ بن حارث جب جنگ کرتے ہوئے زغہ اعداء میں گھر گئے تو امامِ مظلوم علیہ السلام نے حضرتِ عباس علیہ السلام کو ان کی امداد کے لیے روانہ کیا۔

حضرتِ عباس علیہ السلام نے لشکرِ اعداء کو مار بھگایا لیکن یہ حضرات زخموں کی کثرت سے نڈھال ہو چکے تھے اور واپس جانے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم زندگی کے نہیں موت کے طلبگار ہیں اور واپس جانے کے لیے نہیں آئے۔ شہادت کی تمنا ہمیں میدان میں لائی ہے اس واسطے وہ میدان میں پھر مصروفِ جہاد ہوئے یہاں تک کہ یہ چاروں حضرات اسی ایک جگہ مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

واقعاتِ شجاعت و شہادت

حضرتِ عباس علمدار علیہ السلام کی تاخیرِ شہادت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کے قوتِ بازو تھے اور فوجِ مختصر کے سپہ سالار تھے۔ دستور ہے کہ جب کسی فوج کا سپہ سالار اور غازیوں کا قائد مارا جائے تو فوج کے حوصلے اور مجاہدین کے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور جذبات پست ہو جاتے ہیں جبکہ سپہ سالار کے وجود سے بلند عزائم، مضبوط ارادے اور جمعیت مستحکم رہتی ہے۔ اسی واسطے امام علیہ السلام نے حضرتِ عباسؑ کو آخر وقت تک اپنے ساتھ رکھا اور کئی مشکلات میں یہ قوتِ بازو اور زور کمر رہے۔

علاوہ ازیں مستورات و اطفال کی ڈھارس بھی حضرتِ عباس علیہ السلام کے وجودِ پاک سے بندھی رہی کیونکہ یہ ان کی تسکینِ قلب اور اضطراب کے وقت باعثِ تسلی تھے۔ حفاظتِ مخدراتِ عصمت اور خیامِ اہل بیتؑ کی نگرانی کا ہر دم حضرت عباس

علیہ السلام کو خیال رہا۔ اعدائے اشقیاء نے خیموں کی رخ کیا لیکن انصار و جوانانِ بنی ہاشم نے حضرت عباسؑ کی قیادت میں ان کے ہر حملہ کو ناکام کیا اور اشقیائے بے دین کو اس مقصد میں بری طرح ناکام کیا۔

اپنے حین حیات میں ان غازیانِ حق وصداقت اور ناصرانِ امامؑ وقت نے خیامِ اہل بیتؑ کی پوری طرح حفاظت کی اور مستورات واطفال کو کسی قسم کی کوئی گزند نہ پہنچنے دی۔ اس واسطے آخر تک حضرتِ عباس علیہ السلام کا وجود ضروری تھا۔

خیامِ حسینیؑ میں جب کبھی اضطراب کی سی کیفیت ہوتی، مستوراتِ اہل بیتؑ میں خوف و ہراس کی لہر اٹھتی، اہل بیتؑ کے خورد سال بچے دکھ و درد سے بیتاب ہو کر نالہ شیون وغم بلند کرتے امام علیہ السلام ان کو تسلی دینے کیلئے کبھی آپؑ خود آتے اور کبھی عباسؑ بھائی کو بھیجتے، جن کی آرام دہ آواز دھڑکتے دلوں کو مطمئن کر کے ان سے گھبراہٹ کو دور اور حوصلوں کو بلند کر دیتی اور خیام میں گریہ وبکاء کی آوازیں خاموش ہو جاتیں کیونکہ یہ دکھی دلوں کا سہارا اور مخدراتِ عصمت کے پردوں کے محافظ تھے۔

جب مولائے مظلوم امامِ حسین علیہ السلام کی جمعیت ختم ہوگئی، مختصر سی بہادر فوج دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئی، تمام رفقاء عہد وفا پورا کر کے راہیِ ملکِ بقا ہو گئے، خیام کی رونقیں ختم ہو گئیں، انصار و اقرباء رخصت ہو گئے، زہراؑ کا لعل تنہا رہ گیا اور خیام میں معصوم بچوں کے گلوں سے العطش العطش کی صدائیں زور پکڑ گئیں، برباد گھر اور سیدانیوں کے کھلے سر، حضرت عباس علیہ السلام سے دیکھے نہ گئے، امّ البنین کے لعل کے جذباتِ غیرت ابھر آئے۔ صد لخراش نالوں سے حیدریؑ شجاعت کے ارمان، غازی کے سینے میں مچلنے لگے تو اب حضرتِ عباس علیہ السلام کو صبر کا یارا نہ رہا، زندگی سے دل بے نیاز ہو گیا، اندرونِ سینہ گھٹن بڑھ گئی، امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر رخصت طلب کی:

"یَا اَخِیْ هَلْ مِنْ رُخْصَتِیْ؟"

"بھائی جان! کیا مجھے بھی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟"

امام علیہ السلام نے آہِ سرد بھری اور کڑیل جوان پر نگاہ ڈالی اور فرمایا:

"یَا اَخِیْ اَنْتَ صَاحِبِ لِوَائِیْ"

"بھائی! تم میرے علمدار ہو!"

اس کے بعد امام علیہ السلام نے بھائی کو گلے لگایا اور بہت گریہ کیا۔ میں عرض کروں گا کہ اس سے زیادہ رونے کا اور کون سا مقام تھا، تمام سپاہ کی رخصت ایک طرف اور سپہ سالار کی رخصت ایک طرف۔ تمام انصاران و اقرباء کی جدائی کے صدمہ سے وفادار اور زور بازو بھائی کی رفاقت کا صدمہ کم نہ تھا۔

حضرتِ عباس علیہ السلام نے پھر عرض کی:

"لَقَدْ ضَاقَ صَدْرِیْ وَ سَئِمْتُ مِنَ الْحَیٰوۃِ وَ اُرِیْدُ اَنْ اَطْلُبَ ثَارِیْ مِنْ ھٰؤُلَاءِ الْمُنَافِقِیْنَ".

"میرا سینہ تنگ ہو گیا ہے، زندگی سے ملول ہو گیا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ ان منافقین سے انتقام لوں"۔

امام علیہ السلام نے جواب میں صرف اتنا کچھ فرمایا:

"فَاطْلُبْ لِھٰؤُلَاءِ الْاَطْفَالِ قَلِیاً مِنَ الْمَاءِ".

منتخب میں ہے کہ حضرتِ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:

"اِذَا غَدَوْتَ اِلَی الْجِھَادِ فَاطْلُبْ لِھٰؤُلَاءِ الْاَطْفَالِ قَلِیْلاً مِنَ الْمَاءِ".

"جب جہاد کے لیے آپ جا ہی چاہتے ہیں تو ان پیاسے بچوں کے لیے کچھ پانی لے آئیں"۔

یاد رہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے حضرتِ عباس علیہ السلام کو دفاعی جنگ سے روکا نہیں۔ امام علیہ السلام اور آپ کے انصار و اقرباء کی یہ تمام لڑائی دفاعی لڑائی تھی۔ آغازِ جنگ تو عمر بن سعد نے تیر پھینک کر کیا تھا۔ امام حسین علیہ السلام جب تنہا رہ گئے تو حضرت عباس علیہ السلام کو اس وقت پانی لانے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، کیونکہ ان کے بعد پانی لانے والا اور کوئی نہ رہ گیا تھا۔

کسی روایت میں یہ نہیں ملتا کہ حضرت امام علیہ السلام نے حضرتِ عباس علیہ السلام کو دفاعی جنگ سے روکا ہو اور امام علیہ السلام کو یہ معلوم تھا کہ گھاٹ پر چار ہزار کا پہرہ ہے اور بغیر لڑائی کے پانی کا حصول ناممکن ہے۔ اس واسطے پانی کیلئے بھیجنا ایک قسم کی اجازت جنگ تھی۔ تنہا، حضرتِ عباس علیہ السلام کا چار ہزار لشکر جرار کے ساتھ لڑنا یہ جنگ اور جنگ کی اجازت نہیں؟

حضرتِ عباس علیہ السلام اجازت پا کر خیام سے کس طرح رخصت ہوئے اور ستم رسیدہ بیبیوں نے کس طرح اس کڑیل جوان کو وداع کیا، زبان بیان نہیں کر سکتی۔ قلم لکھ نہیں سکتا، کیونکہ ان کی امیدوں کا ذخیرہ، ان کے دکھوں کا مداوا ختم ہو رہا تھا، ان کے بے چین دلوں کا سہارا ٹوٹ رہا تھا۔ عباس علیہ السلام ہی سے ان کی آس وابستہ تھی، پردہ داروں کو اپنے پردوں کی فکر پڑ گئی، انہیں خیموں کے ستون گرتے نظر آ رہے تھے، بچے کلیجے پکڑ کر رہ گئے، عباسؑ درمیان میں تھے، گریہ کی صداؤں اور درد بھری آہوں نے عباسؑ کو گھیر لیا۔ بہتے ہوئے آنسوؤں، دھڑکتے ہوئے دلوں، درد بھرے نالوں، چلاتے ہوئے بچوں اور سر پیٹتی ہوئی

بہنوں نے در خیمہ سے رخصت کیا۔ حضرت عباس علیہ السلام نے مشک لی، ہتھیار اٹھائے اور خیمہ سے باہر نکلے۔ اس مقام پر میر انیس مرحوم نے خیمہ سے نکلنا نظم کیا ہے:

یہ سن کے سکینہؑ نے جو دی مشک بصد غم　　آہستہ کہا شہ نے بہن سے کہ موئے ہم
سنبھلا جو نہ دل، بیٹھ گئے قبلہ عالم　　عباسؑ چلے گھر سے بپا ہو گیا ماتم

یوں خیمے کے پردے سے وہ صفدر نکل آیا
گویا کہ قمر برج سے باہر نکل آیا

حضرت عباس علیہ السلام ہتھیار اور مشک سجا کر گھوڑے پر میدان میں آئے۔ عمر بن سعد کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اے پسر سعد! یہ حسین علیہ السلام نواسہ رسول ہیں! تم نے ان کے اقرباء و انصار کو شہید کر دیا۔ اب ان کے پاس سوائے کمسن بچوں اور مستورات کے کوئی نہ رہ گیا۔ مرد تو سب مارے گئے۔ اب تنہا حسین علیہ السلام رہ گئے ہیں۔ بچے اور اہل حرم شدت پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ کیا بندشِ آب ختم نہیں ہوئی؟"

اس درد بھری تقریر سے بعض لوگ رونے لگے اور بعض بے حیاؤں نے شرمندگی سے سر نیچے جھکا لئے۔ فوج کی حالت بدل گئی۔ شمر لعین اور شیث بن ربعی کمینے نے نہایت شقاوت سے کہا:

"اے ابوتراب کے فرزند! اگر تمام روئے زمین پانی ہو جائے اور وہ ہمارے قبضے میں ہو، تو پھر بھی ہم ایک قطرہ فرزندِ رسولؐ اور ان کے عیال کو نہ دیں گے، تاوقتیکہ وہ بیعتِ یزید میں داخل نہ ہوں"۔

ان منافقوں کا کافرانہ جواب سن کر حضرت عباس علیہ السلام مولائے مظلوم کے پاس پریشان حالی میں لوٹ آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔

غریب و بے کس امامؑ نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر اتنا روئے کہ گریبان آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ادھر خیام سے العطش العطش کی جگر پاش صدائیں غازی کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ پیاس بڑھ گئی اور جمعیت ختم ہو رہی تھی۔ اس وقت امام حسینؑ اور حضرت غازی عباس علیہما السلام کی پوری توجہ پانی کی طرف تھی۔ مولائے مظلوم علیہ السلام کی انتہائی خواہش تھی کہ زندگی میں درد رسیدہ مستورات اور یتیم بچوں کو پانی سے سیراب دیکھ لوں، میرے بعد انہیں کون پانی پلائے گا؟ حضرت عباس علیہ السلام نے گھوڑ کو ایڑ لگائی اور رجز پڑھتے ہوئے فرات کا رخ کیا۔

لا اَرھبُ الْمَوْتَ اذا الموتُ رِقَا
حتیٰ اوارِیَ فی المصالیت اللِقاء
نَفسی لِنَفْسِ المصطفیٰ الطّھر وفا
ولا اخاف طارِقا ان طرُقا
بل اضرب الھام و اَفری المفرقا
انی انا العبّاس اغدو با التقا
ولا اَخافُ الشَّرَّ یوم الملتقیٰ

حیدرِ کرار کا فرزند مشک سنبھالے جانب فرات بڑھا۔ اعداء کی صفیں حائل رہیں لیکن صفدر کے پسر نے صفوں کو چیرتے ہوئے حملہ آور بہادروں کو ہلاک کرتے ہوئے فرات کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

اسدِ آلِ محمدؐ گھاٹ پر

جس وقت ابتدائے بندشِ آب میں حسینیؑ گروہ طلب آب کیلئے گیا تھا تو اس وقت پچاس مجاہد تھے اور پانچ سو مخالف پہرہ دار تھے۔ اب تنہا صرف ایک عباسؑ اور چار ہزار پہرے دار۔ کیونکہ عمر بن سعد نے پانی روکنے کے انتظام سخت کر دیے تھے اور پہریداروں کی تعداد بڑھا دی تھی۔

آلِ محمد علیہم السلام کا ضرغام تیغ بُراں اور نوکِ سناں سے راستہ بناتا ہوا سپاہ کو راہ سے ہٹاتا ہوا، روکنے والوں کو روندتا ہوا اور گھیراؤ کو چیرتا ہوا لبِ فرات پہنچ گیا۔ چار ہزار ناری یک دم حرکت میں آگئے اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔

ساحل پہ قیامت کی صف آرائی ہوئی تھی
لشکر تھا کہ دریا پہ گھٹا چھائی ہوئی تھی

اب فرزندِ اسد اللہ کو اظہارِ شجاعت کا موقع ملا۔ ضرغام بنی ہاشم نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ جمایا۔ پھر کیا تھا؟ بس بجلی تھی جو قہرِ خدا بن کر اعداء و اشقیاء پر گر رہی تھی۔ سر اڑتے اور دھڑ گرتے نظر آرہے تھے، صفیں بکھر گئیں، دم سینوں میں رک گئے، حوصلے چھوٹ گئے، دل ٹوٹ گئے۔ اسدِ آلِ محمد علیہم السلام غضبناک ہو کر کوفہ و شام کے ریوڑ میں گھس آیا۔ حمزہؑ کی آن، جعفر طیارؑ کی شان، حیدرِ کرارؑ کی جان، فرات کے کنارے پر جلوہ گر تھی۔ بدر و خیبر کی لڑائی اور خندق و حنین کے معرکے آنکھوں کے سامنے آگئے۔

اُمّ البنین کا لعل، مادری تمناؤں کو سرخرو کر رہا تھا۔ ہاشمی شجاعت، اُموی رذالت سے برسرِ پیکار تھی۔ کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ناریوں کا لہو مثلِ سیل بہہ رہا تھا اور نابکاروں کے ناپاک لاشوں سے ساحلِ فرات بھر گیا تھا۔ یکایک اس بے دین لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔

چھوڑ دو گھاٹ یہ غل لشکرِ بے پیر میں ہے

قوتِ دستِ خدا بازوئے شبیرؑ میں ہے

ہاشمی وکلابی شجاعت کے مالک نے ان بے غیرت و بے حیا فوج کی صفوں کو اس طرح درہم برہم کیا کہ اگر دائیں طرف سے داخل ہوتے تو مار بھگاتے اور بائیں طرف سے آنکلتے اور اگر بائیں جانب سے گھستے تو ان کو کچلتے ہوئے دائیں حصے سے برآمد ہوتے۔

چار ہزار کا لشکر اور ان پر ایک عباسؑ غالب آ گئے، صفیں صاف ہو گئیں، پہرے کے بادل چھٹ گئے۔ کچھ ہٹ گئے، کچھ کٹ گئے۔ گھاٹ خالی ہو گیا اور ساحلِ فرات پر ایک عباس علیہ السلام اور ایک آپ کا گھوڑا ہی باقی بچے۔ پسرِ شیرِ خدا نے فرات پر مکمل قبضہ کر لیا۔ ترائی میں گھوڑا اترا اور پانی میں داخل ہو گیا۔

سوار بھی پیاسا، راہوار بھی تشنہ۔ مولا عباس علیہ السلام نے باگیں ڈھیلی کر دیں کہ اسپِ باوفا سیراب ہو لے، مگر وفادار کا وفادار راہوار تھا۔ وفا و حیاء کے ماحول میں پلا ہوا تھا۔

پانی پیے کس طرح علمدار کا گھوڑا

پیاسا ہے ابھی سیدِ ابرارؑ کا گھوڑا

علمدارِ شبیر علیہم السلام گھوڑے سے اُترے۔ شدتِ پیاس سے قلب و جگر کباب ہوئے جا رہے تھے۔ ہاتھوں نے پانی کو چھوا، پانی کی ٹھنڈک محسوس ہوئی، آقا حسینؑ اور ان کے اطفال و عیال کی پیاس کی تقلید میں دہن و زبان کو پیاسا رکھا۔ ان کی تشنہ دہانی پر اپنی سیرابی کو سبقت نہ دی۔ پانی سے چلو بھرا، دشمنوں کو اپنا قبضہ دکھایا، مگر اُم البنین کے پیاسے لعل نے فرزندِ فاطمہؑ کے جانباز سپاہی اور زینب سلام اللہ علیہا کے وفادار بھائی نے وہی پانی دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ مشک بھر لی اور خود سوکھے گلے اور تشنہ لبوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ سن کے علمدار کی آنکھیں ہوئیں پرنم

سیراب کیا مشکو سکینہؑ کو بصد غم

منہ باندھ کے تسمہ سے رکھا دوش پہ جس دم

کی عرض مدد کیجو اے حافظ دوعالم

تو مشک کا حافظ، نگہباں ہے علَم کا

یارب میں بہشتی ہوں پیمبرؐ کے حرم کا

سقائے سکینہؑ گھوڑے پہ سوار دریا کی ترائی سے باہر نکلے۔ عمر بن سعد نے دیکھا کہ اگر پانی خیام میں پہنچ گیا تو علیؑ کے دونوں پسر حسینؑ اور عباسؑ ہماری بقیہ فوج کے لیے کافی ہیں۔ اس وقت اس تمام لشکر کو اکٹھا کر کے چاروں طرف سے بھرپور حملہ کر دیا گیا اور کمانداروں کو چلے چڑھانے کا حکم دے دیا گیا۔

حضرات! آپ ذرا غور فرمائیں! ادھر تنہا علیؑ کا لال، بھرا دکھا ہوا دل، صدمات سے دوچار قلب اور جگر فگار تشنہ لب، ادھر لشکرِ اشقیاء، ہر قسم کے ہتھیاروں سے آراستہ، گھاٹ خالی کروا لینا، کنارے پر قبضہ اور فوجِ مخالف کا بھیڑ بکریوں کی طرف بھاگنا، حضرت عباس علیہ السلام کی شجاعت وہمت کا ثبوت ہے، ہاشمی وکلابی خاندانوں کی بہادری کا مظاہرہ ہے، پھر سامنے آ کر کوئی مقابلہ نہیں کرتا!

عمر بن سعد کے حکم سے تیر اندازوں نے کمانیں سنبھالیں اور سینکڑوں تیر بیک وقت کمانوں سے نکلے، جن کا ہدف جسم حضرت عباسؑ تھا۔ یہی ایک ہتھیار فوجِ مخالف کے پاس تھا جس کی وجہ سے ابن سعد کو مادی فتح اور ظاہری کامیابی حاصل ہوئی۔

تلوار و نیزہ کی لڑائی، دست بدست جنگ اور مبارزہ طلبی کی نبرد آزمائی میں اگر تمام عرب وعراق وشام ومصر کی افواج بھی اکٹھی ہو جاتیں تو انصارِ حسینیؑ اور جوانانِ بنی ہاشم کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہ کر سکتیں۔ جو آتا زندگی سے ہاتھ دھو کر جاتا، مگر تیر ایسے ہتھیار تھے جو دور سے پھینکے جاتے تھے۔ یہ کام تو بزدل اور ہر قسم کے لوگ کر سکتے ہیں اور یہ تیر انداز سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ بیک وقت سینکڑوں تیر جب ایک بدن کی طرف رُخ کرتے تو حسینیؑ مجاہد کا بدن چھلنی کی مانند ہو جاتا، خون بہہ جاتا اور زخموں کی کثرت ناتواں کر دیتی اور مجروح مجاہد نڈھال ہو کر سفرِ آخرت اختیار کر جاتا۔

یہی حال اسدِ آلِ محمدؐ کے ساتھ دریا کی ترائی سے باہر نکلتے وقت ہوا۔ چاروں طرف سے تیروں کی برسات شروع ہو گئی۔ تیروں کے مینہ میں بھی علیؑ کے شیر نے گھوڑے کو دوڑائے اور مشک کو لگائے رکھا۔ جب فرات کا کنارہ چھوڑا تو رخ سیدھا خیام گاہ کی طرف کیا۔ مشک دائیں شانے میں تھی، تلوار، نیزہ یہ دو ہتھیار تھے۔ علَم کو بلند رکھنے کی ذمہ داری بھی تھی۔ راہوار وفادار بھی نہایت تیز رفتاری کے ساتھ تیروں کی ژالہ باری کا مقابلہ کرتے ہوئے جانبِ خیام رواں دواں تھا۔ اس وقت سقائے اہل

حرم کے سامنے زندگی سے بھی عزیز مقصد پانی کو خیام میں پہنچانا تھا۔ یہ آرزو تھی سقائے سکینہؑ کی اور انتہائی آرزو تھی۔

تاہم سپاہ ابن سعد پسپا ہو رہی تھی، غازی نوکِ نیزہ کے ساتھ اپنے سامنے سے بھیڑ ہٹاتے اور راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ کمینے دشمن نے کمین گاہوں کو تاکا اور چھپ کر حملے شروع کر دیئے۔ علمدار گھوڑا تیزی سے خیام کی طرف بڑھائے جا رہے تھے کہ اے شقی ملعون اور بے دین کمینہ زید بن ورقاء نے کمین گاہ سے چھپ کر دائیں جانب پر اس زور سے وار کیا کہ غازی کا دایاں بازو کٹ کر زمین پر گر پڑا۔

ہوشیار مجاہد نے تیزی کے ساتھ مشک بائیں کندھے پر ڈال دی اور نیزہ و علم کو سنبھال کر بائیں ہاتھ سے دفاع کرنے لگے اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اس وقت پسرِ حیدرؑ یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

وَ اللّٰہِ اِنْ قَطَعْتُمْ یَمِیْنِیْ
اِنِّیْ اُحَامِیْ اَبَداً عَنْ دِیْنِیْ
وَ عَنْ اِمَامٍ صَادِقِ الْیَقِیْنِ
نَجْلِ النَّبِیِّ الطَّاھِرِ الْاَمِیْنِ

زباں پر اشعار، ہاتھ میں تلوار، کشت و خون کا بازار گرم تھا، زخموں کی کثرت اور تیروں کی ژالہ باری نے غازی کے جسم کو کمزور کر دیا۔ خون زیادہ بہہ گیا اور طاقتِ بدن گھٹ گئی لیکن دفاع بدستور جاری رکھا اور رفتار میں کمی نہ آئی۔ اسی اثناء میں نوفل بن ارزق لعین نے کمین گاہ سے چھپ کر حملہ کیا اور حسینیؑ سپہ سالار کا بایاں بازو بھی کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ علمدارِ حسینی علیہم السلام نے فوراً مشک کا تسمہ منہ میں پکڑ لیا۔ تسموں کو دانتوں میں دبا لیا، بازوؤں کی پرواہ نہ کی۔ پوری توجہ مشک کی حفاظت پر مرکوز کر دی۔

بایاں شانہ قلم ہونے کے بعد حضرت عباس علیہ السلام یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

یَا نَفْسُ لَا تَخْشَیْ مِنَ الْکُفَّار
وَ اَبْشِرِیْ بِرَحْمَۃِ الْجَبَّارِ
مَعَ النَّبِیِّ السَّیِّدِ الْمُخْتَارِ
قَدْ قَطَعُوْا بِبَغْیِھِمْ یَسَارِیْ
فَاَصْلِھِمْ یَا رَبِّ حَرَّ النَّارِ

اب حضرت عباس علیہ السلام بازوؤں سے محروم ہو گئے، بدن نڈھال ہو گیا، زخموں کی کثرت سے خون بہہ گیا، مگر دل قوی تھا، عزم پختہ اور قوتِ ارادی مضبوط تھی۔ اب لڑائی کے تو قابل نہ رہے تھے، نہ تلوار پکڑ سکتے تھے اور نہ ہی نیزہ، مگر کیا کریں تیروں کی بارش ہے، پہلے ہی کتنے تیر بدنِ اقدس میں پیوست ہیں، اب غازیؑ کا طریقہ یہ ہے کہ سامنے سے جو تیر آتا ہے، آپ اپنا سینہ مشک پر رکھ دیتے ہیں، مشک پر جھک جاتے ہیں، جو تیر آتا ہے، بدن پر لے لیتے ہیں اور مشک بچانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر کوئی دس بیس تیر تو نہ تھے، ہزاروں کمانیں تیر برسا رہی تھیں، باوجود امکانی کوشش کے، ایک تیر مشک میں آلگا۔ مشکیزہ چھد گیا اور محنتوں و جانفشانی سے بھرا ہوا پانی زمین پر بہہ گیا۔ علمدارِ حسینؑ کی آہ نکل گئی۔ اتنا کہا کہ کاش میرا خون سارا بہہ جاتا، پانی بچ جاتا۔

اب آس ٹوٹ گئی، اُمیدوں سے بھرا پانی گر گیا۔ ارمانوں کا خون ہو گیا، طاقت ختم ہو گئی، اتنے میں حکیم بن طفیل نے سرِ اقدس پر آہنی گرز مارا۔ سر پہلے ہی زخموں سے بھرا ہوا تھا، گرز لگنے سے شگافتہ ہو گیا۔

خم تھے کہ پڑا فرق پہ گرز ایک شقی کا
شق ہو گیا سر حضرتِ عباسؑ علیؑ کا

حضرت عباس علیہ السلام گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ ناچار زمین پر گر پڑے۔ آہ! وہ بہادر جس کی بارعب آواز سے بہادروں کے دل دہل جاتے تھے، جس نے گھاٹ خالی کروالیا تھا، وہ شیر مجروح ہو کر فرشِ زمین پر گر پڑا اور گرتے ہی آواز دی:

"عَلَيْكَ مِنِّيَ السَّلَامُ يَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ".

"حسین! میرا آخری سلام قبول ہو۔"

جنابِ فاضل محترم "مقتل الحسینؑ" میں لکھتے ہیں کہ میں نے عالم فاضل جناب شیخ کاظم سبتی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں: میرے پاس ایک فاضل جلیل معتبر و معتمد عالم آئے اور کہا کہ میں جنابِ عباسؑ کا قاصد ہوں، میں نے آنجناب کو خواب میں دیکھا ہے اور وہ آپ سے ناراض ہیں اور کہتے ہیں: "اے شیخ کاظم سبتی! تو میری خاص مصیبت کا ذکر نہیں کرتا۔"

وہ عالم دین کہتے ہیں کہ میں نے حالتِ خواب میں دیکھا کہ عباس علیہ السلام سے عرض کیا: "حضور! میں ہمیشہ ان کی زبان سے آپ کے درد بھرے مصائب سنتا ہوں"۔

تو جناب شیخ نے فرمایا: "شیخ کاظم سبتی سے کہو کہ یہ مصیبت مجلس میں بیان کرے کہ جب سوار گھوڑے سے گرتا ہے تو

زمین پر ہاتھوں کا سہارا لیتا ہے۔ جب سوار کے سینے میں تیر پیوست ہوں اور بازو قلم ہو چکے ہوں تو وہ کس چیز کا سہارا لے اور کس بل زمین پر گرے؟''

جب امامِ مظلوم علیہ السلام نے بھائی کی صدائے استغاثہ سنی اور آخری سلام کی آواز پہنچی تو کیا حالت ہوگی؟ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی ہوگی، کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھے اور اٹھتے بیٹھتے میدان میں تشریف لائے اور جاں نثار بھائی کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔ دیکھا کہ قوت بازو اور زورِ کمر خون میں غلطاں، زخموں سے چور، زخمی سینہ اور کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ خاک کربلا پر زخموں کی تکلیف سے کراہ رہا ہے، بدنِ اطہر تیروں سے بھرا ہوا ہے اور بے شمار زخم کھائے ہوئے، آنکھیں بند کئے ہوئے حسرتوں اور ارمانوں کے ساتھ گرم ریت پر سویا ہوا ہے۔ اس وقت میرے آقا نے آہِ سرد کے ساتھ کہا:

"اَلْآنَ اِنْكَسَرَ ظَهْرِی وَ قَلَّتْ حِيْلَتِی".

''اب میری کمر ٹوٹ گئی اور تدبیر ختم ہوگئی''۔

سب شہیدوں سے زیادہ حضرت عباس علیہ السلام کے بدن پر زخم آئے تھے۔ ایک آنکھ میں بھی تیر کی نوک کا شدید زخم تھا، جس سے بصارت ختم ہوگئی تھی۔

وفادار بھائی نے حقِ وفا ادا کر دیا۔ عباس علیہ السلام کی شہادت کے غم سے زیادہ آپؑ کی حسرتوں اور ارمانوں کا غم تھا۔ اگر پانی خیمہ میں پہنچ جاتا تو غم کس قدر ہلکا ہو جاتا؟ مگر اس حسرت نے عباسؑ کی جدائی کا صدمہ بڑھا دیا۔ امامِ مظلوم علیہ السلام نے کڑیل جوان بھائی کے لاشے پر نوحہ پڑھا۔ عربی شاعر نے نظم کیا جو ترجمہ کے ساتھ پیش ہے:

اَحَقُّ النَّاسِ اَنْ يُّبْكٰى عَلَيْهِ
فَتًى اَبْكَى الْحُسَيْنَ بِكَرْبَلَا

''جس پر گریہ کیا جاتا ہے ان سب سے زیادہ جوان وہ ہے، جس نے کربلا میں حسینؑ کو رُلایا''۔

اَخُوْهُ وَ ابْنَ وَالِدِهٖ عَلِیٍّ
اَبُو الْفَضْلِ الْمُضَرَّجِ بِالدِّمَاءِ

''حسینؑ کا بھائی اور اس کے والد کا بیٹا عباسؑ جس کی لاش لہولہان تھی''۔

وَ اٰسَاهُ لَا يُثْنِيْهِ شَیْءٌ
وَ جَادَلَهٗ عَلٰى عَطَشٍ بِمَاءِ

''جس نے بھائی کے ساتھ انتہائی غمگساری کی اور باوجود پیاس کے بھائی کی پیاس پر پانی نہ پیا''۔

ایک شاعر نے حضرت مظلوم کربلا علیہ السلام کا یہ مرثیہ نقل کیا ہے:

اَخِیُ یَا نُوْرَ عَیْنِیُ یَا شَقِیْقِیُ
فَلِیُ قَدْ کُنْتَ کَالرُّکْنِ الْوَثِیْقِ

''میرے بھائی، میری آنکھوں کے نور، میرا برادر! تُو تو میرا مضبوط سہارا تھا''۔

یَابْنَ اَبِیُ نَصَحْتَ اَخَاکَ حَتّٰی
سَقَاکَ اللّٰہُ کَاساً مِنْ رَحِیْقٍ

''میرے باپ کے بیٹے! تو نے بھائی کے ساتھ ہمدردی کی! خدا تجھے شرابِ طہورا کا جام پلائے''۔

اَیَا قَمَراً مُنِیْراً کُنْتَ عَوْنِیُ
عَلٰی کُلِّ النَّوَائِبِ فِیُ الْمَضِیْقِ

''اے میرے روشن چاند! تم ہر تنگی کے وقت مصیبتوں میں میرے مددگار تھے''۔

فَبَعْدَکَ لَا تَطِیْبُ لَنَا حَیٰوۃٌ
سَنَجْمَعُ فِیُ الْغَدَاۃِ عَلَی الْحَقِیْقِ

''عباسؑ! تیرے بعد زندگی کا مزہ جاتا رہا، کل ہم اکٹھے ہو جائیں گے''۔

جناب فاضل مقرم بیان کرتے ہیں کہ وفادار اور کڑیل جوان بھائی عباسؑ کی شہادت کے بعد امام حسین علیہ السلام صرف ظاہری شکل وصورت میں ہی رہ گئے تھے۔ زندہ صورت تھے، درحقیقت زندگی ختم ہو چکی تھی، بیٹوں اور بھائیوں کی موت نے روحِ حیات سلب کر لی تھی۔ چلتے پھرتے جسم رہ گئے تھے، آثارِ زندگی مٹ گئے تھے۔

اس شہید کا ایک نرالا غم یہ بھی تھا کہ باقی شہدائے بنی ہاشم کی لاشیں جوں توں خیام میں پہنچیں مگر لاشِ برادر خیام میں نہ پہنچ سکی، باقی لاشوں پر تو سیدانیوں نے سر کے بال کھولے، ماتم کیا، مگر عباسؑ کی لاش کے لیے ترستی ہی رہیں۔ لاش خیمہ میں کیوں نہیں گئی؟ کئی وجوہ ہیں۔

لاش اس قدر مجروح ہو چکی تھی کہ اٹھانے کے قابل ہی نہ رہی تھی، کیونکہ پانی روکنے کیلئے سپاہِ عمر بن سعد نے اس مرد

جری پر زیادہ حملے کیے۔ کسی مجاہد پر اتنے تیر نہیں برسائے گئے جتنی تیروں کی بارش غازیؑ پر ہوئی۔ ان کا نشانہ بندِ عباسؑ کے علاوہ مشکِ عباسؑ بھی تھی اور مشک کے حصے کے تیر بھی یہ اپنے بدن پر لیتے تھے۔

پہلے شہیدوں کی لاشیں اٹھوانے کے لیے کچھ جمعیت باقی تھی، جو لاشیں اٹھوانے میں مدد دیتے تھے۔ زخموں کی اس قدر کثرت تھی کہ فرزندِ رسولؐ لاش پر بوسہ دینے کے لیے جھکے تو بوسہ دینے کے لیے کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ اب جمعیت تو ختم ہو چکی تھی اور حسین علیہ السلام کی طاقت زائل ہو چکی تھی، کمر ٹوٹ چکی تھی، مرنے والا کوئی معمولی جوان نہ تھا، چونتیس سال کا کڑیل جوان تھا۔ حسین علیہ السلام اکیلے لاش نہ اٹھا سکتے تھے۔

یہ باب الحوائج اور مقبول وسیلہ ہیں۔ باقی شہداء سے علیحدہ ان کو حاجات براری کے لیے اور مرجع خلائق ہونے کے لیے الگ مقام دیا گیا۔ جن کا روضہ مبارک کرامات و معجزات کا مظہر ہے۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب فرزندِ رسولؐ لاشِ برادر پر پہنچے تو گرد آلود اور شگافتہ سر گود میں لیا اور چہرہ منور سے خاک و خون صاف کرنے لگے تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ عباسِ علمدار گریہ کر رہے ہیں۔ مولائے مظلومؑ نے اپنے بھائی سے گریہ کرنے کی وجہ دریافت فرمائی تو جواب دیا:

''مولاؑ! اس بات پر رو رہا ہوں کہ میں آپ کا آخری مددگار تھا۔ آپؑ نے تو میرا سر گود میں لیا، غبار سے صاف کیا، مولا جب آپ خاک و خون میں غلطاں ہوں گے تو آپ کے چہرے سے گرد و خون کون صاف کرے گا اور آپ کی لاش پر کون روئے گا؟''

اس کے بعد امام علیہ السلام نے حضرت غازی عباس علیہ السلام کی لاش کو اٹھانے کا قصد کیا تو آواز آئی: ''مولاؑ! میری لاش خیمہ نہ لے جایئے گا''۔

''کیوں بھائی عباسؑ؟''

''مولاؑ! میری حسرتیں اور میرے ارمان دل میں رہے، میری آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور میں پیاسے بچوں کی آس بجھا اور پیاس بجھا نہ سکا۔ مجھے خوشی ہوتی جب میرے بدن کے ساتھ پانی کی مشک بھی جاتی۔ اب بغیر پانی کے میں خیام میں جانا گوارا نہیں کر سکتا اور العطش العطش کی صدائیں میرا غیور بدن سننے کی تاب نہیں رکھتا''۔

امام حسین علیہ السلام غمگین ہو کر لاش سے اٹھے۔ علم اٹھایا اور خیمہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اشکبار آنکھوں، ٹوٹے ہوئے دل اور جھکی ہوئی کمر کے ساتھ حسین علیہ السلام خیام میں آئے۔

حضرات! آپ خود اندازہ لگائیں کہ عباسؑ جیسا غیور و جوان بھائی میدان میں جائے تو کیا بتولؑ کی بیٹیاں خیمے میں آرام سے بیٹھ سکتی ہوں گی؟ پانی لینے کیلئے مشک لے کر جائے تو پیاسے بچوں کو کتنی اُمید ہو گی؟

قارئین کرام! جب سے عباس علیہ السلام میدان میں سدھارے، مستورات کسی جگہ چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ کبھی کسی خیمہ میں اور کبھی کسی خیمہ میں۔ خصوصاً زہراؑ جائیوں کی یہ حالت تھی کہ کبھی زمین پر بیٹھتیں تو کبھی اُٹھتیں، کبھی خیمہ کے در پر، کبھی قنات کے قریب بے آرامی کے ساتھ عباسؑ کی خبر پوچھتیں۔

بنی ہاشم کے بیس بچے ہاتھوں میں پیالے لئے، مرجھائے ہوئے چہروں، کملائے ہوئے ہونٹوں، کھلے ہوئے بالوں اور خاک آلود کپڑوں کے ساتھ در خیمہ پر پانی کی آس لگائے، میدان کی طرف نظریں جمائے اور آمدِ عباس علیہ السلام کے منتظر بیٹھے تھے۔ ان کے آگے مولاؑ کی پیاری بیٹی سکینہؑ تھیں، شدّت سے مستورات کو انتظار تھا کہ ناگاہ حسین علیہ السلام نظر آئے، جھکی ہوئی کمر، عمامہ کے کچھ پیچ گلے میں ہیں اور آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے اُٹھتے بیٹھتے آرہے ہیں۔

قرینے سے پہچان گئیں کہ خبر نیک نہیں۔ عباسؑ کی خیر نہیں، بچے حسین علیہ السلام کی طرف دوڑے، سب سے آگے سکینہؑ تھیں۔ پوچھا:

''بابا! چچا جان نہیں آئے؟''

رو کر فرمایا: ''بیٹی وہ تو ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر چلے گئے۔ بیٹی! تیرے چچا کے بازو قلم ہو گئے، مشک تیروں سے چھد گئی، عباسؑ شہید ہو گئے''۔

عزادارو! بچوں نے جب یہ خبر سنی ہو گی تو ان پر کیا کیفیت گزری ہو گی؟

شہزادیاں نہایت بیقراری کے سے قنات کے پیچھے جمع تھیں۔ بار بار قنات کا پردہ حرکت کرتا تھا۔ جس طرح مچھلی پانی سے باہر تڑپتی ہے، شہزادیاں بیقراری کے ساتھ تڑپ رہی تھیں۔ پردہ باہر نکلنے سے روکے ہوئے تھا، اندر بیٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا، حسین علیہ السلام خیمہ کے اندر داخل ہوئے اور کہا:

''زینب و امّ کلثومؑ! تمہارا مان ختم ہو گیا، میرا زور بازو شہید ہو گیا۔''

سکینہؑ کو گلے لگا کر فرمایا: ''بیٹی! تمہارے چچا مجبور تھے، پانی نہ لا سکے''۔

یہ سن کر کہا: ''بابا! پانی نہ لا سکے تو خود تو آجاتے''۔

''نہیں بیٹی نہیں! وہ جگہ پسند آگئی، انہوں نے دریا کے نزدیک رہنا پسند کرلیا''۔

فضل وعبیداللہ کے سروں پر شفقت اور یتیمی کا ہاتھ پھیرا، سیدانیوں پر شہادتِ عباس علیہ السلام کی خبر بجلی بن کر گری۔ زہراؑ کی بیٹیاں غش کھا کر زمین پر گر پڑیں۔ دردناک بینوں سے زمین تھرّا رہی تھی۔ آسمان کانپ رہا تھا، بچوں کی چیخ وپکار سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا، فضا اداس تھی، پریشانی نے بیبیوں کو گھیر لیا تھا۔

یہ نرالا شہید تھا کہ آخری بار جس کا منہ نہ دیکھ سکی تھیں۔ شیر کی لاش پر بہنیں سر کے بال نہ کھول سکیں، نہ گلے لگا کر رو سکیں، نہ کٹے ہوئے بازوؤں کے بوسے لے سکیں، نہ حلقہ باندھ کر ماتم کر سکیں، ہاں! عباسؑ کے علم کو چوما۔

زینبؑ لپٹ کے روئی عباسؑ کے نشاں سے
تجھ سا غیور بھیا لائے بہن کہاں سے

دراصل حضرت عباس علیہ السلام کی شہادت سے جنگِ کربلا کا خاتمہ ہوگیا۔ پردہ داروں کی آس واُمید ختم ہوگئی۔ بناتِ رسولؐ اور ہاشمی مستورات نے جس سہارے سفر کی صعوبتیں برداشت کی تھیں، وہ سہارا ٹوٹ گیا۔ اب سفر کی نوعیت بدلنے والی تھی، یہ ایک ایسا بین تھا جس سے پتھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔

جب درِ ستائیوں کی دلدوز آواز آتی تھی کہ اب ہماری حفاظت کون کرے گا؟ ہمیں کون آرام کی نیند سلائے گا، کون راتیں جاگ کر ہمارا پہرہ دے گا؟

صراطِ مستقیم کی تشریح اورامامِ حق کی معرفت

شہادتِ حضرت علی اصغرؑ، حضرت سید الشُّہداء میدان میں اور حالاتِ شہادتِ امام علیہ السلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

"اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ".

"ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ"۔

ہدایت کا معنی ہے راہ دکھانا اور راہ پر چلانا۔ اہل علم وفضل حضرات نے ہدایت کے دو معنی لکھے ہیں:

۱۔ راہ دکھانا

جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

"اَمَّا ثَمُوۡدُ فَھَدَیۡنٰھُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰی عَلَی الۡھُدٰی".

'تو قومِ ثمود، ہم نے ان کو راہ دکھائی مگر انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی'۔

اس آیت مبارکہ میں ہدایت سے مراد رہنمائی ہے۔ اسی طرح اس قسم کی اور بہت سی آیات میں "ہدایت" راہنمائی کا معنی دیتی ہے۔

۲۔منزلِ مقصود پر پہنچانا

جیسا کہ ارشادِ پروردگار ہے:

"اِنَّکَ لَا تَھۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ".

"جس کو تو پسند کرتا ہے اسے ہدایت نہیں دے سکتا، (یعنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا) مگر جسے اللہ چاہے ہدایت کر سکتا ہے (یعنی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے)۔" (قصص/۵۶)

"وَمِنۡ اٰبَآئِھِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِھِمۡ وَ اِخۡوَانِھِمۡ وَ اجۡتَبَیۡنٰھُمۡ وَ ھَدَیۡنٰھُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ". (انعام/۸۷)۔

"ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور برادران میں سے اور ہم نے ان کو چن لیا اور صراط مستقیم کی ہدایت کی"۔

یہاں بھی ہدایت کرنے سے مراد 'ایصال الیٰ المطلوب' ہے، یعنی مطلوب ومقصود تک پہنچا دینا۔ اسی طرح اور بہت سی آیات سے یہی معنی مراد ہے۔

دراصل ہدایت کے تین مرتبے ہیں۔

۱۔ راہ دکھانا ۲۔ راہ راست پر چلانا ۳۔ منزل مقصود تک پہنچانا

یہ تینوں ہادی کی مہربانی کا اثر ہیں۔ پہلا مرتبہ راہ دکھانا عام مہربانی ہے، دوسرا مرتبہ راہ راست پر چلانا خاص مہربانی ہے اور تیسرا مرتبہ منزل مطلوب تک پہنچانا کمال مہربانی ہے۔

ہدایت کے مراتب

اسی طرح ہدایت کی تین منزلیں ہیں:

۱۔ راہ دکھانا

یہ اُن لوگوں کیلئے ہے جو ابھی راہ راست سے دور ہیں۔ گمراہی میں پھنسے ہوئے، ضلالت کی تاریکی میں ڈگمگاتے پھرتے ہیں۔ ان کی راہنمائی کے لیے خدا ہادی بھیجتا ہے جو انہیں راہ راست دکھاتے ہیں۔

۲۔ ثابت قدم رکھنا

راہ راست پر چل رہے ہیں۔ منزل مقصود کی نشاندہی انہیں کر دی گئی ہے، لیکن پھسلنے کا اندیشہ ہے۔ کئی راہزن بھی راہ میں موجود ہیں۔ راہ سے بھٹکانے والوں سے بھی خطرہ ہے۔ شک وشبہ بھی ساتھ ساتھ ہے۔ بھٹک جانے کا ڈر ہے۔ اس واسطے اس قسم کے لوگوں کی ہدایت کرنے کا مقصد ہے کہ یہ لوگ راہ راست پر ثابت قدم رہ سکیں۔

۳۔ معرفت اور روحانیت کا بڑھنا

معرفت اور روحانیت کا بڑھنا اور ایک درجہ کمال پر فائز ہوتے ہوئے مافوق مرتبہ کمال حاصل کرنا کیونکہ معرفت و روحانیت کی کئی منزلیں اور کمال کے کئی مراتب ہیں۔ نہ عرفان و روحانیت میں کی منزلیں ختم ہوتی ہیں اور نہ ہی کمال کے درجات بیک وقت طے ہو سکتے ہیں۔

سالک جادۂ حق جوں جوں صراط مستقیم کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے، اس کی معرفت اور کمال بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن نہ

سالک چلتے چلتے تھکتا ہے اور نہ ہی مراتب ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کے ذوق وشوقِ سلوک کی رفتار رکتی ہے۔ جوں جوں لذتِ وصال بڑھتی ہے، اس کا ذوق ترقی کرتا ہے اور جوں جوں تقربِ خدا حاصل ہوتا ہے، اس کا شوق آگے آگے بڑھتا ہے۔ یہ معنی انبیاء، مرسلین، آئمہ طاہرین، اوصیاء وصالحین ومقربین اجمعین کیلئے ہیں۔

اس واسطے گمراہ کیلئے ہدایت کا معنی ہے، راہِ راست دکھانا اور اس پر چلانا۔ مومن اور ہدایت یافتہ کیلئے ہدایت کا معنی ہے راہِ راست پر ثابت قدم رکھنا اور انبیاء وآئمہ جب "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" کہتے ہیں تو وہاں مراد ہے کمال بڑھانے سے، زیادہ سے زیادہ اپنے قریب کر اور ہر ممکن درجۂ کمال پر پہنچا۔

جس طرح کہ خدا نے فرمایا ہے اور حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا ہے:

"قُلْ رَبِّ زِدْنِيْ عِلْماً"

"اے پیغمبر کہہ دیجئے! پروردگار میرا علم زیادہ کر"۔

الصّراط المستقیم (سیدھا راستہ)

صراط: سبیل، طریق ہم معنی الفاظ ہیں، منزلِ مقصود تک پہنچانے والے ذریعہ کو راستہ کہا جاتا ہے۔ اگر منزلِ مقصود مادّی ہو تو راستہ بھی مادّی ہوتا ہے اور اگر منزلِ مقصود روحانی ومعنوی ہو تو راستہ بھی روحانی ومعنوی ہوگا۔

یہاں منزلِ مقصود مادّی نہیں بلکہ "وصول الی الحق" یعنی حق تک پہنچنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خدا تک رسائی۔ تو یہاں "صراطِ مستقیم" سے مراد وہ طریق کار ہوگا جو بندہ کو خدا کا قرب عطا کر کے خدا رسیدہ بنا دے اور خدا تک پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا محبوب اور پسندیدہ ہو جائے۔

یوں تو خداوند عالم ہر بندہ کے قریب ہے، بلکہ اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہے، لیکن یہ قرب قدرتی ہے۔ یہاں مراد "قربِ اصطلاحی" ہے۔ اسلامی اصطلاح میں تقرب سے مراد قربِ روحانی ہے، قربِ مکانی نہیں۔

بعض اوقات مکانی قرب حاصل ہونے کے باوجود روحانی قرب حاصل نہیں ہوتا۔ جس طرح حضرت نوحؑ اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کو ان دونوں حضرات سے مکانی قرب تو حاصل تھا ہی۔ ایک ہی مکان، بلکہ ایک ہی جگہ زندگی بسر ہوتی رہی، دنوں کی بات نہیں، مہینوں اور برسوں کا عرصہ نہیں، طویل مدت تک قربِ مکانی رہا۔ زوج اور زوجہ سے بڑھ کر اور کیا قربِ مکانی ہو سکتا ہے۔ لیکن قربِ روحانی حاصل نہ تھا۔ اسی واسطے بالآخر اتنی دوری ان دونوں کی اپنی بیویوں سے پیدا ہو گئی کہ زوج جنت میں اور زوجہ جہنم میں۔ اگر حضرت نوح اور لوط علیہم السلام کی قبروں کے ساتھ ان کی بیویوں کی قبریں بھی بنا دی

جائیں تو یہ قرب اور اتصال بھی ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتا۔ جب زندگی میں جسموں کا قرب کوئی مفید نہ ہو سکا تو مرنے کے بعد قبروں کا اتصال کیا نفع دے گا؟

کہتے ہیں کہ گھر دور ہو تو ہو لیکن دل دور نہ ہوں۔ ایک گھر میں دونوں رہتے ہیں لیکن باوجود ایک مکان اور یکجا ہونے کے دل دُور ہیں۔ زوجہ سے بڑھ کر کس کو صحبت پیغمبر حاصل ہو سکتی ہے؟

لہٰذا صرف صحبت ہی میں رہنا نجات کے لیے کافی نہیں۔ اگر صرف صحبت ہی نجات دے سکتی تو ان دونوں پیغمبروں کی بیویاں بھی نجات پا چکی ہوتیں۔ لیکن قرآن شاہد ہے کہ یہ دونوں جہنمی ہیں۔ جب بیوی اثر نہ لے سکی تو بیوی کے باپ اور بھائی کا اثر قبول کرنا کیونکر ممکن ہے؟ وہ تو اور بھی دُور ہیں۔

ہاں! باوجود بُعدِ مکانی کے، قربِ روحانی حاصل ہے۔ گھر دور ہیں لیکن دل دور نہیں۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں، ایک مدینہ میں ہے، دوسرا یمن میں جس کا نام اویس قرنیؓ ہے، لیکن اتنا قرب روحانی حاصل ہے کہ حضوؐر فرماتے ہیں کہ "میں یمن سے بوئے رحمٰن سونگھ رہا ہوں"۔

حضرت اویس قرنیؓ کو حضوؐر اکرم کی زیارت تو نصیب نہ ہو سکی البتہ اس خوشبوئے رحمٰن نے حسنین علیہم السلام کے بابا کی زیارت بھی کی اور جنگِ جمل میں ساتھ بھی دیا۔ زیارتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محروم رہا، وصیِ رسول کا مددگار رہا، بندہ اپنے علم و عمل کی بناء پر خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کر کے اس کی خاص رحمت و انعام کا مستحق ہو جائے اور اس کے غضب و ناراضگی سے مامون ہو جائے۔ اس واسطے صراطِ مستقیم سے دین اسلام اور شریعتِ مقدسہ مراد ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر بندہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو کر مقبولِ خدا ہو جائے اور اس کے عوض "رضوانِ الٰہی" کا مستحق بن کر نعماتِ ابدی اور دائمی خوشگوار زندگی حاصل کر لے۔ جس طرح منزلِ مقصود مادّی آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتی اسی طرح اس کا راستہ بھی بصارتِ ظاہری سے بلند ہے۔ اسے بصیرت یعنی دل کی آنکھوں اور عقل کی فکر سے پہچانا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم کی شناخت

سالک یعنی راہ چلنے والے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے منزلِ مقصود کا تعین کرے اور پھر اس منزل تک پہنچانے والے راستے کی معرفت حاصل کرے۔ اگر منزل کوئی متعین نہیں، نصب العین اور نظریہ کوئی قائم نہیں تو وہ آوارہ گرد ہے اور اس کا سفر بے معنی اور سلوک بے مقصد اور بے فائدہ ہے اور اس کی محنت رائیگاں ہے۔ اسی طرح اگر راستے کی پہچان نہیں ہے، صحیح راہ سے

بے خبر ہے، منزلِ مقصود معین ہے لیکن راہ اور منزل میں کوئی ربط نہیں، کوئی تعلق نہیں، منزل راہ سے بیگانہ اور راہ منزل سے جدا ہے تو چلنے والا جتنا بھی سفر کرے، منزل سے نا آشنا رہے گا اور اس کی تمام مشقت ضائع ہو جائے گی۔

مثلاً کسی شخص نے کراچی جانا ہے اور وہ پشاور کا رخ کر کے پشاور جانے والی سڑک پر گامزن ہو جاتا ہے تو وہ جتنا بھی سفر کرے گا، منزل سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جائے گا اور جس قدر تیزی سے مسافت طے کرے گا، اسی قدر تیزی سے منزل سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ بیچارہ محنت و مشقت تو کر رہا ہے، معروفِ عمل تو ہے مگر جہاں تک اس کے عمل کا تعلق ہے، اس میں وہ کوتاہی نہیں کر رہا، عمل پر زور ہے لیکن اس کا عمل بجائے فائدہ کے اسے اُلٹا نقصان پہنچا رہا ہے اور اسے نفع کی جگہ زیاں حاصل ہو رہا ہے۔

یہ اس واسطے ہے کہ سالک صراطِ مستقیم کی معرفت سے محروم ہے۔ عمل ہے، لیکن معرفت نہیں ہے۔ اس واسطے وہی عمل نفع رساں ہوتا ہے جو صحیح معرفت کے تابع ہو۔ لہٰذا خدا تک پہنچنے، اس کا تقرب حاصل کرنے اور اپنے اعمال کا ثمرہ حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے بندہ ''الصراط المستقیم'' کی پہچان حاصل کرے۔ اسی طرح روحانی و ایمانی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے روحانی و ایمانی صراطِ مستقیم کی معرفت حاصل کرے۔ لہٰذا معرفت پہلے ہے اور عمل اس کے بعد۔

تقرّب اِلَی اللّٰہ

پس تقرب اور وصل حاصل کرنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ منزلِ مقصود کا تعین۔

۲۔ راستے کی پہچان۔

۳۔ سلوک، یعنی اس راہ پر چلنا۔

منزل کا تعین نہیں تو آوارہ گردی اور بے مقصد سیر، بے فائدہ سفر ہے۔ راہ کی معرفت نہیں تو بھٹکتے پھرنا، ڈانواں ڈول پھرنا اور تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارنا ہے اور آخر تھک ہار کر بیٹھ جانا ہے۔ اگر منزل بھی متعین ہے، راہ کی پہچان بھی ہے لیکن چلنے والا چلتا نہیں، پاؤں کو حرکت نہیں دیتا، بیٹھا بیٹھا، پڑا پڑا منزلِ مقصود کو پکارے جا رہا ہے، منزلِ مقصود کے نام کا ورد کر رہا ہے، تو صرف پکارنے سے رسائی نہیں ہو جاتی، وہاں عمل کی ضرورت ہے۔ منزل پر پہنچنے کیلئے چلنا بھی ضروری ہے۔

کوئی نظریہ بھی ہو، وہ منزلِ مقصود ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ ''صراطِ مستقیم'' ہے۔ منزلیں جدا جدا ہیں،

ان کے راستے بھی جدا جدا ہیں۔ مثلاً اگر بیمار ہے تو اس کی منزلِ مقصود "تندرستی" ہے۔ اسے منزل تک پہنچنے کے لیے راستہ چاہیے اور وہ راستہ ہے علاج۔ اگر جاہل، غلط اور مصنوعی طبیب و ڈاکٹر کے پاس جائے گا تو منزلِ مقصود یعنی تندرستی تک نہ پہنچ پائے گا، کیونکہ جس راہ پر چلے گا، وہ مستقیم نہیں، راہ غلط ہے۔ وہ منزل سے زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ یعنی اس کا مرض بڑھے گا۔ اگر وہ حاذق، طبیب یا ماہر ڈاکٹر کے پاس بغیر علاج گیا تو یہ راہ ہے تو صراطِ مستقیم ہی لیکن صراطِ مستقیم کا صرف پہچان لینا ہی کافی نہیں، اس پر چلنا بھی ضروری ہے۔ طبیب نے جو نسخہ تجویز کیا ہے، اسے مریض گلے میں ڈال لے یا ہاتھ میں تھامے رہے، اس کی دواؤں کا ورد کرتا رہے، اس کی دواؤں کی رٹ لگاتا رہے تو وہ صحت سے ہمکنار نہ ہوگا۔ صحت کی منزل سے وہ تب ہی قریب ہوگا جب اس کے نسخے کو استعمال کرے گا۔

ہماری منزلِ مقصود ہے تقرب خدا، محبت خدا، خدا تک رسائی، مرضِ ضلالت کا مریض صحت روحانی کا طلبگار ہے۔ اگر وہ مستند روحانی طبیب کے مطب میں جائے گا، صحیح ہادی اور سچے پیشوا کا دامن پکڑے گا تو تب ہی وہ روحانی امراض سے نجات پا سکے گا اور ضلالت کی تاریکی سے نکل کر جلوہ گاہِ ہدایت میں قدم رکھ سکے گا۔

اگر طبیب روحانی کے شفاخانہ میں پہنچ کر اس نے استعمالِ نسخہ کا سفر طے نہیں کیا تو صحت کی منزل سے دور ہی رہا۔ بعض بدنصیب صحیح ہادی اور سچے پیشوا کی معرفت سے محروم رہ کر ضلالت کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں اور بعض امامِ حق کو پہچان کر، سچے ہادی کو مان کر، صراطِ مستقیم کو جان کر اس راہ پر نہیں چلے، عمل کے پیروں کو حرکت نہ دی، صرف منزل اور اس کی راہ کی رٹ لگاتے رہے، وہ بھی منزل سے دور ہی رہیں گے۔

لہٰذا شیعہ حضرات اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ سچے ہادیوں کو صرف پہچان کر جنت کا پروانہ لے لیں گے، نہیں، عملی پیروی بھی ضروری ہے۔ عمل، عمل، عمل ضروری ہے!!

صراطِ مستقیم کی پہچان ضروری ہے کیونکہ منزلِ مقصود پر سالک کو پہچانے والی یہی چیز ہے۔ سالک اور منزل کے درمیان یہی راستہ اور ذریعہ و وسیلہ ہے۔ صراط کسی شے کا دروازہ ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے انسان اس میں داخل ہوتا ہے۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے:

وَ اِذَا اَتَیتَ الْاَمرَ مِنْ غَیرِ بَابِہٖ
ضَلَلْتَ وَ اِنْ تَقْصِدُ اِلَی الْبَابِ تَھْتَدِ

"جب تو کسی کام کے بغیر دروازے پر آئے تو تُو گمراہ ہو جائے گا اور اگر تو کام کے ساتھ دروازے کا قصد کرے تو

ہدایت پا جائے گا"۔

اس واسطے تو دیکھ کہ تیری منزل کیا ہے؟ تو نے جانا کہاں ہے؟ یقیناً تیری منزل مقامِ مصطفویؐ اور درِ رسولؐ ہے۔ اگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ گیا تو یقین جان کہ خدا تک رسائی ہوگئی۔

"وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ".

"تو کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت کرے گا۔"

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

"اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا دے کہ وہی سب کا دین ہے، اگر تو وہاں تک نہ پہنچا تو تمام اعمال تجھے بولہب تک پہنچا دیں گے"۔ جس کا مقام نارِ جہنم ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تک پہنچنے کا راستہ اور دروازہ اُمت کو بتا دیا ہے کہ:

"اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا".

"میں علوم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔" مزید بتایا کہ

"مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَاْتِهٖ".

"جو شخص حصول علم کا ارادہ رکھتا ہو وہ اس (علیؑ) تک پہنچے۔"

یعنی جو شخص دینِ اسلام کی معرفت، صراطِ مستقیم کی پہچان چاہے، وہ اس دروازہ پر آئے۔ جو اس دروازہ پر پہنچ گیا، وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔

شد فیض یاب ہر دوسرا از درِ علیؑ
بے بہرہ آنکہ گشت جدا از درِ علیؑ
بکشود مصطفےٰؐ در حیدرؑ بمسجدش
یعنی کہ میری بخدا از درِ علیؑ

"دروازۂ علیؑ سے دونوں جہان فیض یاب ہیں۔ وہ شخص فیض سے محروم رہا جو درِ علیؑ سے جدا ہوا۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت حیدرِ کرار علیہ السلام کا دروازہ مسجد کی جانب کھلا رکھا۔ باقی تمام صحابہ کے دروازے جو مسجد کی طرف کھلتے تھے، بند کروادیئے، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ علیؑ کے در سے ہی خدا تک رسائی ہوسکتی ہے"۔

اگر کسی وقت راہ چلنے والا راہِ راست کی پہچان میں پریشان ہو تو وہ ایسے شخص سے راہ دریافت کرکے منزل تک نہیں پہنچ سکتا جو خود ہی راہ سے بے خبر ہو۔ اسلام "صراطِ مستقیم" ہے۔ اس کی رہنمائی وہی کرسکتا ہے جو اسلام کے تمام امور، اصول و فروع اور جملہ احکامِ قرآن سے واقف ہو کیونکہ یہ تمام اُمورِ اسلام میں شامل ہیں۔ احکامِ اسلام سے ناواقف اسلام کے متعلق رہنمائی نہیں کرسکتا۔ اسی واسطے ہر تین حکومتیں مسائلِ اسلام اور احکامِ قرآن سے ناواقف ہوتے ہوئے جب بھی مسائلِ دین حل کرنے سے عاجز آتیں تو درِ علیؑ پر ہی سائل بن کر آتیں۔ اس سے ان کی دین سے بے علمی ظاہر ہوتی ہے۔

دین سے بے علم اسلام کا سائل تو بن سکتا ہے مگر اسلام کا رہنما نہیں بن سکتا۔ اسلام کا رہنما تو وہ ہے جو ہر مشکل کو حل کر کے دین کے سائل کی تشنگی بجھادے اور مدینۃ العلم بن کر صراطِ مستقیم کی رہبری کرسکے۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنی موٴقر کتاب "تفسیرِ عزیزی" میں الٓمٓ اور حروفِ مقطعات کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ تمام حروفِ مقطعات کو یکجا جمع کرنے سے ایک جملہ بنتا ہے:

"صِرَاطُ عَلِيٍّ حَقٌّ نُمْسِكُهُ".

"علیؑ کا راستہ حق ہے، جسے ہم مضبوطی سے پکڑتے ہیں"۔

جب علیؑ کا راستہ حق ہے، تو جو راہیں صراطِ علیؑ کے مقابل اور مخالف ہوں وہ باطل ہیں۔ لہٰذا راہِ علیؑ پر چلنے والا تو منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا اور مخالف راہِ علیؑ کسی راہ پر چلنے والا بھٹکتا رہ جائے گا۔ جتنا چلے گا، منزل سے دور ہی رہے گا۔

نیز تفسیر ثعلبی اور معالم التنزیل میں زیرِ آیت:

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ".

"ہمیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کر۔" درج ہے:

"عن مسلم بن حمان قَالَ سَمِعْتُ اَبَا بُرَيْدَةَ يَقُوْلُ صِرَاطَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ".

"مسلم بن حسان کہتے ہیں کہ میں نے ابو بریدۃ سے سنا کہ وہ کہتے ہیں کہ صراط مستقیم سے مراد حضورؐ اور آپؐ کی آلؑ کا راستہ ہے"۔

علاوہ ازیں ایک یہ بھی پہچان ہے کہ جنہوں نے دین کو پھیلانے، قوت دینے اور اسلام کی حفاظت کرنے کیلئے قربانیاں دی ہیں، وہی دین کے سچے ہادی ہیں۔ کچھ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے دین سے فائدہ اٹھایا اور گھر بھرے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کو فائدہ پہنچایا اور دین کی خاطر بھرے گھر اجاڑ دیے۔ یقیناً وہ ہی دین کے سچے ہمدرد ہیں۔

حضرات گرامی! اگر دین پر خرچ ہوا ہے تو صرف اور صرف ابو طالب علیہ السلام کے گھرانے کا۔ آپؑ کے علاوہ کسی کا کچھ خرچ نہیں ہوا۔ باقی لوگوں نے تو کمایا ہے۔ مگر آل ابیطالب علیہم السلام نے ہمیشہ قربانیاں دے کر شجر اسلام کی حفاظت کی۔

کربلا میں کون سا خاندان اجڑا؟ کس کا گھرانہ برباد ہوا؟ کس کا گلشن تاراج ہوا؟ ابو طالب علیہ السلام کا سارا گھرانہ کربلا میں قربان ہوا۔ اولادِ عقیلؑ، اولادِ جعفر طیارؑ، اولادِ علیؑ، اولادِ حسنؑ، اولادِ حسینؑ، یہ سب ابو طالب علیہ السلام ہی کا تو گھرانہ ہے جو مدینہ سے کربلا آیا اور سارے کا سارا اسلام پر قربان ہو گیا۔

آپ شہدائے کربلا علیہم السلا کے واقعات پڑھ اور سن چکے ہیں، قافلہ سالار نے اپنا قافلہ سوئے جنت روانہ کر دیا۔ اب قافلہ سالار تنہا رہ گیا ہے۔ خیمے مَردوں سے خالی ہو چکے ہیں۔ ہاں! سوگواروں کے لیے ایک خیمے میں شہدائے بنی ہاشم کی لاشیں رکھی ہیں، جو فرزند رسولؐ میدان سے لاتے رہے اور دردستائیاں ان لاشوں پہ ماتم کرتی رہیں مگر حضرت عباس علیہ السلام کی لاش مجبوریوں کی وجہ سے نہ لا سکے۔

❁❁❁

واقعاتِ شہادت
حضرت سیدالشہداء علیہ السلام

حضرت عباس علمدار علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی ساری سپاہ ختم ہوگئی، زور ٹوٹ چکا ہے، کمر جھک چکی ہے، عزیزوں کی شہادت نے فرزندِ رسولؐ کو ناتواں کر دیا ہے

گر پڑتے ہیں اٹھ اٹھ کے یہ کمزور ہیں شبیرؑ
جیتے ہیں مگر غم سے لب گور ہیں شبیرؑ

حضرت امامِ مظلوم علیہ السلام کڑیل جوان برادر کی شہادت پر اشک بہاتے ہوئے امامؑ نے دائیں بائیں دیکھا۔ خیمے مردوں سے خالی ہو چکے تھے۔ جس خیمے میں بیٹھتے اس میں جاں نثار دائیں بائیں قربان ہونے کیلئے تیار رہتے تھے، مگر اب خیام سُونے پڑے تھے۔ ایک خیمے میں جوانانِ بنی ہاشم تیروں اور نیزوں کے زخم کھائے راحت کی نیند سو رہے تھے، اس لئے کہ شبِ عاشور جاگ کر کاٹی تھی، بڑی گہری نیند سو رہے تھے اس واسطے کئی بار پکارا:

"یَا اَبْطَالَ الصَّفَا وَ فُرْسَانَ الْہَیجَا".

مگر وہ تو ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے، کہاں جواب دیتے؟ آپؑ نے ایک مرتبہ آواز دی:

"اَمَا مِنْ مُغِیْثٍ یُغِیْثُنَا".

"کوئی مدد کرنے والا نہیں جو ہماری مدد کرے۔"

"اَمَا مِنْ مُجِیْرٍ یُجِیْرُنَا".

"کیا کوئی ایسا ہے جو حرمِ رسول اللہ سے دشمنوں کو دور کرے؟" کیا بناتِ رسولؐ کا پردہ بچانے والا کوئی نہیں؟

حضرت امامِ مظلوم علیہ السلام کے اس استغاثہ سے کائنات متزلزل ہوگئی، عالمِ امکان میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ شبیرؑ کی تنہائی دیکھ کر زمینِ کربلا تھرّا اٹھی، فضا سوگوار ہوگئی، استغاثہ کی دردناک آواز فضا کو چیرتی ہوئی بسترِ بیماری پر سید سجاد علیہ السلام کے کانوں سے جا ٹکرائی، بیمار نے کروٹ بدلی، بے چین ہو کر پوچھا:

"پھوپھی اماں! کیا بابا تنہا رہ گئے ہیں؟ پھوپھی اماں! چچا عباسؑ کہاں ہیں؟ اکبرؑ و قاسمؑ کہاں ہیں؟"

فرمایا: "بیٹا! سب شہید ہوگئے۔ دیکھو تو سہی خیام میں کوئی مرد رہ گیا ہے؟ اب اکیلے تیرے بابا ہی میدان میں ھَل

مِنْ مُغِیثٍ کی آواز دے رہے ہیں"۔

یہ سننا تھا کہ بیمارِ کربلا بے قرار ہو کر اٹھے، اٹھتے تھے لیکن بیماری کی وجہ سے پھر بیٹھ جاتے تھے۔ عصاء کا سہارا لے کر اٹھے، تلوار سنبھالی اور میدان کو جانا چاہتے تھے کہ حضرتِ اُمّ کلثوم سلام اللہ علیہا نے تھامنے کی کوشش کی اور پوچھا: "بیٹا! کہاں جاتے ہو؟"

"پھوپھی اماں! مجھے چھوڑ دیجئے! دیکھئے میرے بابا تنہا رہ گئے ہیں۔ میں ان کی مدد کو جانا چاہتا ہوں"۔

حضرتِ امام زین العابدین علیہ السلام میدان کی طرف بڑھتے تھے مگر حضرتِ کلثوم سلام اللہ علیہا آپ کو روک لیتی تھیں۔ اسی اثناء میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی نظر پڑی تو آپ نے فرمایا:

"احتاہ! احبیہ"۔

"بہن! اسے روک لو" کہ زمین حجتِ خدا سے خالی نہ رہ جائے۔ حضرتِ امّ کلثوم اور حضرت زینب سلام اللہ علیہما نے بھتیجے کو گلے لگایا، تسلیاں دیں اور سہارا دے کر بستر بیماری پر لٹا دیا۔

حضرت علیٔ اصغرؑ بن الحسینؑ کی شہادت

میدان میں حضرتِ امام حسین علیہ السلام نے استغاثہ بلند کیا ادھر خیامِ مستورات میں صدائے ماتم بلند ہوئی۔ شبیرؑ کی تنہائی اور غربت بہنوں سے دیکھی نہ گئی۔ کہرامِ ماتم بپا ہو گیا۔ امامِ مظلوم علیہ السلام خیام میں تسلّی دینے کے لیے آئے مگر یہ تسلّی کہاں تک خاموش کر سکتی تھی۔ جن کا بھرا گھر ایک دن میں اجڑ گیا ہو، جن کے سامنے بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں کی لاشیں پڑی ہوں، وہ گریہ کس طرح ضبط کر سکتیں؟

بہر حال امام علیہ السلام تسلّی دے رہے تھے کہ اسی اثناء میں کمسن، شیر خوار چھ ماہ کے علی اصغرؑ کے رونے کی آواز امام علیہ السلام کے کانوں میں پڑی، جو شدّتِ پیاس سے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ماں دودھ پلانے سے قاصر تھی، باپ پانی پلانے سے مجبور۔ معصوم بچہ بار بار زبان باہر نکالتا تھا۔ اس دردناک منظر نے اہلبیت علیہم السلام کو اور زیادہ مغموم کر دیا۔ امام علیہ السلام نے جنابِ اُمّ المصائب سے فرمایا:

"نَاوِلِینِیْ وَلَدِیَ الصَّغِیْرَ حَتّٰی اُوَدِّعَہٗ"

"بہن! میرے صغیر و دلگیر بیٹے کو لاؤ تاکہ میں اسے وداع کر لوں"۔

حضرتِ شریکۃ الحسین سلام اللہ علیہا نے پیاسے معصوم کو حسین علیہ السلام کے ہاتھوں میں دے کر کہا: ''اماں جائے! اصغر بہت پیاسا ہے، کئی دنوں سے پانی نہیں پیا۔ ماں دودھ پلانے سے معذور ہے، اس واسطے کچھ پانی کا انتظام کیجئے۔ اپنی زندگی میں اسے پانی پلا جایئے، بھائی! آپ کے بعد کون پانی پلائے گا؟''

اسی خیال سے کہ معصوم بچہ ہے، کسی مذہب وملت میں بچہ قصوروار نہیں سمجھا جاتا، فوجِ اشقیاء میں بھی صاحب اولاد ہیں، شاید کسی کو ترس آجائے، امام علیہ السلام نے مظلوم بچے کو ہاتھوں میں لیا لیکن سارے دن کا معمول بیبیوں کو معصوم کی موت کا تصور دلا رہا تھا۔ کس دل اور کس جگر سے معصوم کلی کو سوئے مقتل روانہ کیا ہوگا؟

دستور ہے کہ بچہ جب ماں سے جدا ہوتا ہے تو روتا ہے اور روتی ہوئی آنکھوں سے ماں کی طرف بار بار دیکھتا ہے۔ ماں نے خشک ہونٹوں اور مرجھائی ہوئی صورت کو چوما

جھک جھک کے جو فرزند کا منہ پاس سے دیکھا
ماں کو علی اصغر نے عجب یاس سے دیکھا

امام حسین علیہ السلام نے صغیر کو ہاتھوں پر اٹھایا، دیکھا کہ معصوم بچہ زبان کو منہ میں پیاس کی وجہ سے چبا رہا ہے۔

چھائی ہوئی زردی تھی جو دلبند کے منہ پر
شبیرؑ نے منہ رکھ دیا فرزند کے منہ پر

فرزندِ رسولؐ اپنے ننھے فرزند کو لے کر میدان میں آئے۔ کس لیے آئے؟ اُمتِ جد سے پانی مانگنے کیلئے آئے۔

آہ! ساقیِ کوثر کا فرزند، کریم ابن کریم، حُر کی فوج کو صحرائے بے آب میں پانی سے سیراب کرنے والے آج ایک بوند پانی کے لیے کمینوں سے سوال کرتے ہیں۔

حضرات! یہ مرحلہ بھی بہت دشوار اور جگر گداز ہوتا ہے۔ جب کوئی کریم سائل بن کر (لئیم) کمینے کے پاس آئے، بقراط سے کسی نے پوچھا: ''کوئی چیز موت سے زیادہ تلخ بھی ہے؟''

اس نے کہا: ''ہاں! ایک کریم کا لئیم (کمینے) کے سامنے سوال کرنا''۔

فرزندِ رسولؐ سے بڑھ کر اس زمانے میں کون کریم تھا اور ان اشقیاء سے بڑھ کر کون لئیم تھا؟ امام علیہ السلام، کریم بن کریم، بچہ اُٹھا کر اُمتِ جد کے سامنے آئے اور ان الفاظ میں سوال آب کیا:

''یَا قَوم قد قتلتم شِیْعَتِیْ وَ اَھْلَ بَیْتِیْ وَ قَدْ بَقِی ھٰذَا الطِّفْلُ وَیْلَکُمْ اِسْقُو ھٰذَا

الرَّضِیعَ اَمَا تَرَوْنَهٗ یَتَلَظّٰی عَطَشاً مِنْ غَیْرِ ذَنْبٍ"

"لوگو! تم نے میرے انصار و اہل بیت علیہم السلام کو توقتل کر دیا۔ اب ہمارے گھرانے میں یہی صغیر بچہ رہ گیا ہے۔ میرے گھر کا تم نے خاتمہ کر دیا۔ اب اس معصوم بچے پر تمہیں رحم نہیں آتا؟ اس شیر خوار کو تو پانی پلا دو"۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے معصوم چہرے سے چادر کا دامن ہٹایا۔ منہ فوج اشقیاء کی طرف کیا اور ساتھ ہی حضرت علی اصغرؑ سے فرمایا: "بیٹا! تو حجت خدا کا فرزند ہے۔ حجت تمام کر۔" معصوم بچے نے سوکھی ہوئی زبان ہونٹوں پر پھیری۔ یہ ایسا دردناک منظر اور رقت آمیز حالت تھی کہ سنگدل بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ واقعی بچہ تو بے قصور ہے اگر اسے پانی پلا دیا جائے تو کیا جرم ہے؟

فوج اشقیاء میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ بعض ظالم تو منہ پھیر کر رونے لگے۔ بعض صاحب اولاد شقیوں کے دل بھر آئے۔ آنکھوں سے دیکھا نہ گیا۔ غرض یہ کہ فوج ابن سعد کی کیفیت بدل گئی اور امام حسین علیہ السلام کے ننھے علی اصغرؑ نے فوج کوفہ میں ایک ایسا تاثر پیدا کر دیا کہ سنگدل بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

اس واقعہ کو جناب میر انیس مرحوم نے منظوم بیان کیا ہے:

کی آہ کسی نے کوئی منہ پھیر کے رویا — دامن کسی جلاد نے اشکوں سے بھگویا
ہر شخص کے اک تیر لگا قلب پہ گویا — بولا کوئی ایمان بھی گیا دین بھی کھویا
یوں پھول کوئی دھوپ سے مرجھا نہیں جاتا
بچے کا یہ عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

پسر سعد لعین نے فوج کی بدلی ہوئی حالت دیکھی تو فوراً حرملہ لعین کو پکارا اور کہا:

"اِقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنِ"

"حسینؑ کی بات ختم کر دو"۔ یعنی اس بچے کا کام تمام کر دو۔

واضح رہے کہ یہ حرملہ بن کاہل ملعون، کوفہ کا مشہور تیر انداز اور ماہر نشانہ باز تھا اور کربلا میں تیر اندازوں کی فوج کا افسر تھا۔ اسی شقی وخبیث نے حضرت عباس علیہ السلام کو بے آس کیا تھا۔ اسی ملعون کی تیر بارانی سے غازیؑ کا بدن چھلنی ہوا تھا اور اسی کے تیر سے غازیؑ کی مشک چھد گئی تھی اور پانی بہہ گیا تھا۔ اس زمانے میں اتنے بڑے اور نوکدار تیر بھی ہوتے تھے کہ ایک تیر سے بھی جوان آدمی کا کام تمام ہو سکتا تھا اور بعض اس قسم کے تیر تین نوکوں والے بھی تھے۔ کوفہ کے اسلحہ سازوں نے کچھ ایسے

ہتھیار خاص طور پر تیار کیئے تھے اور زہراؑ کا گھر برباد کرنے کے لیے نیزوں اور تیروں کی نوکیں خاص طور پر تیز کر لی گئی تھیں، کیونکہ جتنا ہتھیار تیز اور مضبوط ہوتا تھا، اسی قدر قیمت بھی زیادہ ملتی تھی۔

اس ملعون نے وہ تیر کمان میں رکھا جس کی لمبائی حضرت علی اصغرؑ کے قد سے بھی زیادہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس شقی کا ہاتھ بھی کانپا تھا۔

حرملہ نے کئی بار کماں کھینچ کے رکھ دی
دیکھا کبھی اصغر کو کبھی تیر کو دیکھا

ابن سعد کے حکم سے اس کمینے نے دل کو سخت کیا اور وہ تیر چڑھایا جس کی تین نوکیں تھیں، کیونکہ ابن سعد کا حکم تھا کہ بچہ زندہ واپس نہ جائے۔ معصوم بچہ حسین علیہ السلام کے ہاتھوں پر تھا۔ منہ قومِ اشقیاء کی جانب تھا کہ یہ تیر معصوم کی گردن میں پیوست ہو گیا۔

چونکہ تیر وزنی تھا، اس واسطے اس واسطے ایسا دھچکہ لگا کہ صغیر کا رخ باپ کے ہاتھوں پر بدل گیا:

"فَانْقَلَبَ الصَّغِیْرُ عَلٰی یَدَی اَبِیهِ".

"بچہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا۔"

بعض روایات میں ہے کہ تیر نے ایک کان سے دوسرے کان تک بچے کے حلقوم کو ذبح کر ڈالا۔ خون کا فوارہ باہر نکلا اور رُباب کا لعل باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر ماں کی آغوش ویران کر گیا۔

دستور ہے کہ ماں کا دل ہمیشہ چھوٹے بچے سے بہلتا ہے۔ کم سن بچیاں گود والے بچے سے بہت مانوس ہوتی ہیں۔ پردیس میں رُباب کی آنکھوں کا جو تارا اور دل کا سہارا تھا، وہ ٹوٹ گیا اور حضرتِ سکینہ بنت الحسین علیہم السلام کا بہلاوا جاتا رہا۔

امام علیہ السلام کے خزانے میں یہ آخری لعل تھا اور اسے بھی آپ نے بارگاہِ ایزدی میں پیش کر دیا۔

امام علیہ السلام کے دل پر کیا گزری ہوگی جب کریم کے سوال کا اس طرح جواب دیا گیا ہوگا؟

عزادارو! امام علیہ السلام کو لاش اٹھانے میں تو کوئی دشواری پیش نہ آئی کیونکہ چھ ماہ کا صغیر تھا، لیکن ایک مشکل ضرور سامنے آئی، جو جوانوں کی لاشیں اُٹھانے سے کم نہ تھی۔

آہ! کس دل سے مولاؑ نے معصوم کی گردن اور کانوں کے درمیان سے تیر کی نوکیں نکالی ہوں گی؟ جوان بدن سے ٹوٹا ہوا نیزہ نکالنا اتنا دشوار نہیں جتنا کہ معصوم بدن سے تیر کی نوکیں نکالنا دشوار ہے۔

مولائے مظلوم علیہ السلام نے جب تیر نکالا تو خون کی دھار نکلی، جو مولاؑ نے ہاتھوں پر لے لی۔ منہ آسمان کی طرف کر کے کہا:

''خدایا! میرے اور اس قوم کے درمیان فیصلہ کر۔ ان نابکاروں نے مدد کیلئے بلایا تھا، مگر میرا ابھرا گھر آج برباد کر دیا۔ خدایا! میرے پاس یہ آخری قربانی تھی، جسے میں نے تیرے حضور میں پیش کر دیا''۔

باقی لاشیں تو امام علیہ السلام خیام میں لے گئے، لیکن کسی مصلحت سے اس شیر خوار کی لاش کو شہداء بنی ہاشم کی لاشوں میں نہ رکھا۔ تلوار سے ایک چھوٹی سی قبر کھودی اور اس معصوم میت پر تنہا نماز جنازہ پڑھی۔

عزادارو! وہ شخص کس قدر غریب اور بیکس شمار کیا جاتا ہے کہ جس کے ساتھ دفن کرنے کیلئے قبرستان میں کوئی نہ جائے یا جس کے عزیز پر نماز جنازہ پڑھنے والے کم ہوں۔

حضرات! یہ نرالا شہید تھا، جس کی معصوم اور ننھی سی میت پر امام علیہ السلام نے نماز جنازہ پڑھی، پڑھائی نہیں۔ پڑھائی تو تب ہوتی جب کوئی پیچھے پڑھنے والا بھی ہوتا۔ مولاؑ کے تو تمام نمازی رخصت ہو گئے تھے، تنہا امام علیہ السلام باقی رہ گئے تھے اور تنہا مولاؑ نے رباب کے اس معصوم تارے کو قبر کے سپرد کر دیا۔ مٹی برابر کی، قبر بنائی اور دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''بارالہا! میرا گھر خالی ہو گیا ہے، اب میرے پاس مردوں میں کوئی باقی نہیں''۔

ننھی سی قبر کھود کے اصغرؑ کو گاڑ کے
شبیرؑ اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

سیّدالشُھداء علیہ السلام میدان میں
مخدراتِ عصمت سے پہلا وداع

انصار و اقرباء رخصت ہو چکے ہیں۔ اب پسر بتولؑ کی باری اور پدر سکینہؑ کی تیاری ہے۔ ہنگامِ عصر قریب ہے۔ غریب کربلا زندگی سے بے نیاز اور طائرِ عالم لاہوت، موت سے مانوس ہو چکا ہے۔ کئی روز کا بھوکا پیاسا، صدموں اور دکھوں کا آزمایا ہوا، اُمتِ جد کا بیحد ستایا ہوا، رات بھر کا جاگا ہوا، لاشیں اٹھا اٹھا کر دن بھر کا تھکا ہوا، اپنا عہد نبھانے کیلئے سوئے میدان جانے سے پہلے اہلِ حرم سے وداع کرتا ہے۔

شیعو! مظلومِ کربلاؑ کا بیواؤں اور بے سہاروں سے رخصت ہونا اور یتیموں اور بے آسرا بیبیوں کا حسین علیہ السلام کا دامن پکڑنا اور یہ کہنا کہ ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں؟ آپ تو جا رہے ہیں، ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا کون ہے؟ پھر مستورات کا سر پیٹنا اور یتیم بچوں کا درد بھری فریادیں کرنا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قیامت کی گھڑی تھی۔ حضرت سیّدالشہداء علیہ السلام کے خیام میں بے آسرا مستورات اور بے سہارا یتیموں سے رخصت بہت بڑی مصیبت ہے۔

جناب ثقۃ الاسلام محدث نوری قدس سرہٗ اپنی کتاب "دارالسلام" میں ایک مردِ صالح، فاضلِ جلیل، جناب میرزا یحییٰ البہری کا ایک خواب نقل کرتے ہیں۔

ایک عجیب و غریب خواب

وہ عالم و بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں عرفہ کے روز کربلا آیا اور شب دس ذوالحجہ حرمِ شریف سے رخصت ہو کر اپنے مقام پر آ کر سو گیا۔ عالم خواب میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص آواز دے رہا ہے کہ محمد باقر مجلسی صحن مقدس میں درس دے رہے ہیں۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ صحن مقدس کی کس جگہ پر درس دے رہے ہیں؟ تو اس نے اشارہ کرتے ہوئے جگہ کا پتہ بتایا، میں اُس جگہ پر گیا۔

میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی مسجد ہے اور اس میں خلقِ عظیم جو علماء و فضلاء پر مشتمل ہے، جمع ہے اور علماء تقریباً پانچ سو کے قریب جناب مجلسیؒ کے درس میں شریک ہیں اور جناب مجلسی منبر پر درس میں مشغول ہیں۔ درس سے فراغت کے بعد وہ وعظ میں مشغول ہوئے اور وعظ کے بعد حضرت سیّدالشہداء علیہ السلام کے مصائب بیان کرنے لگے۔

اسی اثناء میں ایک شخص حجرہ سے باہر نکلا اور جناب مجلسیؒ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

مادرِ حسینؑ فرماتی ہیں کہ مجلسی! میرے فرزند کے وداع کے واقعات بیان کرو کہ مستوراتِ ہاشمی اور یتیم و پیاسے بچوں سے میرا مظلوم بیٹا کس طرح رخصت ہوا"۔

جنابِ مجلسیؒ نے حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے خیام سے رخصت کے مصائب بیان کئے۔ اس قدر گریہ اور ماتم ہوا کہ زندگی میں ایسا گریہ و بکا نہ دیکھا تھا۔

قارئین! آیئے فرزندِ بتولؑ، چند لمحوں کے مہمان کی خیام سے رخصت کے حالات سنیئے۔ ہم "الدمعۃ الساکبہ" سے مصائبِ وداع بیان کرتے ہیں:

جب حضرت امام حسین علیہ السلام اکیلے و تنہا رہ گئے، اپنے بھائیوں کے خیمے میں آئے، جہاں اُمّ البنینؑ کے لعل کی قیام گاہ تھی، دیکھا کہ خیام خالی ہیں۔ شیر رخصت ہو گئے ہیں، ان بیواؤں اور یتیموں پر نظر پڑی، یہ روح فرسا منظر دیکھ کر دل بھر آیا۔ پھر آپؑ اولادِ حضرت عقیل علیہم السلام کے خیام میں گئے، یہی منظر تھا۔ اپنے بڑے بھائی حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کی اولاد کے خیام کی بھی یہی حالت اور یہی دردناک منظر اصحابِ باوفا کے خیام کا بھی تھا۔

جن خیام میں غریبِ کربلا جاتے، بیواؤں کی سسکیاں اور یتیموں کے نالے استقبال کرتے۔ دلبندِ رسولؐ کا دل بھر آیا اور اُجڑی ہوئی قیام گاہیں دیکھ کر فرزندِ فاطمہؑ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔ گویا ان لٹے ہوئے بستروں اور سُونی خوابگاہوں کو دیکھ کر جوانانِ بنی ہاشم آنکھوں کے سامنے آ گئے جو مدینہ سے ساتھ چلے تھے اور قافلے کو اپنی منزل پر پہنچایا۔

اس کے بعد مستورات کے خیام میں آئے۔ دیکھا کہ بنی ہاشم کی شہزادیاں گریاں کناں ہیں، سر کے بال پریشان ہیں، انہیں وارثوں اور عزیزوں کی شہادت کا اتنا صدمہ نہیں جتنی مستقبل کی فکر ستاتی ہے کہ اب ہمارا کیا ہوگا؟ وطن جانے کی آس ختم ہوئی، مرد کوئی نگہبان نہیں رہا، بے حیاء اور سنگدل ظالموں کے ہاتھوں ہمارا کیا حال ہوگا؟

ان خیام کے بعد اپنے فرزندِ اکبر، علیل پسر، امام زین العابدین علیہ السلام کے خیمے میں داخل ہوئے۔ چمڑے کے ایک بستر پر بیمار پسر کو لیٹے ہوئے دیکھا۔ پھوپھی بھتیجے کی تیمارداری کر رہی ہیں۔ تیمارداری کیا تھا، بیمار بھتیجے کا دل بہلا رہی تھیں۔ نہ دوا دارو، نہ غذا نہ پانی۔ حضرتِ سجاد علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی کو خیمے میں داخل ہوتے دیکھا تو اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن اُٹھ نہ سکے۔ نحیف آواز میں کہا:

"پھوپھی اماں! مجھے سہارا دیجئے تاکہ میں فرزندِ رسولؐ، پسرِ بتولؑ اور امامِ زمانہ کا احترام بجا لاؤں"۔

ضعف اور نقاہت کی وجہ سے کھڑے نہ ہو سکے۔ حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا نے سہارا دیا اور آپ اُمّ المصائب کے سہارے سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اس طرح حضرتِ امامِ سجاد علیہ السلام کی پشت کا سہارا بنتِ رسول سلام اللہ علیہا خود تھیں۔

مظلوم پدر نے بیمار پسر سے بیماری کا حال دیافت فرمایا۔ امام علیہ السلام نے حمد وثنائے باری تعالیٰ بیان کی۔ پھر بیمار پسر نے مظلوم پدر سے یومِ عاشور اور میدانِ کارزار کے حالات دریافت کیے۔ مظلوم آقا نے فرمایا:

''بیٹا! ان لوگوں پر شیطان نے غلبہ پالیا ہے۔ ان کی دنیا پرستی ان کے دین پر چھا گئی ہے۔ یہ لوگ حرصِ دنیا اور جاگیروں کے طمع میں خدا کو بھول گئے ہیں۔ بیٹا! تمام دن میدانِ کارزار گرم رہا۔ زور کا معرکہ جاری رہا۔ زمین کربلا خون سے لالہ زار بن گئی''۔

اسی اثناء میں حضرتِ امامِ سجاد علیہ السلام کے چہرے پر جلال کے آثار نمودار ہوئے اور پوچھا: ''بابا جان! چچا عباسؑ کہاں ہیں؟''

عباسؑ کا نام آنا تھا کہ دخترِ علیؑ کا دل بھر آیا۔ بھائی کی طرف دیکھا کہ کس طرح جواب دیتے ہیں!

امام علیہ السلام نے ڈبڈبائی ہوئی آواز میں بتایا: ''بیٹا! آپ کے چچا عباسؑ شہید ہو گئے۔ ان کے دونوں بازو معرکہ قتال میں کام آئے''۔

حضرتِ عباس علیہ السلام کی شہادت کی خبر سننا تھی کہ امام علیہ السلام غشی کی حالت میں چلے گئے۔ جب غش سے افاقہ ہوا تو ہر ایک جوانِ بنی ہاشم کے بارے میں دریافت فرمایا۔ اکبرؑ و قاسمؑ، عونؑ و محمدؑ کے بارے میں پوچھا۔

فرمایا: ''بیٹا! وہ سب شہید ہو گئے''۔

غرض یہ کہ امامِ زین العابدین علیہ السلام ہر ایک کے متعلق دریافت فرماتے، امامِ مظلوم جواب دیتے ''قُتِلَ''۔

امام زین العابدین علیہ السلام نام لیتے، حسین مظلوم علیہ السلام فرماتے:

''قُتِلَ قُتِلَ''۔

آخر میں امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: ''بیٹا سجادؑ! سوائے آپ کے اور میرے کوئی باقی نہیں بچا۔ بیٹا! جن کے متعلق آپ نے دریافت کیا ہے وہ سب خاک و خون میں غلطاں اپنے عہد وفا کر کے ریگِ کربلا پر مقتول پڑے ہیں''۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے بدن میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا، چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، بے تابی سے پھوپھی زینب سلام اللہ علیہا سے کہا: ''پھوپھی اماں! آپ مجھے عصاء اور تلوار دے دیں''۔

امامِ مظلوم علیہ السلام نے فرمایا:

''بیٹا! عصاء اور تلوار لے کر کیا کرو گے؟'' عرض کی: ''بابا جان! عصاء کا سہارا لوں گا اور تلوار سے جہاد کروں گا۔ دین کی حمایت، آپ کی نصرت اور مستورات کی حفاظت کروں گا۔ فرزندِ رسولؐ کے بعد زندگی میں کیا بھلائی رہ گئی ہے؟''

اس وقت میرے مولاؑ نے بیمار فرزند کو گلے لگالیا اور فرمایا:

''بیٹا! تیرا جہاد تلوار سے نہیں، تیرا جہاد میدانِ کربلا میں نہیں، تیرا جہاد شام کی راہوں اور دشوار گزرگاہوں، کوفہ و دمشق کے بازاروں اور ابن زیاد و یزید کے درباروں میں تقریروں اور خطبوں سے ہوگا۔ اب میرے بعد تو امام ہے۔ میرا خلیفہ ہے اور حجتِ خدا ہے۔ تو بھی اگر میدان میں جائے تو ان بے وارث بیواؤں اور بے سہارا یتیموں کا کون محافظ ہوگا؟ میرے بعد میرے نانا کی مقدس امانتیں آپ کے سپرد ہیں اور بحرِ غم میں مبتلا مسافر، کشتی کے اس مظلوم اور بیکس پور کے آپ ملاح ہیں۔ بیٹا! اضطراب کے وقت انہیں تسلی دینا۔ یہ آپ سے اور آپ ان سے تسلی حاصل کریں گے''۔

اسرارِ امامت اور مواریث انبیاء کی سپردگی

اسرار و امانات امامت دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض وہ جنہیں امام خود اپنے جانشین ولائے حق امام کے سپرد کرتا ہے اور خود موجود ہو کر اسرار و مواریث سپرد کرتا ہے، جس طرح امام موسیٰ کاظم علیہ السلام زندانِ بغداد سے باعجازِ امامت خود مدینہ جا کر اپنے فرزند حضرتِ امام علی رضا علیہ السلام کے سپرد یہ امانات و مواریث کر کے آئے، یہ تحویل بلاواسطہ ہوتی ہے۔ بعض امانات اور تبرکات بالواسطہ بھی منتقل ہوتے ہیں۔

کتبِ تواریخ میں مرقوم ہے کہ اسم اعظم و دیگر مواریث انبیاء امامِ مظلوم نے بوقتِ وداع حضرتِ علی زین العابدین علیہ السلام کے سپرد کر دیئے تھے اور جو خیموں میں مستورات و یتامیٰ موجود تھے، ان سب کو بلا کر بلند آواز سے فرمایا:

''میرا بیٹا علی زین العابدین تم پر خلیفہ ہے اور میرے بعد امامِ وقت ہے، جس کی اطاعت تم پر فرض ہے۔ اس کی اطاعت کرنا، یہ میرے بعد حجتِ خدا ہے''۔

بعض امانتیں، تبرکات، صحیفے اور سلاح، مدینے سے روانگی کے وقت حضرتِ امّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کیے تھے کہ امامِ زین العابدین علیہ السلام کی واپسی پر ان کے سپرد کر دیں اور امامِ زین العابدین علیہ السلام کو حضرتِ امّ سلمہؓ کے پاس ان تبرکات و امانات کے متعلق مطلع کر دیا تھا۔

بعض اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض تبرکات اور امانات امام علیہ السلام نے حضرتِ فاطمہ کبریٰ سلام اللہ علیہا کے سپرد کئے تھے اور بعض روایات بتاتی ہیں کہ یہ تبرکات عقیلہ بنی ہاشم، حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی وساطت سے امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچے تھے۔

اس وقت ایک خاص دعا بھی آپؑ نے امام اور وارث پسر کو آخری وقت پر تعلیم کی تھی، جس کی اہمیت کے پیش نظر ہم قارئین کو اس سے مستفید کرتے ہیں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِحَقِّ یٰسٓ وَ الۡقُرۡآنِ الۡحَکِیۡمِ وَ بِحَقِّ طٰهٰ وَ الۡقُرۡآنِ الۡعَظِیۡمِ یَا مَنۡ یَّقۡدِرُ عَلٰی حَوَائِجِ السَّائِلِیۡنَ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الضَّمِیۡرِ یَا مُنَفِّسُ عَنِ الۡمَکۡرُوۡبِیۡنَ یَا مُفَرِّجُ یَحتاجُ اِلَی التَّفۡسِیۡرِ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ وَّ افۡعَلۡ بِیۡ کذا و کذا.

(کذا کذا کی جگہ اپنی حاجات کا ذکر کرے)۔

(اس جگہ ایک اور دعا کا ذکر بھی مورخین نے کیا ہے جو مفاتیح الجنان اور مصباح کفعمی وغیرہ کتب ادعیہ میں مذکور ہے۔ہم نے اختصار کی خاطر نقل نہیں کی۔ خواہش مند حضرات کتب ادعیہ کی طرف رجوع کریں)۔

مصیبت زدہ بیبیوں اور لاوارث یتیموں سے وداع

لو بیبیو! شبیرؑ جہاں سے سفری ہے
اب فاطمہؑ کا لعل چراغِ سحری ہے

"یَا اُخۡتَاه ایتِنِیۡ بِثَوۡبٍ عَتِیۡقٍ لَا یَرۡغَبُ فِیۡهِ اَحَدٌ مِّنَ الۡقَوۡمِ اَجۡعَلُهٗ تَحۡتَ ثِیَابِیۡ لِئَلَّا اُجَرَّدَ مِنۡهُ بَعۡدَ قَتۡلِیۡ فَاِنِّیۡ مَقۡتُوۡلٌ مَّسۡلُوۡبٌ".

''بہن! مجھے ایسا پرانا کپڑا لا دو، جس کی طرف پرانا اور بے قیمت ہونے کی وجہ سے کوئی رغبت نہ کرے۔ میں اسے ان کپڑوں کے نیچے پہنوں گا کہ میری شہادت کے بعد بدن عریاں نہ ہو جائے، کیونکہ مقتول ہونے کے بعد میرے بدن سے یہ بے حیاء اُمت اور جفاشعار لوگ لباس اُتار لیں گے''۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے حسب خواہش پرانا لباس دیا اور پھر غریب کربلا نے مزید پھاڑ کر اسے پوشاک کے نیچے پہن لیا۔ اس پوشاک پر آپؑ نے حضرتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اوڑھی۔ جبہ مبارک ایک قیمتی کپڑے کا تھا،

جس کا رنگ سیاہی مائل تھا تن انور پر پہنا اور گلابی رنگ کا عمامہ سر اقدس پر رکھا۔ جناب رسولؐ خدا کی زرہ جس کا نام "فاضل" تھا، بدن پر سجائی، تلوار حمائل کی، آخری نگاہ عیال و اقرباء پر ڈالی اور کہا:

"یَا زینبُ یا اُمّ کلثُوم یا فاطمة یا رباب یاسکینه علیکن منّی السّلام".

'یا زینبؑ، یا اُمّ کلثومؑ، یا فاطمہؑ، یا ربابؑ، یا سکینہؑ! تم سب پر میرا آخری سلام ہو'

یہ کہنا تھا کہ خیام سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ الوداع، الوداع، الفراق، الفراق کی صدائیں مظلوم سیدانیوں اور معصوم یتیموں کی زبانوں پر تھیں۔ تمام بیبیاں امام علیہ السلام کے آس پاس حلقہ کیے ہوئے تھیں۔ درمیان میں امام علیہ السلام تھے۔ ہر بی بی کے ہاتھ میں امام علیہ السلام کا دامن تھا، کوئی بی بی بھائی کہہ کر پکارتی تھی، کوئی ماموں کہتی تھی، کوئی چچا، کوئی بابا۔ ایسے دلخراش بین تھے کہ پہاڑ بھی یہ فریادیں سن کر پگھل جاتے، کیونکہ ان دکھی اور دردستائیوں کا آخری سہارا ٹوٹ رہا تھا۔

ہاں! اس وقت مولائے مظلوم علیہ السلام سے ایک بات کہتا ہوں کہ مولاؑ! جب مکہ سے روانہ ہوتے وقت عبداللہ بن عباسؓ نے گزارش کی تھی کہ اگر آپ کو عراق جانا ہی ہے تو پردہ داروں اور معصوم بچوں کو ہمراہ نہ لے جائیں، تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ رسولؐ اللہ کی امانتیں ہیں، ان کو کس کے سپرد کردوں؟ یہ بھی مجھ سے جدا ہونا گوارا نہ کریں گی۔ مولاؑ! اب کیا مجبوری بن گئی ہے کہ ان امانتوں سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو رہے ہیں؟ ان امانتوں کو کس کے سپرد کر کے جا رہے ہیں؟

دخترِ رسولؐ! آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا تھا کہ میں حسینؑ سے جدا نہ ہوں گی، جہاں میرا بھائی جائے گا، بہن ساتھ جائے گی۔ ہاں! اُمّ المصائب اب کس دل سے ماں جائے کو موت کے میدان میں بھیج رہی ہیں؟

عزادارو! خدا شاہد ہے، بڑا دردناک منظر اور روح فرسا نظارہ تھا۔ یتیم بچے کھلے سروں اور خشک لبوں کے ساتھ دُہائی دے رہے تھے اور بے آسرا و بے وارث بیبیاں الگ سر پیٹ رہی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت لیلیٰؑ کو اکبرؑ کی موت بھول چکی تھی، رملہ کو قاسمؑ یاد نہ رہا اور زینبؑ کو عونؑ و محمدؑ یاد نہ تھے۔ سب بیبیاں فرزندِ رسولؐ کے فراق میں اپنا سر پیٹ رہی تھیں۔

اتنے میں حضرتِ سکینہؑ نے آگے بڑھ کر کہا:

'یَا اَبَتِ اِسْتَسْلَمْتَ لِلْمَوْتِ؟ فَاِلٰی مَنْ اِتَّكَلْتَنَا؟'

"بابا جان! آپ موت کی تیاری کر رہے ہیں تو ہمیں کس کے سپرد کر کے جا رہے ہیں؟"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"كَیْفَ لَا یَسْتَسْلِمُ لِلْمَوْتِ مَنْ لَا نَاصِرَ لَهٗ وَ لَا مُعِیْنَ".

"بیٹی! جس کا کوئی ناصر و مددگار نہ رہے تو وہ موت کو کس طرح قبول نہ کرے؟"

اس کے بعد جناب سکینہؑ نے عرض کی:

"رُدَّنَا اِلٰی حَرَمِ جَدِّنَا"

"بابا جان! ہمیں جدامجد کے حرم، مدینہ میں ہی پہنچادیں"۔

بیٹی کی یہ دل فگار فریاد سن کر مظلوم و غریب باپؑ بے چین ہوگیا، سینے سے لگا کر ان الفاظ سے پیاری بیٹی کو تسلی دی:

"سَیَطُول بعدِی یَا سَکِیْنَۃُ فَاعْلَمِی، مِنْکِ الْبُکَاءُ اِذَا الْحِمَامُ دَھَانِیْ"۔

"سکینہؑ بیٹی! میرے بعد تیرے رونے کی مدت طویل ہوگی، تو بہت روئے گی، جب موت مجھے آلے گی، تیرے رونے کے بہت مواقع آئیں گے"۔

"لَا یُحرِقِیْ قَلْبِیْ بَدَمْعِکِ حَسْرَۃً، مَادَامَ مِنِّیْ الرُّوْحُ فِیْ جُثْمَانِی"۔

"بیٹی! اب تیرا حسرت سے رونا میرا دل جلا رہا ہے، جب تک میں زندہ ہوں، اس وقت اس انداز سے گریہ نہ کرو، میرا جگر پھٹا اور دل پگھلا جارہا ہے"۔

"فَاِذَا قُتِلْتُ فَاَنْتِ اَولٰی بِالَّذِیْ، تَاتِیْنَہٗ یَا خَیْرَۃِ النِّسْوَانِ"۔

"جب میں قتل کردیا جاؤں تو اے بہترین دختر! تجھے میری لاش پر رونے کا حق سب سے زیادہ ہے"۔

اس کے بعد تمام بیبیوں کو صبر کی تلقین کی، تسلی دی اور خیمہ سے باہر نکل کر اس طرح آئے جس طرح شاعر نے کہا ہے:

شبیرؑ برآمد ہوئے یوں خیمہ کے در سے
جس طرح نکلتا ہے جنازہ کسی گھر سے

حضرتِ سیدالشُّھداء علیہ السلام میدان میں

حضرت سیدالشہداء، حضرت امام حسین علیہ السلام اسلحہ جنگ زیب تن فرما کر میدانِ قتال میں آئے، عمر بن سعد کو بلا کر فرمایا:

"جس طرح ابتدائے جنگ میں تین باتوں میں سے ایک قبول کرلینے کیلئے میں نے تمہیں کہا تھا، اب انتہائے جنگ پر بھی ان باتوں میں سے کسی ایک کو ماننے کے لیے کہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے واپس مدینہ جانے دو تاکہ میں جدامجد

رسولؐ اللہ کے حرمِ مبارک میں جا بیٹھوں"۔

عمر بن سعد نے کہا: "ایسا تو نہیں ہو سکتا"۔

آپؑ نے فرمایا: "مجھے تھوڑا سا پانی دے تاکہ کلیجہ کی حرارت بجھا سکوں"۔

عمر بن سعد نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

مولاؑ نے تیسری بات یہ فرمائی: "اگر تم نے مجھے قتل ہی کرنا ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ سوائے میرے اور کوئی باقی نہیں، تو تم میں سے ایک ایک آدمی نکل کر میرے مقابلے کیلئے آئے اور اسی طرح لڑائی ہو"۔

ابن سعد نے یہ بات منظور کر لی۔

آپؑ آمادۂ جنگ ہو کر دشمن کی صفوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور یہ رجزیہ اشعار پڑھے:

اَنَا بْنُ عَلِی الْمُطَھَّر مِنْ آلِ ھَاشِم
کَفَانِی بِھٰذَا مَفْخَراً حِیْنَ اَفْخَرُ

"میں طاہر و مطہر علیؑ کا فرزند ہوں جو آلِ ہاشم سے ہیں۔ جب میں فخر کرنے لگوں تو میرے لئے یہی کافی ہے"۔

وَ جَدِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَکْرَمُ مَنْ مَشٰی
وَ نَحْنُ سِرَاجُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ یزھر

"میرے جدِ امجد رسولؐ اللہ ہیں، جو سب لوگوں سے بزرگ ہیں اور ہم زمین پر اللہ کے روشن چراغ ہیں۔"

وَ فَاطِمَۃُ اُمِّیْ مِنْ سُلَالَۃِ اَحْمَد
وَ فِیْنَا الْھُدیٰ وَ الْوَحِیُ بِالْخَیْرِ یُذْکَرُ

"اور حضرت فاطمہؑ بنتِ مصطفےٰؐ میری مادر ہیں اور ہم ہدایت اور نزولِ وحی کے احکام ہیں، جن کا خیر کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے"۔

وَ نَحْنُ اَمَانُ اللّٰہِ لِلنَّاسِ کُلِّھِمْ
وَ نُسِرُّ بِھٰذَا فِی الْاَنَامِ وَ نَجْھَر

"ہم سب لوگوں کیلئے باعثِ امان ہیں، ظاہری اور باطنی طور پر لوگوں کو معلوم ہے"۔

وَ نَحْنُ وُلَاةُ الْحَوْضِ نَسْقِيْ مُحِبَّنَا
بِكَاسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَنْ لَيْسَ يُنْكَرُ

"ہم حوضِ کوثر کے مالک ہیں، اپنے محبوں کو رسولؐ اللہ کے ساغر سے سیراب کریں گے"۔

اِذَا مَا اَتٰی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ظَامِئاً
اِلَی الْحَوْضِ یَسْقِیْهِ بِكَفَّیْهِ حَیْدَرٌ

"جب روزِ قیامت ہمارا محب حوضِ کوثر پر پیاسا وارد ہوگا تو میرے بابا حیدرِ کرارؑ اس کو اپنے ہاتھوں سے سیراب کریں گے"۔

اِمَامٌ مُطَاعٌ وَ حَبَ اللّٰه حَقَّهُ
عَلَی النَّاسِ جَمْعاً وَالَّذِیْ كَانَ یَنْظُرُ

"وہ امام واجب اطاعت ہیں، تمام لوگوں پر خدا نے ان کا حق واجب قرار دیا ہے اور ہر اس شخص پر جو دیکھے اور سمجھے"۔

وَ شِیْعَتُنَا فِی النَّاسِ اَكْرَمُ شِیْعَةٍ
وَ مُبْغِضُنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ یَخْسِرُ

"ہمارے شیعہ تمام لوگوں میں سے ہر گروہ سے افضل ہیں اور ہمارا دشمن روزِ قیامت گھاٹے میں رہے گا"۔

فَطُوْبٰی لِعَبْدٍ زَارَنَا بَعْدَ مَوْتِنَا
بِجَنَّةِ عَدْنٍ صَفْوُهَا لَا یُكْدِرُ

"اُس شخص کیلئے مبارک ہو جس نے ہماری شہادت کے بعد ہمارے روضہ پر ہماری زیارت کی اور جنت کی راحت و نعمتیں ہیں، جن میں کبھی رنج و غم نہ ہوگا"۔

شجاعتِ حسینیہ

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اتمامِ حجت کے لیے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اشقیاء کو پند و نصیحت کی۔ مگر ہزاروں کی جمعیت میں کسی مردود نے کوئی اثر نہ لیا اور جواب نہ دیا۔ آپؑ نے فرمایا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! جو میرا منصب تھا ادا کر چکا۔ اب تمہاری کوئی حجت مجھ پر باقی نہیں ہے"۔

اس کے بعد آپؑ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے یہ دعا کی:

"اَللّٰھُمَّ اَنْتَ ثِقَتِیْ فِیْ کُرْبَۃٍ وَ عُدَّتِیْ فِیْ شِدَّۃٍ وَّ قوتی فِیْ شامۃٍ وَّ رَجَائِیْ فِیْ کُلِّ حَالَۃٍ اَنْتَ وَلِیِّ وَدَلِیُّ مَا اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ مُنْتَھٰی کُلِّ غَایَۃٍ فَاکْفِنِیْ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ".

"خدایا! تو ہی ہر مصیبت میں میرا بھروسہ اور ہر شدت میں میرا سہارا ہے۔ ہر آفت میں وقوت اور ہر حالت میں میری اُمید ہے۔ تو میرا اور ان تمام نعمتوں کا جو تو نے مجھے عطا فرمائی ہیں، مالک ہے اور ہر حاجت و آرزو کی انتہاء تیری ہی طرف ہے۔ اے ارحم الراحمین میری کفایت کر"۔

اب معرکہ قتال شروع ہوا اور حیدر کرارؑ کے فرزند نے ہاشمی شجاعت کے جی بھر کر جوہر دکھائے، لیکن آپؑ کی شجاعت و دلیری کے واقعات بیان کرنے سے پہلے آپؑ کے مظلومانہ حالات و اسبابِ بیکسی و غربت اور اسبابِ ضعف و نقاہت کو قلمبند کرتے ہیں تاکہ آپؑ کے اسبابِ ضعف و نقاہت سے مطلع ہو کر آپؑ کی بہادری، حوصلہ مندی اور دلیری کی جی بھر کر داد دے سکیں۔

غریب الوطن، سامانِ خورد و نوش کا فقدان، کئی روز سے بھوکے و پیاسے، بے آرامی و کئی شب و روز سے متواتر بے چینی اور بیقراری، جو بہادروں کے اعصاب کو مضمحل کر دیتی ہے۔

دشمنانِ دین اور سنگدل مخالفین کی طعن و تشنیع۔ دوستوں، محبوں اور ساتھیوں کا بیدردی سے قتل ہو جانے کا غم۔ بیٹوں، بھتیجوں، بھانجوں اور بھائیوں کے ظلم و جور سے شہید ہو جانے کا صدمہ۔ لاشوں کے اٹھانے، ان پر رونے اور ان لاشوں سے دشمنوں کو دُور کرنے کیلئے لڑائی کا تھکاوٹ اور زخموں کا اثر نیز بھرے گھر کی بربادی۔ حضرت ابو طالب علیہ السلام کے سارے خاندان کی تباہی و دردناک منظر کو خود آنکھوں سے دیکھنا اور لاشوں کا بے گور و کفن، خاک پر بکھرا ہوا ہونا اور آنکھوں کے سامنے ہونا۔

مستورات ہاشمیہ جو اپنے شہر کے ایک محلّہ سے بھی کبھی باہر نہ نکلتی تھیں، جو خود اپنے شہر کی گلیوں سے ناواقف تھیں، ان کا بے وارث اور یتیم بچوں کا بے سہارا رہ جانے کا غم و فکر۔ بے حیاء اور کمینے دشمنوں کے ماحول میں رسولؐ و علیؑ و بتولؑ کی بیٹیوں کا گھر جانا اور ان کے مستقبل کے بارے میں تشویش۔

یہ ایسے اسباب ہیں جو پہاڑ کی طاقت کو زائل اور لوہے کے پہاڑوں کو پگھلا دینے والے ہیں۔ شبیرؑ کے ظاہری زخم کیا

کم تھے کہ روحانی زخم بہت زیادہ گہرے تھے۔ مذکورہ مصائب میں سے ہر مصیبت قوی سے قوی انسان کو مفلوج اور طاقتور و بہادر کے اعصاب شل کر دینے کے لیے کافی ہے، مگر ان تمام مصائب کے اجتماع کے باوجود فرزندِ حیدرِ کرار علیہم السلام نے جو دفاعی جنگ لڑی ہے، اس کے سامنے بڑے بڑے بہادروں کے سرمایۂ افتخار کارنامے اور خیبر و خندق، بدر و حنین کے معرکے ہیچ ہیں۔

اب ہم بنو ہاشم کے چشم و چراغ، بطالتِ مطلبی، شجاعتِ ہاشمی اور زورِ حیدری کے وارث کے جنگی کارنامے سپردِ قرطاس کرتے ہیں:

چونکہ باہمی معاہدہ کی رو سے یہ قرار پاچکا تھا کہ ایک ایک شخص امام علیہ السلام کے مقابلے کے لیے نکلے گا، سب سے پہلا شخص ''تمیم بن قحطبہ'' نہایت ہوشیاری سے امام علیہ السلام پر حملہ آور ہوا، جو دم کے دم میں قتل ہو کر زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کے بعد دوسرا شخص آیا اور ایک ہی لحظہ میں زمین پر تڑپنے لگا۔ تیسرا آیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واصلِ جہنم ہو گیا۔ کیفیت یہ تھی کہ معاہدہ کی رو سے فوجِ اشقیاء اپنے بہادروں کو میدانِ قتال میں پیش کرتی رہی اور حیدرِ کرار کا فرزند انہیں دم بھر میں ہلاک کرتا رہا۔ اس طرح پسر سعد کی جمعیت اتنی ہلاک ہو گئی کہ اسے اپنا معاہدہ توڑنا پڑا اور مبارزہ طلبی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

عمر بن سعد کو اپنے ہزاروں پر مشتمل لشکر میں کافی خلا محسوس ہونے لگا۔ اس نے بلند آواز سے چلّا کر کہا: ''اس طرح اگر سلسلہ قتال جاری رہا تو ساری فوج لقمۂ اجل بن جائے گی اور ہماری کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گی''۔

''فَاحْمِلُوْا عَلَيْهِ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ''.

''تم ہر طرف سے اس پر حملہ کر دو''۔

پھر کیا تھا؟ چاروں طرف سے اس ایک دلیر پر رسالے کے رسالے، فوجوں کی فوجیں اور دستوں کے دستے ٹوٹ پڑے۔ تلواریں فضاء میں چمکنے لگیں، نیزے ہوا میں لہرانے لگے، تیر کمانوں میں جڑ گئے اور پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ لیکن اس شجاعت کے کوہِ گراں کی ہمت و دلاوری میں سرِ مُو فرق نہ آیا۔ گھوڑے پر جم کے بیٹھ گئے اور یہ رجز پڑھ کر دشمنوں کی صفوں میں اس طرح گھس آئے جس طرح غضبناک شیر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ میں داخل ہو جائے۔

اَلْمَوْتُ اَوْلٰى مِنْ رُكُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ اَوْلٰى مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

''موت عار سے بہتر ہے اور عار آگ میں داخل ہونے سے بہتر ہے''۔

پھر لشکرِ ستم شعار کے دائیں حصے پر حملہ کیا اور تیغ شعلہ بار نے ناریوں کے سر جسموں سے جدا کرنا شروع کر دیے۔ سوار

گھوڑوں سے اور سر دھڑوں سے گرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے بجلی گر رہی ہے جو اشقیاء کے خرمن کو جلا رہی ہے۔ بادِ صرصر کے جھونکے ہیں جو عذاب بن کر بے دینوں کو بھسم کر رہے ہیں۔ پھر میسرہ پر یہ رجز پڑھتے ہوئے حملہ کیا:

اَنَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيّ

اَلَيْتُ ان لَّا اَنْثَنِیْ

اَحْمِیْ عَيَالاتِ اَبِیْ

اَمْضِیْ عَلٰی دِيْنِ النَّبِیّ

"میں حسینؑ فرزندِ علیؑ ہوں، میں نے قسم کھائی ہے کہ اپنے مقصد سے نہ پھروں گا، اپنے والدِ بزرگوار کے کنبے کی حفاظت کروں گا اور اپنے نانا نبیؐ کے دین پر قائم رہ کر دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا"

ان صفوں کو پراگندہ کیا جو حملہ آور تھیں اور رسالوں اور پیادوں میں یوں ہلچل مچ گئی کہ ایک دوسرے پر گرتے اور بھاگتے جاتے تھے۔ ان بزدلوں، کمینوں کو اس طرح ہنکاتے تھے کہ جس طرح ریوڑ کو آگے آگے ہنکایا جاتا ہے۔ ان بے دینوں کے خون سے زمین لالہ زار بن گئی تھی اور اشقیاء کے ناپاک خون کی ندیاں ارضِ کربلا پر بہہ رہی تھیں۔

اس حملہ میں کوفیوں اور شامیوں کے ایک ہزار نو سو پچاس مردودوں کو فی النار کیا اور زخمیوں کی تعداد الگ تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بشریتِ حسینؑ میں قوتِ ربانی کارفرما تھی۔ یہ ہمت و دلیری آپؑ کی امامت کی تصدیق کا معجزہ تھا۔ جسمانی نقاہت کے ساتھ روحانی طاقت پُر زور تھی۔ ہیئتِ حسینیہ میں ہیئتِ الٰہیہ کارفرما تھی۔ فرزندِ بتولؑ کو اپنی حقانیت پر ناز تھا۔ یہ کارنامہ آپؑ کی امامت کا اعجاز اور صداقت کا راز تھا۔ واقعہ کربلا سے پہلے شجاعتِ امیر المومنین علیہ السلام کے فسانے زبانِ زدِ خلائق تھے لیکن روزِ عاشور کو غریبِ کربلا کی بہادری اور دلیری نے لوگوں کو حیدری کارناموں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ محفلوں اور اجتماعات میں حسینی شجاعت بطور ضرب المثل بیان کی جاتی۔

جناب علی بن عیسیٰ "کشف الغمہ" میں بیان کرتے ہیں کہ حسینیؑ شجاعت اور حسینی صبر کی نظیر نہ پہلے لوگوں میں ہے اور نہ ہی پچھلے لوگ پیش کر سکیں گے۔ عزم کے پہاڑ تھے، جسے ظلم و ستم کی تیز آندھیاں متحرک نہ کر سکیں۔

رنگ اُڑ گیا حکومتِ بدعت شعار کا

عزمِ حسینؑ عزم تھا پروردگار کا

تیس ہزار کا لشکر ہر قسم کے ہتھیاروں سے آراستہ تنہا پسرِ حیدر علیہم السلام کے مقابلے سے عاجز آ گیا۔

دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیداد گروں کی

تھی مینہ کی طرح خاک پہ بوچھاڑ سروں کی

اگر دونوں طرف سے مقتولین کی تعداد گنی جائے اور مقتولین کی تعداد پر فتح و شکست کی بنیاد رکھی جائے تو بے شک فتح غریب کربلا اور مسافر نینوئی، امام ہدیٰ کی ہی ہے۔ بیشک امامِ مظلوم علیہ السلام کی جمعیت ساری کی ساری شہید ہو گئی مگر فوج اشقیاء اور سپاہِ بے حیاء کے مقتولین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کوفہ میں کسی دشمن کا گھر اور کسی مخالف کا صحن ایسا نہ تھا کہ جہاں اس کے مقتول پر رونے کی آواز بلند نہ ہوتی ہو۔ کوفہ کی ہر گلی میں ناریوں کے ورثاء کے رونے کی صدائیں آتی تھیں اور بے دینوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔

حمید بن مسلم یا عبداللہ بن عمار کا بیان ہے:

"وَاللّٰهِ مَا رَاَيْتُ مكثورًا قَطُّ قَدْ قُتِلَ وُلْدَهُ وَ اَهْلُ بَيْتِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَرْبَطَ جَاشًا مِنْهُ عَلَيْهِ السَّلَام وَ اِنْ كَانَتِ الرِّجَالَةُ لَتَشُدُّ عَلَيْهِ فَشَدَّ عَلَيْهَا فَيَشُدُّ عَلَيْهَا بِسَفِهٖ فَتَنْكَشِفُ عَنْهُ اِنْكِشَافَ الْمِعْزىٰ اِذَا شَدَّ فِيْهَا الذِّئْبُ وَ لَقَدْ كَانَ يَحْمِلُ عَلَيْهِمْ وَ قَدْ تَكَمَّلُوا ثَلٰثِيْنَ اَلْفًا فَيَنْهَزِمُوْنَ بَيْنَ يَدَيْهِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى مَرْكَزِهٖ وَ يَقُوْلُ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ".

"حمید بن مسلم یا عبداللہ بن عمار کہتا ہے کہ میں نے کسی ایسے تنہا شخص کو نرغۂ اعداء میں گھرے ہوئے نہیں دیکھا جس کی اولاد، بھائی، اہل بیت، سارا کنبہ اور انصار سب قتل ہو چکے ہوں۔ ایسا مضبوط دل اور باہمت، مثل حسینؑ کے نہیں دیکھا۔ وہ بے دھڑک پیش قدمی کرتے، پیادوں کی صفیں جب ان پر ٹوٹ پڑتیں تو آپ اس انداز سے لڑتے کہ دائیں بائیں سپاہِ ابن سعد اس طرح بھاگتی نظر آتی کہ جس طرح ریوڑ میں شیر گھس آنے سے بھیڑیں بکریاں بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔ حالانکہ مخالف لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی۔ جب امام علیہ السلام ان پر تابڑ توڑ حملہ کرتے تو بزدلوں کی یہ فوج آپ کے سامنے یوں درہم برہم نظر آتی جس طرح پراگندہ ٹڈیاں ہوں۔ امام علیہ السلام حملہ کے بعد "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" پڑھتے اور اپنے مرکز کی طرف واپس آ جاتے۔

شمر ملعون کا خیام پر حملہ کرنے کا ارادہ

دورانِ جنگ بھی امام علیہ السلام کو مستورات اور اہل حرم کی فکر دامن گیر رہی۔ جبھی حملہ کر کے واپس مرکز کی طرف لوٹتے ،سوئے حرم نظر کرتے۔ اس کا اندیشہ امامؑ کو ہر وقت رہتا کہ کمینے اور بے حیاء دشمن خیام کی طرف بڑھ کر حملہ نہ کر دیں۔

چنانچہ شمر ملعون اپنی فطری کمینگی اور پیدائشی بدذاتی سے باز نہ آیا اور ایک دستۂ فوج کا لے کر جانب خیام بڑھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ خیام پر حملہ کر کے مخدراتِ عصمت وطہارت کو لوٹ لیا جائے اور پھر خیام کو آگ لگا دی جائے۔ اس ناپاک اور مذموم نیت سے وہ امام علیہ السلام اور خیام کے درمیان سپاہ لے کر حائل ہو گیا۔

ان بدفطرت لوگوں نے پہلے بھی کئی بار خیام پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر اصحابِ حسینؑ اور جوانانِ بنی ہاشم نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا اور تا حیات ان کو خیام کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔

اب امام علیہ السلام تنہا تھے اور صرف اکیلے ہی میدان میں مصروفِ قتال تھے۔ جونہی امامؑ کو اشقیاء کے مذموم ارادے اور ناپاک مقصد کی خبر ہوئی اور بے حیاؤں کو خیام کی طرف بڑھتے دیکھا، تو راہوار کی باگ کو سوئے خیام موڑ دیا اور فوراً خیام کی طرف پلٹے۔

بے دینوں اور کمینوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے گروہِ ابوسفیان! اگر تمہیں مذہب کا خیال اور آخرت کا خوف نہیں تو دنیا میں تو آدمی بنے رہو! اگر تم عرب نسل ہو تو عرب غیرت و حمیت کا تو پاس کرو''۔

آپؑ کا کلام سن کر شمر نے کہا: ''حسینؑ! اس بات سے آپؑ کا کیا مقصد ہے؟''

امام علیہ السلام نے جواب دیا:

"اَقُوْلُ اَنَا الَّذِیْ اُقَاتِلُکُم وَ تُقَاتِلُوْنِیْ وَ النِّسَآءُ لَیْسَ عَلَیْھِنَّ جُنَاحٌ فَامْنَعُوْا عتاتکم عَنِ التَعَرّضِ لِحَرَمِیْ مَادُمْتُ حَیًّا".

''میں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ لڑ رہا ہوں اور تم میرے ساتھ قتال کر رہے ہو۔ مردوں مردوں کی لڑائی ہے۔ اس میں عورتیں بے قصور ہیں۔ شرافت اور غیرت عورتوں پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ تم اپنے سرکش اور گستاخ بے حیا سپاہ کو روک لو، کہ میری مستورات و حرم کی جانب نہ بڑھیں۔ جب تک میں زندہ ہوں یہ برداشت نہیں کر سکتا''۔

مولاؑ کی اس تقریر سے بے حیاؤں نے کہا: ''آپؑ کا مطالبہ منظور ہے''۔

اور فوج کو خیام کے قریب سے ہٹا کر میدان میں بھیج دیا۔

اس کے بعد تمام فوج کا رُخ سوئے امام تھا اور یہ سپاہ بدنہاد چار حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شمشیرزن، انہوں نے تلواروں سے حملہ کیا۔ نیزے بردار نیزوں سے وار کرتے، تیرانداز بیک وقت چار ہزار کمانوں سے چار ہزار تیر نکالتے اور پتھر مارنے والے۔ تیروں کی بارش اور پتھروں کا مینہ جاری ہوگیا تھا۔

پیاسا امامؑ لبِ فرات پر

ادھر ایک جسم ایک بدن، تیروں کا نشانہ بھی ہے، پتھروں کا ہدف بھی، نیزوں کا مقام بھی اور تلواروں کی جائے ضربت بھی۔ شدتِ پیاس سے کلیجہ پھنک رہا ہے۔ پانی طلب کرتے ہیں تو بے دین استہزاء اور تمسخر کرتے ہیں۔ طعن وتشنیع سے کام لیتے ہیں۔ گستاخانہ جواب دیتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے جانب فرات گھوڑے کی باگ موڑی اور صفوں کو چیرتے ہوئے، نابکاروں کو راہ سے ہٹاتے ہوئے، دائیں بائیں ناریوں کو اس طرح کاٹتے چلے جس طرح مالی باغ کے درختوں کی شاخیں اور کسان درانتی سے فصل کاٹتا ہے، لب فرات پہنچ گئے۔

ابوراعور اسلمی اور عمر بن حجاج چار ہزار سواروں کے ساتھ گھاٹ پر پہرہ دے رہا تھا۔ مزاحمت کی مگر مقابلے کی تاب نہ لاسکے۔ کنارہ خالی ہوگیا اور ساقی کوثر کا فرزند دریائے فرات کی مغصوبہ جاگیر میں داخل ہوگیا۔ پیاسے راہوار کو پانی کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ اس کا جگر جل رہا تھا، منہ سطح آب کے قریب کیا۔ مولاؑ نے فرمایا:

"تو بھی پیاسا ہے اور میں بھی پیاسا ہوں۔ میں اس وقت تک پانی نہ پیوں گا جب تک تو نہ پی لے"۔

وفادار راہوار نے پیاسے آقا کا کلام سنا تو منہ پانی سے اُٹھالیا، گویا وہ اپنی زبان میں کہہ رہا ہے کہ یہ شانِ وفا نہیں کہ سوار اور مالک پیاسا ہو اور راہوار پانی پی لے۔ مولاؑ نے پانی سے چلو بھرا۔ اسی اثناء میں ایک تیر آیا اور حلق میں پیوست ہوگیا۔ آپؑ نے تیر کھینچا، خون کا ایک فوارہ باہر آیا۔ پانی کی بجائے ہاتھ خون سے بھر گیا۔ آپؑ نے اس خون کو آسمان کی طرف پھینک کر کہا:

"خدایا! اس قومِ جفاکار کی شکایت تیری بارگاہ میں کرتا ہوں، جس نے میرا خون بہایا اور پانی سے روکا"۔

اسی اثناء میں کسی نے آواز دی: "حسینؑ! آپ تو پانی میں کھڑے ہیں اور ادھر خیام لوٹے جارہے ہیں"۔

پیاسے امامؑ نے ایک لمحہ کی بھی دیر کیے بغیر فوراً خیام کی جانب رخ کیا۔ گو امامِ مظلوم بے حد پیاسے تھے اور پانی پر پہنچ

گئے تھے۔ چلو میں پانی بھی لیا مگر نہ پیا۔ اگر پی بھی لیتے تو کون سی دیر تھی، مگر آپ پانی پینا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کیا زینبؑ وام کلثومؑ کی پیاس یاد نہ تھی؟ اگر اس وقت پانی سے سیراب ہو جاتے تو کیا یہ کہا جا سکتا تھا کہ امام مظلوم پیاسے شہید ہو گئے؟

اپنے قوت بازو سے فرات کا کنارہ خالی کروا کے اپنے کھوئے ہوئے حق پر قبضہ کر کے ہاشمی شجاعت اور کمینہ صفت فوج کی بزدلی اور بے حیائی عیاں کر دی۔ جب تک اہل حرم کو پانی نہ پہنچاتے خود بھی نہ پیتے۔ اسی واسطے تشنہ لب ہی وہاں سے واپس خیمہ گاہ کی طرف پلٹے۔

خیام میں آکر امامِ علیہ السلام کا اہل حرم سے دوسری بار وِداع کرنا

خیمے تو صحیح و سالم تھے مگر چند لمحوں کیلئے، جب تک آپ کا تن سلامت تھا۔ امام خیام میں داخل ہوئے۔ سوگوار بیبیاں خیموں میں خاک پر بیٹھی شہداء کے غم و ماتم میں مصروف تھیں۔ معصوم بچے العطش العطش کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ امام کے آنے سے بچے اکٹھے ہو گئے۔ سیدانیوں کو کچھ سہارا ملا لیکن پہلے وداع اور دوسرے وداع میں امام کی حالت بدلی ہوئی تھی۔

اب کی مرتبہ کپڑے خون میں تر تھے، بدن زخمی تھا، ایک مرتبہ پھر خیام میں کہرام بپا ہو گیا۔ امامِ مظلومؑ نے تسلی دی اور صبر و سکون کی تلقین کی اور اجرِ کریم وثوابِ عظیم کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

"اِسْتَعِدُّوْا لِلْبَلَاءِ وَ اَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی حَافِظُكُمْ وَ حَامِيْكُمْ سَيُجَنِّبُكُمْ مِنْ شَرِّ الْاَعْدَاءِ وَ يَجْعَلُ عَاقِبَةَ اَمْرِكُمْ اِلٰى خَيْرٍ يُعَذِّبُ اَعْدَائِكُمْ بِاَنْوَاعِ الْبَلَاءِ".

"بلاء و مصیبت آن پہنچی ہے۔ میرا امتحان ختم ہونے کو ہے۔ تمہارا امتحان شروع ہو رہا ہے۔ میری منزل کی انتہاء ہے۔ تمہاری منزل کی ابتداء ہے۔ جان لو اللہ تعالیٰ تمہارا حافظ و حامی ہے۔ وہ تمہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے گا اور تمہارے امتحان کا نیک انجام ہوگا اور تمہارے دشمنوں کو مختلف قسم کا عذاب دے گا"۔

امام علیہ السلام مستورات اور پسماندہ بچوں کو دلاسے دے رہے تھے کہ اس اثناء میں دشمن گھٹا کی مانند چڑھ آیا۔ تیر بارانی شروع ہو گئی اور کچھ تیر خیام میں بھی آئے۔ امام علیہ السلام میدانِ کارزار میں دوبارہ وارد ہوئے اور قوتِ ربانی اور طاقتِ یزدانی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اب معرکہ قتال دوبارہ گرم ہوا، گھمسان کا رن پڑا، تیروں کی برسات اور پتھروں کے مینہ میں پسر حیدرِ کرارؑ نے جہاد جاری رکھا اور لاشوں کے انبار لگاتے رہے اور خون کے دریا بہاتے رہے۔

سابقہ تجربہ ناکام ہونے پر شمر نے اپنے لشکر کو نئے سرے سے اس طرح ترتیب دیا کہ لشکر سے آگے پیادوں کی صفیں تھیں اور پیادوں کے پیچھے گھوڑے سوار ایک تنظیم کے تحت صفیں بنائے کھڑے تھے۔ چار ہزار تیر اندازوں کو دور سے تیر چلانے پر مامور کیا اور دوسروں کو پتھر مارنے کا حکم دیا۔

یکبارگی حملہ شروع ہوا، مگر اسد اللہ الغالب کے فرزند نے صفوں کو درہم برہم، رسالوں کو تتر بتر اور پیادوں کو منتشر کر دیا۔ کیا تنظیم اور کیا ترتیب؟ جس طرح تیز ہوا کا جھونکا خس و خاشاک کو اُڑا پھینکتا ہے، اسی طرح ہاشمی شجاع کی تلوار قہرِ خداوندی اور غضب الٰہی بن کر ان بے دینوں کو دار البوار میں پہنچا رہی تھی۔ ہاں! تیروں کی بارش نے مولاؑ کے بدن کو نڈھال کر دیا تھا۔ امام علیہ السلام جوابی حملہ بھی کرتے اور فرماتے جاتے:

"یَا اُمَّةَ السُّوْءِ بِئْسَمَا خَلَفْتُمْ مُحَمَّداً فِیْ عِتْرَتِهٖ اَمَا اَنَّكُمْ لَنْ تَقْتُلُوْا الْعِدٰی عَبْداً مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ فَتَهَابُوْا قَتْلَهٗ بَلْ یَهُوْنُ عَلَیْكُمْ عِنْدَ قَتْلِكُمْ اِیَّایَ وَ اَیْمُ اللّٰهِ اِنِّیْ لَا رْجُوْا اَنْ یُكْرِمَنِیْ رَبِّیْ بِالشَّهَادَةِ بِهَوَانِكُمْ ثُمَّ یَنْتَقِمُ لِیْ مِنْكُمْ مِنْ حَیْثُ لَا تَشْعُرُوْنَ".

''اے بدکردار و بے حیاء اُمت! تم نے رسولؐ اللہ کے بعد ان کی عترت کے ساتھ کس قدر برا سلوک کیا۔

آگاہ رہو! اس کے بعد تمہیں اور بندگانِ خدا کا قتل آسان ہو جائے گا۔ خدا کی قسم! مجھے اُمید ہے خدا مجھے شہادت کی عزت اور سعادت بخشے گا اور تم پر ذلت مسلط کرے گا اور تم سے اس طرح قتل کا انتقام لے گا کہ تمہیں خبر بھی نہ ہوگی''۔

حضرتِ اسد اللہ الغالبؑ کے فرزند نے اس ضعف و نقاہت اور زخموں کی کثرت کے باوجود وہ شجاعت اور دلیری دکھائی کہ فوجِ بدنہاد سے میدان خالی ہو گیا اور امامؑ ان کا تعاقب کرتے ہوئے بارہ میل دور مقام ذوالکفل تک پہنچ گئے اور میدانِ قتال ناپاک لاشوں سے اس طرح بھر گیا تھا کہ گھوڑوں کا زمین پر چلنا دشوار ہو گیا۔ یہ آخری حملہ تھا۔ اس کے بعد مرکز پر تشریف لائے۔ اسی اثناء میں ہاتف غیبی کی آواز آئی:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ".

''اے ایمان والو! وعدہ وفا کرو''۔

امام علیہ السلام سمجھ گئے اور قتال سے ہاتھ روک لیا۔ لڑائی ختم کر کے تلوار نیام میں ڈال دی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

"لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، رِضاً بِقَضَائِهٖ وَ تَسْلِيْماً لِاَمْرِهٖ".

کوئی خوف اور قوت اللہ العلی العظیم کے سوانہیں، اس کے فیصلہ پر راضی ہوں اور اس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم ہے"۔

اب اظہارِ شجاعت کا وقت گزر گیا، امتحان میں کامیابی کی گھڑی آن پہنچی۔ غیب سے آواز آئی: "وعدہ وفا کرو۔"

عصر کا وقت آ گیا وعدہ وفا ہونے کو ہے
زیرِ خنجر آج سبطِ مصطفےٰؐ ہونے کو ہے
جس کی خاطر زینبؑ مغموم نے چھوڑا وطن
عالمِ غربت میں بھائی سے جدا ہونے کو ہے

نیزوں اور تیروں کے وار اور زینِ ذوالجناح سے سقوط

تلوار کا نیام میں ڈالنا تھا کہ بکھری ہوئی فوج پھر سے جمع ہوگئی۔ اب تن تنہا، جسم پاک تیروں، تلواروں اور نیزوں کا نشانہ ہے۔ شیعو! تمہارے امام ابھی گھوڑے پر سوار ہیں۔ چاروں طرف سے تیر آ رہے ہیں اور نازنین بتولؑ تیروں کا استقبال کر رہا ہے۔

فوجِ شمر میں سے ایک تیرانداز ہے جس کا نام ابوالحتوف جعفی ہے، اس شقی نے ایک زبردست تیر چلایا جو غریب کربلا کی پیشانی پر لگا۔ پیشانی سے خون کی دھار پھوٹی، چہرۂ اقدس خون سے لالہ گوں ہوگیا۔ مولاؑ نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا: "یا اللہ! تو دیکھ رہا ہے کہ تیرے سرکش بندے میرے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں"۔

بدن زخموں سے چور ہے، جسم نڈھال ہو چکا ہے۔ کتنے زخم ہیں، ان کا کوئی شمار نہیں۔ ایک ہتھیار کے زخم نہیں۔ تلواروں کے زخم تھے، نیزوں کے علیحدہ، تیروں کے الگ اور پتھروں کے علاوہ تھے۔ کتنے زخم تھے؟ مختلف روایات ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ بدنِ پاک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں دردستائیاں اور مصیبت زدہ زہراؑ جائیاں بوسے دے سکیں۔ ایک زخم کے اندر کئی کئی تیر تھے، تمام ملا کر ایک ہزار نو سو پچاس زخم شمار کئے گئے ہیں۔

روایت است کہ برتن شہ ذی جود
ہزار نو صد و پنجاہ جراحت بود

ابھی فرزندِ رسولؐ زینِ ذوالجناح پر بیٹھے ستا رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک سنگدل ظالم نے پتھر مارا جو پیشانی مبارک پر لگا۔ خون پھر جاری ہوگیا۔ آپ نے پیراہن کا دامن اٹھایا اور خون پونچھا۔ ابھی خون پونچھ ہی رہے تھے کہ ایک سہ شعبہ تیر فضاء

کو چیرتا ہوا سینۂ اقدس میں پیوست ہو گیا۔ چونکہ تنِ مبارک زخموں سے چور چور ہو چکا تھا، اس لیے تیر کی نوکیں بدن سے پار نکل گئیں۔

اس تیر کا پیوست ہونا تھا کہ امام کی زبان ذکرِ خدا میں مصروف ہو گئی اور کہا:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِا اللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ".

آپ ہر تیر کے استقبال میں یہی جملہ فرماتے۔ پھر آپ نے آسمان کی طرف رخ کر کے فرمایا:

"اِلٰهِیْ اِنَّکَ تَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقْتُلُوْنَ رَجُلاً لَیْسَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ ابْنُ نَبِیٍّ غَیْرُهٗ"

"الٰہی! تو جانتا ہے کہ یہ لوگ ایسے مرد کو قتل کر رہے ہیں کہ روئے زمین پر اس کے سوا کوئی فرزندِ رسول نہیں ہے"۔

تیر اس زور سے آیا تھا کہ جسمِ اقدس میں پیوست ہونے کے بعد اس کی نوکیں پشت کی جانب سے پار ہو گئیں۔ امام علیہ السلام نے تیر نکالنا چاہا۔ مولاؑ! تیری مظلومی و غربت، بیکسی و تنہائی پر قربان! تو نے دوسرے شہیدوں کے بدنوں سے تو کیں نکالیں، اب تیرے بدن سے تیر کھینچنے والا کوئی نہیں۔

آپ نے دونوں ہاتھوں سے تیر کو کھینچنے کی کوشش کی، مگر یہ تیر سینے کی طرف سے نہ نکل سکا، اسی واسطے آپ نے جھک کر اس تیر کو پشت میں سے نکالا۔ حسینیو! اس تیر کے نکلنے سے خون کتنا نکلا ہوگا؟ عربی کے الفاظ ہیں:

"فَانْبَعَثَ الدَّمُ کَالْمِیزَابِ". "خون پرنالہ کی طرح جوش مار کر نکلا"۔

آپ نے پشت کے پیچھے ہاتھ رکھا، خون بھر کر آسمان کی طرف پھینکا، جس کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرا۔ دوبارہ ہاتھ بھر کر ریش مبارک اور چہرۂ اقدس پر مل لیا اور کہا: "اسی خون کا خضاب لگا کر روزِ قیامت نانا کے پاس جا کہ کہوں گا: نانا! آپ کی اُمت نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے"۔

شیعو! تمہارے زخمی امام ابھی تک گھوڑے کی پشت پر سوار ہیں۔ بیشک خون کثرت سے بہہ چکا ہے اور بہت نڈھال ہو چکے ہیں۔ تاہم زین پر سوار ہیں۔ اب تمہارے امام کا وقت آیا ہے کہ زین چھوڑ دیں۔

مولاؑ نے زین خود نہیں چھوڑی، مولا سے زین چھڑائی گئی، اترے نہیں، بلکہ اتارے گئے۔ کس نے زین چھڑائی؟ سنیں گے؟ کلیجہ پکڑ کر اور دل تھام کر سنئے!

ایک ملعون صالح بن وہب مزنی نے کمر میں ایسا نیزہ مارا کہ بتولؑ کی فریاد نکل گئی، قبرِ رسول کانپ گئی، عرش لرز اٹھا، زمین تھرائی اور دلبندِ بتولؑ نے گھوڑے کی زین چھوڑ دی۔ وہی جملے جو تیر کے استقبال میں آپ پڑھتے تھے، نیزے کا استقبال

بھی انہی جملوں سے کیا اور " بِسْمِ اللّٰہِ وَ بِاللّٰہِ وَ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ " پڑھتے ہوئے دائیں رخسار کے بل فرشِ زمین کے مہمان ہوئے۔

حضرت قائم آلِ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام زیارتِ ناحیہ میں فرماتے ہیں:

"فَهَوَيْتَ اِلَى الْاَرْضِ جَرِيْحاً".

" آپ زخموں سے چور ہو کر تیروں اور نیزوں کی تاب نہ لا سکے اور زمین پر گر پڑے"۔

"اَلسَّلَامُ عَلَى الْخَدِّ التَّرِيْبِ". "خاک آلود رخسار پر سلام"۔

بلند مرتبہ شاہے زصدر زین افتاد | اگر غلط نہ کنم عرش بر زمین افتاد
قرآن رحلِ زیں سے سوئے فرش گر پڑا | دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

شہسوار دوشِ رسولؐ اور ناز پروردۂ آغوشِ بتولؑ سینکڑوں زخم کھا کر، خون میں نہا کر، زخموں سے چور، سنبھلنے سے معذور، زین عرش سے فرشِ زمین پر آ رہا۔ شہزادیاں جو در خیمہ پر، برادرِ مظلوم کا دردناک منظر دیکھ رہی تھیں، قرآنِ ناطق کا رحل زین سے گرتے دیکھا، لختِ بتولؑ کو بے بس ہو کر زین کو چھوڑتے دیکھا۔ صحن خیمہ سے بے تاب ہو کر باہر نکل آئیں اور زبان پر یہ فریاد تھی:

"وَ اَهْلَ بَيْتَاهِ لَيْتَ السَّمَآءَ طَبقَتْ عَلَى الْاَرْضِ وَ لَيْتَ الْجِبَالُ تَدَكْدَكَتْ عَلَى السَّهْلِ".

" پہاڑ ریزہ ریزہ کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہمارے سردار، ہائے اہلِ بیتؑ! آسمان زمین پر کیوں نہیں گر پڑتا۔ پہاڑ ریزہ ریزہ کیوں نہیں ہو جاتے؟"

معصومہ مظلومہ، شریکۃ الحسین سلام اللہ علیہا اب خیمہ میں کس طرح قرار سے بیٹھے؟ اس مقام پر آ گئیں جسے "تلِّ زینبیہ" کہا جاتا ہے۔ خیام سے باہر ایک اونچا مقام تھا، جہاں درد ستائی اپنے مظلوم بھائی کی دائمی جدائی کا منظر دیکھتی رہی۔ پھر سعد کو پکار کر کہا:

"وَيْحَكَ يَا عُمَرُ! يُقْتَلُ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ وَ اَنْتَ تَنْظُرُ اِلَيْهِ".

" وائے ہو تم پر اے عمر! فرزندِ رسولؐ، دلبندِ بتولؑ، ابو عبد اللہ الحسینؑ قتل ہو رہے ہیں اور تو دیکھ رہا ہے؟"

دردبھری فریاد اور زہراء جائی کا اس طرح جنگل میں دہائی دینا، بتولؑ کی بیٹی کا اس قدر غریب و بیکس ہو جانا، حسینؑ کی مظلومی کا اثر تھا کہ ابن سعد منہ پھیر کر رونے لگا اور یہ آنسو اس کے رخسار پر بہہ نکلے۔

اس کے بعد درد ستائی اور دل جلی بہن نے بلند آواز سے سنگدل فوج کو مخاطب کر کے کہا:

"وَيْحَكُمْ اَمَا فِيْكُمْ مُسْلِمٌ".

"وائے ہو تم پر! کیا تم میں کوئی مسلمان نہیں؟"

افسوس کہ دختر رسولؐ سلام اللہ علیہا کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور کسی بدبخت نے توجہ نہ دی۔ کسی شقی نے جواب نہ دیا اور علیؑ کی بیٹی یاس و پریشانی کے عالم میں خیمہ میں واپس آئی۔

شہادتِ حضرتِ امام حسین علیہ السلام اور جنگ کا خاتمہ

عزادارو! میرے مولاؑ مظلوم حضرتِ امام حسین علیہ السلام کے مسقط اور مقتل میں فاصلہ ہے۔ جہاں گرے ہیں، وہاں قتل نہیں ہوئے۔ گرنے کے بعد کچھ دیر تک تو زمین پر بے حس پڑے رہے، اس کے بعد سنبھلے، اٹھ کر بیٹھے اور پہچان گئے کہ یہ جگہ میری مقتل گاہ نہیں۔ اس واسطے آپ اپنی مقتل گاہ کی جانب روانہ ہوئے مگر دشواری یہ تھی کہ سنبھلنے کی طاقت اور چلنے کی قوت ختم ہو گئی تھی۔ چند قدم ہی چلتے کہ پھر ضعف اور نقاہت کی وجہ سے گر پڑتے تھے۔

بعض مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ چلتے وقت امام علیہ السلام کمزوری کی وجہ سے نہ گرتے بلکہ ہر قدم پر نیزوں اور تلواروں کی ضرب لگی اور غریب کربلا گر پڑتے۔ مقامِ سقوط سے جائے قتل تک چند قدموں کا فاصلہ کئی نیزوں اور تلواروں کے واروں میں طے کیا۔

شیعو! اب تمہارے آقا و مولاؑ اپنی اصلی وعدہ گاہ پر پہنچ چکے ہیں۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے، رُخ آسمان کی طرف کیا اور کہا:

تَرَكْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِيْ هَوَاكَ
وَ اَيْتَمْتُ الْعِيَالَ لِكَيْ اَرَاكَ
فَلَوْ قَطَّعْتَنِيْ فِي الْحُبِّ اِرْبًا
كَمَا حَنَّ الْفُؤَادُ اِلٰى سِوَاكَ

"میرے معبود! میں نے تمام مخلوق کو تیری محبت میں چھوڑ دیا ہے اور تیرے وصال کے شوق میں بچوں کو یتیم کرلیا ہے۔ اگر تیری محبت کے جرم میں میرا بدن پارہ پارہ کر دیا جائے تب بھی میرا دل تیرے غیر کی طرف مائل نہ ہوگا۔"

اب حسین علیہ السلام رزمگاہ میں نہیں بلکہ مقتل گاہ میں ہیں۔ تیر اور پتھر متواتر آ رہے ہیں۔ زانوؤں کے بل زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ دعا پڑھ رہے ہیں:

"صَبْراً عَلٰى قَضَائِكَ يَا رَبِّ لَا اِلٰهَ سِوَاكَ يَا غِيَاثَ الْمُسْتَغِيْثِيْنَ مَا لِيْ رَبٌّ سِوَاكَ وَلَا مَعْبُوْدَ غَيْرُكَ صَبْراً عَلٰى حُكْمِكَ يَا غِيَاثَ مَنْ لَا غِيَاثَ لَهٗ دَائِماً لَا نِفَادَ لَهٗ يَا مُحْيِيَ الْمَوْتٰى يَا قَائِماً عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ اُحْكُمْ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ".

باوجود اس نقاہت و ناتوانی کے قریب جا کر وار کرنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ عمر ابن سعد نے حکم دیا:

"اب اس بیکس و ناتواں کا قتل دشوار نہیں۔ بھائیوں، بھتیجوں کے گہرے زخم اس کی روح میں ہیں اور ظاہری بدن بھی زخموں کی کثرت سے چور چور ہو چکا ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے سے معذور ہے۔ روحانی اور جسمانی طور پر شدید گھائل ہو چکا ہے۔ جو اس کا سر لائے گا، اُسے خاص انعام ملے گا۔ جلدی کرو اس کی شمعِ حیات گل کر دو"۔

تاہم اس گناہِ عظیم کو کوئی اپنے سر لینے کو تیار نہ تھا۔ شمر ملعون نے ترغیب دی اور چالیس سواروں نے آگے بڑھ کر امام علیہ السلام کو گھیرے میں لے لیا اور آپ پر یکے بعد دیگرے حملے کرنے لگے۔ یوں تو تیس ہزار اشقیاء قتلِ امام علیہ السلام کے ذمہ دار اور آپ کے قاتل ہیں، جنہوں نے پتھروں، تیروں، تلواروں اور نیزوں سے امام علیہ السلام کو زخمی کیا۔ بیشک یہ تمام قاتل اور قتلِ حسین علیہ السلام میں شریک اور حصہ دار ہیں مگر خاص طور پر وہ قاتل جنہوں نے پنجتن پاک کے آخری جزو کو شہید کیا اور حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کے گھر کو برباد کیا، چراغِ رسالت کو گل کیا اور روزِ حشر تک حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کو رُلایا، وہ ملعون سات ہیں۔

حصین بن نمیر، اس ظالم اور شقی القلب نے دہنِ اقدس پر تیر مارا۔ یہ ملعون پہلے بھی اپنے تیروں سے بدنِ امام کو زخمی کر چکا تھا۔

ابوایوب غنوی، اس ظالم اور سفاک نے امام علیہ السلام کے حلق مبارک کو تیر سے زخمی کیا۔

نصر بن خرشہ، اس نے دائیں شانے پر تلوار ماری۔

زراعہ بن شریک، اس ملعون نے بائیں [illegible] پر تلوار کا وار کیا۔

صالح بن وہب مزنی، اس ملعون نے نیزہ مارا۔

خولی بن یزید اصبحی، اس لعین نے سہ شعبہ تیر مارا جو قلب لختِ جگرِ فاطمہؑ بنتِ رسولؐ میں پیوست ہو گیا۔ قلب کی رگ کے کٹ جانے سے امام علیہ السلام کے جسم سے بہت زیادہ خون بہا۔

سنان بن انس، اس لعین نے تیر لگنے کے فوراً بعد ایسا نیزہ مارا کہ زینبؑ کے مظلوم کے برادرِ بزرگ، زہراؑ کے لعل ذی قدر وحشمت سنبھل نہ سکے اور زین سے زمین پر آئے۔

تین ساعت دوشِ پیغمبرؐ کا سوار خون میں غلطاں زمین پر پڑا رہا۔ اس دوران لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ بتولؑ کا بیٹا زندہ ہے یا اس دنیا سے رحلت فرما گیا ہے۔ اس کے بعد جوں توں کر کے سکینہؑ کا بابا اٹھا اور حلق سے تیر نکالا۔ زینبؑ کا بھائی اپنی زندگی کے آخری لحات میں ہے۔

مالک بن نصر، کندہ خاندان کا ایک ذلیل اور سنگدل ملعون ہے، جس نے آگے بڑھ کر فرزندِ رسولؐ کو سب وشتم کیا اور سرِ اقدس پر تلوار ماری۔ عمامہ کے نیچے ایک ٹوپی تھی جو کٹ گئی اور آپؑ کے سرِ اقدس پر شدید زخم آ گیا اور وہ ٹوپی خون سے بھر گئی۔ امام علیہ السلام نے ٹوپی اُتاری اور سر کو ایک پٹی سے باندھ لیا۔

اس کے بعد شمر ملعون نے پکار کر کہا: ''اب کیا انتظار ہے؟ آگے بڑھو اور جلدی سے ان کا کام تمام کر دو''۔

خولی ملعون تلوار لے کر آگے بڑھا مگر جونہی آپؑ کے قریب پہنچا تو اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ اپنی یہ حالت دیکھ کر ڈر گیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد شیث بن ربعی بھی اسی ناپاک ارادے سے آگے بڑھا مگر اس پر بھی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر گر پڑی اور وہ گھبرا کر واپس آ گیا۔

سنان ابن انس نے ان شقیوں سے پوچھا: ''تمہاری ماں تمہارے سوگ میں بیٹھے، تیر اور نیزے مارتے رہے، اب تلوار کا آخری وار ہی اس مجروح کیلئے کافی تھا، تم کانپتے ہوئے واپس کیوں آ گئے ہو؟''

ان لعینوں نے جواب میں کہا: ''جب قتل کے ارادے سے مظلوم کے قریب گئے اور غریبِ کربلا نے آنکھیں کھولیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رسول اللہؐ آنکھیں کھول رہے ہیں اور رسول اللہؐ کی ہیبت آنکھوں میں سما گئی ہے''۔

اس کے بعد سنان بن انس ملعون آگے بڑھا کہ امام علیہ السلام کا رشتہ حیات منقطع کر دے۔ جب قریب پہنچا تو اس پر بھی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ شمر لعین نے سنانِ ملعون سے پوچھا:

''تو کیوں واپس آ گیا ہے اور قتل کیوں نہیں کیا؟''

سنان ملعون نے کہا: ''جب میں تلوار لے کر حسینؑ کے قریب گیا اور حسینؑ نے میری طرف دیکھا تو مجھے ایسے معلوم ہوا کہ گویا علیؑ مجھے دیکھ رہے ہوں تو مجھ پر شدید ہیبت طاری ہوگئی''۔

شمر ملعون اب آخری اور بدالعین قاتل تلوار سونت کر آگے بڑھا۔ اس ملعون نے جاتے ہی گستاخانہ کلمات کہے اور آپؑ کے سینۂ اقدس پر نہایت بے ادبی کے ساتھ چڑھ گیا۔ امام علیہ السلام کی نظر پڑی تو پوچھا: ''تو کون ہے؟''

جواب دیا: ''میں شمر بن ذی الجوشن ہوں۔''

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''تو مجھے پہچانتا بھی ہے؟''

شمر ملعون نے جواب دیا: ''ہاں! جان کر اور پہچان کر قتل کر رہا ہوں۔ یزید سے انعام کی خاطر مجھے آخرت کی ضرورت نہیں۔ یزید کے انعام کا طلبگار ہوں''۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''ذرا اپنا سینہ تو کھول دے''۔

اس نے اپنے سینے پر سے کپڑا ہٹایا تو امام علیہ السلام نے دیکھا کہ اس کے سینے پر دھبے دار کتے کی طرح کے سفید داغ اور سور کی طرح کے بال تھے۔

اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا: ''میرا آخری قاتل تو ہی ہے۔ میرے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ زمین کربلا پر میرے فرزند کو ایسا شخص قتل کرے گا جو کتے کی مانند مبروص ہوگا اور سور کی مانند اس کے بال ہوں گے۔ بیشک تو ہی میرا قاتل ہے''۔

جس حلق کے بوسے لئے زہراؑ و علیؑ نے
فریاد ہے کاٹا اسے خنجر سے شقی نے

اس ملعون نے جوشِ غضب سے امام علیہ السلام کے پس گردن بارہ ضربیں پہنچائیں۔ خنجر کند تھا اور اس وقت اس ملعون کی نیت بھی اذیت کے ساتھ ذبح کرنے کی تھی۔

فرزندِ رسولؐ کی گردنِ اقدس پر کند خنجر چلتا رہا اور سیدانیاں درِ خیمہ پر حالات دریافت کرنے کیلئے بے چینی سے منتظر رہیں۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ زبان بیان سے قاصر ہے اور قلم لکھنے سے عاجز ہے۔ کیا ہوا؟ کعبہ منہدم ہوگیا، عرش تھرا گیا، زمین پر لرزہ طاری ہوگیا، آسمان سے خون برسنے لگا، مچھلیاں پانی میں بیتاب ہوگئیں، پرندوں نے پرواز چھوڑ دی، حیوانوں نے چرنا

چھوڑ دیا۔

جمعہ کا دن تھا، عصر کا وقت تھا، بتولؑ کی فریاد آئی، رسولؐ کے سر سے دستار گر پڑی، لشکرِ ابن سعد میں تکبیریں بلند ہوئیں۔

ادھر زہراؑ کا گھر اُجڑ گیا، زینبؑ و امّ کلثومؑ کا آخری سہارا ختم ہو گیا، ادھر یزیدی افواج میں شادیانے بجنے لگے۔

جنگ کا غبار چھٹا، کیا نظر آیا؟ خولی کے نیزہ پر بتولؑ کا لعل سوار ہے، زلفیں ہوا میں لہرا رہی ہیں، خون کے قطرے زمین پر گر رہے ہیں:

"اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا، اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا"

کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔

اسپ باوفا

امامِ مظلوم علیہ السلام مجروح ہو کر گھوڑے سے نیچے آئے۔ وفادار گھوڑا زخمی آقا کے پاس رہا۔ پیاسا تھا، دریا پر چلا جاتا۔ بھوکا تھا، خوراک تلاش کر لیتا، زخمی تھا، کسی جائے امن پر چلا جاتا، لیکن اتنا عرصہ معصوم امام اور کریم آقا کی خدمت میں رہا، ان ذواتِ مقدسہ کے پاک وطیب ماحول میں رہنے والے جانور بھی نیک عادت اور محمود اطوار سے متصف ہو جاتے ہیں۔ آقا تو کثرتِ جراحت سے خاک وخون میں غلطاں رہے اور گھوڑا غریب آقا کی حفاظت وحمایت کرتا رہا۔ گھوڑا خیام میں آیا، لیکن اس وقت تک ساتھ نہیں چھوڑا جب تک آقا، امامِ مظلوم علیہ السلام اس دارِ فانی سے شہادت اختیار نہ کر گئے۔

جونہی شمر لعین سینے سے اترا، سر کو جدا کیا اور بے ادبی کرتے ہوئے آپؑ کے سرِ اقدس کو بالوں سے اٹھایا اور ابن سعد کے پاس لے کر چلا گیا، راہوار نے اپنی زبان میں فریاد کرتے ہوئے بے سر لاش کا طواف شروع کیا۔ میرے خیال میں بعد از شہادت، لاشِ حسین علیہ السلام کی زیارت کا سب سے پہلے اسی راہوار کو شرف حاصل ہوا۔ لاش کا طواف کرنے کے بعد اعضائے بدن کے بوسے لئے، لاش کو چوما اور اپنی گردن اور سر کو خونِ آقا سے رنگین کیا اور نہایت اداسی اور پریشانی کے ساتھ شہادتِ حسین علیہ السلام کا قاصد بن کر خیام کی طرف روانہ ہوا۔

اس وفادار ذوالجناح کا عجیب حال تھا۔ اس انداز سے بے چارہ ہنہنا رہا تھا کہ گویا اپنی زبان میں کہہ رہا ہو: "لوگو! میرا سردار شہید ہو گیا، میرا اسوار مارا گیا"۔

یہ تو حال تھا میدان کا۔ ادھر خیام میں یہ کیفیت تھی کہ مصیبت زدہ مستورات اور بھوکے پیاسے یتیم بچے سب ایک خیمہ

میں قنات کے پیچھے اکٹھے تھے۔ جب امام علیہ السلام دوبارہ وداع کہہ گئے تھے، زہراؑ کی بیٹیاں اور مستورات بنی ہاشم قنات کے پیچھے سے جھانک جھانک کر صحرا کی جانب دیکھتیں۔ ایسا مرد تو کوئی نہ تھا جو میدان میں جا کر خبر لاتا۔ فوجوں کی بھیڑ اور گھوڑوں کے گھمسان میں بچوں کا کام نہ تھا۔ جو بچے گئے بھی وہ زندہ واپس نہ لوٹے۔

گھبراہٹ اور بیقراری کا عالم تھا، اداسی اور پریشانی چھائی ہوئی تھی، خوفزدہ بچے ماؤں کی انگلیاں پکڑے پریشان کھڑے تھے۔ بیبیاں بار بار میدان کی طرف دیکھتی تھیں مگر جہاں تک نظر کام کرتی تھی، اعدائے بے دین کی کثرت نظر آتی، فوجوں کے سر دکھائی دیتے۔ گو ہمشیر بیکس نے اس ٹیلہ پر جس کو "تلۂ زینبیہ" کہتے ہیں، جا کر مظلوم بھائی کی خبر گیری کی کوشش کی، مگر زہراؑ کا نور عین اور اجڑی بہن کے دل کا چین، ہمشیر دلگیر کو نظر نہ آیا کیونکہ زہراؑ کا چاند ظلم کی گھٹاؤں تلے پوشیدہ تھا اور خورشید فاطمہ فوجوں کے جفا کار بادلوں میں پنہاں ہو گیا تھا۔

جوں جوں انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی جاتیں تھیں، زہراؑ جائیوں کے قلب کا اضطراب بڑھتا چلا جاتا تھا۔ نگاہیں سوئے میدان تھیں کہ گھوڑے کے ہنہنانے بلکہ رونے اور فریاد کرنے کی آواز سنی۔

دُور سے دیکھا کہ زین خالی ہے۔ راہوار آرہا ہے، مگر پشت پر سوار نہیں۔ راہوار بھی عجیب حالت میں ہے کہ زین دائیں طرف جھکی ہوئی، باگیں کٹی ہوئی، پیشانی اور گردن خون آلود ہے۔ جو بات دل میں کھٹک رہی تھی، سامنے آگئی۔ بس یقین ہو گیا کہ آخری سہارا ختم ہو گیا، حسینؑ شہید ہو گئے۔ راہوار کی اس خبر نے سیّدانیوں کے کلیجے مزید زخمی کر دیئے۔ دل فگار ہو گئے۔ دلدوز نالوں، دلخراش بینوں اور دلفگار فریادوں سے صحرا ابھر گیا۔ سروں سے چادریں گر پڑیں۔ وامحمداؐہ، واعلیاہ، واحسیناہ، کی صدائیں دھرتی کو ہلا رہی تھیں۔

زہراؑ کی بیٹیاں جو کھلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام سے باہر نکل پڑیں

ہر بی بی کے الگ بین تھے، جدا جدا نوحے تھے، سر پر ہاتھ تھے، سروں کے بال کھل گئے تھے، کسی کا منہ مدینے کی طرف تھا اور کوئی نجف کی طرف منہ کر کے ماتم کرتی تھی اور منہ پر طمانچے مارتی تھیں۔ سکینہؑ کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگ تھی اور امّ کلثومؑ کے ہاتھ گھوڑے کی گردن میں تھے، گھوڑا رو رو کر اپنی زبان میں کہتا تھا:

"الظليمة، الظليمة".

"آج اُمت نے اپنے نبی کے فرزند کو ظلم وجور کے ساتھ قتل کر دیا"۔

زہراؑ کی بیٹیوں کی دلخراش پکار تھی: "راہوار! تو نے سوار کو کہاں اتارا؟ ہمارے بھائی پر قضائے الٰہی کہاں نازل ہوئی؟
اے راہوار! آج دشمنوں کو تشفی حاصل ہوئی اور زہراؑ کا گھر برباد ہوگیا۔ گلشن رسولؐ تاراج ہوگیا، اب بیواؤں کا کوئی سہارا نہ رہا، یتیموں کا کوئی مددگار نہ رہا، ہمیں وطن کون پہنچائے گا؟"

اس کیفیت کو ہم زیارتِ ناحیہ مقدسہ کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"وَاَسْرَعَ فَرَسُکَ شَارِداً اِلٰی خِیَامِکَ قَاصِداً مُحَمْحِماً بَاکِیاً فَلَمَّا رَأَیْنَ النِّسَاءُ جَوَادَکَ مَخْزِیّاً وَ نَظَرْنَ سَرْجَکَ عَلَیْہِ مَلْوِیّاً بَرَزْنَ مِنَ الْخُدُوْرِ نَاشِرَاتِ الشُّعُوْرِ عَلَی الْخُدُوْدِ لَاطِمَاتٍ عَنِ الْوُجُوْہِ سَافِرَاتٍ وَّ بِالْعَوِیْلِ دَاعِیَاتٍ وَّ بَعْدَ الْعِزِّ مُذَلَّلَاتٍ".

یہ زیارت حضرت حجت قائم آل محمد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ اس میں امامِ زمانہ فرجہٗ الشریف اپنے جد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"آپ کا راہوار ہنہناتے ہوئے اور روتے ہوئے آپ کی شہادت کا قاصد بن کر تیزی کے ساتھ بھاگا اور دوڑا۔ جب مستورات نے گھوڑے کو پریشان دیکھا اور جھکی ہوئی زین پر نظر پڑی تو کھلے ہوئے بالوں کے ساتھ منہ پیٹتی ہوئی باہر نکل آئیں"۔

بین اور نوحہ کر کے کلیجے ہلا رہی تھیں۔ سکینہ یتیم ہوگئی، سیدانیوں کا آخری سہارا اور یتیموں کا آخری آسرا ختم ہوگیا۔ سیدانیاں سر پیٹ رہی تھیں۔ یتیم رو رہے تھے۔ فوج شام میں خوشیاں ہو رہی تھیں، شادیانے بج رہے تھے اور پنجتن کی روحیں لاشِ حسینؑ کا طواف کر رہی تھیں اور رسول اللہؐ کے گھر میں ماتم ہو رہا تھا۔

گھوڑا جس کا نام ذوالجناح مشہور ہے، اسے "مرتجز" بھی کہتے ہیں اور بعض کتابوں میں اس کا نام "میمون" لکھا گیا ہے، اپنے آقا و سردار کی شہادت کے بعد زندگی سے دل تنگ ہوگیا۔ ابن سعد نے اپنے آدمیوں کے ذریعے اسے پکڑوانے کی کوشش کی، مگر وفادار گھوڑے نے اپنی زین غیر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ چالیس پیادوں اور دس سواروں کو ہلاک کر ڈالا۔ جب خیام میں آیا اور خیام کو مردوں سے خالی پایا، آقا کی جدائی اور سیدانیوں کی مصیبت دیکھی تو خیمہ حسین علیہ السلام کے سامنے زمین پر ٹکریں مار مار کر اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اس طرح اس وفادار راہوار نے اپنے کریم سردار کا

زندگی اور موت میں ساتھ دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ شہادت امام حسین علیہ السلام کی خبر خیام میں پہنچا کر آقا کے دائمی فراق کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور اپنے آپ کو دریائے فرات میں ڈال کر اپنی زندگی ختم کر لی۔

ظلم بالائے ظلم! لاشِ مطہر کا لوٹا جانا

صحرائے کربلا میں غریبِ کربلا کی بے سر لاش پڑی ہے۔ بدن کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہیں۔ سیاہ آندھی تھم چکی ہے۔ خون کی بارش رک گئی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ تدفین کا انتظام کرتے، مگر بے دردی سے شہید کر دینے کو ہی کافی نہ سمجھا، آتشِ عناد فرو نہ ہوئی، فرزندِ رسولؐ اور لختِ جگرِ بتولؑ کی لاش پر اس اُمتِ بے حیاء نے لوٹ مچا دی۔ بے وارث سمجھ کر جو بے ادبیاں کیں، بیان کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، پتھر کا دل بھی رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مجروح بدن پر جو لباس تھا، وہ بھی بے رحمی کے ساتھ اتار لیا گیا اور فقط وہ پرانا لباس ہی آپؑ کے بدن پر باقی رہا جو آپؑ نے خیام سے نکلتے وقت لباس کے نیچے پہنا تھا۔ اسحٰق بن حیواۃ حضرمی نے قمیض اتاری، اخنس بن مرثد نے آپؑ کا عمامہ اٹھایا، تلوار جمیع بن خلق ازدی نے لے لی، زرہ جس کا نام بترا تھا، خود عمر سعد نے حاصل کر لی، خالد بن اسود ازدی نے نعلین اتارے، ردائے مبارک قیس بن اشعث نے لوٹی۔

ذوالفقار اور خاص انگوٹھی، جس پر نقش تھا اور ہر دو تبرکاتِ امامت تھے، آپؑ نے وداع کے وقت اپنے جانشین پسر، امام علی زین العابدین علیہ السلام کے حوالے کر دیئے تھے۔

ایک اور تلوار تھی جو لوٹی گئی اور اسی طرح ایک اور انگوٹھی تھی، جسے بجدل بن سلیم کلبی نے ظلم کے ساتھ اتارا۔ انگوٹھی اتارنے میں اس ملعون کو دشواری پیش آئی۔ جلدی کی وجہ سے اس نے مظلوم لاش کے ساتھ یہ بے ادبی کی کہ انگوٹھی کے لالچ میں اُس نے انگلی ہی کاٹ ڈالی۔

✿✿✿

منزلِ صبر و رضا

علیؑ کی بیٹیاں دُکھوں کی منجدھار میں
بھائی بھی مارے گئے اور گھر بھی جلائے گئے

راہِ حق میں تکلیفوں کا برداشت کرنا خاصانِ خدا کا شیوہ ہے اور خوشنودئ خدا اور تقویت دین کی خاطر دکھوں کا استقبال کرنا مقربانِ خدا کا خاصہ۔ اعلائے کلمۃ الحق اور ظلم و جور کے خلاف مصیبتوں کو گلے لگانا، آزاد منش، ارتقائے انسانیت کے رہنماؤں اور باطل کے خلاف سینہ سپر ہو جانے والے مجاہدین کا نصب العین ہے۔

اگر انسانیت میں کچھ رمق ہے، حق کی کچھ قدر و منزلت ہے، مظلومی سے محبت اور ظلم و جور سے نفرت، برائیوں سے پرہیز اور نیکیوں سے الفت ہے، تو انہی مجاہدین حق، حریت پسندوں اور باہمت و پر خلوص، سرفروشان شہیدوں کی قربانیوں کی بدولت ہے، جنھوں نے جان، عزت اور مال راہِ حق کی خاطر قربان کر دیے اور ظلم و تشدد کا حوصلہ مندی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

آج مساجد میں اذانیں گونجتی ہیں، جمعے و جماعتیں ہو رہی ہیں، درسِ قرآن جاری ہیں، حلال و حرام کی تمیز باقی ہے، حق و باطل اور سچ اور جھوٹ میں فرق قائم ہے، تو کربلا کے شہیدوں، بے وارث بیواؤں، بے گھر سیدانیوں، بے نوا اور اسیر ظلم و جفا بی زادیوں کے صدقے۔

شہدائے کربلا اور اسیرانِ کوفہ و شام کا مقصد بلند اور نصب العین ارفع تھا۔ اس واسطے ثابت قدمی کے ساتھ راہِ حق میں ہر آنے والی مصیبت کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔ پائے ثبات میں لغزش تک نہ آئی اور نہ ہی استقلال کے قدم ڈگمگائے اور نہ ہی ہمت و عزم میں کوئی کمزوری آئی۔

گریہ و زاری اور نوحہ و ماتم، یہ بشری تقاضے اور انسانی خاصیتیں ہیں۔ جہاں حوصلہ مندی، شجاعت، صبر و استقلال اور بلند صفات ہیں، وہیں رحمدلی، ہمدردی، دل کا بھر آنا اور آنکھوں کا آنسو بہانا، دردناک واقعات سے متاثر ہونا، شدتِ غم سے نوحہ اور بین کرنا، درد و الم سے سر اور منہ پیٹ لینا، یہ بشری جذبات کی صحیح ترجمانی اور انسانی فطری عادات ہیں جو نہ دبائے دب سکتی ہیں اور نہ ہی روکے رک سکتی ہیں۔

کربلا والوں نے ہر مصیبت اور ہر دکھ کو گلے لگایا اور ہر قسم کی قربانی کھلے دل سے دی۔ جس مقصد کو لے کر مدینہ سے

نکلے تھے، آخر دم تک وقتِ شہادت تک بلکہ کوفہ و شام کے بازاروں، درباروں، بلکہ واپس مدینہ تک اسی مقصد پر قائم رہے اور ان کے مقصد اور نصب العین میں مو برابر فرق نہ آیا۔

ہاں! روئے، ماتم کیا، نوحہ و بین کئے، آنسو بہائے، سر و منہ پیٹا اور بتایا کہ ہم انسان ہیں، پہلو میں دل اور سینے میں کلیجہ ہے۔ بشری جذبات ہیں اور امتحان گاہ میں ہیں۔ احساسِ درد و الم ہے، اگر غم و ماتم نہ کرتے تو یہی خیال کیا جاتا کہ یہ انسان نہیں ہیں، ان میں بشری جذبات نہیں ہیں، انہیں بھائی بہنوں سے محبت نہیں ہے، انہیں جان و عزت پیاری نہیں ہے، انہیں دردِ فراق نہیں ہے، انہیں عزیزوں کی موت کا صدمہ نہیں ہے، اسی لئے تو ان پر کوئی اثر نہیں، نہ روتے ہیں اور نہ ہی غم کرتے ہیں، نہ بھوک اور پیاس کا ہی اثر ہے اور نہ ہی زخموں کا درد۔ یہ کون سی مخلوق ہے اور جب تک احساسات نہ ہوں، بشری جذبات نہ ہوں، امتحان بیکار ہے۔ آزمائش بے سود ہے، امتحان کا مقصد یہی ہے کہ درد و الم کا اثر ہو، دل و دماغ کو صدمہ پہنچے، بشری بدن کو تکلیف پہنچے، جسمانی و اعصابی اذیتیں محسوس ہوں مگر انسان اپنے رب کی رضا کی خاطر ان تمام کو برداشت کرے۔

اس واسطے ان مقدس نفوس کا رونا، نالہ و ماتم کرنا، انسانی احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے مقصد اور نصب العین کی مخالفت نہیں کرتا اور نہ ہی صبر و آزمائش کے خلاف ہے۔ بلکہ جذبۂ رحم اور رقتِ قلب کا اظہار ہے۔

صبر و رضا کو ان ذواتِ مقدسہ نے مقامِ تکمیل تک پہنچایا۔ کسی مصیبت اور کسی دکھ کے موقع پر صغیر و کبیر اور مردوں اور عورتوں نے کوئی شکوہ نہیں کیا بلکہ ہر منزل پر کامیابی حاصل کر کے شکر ادا کیا۔ عام طور پر انسان مصیبتوں سے گھبرا کر نصب العین سے ہٹ جاتا ہے یا شکوہ کے الفاظ لبوں پر لاتا ہے۔ لیکن یہ کامل انسان اور افضل بشر ہر مصیبت کے وقت ذکرِ خدا کرتے اور اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام تیر لگنے کے وقت " بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَ عَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ " کے کلمات تلاوت فرماتے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب دکھ اور مصیبتیں اللہ کی رضا کیلئے برداشت کر رہے تھے۔

کربلا میں آنے، تمام مصیبتوں کو برداشت کرنے اور اپنی زندگیاں وقف کرنے کا مقصد، حضرت امام علیہ السلام کا ایک رات کی مہلت طلب کرنا، رات بھر عبادتِ خدا اور تلاوتِ قرآن، تسبیح و استغفار میں کرنے سے واضح کر دیا تھا۔ خدا کسی کا امتحان اتنی ہی مصیبتوں سے لیتا ہے جتنی اس میں قوتِ برداشت اور طاقتِ صبر ہوتی ہے۔ اگر وسعتِ قلب محدود ہو تو امتحان و شدائد بھی محدود ہوتے ہیں اور جس قدر وسعتِ قلب اور قوتِ برداشت بڑھتی چلی جائے، مصیبتوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر محدود مصائب آئے اور انبیاء علیہم السلام ان میں کامیاب ہوئے، لیکن کربلا والوں کے قلوب میں اتنی وسعت تھی کہ تمام مصیبتیں اور ہر قسم کے دُکھ ہجوم کر کے آگئے اور جوں جوں دکھ بڑھتے گئے اور ظلم و جور زیادہ ہوتے گئے، ان کے حوصلے بھی ساتھ ساتھ بڑھتے چلے گئے اور قوتِ برداشت زیادہ ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ ظالم ظلم کرتے کرتے تھک گئے، لیکن شہدائے کربلا اور اسیرانِ کوفہ و شام صبر کرتے کرتے نہ تھکے۔

ظالم اپنے ظلم پر رونے پر مجبور ہو گئے لیکن خانوادۂ اہلِ بیتؑ نے دامنِ صبر و شکیبائی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

عزادارو! امام حسین بن علی علیہما السلام تو اپنے ساتھیوں سمیت آزمائش میں کامیابی حاصل کر کے اپنے نانا کے پاس پہنچ گئے، اب علیؑ کی شیر دل بیٹیوں کے مصائب و آلام دیکھئے اور ان کے بلند حوصلوں، قوتِ برداشت اور عزم کی پختگی دیکھئے۔

غارتِ خیام

جس گھر سے کوئی ایک جنازہ بھی نکلے اس گھر والے مصروفِ غم ہو کر دوسرے حالات سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور اپنے ہوش و حواس قائم نہیں رکھ سکتے، مگر جس گھر سے ایک دن میں بہتر (۷۲) یا اس سے زیادہ جنازے نکلے ہوں اور بیدردی اور ظلم و جور سے جس گھر کے جوان خون میں نہا کر سامنے بے گور و کفن پڑے ہوں، پھر صفِ ماتم بچھانے کی مہلت بھی نہ ملے، تعزیت اور ماتم پرسی کے لئے کوئی مسلمان نہ آئے تو اس سے بڑھ کر کوئی غریب و مظلوم ہے؟ دخترانِ بتولؑ خود پیاسی تھیں، ان کے بھائی، بیٹے، بھتیجے اور بھانجے پیاسے تھے، مگر ساقیٔ کوثر کی پیاسی شہزادیوں نے کبھی پیاس کی شکایت نہ کی۔

لُوٹو تبرّکاتِ علیؑ و بتولؑ کو

مرتجز شہادت حسین علیہ السلام کی خبر سنا کر اس دنیا سے کوچ کر گیا اور شہزادیاں فراقِ برادر میں مصروفِ غم ہوئیں۔ خیام میں نوحہ و بکاء کر رہی تھیں اور اس فکر میں پریشان تھیں کہ اب ہمارا کیا حال ہوگا؟ کوئی محافظ اور ناصر نہیں رہ گیا، ظالم قید کریں گے یا قتل کریں گے؟ کہ ناگاہ سپاہِ ابن سعد بے وارث سیدانیوں کو لوٹنے کی غرض سے خیامِ سادات میں داخل ہو گئی اور یہ نام نہاد مسلمان نبی زادیوں کا سامان لوٹنے اور زیورات اتارنے میں مصروف ہو گئے۔ جس گھر میں مرد کوئی نہ ہو، بے وارث عورتیں اور یتیم بچے رہ جائیں، لوٹنے والے بے خوف ہو کر لوٹتے ہیں۔ انہیں نہ خوفِ خدا تھا اور نہ ہی کسی مرد کا ڈر۔ ان میں نہ دین تھا اور نہ ہی دنیاوی انسانیت۔

ان وحشی درندوں نے متاعِ رسولؐ لوٹی، تبرکاتِ بتولؑ لوٹے، یتیموں کی دُر چھینے، بیواؤں کے زیورات اتارے۔

معصیبت زدہ مستورات ڈر کے مارے پناہ ڈھونڈتی تھیں، مگر کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ علیؑ و بتولؑ کی شہزادیاں ہراساں تھیں۔ بچے سہمے ہوئے تھے۔ فریاد کرتے تھے، مگر کوئی فریاد رس نہ تھا۔ دہائی دیتے تھے مگر کوئی رحمدل نہ تھا۔ سادات کے گھر تھے اور بے تحاشا لوٹ پڑ رہی تھی، آسمان دیکھتا رہا اور آلِ محمد لٹتی رہی۔

سادات کے لوٹے جانے کے واقعات بیان کرنے سے زبان میں لکنت آتی ہے اور لکھنے میں قلم تھرّاتا ہے۔ معلوم نہیں آسمان کیوں نہ گر پڑا؟ زمین کیوں برقرار رہی اور کس جگر سے فضا مظلوم شہزادیوں کے بین سنتی رہی؟ سوگواروں کو اپنے عزیزوں کا سوگ اور ماتمداروں کو اپنے اقرباء کا ماتم بھول گیا تھا۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے اور جگر پھٹ جاتا ہے کہ کس طرح بیان کروں کہ ہاشمی شہزادیاں خیام میں چھپتی پھرتی تھیں اور بے حیاء ظالم بے رحمی کے ساتھ سروں سے چادریں اور پاؤں سے خلخال اور کانوں سے گوشوارے اُتار رہے تھے۔

اُمّ المصائب کی روایت

لٹے جانے کے ان واقعات کو خود شریکۃ الحسین علیہم السلام ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

''میں درِ خیمہ پر کھڑی مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اتنے میں ایک نیلگوں چشم خیمہ میں گھس آیا، مال و اسباب بے خوف ہو کر لوٹا۔ میرا بھتیجا چمڑے کے بستر پر لیٹا ہوا تھا، اس نے بیمار کو بستر سے ہٹا دیا اور نیچے سے چمڑہ کھینچ لیا''۔

تاریخ کے الفاظ اس مقام پر کچھ اور ہیں، مگر حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے کچھ اور مگر بیان نہیں کیے جاسکتے، مظلومہ فریاد کرتی ہیں:

''میں گوشواروں سے محروم ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں میں گوشوارے اور آنکھوں میں آنسو!''

میں نے کہا: اے ظالم! ظلم بھی کر رہا ہے اور رو بھی رہا ہے۔ اس نے کہا: رو اس لیے رہا ہوں کہ آج میں علیؑ کی دختر کو لوٹ رہا ہوں اور لوٹ اس لیے رہا ہوں کہ تم بے وارث ہو، اگر میں نے نہ لوٹا تو کوئی اور لوٹ لے گا''۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں: ''میں نے اس کو بد دعا دی: ظالم! خدا تیرے ان ہاتھوں کو کاٹ ڈالے جن سے تو نے دختر بتولؑ کے گوشوارے چھینے، خدا تیرے ان پیروں کو قطع کردے جن سے تو چل کر ہمارے پردوں میں گھس آیا اور خدا تجھے اس دنیا میں آگ میں جلا ڈالے''۔

چنانچہ اس کا حشر حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی بد دعا کے مطابق ہی حضرت مختارؒ کے ہاتھوں ہوا۔

حضرتِ فاطمہ کبریٰ سلام اللہ علیہا کی روایت

حضرتِ فاطمہ کبریٰ سلام اللہ علیہا بنت الحسین علیہ السلام بیان کرتی ہیں: ''میں خیمہ کے دروازے پر کھڑی اپنے بابا اور عزیزوں کی بے گوروکفن لاشوں کو دیکھ رہی تھی، ریت پر خون میں غلطاں بے وارث میتوں پر آنسو بہا رہی تھی اور اپنے انجامِ قتل یا قید کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک غارتگر بے ڈرو جھجک خیام میں داخل ہوئے۔ میں ڈر کر دوڑ پڑی، اس ظالم کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔''

زیادہ بیان کی طاقت نہیں، جو حسینِ مظلوم علیہ السلام کی دختر نے بتایا، اتنا کہتا ہوں کہ معصومہ میں بیہوش ہو کر گر پڑیں۔ سر سے چادر اتار لی گئی اور زیورات چھین کر ظالم تو چلا گیا۔ بی بی کا بیان ہے:

''جب میں ہوش میں آئی تو دیکھا کہ پھوپھی اماں میرے پاس بیٹھی رو رہی ہیں اور مجھے فرمایا: بیٹی! اُٹھو جا کر پتہ کرو کہ دوسری مستورات اور تیرے بیمار بھائی پر کیا گزری ہے۔ میں نے کہا: پھوپھی اماں! میرے سر پر چادر نہیں، کوئی کپڑے کا ٹکڑا نہیں، جس سے میں اپنا سر ڈھانپ لوں۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے جنابِ کبریٰؑ سے کہا:

''یَا بِنْتَاہ عَمَّتُکِ مِثْلُکِ''۔

''بیٹی! تمہاری پھوپھی بھی تیری ہی طرح سر عریاں ہے''۔

دیکھا کہ خیام میں تمام بیبیاں سر عریاں ہیں، کانوں میں زیورات نہیں''۔

سن سکو تو بیان کروں، مستورات اور بچیوں کے کان زخمی تھے۔ حضرتِ کبریٰ سلام اللہ علیہا کا بیان ہے:

''شہداء کی قیام گاہیں خالی تھیں، اب وہ گھر بھی لٹ چکے تھے اور خیام سامان و اسباب سے یکسر خالی ہو چکے تھے۔ بچے سہمے ہوئے خیام کے کونوں میں دبک کر بیٹھے تھے اور بیبیوں کے بدن خوف کے مارے کانپ رہے تھے''۔

انقلابِ زمانہ تھا کہ جن کے گھروں میں نامحرم کمسن معصوم بچے بھی نہ آ سکتے تھے، آج غیر محرموں کے ہاتھوں وہ سیدانیاں لٹیں، معصومہؑ فرماتی ہیں:

''ہم نے بیمارِ کربلا حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کو دیکھا جو بھوک و پیاس کی شدت اور بیماری کی وجہ سے حرکت تک نہ کر سکتے تھے، خاک پر پڑے ہیں، ہم نے سنبھالا دیا۔ وہ ہماری حالتِ زار پر اور ہم ان کی بیکسی پر گریہ کرنے لگے''۔

یہ غارت گر یہود و عیسائی نہ تھے بلکہ کلمہ گو مسلمان کہلواتے تھے۔ بے وارث اور غریب الوطن سوگوار مستورات پر کسی کو

رحم نہ آیا۔

ہاں! ایک عورت کو ترس آیا۔ بکر بن وائل قبیلہ کی ایک عورت تھی، جو اپنے شوہر کے ساتھ میدانِ کربلا میں آئی ہوئی تھی۔ اس نے خاندانِ محمدؐ کی بے وارث عورتوں کی یہ بیکسی و مظلومی دیکھی تو اس کا دل بھر آیا اور کہنے لگی:

''ہائے! بھائی بھی انہی کے مارے جائیں، عزیز و اقرباء بھی انہی کے قتل ہو جائیں، مردوں کا سہارا بھی انہی کا ختم ہو جائے اور انہی خاندانِ محمدؐ کی مستورات کے ساتھ پھر یہ ظلم و ستم!''

وہ پھر عورت ذات تھی، اتنا ظلم و تشدد برداشت نہ کر سکی۔ ہاتھ میں تلوار سنبھالی اور نعرہ بلند کرتی ہوئی ان بیکس اور غریب سادات کے خیام کے دروازہ پر آ کھڑی ہوگئی اور پکار کر کہا:

''يَا آلَ بَكرِ بنِ وَائِلٍ اَتُسلَبُ بنات رَسُولِ اللّٰهِ؟ لَاحُكمَ اِلَّا لِلّٰهِ يَا لثَارَاتِ رَسُولِ اللّٰهِ''۔

''اے بکر بن وائل کی آل! تم دیکھ رہے ہو اور رسول اللہؐ کی بیٹیوں کو لوٹا جا رہا ہے؟ خدا کے سوا کسی کا فیصلہ قبول نہیں۔ لوگو! آؤ اور خاندانِ رسالت کی اولاد کا بدلہ لو''۔

اتنے میں اس کا خاوند آیا اور اس کو مجبور کر کے وہاں سے اپنے خیمے میں لے گیا۔

آپ مدینہ سے روانگی کے حالات پڑھ چکے ہیں کہ امام علیہ السلام نے اس طویل سفر کیلئے کتنا سامان ساتھ لیا تھا۔ کتنے اونٹ یہ سامان اٹھانے کیلئے مخصوص تھے؟ مگر عصر کے بعد تمام خیام اس سامان سے خالی ہو گئے تھے اور ظالم سارا سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ ہاں! جنہوں نے اسباب لوٹا تھا، انہیں استعمال کرنا نصیب نہ ہوا۔ جو بھی استعمال کرتا، بیمار ہو جاتا اور طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا۔

بیمارِ کربلا کے قتل کا ارادہ

لوٹنے والے خالی ہاتھ نہ آئے تھے، بلکہ نیزے اور تلواریں بھی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان میں سے بعض کمینے اور سنگدل دشمن اس مذموم ارادے سے آئے تھے کہ مردوں میں سے جو خیام میں موجود ہو، چھوٹا ہو خواہ بڑا، کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اے آسمان! تو نے زمین پر کبھی ایسے ظالم اور ایسے مظلوم بھی دیکھے ہیں؟ جواب ملے گا کہ دھرتی ظالم و مظلوم سے خالی نہیں۔ ظالم بھی گزرے ہیں اور مظلوم بھی۔ مگر ایسے ظالم اور سنگدل ستمگر اور ان کے مقابلہ میں ایسے مظلوم و صبر

شعار میری آنکھ نے میرے سائے کے نیچے اور زمین کے اوپر نہیں دیکھے۔ میں ہمیشہ مظلوموں پر رویا کیا، لیکن کربلا کے مظلوموں پر خون کے آنسو رویا ہوں۔ اس واقعہ ہائلہ نے میرا جگر فگار کر دیا ہے۔

جوں ہی غارت گر، جفاکار اور بے حیاء ستم شعار ان عصمت سراء گھروں میں داخل ہوئے اور بیمار امام کو بستر پر دیکھا قتل کے بارے میں اختلاف کرنے لگے۔ بعض نے کہا جلدی نہ کرو اور امیر لشکر عمر بن سعد سے مشورہ کرلو۔ اسی اثناء میں ایک خبیث ازلی سگ ابلق تلوار سونت کر داخل ہوا اور امام علیہ السلام کو شہید کرنے کا ارادہ کیا کہ اتنے میں حمید بن مسلم نے ہاتھ پکڑ کر کہا: "یہ شخص بیمار ہے۔ کبھی بھی بیمار قتل نہیں کئے جاتے"۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب شمر حرام زادے نے قتل کرنے پر اصرار کیا تو اُمّ المصائب حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

"لَا يُقْتَلُ حَتّٰى اُقْتَلُ"۔

"پہلے مجھے قتل کرو پھر اسے قتل کرنا، میں اسے اپنی زندگی میں قتل نہ ہونے دوں گی"۔

حضرات! یہ تو تھا پاک خیام اور مقدس گھروں کے لٹنے کے بارے میں۔ ان ظالموں کی فطرت میں ذرہ بھر رحم کو دخل نہ تھا اور یہ پیدائشی سنگدل، اولادِ حرام، عداوتِ اہل بیت علیہم السلام پر پیدا ہوئے تھے۔ جب لوٹ مار سے فارغ ہوئے تو خیام میں بیدردی سے آگ لگا دی۔

ابیاتِ آلِ محمدؐ، آگ کی لپیٹ میں

خاندانِ رسالت کی آفت زدہ اور درد رسیدہ بیبیاں جب ایک مصیبت سے فارغ ہوتیں تو دوسری مصیبت جو اس سے بڑھ کر ہوتی آن گھیرتی۔ عزیزوں، بھائیوں اور وارثوں کا ماتم کیا کم مصیبت تھی کہ عصمت سراؤں اور باپردہ گھروں میں ظالم جفاکاروں کے ہاتھوں بے رحمی سے لٹیں؟ سروں سے چادریں اتر گئیں مگر خیام میں نامحرموں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھیں۔ بتولؑ زادیوں کی اس فریاد کو کسی نے نہ سنا:

دختر ہوں نبیؐ کی مسلمانو! کیوں لوٹ رہے ہو گھر میرا
کچھ شرم کرو سیدانی ہوں عریاں نہ کرو تم سر میرا

آخر وہ وقت آگیا جب عصمت سرائے خاندانِ بنی ہاشم اور ابو طالبؑ کے گھرانے کی مستورات اور دخترانِ بتولؑ کو جو

مدینہ میں کبھی گھروں سے باہر نہ نکلی تھیں اور محلہ کی گلیوں سے بھی ناواقف تھیں، ننگے سر اور پا برہنہ کھلے میدان میں گھبراہٹ و بیقراری کے ساتھ نکلنا پڑا۔

خیام کو آگ لگادی گئی۔ جن خیام میں عبادت خدا اور تلاوت قرآن ہوتی تھی، جو خیام ایک رات قبل ہاشمی ستاروں کی ضوء سے منور تھے، جن میں حمد وثناء اور تسبیح و تحلیل کی صدائیں گونجتی رہیں تھیں، آج عصرِ عاشور کے بعد آگ کی لپیٹ میں آگئے۔ خیام تھوڑے نہ تھے۔ آس پاس قناتیں تھیں۔ چونکہ آس پاس بے حیا سپاہ کا ہجوم تھا، لہٰذا باہر نکلنا گوارا نہ تھا۔ جب تک کوئی خیمہ بھی بچا رہا اور پردہ کی صورت باقی رہی، باہر نہ نکلیں۔ جب تمام خیام کو آگ نے گھیر لیا تب اس قدر مجبور ہوئیں کہ اندر آگ ہے اور باہر نکلیں تو بے حیاؤں کا مجمع ہے۔

امامِ زمانہ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی طرف رجوع کیا۔ حکم ہوا کہ جان بچانے کی خاطر باہر نکل جاؤ۔ اس وقت دریائے عصمت وطہارت کی مچھلیاں خیام سے باہر صحراء میں آنے پر مجبور ہو گئیں۔

زہراؑ کی بیٹیاں جو کھلے سر نکل پڑیں
سب بیبیاں خیام سے باہر نکل پڑیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام بیبیاں اپنے پاؤں باہر نکلیں، بچے بھی باہر صحراء کی طرف دوڑے لیکن امام علیہ السلام کا پسر علیل، امام علی زین العابدین علیہ السلام جو بیماری کے بستر پر بیٹھنے کے قابل بھی نہ تھے، کس طرح باہر نکلتے؟

حمید بن مسلم کا بیان ہے: ''میں نے ایک بی بی کو دیکھا کہ بار بار ایک خیمہ میں داخل ہوتی تھیں اور باہر نکلتی تھیں۔ بیقراری کے عالم میں دائیں بائیں دیکھتی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی قیمتی شے اس خیمہ میں رہ گئی ہے جس کیلئے بی بی بیتاب ہیں اور چیز بھی کوئی وزنی ہے جسے اٹھانے پر قادر نہیں۔ بے چین بھی بہت ہیں''۔

وہ کہتا ہے کہ میں نے پوچھا: ''بی بی! کوئی قیمتی چیز اس خیمہ میں رہ گئی ہے؟ اس معصومہؑ نے جواب دیا: باقی قیمتی چیزیں کہاں رہیں وہ تو لوٹ لی گئیں۔ میرے بھائی کی یادگار، میرا بیمار بھتیجا جو چلنے پھرنے اور حرکت کرنے سے قاصر ہے، اسے آگ کے شعلوں سے بچانا چاہتی ہوں''۔

آخر جوں توں کر کے بیمار امامؑ کو خیمہ سے باہر نکال لائیں۔ جتنا سامان، پارچہ جات مدینہ سے ساتھ لائی تھیں، ہر بی بی کے پاس کئی کئی پوشاکیں تھیں، کتنی ہی چادریں تھیں، جنہیں کئی اونٹ اٹھائے ہوئے تھے، لیکن عصر عاشور کے بعد سوائے بدنی لباس کے کوئی کپڑا نہ بچا تھا جس سے منہ چھپا سکیں اور سر پر اوڑھ لیں۔

شدید دہشت اور یتیموں کی موت

دہشت شدید اور گھبراہٹ سخت تھی، چنانچہ جب جلتے ہوئے خیام سے بیکس اور آفت زدہ مستورات گھبراہٹ کے عالم میں باہر نکلیں، ماؤں کے دامن بچوں کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور بچے دہشت زدہ ہو کر بے تحاشا جنگل کی طرف دوڑ پڑے۔ بچے ماؤں سے جدا ہو گئے تھے اور مائیں بچوں سے بے خبر تھیں۔ معصوم بچے تھے، ایسے واقعات کب دیکھے تھے؟ روز عاشورا گر باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، بھائی شہید ہو گئے تھے، تو مائیں تو زندہ تھیں جو عالم غربت میں باوجود اتنی مصیبتوں کے پھر بھی یتیموں کے دھڑکتے دلوں کا سہارا تھیں۔

میدان میں ان بچوں کو جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ اس وقت خیام میں مائیں سنبھالے تھیں اور میدان میں جانے سے روکتی تھیں۔ چند ایک بچے جو ماؤں سے دامن چھڑا کر بیتاب ہو کر میدان میں چلے بھی گئے تھے، ظلم و جور کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔

جونہی سفاک غارت گر خیموں میں داخل ہوئے، بچوں کے اوسان خطا ہو گئے اور ماؤں کی مظلومی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، بدن کانپنے لگے اور دل و دماغ پریشان ہو گئے۔ سہمے ہوئے بچے خیام کے کونوں میں چھپتے تھے اور جب خیام میں آگ لگی تو ان بچوں پر شدید دہشت طاری ہو گئی۔ حتیٰ کہ ہوش و حواس بھی بجا نہ رہے۔ مستورات حجابوں سے نکل آئیں اور ان کے بچے جنگل کی طرف دوڑ پڑے اور اپنی ماؤں سے جدا ہو گئے۔ پیادوں کی بھیڑ تھی، رسالوں کا گھمسان تھا اور گھوڑے دوڑ رہے تھے، خاندان بنی ہاشم کے کئی بچے حد سے زیادہ دہشت زدہ ہونے کی وجہ سے اس دنیا سے کوچ کر گئے اور کئی یتیم و معصوم بچے گھمسان میں گھوڑوں کی ٹاپوں تلے آ کر کچلے گئے۔

ماں کو لعل کی خبر نہ تھی اور یتیم ماؤں سے غافل تھے۔ چنانچہ کتاب ''ایقاد القلوب'' مقتل ابن عربی کے حوالے سے مرقوم ہے کہ دو معصوم بچے دہشت، گھبراہٹ اور شدت پیاس سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ چنانچہ معصوموں کی اس موت سے متاثر ہو کر فوج اشقیاء کے چند دستوں نے لٹی ہوئی مستورات اور یتیم بچوں کے پاس پانی بھجوا دیا۔

سلیمان بن محمد بن الحسین الشوکی نے اپنے مقتل میں عبدالوہاب الشعرانی کی کتاب المنن کی دسویں جلد کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ جناب عبدالرحمٰن بن عقیل تو روز عاشور حضرت سیّد الشہداء علیہ السلام کے ساتھ شہید ہو گئے لیکن ان کے دو صاحبزادے سعد اور عقیل جوان کے ہمراہ تھے اور کربلا میں موجود تھے، بعد شہادت امام حسین علیہ السلام پیاس اور دہشت کی وجہ سے گھبرا کر جاں بحق ہو گئے۔ یہ بچے حضرت علی علیہ السلام کی دختر حضرت خدیجہؑ کے فرزند تھے۔

حضرت مسلمؑ بن عقیلؑ کے دو صاحبزادے واقعہ کربلا میں، روزِ عاشور شہید ہوئے جن کا نام محمد بن مسلم اور عبداللہ بن مسلم علیہم السلام ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت رقیہ الکبریٰ بنت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہم السلام ہیں۔ حضرت مسلم بن عقیل علیہم السلام کی ایک دختر حضرت رقیہ الکبریٰ علیہا السلام کے بطن سے تھیں جو کربلا میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ موجود تھیں۔ جب خیام کو آگ لگی، معصومہ ماں سے بچھڑ گئیں، بے تحاشا صحراء کی طرف دوڑ رہی تھیں کہ گھوڑوں کی زد میں آ کر پامال ہو گئیں۔ اس طرح حضرت مسلم بن عقیل علیہم السلام کی اولاد کوفہ و کربلا میں نہایت بے دردی سے شہید ہوئی اور معصومہ کا نازک بدن گھوڑوں کی ٹاپوں تلے آ کر پامال ہو گیا۔

اسی طرح دو اور یتیم بچیوں کی شہادت کا واقعہ جناب علامہ مجلسیؒ نے "بحار" اور ذہبی نے "تجرید" میں تحریر کیا ہے کہ یہ معصوم بچیاں روزِ عاشور عصر کے بعد گھبراہٹ کے عالم میں اور شدتِ پیاس و دہشت سے گھبرا کر گھوڑوں کے سموں تلے آ کر پامال ہو گئیں۔ علیؑ کی بیٹیوں نے گیارھویں کی رات دو بچوں کی نہیں کئی بچوں اور بچیوں کی لاشیں بھی سنبھالیں۔

شامِ غریباں اور شبِ آلام

اس میں کوئی شک نہیں کہ شبِ عاشور آلِ محمد علیہم السلام پر نہایت سخت تھی، جبکہ اہل بیت علیہم السلام پوری طرح دشمنوں کے گھیرے میں آ گئے تھے۔ زندگی سے ناامید ہو چکے تھے اور موت سامنے منڈلا رہی تھی۔ ہر ماں اپنے فرزند، ہر بہن اپنے بھائی اور ہر زوجہ اپنے خاوند کی شہادت کا یقین کر چکی تھی۔

ایک رات قبل خیام بھی تھے، خیام میں قمرِ امامت اور نجومِ اہل بیت علیہم السلام کی ضو بھی تھی، خوابگاہیں، بستر اور سامان پارچہ جات وغیرہ بھی تھا، ماں نونہال کا مکھڑا دیکھ رہی تھی، بہنیں بھائیوں کے دیدار سے محروم نہ تھیں اور زوجہ اپنے سرتاج کے سائے میں تھی، لیکن مصائب و شدائد کے اعتبار سے شبِ دہم کو گیارھویں کی رات سے کیا نسبت ہے؟

گیارھویں کی رات بہنیں بھائیوں کے سوگ میں، مائیں اولاد کے غم میں اور ازواج اپنے آقاؤں کے ماتم میں اس طرح نالہ و فریاد اور نوحہ و بین کر رہی ہیں کہ فضا آنسو بہا رہی ہے، زمین کا جگر پھٹ گیا ہے، آسمان خون رو رہا ہے، پتھروں کے کلیجے شق ہو گئے ہیں، فرات کا پانی کھول رہا ہے، خود قاتل اشکبار ہیں، ظالم بھی رونے پر مجبور ہو گئے ہیں، آسمان نے لاکھوں راتیں اور زمین نے لاکھوں دن ایسے دیکھے ہیں، مگر اس دنیا میں مصائب و آلام اور ہجوم و ہموم و غموم کے لحاظ سے عاشور کے برابر کوئی دن نہیں، جس روز بنی ہاشم کا بھرا کنبہ مقتول ہوا، گلشن بتولؑ تاراج ہو گیا اور ابوطالب علیہ السلام کا خاندان اُجڑ گیا۔

گیارھویں کی رات کے برابر دکھ بھری رات کوئی نہیں۔ بنی ہاشم کی مستورات، خاندانِ ابوطالبؑ کی بہو بیٹیاں اور

دخترانِ رسولؐ و بتولؑ ننگے سر زیرِ آسمان، عالمِ غربت میں اپنے سارے عزیز و اقارب شہید کروا کے ذلیلوں اور لعینوں کی قید میں بے وارث و بے آسرا ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں بے پردہ بیٹھی ہیں۔ اپنے محلہ کی گلیوں سے ناواقف بیبیاں نامحرموں کے گھیرے میں ہراساں و پریشاں، غربت و حسرت کے سایہ میں بیکسی کے عالم میں اپنے شہیدوں کے غم میں سوگوار ہیں۔

خیام جو کل تک جوانانِ بنی ہاشم اور انصار جانباز سے بھرے ہوئے تھے، راکھ میں تبدیل ہو چکے ہیں اور راتوں کو جاگ کر پہرہ دینے والے جوان ہمیشہ کی نیند سو چکے ہیں۔ سامان و اسباب لٹ چکا ہے اور اتنا کپڑا بھی پاس نہیں کہ نامحرموں سے منہ ہی چھپا سکیں۔ خیام جل چکے ہیں اور سر کے بال کھل چکے ہیں۔ زیورات کانوں سے اتارے جا چکے ہیں۔ اپنے سامنے تمام عزیزوں کی لاشیں خون میں نہائی ہوئی اور ریگ و خاک میں اٹی ہوئی بے گور و کفن پڑی ہیں۔ کوئی پرسا دینے والا نہیں، کوئی دلاسا دینے والا نہیں۔ اب کوئی ناصر و مددگار نہیں رہا۔ کوئی ہمدرد و غمگسار نہیں رہا۔ خاک کا سفینہ دکھوں کی منجدھار میں پھنس گیا ہے، کشتی غموں سے بھرپور ہے۔ نہایت دکھی ہے۔ کنارہ دور ہے، ملاح بہت رنجور ہے۔

یتیموں سے ظالموں نے یہ سلوک کیا کہ بچیوں کے کانوں سے خون بہہ رہا ہے، بچوں کے چہروں پر طمانچوں کے نشان ہیں۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں سے دامنِ صحرا بھرا پڑا ہے۔ مرد کوئی نہیں رہا۔ صرف اللہ رکھوالا ہے۔ بیکس بیبیاں کبھی مدینہ کی طرف رخ کر کے وَامُحَمَّدَاہ کبھی نجف کی طرف رُخ کر کے وَاعَلِیَّاہ کی صدائیں دیتی تھیں۔ کبھی نہرِ فرات کی جانب متوجہ ہو کر عباسؑ کو پکارتی ہیں اور کبھی فرزندِ بتولؑ کی لاش کو مخاطب کر کے کہتی ہیں: ''اماں جائے! تیرے سہارے آئی تھیں، اب بتا ہمارا سہارا کون ہے؟ ہمیں کس کے سپرد کر کے گئے ہو؟''

یہ رات غم و ماتم کی اور تعزیت و سوگ کی رات تھی۔ کربلا کے شہیدوں اور شام کے غریبوں پر کائنات رو رہی تھی، عالمِ ملکوت میں سوگ تھا۔

سب سے بڑا غم جو ہر مستور اور بچی کا کلیجہ کھائے جا رہا تھا، وہ یہ تھا کہ رات کے بعد صبح کی سفیدی ہمیں موت کا پیغام سنائے گی یا بے حیاء اور ظالموں کی قید کی خبر دے گی۔ وطن جانے کی اُمید تو ختم ہو چکی تھی۔ ''ہمیں قید کر کے کہاں لے جایا جائے گا؟'' یہ فطری بات ہے کہ جب کوئی دلگداز سانحہ رونما ہو اور ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں اور افراتفری پیدا ہو اور ایسے دلخراش واقعات کے بعد مستورات اور بچے منتشر ہو جائیں تو طوفانِ غم تھمنے کے بعد ہمیشہ والدین اپنے ننھے منے بچوں کو سنبھالتے ہیں۔

خیام کی لوٹ مار اور ان کے جل جانے سے بیبیاں اور بچے بے تحاشا روئے اور صحراء کی طرف دوڑے۔ خوف و خطر بے حد تھا۔ گھبراہٹ اور دہشت چھائی ہوئی تھی۔ اس واسطے ماؤں کو بچوں کی ہوش نہ رہی اور بچوں کو ماؤں کی خبر نہ رہی۔ نہ

بچے کے ہاتھ میں ماں کا دامن تھا اور نہ ہی ماں کے ہاتھ میں بچے کا بازو۔ جب جور و جفا کی آندھی کچھ رکی تو ماؤں نے بچوں کو سنبھالا۔ بیواؤں نے اپنے لعلوں کی خبر گیری کی اور حضرت زینب وام کلثوم سلام اللہ علیہما نے اپنے یتیموں کو گنا۔ دو نہیں دو سے زیادہ معصوم گم تھے۔ یہ آنکھوں کے تارے اور ماؤں کی غربت کے سہارے کربلا میں گم ہو گئے۔

جب کسی ماں کا لعل گم ہو جائے تو ماں بے حد بیقرار ہو جاتی ہے۔ اب ان آفت رسیدہ و غم زدہ بیبیوں کی قافلہ سالار دختران علی زینب وام کلثوم سلام اللہ علیہا تھیں۔ جب ان گمشدہ یتیموں کو تلاش کرنے کے لیے نکلیں تو دیکھا کہ ایک نشیب میں دو بچے سوئے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں لعل حضرت عبدالرحمن بن عقیل علیہم السلام کے فرزند تھے۔ حضرت مسلم بن عقیل علیہم السلام کی ایک یتیمہ اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی دو بچیاں تھیں جن کی لاشیں بتولؑ کی بیٹیاں تلاش کر کر کے لائی تھیں۔ کس قدر مصیبت کی کہانی ہے کہ دن بھر مظلوم بھائی شہیدوں کے لاشے اٹھاتا رہا اور رات بھر مظلوم بہنیں یتیموں کے پامال لاشوں کو سنبھالتی رہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان ماؤں کے دل پر کیا گزری ہو گی جنہوں نے دن کو بیٹوں کی لاشیں اور رات کو بیٹیوں کی لاشیں دیکھی ہوں گی۔

عمر بن سعد نے ایک جماعت کو ان بے وارثوں کی حفاظت کے لیے مامور کیا تھا۔ نہیں معلوم کہ اس امر کی حفاظت مطلوب تھی کہ اس کی ظالم فوج کوئی مزید ظلم و ستم نہ کرے یا اس بات کی حفاظت تھی کہ یہ مسافر رات کو کہیں نکل نہ جائیں کیونکہ صبح ان کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے دربار میں لے جانا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ گیارہویں کی رات سوگوار بیبیوں اور یتیم بچوں کیلئے کھانے پینے کا انتظام بھی کیا گیا۔ یہ بات قرین قیاس ہے کیونکہ ظاہری طور پر ابن سعد کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ ہاشمی کنبہ برباد ہو چکا تھا، مرد مارے گئے تھے، یتیموں اور بیواؤں پر مشتمل پسماندگان ہیں۔ آخر حیاء آ ہی گئی ہو گی۔ ان کی مظلومی انتہاء کو پہنچ چکی تھی۔ اس واسطے ان ظالموں نے بعدِ شہادت سیدالشہداءعلیہ السلام، پانی کی پابندی ختم کر دی۔ بہر حال پانی پہنچایا گیا لیکن کس طرح اور کس قدر؟

تاریخیں خاموش ہیں۔ جو روایت بیان کی جاتی ہے، قابل تردید نہیں کیونکہ قرین قیاس ہے اور قابل تائید نہیں کیونکہ تواریخ میں موجود نہیں۔

ارواحِ پنجتنؑ پاک کی کربلا میں آمد

حضرت سیدالشہداءعلیہ السلام کی شہادت اور حضرت زینب وام کلثوم علیہما السلام کی اسیری سے قبل حضرت پنجتن پاک علیہم السلام کو اس واقعہ کا علم تھا۔ اس سرزمین سے ایک مرتبہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کا گزر ہوا تو وقت قیام بہت

روئے۔ جیسا کہ تواریخ میں مذکور ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام روانگی کے وقت، حضرت رسولؐ خدا سے خواب میں امام حسین علیہ السلام کی ملاقات وگفتگو بھی مذکور ہے، بلکہ آپؐ بحکم رسولؐ خدا کربلا میں وارد ہوئے۔

جب پنجتن پاک علیہم السلام کو معلوم ہے کہ ہمارا کنبہ کربلا میں شہید ہوگیا، گھر برباد ہوگیا اور ظلم وجور سے بنی ہاشم مارے گئے، اس کا انہیں علم بھی ہو، وہ عالمِ ارواح میں زندہ بھی ہوں، آنے پر قدرت بھی رکھتے ہوں، انہیں اس شہادتِ عظمیٰ اور حادثہ کبریٰ سے سخت درد و شدید غم بھی ہوا ہو، پھر کوئی وجہ نہیں کہ کربلا میں نہ آئیں۔ چنانچہ آئے، ضرور آئے اور اس طرح آئے جس طرح وارث میت پر آتے ہیں۔ اس طرح آئے جس طرح والدین بیٹے کی اور بہن بھائی کی لاش پر آتی ہے۔ حضرتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آنا، کھلے سر آنا، بالوں پر خاکِ کربلا کا ہونا، گریہ وبکا کرنا اور خونِ شہدائے کربلا کا ایک شیشی میں محفوظ کرنا تو ترمذی ومشکوٰۃ کی حدیثوں اور حضرت اُمّ سلمہؓ وابن عباسؓ کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

روزِ عاشور پنجتنؑ پاک کی ارواحِ مقدسہ ومغمومہ ومحزونہ دِن بھر کربلا میں شہیدوں کے دردناک مناظر دیکھتی اور اپنی بیٹیوں کے جگرخراش بین اور دل فگار نوحے سنتی رہیں۔ وہ اس وقت بھی کربلا میں موجود تھیں جب امام حسین علیہ السلام اکبرؑ کی لاش پر پہنچے اور بیتاب ہو کر لاش پر گر پڑے۔ وہ اس وقت بھی دیکھ رہی تھیں جب امام حسین علیہ السلام عباس علمدار علیہ السلام کی لاش کے سرہانے بیٹھے، بھائی کا سر گود میں لے کر غبار صاف کر رہے تھے، وہ اس وقت بھی حسین علیہ السلام کے اردگرد موجود رہیں جب پیاسے گلے پر شمر کا کند خنجر چل رہا تھا۔

جناب عبدالرزاق المقرم اپنی کتاب "مقتل الحسینؑ" میں لکھتے ہیں:

"بلٰی لقد حضَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّمَ المعرکۃ و شَاھَدَ ذَالِکَ الجَمعَ الْمُتالِّبَ عَلٰی اسْتِئصَال اھلہٖ مِنْ جَدِیْد الْاَرضِ"۔

"ہاں! حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس معرکہ قتال میں موجود تھے اور گروہ جفاکار کی ظالمانہ وقاتلانہ کارروائیاں دیکھ رہے تھے کہ روئے زمین سے ان کی آلؑ کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے"۔

بیواؤں اور دل جلی ہاشمی مستورات کی فریادیں اور پیاسے بچوں کی العطش کی صدائیں بھی سن رہے تھے۔ موصوف تحریر کرتے ہیں کہ لشکرِ کوفہ نے ایک خوفناک آواز سنی:

"ویلکم یا اھل الکوفۃ انّی اریٰ رسولَ اللّٰہ یَنظُرُ اِلٰی جَمعِکُمْ مَرَّۃً وّ اِلَی السَّمَآءِ مَرَّۃً اُخرٰی وَ ھُوَ قَابِضٌ عَلٰی الْحِیَتِہٖ المقدسۃ"۔

''وائے ہوتم پر اے اہل کوفہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ کبھی تمہاری جماعت کو دیکھتے ہیں اور کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور انہوں نے اپنی ریشِ مبارک کو پکڑا ہوا ہے۔''

''وَاِنَّا اَخَافُ اَنْ یَدْعُوَ اللّٰہَ عَلٰی اَھْلِ الْاَرْضِ فَاَھْلِکَ فِیْھِمْ''.

''اور مجھے خوف ہے کہ وہ بددعا کریں تو اہل زمین ہلاک جائیں گے اور یہ کہ کہیں میں بھی ان میں شامل نہ ہو جاؤں''۔

لیکن اہل کوفہ طمع دنیا اور ضلال میں مبتلا تھے۔ کسی نے آواز دی: ''لوگو! اس بات کی طرف توجہ نہ کرو اور مت ڈرو، یہ کسی دیوانے کی آواز ہے''۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ جبرئیلؑ تھے۔ صرف تمہارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہاں موجود نہ تھے بلکہ حضرت علیؑ و فاطمہؑ اور حضرت حسن علیہم السلام بھی ہمراہ تھے۔

جمال ملعون کا واقعہ

بحار الانوار میں سعد بن مسیب نے خود جمال ملعون کی زبانی اس کے ظلم وشقاوت کا واقعہ بیان کیا ہے، یہ ملعون کہتا ہے:

میں امام علیہ السلام کا ساربان تھا جب مدینہ سے عراق آئے۔ جب بھی وہ اپنا جامہ کسی وقت تبدیل کرتے تو میرے سپرد فرماتے۔ اس سراویل میں کمر بند نہایت اچھا تھا جس کو دیکھنے سے میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ جب ہی میرے سپرد وہ جامہ ہوتا، میں اس کمر بند کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا کہ کاش! ایسا کمر بند مجھے نصیب ہوتا۔

وہ ملعون بیان کرتا ہے: لیکن یہ حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی۔ جب امام مظلوم علیہ السلام کربلا میں شہید ہو گئے اور آپؑ کی لاش بے ادبی کے ساتھ لوٹ لی گئی، تو میرے دل میں بھی یہ حسرت پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اب حسین علیہ السلام مظلوم ہو کر مارے گئے ہیں، لاش لوٹ لی گئی ہے، جا کر کمر بند کا پتہ تو کروں، شاید میری قسمت یاوری کرے اور مدت کی تمنا پوری ہو جائے اور کمر بند ہاتھ آ جائے۔

چنانچہ میں اس مذموم ارادے اور بری نیت سے سوئے مقتل بڑھا۔ میں چھپتا چھپاتا میدان میں گیا۔ رات چھا چکی تھی اور ہر شخص اپنے اپنے ٹھکانے پر تھا۔ میدانِ قتال دن بھر گرم رہنے کے بعد سرد ہو چکا تھا۔ خون سے زمین سرخ تھی۔ جا بجا ٹوٹے ہوئے نیزوں، شکستہ تیروں اور تلواروں کے ٹکڑے نظر آتے تھے۔ سارے دن کی گہما گہمی، سواروں کے فراٹے، تلواروں کی جھنکار اور لڑائی کا شور وغل ساکن ہو چکا تھا۔ میں نے میدان میں مختلف بے سر لاشے دیکھے جن سے نور کی شعاعیں بلند ہو رہی

تھیں۔ان ہی لاشوں میں مَیں نے لعل بتولؑ کی لاش تلاش کی جو سر کے بغیر زمین پر اوندھے منہ پڑی تھی۔
باوجود یہ کہ خاک وخون میں غلطاں تھی، زخموں کی کثرت تھی لیکن نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہی غریب مدینہ، مظلومِ کربلا، قافلہ سالار شہداء کی لاش ہے۔ یہی حضرت رسول اللہ کا دلبر، امیرالمومنینؑ کا نورِ نظر، حضرت زہراؑ کا لختِ جگر اور زینب وام کلثوم سلام اللہ علیہما کا برادر حسین مظلوم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔
مجھ پر خباثت اور شقاوت غالب آچکی تھی۔ میں لاش کے قریب گیا اور اس خیال سے کہ کوئی دیکھ نہیں رہا اور لاش بھی بے وارث ہے، کمر بند اُتارنے کے ناپاک ارادے سے میں کمر بند کھولنے لگا۔ دیکھا کہ امامِ مظلوم نے کمر بند کو بڑا مضبوط کر رکھا ہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی اور کمر بند کھولنے لگا۔ اسی اثناء میں امام علیہ السلام کا ہاتھ نہایت مضبوطی سے کمر بند کے اوپر آگیا۔ میں کمر بند کو امام علیہ السلام کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی لیکن میں ان کا ہاتھ نہ ہٹا سکا۔ بدبختی غالب تھی، حیاء اور ایمان رخصت ہو چکا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی زہراؑ کا نورِ نظر ظالموں کے ہاتھوں لٹ چکا تھا۔ میں بھی اسی وجہ سے بے ڈر ہو کر میدان کی طرف بڑھا، ٹوٹی ہوئی تلوار کا ایک ٹکڑا ملا، میں وہ اٹھا لایا اور اس کند ٹکڑے سے میں مظلوم کا ہاتھ کاٹنے لگا۔ میں نے نہایت ہی بے رحمی سے دلبر بتولؑ کا دایاں ہاتھ کلائی سے کاٹ ڈالا۔
ہاتھ کاٹنے کے بعد میں پھر کمر بند کھولنے کی فکر میں تھا کہ ناگاہ کمر بند پر اس بیکس و بے وارث مظلوم کا بایاں ہاتھ آگیا۔ میں نے بایاں ہاتھ بھی کمر بند سے ہٹانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میں وہی تلوار کا کند ٹکڑا لیا اور اس کو دوسرے ہاتھ پر بھی چلانے لگا۔ کند ہونے کی وجہ سے دیر تو لگی، مگر میں دوسرا ہاتھ بھی کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔
اب دونوں ہاتھ کٹ چکنے کے بعد میں نے دوبارہ کمر بند کھولنے کا ارادہ کیا، اب میں دیکھتا ہوں کہ جیسے امام علیہ السلام اُٹھ کر بیٹھ گئے ہوں، اسی اثناء میں زمین کانپنے لگی، آسمان تھرانے لگا اور میدانِ کربلا رونے پیٹنے کی آوازوں سے بھر گیا۔ میں ڈر کر لاش سے دور بھاگ گیا اور دوسری لاشوں کے درمیان جا کر چھپ گیا۔
مجھ پر شدید وحشت طاری ہو گئی اور میں کانپنے لگا کہ اسی اثناء میں ایک نور کی عماری نازل ہوئی، جس میں سے تین مرد اور ایک عورت باہر آئے۔ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور اس طرح نالہ وفریاد بلند کر رہے تھے کہ جس طرح ضعیف والدین جوانمرگ پسر پر نوحہ و ماتم کرتے ہیں۔ آواز آتی تھی: ''ہائے میرے مظلوم بیٹے''، کوئی کہتا تھا: ''میرے ناز پروردہ بیٹے! میرے پیاسے بیٹے! میرے بے وارث فرزند! کیا مرنے کے بعد بھی تیری لاش پر ظلم بند نہیں ہوئے؟''
ان چار اشخاص کے ساتھ اور بھی بہت سے زن و مرد تھے، سب ماتمی لباس میں تھے اور کربلا میں مظلوم پر گریہ وبکاء

کرنے آئے تھے۔ فرشتے گریاں صورت میں کثیر تعداد میں ان کے ساتھ تھے۔ گیارہویں کی رات تھی، میں نے دیکھا کہ انسانوں کی صورتوں اور ملائکہ کے پروں سے صحرا بھر گیا تھا، رونے پیٹنے اور گریہ وبکاء کرنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اتنے میں آواز آئی:

''میرے لخت دل حسینؑ! تیرا نانا تجھ پر قربان ہو جائے! تیری موت نے تیرے نانا کے جگر کو زخمی کر دیا ہے۔ بیٹا! تو نے اپنا فرض خوب ادا کیا۔ میری نصیحت پر پورا پورا عمل کیا۔ میرا اسلام قبول کر! بیٹا! یہ تیرے بابا علیؑ ہیں، یہ تیری مہربان والدہ بتولؑ ہیں، یہ تیرے شفیق برادر حسن مسموم علیہ السلام ہیں، بیٹا! تجھے رونے آئے ہیں، تجھے تیرے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، تیری غربت کی موت کو پرسا دینے آئے ہیں۔ بیٹا! تیری لاش پر رونے والا کوئی نہیں تھا، تیرے رونے والے اپنے دکھوں میں مشغول ہو گئے۔ بیٹا! ہمارا اسلام قبول کر! تو نے میرے دین کی حفاظت کی، میری شریعت کو مٹنے سے بچایا''۔

میں نے دیکھا کہ امام علیہ السلام کی لاش گویا اٹھ بیٹھی اور آواز آئی:

''نانا! مظلوم نواسے کا سلام قبول فرمایئے، بابا! مجروح پسر کا سلام قبول فرمایئے، اماں! بے وارث نورِ نظر کا سلام قبول فرمایئے، بھائی! غریب وبیکس برادر کا سلام قبول ہو! نانا! راضی ہو؟ بابا! راضی ہو؟ نانا! ہمارے مرد مارے گئے، نانا! آپ کی امانتوں کو صحراء میں لایا مگر میری موت کے بعد انہیں ظلم وجور سے لوٹا گیا، ان کے گھر جلا دیئے گئے، ان امانتوں کو جنگل میں بے سہارا چھوڑ چکا ہوں، نانا، بابا، اماں، بھائی ! اپنی آنکھوں سے ہماری حال دیکھ لیجئے، نانا! یہ آپ کی اُمت کا سلوک ہے ہمارے ساتھ!''

عزادارو! لٹی ہوئی اور کٹی ہوئی لاش کے آس پاس یہ ورثاء بیٹھ کر رونے لگے۔ حضرت مظلومہ ومحرومہ مادرِ امام حسینؑ سلام اللہ علیہا کی اواز آئی: ''بابا! اجازت ہے؟ میں اپنے غریب ومظلوم بیٹے خون سے اپنے سر کے بالوں کو خضاب کر لوں؟''

آواز آئی: ''بیٹی! تو بھی سر اور پیشانی پر خون لگا، ہم بھی سر اور پیشانی خون سے سرخرو کریں گے اور روزِ قیامت اسی حال میں دربارِ خدا میں پیش ہو کر فریاد کریں گے''۔

''بیٹا! تیری بیکسی ومظلومی ہم پر کس قدر گراں ہے!

بیٹا! تیرے ہاتھ کس ظالم نے کاٹے ہیں؟ اسے شرم نہ آئی؟ کیا تجھے بے وارث خیال کیا تھا اس نے؟ کس ظالم نے تیری انگوٹھی کے لالچ میں تیری انگلی کاٹ لی ہے؟ اور کس ملعون نے تیرے کمر بند کی حرص میں تیرے ہاتھ قطع کر ڈالے ہیں؟ تو اتنا بے وارث اور غریب سمجھ لیا گیا ہے؟''

جمال لعین کا بیان ہے کہ مظلومِ کربلا نے تمام ماجرا نانا کو سنایا اور کہا: ''نانا! وہ ملعون لاشوں کے درمیان چھپا ہوا ہے''۔

پس حضرت رسول اللہ میرے پاس آئے اور کہا: ''ظالم! میں ان ہاتھوں کے بوسے لیتا تھا، ملائکہ ان ہاتھوں کو چومتے تھے، وہ ہاتھ بوسہ گاہِ علیؑ و بتولؑ تھے، نازپروردۂ بتولؑ کے کس بیدردی سے تو نے ہاتھ قطع کر ڈالے؟ کیا ظالموں کے ظلم کم تھے؟ کوئی کسر رہ گئی تھی جو تو نے ہاتھ قلم کر کے پور کر دی؟ خدا تیرے ہاتھ قطع کرے''۔

جمال کا بیان ہے کہ رسول اللہ کی بددعا سے میرے دونوں ہاتھ قلم ہو گئے اور چہرہ مانندِ شبِ سیاہ تاریک ہو گیا۔

عزادارو! اس طرح شہداء کی لاشوں اور جلے ہوئے خیام، بے وارث مسافروں، بیکس یتیموں اور بے آسرا بیواؤں کے پاس پنجتن علیہم السلام کی غمگین و محزون روحیں مصروفِ گریہ و بکاء رہیں۔

شہادتِ امام حسین علیہ السلام پر قدرتی آیات و آثار کا ظہور

حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی مظلومی و بیکسی اور بے دردی کی شہادت نے عالمِ امکان میں تلاطم پیدا کر دیا۔ عالمِ ناسوت کیا، عالمِ لاہوت اور کراتِ کائنات میں تزلزل و تغیر بپا ہو گیا۔ سیاہ آندھیاں چلنے لگیں اور آسمان سے خون کی بارش نازل ہوتی رہی۔ بعد از قتل امامِ مظلوم علیہ السلام اس قدر تاریکی چھا گئی کہ دن میں تارے نظر آنے لگے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا، یہ کیفیت ایک گھنٹہ برابر رہی۔ لوگ سمجھے کہ قیامت آ گئی ہے، کپڑوں اور دیواروں پر خون کے آثار دکھائی دینے لگے، مٹکے اور گھڑے بجائے پانی کے خون سے بھرے ہوئے نظر آنے لگے۔

اگر زمین سے کوئی ڈھیلا یا پتھر اُٹھایا جاتا تو اس کے نیچے سے جوش مارتا ہوا خون برآمد ہوتا۔ شہادت سے قبل آسمان کے کنارے شفق سے خالی ہو گئے تھے اور بعد از شہادت طلوع و غروب کے وقت خونِ حسینؑ سے کنارے رنگین ہو جاتے۔

جنابِ سفیان ثوری اپنی دادی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ بیان کرتی ہیں:

''میں زمانۂ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے وقت جوان تھی۔ آسمان کئی دن تک آپؑ کے ناحق خون پر روتا رہا اور بغیر بادلوں کے بارش ہوتی رہی جو گریہ و بکائے آسمان کی دلیل ہے''۔

آسمان سے خون کا مینہ برسا جس کا اثر کپڑوں اور دیواروں پر کئی روز تک رہا۔ خود حوروں، جنات نے عالیات میں، ملائکہ نے طبقاتِ سمٰوٰت میں، پرندوں نے ہوا میں، مچھلیوں نے دریا میں اور وحشی جانوروں نے صحرا میں مظلومِ کربلا علیہ السلام کی بیکسی پر گریہ و بکاء کیا اور خلاقِ عالم، جبار و قہار نے اپنے قہر و غضب کا اظہار مذکورہ بالا نشانیوں کی صورت میں کیا۔

فرزندِ رسولؐ کی غریب الوطنی اور بے گناہی پر تمام انبیاء و اوصیاء روئے۔ اپنے بھی روئے پرائے بھی روئے اور یہی وہ

مظلوم ہے۔ جس کے بے جُرم و خطا قتل پر دوست اور دشمن دونوں روئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمٰی سلام اللہ علیہا کے خواب اس واقعہ مفجعہ کے اثرات کے شاہد ہیں۔ دونوں نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں اور سر اور ریش مبارک خاک سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت ام سلمٰی نے پوچھا تو جواب دیا: ''حسینؑ قتل ہو گیا! میں حسینؑ کی اور انصارانِ حسینؑ کی قبریں کھودتا رہا''۔

حضرت سلمٰی بیقراری میں اُٹھ بیٹھیں اور اس شیشی کو دیکھا جس میں حضرت رسول اللہؐ کی دی ہوئی خاک کربلا تھی، وہ مٹی خون بن کر جوش مار رہی تھی۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے دیکھا تو پوچھنے پر جواب ملا: ''میں کربلا گیا تھا۔ میر الخیب جگر ظلم و جور سے شہید کر دیا گیا میرے ہاتھ میں ان کا ان کے اصحاب کا خون ہے، جو آج کے دن ہر شہید کی لاش سے میں جمع کرتا رہا''۔

جنابِ دعبل خزاعی اپنے دادا سے روایت بیان کرتے ہیں: ''میری ماں نے ایک درخت کو دیکھا جو بہت خشک ہو چکا تھا۔ اس کے نیچے حضرت رسولِ خدا نے وضو فرمایا۔ وہ درخت ''اُمّ معبد الالخزاعیہ'' کا تھا۔ حضورؐ کے وضو کے پانی کی برکت سے وہ درخت سرسبز و شاداب ہو گیا۔ کونپلیں پھوٹ آئیں، برگ و بار آ گئے اور وہ درخت اپنے ٹھنڈے سائے اور میٹھے پھلوں سے لوگوں کو فیضیاب کرتا رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے بعد اس درخت کے پھل کم ہو گئے اور شادابی میں کمی آ گئی۔ پھر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس پر پھل آنا بند ہو گئے۔ تب لوگ صرف اس کے پتوں سے استفادہ کرتے اور انہیں اپنی بیماریوں کی شفا کے لیے استعمال کرتے تھے۔

پھر کچھ مدت کے بعد ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ اس درخت کے تنے اور شاخوں سے خون ابل رہا ہے۔ اس حادثے نے لوگوں کو دہشت ناک کر دیا اور اس دن جب رات چھا گئی تو فضاء میں رونے اور نوحہ کرنے کرنے کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ لوگ گریہ و بکاء کی آوازیں سنتے تھے رونے والوں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ کوئی با آواز بلند یہ شعر پڑھ رہا تھا:

يَا ابنَ الشَّهِيدِ وَ يَا شَهِيداً عَمُّهُ
خَيرُ العُمُومَةِ جَعفَرَ الطَّيار
عجباً لِمَقتُولٍ اَصابکَ حدُّهُ
فِي الوَجهِ مِنکَ وَ قَدْ عَداکَ غبار

اس کے بعد جب قتلِ حسین علیہ السلام کی خبر لوگوں تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ درخت کے تنے میں جوشِ خون کا وہی وقت تھا جس وقت جولؔ کے لعل پر شمر کا خنجر چلا تھا۔

''الدمعۃ الساکبہ'' میں بیان کیا گیا ہے کہ بعد از شہادت، امام علیہ السلام کے اونٹ بھی ظالموں نے لوٹ لئے تھے۔ ان میں ایک خاص آپ کی سواری کے مخصوص تھا۔ اسی ناقہ پر سوار ہو کر امام علیہ السلام روزِ عاشور لشکرِ ابن سعد کو وعظ و نصیحت کرنے گئے تھے۔ جب قتلِ امام علیہ السلام پر فوج پسرِ سعد میں تکبیریں بلند ہوئیں اور سادات کے خیام میں سر پیٹنے اور نوحہ و مرثیہ کی آوازیں بلند ہوئیں تو یہ ناقہ میدان میں شہیدوں کے درمیان اپنے آقا کی لاش کو تلاش کرنے لگا۔

اس نے مقتول آقا کی لاش پہچان لی اور فرطِ غم سے بلبلانے لگا۔ دائیں بائیں دیکھتا اور اپنی زبان میں آہ و بکاء کرتا رہا، کہ فوجِ اعداء کے تیس سوار اسے پکڑنے کے لیے آ گئے۔ اس نے خیمہ گاہ کا رخ کیا مگر فوجی اسے خیمہ گاہ سے روک کر اپنے خیمہ میں لے جانا چاہتے تھے، مگر وہ اسے منزلِ مقصود سے روک نہ سکے۔

جس خیمے کے ساتھ اور جس جگہ وہ بیٹھنے کا عادی تھا، اسی جگہ آیا مگر دیکھا کہ خیمہ جل چکا ہے، نہ گھر ہیں اور نہ ہی گھر والے ہیں۔ ناچار ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ غم سے بیقرار اور نڈھال ہو چکا تھا۔ جانور ہی تھا مگر وفادار تھا۔ اس کا دل زخمی ہو چکا تھا۔ ظالموں نے اسے ذبح کیا اور گوشت تقسیم کر دیا۔ جب گوشت کو پکایا گیا تو دیگوں میں آگ بن گیا اور پکنے کے بعد انتہائی تلخ ہو گیا اور اس کے بعد بھی جتنے اونٹ ذبح کئے گئے، ان سب کا گوشت سخت تلخ نکلا۔

بلال بن نافع کا بیان ہے کہ میں نے امام علیہ السلام کا سر دیکھا۔ باوجود یہ کہ خاک و خون میں غلطاں تھا، مگر چہرہ ایسا مبارک تھا اور اس سے ایسا نور ساطع تھا اور انؑ کے جمالِ مبارک کی ایسی ہیبت تھی کہ میں انؑ کی موت کا غم بھول گیا اور زہراؑ کے لعل کا حسن و جمال دیکھنے میں محو ہو گیا۔ ریشِ مبارک اور زُلفوں پر وسمہ رنگ تھا۔ سفید نورانی چہرہ زلفوں کے سیاہ حجاب میں گھرا ہوا تھا۔ اس منظر کو جناب میر انیس نے یوں بیان کیا ہے:

وہ ریشِ مُخضب وہ رُخِ سیّد والا ۔۔۔ ہے چاند نے منہ شام کے پردے سے نکالا
وہ گیسوئے مُشکیں کا رخِ پاک پہ ہالا ۔۔۔ تھا صبح پہ دامن شہِ معراج نے ڈالا

رُخساروں پہ کچھ زلف سی لہرائی ہوئی ہے
خورشید پہ زہراؑ کے گھٹا چھائی ہوئی ہے

✿✿✿

اھلبیت علیھم السلام کا تعارف

اھل بیتؑ رسولؐ بعد از رسولؐ سچے ھادی ھیں
سرھائے شھدا ء و اسیرانِ آلِ محمدؐ کا
کربلا سے سفر، شھداء سے وداع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

"صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ. غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ".

"ان لوگوں کا رستہ جن کو تو نے خاص نعمتیں عطا فرمائی ہیں، نہ کہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا"۔

بندۂ مومن نے اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی دعا میں "صراط مستقیم" پر چلنے اور ثابت قدم رہنے کی حمد و ثناء اور تخصیص عبادت و استعانت کے بعد دعا مانگی:

"خدایا! ہمیں صراط مستقیم پر چلا"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تعلیم کی ہوئی اس دعا میں "صراط مستقیم" کی وضاحت کر دی کہ ان لوگوں کی راہ پر چلا جنہیں تو نے اپنی نعمتوں اور مہربانیوں سے نوازا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ذوات مقدسہ مورد انعامات الٰہی اور مستفیض فیوضات خدائی ہیں، ان کی راہ، راہ راست اور منزل مقصود تک بغیر کھٹکے اور اندیشے کے پہنچانے والی ہے۔ اس میں رہزن کا گزر نہیں، چور کا ڈر نہیں، اس کے پڑاؤ خطرات سے مامون ہیں اور موذ ہلاکتوں سے مصئون ہیں۔ یہ راہ ہموار ہے، اس میں کوئی نشیب و فراز نہیں اور اس قدر صاف ہے کہ خار و خاشاک کا شائبہ تک نہیں۔ سفری سہولتیں اس میں بھرپور ہیں اور صعوبتیں اس سے دور ہیں۔ اب اس راہ کو پہچاننا اور پہچان کر اس پر گامزن ہونا سالک کا فرض ہے۔

ہاں! ان لوگوں کی پہچان ازبس ضروری ہے جن کی یہ راہ ہے اور جن پر فیضان الٰہی کی بارش ہے۔

ان نفوس مقدسہ کا قرآن پاک میں ایک جگہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ

الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصَّالِحِينَ وَ حَسُنَ اُولٰئِکَ رَفِيقاً"

"جس کسی نے بھی اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی وہ ان مقدس حضرات کے ساتھ ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ لوگ نبی ہیں، صدّیق ہیں، شہداء ہیں اور صالحین ہیں اور یہ بزرگ بہترین رفیق ہیں"۔

اگر مسافر کے ساتھ کوئی ایسا رفیق سفر ہو جو ساری راہ سے واقف اور منزل سے آشنا ہو تو ایسے مہربان کی معیت میں وہ سفر کرے تو اس کے بھٹک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سالک اور منزل کے درمیان دوری ختم ہو جاتی ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں چار گروہ رہنمائے منزل قرار پائے ہیں۔ انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالحین۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ چونکہ منزل روحانی ہے، اس واسطے اس کا راستہ بھی روحانی ہے، تو یہاں راہ سے مراد وہ روحانی اعمال اور اخلاق و اطوار ہیں جو خدا کے قریب اور اس کا پسندیدہ بندہ بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح صراطِ مستقیم سے مراد وہ آدابِ زندگی، حیاتِ دنیوی کو بسر کرنے کا وہ طریقہ، جو تمام زندگی کے تمام پہلوؤں کو خوشنودیٔ خدا کے سانچے میں ڈھال کر بخیر و خوبی انجام تک پہنچائے۔

چونکہ صراطِ مستقیم، اقوال و اعمال اور علم و عمل پر مشتمل ہے، اس کا تعلق فکر و نظر کے ساتھ بھی ہے اور قول و عمل کے ساتھ بھی۔ اس واسطے صراطِ مستقیم کی ہدایت کے لیے خدا نے ایسے رہنما بھیجے ہیں جو بندوں میں رہ کر، ان میں گھل مل کر، زبان کے ساتھ اور عمل کے ساتھ تبلیغ کر سکیں تاکہ لوگ کانوں کے ساتھ ہدایات سنیں، آنکھوں کے ساتھ ان کا عمل دیکھیں، قلب و دماغ کے ساتھ انہیں پہچان لیں اور اپنے عقیدہ میں ان کو مان لیں، نیز اعمال و آداب میں ان کی پیروی کریں۔

جب ایک شاہراہ چھوٹی راہوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک راہ کی چار راہیں بن جاتی ہیں تو چلنے والے کو راہِ راست کی پہچان میں دشواری پیش آ جاتی ہے۔ اسی طرح ایک سڑک کا مسافر جب چوک کی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے تو اسے منزل پر پہنچانے والی اصلی سڑک کی شناخت میں دقت پیش آتی ہے۔ اگر ایک ہی راہ ہو تو دشواری کیسی؟ راہوں کی کثرت چلنے والے کے قدم روک لیتی ہے اور مسافر بیچارہ حیران و پریشان رہ جاتا ہے۔ اس وقت ایک کامل رہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے صحیح اور سچے رہبر کی ہدایت درکار ہوتی ہے، جو ان راستوں کو جانتا ہو اور سالک کی باحسن رہنمائی کر سکے۔

اسلام چونکہ متعدد فرقوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور ہر فرقہ اپنی صداقت کا دعویدار ہے اور ہر کوئی اپنی راہ کو صراطِ مستقیم خیال کرتا ہے، حالانکہ نہ تمام فرقے حق پر ہیں اور نہ سب کی راہیں صراطِ مستقیم ہیں۔ اس واسطے ہمیں سچے ہادیوں اور کامل رہنماؤں سے صراطِ مستقیم کا پتہ کرنا چاہئے اور اس کے سوا ہمارے لیے کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے کہ رہبرِ اعظم، ہادیٔ کامل، مالکِ

اُمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دریافت کریں:

''یارسولؐ اللہ! آپؐ کے فرمان کے مطابق آپ کی اُمت تہتر فرقوں میں بٹ گئی، مسلمان گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر گروہ کی ایک راہ ہے اور ہر گروہ کا ایک رہنما ہے، ہم کس راہ پر چلیں اور کس رہنماء کا ہاتھ تھامیں؟''

یہ ایک ضروری سوال ہے جو ہر مسلمان کے دماغ میں ابھرتا ہے، لیکن اس سوال سے پہلے ہادی امت، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اقوال اور اعمال کے ذریعے اُمت کو اس کا جواب پیشگی دے دیا ہے۔ جب انہیں علم تھا کہ امت فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی اور صحیح راہ کثیر راہوں میں پوشیدہ ہو جائے گی، جھوٹے ہادی بکثرت ہوں پیدا ہو جائیں گے، اصلی رہنما نقلی رہنماؤں میں چھپ جائیں گے، تو سرکار رسالت خود اس بات کا بندوبست کر گئے اور جانے سے پہلے کئی مرتبہ، کئی مقامات پر قول اور عمل کے ذریعے سچے ہادی اور ان کی سچی راہ دکھلا گئے۔ ان کی معرفت کروا گئے اور ان کا طریقہ بتا گئے۔ ان کا اور ان کی راہ کا نقشہ بھی سمجھا گئے۔

اھلبیت علیھم السلام کی شان

راہِ راست کی تلاش کرنے والے، سچے امام کی پہچان کرنے والے، کچھ کوشش تو بھی تو کر! دل و دماغ اور عقل و فہم سے کام لے، سچی نیت سے حق کو تلاش کر، خالق خود مدد کرے گا۔

''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا''.

''جو لوگ ہمارے بارے (میں اور راہِ حق کی تلاش) میں کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں''۔

اور جو صحیح راہ پر چلنے کی کوشش کریں، ہم انہیں منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

حضرات سنئے! کان کھول کر، دل لگا کر، تعصب کے حجاب ہٹا کر، پرانے نقوش دل سے مٹا کر اور نیت کو خلوص سے سجا کر سنو! سرکار رسالت نے ابہام کے پردے چاک کر دیے ہیں، شک و شبہات کے غبار صاف کر دیے ہیں، یقین کی شاہراہ متعین کر دی ہے۔ جرنیلی سڑک کو گمنام پگڈنڈیوں سے جدا کر دیا ہے اور صراطِ مستقیم کو کج راہوں سے ممتاز کر دیا ہے۔ بعد از رسالت مآب، حضرتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، اس زمانے میں اُمت کے دو حصے تھے: ایک اصحاب اور دوسرے اہل بیتؑ۔ اصحاب میں سالے اور سسرال، اہل بیت علیہم السلام میں بھائی اور آل۔ اس زمانے میں مسلمان انہی دو حصوں میں تھے۔ یعنی آلؑ اور اصحاب۔ اگرچہ آل بھی اصحاب ہے، کیونکہ انہوں نے صحبتِ رسولِؐ خدا کا شرف حاصل کیا ہے لیکن انہیں قرابتداری

اور خونی و نسبی رشتہ میں شریک ہونے کے علاوہ خاص اوصاف اور خاص فضائل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اشتراک تھا مگر اصحاب ان خصائص سے محروم تھے۔ اصحاب، آلِ رسولؑ اور اہل بیتِ پیغمبر نہیں۔ اس دور کا ہر سچا مسلمان صحابی تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اصحاب میں آل کا کیا مقام تھا اور آل کے ساتھ اصحاب کو کیا نسبت تھی۔ سرکارِ رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت علیہم السلام کو جس مقام پر پیش کیا ہے، بحیثیت پیشوا، امام اور رہنما کے ہے اور صحابہ کو ان کی اطاعت، محبت اور ان کے دامن سے متمسک رہنے کا حکم دیا ہے۔

کوئی ایسا مقام نہیں ملتا جہاں اہل بیت علیہم السلام کو صحابہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہو۔ صحابہ سے علم حاصل کرنے، ان سے فیضیاب ہونے اور کسی مسئلہ میں ان کی جانب رجوع کرنے کا امر صادر فرمایا ہو۔ بلکہ بیسیوں مقام پر صحابہ کو، امت کو اور تمام مسلمانوں کو نیز ہر دور کے اہل ایمان کو تا قیامت اہلبیت علیہم السلام کا دامن پکڑنے، ان پر درود بھیجنے، ان سے محبت کرنے، ان کی اقتداء اور اطاعت کرنے، ان کے در سے فیضیاب ہونے، قرآن فہمی میں ان کے پاس جانے، علمی مشکلات میں ان سے مدد مانگنے اور ان سے مسائلِ دین حل کروانے کی طرف توجہ دلائی ہے اور خاص تاکید کی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" سے اہل بیت نبوت علیہم السلام مراد ہیں۔ جن میں نبی بھی ہیں، بلکہ سید الانبیاء بھی ہیں، صدیق اکبر بھی ہیں، سید الشہداء بھی ہیں اور سید الصالحین بھی ہیں۔

اضافۂ ایمان، زیادتی یقین اور ترقی درجاتِ عرفان کیلئے پیغمبر اسلام کی اہل بیت علیہم السلام کے حق میں احادیث درج کرتے ہیں:

"مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِیْ فِيْكُمْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجٰی وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَ هَوٰی".

"لوگو! میرے اہل بیتؑ کی مثال تم میں کشتی نوح کی مانند ہے۔ جو اس میں سوار ہو گیا وہ گمراہی سے نجات پا گیا اور جو اس کشتی نجات میں سوار ہونے سے رہ گیا، وہ ہلاک ہو گیا اور بحرِ ضلالت میں غرق ہو گیا"۔

اس حدیث مبارکہ کی صحت سے کسی کو انکار نہیں۔ اس میں اہل بیت علیہم السلام کو نجات دہندہ اور اُمت کو، صحابہ کو نجات خواہندہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کشتی سے مراد مادّی کشتی نہیں، بلکہ روحانی سفینہ ہے، جس کو مادّی کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر سمجھایا گیا ہے کہ اگر گمراہی سے بچنا چاہو، نجات حاصل کرنا چاہو، جہنم سے برأت، آگ سے نجات اور جنت کے درجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اہل بیت علیہم السلام کی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ یعنی ان کی پیروی کرو، ان کی راہ پر چلو، ان کی ہدایات پر عمل کرو اور

انہی کو رہبر بناؤ۔

حدیث مذکورہ تو کافی تشریح چاہتی ہے مگر اختصار کی خاطر صرف ترجمہ و مختصر وضاحت پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

"اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِہٖ".

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جو علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ درِ علیؑ پر آئے"۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

"لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَ اْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا".

"یہ نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کی دیواروں سے آؤ لیکن نیکی تو اس شخص کی ہے، جو تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آئے"۔

آنا جانا تو گھروں میں دروازوں سے ہی ہوتا ہے اور اس زمانے میں تو ہر بڑے شہر کے اردگرد فصیل ہوتی تھی اور اس فصیل میں دروازے ہوتے جن سے شہروں میں آنے والا داخل ہوتا اور جانے والا خارج ہوتا۔ اسی وجہ سے کسی شہر میں دخول و خروج دروازے ہی سے ہوتا تھا، یہی مثال گھروں کی ہے۔

جس طرح کہ حاجت مند شہر یا گھر میں سے کچھ حاصل کرنا چاہے تو دروازے سے داخل ہوتا ہے اور وہی نفع و متاع حاصل کرنے کی راہ ہے۔ اس واسطے آپؐ نے خود کو شہر کی مثال دے کر خزانۂ علم ظاہر کیا اور علیؑ کو دروازے سے تشبیہ دے کر علوم کے خزانے حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بنایا۔ یعنی جو کچھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ہے، اس کے وارث علی ابن ابیطالب علیہم السلام ہیں۔ اس خزانے کی تقسیم کرنے والے امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہم السلام ہیں اور انہی کی راہ صراطِ مستقیم اور راہِ نجات ہے۔ جن علوم کے حضرت رسولؐ خدا شہر ہیں انہی علوم کا دروازہ حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

پس علومِ پیغمبرؐ، دینِ نبی اور اسلامی شریعت کی سند صرف امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہما السلام ہیں۔ اسلام اگر ان سے حاصل کیا جائے تو وہ صحیح اسلام ہے اور اگر ان کے مخالف سے حاصل کیا جائے تو وہ غیر معتبر ہے کیونکہ ہر ادارہ کا ایک نمائندہ ہوتا ہے جس کے پاس اس ادارہ کا مال ہوتا ہے۔ غیر ادارہ اس مال کی بیع کا مجاز نہیں۔ اسی طرح ادارۂ نبویؐ کے نمائندہ حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ لہٰذا نبوی دین علیؑ کے پاس ہی ہے۔ غیر چونکہ ادارہ نہیں، لہٰذا ان کا دین نبوی نہیں اور اگر کوئی دین ہے تو وہ جعلی ہی ہوسکتا ہے، اصل نہیں ہوسکتا۔

"یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ".

"یا علیؑ! آپ کی نسبت میرے ساتھ ایسی ہے جس طرح ہارون کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

ہر نبی کا ایک وزیر ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر جناب ہارونؑ تھے۔ اسی طرح حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وزیر حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی:

"رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَ یَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هَارُوْنَ اَخِیْ".

"میرے ربّ! میرا سینہ کھول دے، میرے کارِ نبوت کو میرے لئے آسان کردے، میری زبان کی گرہ کھول دے، لکنت دور کردے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے اہل میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا تھی، مطالبے تھے، جو حقیقت پر مبنی تھے اور تبلیغ رسالت کے لیے ان امور کی ضرورت حتمی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوئی اور ان کے مطالبات منظور ہوئے۔ حضورؐ ختمی مرتبت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اور ان کی امت کو امت کے ساتھ مطابقت دی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

"اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا".

"ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا جو تم پر گواہ ہے۔ جس طرح فرعون کی طرف رسول بھیجا گیا تھا"۔

رسالت میں مطابقت تھی، اُمت میں مطابقت تھی، وزارت میں بھی مطابقت، ہارونؑ، موسیٰ علیہ السلام کے اور علیؑ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وزیر، جو راہ نبی کی، وہی راہ وزیر و وصی کی۔

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَ اِنَّهُمَا لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ".

"میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی عترتِ اہل بیتؑ، جب تک تم ان کا دامن پکڑے رکھو گے (یعنی اطاعت کرو گے) اور ان کے ساتھ رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ جائیں گی"۔

یہ حدیث مبارکہ بھی شک وشبہ سے بلند تر ہے اوراس کی صحت واعتبار پر بھی تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ کیونکہ علاوہ دوسری کتب احادیث کے صحاحِ ستہ میں بھی مذکور ہے اوراس حدیث کی دلالت، اہل بیت علیہم السلام کی امامت وخلافت پر واضح ہے۔ خطاب مسلمانوں سے اور تمام مسلمانوں سے ہے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں سے لے کرتا قیامت جملہ مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس خطاب میں ہر ملک وقوم کے مسلمان شامل ہیں اور ہر دور کے، جن میں پہلے دور کے مسلمانوں کو صحابی اور دوسرے دور کے مسلمانوں کو تابعی کہا جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں تم میں کتاب اور اہل بیت چھوڑ رہا ہوں اور ان کو نہایت اہم اور گرانقدر قرار فرمایا۔ یقیناً یہ تمام اُمت پر ایمان، معرفت، عمل، مرتبہ اور درجات میں بھاری ہیں اور وہ ان سے ہلکے ہیں۔ قرآن اور اہل بیتؑ افضل اور جملہ مسلمان مفضول ہیں۔ ان کو اس لیے اپنی قوم میں چھوڑا کہ مسلمان میرے بعد گمراہ نہ ہوں۔ گمراہی سے بچانے، ضلالت سے ہٹانے، راہِ راست پر چلانے کے لیے قرآن کو قانون کی حیثیت حاصل ہے اور اہلبیت علیہم السلام کو اسلامی قانون کی انتظامیہ وعدلیہ کی حیثیت سے چھوڑا۔

یعنی مسلمان ضلالت سے بچنے والے اور اہل بیت علیہم السلام ان کو بچانے والے ہیں۔ مسلمان صراطِ مستقیم پر چلنے والے اور اہلبیت علیہم السلام ان کو صراطِ مستقیم دکھانے والے ہیں۔ الغرض چلنے والے مسلمان اور چلانے والے اہل بیتؑ ہیں۔ پیروکار تمام مسلمان، جن میں صحابی، تابعی، اولیا، صالحین، غوث وابدال متقین، یہ سب اہل بیت علیہم السلام کی امامت کے سائے اور ولایت کی حدود کے اندر ہیں۔ دامن اہل بیت علیہم السلام کا، ہاتھ اُمت کے۔ رہنمائی اہل بیت علیہم السلام کی، قدم اُمت کے۔ امامت اہل بیت علیہم السلام کی، اتباع اُمت کی۔ شرط ہدایت ہے کہ جب تک دامن ہاتھ میں رہے گا ہدایت جاری رہے گی۔ ادھر ہاتھ کانپا، کمزوری آئی، سستی وکوتاہی ہوئی، دامن چھوٹ گیا، گمراہی کے گڑھے میں گر پڑو گے اور پھر نکل نہ سکو گے۔

ہدایت کرنے والا امام ہوتا ہے اور ہدایت پانے والا مقتدی، لہٰذا اہل بیتؑ اور ماسوائے اہل بیت علیہم السلام خواہ کوئی بھی ہو، کسی زمانے میں بھی، ان کا مقتدی اور پیروکار۔ جو ان کی اقتداء سے گیا اگر وہ مومن ہے تو ایمان سے، مسلم ہے تو اسلام سے اور اگر متقی ہے تو تقویٰ سے گیا۔

پیغمبرِ اسلام نے اپنے بعد کوئی ایک ہی ہادی نہیں چھوڑا۔ کتاب یعنی قرآن کو اور اہل بیت علیہم السلام کو اپنے بعد ہادی مقرر فرمایا اور ہدایت کی شرط، ان دونوں سے تمسک کو قرار فرمایا۔

اگر کسی نے اہل بیتؑ کو چھوڑ دیا تو بھی گمراہ، قرآن کو چھوڑ دیا تو بھی گمراہ ہوگیا۔ جس نے اہل بیت علیہم السلام کا تذکرہ سننے سے انکار کیا وہ بھی شقی اور جس نے قرآن سننا گوارہ نہ کیا وہ بھی ملعون۔ جس نے اہل بیتؑ سے بیزاری اختیار کی وہ بھی جہنمی

اور جس نے قرآن سے نفرت کی وہ بھی دوزخی۔ جس نے اہل بیت علیہم السلام سے منہ پھیرا، اوندھے منہ جہنم میں گرا اور جس نے قرآن سے روگردانی کی وہ روسیاہ بھی دوزخ کا ایندھن بنا۔ جس نے اہل بیتؑ پر تہمت باندھی اس کا بھی ایمان غلط اور جس نے قرآن پر تہمت باندھی اس کا بھی دین غلط۔

ہدایت یافتہ تو وہ ہی ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن کا دامن اور دوسرے ہاتھ میں اہل بیت علیہم السلام کا دامن ہو۔ دونوں سے ولاء، دونوں سے تمسک، ایک قولی رہنما، دوسرا عملی رہنما، ایک الفاظ میں ہادی، دوسرا ان الفاظ کے معانی بن کر ہادی، لہٰذا اہل بیت علیہم السلام "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کے مصداق ہیں۔

قرآن اور اہل بیت علیہم السلام معصوم ہونے، ہادی ہونے اور خدا کی جانب سے ہونے میں مشترک ہیں۔ قرآن قولی اور لفظی تبلیغ کرتا ہے اور اہل بیت علیہم السلام اس کی تفسیر اور عملی تبلیغ کرتے ہیں۔

قرآن الفاظ ہے، اہل بیت علیہم السلام اس کے معانی ہیں۔ قرآن الہام ہے اور اہل بیت علیہ السلام اس کی وضاحت ہیں، قرآن اجمال ہے اور اہل بیت علیہم السلام اس کی تفصیل ہیں۔ قرآن متن ہے اور اہل بیت علیہم السلام اس کی تشریح ہیں۔ قرآن کا حکم حجت ہے اور اہل بیت علیہم السلام کا قول وعمل حجت ہے۔

روز قیامت قرآن امت کی بے وفائی کا شکوہ کرے گا، اہل بیت بھی اُمت کی بے وفائی کی فریاد کریں گے۔ قرآن بھی اُمت کے مظالم کا نشانہ بنا رہا، اہل بیت علیہم السلام بھی اُمت کی بے وفائیوں اور ستم شعاریوں کا ہدف بنے رہے۔ قرآن کو بھی پھاڑا گیا اس کے پارے زمین پر پھینک دیئے گئے، اہل بیت علیہم السلام بھی پاروں کی صورت میں خاک خون میں غلطاں کربلا کے میدان میں بے گور وکفن رہے۔ قرآن کو بھی جلایا گیا، اہل بیت علیہم السلام کے گھروں کو مدینہ میں جلانے کی دھمکی دی گئی اور کربلا میں ان بے وارثوں کے خیام جلا دیئے گئے۔ قرآن کو بھی نیزوں پر اٹھایا گیا اور کربلا میں اہل بیت علیہم السلام کی لاشیں بھی میدان میں گور وکفن رہیں اور سروں کو نیزوں پر سوار کیا گیا۔

مؤمنین! کربلا میں جب گلشن بتولؑ تاراج ہوا، قرآن ناطق کے پارے صحرا کی ریت پر بکھر گئے، بے وارث بیبیاں اور یتیم بچے باقی رہ گئے، تو حکم ملا کہ قیدی بنا کے لے چلو آلِ رسولؐ کو۔ اُمت نے ذریت رسولؐ کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مردوں کو بیدردی سے شہید کر ڈالا اور مستورات کو قید کر لیا۔ دسویں محرم کو حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کا گھر اجڑ گیا اور گیارہویں کو بتولؑ کی بیٹیاں قید کر لی گئیں۔ یہ قیدی گیارہویں محرم کو بعد از ظہر کوفہ میں عمر بن سعد کی نگرانی میں دربار ابن زیاد میں پیش ہونے کیلئے روانہ کر دیئے گئے۔

قیدی قافلے کا کربلا سے سفر

بنی ہاشم اور آلِ رسولؐ جو مدینہ سے چلے تھے، کربلا میں نو روز قیام کرنے کے بعد اب کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مدینہ سے چلے تو بہت سے افراد تھے مگر کربلا میں پہنچ کر بہت سے حضرات نے کربلا ہی میں مستقل قیام اختیار کرلیا۔ مرد تو تقریباً تمام ہی اس میدان میں مقیم ہو گئے تھے اور یہ جگہ انہیں پسند آ گئی تھی۔ عورتوں میں سے بھی چند معصوم اور یتیم بچیاں رفاقتِ امامِ مظلوم علیہ السلام میں یہیں کی ہو گئیں۔

مکہ روانگی کے وقت حضرت عبداللہ بن عباس نے جب مشورہ دیا کہ ایسے پُر آشوب حالات میں مستورات کو ساتھ نہ لے جائیں تو امامؑ نے جو جواب دیا اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ یہ رسول اللہؐ کی امانت ہیں، میں انہیں کس کے سپرد کروں؟

مزید یہ بھی فرمایا: ''یہ مجھ سے جدا ہونے پر راضی نہیں اور میں ان سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا''۔

وہاں سے تو اکٹھے چلے تھے اور کربلا تک بھی اکٹھے ہی پہنچے۔ مگر کربلا میں جدائی پیدا ہو گئی۔ اتنا سوال کرتا ہوں کہ یا مولا حسینؑ! مدینہ و مکہ میں تو آپ نے فرمایا: ''رسول اللہؐ کی ان امانتوں کو کس کے سپرد کروں؟'' مگر کربلا میں کس طرح بے وارث چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟ ہائے مولاؑ! یہ رسولؐ و بتولؑ کی امانتیں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھیں، مگر آپؑ تو ان سے جدا ہو گئے۔

عصرِ عاشور جدا ہوئے، پھر گیارہویں کے روز جدا ہوئے، واقعاً یہ آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھیں، وہ تو آپؑ کی لاش دفن کرنا چاہتی تھیں۔ خیام نہ سہی، وہ تو بغیر خیام کے دھوپ ہی میں رہنا پسند کرلیتیں، لیکن آپ کی لاش سے جدائی گوارا نہ کرتیں۔ وہ تو تیری لاش سے جدا نہیں ہوئیں، مگر ظالموں کے تشدد، کمینوں کی سختیوں اور لعینوں کے کوڑوں نے ان ستم رسیدہ بیواؤں کو عزیزوں کی لاشوں سے جدا کر دیا۔

کربلا سے قیدی مستورات کا قافلہ چلا ہے۔ مردوں میں سے ایک علیل و مریض پسرِ حسینؑ ہیں۔ کچھ بچے ہیں اور باقی بیوہ و بے وارث ہاشمی مستورات۔

کہنا پڑتا ہے، مستورات! اگر مستورات تو انہیں کہا جاتا ہے جو پردوں میں ملفوف ہوں، اب پردہ کہاں رہا؟

شہدأء کے سروں کا کوفہ روانہ کیا جانا

عاشور کے دن ابن زیاد ملعون کوفہ سے باہر ''نخیلہ'' کے ایک مقام پر آ گیا تھا، جو کربلا کے نزدیک ہے اور وہاں سے وہ جنگ کی تازہ خبریں سنتا رہا۔ جب عصر کے وقت اس جنگ کا خاتمہ ہوا اور ساتھ ہی بنی ہاشم کے کنبے کا بھی خاتمہ ہو گیا اور قتل کی

خوش خبری اس لعین کو سنائی گئی تو وہ ملعون مسرور ہو کر ظاہری فتح کے نشہ میں مخمور ہو کر کوفہ واپس چلا گیا۔ ابن سعد نے سرِ امام حسین علیہ السلام نیزے پر سوار کر کے خولی بن یزید اور حمید بن مسلم ازدی کے ہاتھ کوفہ بھیج دیا۔

عاشور کے دن بعد شہادت، امام علیہ السلام کا سر کربلا سے سفر کر گیا تھا۔ صرف بدن بغیر سر کے رہ گیا۔ پھر ابن سعد ملعون نے باقی شہداء کی لاشوں سے بھی سر کاٹنے کا حکم دے دیا۔ وقتِ شہادت پسرِ بتولؑ کا سر کاٹا گیا مگر باقی شہداء کے سر لاشوں کے ساتھ تھے۔ ملعون کے اس حکم سے شہید دوبارہ شہید ہونے لگے۔ فقہی مسئلہ ہے کہ میت کے بدن کو آہستہ چھوا جائے اور لوہے کی کوئی شے میت پر نہ رکھی جائے۔ مگر ان بے وارث شہیدوں کے بدن جو پہلے ہی سینکڑوں زخم کھا کر شہید ہوئے تھے، مزید ظلم سہنے کے لیے آمادہ و تیار ہو گئے۔ ان مظلوم و بے وارث شہیدوں کے دھڑ سروں سے محروم ہو گئے۔ ادھر کمینے جب سر دھڑوں سے جدا کرتے تو ساتھ ہی خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے۔

جب سر کاٹ لئے گئے تو مختلف قبیلوں میں تقسیم کر دیئے گئے تاکہ جو قبائل کوفہ سے باغِ بتولؑ اور کنبہ رسولؐ برباد کرنے کے لیے آئے تھے، وہ ان سروں کو اٹھا کر کوفہ کے بازاروں اور گلیوں میں اپنے کارناموں پر فخر کر سکیں اور ابن زیاد ملعون کے دربار میں سرخروئی حاصل کر کے اپنی شقاوت کا انعام بھی حاصل کریں اور ابن زیاد کی خوشنودی بھی پائیں۔

پس بنو کندہ ۱۳ سر اٹھا کر کوفہ لائے۔ اس قبیلہ کا سردار قیس بن اشعث تھا۔ یاد رہے کہ یہ قیس، جعدہ بن اشعث کا بھائی تھا، جس ملعونہ نے فرزندِ رسولؐ حضرتِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو زہر دے کر قاسم و عبداللہ اور ان کے بھائی و بہنوں کو یتیم کر دیا تھا اور اس ملعون کا ایک اور بھائی محمد بن اشعث کوفہ میں حضرتِ مسلمؑ بن عقیلؑ کے ساتھ برسرِ پیکار رہا۔

بنی ہوازن ۱۲ سر لے کر کوفہ میں وارد ہوئے۔ اس قبیلہ کا سردار شمر لعین تھا۔

بنی تمیم کو ۱۷ سر دیئے گئے اور بنی اسد کے سردار ۱۶ سر لا کر کوفہ میں وارد ہوئے۔ ۷ سر بنی مذحج اور باقی سر مختلف قبیلے لائے۔ حضرت حر کا سر جب بدن سے علیحدہ کرنے لگے تو ان کا قبیلہ جو کافی تعداد میں کربلا میں موجود تھا، آڑے آیا اور ان کا سر لاش سے جدا نہ ہوا اور نہ ہی ان کی لاش کو پامال کیا گیا۔

سروں کی روانگی کے بعد خود ابن سعد وہیں کربلا میں موجود رہا اور دوسرے دن 11 محرم الحرام کو ظہر کے بعد کربلا سے روانہ ہوا اور کوفہ آیا اور اپنے ناپاک کشتوں کو دفن کیا۔

"وَتَرَکَ الْحُسَیْنَ وَ اَصْحَابَهٗ".

''اور حسینؑ اور ان کے اصحاب علیہم السلام کو بے گور و کفن چھوڑ دیا''۔

خولی کے گھر میں فرزندِ رسولؐ کا سرِ اقدس

خولی اپنے نیزہ کی نوک پر شہسوارِ دوشِ نبیؐ اور جبرئیل کے پروں پر استراحت کرنے والے فرزندِ علیؑ، نورِ چشم رسولؐ و لختِ بتولؑ کا پرانوار سر لے کر تکبیر کے نعرے بلند کرتا ہوا، قلبِ رسولؐ و جگرِ علیؑ و بتولؑ کو زخمی کر کے کوفہ کی جانب روانہ ہوا۔ خولی رات کو ابن زیاد کے دارالامارہ میں نہ گیا۔ رات چھا چکی تھی، اس واسطے وہ رات کو گھر میں ہی ٹھہر گیا اور سرِ اقدس ایک تغار کے نیچے رکھ کر تنور میں رکھ دیا اور تغاری سے بند کر کے اپنی آرام گاہ میں چلا گیا۔ جن پاک زلفوں میں بتولِ عظمیٰؑ اپنے ہاتھوں سے کنگھی کیا کرتی تھیں، وہ زلفیں خولی ملعون کے ناپاک ہاتھوں میں تھیں اور جو سر پیغمبرِ اسلامؐ کی گود میں راحت کرتا تھا، آج وہ ملعون خولی کے نجس گھر میں زیرِ تغار تھا۔

خولی کی دو بیویاں تھیں ایک بیوی جس کا نام نوار بنت مالک بن عقرب ہے، خولی رات کو اس کے گھر رہا۔ جب وہ اپنی آرامگاہ پر آیا تو اس کی بیوی نوار بنت مالک نے سفر کے حالات دریافت کیے، دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی۔ خولی نے کہا:

''اب ہم دولت سے مالا مال ہو جائیں گے۔ غربت دور ہو جائے گی۔ جنگ میں ہم نے فتح حاصل کر لی ہے۔ ہمارے مقابل تمام مارے گئے ہیں۔ ان کے بچوں کو یتیم اور ان کی عورتوں کو ہم نے بیوہ کر دیا ہے۔ ان کے مقتولوں کے سردار اور اس کے قافلہ کے سالار کا سر آج تیرے گھر میں ہے''۔

خولی کی زوجہ نے دریافت کیا کہ اس قافلہ کے سالار کا کیا نام ہے؟ اور وہ کون؟ کہنے لگا:

''اس کا نام حسینؑ بن علیؑ ہے!''

اس کی زوجہ بولی ''وہ حسینؑ جو امیر المومنینؑ اور سیدۃ النساءؑ کا لختِ جگر ہے؟ وہ حسینؑ جو نواسۂ رسولؐ ہے؟''

کہا: ''ہاں! وہی حسینؑ جنگ ہار گیا ہے۔ اس کے سب ساتھی مارے گئے ہیں اور وہ خود بھی مارا گیا ہے۔ اب اس کا سر ہمراہ لایا ہوں۔ صبح ابن زیاد کے دربار میں پیش کروں گا اور منہ مانگا انعام لوں گا''۔

وہ تھی تو اس ملعون کی زوجہ، مگر نیک دل مومنہ تھی۔ آلِ محمد علیہم السلام سے واقف تھی۔ چونکہ امیر المومنین علیہ السلام کوفہ میں چار سال مع اہل و عیال کے رہ چکے تھے، لہٰذا مولا علیؑ سے اور انؑ کی اولادِ اطہر سے سب متعارف تھے۔

''حسین بن علی علیہم السلام کا سر؟''

''ہاں! حسینؑ بن علیؑ کا سر ہے!''

اس نیک دل مومنہ کا رنگ فق ہو گیا، خون کھولنے لگا اور کہنے لگی: ''خولی! اب تک تو میں تمہارے ساتھ ایک گھر میں ہی تھی، لیکن خدا کی قسم! اب میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ رہوں گی۔ تو دلبند بتولؑ کے خون میں ہاتھ رنگین کرکے آیا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ حضرت بتولؑ اور رسولؐ کی اس وقت کیا حالت ہوگی؟'' نوار یہ کہتی ہوئی بستر سے اٹھی اور اس کی دوسری بیوی، جو بنی اسد سے تھی، اس کو بھی بلا لائی۔

خولی کی زوجہ بیان کرتی ہے: ''میں صحن میں بیٹھ کر اس پرنور سر کا نظارہ کرنے لگی، اس منور سر سے نور کی شعاعیں ستون کی مانند آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سرِ انور اور آسمان کے درمیان نور کا ایک ستون قائم ہے اور اس کے آس پاس سفید رنگ کے پرندے پر پھیلائے ہوئے ہیں''۔

خولی کی دوسری زوجہ اسدیہ انصاریہ کا بیان ہے: ''جب میں سر کے قریب گئی تو میرے کانوں میں عورتوں کے رونے کی آواز آئی، جس طرح ماں اپنے جوان پسر اور بہن اپنے جوان بھائی کی میت پر نوحہ کناں و ماتم کرتی ہے۔ یہ آواز نہایت دردناک اور دلخراش نالے تھے''۔

وہ کون عورتیں ہو سکتی ہیں؟ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا اور دُکھیاری مادرِ بتول سلام اللہ علیہا کی دل فگار فریادیں تھیں۔

خولی کی اس زوجہ کا نام ''عیوف'' ہے۔ اس کے بعد وہ اس قدر حزین و غمگین ہوئی کہ اس نے نہ کبھی خوشبو لگائی اور نہ ہی آنکھ میں سرمہ ڈالا۔

کربلا سے روانگی

جس طرح اہل بیت علیہم السلام پر دو راتیں نہایت سخت گزری ہیں، شبِ عاشور اور شامِ غریباں، اسی طرح اہل بیت علیہم السلام پر دو دن نہایت شدید گزرے ہیں۔ دسویں محرم کا دن اور گیارہویں محرم کا دن۔ دسویں کی صبح اہل بیتؑ کے مردوں کی شہادت کا پیغام لے کر طلوع ہوئی اور گیارہویں کی صبح زنانِ بنی ہاشم کی قید کی خبر لا کر نمودار ہوئی۔

شامِ غریباں اور شبِ آلام گزر گئی، کس طرح گزری؟ اس کا حال ان معصوم ذوات کو معلوم ہے جن پر گزری یا خدا کو اس کا علم ہے۔ ہم فقط اتنا کہہ سکتے ہیں کہ مصیبتوں کی انتہائی اور دکھوں کی آخری حد تھی۔ گیارہویں کا دن آیا اور دخترانِ علیؑ و بتولؑ کی قید کا پیغام لایا۔ مدینے والے ساتھی تو ساتھ چھوڑ چکے تھے، اب صرف خواتین کا قافلہ باقی تھا۔

گیارہویں کی ظہر کے بعد تک بغیر سایہ اور بغیر خیام کے دھوپ میں بے وارث شہزادیاں اور یتیم بچے نوحہ و ماتم کرتے رہے۔ خاکِ کربلا پر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ خود ہی آہ و بکاء کرنے والی مستورات تھیں اور خود ہی پرسہ قبول کرنے والی، باہر سے پرسہ اور تعزیت پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔

عمر بن سعد گیارہ محرم الحرام کے دن ظہر کے بعد کربلا سے قیدیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ ان کے سوار کرنے کے لیے جو کچھ اونٹ بھیجے گئے، وہ محملوں سے خالی تھے اور ان پر باپردہ عماریاں بھی نہ تھیں۔ ہاشمی مستورات کا یہ پہلا سفر تھا جو بغیر محملوں کے تھا۔ قضا و قدر نے یہ دن بھی دکھایا جب کہ بیبیاں خود ہی ایک دوسرے کو سوار کروانے پر مجبور تھیں۔ جو لوگ اونٹ لے کر آئے تھے اور فوج کا جو دستہ سوار کروانے آیا تھا، ان کو دخترانِ رسولؐ نے قریب آنے سے روک دیا۔ خود ہی ایک دوسرے کو اونٹوں پر سوار کیا۔ ہاشمی مستورات کے ساتھ شہید اصحاب کی عورتیں بھی قید ہو کر ناقوں پر سوار ہوئیں۔

اب وہ دن کہاں تھے کہ جب حضرتِ عباسؑ و علی اکبر علیہم السلام اپنی نگرانی میں اور امام حسین علیہ السلام اپنی حفاظت میں غیر عادی مخدراتِ عصمت کو باپردہ عماریوں میں سوار کرتے تھے اور اپنی نگرانی میں اور حفاظت میں ہی اتارتے تھے۔ اب تو سوار ہوتے اور اُترتے وقت سنگدل اشقیاء کی بدکلامیوں اور جھڑکیوں کا سامنا کرتی تھیں۔

امامِ علی زین العابدین علیه السلام کی بیماری

یہاں مناسب خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ امام علی زین العابدین علیہ السلام بیمار کب ہوئے۔ اس بارے میں تاریخیں انکار کرتی ہیں اور کتبِ مقاتل صراحت سے قاصر ہیں۔ مدینہ سے جب چلے تھے تو تندرست تھے۔ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک کسی منزل پر آپؑ کی بیماری کی خبر مذکور نہیں، البتہ کربلا میں وارد ہونے کے بعد ہی آپؑ بیمار ہوئے۔

پچھلا سارا سفر اُن کا خاموشی میں گزرا۔ خاص واقعات تاریخ نے بیان نہیں کیے۔ پسرِ امام علیہ السلام تمام واقعات خاموشی سے دیکھتے، سنتے اور برداشت کرتے رہے۔ کیا صرف اجمالی اخبارِ شہادت و قید نے دل پر اثر کیا ہوگا؟ شہداء کے غم اور قیدیوں کی خبر سے یہ روگ لاحق ہوا ہوگا؟ یا کسی مصلحت کے تحت خالق نے ان کو بیمار کیا؟ خدائی اسرار اور الٰہی حکمتیں خدا خود ہی بہتر جانتا ہے یا پھر بذاتِ خود امامِ زمانہ جانتے ہیں۔

ایک بات جو ذہن میں آتی ہے کہ چونکہ سفرِ طویل کرنا مقصود تھا، بازاروں اور درباروں میں کھلے سر بے مقنع و بے چادر ماؤں، بہنوں اور پھوپھیوں کے ہمراہ مجمعِ عام میں غموں کے دریاؤں کو عبور کرنا تھا، جو موت سے کسی صورت کم نہ تھا،

اس واسطے امام کی بیماری کی صورت میں شہدائے کربلا کی دردناک شہادت کے منظر کو آپؑ کی نظروں سے پنہاں رکھا گیا۔ ممکن تھا کہ اگر روزِ عاشور آنکھوں سے مناظرِ شہداء دیکھتے تو بیتابی سے ہرگز برداشت نہ کر سکتے اور جہاد کے فرض ہونے کی وجہ سے نصرتِ امام حسین علیہ السلام میں جامِ شہادت نوش فرماتے اور اس طرح حجتِ خدا سے زمین خالی ہو جاتی۔

چنانچہ گیارہویں کے دن جب لاش ہائے شہداء پر امام علی زین العابدینؑ پہنچے تو لاشوں کی حالت دیکھ کر آپؑ کا رنگ متغیر ہو گیا اور جسم سرد پڑ گیا۔ قریب تھا کہ روح بدن سے پرواز کر جاتی، حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی نظر پڑی تو فوراً بیمار بھتیجے کے قریب آئیں، تسلی دی، بہلایا اور غم دور کرنے کی کوشش کی۔

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب روزِ عاشور تمام جوانانِ بنی ہاشم اور اصحابِ باوفا میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دے رہے تھے اور مردانگی کے جوہر دکھا رہے تھے، آپؑ بھی جوانی کے عالم میں تھے، بہادر تھے، ہاشمی غیرت اور حیدری شجاعت آپؑ کو بھی میدانِ جنگ میں دفاعِ فرزندِ امام علیہ السلام کیلئے لے جاتی، لیکن وارثِ امامت اور جانشین مسندِ رسالت کی بقاء ضروری تھی۔ بیواؤں کے قافلے کی نگرانی کیلئے ایک ہاشمی جوان مرد کا ساتھ ہونا بھی لازمی تھا۔ ویسے بھی اس حالت میں امامِ علیہ السلام کا اکیلے رہ جانے اور آپؑ کا ان کی نصرت نہ کر سکنے کا صدمہ بھی اپنی جگہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس وجہ سے بیماری کو اللہ نے آپ پر بطورِ عذر اور سببِ سقوطِ جہاد کیلئے لاحق کر دیا۔

علاوہ ازیں اب کربلا کے بعد تھکا دینے والے سفر اور صعب ترین منزلوں میں امام علیہ السلام کی وہ بیماری نہ رہی تھی جو کربلا میں تھی۔ کربلا میں تو آپؑ بغیر سہارا کے بیٹھ بھی نہ سکتے تھے جبکہ کوفہ و شام کے لمبے سفروں اور منزلوں، درباروں اور بازاروں میں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، کلام کرتے اور خطبے پڑھتے رہے۔

بہرحال کربلا سے سفر کے بعد بیماری کی وہ شدت نہ تھی۔ کربلا میں تو وہ اکثر غشی کی سی کیفیت میں ہوتے تھے۔ غموں سے غافل کرنے کیلئے پروردگارِ عالم نے آپؑ کو بیماری میں ڈال دیا۔

قیدی بہنیں شہید بھائی کی لاش پر

قیدیوں کا قافلہ جلے ہوئے خیمہ گاہوں سے روانہ ہوا۔ جب قافلہ چلا تو ان مظلوم بیبیوں نے دُکھی زبان سے خواہش ظاہر کی:

"بِاللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا مَرَرْتُمْ بِنَا عَلَى الْقَتْلٰى".

"خدا کے واسطے ہمیں شہیدوں کی لاشوں پر لے چلو"۔

یہ تو بیبیوں کی آرزو تھی، ویسے خود اشقیاء کی بھی یہی خواہش تھی جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دُکھی ماؤں نے اپنے فرزندوں، مظلوم بہنوں نے اپنے بھائیوں اور دردرسیدہ بیواؤں نے اپنے سرتاجوں کو اس حال میں دیکھا کہ گرم ریت پر سینکڑوں زخم کھائے، خون میں نہلائے بے وارث اور بے گوروکفن پڑے ہیں، کربلا کا صحرا ان بیکس لاشوں سے بھرا پڑا ہے اور لاشیں گردوغبار سے اَٹی پڑی ہیں تو ان بیبیوں نے وہ دلخراش بین کئے کہ صحرائے کربلا نالہ وفریاد سے گونجنے لگا۔ فضا پر حسرت چھاگئی، غربت آنسو بہانے لگی، بیکسی اور مظلومی نوحہ کرنے لگی۔ اونٹ بٹھا دیئے گئے اور بیبیاں بے کجاوہ اونٹوں سے نیچے اُتر پڑیں۔

کتاب ''تظلم الزہراء'' میں ہے کہ جب جنابِ اُمِ کلثوم سلام اللہ علیہا نے بھائی کی لاش دیکھی کہ ہاتھ اور انگلیاں کٹی ہوئی ہیں، نیزوں اور تلواروں سے تمام بدن زخمی ہے تو:

''وَقَعَتْ مَنْ اَعْلٰی الْبَعِیْرِ اِلیٰ الْاَرْضِ''.

پشتِ شتر پر سنبھل نہ سکیں اور بیتاب ہو کر اونٹ سے زمین پر آگئیں''۔

اس طرح اونٹ سے زمین پر آنے کے بعد ہر بی بی اپنے عزیز کی لاش پر گئی۔

راوی جس کا نام قرۃ بن قیس تمیمی ہے روایت کرتا ہے: ''اور تو میں سب کچھ بھول سکتا ہوں لیکن زینب سلام اللہ علیہا اور حسین علیہ السلام کی ہمشیرہ کا وہ حال اور وہ کلام نہیں بھول سکتا کہ جب اجڑی اور دردستائی بہن مظلوم ومسلوب برادر کی لاش پر آئی تو نہ معلوم کس سوزِ جگر اور مجروح دل سے مدینہ کی طرف رخ کر کے نانا محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا:

''یَا مُحَمَّدَاہُ! صَلّٰی عَلَیْکَ مَلَائِکَۃُ السَّمَاءِ ھٰذَا حُسَیْنٌ مُرَمَّلٌ بِالدِّمَاءِ مُقَطَّعِ الْاَعْضَاءِ مَسْلُوْبِ الْعَمَامَۃِ وَالرِّدَاءِ یَا مُحَمَّدَاہُ! وَبِنَاتُکَ سَبَایَا وَ ذُرِّیَّتُکَ مُقَتَّلَۃٌ تَسْفیٰ عَلَیْہِ الصَّبَاءُ فَابکَتْ وَ اللّٰہِ کُلَّ عَدُوٍّ وَصَدِیْقٍ حَتّٰی جرتْ دُمُوْعُ الْخَیْلِ''.

''نانا! آپؐ پر تو آسمان کے فرشتے درود وسلام بھیجتے ہیں، یہ آپؐ کے حسینؑ ہیں آج کس بیکسی میں خون میں غلطاں بے وارث وبے گوروکفن پڑے ہیں۔ نانا! دیکھئے تو سہی! آپؐ کے ناز پروردہ فرزند کے اعضائے بدن پارہ پارہ ہو چکے ہیں۔ نہ ان کے سر کا عمامہ رہا اور نہ ہی بدن پر چادر رہی۔ آپؐ کی اُمت انہیں بے وارث سمجھ کر لوٹتی رہی اور ان کے ہاتھ کاٹتی رہی۔

نانا! آپؐ کی بیٹیوں کو آپؐ کی اُمت نے قید کر لیا۔ ہم مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتارِ جوروجفا اور اسیرانِ رنج وبلاء ہیں۔

آپ کی اولاد کو آپ کی امت نے قتل کر دیا، جن کے زخمی بدنوں اور مجروح لاشوں پر ہوا گرد و غبار اڑا رہی ہے اور ان پر خاک کی تہہ جما چکی ہے"۔

جب ہوا چلتی تو گرد کو اُڑا اُڑا کر لاشوں پر ڈال دیتی، اسی لیے لاشیں خاک و خون میں غلطاں تھیں۔ راوی کا بیان ہے:

"خدا کی قسم! مظلومہ کے پرسوز اور دردناک بینوں نے ہر دوست اور دشمن کو رُلا دیا، یہاں تک کہ جانوروں نے بھی آنسو بہائے"۔

جب دردستائی بہن بھائی کی لاش کے قریب آئی تو کہا: "اماں جایا! بے بس ہوں! کیا کروں؟ تیرے خاک و خون آلودہ بدن کا بوسہ لینا چاہتی ہوں مگر کوئی جگہ زخموں سے خالی نہیں، کس جگہ کا بوسہ لوں؟" اور پھر اس کے بعد یہ بین کیے:

"میرے بابا اس مظلوم برادر پر قربان جو اس دنیا سے پیاسا رخصت ہوا۔ ماں صدقے! جس کا سر نوکِ نیزہ پر سوار ہے۔ زلفوں اور ریشِ مبارک سے خون کے قطرے گر رہے ہیں اور بدن خاک و خون میں غلطاں ہوا ہے، جس کے گھر کو لوٹا اور جلایا گیا ہے"۔

ہر بی بی اپنے عزیز کی لاش پر گریہ و بکا کر رہی تھی، لیلیٰ اکبرؑ کے سرہانے، رملہ قاسمؑ کی لاش پر، رقیہ اپنے پسران پر آہ و بکا کر رہی تھیں۔ چونکہ تمام لاشیں یکجا نہ تھیں اور سروں کے بغیر تھیں، اس واسطے ہر بی بی کو اپنے عزیزوں کی لاشیں تلاش کرنا پڑیں۔

حمید بن مسلم بیان کرتا ہے: اسی اثناء میں میں نے دیکھا کہ ایک بی بی لاشوں کے درمیان گھومتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مطلوبہ شہید کی لاش نہیں مل رہی۔ اس کے بعد اس نے نہرِ علقمہ کی طرف رخ کیا اور زبان سے یہ جملے کہے:

"وا اخی عباسؑ"۔

میں نے پوچھا کہ یہ بی بی کون ہے جو عباسؑ کی لاش کی جانب جا رہی ہے تو جواب ملا: "یہ بی بی اُمِ کلثوم ہے، ان کے پردوں کا محافظ اور ان کے خیام کا پردہ دار عباسؑ تھا اس لیے یہ بی بی اس کی لاش پر فریاد کرنے جا رہی ہے"۔

حضرت اُمّ المصائب عقیلہ بنی ہاشم سلام اللہ علیہا کہ عزم و استقلال اور قوت ارادی کے شاہد یہ واقعات شدیدہ ہیں کہ یہ مصیبتیں اگر پہاڑوں پر آتیں تو سرمہ کی مانند پس جاتے، زمین و آسمان ان کے اٹھانے سے کانپ جاتے، بہادرانِ زمانہ شجاعانِ گیتی کے پتے پگھل جاتے، جگر پھٹ جاتے مگر یہ مصائب کے گراں پہاڑ نہ اٹھا سکتے، لیکن عقیلہ بنی ہاشم، علیؑ کی شیر دل بیٹی نے ایک بلند نصب العین اور پاک مقصد کی خاطر ان آلام و شدائد کو برداشت کیا۔ کوئی اور مرد یا عورت ہوتی تو بیتابی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی، مگر جس طرح امامِ ہدیٰ نے اپنے عہد کو نبھایا، اسی طرح شریکۃ الحسین سلام اللہ علیہا نے بھی

اپنے عہد کو کمال صبر اور استقامت سے پورا کیا۔ بیشک بدن میں نقاہت آ گئی لیکن قوتِ روحانی میں ضعف نہ آیا، عزم و استقلال مضبوط رہا اور آپ نصب العین اور حسینی تحریک و مقصد پر ثابت قدم رہیں۔ بہن بھائی کے پیکر جدا جدا تھے، لیکن قوتِ قدسیہ کس قدر تفاوت کے ساتھ ایک تھی۔

جب گریہ و بکاء سے فارغ ہوئیں اور آنسوؤں نے غمِ دل کو کچھ ہلکا کیا، جلالِ پدری، عصمتِ مادری اور کمالِ برادری کی وارث، قوتِ قدسیہ کی مالکہ، کربلا کی شیر دل خاتون نے اپنے دونوں ہاتھ لاش کے نیچے رکھے اور دونوں ہاتھوں پر مظلوم بھائی کا لاشہ اٹھا کر آسمان کی طرف رخ کیا اور کہا:

"اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا ھٰذَا الْقُرْبَانَ".

"اے اللہ! ہماری یہ قربانی قبول فرما"۔

حضرتِ سکینہ بن الحسین علیہم السلام کی یہ حالت تھی کہ بابا کی لاش سے لپٹی ہوئی تھیں اور جدا نہ ہوتی تھیں۔ مظلوم و مقتول بابا کی لاش کو گلے لگائے اپنی مظلومی کے واقعات بیان کر کے مصروف نوحہ و بکا تھیں۔

حضرتِ سکینہ سلام اللہ علیہا کا بیان ہے: "میں نے جب بابا کے گلوئے خون آلود پر بوسے دیئے تو میرے کانوں میں آواز آئی:

شِیْعَتِیْ مَا اِنْ شَرِبْتُمْ عَذْبَ مَاءٍ فَاذْکُرُوْنِیْ
اَوْ سَمِعْتُمْ بِغَرِیْبٍ اَوْ شَہِیْدٍ فَانْدُبُوْنِیْ

"میرے شیعو! جب تم ٹھنڈا پانی پینا تو میری پیاس کو یاد کرنا اور جب سننا کہ کوئی مسافر شہید ہو گیا ہے یا کسی شہید کی لاش دیکھنا تو مجھ پر گریہ کرنا"۔

لَیْتَکُمْ فِیْ یَوْمَ عَاشُوْرَا جَمِیْعاً تَنْظُرُوْنِیْ
کَیْفَ اَسْتَقِیْ بِطِفْلٍ فَاَبَوْا اَنْ یَّرْحَمُوْنِیْ

"کاش تم یومِ عاشور میری بے کسی و مظلومی کو دیکھتے کہ طفل صغیر کو ہاتھوں پہ اٹھائے اُمت سے سوال آب کر رہا تھا اور وہ ظالم بے رحمی و بیدردی کا سلوک کر رہے تھے"۔

یہ تو مستوراتِ مخدرات کی گریہ و زاری اور عزیزوں کی لاشوں سے وداع کی صورت تھی۔ بیمار کربلا امام زین العابدین علیہ السلام نے جب میدان میں بابا کی لاش اور بنی ہاشم کے جوانوں اور بچوں کے لاشے دیکھے کہ جنگل میں نیزوں اور تیروں

سے چھلنی بدن، تلواروں سے کٹی ہوئی گردنوں سے محروم لاشیں، گرد و غبار سے اٹی ہوئی مشک بار زلفیں، خاک و خون میں غلطاں گلہائے نازنیں خصوصاً پروردۂ جگر گوشۂ بتولؑ، علیؑ کی آنکھوں کا نورِ عین، حسنؑ کے دل کا چین، غریب و مظلوم حسینؑ بے وارث و بے گور و کفن پڑے ہیں، رنگ متغیر ہو گیا، حالت بدل گئی اور قریب تھا کہ روح بدن سے پرواز کر جائے، حضرت ثانی زہراء، نگہبانِ قافلۂ اُساریٰ، حضرت زینب بنت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی نظر پڑی کہ بھتیجے کی حالت غیر ہو رہی ہے، فوراً قریب آئیں، گلے لگایا، دستِ شفقت پھیرا اور تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا:

"مَالِیْ اَرَاکَ تَجُوْدُ بِنَفْسِکَ یَا بَقِیَّةَ جَدِّیْ وَ اَبِیْ اِخْوَتِیْ".

"بیٹا علی زین العابدینؑ! کیا بات ہے؟ میں تجھے قریب المرگ پا رہی ہوں، میرے نانا، بابا اور بھائی کی یادگار! بیٹا لاشیں دیکھ کر گھبرا گئے ہو؟ بیٹا اپنے آپ کو سنبھالو!"

حضرت علی زین العابدین علیہ السلام نے جواب دیا:

"کَیْفَ لَا اَجْزَعُ وَ اَهْلَعُ وَ قَدْاریٰ سَیِّدِیْ وَ اِخْوَتِیْ وَ عُمُوْمَتِیْ وَ وُلْدَ عَمِّیْ وَ اَهْلِیْ مصرعِیْنَ بِدِمَائِهِمْ مُرَمَّلِیْنَ بِالْعَرَاءِ مُسَلَّبِیْنَ لَا یُکَفَّنُوْنَ وَ یُزَارُوْنَ لَا یُعَرِّجُ عَلَیْهِ احدٌ وَّلَا یَقْرِبُهُمْ بَشَرٌ کَاَنَّهُمْ اَهْلُ بَیْتٍ مِنَ الدَّیْلَمِ وَ الْخَزَرِ".

"میں کیونکر گریہ و ماتم نہ کروں جب کہ میں اپنے سید و سردار والدِ بزرگوار اور اپنے بھائیوں، چچاؤں اور چچازاد بھائیوں کو اس بیکسی و غریبی کی حالت میں لق و دق صحراء میں خاک و خون میں غلطاں اور ان لٹی ہوئی لاشوں کو بے گور و کفن دیکھ رہا ہوں؟ کوئی آدمی ان کے قریب نہیں اور یہ میتیں بے وارث کی طرح پڑے ہیں۔ میری حالت کیونکر نہ متغیر ہو؟"

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

"لَا یَجْزَعْ عَنْکَ مَا تَرٰی فَوَ اللّٰهِ اِنَّ هٰذَا الْعَهْدَ مِنَ اللّٰهِ اِلٰی جَدِّکَ وَ اَبِیْکَ وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ اُنَاسٍ لَا تَعْرِفُهُمْ فَرَاعِنَةُ هٰذِهِ الْاَعْضَاءِ الْمُقَطَّعَةَ وَ الْجُسُوْمَ الْمُضَرَّجَةَ وَفَیُوَارُوْنَهَا وَ یَنْصُبُوْنَ الْاَیَمِ وَ لَیَجْتَهِدَنَّ اَئِمَّةُ الْکُفْرِ وَ اَشْیَاعُ الضَّلَالِ فِیْ مَحْوِهٖ وَ تَطْمِیْسِهٖ فَلَا یَزْدَادُ اَثَرُهٗ اِلَّا ظُهُوْرًا".

"بیٹا! جو دردناک منظر آپ دیکھ رہے ہیں، آپ اس سے دل تنگ نہ کیجئے! یہ ایک عہد تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے جدِ امجد اور والدِ ماجد سے لیا تھا (سو اس عہد کو وہ اچھی طرح پورا کر چکے) اور خداوندِ عالم نے کچھ لوگوں سے ایک عہد لیا تھا جن

لوگوں کو اس زمین کے فرعونِ وقت نہیں پہچانتے، لیکن ان لوگوں کو باشندگانِ آسمان پہچانتے ہیں۔ وہ ان لاشوں کے کٹے ہوئے اعضاء اور خاک وخون میں آلودہ اجسام کو اکٹھا کریں گے اور زمین میں دفن کردیں گے اور آپؐ کے مظلوم بابا کی قبر پر علم بلند کریں گے (جو زائرین کو مرقدِ مطہرہ کی نشاندہی کرے گا)۔ اگرچہ کفر ونفاق کے آئمہ اور ضلالت کے پیروکاران قبورِ مقدسہ کو اور ان کے آثار کو مٹانے کی کوشش کریں گے مگر دن اور رات اسی طرح گزرتے جائیں گے، نہ ان کا اثر ختم ہوگا اور نہ ہی ان کا نشان مٹنے پائے گا"۔

مظلوم کربلا، ثانیٔ زہراء عالمہ غیر معلمہ، حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا کا یہ کلام ان کی قوتِ قدسیہ اور آئندہ آنے والے واقعات وحالات کے علم کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کی اس پیش گوئی کو آنے والے زمانے اور مستقبل میں رونما ہونے والے حالات نے حرف بحرف سچا کر دکھایا۔ یہ ثانیٔ زہراء، وارثِ عصمتِ بتولؑ، حضرتِ زینبؑ بنتِ فاطمۃ الزہراؑ سلام اللہ علیہا کا علمی معجزہ ہے اور ان کے علم وعرفان کی واضح دلیل ہے۔

اسیرانِ خانوادۂ اہل بیتؑ لاشوں سے ہرگز جدا نہ ہونا چاہتے تھے۔ ہر بی بی اپنے عزیز کی لاش سے لپٹی ہوئی تھی، کوچ کا حکم ملا، انہوں نے لاشوں کو تو نہ چھوڑا، ہاں! مگر جبراً انہیں لاشوں سے علیحدہ کیا گیا۔ حضرتِ سکینہؑ کے متعلق ایک شاعر لکھتا ہے:

تُقَبِّلُ جُثْمَانَ الْحُسَيْنِ سَكِيْنَةُ
وَ الشِّمْرُ لَهَا بِالسَّوْطِ ضَرْباً يُمْنَعُ

"سکینہؑ لاشِ پدر کے بوسے لے رہی تھی اور شمر ملعون تازیانے مار کر ان کو لاش سے جدا کر رہا تھا"۔

آخر ثانیٔ زہراء سلام اللہ علیہا نے لاشِ برادر کو بادلِ نخواستہ چھوڑ دیا اور کہا:

"لَوْ خُيِّرْتُ بَيْنَ الرَّحِيْلِ وَ الْمَقَامِ عِنْدَكَ لَاخْتَرْتُ الْمَقَامَ عِنْدَكَ".

"اماں جائے! اگر مجھے یہاں سے کوچ کرنے اور تیرے پاس رہ جانے میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کرنے کا حق دیا جاتا تو میں تیرے پاس اس صحراء میں بسیرا اختیار کر لیتی، لیکن بھائی حسینؑ! مجبور ہوں۔ تو دکھوں سے راحت پا گیا مگر تیری بہن کا سفینہ دکھوں کے منجدھار میں ہے"۔

اتنے میں ایک سنگدل ملعون بنام زحر بن قیس آیا اور کرخت آواز میں مستورات کو لاشیں چھوڑنے کا حکم دیا۔ اس ملعون نے تازیانہ ہوا میں لہرایا اور غمزدہ وبے بس شہزادیاں اپنے ورثاء کی لاشوں سے جدا ہو کر عازمِ کوفہ ہو گئیں۔

❁❁❁

نعمت کی تشریح

ولایت علی علیہ السلام کا اعلان، کوفہ میں ورود

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

"صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ. غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ. وَلَا الضَّآلِّيۡنَ".

"ان لوگوں کا رستہ جن کو تو نے خاص نعمتیں عطا فرمائی ہیں، نہ کہ ان کا جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی ان لوگوں کی راہ جو خود سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں"۔

اس آیہ مبارکہ میں تین گروہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے:

1۔ جو روحانی درجات طے کرنے کے والے مقربین خدا ہیں اور محبوب رب العالمین ہونے کی وجہ سے اس کی خاص نعمتوں کے سزاوار ہیں اور اس کی مخلوق کو اس کے احکام کی تبلیغ اور سالکانِ جادۂ حق کو صراطِ مستقیم کی رہنمائی کیلئے حق سبحانہٗ کی نمائندگی کا شرف حاصل کئے ہوئے ہیں۔ طالب ہدایت ان کی راہ طلب کر رہا ہے۔

2۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو موردِ عذاب و غضب خداوندی ہے۔ یہ گروہ اپنی کج روی، ناشکری، سرکشی و بغاوت وظلم و تعدی کی بناء پر خالق کی ناراضگی اور اس کے غضب کا سزاوار قرار پایا ہے۔

3۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو خود راہِ راست سے دور ہے۔ جس راہ پر وہ چل رہا ہے، وہ سیدھی نہیں، راست نہیں، بلکہ غلط ہے۔ یہ گروہ اپنی شقاوت و بغاوت اور مادّی لذات میں مبتلا ہو کر دنیا کو آخرت پر ترجیح دے کر صراطِ مستقیم سے دور ہٹ چکا ہے۔ جو گروہ خود راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے، وہ منزلِ مقصود کیسے پائے گا اور دوسروں کو منزلِ مقصود تک کس طرح پہنچا سکے گا؟

اس واسطے طالب راہِ راست کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ کہے: "اے پروردگار! ان لوگوں کی راہ پر چلا جو تیرے خاص بندے ہیں اور جنہیں تیری خاص نعمتوں کی فراوانی دی گئی ہے، نہ ان لوگوں کی راہ جو تیری رحمتِ خاصہ سے دور ہیں اور تیرے مبغوض، مغضوب اور تیری لعنت کے موردو مستحق ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کی راہ پر جو آوارہ گرد ہیں اور راہِ راست سے بھٹکے ہوئے کتنی ہی منزلیں، کتنا ہی سفر کریں اور چاہے کتنی ہی تیز چلیں، غلط راہ پر گامزن ہیں، منزل سے دور ہی جائیں گے"۔

اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں حضراتِ مفسّرین کرام تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے گروہ سے مراد انبیاء و مرسلین اور مومنین و صالحین ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں مذکور ہے:

"اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ".

دوسرے گروہ سے مراد یہود ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں، ان کے پیروکار کہلاتے ہیں اور تورات پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن تورات میں ذاتی اغراض اور مادّی مفادات کے تحت تغیر و تبدل کر چکے ہیں۔ یہ لوگ جان بوجھ کر حق کو چھپاتے رہے: "وَ یَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ" انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے رہے: "وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ" شرارتوں، سرکشیوں اور ظلم و عدوان کی بناء پر موردِ لعنت و غضبِ خدا ٹھہرے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

"وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ".

یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں:

"وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ".

نصاریٰ تین خداؤں کے قائل ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ

2۔ حضرت مریم

3۔ حضرت عیسیٰ

انہوں نے انجیل میں حسبِ مرضی تبدیلی کر دی اور اسی واسطے یہ گمراہ ہو گئے۔ ان کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ".

"وہ راہِ راست سے بھٹک گئے"۔

اسی واسطے ان کو ضالّین کہا گیا ہے۔ گو "من حیث الفرقہ" جماعتی حیثیت سے یہود "الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" اور نصاریٰ "وَ الضَّآلِّیْنَ" کے مصادیق ہیں، مگر انفرادی طور پر ہر وہ شخص جو ایسے عقائد و افعال کا مرتکب ہو، جو غضبِ الٰہی اور لعنتِ خدائی کا موجب ہو، مغضوب علیہم کا مصداق قرار پاتا ہے۔ مثلاً ارشادِ خداوندی ہے:

"وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا" (نساء/۹۵)۔

"جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر ناحق قتل کرتا ہے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ ہمیشہ جہنم میں جلتا رہے گا اور اس پر خدا کا غضب ہے اور اس پر لعنت ہے اور خدا نے اس کے واسطے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

اسی طرح کسی معصوم و معصومہ کو اذیت دینے والا، امام و نبی کو ستانے والا مورد غضب خدا ہے۔ جیسا کہ ارشاد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یَغْضَبُ بِغَضَبِ فَاطِمَۃَ بَضْعَۃٌ مِّنِّیْ مَنْ اَغْضَبَھَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ وَ مَنْ اَغْضَبَنِیْ فَقَدْ اَغْضَبَ اللّٰہَ".

"فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا اور جس نے مجھے غضبناک کیا، اس نے خدا کو غضبناک کیا"۔

تو معلوم ہوا کہ حضرتِ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا بضعۃ الرسولؐ کو ناراض کرنے والا "مغضوبِ خدا" اور وہ بھی "مغضوبِ علیہم" کی فہرست میں داخل اور "انعمت علیھم" کے مصداق کی فہرست سے خارج ہے۔ لہٰذا اس کی راہ "راہِ راست" نہیں۔ بحکم خدا اس سے اور اس کی راہ "طریق عمل" سے بیزاری ضروری ہے۔

"غضب" کی ضد "رضا" ہے۔ "مغضوب" کے مقابل "مرضی" ہے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے خدا کی مرضی خرید لی، وہ "انعمت علیہم" کے مصداق، کیونکہ خدا جن پر راضی ہوتا ہے، جو خدا کی رضا حاصل کرتے ہیں، وہی خدا کی خاص نعمتوں کے سزاوار ہوتے ہیں۔ انہی کی راہ "راہِ راست" ہے۔

ہر وہ شخص جو علوم قرآن اور احکامِ شریعت سے جاہل ہے، وہ ضال یعنی گمراہ ہے۔ لہٰذا باغی، سرکش، ظالم، مشرک اور جاہل فاسق و فاجر، مشرک و منافق کی راہ "صراطِ مستقیم" نہیں اور اس سے بیزاری واجب ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ "صراطِ مستقیم" وہ ہے جو "افراط و تفریط" سے پاک ہو، نہ ہی مرتبہ صحیح سے کسی کو گھٹایا جائے اور نہ ہی مقامِ راست سے کسی کو بڑھا دیا جائے۔ گھٹانے والے مقصر اور بڑھانے والے غالی کہلاتے ہیں۔ یہود گھٹاتے تھے، ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور نصاریٰ بڑھاتے تھے، وہ گمراہ ہو گئے۔ مومنین صراطِ مستقیم پر ہیں، لہٰذا وہی طریقہ صحیح ہے جس میں نہ غلو ہو اور نہ ہی تقصیر۔

رحمت اور نعمت

جس طرح رحمت عام بھی ہے اور خاص بھی، اسی طرح نعمت عام بھی ہے اور خاص بھی۔ اس کی عام رحمت میں اس کی

ہر مخلوق کا حصہ ہے چاہے وہ جاندار ہے یا بے جان، کافر ہے یا مسلمان، مومن ہے یا منافق، صالح ہے یا فاسق، اسی طرح اس کی عام نعمتوں، صحت، زندگی، آب وہوا، دھوپ وسایہ، معادن وجواہر، نبات وحیوانات وغیرہ میں بھی ہر ملحد وجاحد اور ہر مومن وعابد، ہر مخلص وصالح اور ہر مشرک وطالح شریک ہے۔ لیکن رحمتِ خاص اور نعمتِ خاص کے وہی مستحق ہیں جو اس کے مقرب اور خاص بندے ہیں۔ جن کی زندگیاں اس کی محبت ورضا کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔

عام رحمت ونعمت، جو انسان کے بدن کی پرورش کے اسباب مہیا کرے، وہ "رحمتِ عامہ" ہے اور عام رحمت کے تقاضے، جو اسبابِ معیشت، مادّی زندگی کی ضروریات پوری کریں وہ عام نعمتیں ہیں۔

اسبابِ تربیتِ جسمانی اور ضروریاتِ مادّی زندگانی، نعماتِ عامہ ہیں جو ہر فرد کیلئے ہیں اور جو انسان کی روحانی زندگی اور حیاتِ اُخروی کی تربیت کرے، وہ رحمتِ خاصہ ہے۔ رحمتِ خاصہ کے تقاضوں کے مطابق اس کی روحانی زندگی کے ارتقاء کیلئے جو اسباب اور عنایاتِ الٰہی عطا ہوں وہ انعاماتِ خاصہ ہیں، جو خاص بندوں کیلئے وقف ہیں۔

رحمت سبب ہے نعمت کا اور نعمت مسبّب ہے۔ عام رحمت، عام نعمت کا سبب ہے اور خاص رحمت خاص نعمت کا سبب ہے۔ عام نعمتیں تو بے شمار ہیں:

"وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا"

"اگر اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔"

خاص نعمتوں سے مراد اس کے بلند مناصب وحی، نبوت ورسالت اور اس کا پیغام وغیرہ ہیں، جیسا کہ ان آیات میں ان کا ذکر ہے:

"وَذَكِّرْ فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ".

"ان کو یاد دلا کہ تو اپنے رب کی نعمت کے ساتھ کاہن (نجومی) نہیں اور نہ ہی دیوانہ ہے"۔

"وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ".

"اپنے رب کی نعمت بیان کر، لوگوں کو بتا۔" (والضحیٰ)

"اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ. وَ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ" (النحل/۷۱،۷۲)

"وہ خدا کی خاص نعمت کا انکار کرتے ہیں"۔

"یَعْرِفُوْنَ نِعْمَۃَ اللّٰہِ ثُمَّ یُنْکِرُوْنَھَا".

"وہ خدا کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر انکار کر جاتے ہیں"۔

"اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ". (المائدہ/۱۰۹)

"اے عیسیٰ بن مریم! اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں اور تمہاری والدہ کو دی"۔

"وَ کَذٰلِکَ یَجْتَبِیْکَ رَبُّکَ وَ یُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَ یُتِمُّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ وَ عَلٰی آلِ یَعْقُوْبَ کَمَا اَتَمَّھَا عَلٰی اَبَوَیْکَ مِنْ قَبْلُ اِبْرَاھِیْمَ وَ اِسْحٰقَ ط اِنَّ رَبَّکَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ".

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے پدر حضرت یعقوب علیہم السلام سے خواب عرض کیا تو اس وقت مہربان پدر نے پیارے بیٹے سے فرمایا: "اسی طرح تجھے چن لے گا تیرا رب اور تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور وہ اپنی نعمت تجھ پر اور آلِ یعقوبؑ پر تمام کرے گا، جس طرح کہ اس نے تجھ سے پہلے تیرے باپ ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ پر تمام کی تھی۔ بیشک تیرا رب علم و حکمت والا ہے"۔ (یوسف/ابتدائی آیات)

اس آیت میں چار انبیاء کا ذکر ہے جن پر نعمت تمام ہوئی۔ یعنی حضرتِ یوسفؑ، حضرتِ یعقوبؑ، حضرتِ اسحٰقؑ اور حضرتِ ابراہیمؑ۔ یہاں نعمت سے مراد نبوّت ہے اور نبوّت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں نعمت سے مراد وہ نعمت ہے جو روحانی درجات بڑھاتی ہے اور قوتِ قدسیہ کو تیز کرتی ہے۔ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا حضرتِ یوسف علیہ السلام کو اور ان پر اور آلِ یعقوبؑ پر اتمامِ نعمت کی بشارت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں نعمت سے مراد نبوت ہے۔ نعمت تمام ہونے سے مراد ہے کہ پیغامِ خداوندی اور اس کے احکام کا مکمل ہو جانا۔

تکمیلِ دین و اتمامِ نعمت

جب حضور ختم الرسلین حضرتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر احکامِ وحی مکمل ہو گئے اور پیغاماتِ الٰہی پورے نازل ہو چکے تو تکمیلِ رسالت اور اتمامِ نعمت کی بشارت دی گئی:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً". (المائدہ۔پ۶)

"آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے واسطے دین اسلام کو پسند کر لیا۔"

لفظ "آج" کی قید بتاتی ہے کہ کل تک دین مکمل نہ تھا، نعمت تمام نہ تھی اور آج مکمل اور تمام ہوئی۔ کل اور آج میں ویسے تو ایک دن کا فرق ہے لیکن ایک دن کا فرق بھی بہت کچھ کام کر دیتا ہے۔ شبِ قدر بھی صرف ایک رات ہے لیکن شرف وفضیلت میں ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

خُمِ غدیر

اسی طرح اٹھارہ ذوالحجہ ۱۰ ہجری کا دن صرف ایک ہی دن ہے لیکن عظمت وشرف میں ہزاروں دنوں سے بہتر ہے، کیونکہ اس دن دین کی تکمیل ہوئی، نعمت نبوت ورسالت تمام ہوئی اور اسلام کو پسندیدگی کی سند ملی۔

اگر غار حرا کو فخر ہے کہ اس میں وحی کا آغاز ہوا اور نزولِ قرآن کی ابتداء اور بعثت یعنی اظہارِ نبوت کا حکم ملا، تو میدانِ خمِ غدیر کو بھی یہ فخر وشرف حاصل ہے کہ یہاں آخری وحی نازل ہوئی، پیغامِ ربانی کا اختتام ہوا، قرآن ودین اسلام کی تکمیل ہوئی، نعمت نبوت تمام ہوئی اور اسے رضائے الٰہی کی سند عطا ہوئی۔ اس واسطے اٹھارہ ذوالحجہ کا دن بڑی عظمت والا ہے۔ سترہ ذوالحجہ کو نہ دین کامل تھا، نہ نعمت تمام تھی حالانکہ توحید ونبوت تھی، ملائکہ وکتب سماویہ پر ایمان تھا، قیامت پر عقیدہ تھا، نماز تھی، روزہ تھا، زکوٰۃ تھی، جہاد تھا، حج تھا اور حج ہی سے واپسی بھی تھی اور اسلام کے اصول وفروع بھی تھے مگر دین کامل نہ تھا اور ۱۸ ذی الحجہ کو کامل ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تکمیلِ دین اور اتمامِ حجت میں ایک اہم چیز کی کمی تھی جو اٹھارہ ذی الحجہ کو پوری ہوئی اور جسے لوگوں کو پہنچانے اور عمل کر کے دکھانے کا حکم نازل ہوا۔

"یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ".

"اے رسولؐ! وہ حکم لوگوں تک پہنچا دیجئے جو آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے نازل فرمایا گیا ہے اور اگر آپؐ نے اس پر عمل کر کے نہ دکھایا تو گویا آپؐ نے رسالت کو پہنچایا ہی نہیں۔ خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"۔

جب اس آیت کی تبلیغ ہوئی اور اس خاص امر کی تکمیل ہوئی تو آخری آیت نازل ہوئی:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ".

"آج میں نے تم پر دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کا سلسلہ تمام کر دیا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس امرِ خاص کو تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت یعنی نبوت میں بڑا دخل تھا۔اس کے بغیر دین ناقص اور نعمت ناتمام ہے۔آخر یہ اہم امر اور خاص کام ہے کیا، جس کے بغیر دین کامل نہیں، نعمت تمام نہیں اور اسلام پسندیدہ نہیں؟

آیئے حضرات! اس امر پر تھوڑی سی بحث کر لیں اور کھوج لگا لیں۔

اوّل

ایک تو یہ کہ اگر تم نے یہ کام کر کے نہ دکھایا تو گویا رسالت پہنچائی ہی نہیں۔اتنا ضروری ہے کہ اگر محبوب پیغمبرؐ یہ پیغام نہ پہنچائیں اور عمل کر کے نہ دکھائیں تو جتنے امور رسالت انجام دیئے ہیں ان کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں۔سب بے قدر ہیں۔اگر یہ خاص امر ساتھ نہ ہو تو معلوم ہوا کہ تمام امورِ اسلام اور کارِ رسالت کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اسلام کی یہ تمام قدر و قیمت صرف اسی ایک خاص کام کے ساتھ وابستہ ہے۔

تو جتنا پہنچانا رسولؐ کیلئے ضروری ہے، اتنا ہی اُمت کیلئے بھی ماننا ضروری ہے۔اگر رسولؐ پہنچائیں نہیں تو ان کی رسالت میں ضعف اور اگر مسلمان مانیں نہیں تو ان کے ایمان بیکار۔اگر رسولؐ کی رسالت اس کام کے بغیر بیکار ہو سکتی ہے تو مسلمان کا اسلام اور مومن کا ایمان، نبی کی نبوت کے مقابلے میں کیا چیز ہے اور کیسے یہ اس خاص کام کے بغیر فائدہ مند ہو سکتا ہے؟

دوّم

اس امرِ خاص کی تبلیغ اور اس کی تعمیل خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ آیتِ مبارکہ کا آخری جملہ ہے:

"وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ".

"اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے گا"۔

حفاظت کی ضمانت وہاں دی جاتی ہے جہاں خطرہ ہو، خوف ہو یا نقصِ امن کا ڈر ہو۔اس مقام پر جہاں یہ آیت نازل ہوئی کیا ڈر تھا اور کس سے ڈر تھا؟

ولایت علیؑ کی تبلیغ

عام مسلمان کہتے ہیں کہ تمام امورِ اسلام اور احکامِ شریعت تھے، انہی کی تبلیغ کی تاکید کی گئی تھی۔مگر مجھے ان سے اختلاف ہے کیونکہ خوف و خطرہ کی گھڑیاں بیت چکی تھیں، ڈر کا زمانہ گزر چکا تھا، اب تو سارا عرب اسلام قبول کر چکا تھا، اب تمامِ اُمورِ اسلام کی تبلیغ کرنے سے کیا ڈر تھا؟ آغازِ اسلام میں یہ امور پہنچائے جب کہ کفر و شرک کا غلبہ تھا اور دشمنوں کی کثرت اور کفر کو

قوت حاصل تھی۔ اس وقت نہ ڈرے اور اب جبکہ علم اسلام پوری سرزمین عرب پر لہرا رہا تھا، کفر و شرک کا زور ختم ہو گیا تھا، دشمن کمزور اور ملیامیٹ ہو گیا تھا اور تمام عرب زیرنگیں تھا، اب احکامِ اسلام پہنچانے میں کیا ڈر تھا؟

پھر اس آیتِ مبارکہ کے نزول کے وقت لوگ ساتھ ہیں، صحابہ ساتھ ہیں، ایک لاکھ سے زائد مجمع ہے، ماشاءاللہ! سب مسلمان ہیں، ان میں کوئی یہودی نہیں، نصرانی نہیں، مشرک و کافر نہیں، تمام کلمہ گو صحابی اور سارے مسلمان حاجی ہیں، لیکن خطرہ بدستور قائم ہے، کیوں؟ ''اللہ تجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا'' کا جملہ بدستور خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے اور حفاظت کی تسلی بھی دے رہا ہے۔ حکم خطرناک ضرور ہے اور اس حکم کی تبلیغ و تعمیل سے ساتھیوں کے دل پر چوٹ لگنے اور ان کی امیدوں پر اوس پڑنے کا امکان ہے۔ آؤ حضرات! اس حکم کا کھوج لگائیں۔

کیا نماز کا حکم تھا؟ ہرگز نہیں، نماز تو تیس سال سے پڑھ رہے تھے اور ماشاءاللہ سارے ہی نمازی تھے۔

کیا روزہ کا حکم تھا؟ نہیں ہرگز نہیں، سارے روزے رکھتے تھے۔ بھلا روزے کے حکم سے انہیں کیا کد تھی؟

کیا زکوٰۃ کا حکم تھا؟ نہیں جناب! زکوٰۃ کا حکم تو بہت پہلے سن چکے تھے اور عمل بھی کر چکے تھے۔ زکوٰۃ لیتے بھی تھے اور دیتے بھی تھے۔

کیا حج کا حکم تھا؟ نہیں حضور! حج تو کر کے آ رہے تھے۔ حج کے حکم سے ان کی کون سی اُمید ضائع ہو جاتی؟

کیا جہاد کا حکم تھا؟ ہرگز نہیں، مدینے میں ساری عمر جہادوں میں ہی تو گزاری، میدانِ قتال تک جاتے تھے۔ مجاہد تھے یا نہ تھے، میدانِ جہاد کے مسافر تو تھے ہی۔

پھر کون سا حکم تھا، جس کی ادائیگی عین دوپہر کے وقت تپتی زمین پر اور چلچلاتی دھوپ میں ضروری تھی؟

حضور! بات یہ ہے کہ جب اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، حکومت مضبوط ہو جاتی ہے، لوگ برسراقتدار آ جانے والی جماعت میں فوج در فوج داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اوّلاً تو اتنے عہدے نہیں، جو سب میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ جنہیں کوئی عہدہ مل جائے وہ معاون اور مدّاح اور جو بدنصیب عہدے سے محروم رہ گیا وہ لگا شرارتیں کرنے، عیب جوئی کرنے، عیب نکالنے اور صاحبِ عہدہ اور صاحبِ منصب سے حسد کرنے۔

علاوہ ازیں اسلام میں عہدہ کی عطا صرف اہلیت اور لیاقت کی بنیاد پر ہے اور یہ عہدے اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ کیونکہ ظاہری و باطنی خوبیوں، ماضی و مستقبل کے حالات سے وہی واقف ہے۔ اس واسطے یہ منصب وہی عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

آج، یعنی اٹھارہ ذوالحجہ کو مقامِ خمِ غدیر پر اس عہدہ کی عطا کا اعلان کرنا تھا اور اس منصب کو اس کے اہل کے سپرد کرنا تھا۔ محروم لوگوں کے حسد اور ان کے احساسِ محرومی کے ردِّعمل کا خوف تھا۔ جو حاسدوں اور محرومِ اقتدار لوگوں سے عموماً وقوع میں آتا رہتا ہے اور خطرہ بیرونی نہ تھا، بلکہ اندرونی تھا۔ بیرونی خطرے تو ٹل چکے تھے، مگر اب اندرونی سازشوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ بیرونی دشمنوں سے اندرونی دشمن زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عہدہ کی عطا تھی، بلکہ عطا کا اعلان تھا۔ نبوّت تو ختم تھی مگر خلافت وولایت باقی تھی۔ تاریخ واحادیث کی کتب بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کھلے میدان میں اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا تاکہ عام سطح سے بلند ہو کر اعلان کریں۔

مجمع میں ہزاروں کے اجتماع میں آواز پہنچانے کیلئے مقرر بلند مقام پر کھڑا ہوتا ہے تاکہ سارا مجمع اس کی آواز کو سن سکے۔ چونکہ اہم اور بہت ہی ضروری اعلان تھا، اس واسطے اس کے پہنچانے کا اہتمام بھی شاندار اور موثر طریقے پر کیا گیا کہ پالانوں کا اونچا منبر بنایا گیا اور عہدۂ تاج پہنانے کی خاطر امیدوار بلکہ حقدار کو اپنے ساتھ منبر پر لے گئے۔ حسبِ فرمانِ خداوندی اس حکم کی زبانی تبلیغ کی اور "مَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی" کے لبوں سے قولی صورت میں کی اور فرمایا:

"مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ"

"جس جس کا میں مولا ہوں، اُس اُس کا یہ علیؑ مولا ہے"۔

صرف زبانی تبلیغ کافی نہ تھی، عملی مظاہرہ بھی ضروری تھا۔ ادھر لبوں نے جنبش کی اور "من کنت مولاہ" کی صدا صحابیوں کے کانوں سے ٹکرائی، ساتھ ہی نبوت وامامت کے ہاتھ ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئے۔ عہدہ کا اعلان کیا گیا اور عہدیدار کا تعین ہو گیا۔ انگلی کے اشارے سے نہیں تاکہ بہت سے لوگ دعویدار نہ بن جائیں کہ میری طرف اشارہ تھا۔ اس واسطے ہاتھ پکڑ کر دکھا دیا۔ مقام الگ بنایا، عام مجمع سے علیحدگی اختیار کی۔ ایک منبر تھا جہاں نبیؐ وعلیؑ کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا۔

قارئین کرام! مولا اور ولی ایک مصدر کے دو مشتق ہیں۔ مادّہ ایک ہے۔ دونوں کا معنی اس مقام پر ایک ہے۔ یعنی حاکم، متصرف، دوسرے معنوں میں اپنے بعد جانشین کا اعلان کیا۔ یہاں اس نشست کیلئے انتخاب اُمت اور لوگوں کے چناؤ کو دخل نہ تھا۔ یہ خدا کی طرف سے نامزدگی تھی۔ جب کسی نشست پر خالق کسی کی نامزدگی کر دے، مخلوق کو اس نشست کیلئے کسی اُمیدوار کے انتخاب کا حق نہیں۔ لہٰذا سقیفہ کی کارروائی فضول، مہمل اور بیکار ہے۔ ذرا ان سے پوچھئے تو سہی کہ جس نشست کیلئے آپ انتخاب کر رہے ہیں وہ خالی بھی ہے یا نہیں؟ وہ تو کئی ماہ پہلے خمِ غدیر میں پُر ہو چکی ہے۔ مخلوق کے انتخاب کو تو خدا منسوخ کر

سکتا ہے، لیکن خالق کے انتخاب کو مخلوق منسوخ نہیں کرسکتی۔

حضرات! وہ حکم پہنچایا گیا۔ ولایتِ علی علیہ السلام اور خلافتِ برادرِ رسولؐ وزوجِ بتولؑ کا اعلان کردیا گیا۔
معلوم ہوا کہ ولایتِ علی ابن ابیطالب علیہم السلام اسلام میں اتنی اہم اور دین میں اتنی ضروری تھی کہ اس کے بغیر رسالت بیکار، دین ناقص اور نعمت ناتمام جبکہ اس کے آنے سے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد آیت نازل ہوئی:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا".

حالانکہ اس سے کلمہ توحید "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" تھا۔ کلمہ رسالت "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" بھی موجود تھا۔ ملائکہ اور کتبِ سماویہ اور آخرت پر ایمان بھی تھا۔ نماز بھی تھی، روزہ بھی تھا، حج بھی اور زکوٰۃ بھی تھی۔ کون سا حکم ہے جو قبل ازیں نازل نہ ہو چکا تھا اور اس پر عمل بھی نہ ہو چکا تھا۔ صرف اسی آخری حکم کا اعلان اور تعمیل باقی تھی، جس کے بغیر دین نامکمل اور نعمت ناتمام تھی۔ سب کچھ تھا۔ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" لیکن "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ" نہ تھا۔ تو "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ" شرط ہے تکمیل عقیدہ کی "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی اور احکامِ شریعت کے قبول ہونے کی۔ "عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ" نے نعمت تمام کی۔ جس طرح نبوت ایک نعمت ہے، اسی طرح ولایت بھی ایک نعمت ہے۔ یہ لوگ مصداق ہیں "اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" کے جن پر نبوت و ولایت کی نعمتیں نازل ہوئیں۔ انہی کی راہ، راہِ راست اور صراط صراطِ مستقیم ہے۔ جس کا آخری کنارہ جنت کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی متضاد راہیں کوئی "مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ" ہے اور کوئی "ضَآلِّیْنَ" میں شامل ہے۔

قارئین! بابا علیؑ کی ولایت نے اسلام کو تکمیل کی سند دی اور بیٹے حسینؑ کی شہادت نے اس مکمل اسلام کی حفاظت کی۔
علی علیہ السلام نے رسالت کا حصہ یا شرط بن کر اسلام کو مکمل کیا اور حسین علیہ السلام نے جان قربان کر کے مٹتے اسلام کو زندہ کیا۔ مکمل کرنا آسان ہے لیکن مٹتے ہوئے دین کو بچانا دشوار ہے۔ اسلام مٹ جاتا اگر حسینؑ سر نہ دیتے۔ اسی طرح امام حسین علیہ السلام کے مقصد کو اگر زندہ رکھا ہے تو حضرت سیدہ زینب سلام اللہ علیہا نے۔ جہاں اسلام کی خاطر ہاشمی جوانوں نے میدانِ کارزار میں قربانیاں پیش کیں، وہاں ہاشمی مستورات نے بازاروں اور درباروں میں اپنے پردوں کی قربانیاں دے کر اسلام کی حفاظت کی۔

کربلا کے واقعات کے بعد اب کوفہ کے حالات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

کوفہ میں ورود

اہل بیت رسول علیہم السلام اور بنات بتولؑ اب ابن زیاد کے قیدی ہیں۔ عمر بن سعد اہل بیت علیہم السلام کا قافلہ لے کر روانہ ہوا۔ کوفہ پہنچنے سے قبل ہی شام ہوگئی۔ لہٰذا اس قافلہ کو کوفہ سے باہر ہی قیام کرنا پڑا اور یہ قافلہ ۱۲ محرم الحرام کو کوفہ شہر میں وارد ہوا۔

اسی کوفہ شہر میں جہاں بیس سال قبل امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت تھی۔ آپؑ نے حسب مصلحت کوفہ کو دارالخلافہ تجویز فرمایا اور اپنے اہل وعیال کو کوفہ میں طلب فرمالیا۔ امیر المومنین علیہ السلام کے زمانے میں حضرات حسنین شریفین شہزادے اور دختران علیؑ شہزادیاں تھیں۔ اشراف کوفہ کی عورتیں بارگاہ زینب وام کلثوم علیہا السلام میں باریابی پر فخر کرتی تھیں۔ پہلی بار کوفہ میں آئی تھیں تو عزت واحترام کے ساتھ حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، محمد بن حنفیہؒ، حضرت عباسؑ، حضرت عبداللہ بن جعفر علیہم السلام ہمراہ سفر اور نگران قافلۂ عصمت وطہارت تھے۔ خورد ونوش کا مکمل انتظام تھا اور سفر حسب مرضی تھا۔ جب کوفہ میں آئیں تو حضرت امیر المومنین علیہ السلام عزت واحترام کے ساتھ عصمت سراء میں لائے۔ جتنا عرصہ کوفہ میں قیام فرمایا تعظیم و تکریم کا ماحول رہا۔ اس دوران ان کا حلقہ درس وسیع تھا۔ زنان کوفہ اسلامی احکام سیکھنے کے لیے اور درس قرآن وحدیث لینے کیلئے بصد شوق ورغبت آتیں، دختران علیؑ وبتولؑ شریعت رسولؐ کے احکام نشر فرماتیں اور اسلام کی تبلیغ کرتیں۔

دین اسلام کی یہ مقدس معلمات اپنے قول وعمل سے زنان کوفہ اور مستورات مسلمین کو فقہی مسائل اور اسلامی احکام سے آگاہ فرماتیں۔ کوئی عورت قرآن پڑھ رہی ہے تو کوئی درس حدیث لے رہی ہے اور کوئی فقہی احکام حاصل کر رہی۔ غرض یہ کہ تبلیغ اسلام کا مقدس ماحول تھا اور وارث شریعت کی بیٹیوں سے زنان کوفہ اپنی دینی تربیت لے رہی تھیں۔

چالیس ہجری کو امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت ہوئی۔ والدؑ ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ حضرات حسنین علیہم السلام کوفہ سے واپس مدینہ تشریف لے گئے۔

اب بیس سال کے بعد اسی علیؑ کی بیٹیوں کو قضاء وقدر کوفہ میں لے آئی۔ اب کی مرتبہ کوفہ میں بغیر وارثوں کے آئیں۔ حسن مجتبیٰ علیہ السلام تو دس سال قبل مدینہ منورہ میں شہید کردیئے گئے۔ باقی مردان اہل بیت علیہم السلام کربلا میں شہید ہوگئے۔ دختران علیؑ اب جو کوفہ میں آئیں تو بھائی شہید کروا کے، بیٹے کٹوا کے اور گھر بار لٹوا کے آئیں۔

محرم کی بارہ تاریخ تھی۔ ابن زیاد، گورنر کوفہ کو اطلاع ملی کہ قافلہ کوفہ میں داخل ہونے والا ہے۔ شہدائے کربلا کے سر اس

ملعون کے دربار میں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔اس ناری نے حکم دیا کہ تمام سرنیزوں پر سوار کیے جائیں اور قافلہ کے پاس بھجوا دیے جائیں تاکہ قیدیوں کا قافلہ اور شہیدوں کے سر ایک ساتھ ہی شہر میں داخل ہوں۔ابن زیاد کے حکم کی تعمیل ہوئی، قافلہ کے آگے نیزوں پر سر سوار تھے اور قافلہ کو شہر میں داخل کرنے کے لیے آمادہ کیا گیا۔

عام لوگوں کو مطلع کیا گیا کہ کربلا کی جنگ میں ابن زیاد کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ حسین ابن علی علیہم السلام اور ان کے سارے ساتھی اس جنگ میں مارے گئے ہیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر کے کوفہ لایا گیا ہے۔شہداء کے سر نوک نیزہ پر اور قیدی بے کجاوہ کے اونٹوں پر سوار ہیں۔ جو قیدیوں کا تماشا اور سروں کا نظارہ کرنا چاہے، اذنِ عام ہے۔ کچھ لوگ بے علمی میں، کچھ عداوت کی بناء پر اور اکثر اوباش لوگ تماشا بنا کر اور بطور شغل یہ منظر دیکھنے کیلئے جمع ہو گئے۔

حضرات! آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے اشغال اور مناظر میں شرفاء کم ہی آتے ہیں اور رذیل، کمینے اور اوباش لوگوں کی کثرت ہوتی ہے۔شریف خاندانوں پر جب انقلاب کے دور آتے ہیں اور ان کی عزت اور بڑائی کا کوئی پاس نہیں کیا جاتا تو وہ گھروں سے باہر کم ہی نکلتے ہیں۔ برسرعام اور مجمع عام سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔شریف لوگ تو ان سے ہمدردی کرتے ہیں لیکن کمینہ فطرت اور کسی امیر کی ناجائز خوشامد کرنے والے ایسے انقلاب زمانہ کے ستائے ہوئے شرفاء پر آوازے کستے ہیں اور توہین آمیز جملوں سے ان کے دلوں کو مزید زخمی کر دیتے ہیں۔

اہل بیت محمد علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی شریف گھرانہ نہ تھا اور ابن زیاد اور اس کے ساتھی کوفیوں سے بڑھ کر کوئی کمینہ اور رذیل نہ تھا۔اذنِ عام ملتے ہی تمام شہر کے مرد و زن کوفہ سے باہر ''کناسہ'' کے مقام پر جمع ہو گئے اور قیدیوں اور سروں کا انتظار کرنے لگے۔ابن زیاد نے یہ اعلان بھی کروا دیا تھا کہ کوئی شخص یا عورت جنگی ہتھیار لے کر نہ نکلے، تاکہ کہیں بغاوت ہی نہ ہو جائے۔اس پابندی پر عمل درآمد کرنے کیلئے اس نے جابجا پولیس کے دستے مقرر کر دیے تھے۔

مسلم جصّاص

مسلم جصاص ایک راج (معمار) تھا۔ابن زیاد کے محل ''دارالامارہ'' کی مرمت کیلئے بلایا گیا تھا اور اس محل کی مرمت کے کام میں مشغول تھا۔کوفہ کے اطراف و جوانب میں سے لوگوں کے گروہ اور ان کے شوروغل کی آوازیں سن کر حیران ہوا کہ آج کیا ماجرا ہے۔لوگ اچھے اچھے لباس پہن کر گروہ در گروہ مقامِ کناسہ پر جمع ہو رہے ہیں۔چنانچہ اس نے دارالامارہ کے خادم سے ماجرا دریافت کیا۔اس نے جواب میں کہا: ''(معاذ اللہ) ایک خارجی نے یزید پر خروج کیا تھا۔وہ مارا گیا ہے اور اس کا سر اور

عورتوں اور بچوں کو قید کر کے کوفہ لایا جا رہا ہے"۔

مسلم بصاص کا بیان ہے:

میں نے اس خادم سے نام پوچھا تو اس نے جواب دیا: "حسینؑ ابن علیؑ"۔ جب میں نے یہ نام سنا تو میں دم بخود رہ گیا۔ میرے دل پر رنج والم کا غبار چھا گیا۔ خادم باہر چلا گیا تو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا اور اس زور سے طمانچے مارے کہ قریب تھا کہ میری آنکھیں ضائع ہو جاتیں۔ درد والم میں ڈوبا جب میں مقامِ کناسہ پر پہنچا، جہاں دوسرے لوگ بھی سروں اور قیدیوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک قافلہ وہاں پہنچا۔ اونٹوں پر دخترانِ رسولؐ اور کچھ بچے سوار تھے اور امام زین العابدین علیہ السلام بے پالان کے اونٹ پر سوار تھے اور آپؑ کے زخمی بدن سے خون بہہ رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں اور دردناک آواز کے ساتھ یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

يَا أُمَّةَ السُّوءِ لَا سُقْيًا لِرَ بعكم

يَا أُمَّةُ لَمْ تُراعِيْ جَدَّنَا فِيْنَا

"اے بری امت خدا تمہارے مسکن کو کبھی سیراب نہ کرے۔ اے بدکار امت تم نے ہمارے جدامجد کا ہمارے بارے میں کچھ حیاء ولحاظ نہ کیا"۔

لَوْ أَنَّنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ يَجْمَعُنَا

يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ

"اگر ہم رسولؐ خدا کے ساتھ روزِ قیامت اکٹھے ہوں تو تم کیا جواب دو گے؟"

تُسَرُّوْنَا عَلَى الْأَقْتَابِ عَارِيَةً

كَأَنَّنَا لَمْ نُشَيِّدْ فِيْكُمُ الدِّيْنَا

"ہمیں بے پالانوں کے اونٹوں پر برہنہ سر لئے چل رہے ہو گویا ہم نے تم میں دین کی بنیادیں مضبوط نہیں کیں"۔

بَنِيْ أُمَيَّةَ مَا هٰذَا الْوُقُوْفُ عَلٰى

تِلْكَ الْمَصَائِبِ لَا تُلَبُّوْنَ دَاعِيْنَا

"اے بنی اُمیہ! ان مصائب پر تمہارا وقوف کیا ہے؟ ہماری پکار کا جواب نہیں دیتے"۔

تَصفِقُونَ عَلَینا کَفُکُم فَرِحاً
وَ اَنتُم فِی فِجاجِ الاَرضِ تَسبُونا

''تم آج مسرت سے ہم پر تالیاں بجا رہے ہو اور زمین کے کشادہ راہوں میں ہمیں قیدی بنا کر پھرا رہے ہو''۔

اَلَیسَ جَدِّی رَسُولُ اللّٰہِ وَیلَکُم
اَھدیٰ البَرِیّۃِ مِن سُبلِ المُضِلِّینا

''افسوس ہے تم پر! کیا ہمارے جد امجد رسولؐ اللہ نہیں جو لوگوں کو گمراہی کے راستوں سے نکال کر ہدایت پر لے آئے؟''

یَا وَقعَۃَ الطَّفِ قَد اَورَثتِنِی حُزناً
واللّٰہُ یَھتِکُ اَستَارَ المُسِیئِینا

''اے واقعہ کربلا! تو نے مجھے غم کا وارث بنادیا اور خدا بدکاروں کے پردے چاک کر دیتا ہے''۔

زن و مرد قیدیوں کی خستہ حالی، بیکسی اور مظلومی پر آنسو بہانے لگے۔ بچوں کی یتیمی اور غریبی پر لوگ کھجوریں اور روٹیوں کے ٹکڑے پھینکنے لگے۔ جناب ام کلثوم علیہا السلام یہ کھجوریں اور روٹیوں کے ٹکڑے لے کر یہ کہہ کر زمین پر پھینک دیتیں کہ ہم اہل بیت ہیں، ہم پر صدقہ حرام ہے۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی گریہ وزاری اور بے پالان کے اونٹ پر سواری اور بنات رسول کی قید اور لاچاری دیکھ کر کوفے والے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ جناب ام کلثوم سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

''یَا اَھلَ الکُوفَۃِ تَقتُلُنَا رِجَالُکُم وَ تَبکِینَا نِسَآئُکُم فَالحَاکِمُ بَینَنَا وَ بَینَکُمُ اللّٰہُ یَومَ القِیَامَۃِ''.

''اے اہل کوفہ! تمہارے مرد ہمیں قتل کرتے ہیں اور تمہاری عورتیں ہم پر روتی ہیں؟ اچھا! اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان روز قیامت فیصلہ کرے گا''۔

مسلم کہتا ہے کہ اس وقت اتنا شور وغل بلند ہوا کہ لوگوں کی نگاہیں پھر گئیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شہدائے کربلا کے سر نیزوں پر بلند ہیں اور سب سے آگے آگے حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر آرہا ہے:

"وَ هُوَا رَاسٌ زُهْرِیٌ قَمَرِیٌّ اَشْبَهُ الْخَلْقِ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ اَلْحِیَتُهٗ کَسَوَادِ اَبْسَجٍ قَدِاتَّصَلَ بِهَا الْخِضَابُ وَجْهُهٗ دَارَةُ قَمَرٍ طَالِعٍ وَ الرِّیْحُ تَلْعَبُ بِهَا یَمِیْناً وَّ شِمَالاً".

"وہ سر جو چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور رسولِ خدا کے ساتھ مشابہ تھا اور جس کی ریش مبارک خضاب کی وجہ سے سیاہ تھی اور چہرۂ مبارک چودھویں کے چاند کی طرح گول اور روشن تھا"۔

جو لوگ یہ نظارہ دیکھنے اور تماشا کی خاطر جمع ہوئے تھے یہ کرب ناک منظر دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ ان کی آہ و بکاء دیکھ کر حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے کہا:

"تَنُوْحُوْنَ وَ تَبْکُوْنَ مَنْ اَجْلِنَا فَمَنْ ذَالَّذِیْ قَتَلَنَا".

"کوفہ والو! تم نوحہ و بکاء کر رہے ہو؟ یہ تو بتاؤ کہ پھر ہمیں قتل کس نے کیا ہے؟ تم تو قتل بھی کرتے ہو اور آنسو بھی بہاتے جاتے ہو"۔

اسی اثناء میں ایک عورت نے کوٹھے کی چھت پر سے جھانک کر کہا:

"مِنْ اَیِّ الْاُسَارٰی اَنْتُمْ؟"

"قیدیو! یہ تو بتاؤ کہ تم کس قوم و قبیلہ سے ہو؟"

بیبیوں نے جواب دیا:

"نَحْنُ اُسَارٰی مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ".

"ہم قیدی خاندانِ نبوّت ہیں"۔

یہ سن کر اس کا دل بھر آیا اور ہمدردی کے انداز میں اس نے بے پردہ مستورات کیلئے کچھ برقعے اور چادریں اکٹھی کر کے ان بے پردہ بیبیوں کی خدمت میں پیش کیں، لیکن روایت بتاتی ہے کہ ظالموں نے ان برقعوں اور چادروں سے بھی انہیں منہ نہ چھپانے دیا اور بے دردی سے یہ بھی چھین لئے۔

دخترانِ حیدرِ کرار کے خطبے

تقریر کرنے کے وقت ہوش و حواس بجا اور ذہنی قوتوں کا سلامت ہونا ضروری ہے۔ دماغی پریشانی اور بے چین

طبیعت، رنج واذیت سے دل کا غبار آلود ہونا بیان کی ادائیگی میں رُکاوٹ ڈالتا ہے۔کوئی غمزدہ اور مصیبت میں مبتلا بشر ایک کلمہ بھی منہ سے نہیں بول سکتا۔

حضرات! آپ خود اندازہ کریں کہ حیدر کرّار علیہ السلام کی بیٹیاں کن مصائب کے پہاڑ سروں پر اٹھائے ہوئے تھیں؟ دل ودماغ پر کس قدر پریشانیاں چھائی ہوئی تھیں؟ دکھوں کے کربناک اور ہولناک سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کتنے صدمے اور رنج اٹھا چکی تھیں۔ پھر عورت ذات، بے حیاؤں کا مجمع عام، دشمنوں کا شہر، بے وارث و بے وطن بیبیاں، مگر قوت ارادی اور روحانی طاقت کی مالک، صبر وتحمل کے اعلیٰ مدارج پر فائز، کمال استقلال کے آخری درجہ پر فائز شہزادیوں نے قاتلین کے شہر اور دشمنوں کے مجمع میں وہ موثر اور فصیح و بلیغ خطبے ارشاد فرمائے کہ لوگ ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ غرض یہ کہ آپؑ نے کمالِ فصاحت وبلاغت سے اپنے مافی الضمیر کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور باطل کے مکروفریب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا اور حقیقت کو اس طرح آشکار کر دیا کہ تماشائیوں کی آنکھیں کھل گئیں، قصرِ ظلم کی بنیادیں ہل گئیں اور جبر واستبداد کے محل کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔

حسینی اقدام کا پس منظر بیان کیا اور حضرت سید الشہداء علیہ السلام کا نصب العین اور مقصدِ شہادت فصاحت کے ساتھ پیش کیا۔ کوفہ والوں کو ان کی بے وفائی اور ان کے مکروفریب سے آگاہ کیا اور اپنے مقصد پر ثبات اور عزم واستقلال کا اظہار کیا، نیز شہداء کی داستان کے خاکے میں وہ شوخ رنگ بھرا کہ فضائے زمانہ نے ان نقوش کو اپنے دامن میں بحفاظت قائم ودائم رکھا۔

اس وقت رخِ زینب سلام اللہ علیہا سے رعب محمدیؐ اور جلالِ حیدریؑ ٹپک رہا تھا۔

عقیلہ بنی ہاشم سلام اللہ علیہا

سب سے پہلے فصاحت و بلاغتِ علوی کی وارث اور جلالِ حیدری کی امانت دار، عباسؑ کی بہن حضرت زینب سلام اللہ علیہا دختر شیر یزداں علی ابن ابیطالب علیہما السلام نے پشتِ شتر کے منبر سے ہزاروں سامعین کے سامنے اپنے خطبے کا آغاز کیا۔ غم ودکھ کے سفر کی تھکی ہوئی مسافرہ نے مجمع عام پر پوری طرح قابو پالیا۔ شوروغل کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی مگر رعب وجلالِ پدر کا نمونہ بن کر آپ نے انگلی کا اشارہ کیا اور کہا:

"اَنْصِتُوْا".

"خاموش ہو جاؤ!"

"فَارْتَدَّتِ الْاَنْفَاسُ وَ سَكَنَتِ الْاَجْرَاسُ".

"چلتے ہوئے سانس بدنوں میں رک گئے اور کاررواں کی گھنٹیاں خاموش ہوگئیں"۔

لوگ ہمہ تن گوش ہو کر تقریر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس قدر پر تاثیر خطبہ تھا کہ ایک شخص حزام اسدی کہتا ہے: خدا کی قسم! میں نے کسی پردہ نشین عورت کو دختر علی علیہم السلام سے زیادہ پرزور تقریر کرتے نہیں دیکھا۔

"كَاَنَّهَا تَنْطِقُ وَ تَفْرِغُ عَنْ لِسَانِ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْطَالِب عَلَيْهِم السَّلَام".

"حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے انداز بیان اور لب ولہجہ وفصاحت و بلاغت سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت امام علی ابن ابیطالب علیہما السلام کلام کر رہے ہیں"۔

چونکہ کوفہ کے لوگ مسجد کوفہ کے منبر سے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے فصیح و بلیغ خطبے سن چکے تھے اس لیے انہوں نے جب حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے خطبے سنے تو ایسے محسوس کیا کہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہم السلام کلام کر رہے ہیں۔

ہم طوالت کے خوف سے پورا خطبہ نقل کرنے سے قاصر ہیں، صرف ایک اقتباس درج کرتے ہیں۔ جب حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے یہ جملے کہے:

"وَيْلَكُمْ يَا اَهْلَ الْكُوْفَةِ! اَتَدْرُوْنَ اَیَّ كَبِدٍ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ فَرَيْتُمْ؟ وَ اَیَّ كَرِيْمَةٍ لَهُ اَبْرَزْتُمْ؟ وَ اَیَّ دَمٍ لَهُ سَفَكْتُمْ؟ وَ اَیَّ حُرْمٍ لَهُ اِنْتَهَكْتُمْ؟ وَ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئاً اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا.

وَ لَقَدْ اَتَيْتُمْ بِهَا خَرْقَاءَ شَوْهَاءِ كَطِلَاعِ الْاَرْضِ وَ مِلْءَ السَّمَآءِ اَفَعَجِبْتُمْ اَنْ مَطَرَتِ السَّمَاءِ دَماً وَ لَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَخْزَىٰ وَ هُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ. فَلَا يَسْتَخِلَفَنَّكُمُ الْمُهَلُ فَاِنَّهُ لَا يَحْفِزُهُ الْبِدَارُ وَ لَا يُخَافُ فَوْتَ الثَّارِ وَ اِنَّ رَبَّكُمْ لِبَا الْمِرْصَادِ".

"اے کوفہ والو! کیا تم جانتے ہو کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جگر کے کس ٹکڑے پر چھری چلائی؟ رسول اللہ کا کون سا خون بہایا؟ رسول اللہ کی کون سی ہتک حرمت کی؟ ان کی دختران کو بے پردہ کیا؟ تم نے ایسے افعال شنیعہ کا ارتکاب کیا ہے اور ایسا جرم کیا ہے کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ یہ

ایک مصیبتِ عظمیٰ ہے، کج و پیچیدہ، بدترین و شوم اور منحوس کہ جس سے چارۂ نجات نہیں۔ تم نے قتلِ امام معمولی سمجھا؟ (یہ قتل) اس قدر عظیم ہے کہ زمینوں اور آسمانوں کی وسعت کے برابر ہے۔ تم حیران ہو کہ آسمان سے خون برسا؟ آخرت کا عذاب اس سے شدید ترین اور رسوا کر دینے والا ہے، جس دن ظالموں کی کوئی مدد نہ کی جائے گی۔ اس وقت جو تم عذاب سے بچے ہوئے ہو اور تمہیں جو مہلت دی گئی ہے، اس سے خوش نہ ہو! خدا بدلہ لینے میں جلدی نہیں کرتا۔ (وہ ظالموں کو مہلت دیتا ہے کہ ان کا نامہ اعمال جرائم سے بھر جائے) کیونکہ اسے انتقام کے فوت ہو جانے کا خدشہ نہیں (اور وہ جانتا ہے کہ ظالم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے) بیشک تمہارا پروردگار اپنے ظالم بندوں کی تاڑ میں ہے"۔

اس کے بعد یہ اشعار پڑھے:

مَاذا تَقُوْلُوْنَ اِذْقَالَ النَّبِیُّ
مَا ذَا صَنَعْتُمْ وَ اَنْتُمْ آخِرَ الْاُمَمِ
بِعِتْرَتِیْ بِاَهْلِیْ بَعْدَ مُفْتَقَدِیْ
مِنْهُمْ اُسَارٰیْ وَ مِنْهُمْ ضُرِّجُوْا بِدَمِیْ
مَا کَانَ ذَاکَ جَزَائِیْ اِذْ نَصَحْتُ لَکُمْ
اَنْ تُخَلِّفُوْنِیْ بِسُوْءٍ فِیْ ذَوِیْ رَحِمٍ
اِنِّیْ لَاَخْشٰی عَلَیْکُمْ اَنْ تَحِلَّ بِکُمْ
مِثْلُ الْعَذَابِ الَّذِیْ یَاْتِیْ عَلَی الْاُمَمِ

راوی کا بیان ہے کہ اس خطبے کا اتنا اثر ہوا کہ لوگ حیران و سرگردان تھے اور منہ میں انگلیاں ڈالے زار و قطار رو رہے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ میرے پہلو میں ایک ضعیف شخص کھڑا رو رہا تھا، اس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہہ رہا تھا:

"بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَ اُمِّیْ کُهُوْلُکُمْ خَیْرُ الْکُهُوْلِ وَ شَبَابُکُمْ خَیْرُ الشَّبَابِ وَ نِسَآئُکُمْ خَیْرُ النِّسَآءِ وَ نَسْلُکُمْ خَیْرُ النَّسْلِ وَ فَضْلُکُمْ عَظِیْمٌ"

"تمہارے بزرگ تمام دنیا کے بزرگوں سے، تمہارے جوان سب جوانوں سے، تمہاری عورتیں عالمین کی عورتوں سے افضل ہیں اور بہتر ہیں اور تمہاری نسل جہان بھر کی نسلوں سے اشرف اور اعلیٰ ہے اور تمہارا فضل و مرتبہ بہت بلند اور عظیم ہے"۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے پھوپھی کو خاموشی کی نصیحت فرمائی اور کہا:

"اَنْتِ بِحَمْدِ اللّٰہِ عَالِمَۃٌ غَیْرُ مَعَلَّمَۃٍ وَّ فَھِمَۃٌ غَیْرُ مُفَھَّمَۃٍ"

"پھوپھی اماں! آپ بغیر کسی کی تعلیم کے عالمہ لدنی ہیں اور بغیر کسی کے سمجھائے خود فہم وادراک رکھتی ہیں"۔

جنابِ فاطمہ بنت الحسینؑ سلام اللہ علیہا

اس کے بعد حضرت فاطمہ بن الحسینؑ سلام اللہ علیہا نے خطبہ پڑھا۔ حضرت حیدر کرار علیہ السلام کی پوتی اور بلاغت حسینیؑ کی وارثہ تھیں۔ ایسا پرجوش خطبہ اور ایسی عبرت انگیز تقریر تھی کہ اہل کوفہ کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ درد والم میں ڈوبے ہوئے فقروں نے سنگدل اعداء کو بھی رونے پر مجبور کر دیا۔ آپؑ خطبہ دے رہی تھیں کہ نوحہ وبکاء کی آوازیں بلند ہوئیں اور لوگوں نے کہا:

"فَارْتَفَعَتْ الْاَصْوَاتُ بِالْبُکَاءِ وَ النَّحِیْبِ وَ قَالُوْ حَسْبُکَ یَابْنَۃَ الطَّیِّبِیْنَ فَقَدْ اَحْرَقْتِ قُلُوْبَنَا وَ اَنْضَجْتِ نُحُوْرَنَا وَ اَضْرَمْتِ اَجْوَافَنَا"۔

"اے دختر طاہرین علیہم السلام! آپؑ نے ہمارے دلوں کو آتشِ غم سے جلا دیا ہے۔ ہمارے سینوں میں درد کا مواد پکا دیا ہے اور ہمارے اندر حزن وملال کی آگ بھڑکا دی ہے۔" چنانچہ معصومہ خاموش ہو گئیں۔

حضرتِ اُمِ کلثوم سلام اللہ علیہا

بعد ازاں حضرت ام کلثوم سلام اللہ علیہا نے رقت آمیز لہجے اور درد انگیز پیرائے میں خطبہ دیا اور یہ اشعار پڑھے:

قَتَلْتُمْ اَخِیْ صَبْرًا فَوَیْلٌ لِاُمِّکُمْ
لَتُجْزَوْنَ نَارًا حَرُّھَا یَتَوَقَّدُ

"تم نے میرے بھائی کو بے جرم وخطا قتل کیا۔ ہمیں تو صبر حاصل ہے مگر تمہیں اس کی سزا جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کی صورت میں ملے گی"۔

سَفَکْتُمْ دِمَاءً حَرَّمَ اللّٰہُ سَفْکَھَا
وَ حَرَّمَھَا الْقُرْآنُ ثُمَّ مُحَمَّدٌ

"تم نے وہ خون بہائے جن کا بہانا قرآن اور محمدؐ نے حرام قرار دیا ہے"۔

اَلا فَابْشِرُوْا بِالنَّارِ اَنَّكُمْ غَدًا
لَفِيْ سَقَرٍ حَقًّا يَقِيْنًا تُخَلَّدُوْا

"آگاہ رہو! تمہیں جہنم کی آگ کی بشارت ہو! تم یقیناً اس آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گرفتارِ عذاب رہو گے"۔

وَ اِنِّيْ لَاَبْكِيْ فِيْ حَيَاتِيْ عَلٰى اَخِيْ
عَلٰى خَيْرٍ مِنْ بَعْدِ النَّبِيِّ سَيُوْلَدُ

"میں اپنے مظلوم بھائی پر زندگی بھر روتی رہوں گی۔ ایسا بھائی کہ جو بعد از رسولؐ پیدا ہونے والوں میں سے سب سے بہتر ہے"۔

بِدَمْعٍ غَزِيْرٍ مُسْتَهِلٍّ مُكَفْكَفٍ
عَلَى الْخَدِّ مِنِّيْ ذَائِبًا لَيْسَ بِجَمَدٍ

"اشکوں کا سیلاب میرے چہرے پر رواں رہے گا اور آنسوؤں کا چشمہ کبھی خشک نہ ہوگا"۔

قَالَ الرَّاوِيْ فَضَجَّ النَّاسُ بِالْبُكَاءِ وَ النُّوحِ وَ نَشَرْنَ النِّسَآءُ شُعُوْرَهُنَّ وَ وَضَعْنَ التُّرَابَ عَلٰى رُءُوْسِهِنَّ وَ خَمَشْنَ وُجُوْهَهُنَّ وَ لَطَمْنَ خُدُوْدَهُنَّ وَ دَعَوْنَ بِالْوَيْلِ وَالثُّبُوْرِ وَ بَكَى الرِّجَالُ وَ نَتَفُوْا لِحَاهُمْ فَلَمْ يُرَىٰ بَاكِيَةٌ وَ بَاكٍ اَكْثَرَ مِنْ ذَالِكَ الْيَوْمِ".

"راوی کہتا ہے: تماشا دیکھنے لوگوں کی آہ و بکاء کی آوازیں بلند ہورہی، عورتوں نے اپنے سروں کے بال کھول دیئے اور اپنے سروں میں مٹی ڈال کر اپنے رخسار پیٹ کر اپنے چہرے زخمی کر ڈالے۔ نالہ و فریاد کی صداؤں سے کوفہ کی فضاء بھر گئی۔ مرد شدتِ غم اور فرطِ درد والم سے اپنی داڑھیاں نوچ رہے تھے۔ رونے والے مردوں اور عورتوں کا اتنا ہجوم تھا کہ پہلے اس سے بڑھ کر شہر کوفہ میں کبھی رونے والے مرد اور عورتیں نہیں دیکھے گئے"۔

امام علی زین العابدین علیہ السلام کا خطبہ

حضرتِ امام علی زین العابدین علیہ السلام نے پھوپھی اور ہمشیر کے خطبوں کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اُسْكُتُوْا، اُسْكُتُوْا".

''خاموش ہو جاؤ! خاموش ہو جاؤ!''

لوگ خاموش ہو گئے۔ پھر آپؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

طوالت کے خوف سے عربی عبارت نقل نہیں کر سکتے اور صرف ترجمے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

''لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے سو وہ تو پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا، اسے میں اپنا تعارف کروا دیتا ہوں۔ میں علی ابن الحسین علیہما السلام ہوں۔ میں حسین ابن علی ابن ابیطالب علیہم السلام کا بیٹا ہوں، جو بے جرم و خطا نہر فرات کے کنارے تشنہ ذبح کیا گیا۔ میں اسی حسینؑ کا بیٹا ہوں، جس کی ہتکِ حرمت کی گئی، جس کا مال و اسباب لوٹا گیا، جس کے اہل و عیال کو قید کیا گیا۔ میں اس مظلوم کا پسر ہوں جسے بے دردی اور ظلم و جور کے ساتھ شہید کیا گیا۔

لوگو! یہی بات ہمارے فخر کے لیے کافی ہے کہ ہم نے حفاظتِ اسلام اور تقویتِ دین کیلئے قربانیاں دی ہیں۔

کوفیو! میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم نے میرے پدرِ عالی قدر کو دعوتی خطوط لکھ کر نہیں بلایا تھا؟ کیا تم نے ان کی نصرت کے عہد و پیمان نہیں کیے تھے؟ جب تمہاری دعوت کو قبول کرتے ہوئے وہ تشریف لائے تو تم نے مکر و فریب کا مظاہرہ کر کے اُنؑ کی نصرت و امداد سے دست برداری اختیار کر لی؟ نصرت نہ کرنا تو درکنار، تم نے تو ان کے ساتھ قتال کیا! ان کا پانی بند کیا، ان پر راہیں بند کر دیں، تم نے ان کو قتل کیا اور ان کے اہل و عیال کو قید کر لیا۔ تمہارے لئے ہلاکت ہو، تم نے بدترین اعمال کا ذخیرہ کیا ہے۔ تمہاری رائے اور تدبیر پر تُف ہے۔ تم کن آنکھوں سے حضرتِ رسولؐ خدا کی طرف دیکھو گے جب وہ تم سے فرمائیں گے کہ تم نے میری عترت و اہل بیتؑ کو قتل کیا، میری ہتکِ حرمت کی؟ اس لیے تم میری اُمت میں سے نہیں ہو!''

راویانِ اخبار بیان کرتے ہیں کہ جب قیدی امامؑ کا کلام یہاں تک پہنچا تو پھر ہر طرف سے رونے اور زور سے چیخنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''تم لاعلمی میں ہلاک و برباد ہو گئے''۔

امام علیہ السلام نے اس کے بعد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اس بندہ پر رحم کرے جو میری نصیحت کو قبول کرے اور میری وصیت کو خدا اور رسولؐ خدا اور اہل بیتِ رسول علیہم السلام کے بارے میں یاد رکھے، کیونکہ ہمارے لیے حضرتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات میں اعلیٰ نمونہ ہے''۔

سامعین گریہ کرتے ہوئے یک زبان بول اٹھے: ''یا فرزندِ رسولؐ! ہم سب آپؑ کے فرمانبردار ہیں۔ آپؑ جو حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ ہم آپؑ کے دوستوں کے دوست اور آپؑ کے دشمنوں کے دشمن ہیں''۔

امام علیہ السلام نے ان میں فرمایا: ''اب تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی، تم چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک

کرو جو تم نے میرے باپ دادا کے ساتھ کیا تھا؟"

ورودِ دار الامارہ۔ دربارِ ابن زیاد میں داخلہ

یہ تمام واقعات اور مستوراتِ آلِ محمدؐ اور امام علیہ السلام کے خطبے، ابن زیاد کے دربار سے باہر کے ہیں۔ ان خطبوں کے اختتام کے بعد اہلِ حرم کو دربار عبیداللہ ابن زیاد لعین میں لے جایا گیا۔ اس نے دربار اپنے سرکاری محل میں منعقد کیا۔ دربار کو پوری طرح سجایا گیا تھا اور عام لوگوں کو داخل ہونے کا اذنِ عام تھا، مگر ہتھیار رکھنے پر پابندی تھی۔

اس ملعون کا دربار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے امام حسینؑ کا سر لایا گیا۔ اس کے بعد باقی شہدائے کربلا کے سر دربار میں پیش کیے گئے اور اس کے بعد اہلِ حرم داخلِ دربار ہوئے۔

امام حسین علیہ السلام کا سرِ اقدس

عبیداللہ ابن زیاد لعین، اپنی ظاہری فتح کے نشہ میں مخمور تختِ حکومت پر بیٹھا ہے۔ دائیں بائیں پہرے دار اور سپاہی و غلام کھڑے ہیں۔ فرزندِ رسولؐ کا سرِ اقدس ایک سنہرے طشت میں ابن زیاد کے سامنے رکھا گیا۔ آج ابن زیاد مسرور ہے کہ اس نے جنگ کربلا فتح کر لی۔ حضرت امام حسین بن علی علیہم السلام کا سر اس کے سامنے موجود ہے۔ اہلِ حرم رسن بستہ دربار میں پیش ہیں۔ اس ملعون کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اور یہ ملعون ہنس ہنس کر سرِ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ استہزاء کرتا تھا۔ اپنی چھڑی بار بار دندانِ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ مس کرتا اور کہتا:

"لَقَدْ اَسْرَعَ الشَّیْبُ اِلَیْکَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ!"

"یا ابا عبداللہ! آپ پر بڑھاپا بہت جلدی اتر آیا۔"

کبھی کہتا: "یا حسینؑ! آپ کے دانت کیسے خوبصورت ہیں؟"

"یا حسینؑ! آپ کا چہرہ کس قدر حسین ہے۔ اگر یزید کی بیعت کر لیتے تو آج آپ کا یہ حال نہ ہوتا"۔

نفس المہموم میں درج ہے کہ یہ بدنہاد کبھی ہونٹوں پر چھڑی مارتا، کبھی آنکھوں کے درمیان اور کبھی رخساروں پر۔ وہ جو چاہتا کر سکتا تھا۔ آج اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی اور وہ اقتدار کے نشے میں بدمست تھا جبکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھر برباد ہو چکا تھا اور اولاد قید تھی۔

اس کے ہم نشین فاخرہ لباس پہنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور دربار میں قتلِ حسین ابن علی علیہما السلام کا جشن منایا جا

رہا تھا۔

زید بن ارقم جو ضعیف العمر صحابی رسولؐ تھے اور اس وقت ابن زیاد کے دربار میں اس کے پاس بیٹھے تھے، ان سے ابن زیاد ملعون کی رسولؐ اکرم کے نورعین کے ساتھ ایسی بے ادبی اور گستاخی دیکھی نہ گئی کیونکہ انہوں نے زمانہ رسالت اور امام حسین علیہ السلام کے پیغمبرؐ خدا کے محبت و پیار کے انداز دیکھے ہوئے تھے، ابن زیاد کی گستاخی اور بار بار چھڑی کا پاک لبوں پر مارنا دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور جوش میں آ کر اس کو مخاطب کر کے کہا:

''اِرْفَعْ قَضِيْبَکَ عَنْ هَاتَيْنِ الشَّفَتَيْنِ فَوَ اللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ غَيْرُهُ لَقَدْ رَأَيْتُ شَفَتَیِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّم عَلٰی هَاتَيْنِ الشَّفَتَيْنِ مَا لَا اُحْصِيْهِ يُقَبِّلُهُم''.

''اے ابن زیاد! ان پاک ہونٹوں سے اپنی چھڑی ہٹا لے! مجھے اس خدا کی قسم ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے حسینؑ کے انہی لبوں کے بوسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے لیا کرتے تھے۔ حسینؑ کے یہ لب بوسہ گاہ رسولؐ خدا ہیں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو انہی لبوں پر بار بار چھڑی مار رہا ہے؟''

اس کے بعد اس بوڑھے صحابی نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ابن زیاد اس ضعیف صحابی کا جرأت مندانہ کلام سن کر آگ بگولا ہو گیا اور جھلا کر کہا:

''خدا تیری آنکھوں کو رلائے، تو آج ہمارے جشن مسرت پر آنسو بہا رہا ہے؟ اگر بڑھاپے نے تیری عقل زائل نہ کر دی ہوتی تو آج میں تیری گردن اڑا دیتا۔''

اس کے بعد زید اس ناپاک دربار سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے:

''لوگو! آج کے بعد تم غلام ہو گئے۔ تم نے پسر فاطمہؑ کو قتل کیا اور ابن مرجانہ (ابن زیاد) کو حاکم بنا لیا، جو تمہارے نیک لوگوں کو قتل کرتا ہے اور بدوں کو غلام بنا لیتا ہے۔ اس کے لیے ہلاکت اور لعنت ہے جو ذلت و رسوائی اور عار پر راضی ہوتا ہے''۔

اھلِ حرم علیھم السلام اور ابن زیاد ملعون

سر مبارک حضرتِ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بے ادبی کرنے کے بعد اس ملعون نے قیدیوں پر نگاہ ڈالی۔ معصوم اور یتیم بچے رسن بستہ پیش تھے۔ خاندانِ پیغمبرؐ کی مستورات بے وارث قیدیوں کی طرح زبوں حال پابند رسن، حسرت سے سروں

کو جھکائے کھڑی تھیں۔ قیامت خیز منظر تھا جب ہاشمی شہزادیاں رسن بستہ، اپنے اعزاء و اقرباء شہید کروا کر کمینے دشمن کے دربار اور کچہری میں سر برہنہ پیش کی گئیں۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی اور موت انسان کے بس میں ہوتی تو ہاشمی شہزادیاں دربار میں داخل ہونے سے پہلے ہی موت قبول کر لیتیں اور ابن زیاد کے دربار میں پیشی کو ہرگز قبول نہ کرتیں۔

آج ان بیٹیوں کے جدّ امجد حضرت ہاشمؑ کی روح تڑپ رہی تھی، حضرت عبدالمطلبؑ قبر میں بے چین تھے، حضرت ابوطالب علیہ السلام کی روح مجروح ہو رہی تھی، حضرت رسولؐ خدا خود سر میں خاک ڈالے فریاد کر رہے تھے، علی علیہ السلام رو رہے تھے، جنابِ بتول سلام اللہ علیہا کے سر کے بال کھل گئے تھے، آپؑ اپنے پہلو کی ضربت کو بھول گئی تھیں اور حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو اپنے جگر کے ٹکڑے یاد نہ تھے۔

جب ان حضرات کی ارواحِ مقدسہ نے اپنی بیٹیوں کو دست بستہ اور سر عریاں ابن زیاد کے سامنے پیش ہوتے دیکھا ہوگا، اپنی بیٹیوں کی لاچاری اور ابن زیاد کی شراب خوری، مستورات کی حسرت و بیکسی اور ابن زیاد کی مسرت و خوشی دیکھی ہوگی تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ شہادتِ حضرتِ امام حسین علیہ السلام کا صدمہ بھول گئے ہوں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میدانِ کربلا میں ہاشمی جوانوں کی شہادت اور خصوصاً سیدالشہداء علیہ السلام کی شہادت سے ہاشمی مستورات کا دربار میں آنا مصیبت میں کم نہ تھا۔

مؤرخین کا بالاتفاق بیان ہے:

"دَخَلَتْ زَيْنَبُ ابْنَةُ فَاطِمَةَ مُتَنَكِّرَةً".

حضرت زینب سلام اللہ علیہا منہ کو چھپائے اور حالت کو بدلے ہوئے تھیں تاکہ پہچانی نہ جائیں اور معمولی لباس پہنے ہوئے محل کے ایک کونے میں بیٹھ گئیں"۔

"قَالَ الْمُفِيْدُ فَمَضَتْ حَتّٰى جَلَسَتْ نَاحِيَةً مِنَ الْقَصْرِ".

"دربار میں آئیں اور ایک کونے میں الگ ہو کر بیٹھ گئیں"۔

"وَ حَفَّتْ بِهَا اِمَائُهَا".

"اور کنیزوں نے آس پاس گھیرا ڈال لیا"۔

تاکہ نامحرموں کی نگاہوں سے مستور رہیں۔ ابن زیاد کی نظر پڑی تو پوچھا:

"مَنْ هٰذِهِ الْمُتَنَكِّرَةُ".

"یہ گوشہ دربار میں منہ چھپا کر بیٹھ جانے والی کون ہے؟"

بی بی نے یہ دلخراش جملے سنے مگر کوئی جواب نہ دیا۔ نظر زمین کی طرف تھی۔ دوبارہ اس ملعون نے دریافت کیا۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا تو پھر بھی دل پکڑے رہیں اور اس ملعون کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا مگر ایک کنیز نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ کہا:

"هٰذِهِ زَيْنَبُ بِنْتُ فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ".

"یہ دختر رسولؐ، فاطمہؑ کی بیٹی زینب سلام اللہ علیہا ہیں"۔

اس وفادار کنیز نے فاطمہؑ بنت رسولؐ اللہ کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ یہ ملعون اپنے کیے پر نادم و شرمسار ہوگا اور دختران رسولؐ کو مزید رنج و تکلیف نہ پہنچائے گا اور احترام رسولؐ کی خاطر اپنی نظریں نیچی رکھے گا۔

ابن زیاد ملعون کے ساتھ مکالمہ

لیکن اس ملعون نے جذبہ بغض و عناد سے سرشار اور شرم و حیاء سے بیزار ہو کر کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَحُكُمْ وَ قَتَلَكُمْ وَ اَكْذَبَ اَحْدُوْتَتِكُمْ" (معاذ اللہ)۔

یہ جملے اس ملعون نے ان مصیبت زدوں کو مزید دکھ دینے کیلئے اور شماتت کے طور پر استعمال کیے۔ اس نے کہا: "حمد ہے اس خدا کی جس نے تمہیں قتل کیا اور تمہارے افسانے اور ڈھونگ کو رسوا کر دیا"۔

مادی طاقت کے غرور میں وہ بکواس کر سکتا تھا۔ ادھر سادات بے بس تھیں، اس کی قیدی تھیں، مگر ہاشمی غیرت و مطلبی خون بدنوں میں موجود تھا۔ گو عورت ذات تھیں اور کمینوں کا دربار تھا، دشمنوں کا گھر تھا، بنت رسولؐ مسافرہ تھیں، مگر دینی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر دل خاتون نے حاکم وقت کو دندان شکن جواب دیتے ہوئے کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَكْرَمَنَا بِنَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ وَ طَهَّرَنَا مِنَ الرِّجْسِ تَطْهِيْراً. اِنَّمَا يَفْتَضِحُ الْفَاسِقُ وَ يَكْذِبُ الْفَاجِرُ وَ هُوَ غَيْرُنَا وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ".

"تعریف اس اللہ کی ہے، جس نے ہمیں اپنے رسولؐ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے ذریعہ عزت و بزرگی بخشی اور ہمیں ہر قسم کے رجس اور نجاستوں سے پاک و پاکیزہ بنایا اور رسوا تو فاسق ہی ہوتا ہے اور بدکار ہی جھوٹ بولتا ہے اور وہ ہمارا غیر ہے۔"

"فَقَالُ ابْنِ زِيَادِ: "كَيْفَ رَأَيْتُ فِعْلَ اللّٰهِ بِاَهْلِ بَيْتِكَ؟"

پھر ابن زیاد نے کہا: ''تم نے اپنے خاندان کے ساتھ خدا کا سلوک کیسا پایا؟''

''قَالَتْ عَلَيْهَا السَّلَام: ''مَا رَأَيْتُ إِلَّا جَمِيلاً هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْقَتْلَ فَبَرَزُوْا إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ وَ سَيَجْمَعُ اللّٰهُ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُمْ فَتُحَاجُّ وَ تُخَاصَمُ فَانْظُرُوْا لِمَنِ الْفَلَحُ يَوْمَئِذٍ ثَقِلَتْكَ اُمُّكَ يَابْنَ مَرْجَانَةَ''.

پھر حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

''میں نے تو خدا کا سلوک بہترین پایا ہے۔ یہ وہ (بہادر اور غیور) لوگ تھے جن کے نصیب میں کاتب تقدیر نے شہادت تحریر کر دی تھی۔ پس یہ مجاہد جذبہ شہادت سے سرشار اپنی قتل گاہوں کی طرف بڑھے۔ خدا تجھ کو اور ان کو روزِ قیامت اکٹھا کرے گا۔ پس تیرا مقدمہ بارگاہِ احکم الحاکمین میں پیش ہوگا۔ اِن شہداء کا دعویٰ تیرے خلاف عادلِ حقیقی کی عدالت میں دائر ہو گا۔ پس تو دیکھ لینا کہ کسے کامیابی حاصل ہوگی، اے مرجانہ کے بیٹے! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے''۔

ابن زیاد ملعون نے دربارِ عام میں اپنی جس کامیابی کا اظہار کیا تھا اور جن باتوں میں اس نے اہل بیت علیہم السلام کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی، وہ ناکام ہوگئیں اور عالمہ غیر معلمہ، دخترِ حیدرِ کرار علیہم السلام نے اسے لاجواب کر دیا۔

جو شخص مکالمہ میں شکست کھا جائے اسے غصہ تو آتا ہی ہے اور یہ تو اس وقت کوفہ کا امیر تھا۔ اسے اپنی مادّی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ ظاہری فتح کے خمار میں مخمور اور سطوت و جبروت کے غرور میں چور تھا۔ بھرے دربار میں اس کے فعلِ قبیح اور کفر کا پردہ چاک ہو چکا تھا، غصے میں دیوانہ ہو کر حضرتِ زینبؑ کے قتل پر آمادہ ہو گیا، لیکن عمرو بن حریث کے سمجھانے پر باز آ گیا۔

پھر متوجہ ہوا اور کہا:

''قَدْ شَفَى اللّٰهُ نَفْسِيْ مِنْ طَاغِيَتِكِ وَ الْعُصَاةِ مِنْ اَهْلِبَيْتِكِ''.

''خدا نے میرے دل کو تیرے سرکش بھائی اور تیرے خاندان کے دوسرے نافرمان لوگوں سے شفا بخشی ہے''۔

جب اس نے اہل بیتِ رسولؐ علیہم السلام اور فرزندِ بتولؑ کے بارے میں باغی اور نافرمان کے الفاظ استعمال کیے تو بی بی کے دل پر چوٹ لگی اور معصومہؑ نے آبدیدہ ہو کر کہا:

''لَعَمْرِيْ لَقَدْ قَتَلْتَ كَهْلِيْ وَ اَبَرْزْتَ اَهْلِيْ وَ قَطَعْتَ فَرْعِيْ وَ اجْتَثَثْتَ اَهْلِيْ فَاِنْ يُشْفِكَ هٰذَا فَقَدِ اشْتَفَيْتَ''.

''مجھے اپنی زندگی کی قسم! تو نے میرے بڑوں کو قتل کیا، میرے خاندان کو برباد کیا، میرے شجر کی شاخیں تو نے کاٹ

دیں اوراس کی جڑوں کوتو نے اکھاڑ دیا، میرا خاندان تباہ ہوا تو تجھے شفا ہوئی؟ اگر خاندانِ رسالت کی بربادی سے تیرا دل شفا پاتا ہے تو شفا پا تا رہے"۔

ابن زیاد مردود نے کھسیانا ہو کر کہا: "یہ قافیہ سے عبارت آرائی ہے۔ اس کا والد بھی مقفّیٰ و مسجع کلام کرتا تھا"۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا: "مجھے قافیہ اور سجع کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ضمیر کی آواز تھی اور مناسب حال کلام تھا، جس کے اظہار کا موقع خود تو نے فراہم کیا"۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ

قیدی قافلے میں مستورات اور یتیم بچے تھے اور صرف ایک حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ہی جواں سال مرد تھے، جو کہ بیماری کی وجہ سے مضمحل اور کمزور تھے۔ تمام شہدائے کربلا کے عموماً اور شہیدانِ بنی ہاشم کے خصوصاً ماتم دار تھے اور اٹھارہ جوانانِ بنی ہاشم کی شہادت کے داغ قلب وجگر پر لئے ہوئے تھے جبکہ پھوپھیوں، ماؤں اور بہنوں کی قید اور ہتک حرمت کے زخم علیحدہ تھے اور دشمن دین اور معاندانِ خاندانِ رسالت کے دربار میں مفتوح کا پسر اور قیدی ہو کر پیش ہونے کا صدمہ مزید تھا۔

پابندِ زنجیر ورسن ہونے کے علاوہ مصائب وآلام ودکھوں کے اژدہام میں مبتلا تھے، رسن بستہ دربار میں پیش تھے، ابن زیاد نے سوئے امام علیہ السلام متوجہ ہو کر کہا:

"مَنْ اَنْتَ؟"

"تو کون ہے؟"

امام علیہ السلام نے جواب دیا:

"اَنَا عَلِیُّ ابْنُ الْحُسَیْن".

"میں علیؑ، پسر حسینؑ ہوں"۔

شاید ابن زیاد کو شہدائے کربلا کی فہرست پہنچ چکی تھی اور اسے علم تھا کہ ایک علیؑ پسرِ حسینؑ کربلا میں شہید ہو گئے ہیں۔

حیران ہو کر پوچھا:

"اَوَ لَیْسَ قَدْ قَتَلَ اللّٰہُ عَلِیَّ ابْنَ الْحُسَیْنِ؟"

"کیا خدا نے علی بن الحسینؑ کو کربلا میں قتل نہیں کیا؟"

امام علیہ السلام نے جواب دیا:

"قَدْ کَانَ لِیْ اَخٌ مُسَمّٰی عَلِیٌّ قَتَلَهُ النَّاس".

"ہاں میرا ایک بھائی تھا جس کا نام بھی علی تھا جس کو تیرے لوگوں نے قتل کیا"۔

ابن زیاد نے کہا:

"بَلِ اللّٰهُ قَتَلَهٗ".

"بلکہ خدا نے اسے قتل کیا"۔

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَلَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه".

"اللہ ہی نفوس کو ان کی موت کے وقت مارتا ہے اور کوئی نفس بغیر اذنِ خدا کے نہیں مرتا"۔

ابن زیاد کو حضرت علی زین العابدین علیہ السلام کا جواب اس بناء پر گراں گزرا کہ اس کے پاس ان باتوں کا معقول جواب نہ تھا اس نے قیدی امامؑ کے جواب کو اقتدار و حکومت کے کسرِ شان سمجھا اور اپنے گمانِ باطل میں اسے گستاخی پر محمول کیا۔ کمینہ باتیں چھیڑتا تھا اور جب لاجواب ہو جاتا تھا تو غصے سے آگ بگولا ہو کر قتل پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ جلا کر کہنے لگا:

"اَلَکَ جُرْاَةٌ عَلٰی جَوَابِیْ؟"

"کیا تو میرے جواب دینے کی جرأت کرتا ہے؟" اور ساتھ ہی جلاد کو حکم دیا کہ اس بیمار قیدی کو قتل کر دو۔

ابن زیاد کا حکم سنتے ہی حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے بیمار بھتیجے کو گلے سے لگا لیا۔ امّ المصائب حضرت سیدہ زینب سلام اللہ علیہا فرطِ محبت سے بیمار امام سے لپٹ گئیں اور کہا:

"حَسْبُکَ یَا بْنَ زِیَادٍ مِنْ دِمَائِنَا مَا سَفَکْتَ وَهَلْ اَبْقَیْتَ اَحَداً غَیْرَ هٰذَا فَاِنْ اَرَدْتَ قَتْلَهٗ فَاقْتُلْنِیْ مَعَهٗ".

"اے ابن زیاد! جو ہمارے خون تو پہلے بہا چکا ہے وہ تیرے لیے کافی نہیں؟ اس مردِ بیمار کے سوا تو نے ہمارا کوئی مرد باقی نہیں چھوڑا۔ خدا کی قسم اب میں قیدیوں کے اس وارث اور بیمار بھتیجے سے الگ نہیں ہوں گی اور اگر تو اسے بھی قتل کرنا چاہتا ہے تو مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کر دے"۔

حضرتِ امام علی زین العابدین علیہ السلام کا خون بدن میں جوش مارنے لگا۔ موت سے کھیلنے والے ہاشمیوں کی یادگار نے جذبۂ غیرت ودلاوری سے سرشار ہو کر فرمایا:

'پھوپھی اماں! آپ ذرا خاموش ہو جائیں اور مجھے اس سے بات کرنے دیں'۔

پھر ابن زیاد کی طرف متوجہ ہو کر نہایت جرأت مندانہ کلام اس طرح فرمایا:

"اَبِالْقَتْلِ تُهَدِّدُنِیْ یَابْنَ زِیَادٍ! اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْقَتْلَ لَنَا عَادَةٌ وَّ كَرَامَتُنَا شَهَادَةٌ".

"اے ابن زیاد! تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے؟ تو نہیں جانتا کہ حق پر کٹ مرنا ہماری عادت ہے اور راہِ خدا میں موت قبول کرنا ہماری عزت وکرامت ہے"۔

ابن زیاد نے یہ منظر دیکھ کر کہا: "تعجب ہے محبت، قرابتداری اور اُلفتِ رشتہ داری پر۔ خدا کی قسم! پھوپھی واقعی بھتیجے کے ساتھ قتل ہونا چاہتی ہے؟"

پھر کہا: "اسے چھوڑ دو، اس کیلئے یہ بیماری ہی کافی ہے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیماری اور اس روگ سے یہ جانبر نہ ہو سکے گا"۔

مقتل الحسینؑ، مقرم اور نفس المہموم میں مذکور ہے کہ جنابِ رباب سلام اللہ علیہا نے سرِ امامؑ کو ہاتھوں میں لیا (شاید طلب کرنے پر مل گیا تھا) اور آنکھوں سے لگایا اور یہ دردناک بین کئے:

وَا حُسَيْنَاهُ! فَلَا نَسِيْتُ حُسَيْنَاهُ!
اَقْصَدَتْهُ اَسِنَّةُ الْاَعْدَاءِ

"ہائے حسینؑ! میں کبھی اپنے آقا حسینؑ کو فراموش نہ کروں گی، جن کو دشمنوں کے نیزوں نے نشانہ بنایا"۔

غَادَرُوْهُ بِكَرْبَلَاءِ صَرِيْعًا
لَا سَقَى اللّٰهُ جَانِبَیْ كَرْبَلَاءِ

"جس کو دشمنوں نے خون میں غلطاں کیا، خدا کبھی جانب کربلا کو سیراب نہ کرے"۔

ان ہاشمی مخدرات اور امام علی زین العابدین علیہ السلام کے لاجواب خطاب سے لوگوں کے تیور بدل گئے۔ نوکِ نیزہ

پر نورانی سروں کی سواری اور پشتِ شتر پر ان قیدیوں کی آہ وزاری نے کوفہ کی فضا میں ماتم وغم لہر کی دوڑا دی، خصوصاً بازار و دربار کوفہ میں شہزادیوں اور قیدی امام حضرت علی زین العابدین علیہ السلام کے کلام نے لوگوں کے دلوں میں غم وغصہ کی آگ بھڑ کادی تھی اور خود ابن زیاد کے مصاحب اسے ملامت کرنے لگے تھے۔ ابن زیاد کی ماں، جس کا نام مرجانہ تھا، سرِ دربار اپنے بیٹے کو لعنت وملامت کرنے لگی۔ گو اس کے اپنے قصور سے ابن زیاد کی غلط ولادت ہوئی تھی، مگر چونکہ امامِ مظلوم، امام حسین علیہ السلام تھے، اس لیے دوست و دشمن سب ہی رونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

زندانِ کوفہ

ابن زیاد نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کو جامع مسجد کے پاس قید خانے میں بند کردو۔ جب یہ قیدی دربار سے جانب زندان روانہ ہوئے تو ابن زیاد کے ایک دربان کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر کوفہ کے زن ومرد اکٹھے ہو کر رونے لگے اور اپنا سر اور منہ پیٹنے لگے۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے دربار سے جاتے اہل کوفہ سے یہ فرمائش کی:

''اے اہل کوفہ! اشراف کی عورتوں کو ہمارے پاس نہ آنے دینا اور فقط کنیزوں کے کوئی آزاد عورت ہمیں دیکھنے کے لئے نہ آئے''۔

قیدی امام اپنے دادا کے دارالحکومت اور حضرت زینب واُمِّ کلثوم سلام اللہ علیہما بابا کے حکومتی شہر میں داخل ہوئے۔ یہ بیبیاں کوفہ کی شہزادیاں کہلاتی تھیں۔ انقلابِ زمانہ ہے اور فلکِ کج رفتار کا ستم ہے کہ جو کسی زمانے میں امیر المومنین علیہ السلام کی شہزادیاں کہلاتی تھیں اور جامع مسجد کے پہلو میں اشراف کوفہ کی عورتیں ان سے درسِ قرآن لیا کرتی تھیں، اب وہی امیر المومنین علیہ السلام کی بیٹیاں اسی شہر کوفہ میں اسیرِ امت ہیں اور اسی جامع مسجد کے پہلو میں جہاں امیر المومنین علیہ السلام خطبہ پڑھا کرتے تھے، یہ شہزادیاں ایک زندان میں قید ہونے جارہی ہیں۔

اس کے بعد ابن زیاد نے حکم دیا کہ حسین علیہ السلام کا سر نوکِ نیزہ پر سوار کر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں پھرایا جائے۔ چنانچہ جوانانِ جنت کے سردار کا سر کوفہ کے گلی کوچوں میں پھرایا جانے لگا۔ زید بن ارقم کا بیان ہے:

میں اپنے مکان کے بالاخانے پر بیٹھا تھا۔ جب سرِ مبارک نیزے پر سوار میرے بالاخانے کے قریب آیا تو میں اس نرالے شہید کے سر کو نوکِ نیزہ پر تلاوت قرآن پاک میں مشغول پایا۔ اس وقت عینِ رسولؐ اور لختِ دلِ بتولؑ نیزہ کے منبر پر قاریٔ

بے عدیل، خطیب بے مثل یہ آیت تلاوت کر رہے تھے:

"اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ لا كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَباً"

میں نے پکار کر کہا:

"رَاْسُکَ یَابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَعْجَبُ وَ اَعْجِبُ"

"اے فرزندِ رسولؐ! آپؑ کے سرِ اقدس کی شان ان سے زیادہ عجیب ہے"۔

اس کے بعد آپؑ کے سرِ اقدس کو دارالامارہ، عبیداللہ بن زیاد کے سرکاری محل کے دروازے پر لٹکا دیا گیا، جہاں بنی ہاشم کے شہیدِ اوّل حضرت مسلم بن عقیل علیہم السلام کا سر آویزاں کیا گیا تھا۔

عبداللہ بن عفیف کی شہادت

ابن زیاد نے قیدیوں کو زندان بھیجنے کے بعد "اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ" نماز باجماعت کیلئے تمام لوگوں کو جامع مسجد کوفہ میں حاضر ہونے کی منادی کروادی۔ چونکہ حکومت بدکار کا رنگ اُڑ چکا تھا اور ابن زیاد کے مظالم لوگوں پر آشکار ہو چکے تھے، خانوادۂ رسولؐ کی بربادی، دخترانِ علی علیہ السلام کی ہتکِ حرمت اور قید و بند لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور رائے عامہ حاکم وقت کے خلاف ہو چکی تھی اور لوگوں کے دل امیر بدنہاد سے متنفر ہو چکے تھے، اس لیے اس نے لوگوں کو ہم خیال بنانے اور خطباتِ آلِ محمد علیہم السلام کا اثر مٹانے کے لیے لوگوں کو جامع مسجد میں اکٹھا کیا۔

جب لوگ جامع مسجد کوفہ میں اکٹھے ہو چکے تو منبر پر گیا اور یہ خطبہ پڑھا جو اس کی بے دینی، شقاوتِ قلبی اور بغض وعنادِ خاندانِ رسالت کا مظہر ہے:

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَظْهَرَ الْحَقَّ وَاَهْلَهٗ وَنَصَرَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ یَزِیْد(لَعْنَۃُ اللّٰهِ)وَحِزْبَهٗ وَقَتَلَ الْكَذَّابَ حُسَیْنَ بْنَ عَلِیٍّ وَشِیْعَتَهٗ"۔

"اس اللہ کی تعریف ہے جس نے حق اور حق والوں کو غالب کر دیا اور امیر المومنین یزید (ملعون) اور اس کے گروہ کی مدد کی اور حسین بن علی علیہما السلام اور ان کے شیعوں کو قتل کیا"۔

قبیلہ ازد کا ایک پاکباز مومن اور حبِ علیؑ سے سرشار مجاہد عبداللہ بن عفیف، جو ایک سن رسیدہ بزرگ تھے اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے مخلص اور مجاہد صحابی تھے، آپؑ کے ہمراہ جنگِ جمل اور صفین بھی لڑ چکے تھے اور ان کی ایک

آنکھ دورانِ جہاد جنگِ جمل میں اور دوسری آنکھ دورانِ جہاد جنگِ صفین میں ضائع ہو چکی تھی، اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ یہ مرتبہ شہادت کا خواہش مند صحابیِ علیؑ، آنکھیں ضائع ہو جانے کی وجہ سے کسی قدر مایوس ہو چکا تھا اور پھر دن بھر مسجد میں ہی معروف عبادت رہتا۔

ابن زیاد کے یہ کفر ونفاق سے بھرپور جملے عبداللہ نے جیسے ہی سنے، بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ایمانی حرارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرجدار آواز میں کہنے لگا:

"یَابْنَ مَرْجَانَۃَ الْکَذَّابُ بْنُ الْکَذَّابُ اَنْتَ وَ اَبُوْکَ وَالَّذِیْ وَلَّاکَ وَ اَبُوْہُ! یَابْنَ مَرْجَانَۃَ اَتَقْتُلُوْنَ اَوْلَادَ النَّبِیِّیْنَ وَ تَتَکَلَّمُوْنَ بِکَلَامِ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ بِرِوَایَۃِ اَتَقْتُلُ اَوْلَادَ النَّبِیِّیْنَ وَ لَقُوْمُ عَلٰی مِنْبَرِ الصِّدِّیْقِیْنَ؟".

"اے پسر مرجانہ! دشمنِ خدا تو جھوٹا ہے اور تیرا باپ کذاب ہے اور وہ کذاب ہے جس نے تجھے حاکم بنایا اور تجھے حاکم بنانے والے کا باپ کذاب ہے۔ تم لوگ نبیوں کی اولاد کو قتل کرتے ہو اور صدیقوں والی بات کرتے ہو؟ اور ایک روایت میں مذکور ہے، صدیقوں کے منبر پر بیٹھتے ہو؟"

ابن زیاد نے جب اس مومن کا جرأت مندانہ کلام سنا تو غصے میں جھلا کر بولا:

"مَنْ ھٰذَا الْمُتَکَلِّمُ؟"

"یہ کلام کرنے والا کون ہے؟"

جناب عبداللہ بن عفیفؓ نے جواب دیا:

"اَنَا الْمُتَکَلِّمُ یَا عَدُوَّ اللّٰہِ! اَتَقْتُلُ الذُّرِّیَّۃَ الطَّاھِرَۃَ الَّتِیْ قَدْ ذَھَبَ اللّٰہُ عَنْھَا الرِّجْسَ وَ تَزْعَمُ اَنَّکَ عَلٰی دِیْنِ الْاِسْلَامِ وَ اَغوثاہ! اَیْنَ اَوْلَادُ الْمُھَاجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ لَا یَنْتَقِمُوْنَ مِنْ طَاغِیَتِکَ اللَّعِیْنِ ابْنِ اللَّعِیْنِ عَلٰی لِسَانِ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ".

"اے دشمن خدا! میں عبداللہ بن عفیف کلام کر رہا ہوں۔ تم رسولؐ خدا کی اولاد کو جن سے خدا نے ہر قسم کی نجاست اور گناہ کو دور کر دیا ہے، قتل کرتے ہو اور پھر گمان کرتے ہو کہ تم دینِ اسلام پر باقی ہو؟ ہائے فریاد! ہائے مدد!

کہاں ہے مہاجرین وانصار کی اولاد جو اس سرکش اور باغی (یعنی یزید ملعون) سے انتقام لے جو رسولؐ خدا کے فرمان کے مطابق ملعون ہے اور فرزندِ ملعون ہے"۔

حضرتِ عبداللہ بن عفیفؓ کا یہ کلام سن کر ملعون ابن زیاد کے غیظ وغضب کی انتہاء نہ رہی۔ وہ آگ بگولا ہو کر بولا:

"اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ!"

ابن زیاد کے سپاہی اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس وقت عبداللہؓ نے اپنے خاندانِ ازد کا مخصوص نعرہ "یا مبرود" لگایا۔ یہ نعرہ سنتے ہی اس کے قبیلہ "ازد" کے سات سو لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے پولیس سے چھڑا کر گھر لے گئے۔

ابن زیاد کا غیظ وغضب کم نہ ہوا۔ وہ غصے کی آگ میں جل رہا تھا اور شدتِ غیظ سے پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اپنی پولیس کو حکم دیا کہ اس اندھے کو گھر سے پکڑ کے لے آؤ۔ ابن زیاد کے سپاہی اس کے گھر طرف دوڑ پڑے۔ یہ دیکھ کر اس کی قوم کے دوسرے لوگ اس کے گھر پر جمع ہو گئے، جو اس کی حمایت میں تلواریں سونت کر اس کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں کچھ یمنی لوگ بھی شریک تھے۔

سپاہی عبداللہ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر عبداللہؓ کی قوم مزاحمت کر رہی تھی۔ ابن زیاد کو قبیلہ ازد کی مزاحمت کا پتہ چلا تو اس نے محمد بن اشعث کندی کو کئی قبائل کے مشترکہ لشکر کا سردار بنا کر عبداللہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ اگر گرفتاری میں رکاوٹ پیش آئے تو جنگ کی جائے۔

چنانچہ دونوں میں حضرتِ عبداللہؓ کے گھر سے باہر خونریز جنگ ہوئی اور دونوں اطراف سے کافی لوگ مارے گئے اور ابن اشعث مکان کا دروازہ توڑ کر عبداللہ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ جب اس کی بیٹی نے دشمنوں کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو پکار کر کہا:

"بابا! دشمن گھر میں گھس آیا"۔

شہادت کی تمنا کرنے والے اس نابینا صحابی نے بیٹی کو جواب دیا:

"بیٹی! کوئی غم نہ کر! آ گئے ہیں تو کیا؟ مجھے تو میری تمنا پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ بیٹی! کوئی فکر نہ کر! مجھے میری تلوار دے اور تو بتاتی جا کہ دشمن کس طرف ہے"۔

سعادت مند بیٹی نے نابینا مجاہد کے ہاتھ میں تلوار دے دی۔ حضرتِ عبداللہؓ تلوار کے ذریعے دائیں بائیں سے دشمن سے دفاع کرنے لگے۔ بصارت سے محروم لیکن بصیرت سے بھرپور اس بوڑھے مجاہد نے یہ رجزیہ اشعار پڑھ کر تلوار ہوا میں لہرائی:

اَنَــا ابْنُ ذِیْ الْفَـضْـلِ عَفِیْفِ الطَّـاهِـر

عَـفِـیْـفُ شَـیْـخِـیْ وَ اِبْـنُ اُمِّ عَـامِـر

کَـمْ دَارِعٍ مِـنْ جَـمْـعِـکُـمْ وَ حَـاسِـر

وَ بَـطَـلٍ جَـدَّلْتَـهُ مُـغَـادِر

"میں ہوں صاحب فضل عفیف کا بیٹا! عفیف میرا پدر ہے اور ام عامر کا پسر ہے۔ تمہاری جماعت کے کتنے ہی زرہ پوش اور سر برہنہ اور تاراج کردینے والے پہلوانوں کو میں نے زمین پر پٹخ دیا ہے"۔

عبداللہ کی بیٹی نے حسرت سے کہا: "کاش! اگر میں مرد ہوتی تو بابا! آج تمہاری لڑائی میں مدد کرسکتی اور آلِ رسولؐ کے قاتلوں کا مقابلہ کر کے دل کی حسرت پوری کر لیتی"۔

ان حملہ آور کمینوں میں سے کوئی بھی اس نابینا مجاہد کے قریب جانے کی جرأت نہ کر پاتا تھا، کیونکہ اس کی ہونہار صاجزادی اس کو بتاتی جاتی تھی کہ بابا! اب دشمن دائیں جانب ہے۔ بابا! اب دشمن بائیں جانب ہے۔ اب پیچھے سے حملہ ہو رہا ہے۔ جس طرف سے دشمن جاتا، بیٹی اپنے باپ کو خبردار کردیتی اور نابینا مجاہد اپنا رُخ پھیر کر حملہ کر دیتا۔

اب کی مرتبہ دشمن نے چاروں اطراف سے گھیر لیا۔ اس کی بیٹی چلائی اور فریاد کی:

"میرا بابا اب گھیرے میں آ گیا ہے لیکن کوئی مدد کرنے والا نہیں"۔

حضرت عبداللہ تلوار گھماتے جاتے اور ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے:

اُقْـسِـمُ لَـوْ یَـفْـسَـحُ لِیْ عَنْ بَـصَـرِیْ

ضَـاقَ عَـلَـیْـکُـمْ مَـوْرِدِیْ وَ مَـصْـدَرِیْ

"قسم کھا کر کہتا ہوں! اگر میری بینائی باقی ہوتی تو تمہارے آنے اور جانے کی راہ تنگ ہو جاتی"۔

بالآخر گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا اور نابینا بوڑھا مجاہد ظالموں کی گرفت میں آ گیا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ جرأت و ایمان کا یہ درخشندہ ستارہ ظلم کی گھٹاؤں میں پوشیدہ ہو گیا۔

حملہ آور اسے گرفتار کر کے دربار میں ابن زیاد کے روبرو لے گئے۔ ابن زیاد نے کہا کہ خدا کا شکر ہے جس نے تجھے رسوا کیا۔

عبداللہؓ نے کہا: "خدا نے مجھے کیسے رسوا کیا؟" اور سابق شعر دہرایا۔

ابن زیاد نے کہا: "او دشمن خدا! تیرا عثمان کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟"

عبداللہؓ نے کہا: "تجھے عثمان کے بارے میں پوچھنے کا کیا حق ہے؟ تیرا عثمان کے ساتھ کیا تعلق؟ وہ اچھا تھا یا برا، اس کا حساب خدا کے پاس ہے۔ وہ عدل و حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ تو اپنے، اپنے باپ اور یزید اور اس کے باپ کے بارے میں سوال کر"۔

ابن زیاد نے کہا: "اب مزید کوئی سوال نہیں ہوگا۔ اب تمہیں موت کا تلخ ذائقہ چکھایا جائے گا"۔

یہ سن کر عبداللہؓ نے کہا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ".

میں اپنے پروردگار سے تمہاری پیدائش سے پہلے یہ دعا کیا کرتا تھا کہ مجھے بدترین مخلوق کے ہاتھوں شہادت نصیب فرما۔ لیکن جب میری آنکھیں بھی جاتی رہیں تو میں اس حصولِ سعادت اور مرتبۂ شہادت سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن اب خدا کی حمد و ثنا، اور اس کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری قدیمانہ دعا کو مستجاب فرماتے ہوئے مجھے درجۂ شہادت عطا فرمایا ہے اور مجھے شہادت کے لہو سے سرخرو کیا ہے"۔

اس کے بعد ابن زیاد کے حکم سے عبداللہؓ بن عفیف کو شہید کر دیا گیا اور ایک مقام پر ان کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

حضرات! حضرت عبداللہ بن عفیفؓ نرالے ہی شہید ہیں۔ شہادت کے طلبگار کو مایوسی کے بعد شہادت نصیب ہوئی اور بدترین اُمت مبغوض و ملعونِ خدا، نجس العین، ابن زیاد بدنہاد کے ہاتھوں ان کی شہادت کا قصہ عجیب و نرالا ہے۔ مگر ان کا جہاد بھی عظیم و عجیب ہے۔ صرف ایک جہاد ہی نہیں بلکہ دو جہاد اس مردِ مجاہد نے انجام دیے۔ "جہاد بالسیف" اور "جہاد باللسان"۔ تلوار کے ساتھ بھی اور زبانِ حق کے ساتھ بھی جہاد کیا۔

كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ اَفْضَلُ الْجِهَادِ".

"جابر حکمران کے سامنے حق بات کہنا افضل جہاد ہے۔" جو اس حق پرست کو حاصل ہوا۔

ابن زیاد کے بھرے دربار میں ہزاروں لوگ اس کی بیہودہ گوئی اور آلِ رسولؐ پر سب و شتم سنتے رہے مگر سوائے عبداللہ بن عفیفؓ کے کسی نے حق گوئی اور ایمانی جرأت کا مظاہرہ نہ کیا۔

اے عفیفؓ کے فرزند! تو نے اعلاء کلمۃ الحق کا افضل جہاد کیا۔ تو نے آلِ اطہار اور ذریتِ اخیار کی نصرت کا حق ادا کر

دیا۔ تو نے جان دے کر ابن زیاد کے مکر وفریب اور کفر باطنی کا پردہ چاک کر دیا۔ مظلوم حسین علیہ السلام کی صدائے ھَلْ مِنْ نَاصِرٍ پر تو نے کوفہ کے دربار میں لبیک کہی۔

حضرت مسلمؑ وہانیؒ، قیس بن مسہر صیداوی اور عبداللہ بن یقطر کی روحیں تیرے استقبال کو آگے بڑھیں، خدا تم پر رحمت اور برکات کی بارش کرے۔

تدفین شھدائے کربلا

گیارہویں محرم کو اہل حرم پابند سلاسل ہو کر کوفہ چلے گئے۔ عمر ابن سعد اپنے مقتولین کو دفن کر کے، قیدیوں کو لے کر کوفہ روانہ ہو گیا اور جوانانِ بنی ہاشم اور انصارِ کرام کے لاشے بے گور و کفن میدانِ کربلا میں بغیر سروں کے بے وارث پڑے رہے۔ بہن بھائی کو، زوجہ اپنے وارث کو، اولاد اپنے باپ کو، مائیں اپنی اولاد کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہیں، تقدیر نے میدانِ کربلا میں لاشوں اور ان کے وارثوں کے درمیان جدائی پیدا کر دی۔

اگر کوئی مسافر کسی شہر میں انتقال کر جائے تو اس شہر کے مسلمان جمع ہو کر عزت واحترامِ انسانی کے پیش نظر مذہبی رسوم ادا کر کے اسے دفن کر دیتے ہیں۔ لیکن اُمت رسولؐ نے اپنے رسولؐ کے خاندان کے مقتولین کو گرم ریت پر یوں ہی چھوڑ دیا۔ بدنوں میں تیروں کی نوکیں پیوست تھیں، خون کا غسل تھا اور خاکِ کربلا ان کے بدنوں کا کفن بنی ہوئی تھی۔ آسمانِ شہادت کے یہ تارے زمین کربلا پر چمک رہے تھے اور خوشبوئے ابدانِ شہداء سے صحرا معطر تھا۔

بنی اسد

میدانِ کربلا کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں جہاں بنی اسد کی قوم کے لوگ کاشتکاری کرتے تھے۔ لڑائی کے حالات سنتے رہے مگر ابن زیاد کے لشکرِ جرار سے سہم کر گھروں میں ہی گھسے رہے۔ یہ لوگ بنی اُمیہ کے مظالم سے ڈرے ہوئے تھے۔

گیارہویں محرم کو جب شقی الدارین بعد از ظہر کوفہ روانہ ہو گیا، تو بارہویں محرم کو بنی اسد کی عورتیں میدانِ کربلا، معرکہ قتال میں شہداء کی لاشوں کی زیارت کی خاطر یا نہر فرات پر کپڑے دھونے کے لیے یا میدانِ قتال کا نقشہ دیکھنے کیلئے یا اثرات جنگ دیکھنے یا بعد از جنگ خیمہ گاہوں کی بربادی کا منظر دیکھنے کیلئے یا جلائے جانے بعد کے اثرات کا مقتولین کا نظارہ کرنے یا جنگ کا نقشہ وغیرہ دیکھنے کے لیے آئیں تو انہوں دیکھا کہ زمینِ کربلا پر ریت کے بستر پر ہاشمی مجاہدین اور انصار حسین علیہم السلام

دنیا سے تعلق توڑ کر اور آخرت سے رشتہ جوڑ کر ابدی نیند سو رہے ہیں۔

تیسرا دن تھا، شہیدوں کے ابدانِ مبارک گو کہ خاک و خون میں آلودہ تھے، مگر گلشن توحید کے ان پھولوں سے خوشبو اتنی تیز تھی کہ مشک و عنبر شرما رہے تھے۔ ان گلبدنوں کی خوشبو سے جنگل مہک رہا تھا اور آسمانِ شہادت کے ان تاروں کے اجسام سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

یہ عورتیں آپس میں کہنے لگیں: ''یہی خانوادہ رسولؐ کے شہداء ہیں اور یہی امام علیہ السلام کی جماعت ہے''۔

جب ان عورتوں نے ان اجسام کو بے گور و کفن دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ عورت تو ویسے بھی نرم دل ہوتی ہے اور پھر جب میدان میں اس طرح بے وارث بدن اور بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھا تو ان کا دل بھر آیا اور یارائے ضبط نہ رہا، آنسو ابل پڑے۔ جب اشکوں کی روانی تھمی اور دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو کہنے لگیں:

''آؤ واپس جا کر اپنے مردوں سے ان لاشوں کے دفن کرنے کو کہیں''۔

وہ واپس آئیں اور اپنے مردوں سے تند و تیز لہجے میں کہنے لگیں:

''رسولؐ کی اولاد تمہارے قرب و جوار میں اِس بیدردی سے قتل ہوتی رہی۔ جس نبی کا تم کلمہ پڑھتے ہو، اسی کا نواسہ، اسی کے لختِ جگر کا نورِ عین تمہاری زمینوں میں آیا لیکن تم سے کچھ امداد نہ ہو سکی۔ رسولؐ کی بیٹیاں تمہارے سامنے لٹتی رہیں اور تم اپنے گھروں میں دبکے رہے، گلشن زہراؑ بادِ خزاں کی لپیٹ میں آ گیا اور تم دیکھتے رہے، ان کا قافلہ مدینہ سے چل کر تمہارے پاس آیا اور تم نے نہ ہی حقِ مہمانی ادا کیا اور نہ ہی ان مسافرین کی پاسداری کی اور نہ ہی ان مظلوموں کی کچھ مدد کی۔ اولادِ علیؑ و بتولؑ کٹتی رہی، متاعِ رسولؐ لٹتی رہی لیکن تمہیں غیرت نہ آئی؟ اگر تم زندگی میں ان کی مدد نہیں کر سکے تو وہ شہادت کے بعد مدد کے محتاج ہیں۔ ان کی لاشیں بے گور و کفن پڑی ہیں۔

اُٹھو اور شہدائے خاندانِ رسالت اور انصار و اعزائے حسین علیہم السلام کی لاشوں کو دفن کرو!

یاد رکھو اگر تم یہ کام بھی نہ کر سکو گے تو یہ داغ ہمیشہ کے لیے تمہاری پیشانی پر رہے گا اور آئندہ آنے والی نسلیں تمہیں برے لفظوں سے یاد کریں گی اور عربوں کی غیرت و حمیت پر ضربِ کاری پڑے گی۔ اگر تم اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتے تو ہم جا کر اس مقدس فریضہ کو سرانجام دیں گی''۔

عورتوں کے طعنے سن کر مردوں کو جوش آ گیا، غفلت کے پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹ گئے، غیرت کے جذبات اُبھر آئے، ضمیر نے ملامت کی، ان کے احساسِ غیرت نے انگڑائی لی، بیلچے سنبھالے، چٹائیاں اکٹھی کیں اور دفن کا پختہ ارادہ

کر کے میدانِ کربلا میں آ گئے۔

امام زین العابدینؑ کی کربلا میں آمد

جب یہ لوگ لاشوں کے درمیان آئے تو ان کی عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جن کے بال کھلے ہوئے تھے اور یہ عورتیں نوحہ و بین و گریہ و ماتم کر رہی تھیں۔ یہ عورتیں سوگوار بن کر مردوں کے ساتھ شہداء کے لاشوں پر آئیں۔ غالباً زمینی باشندوں میں سے تعزیت کی رسوم اور غمخواری کے فرائض ادا کرنے والا یہ پہلا گروہ بنی اسد کا بارہ محرم کو کربلا میں آیا اور حضرت سیدۃ النساءؑ کو ان کی اولاد کے پیاسا شہید ہونے پر پرسہ دیا۔

جب بنی اسد لاشوں کے درمیان آئے تو انہوں نے دیکھا کہ لاشیں سروں سے محروم ہیں۔ یہ لوگ شناخت کرنے سے قاصر تھے اور پریشان کھڑے تھے کہ کس طرح دفن کریں۔ اپنے اہل و عیال سے دریافت کرتے لیکن پہچان نہ سکتے تھے۔ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ ہر ایک لاش کی علیحدہ قبر کھودیں یا بعض لاشیں یکجا دفن کر دیں کہ انہوں نے کوفہ کی جانب سے بلند ہوتا ہوا گرد و غبار دیکھا اور دیکھا کہ ایک گھوڑا سوار ہے جو لاشوں کی جانب بڑی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔

پہلے تو یہ لوگ گھبرا گئے۔ جب ان کی گھبراہٹ اس سوار نے دیکھی تو پکار کر فرمایا:

''گھبراؤ نہیں! میں تدفینِ شہداء کے بارے میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں اور میں علیؑ ابن الحسینؑ زین العابدین ہوں اور اپنے بابا کی لاش دفن کرنے کیلئے آیا ہوں''۔

اب چونکہ شہداء کا وارث بھی آن پہنچا تھا اور کوئی خوف و خطر بھی نہ تھا، اب بنی اسد کے مردوں نے دل کھول کر امامؑ کو بابا، بھائیوں، چچاؤں اور انصار کی شہادت کا پرسہ دیا۔ گریہ تو پہلے ہی سے بپا تھا مگر اس وارثِ عزاء و تعزیہ کے آ جانے سے سخت گریہ و ماتم ہوا۔ اس گریہ و ماتم کی آوازوں سے دشتِ کربلا بھر گیا، عورتوں نے بال کھول دیئے، منہ پر ماتم کیا اور پہلا پرسہ اور پہلی تعزیت یا ماتم داری کا شرف بنی اسد کی عورتوں کو حاصل ہوا۔

شہدائے کربلا علیہم السلام کی لاشیں یکجا تھیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدالشہداء علیہ السلام نے خیمہ گاہ کے ایک طرف بڑا خیمہ نصب کیا تھا جس میں انصار و بنی ہاشم کی لاشیں شہادت کے بعد لائی جاتیں اور اس خیمہ میں رکھی جاتیں۔ سوائے ان لاشوں کے جو کسی وجہ سے خیام میں نہ لائی جا سکیں، جیسے حضرت عباس علیہ السلام، حضرت علی اصغرؑ یا عونؑ و محمدؑ کی لاشوں کے۔ باقی تمام لاشیں یکجا گنج شہداء میں موجود تھیں۔ جب بھی کسی شہید کی لاش کا اضافہ ہوتا تو امام علیہ السلام فرماتے:

قَتَلَةٌ مِثْلُ قَتَلَةِ النَّبِيِّينَ وَ آلِ النَّبِيِّينَ".

"یہ قتل انبیاء اور آلِ انبیاء کے قتل کی مانند ہے"۔

جب عصر عاشور کے بعد شہدائے کربلا علیہم السلام کی لاشوں کے ساتھ سے ان کے سر علیحدہ کئے گئے تو اشقیائے بے دین نے خیمے کی طنابیں کاٹ کر خیمہ اکھاڑ لیا اور ہر ایک لاش کا سر علیحدہ کر کے اس کو وہیں چھوڑ دیا، اس طرح خیمہ ختم ہو گیا اور لاشیں بکھر گئیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی لاش ان لاشوں سے جدا تھی، کیونکہ آپ کی لاشِ مطہر کو خیمے تک لانے والا کوئی نہ تھا اور نہ ہی خیمے تک لانے کی کسی کو فرصت ملی، تاہم امامِ حسین علیہ السلام کی لاش میں اور باقی تمام لاشوں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہ تھا۔

بنی اسد کا ایک کاشتکار بیان کرتا ہے:

"عمر بن سعد کے روانہ ہو جانے کے بعد جب میدانِ کربلا خالی ہو گیا تو میں معرکۂ قتال میں آیا۔ دیکھا کہ ابدانِ مبارک سے نور کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہیں اور خوشبو نے میدانِ کربلا معطر ہے"۔

پھر وہ بیان کرتا ہے:

"میں نے ایک شیر کو دیکھا جو شیرانِ بیشۂ شجاعت اور پیرانِ عرصۂ شہادت کی لاشوں میں گھوم رہا تھا۔ بعد ازاں حضرتِ سید الشہداء علیہ السلام کی لاش پر آیا، طواف کرتا، اپنا سر اور منہ آپ کے خون میں آلودہ کرتا اور اپنی زبان میں نوحہ و نالہ کرتا۔ میں حیران رہ گیا اور چھپ کر اس شیر کا لاشوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھتا رہا۔ شیر کی عادت ہوتی ہے کہ لاشوں کو نقصان پہنچاتا ہے، مگر میں نے دیکھا کہ وہ عقیدت سے ہر لاش سے محبت کرتا، زیارت کرتا اور اس طرح ہمہمہ کرتا جس طرح کوئی ماں اپنے جوان بچے کی لاش پر نالہ کرتی ہے"۔

بنی اسد کے اس مرد کی روایت ہے کہ:

"اس رات میں نے لاشوں پر نور کی قندیلیں روشن دیکھیں جن سے میدان بھرا ہوا تھا اور میں نے رونے پیٹنے اور نوحہ کرنے کی آوازیں سنیں"۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام باعجازِ امامت کوفہ سے کربلا پہنچے اور لاشوں کی تدفین میں بنی اسد کی رہنمائی کی، ان کو شہداء کی لاشوں کے نام بتائے اور ان کو شہدائے بنی ہاشم اور انصار کی لاشوں کی پہچان کروائی۔ اس کے بعد آپ اپنے مظلوم و مسلوب بابا حضرتِ سید الشہداء علیہ السلام کی لاش پر آئے، لاش کو گلے لگایا، بوسے لئے اور بہت گریہ کیا۔ پھر آپ نے

اسی جگہ پر تھوڑی سی مٹی ہٹائی اور نیچے سے تیار قبر ظاہر ہوئی۔

آپ نے اپنے بابا اور تمام شہدائے کربلا علیہم السلام پر نماز جنازہ پڑھائی۔ قبر تیار تھی اور لحد اس میں کھدی ہوئی تھی۔

امام علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا اور تنہا بابا کی لاش کو قبر تک پہنچایا۔ جس طرح میت کو لحد میں رکھتے وقت پڑھا جاتا ہے، امام علیہ السلام نے وہ جملے اس طرح ارشاد فرمائے:

"بِسْمِ اللّٰهِ وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ عَلٰی مِلَّتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ".

جب امام علیہ السلام لاش کو اٹھانے لگے تو بنی اسد نے لاش کے اٹھانے اور دفن کرنے میں معاونت کا قصد کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "الگ رہو! میری مدد کرنے والے ہیں"۔

امام علیہ السلام جب حضرت سید الشہداء علیہ السلام کو قبر میں اتار چکے تو اپنے رخسار کو کٹی ہوئی گردن پر رکھا اور گریہ کرتے ہوئے یہ کہا:

"طُوْبٰی لِاَرْضٍ تَضَمَّنَتْ جَسَدَکَ الطَّاهِرَ فَاِنَّ الدُّنْیَا بَعْدَکَ مُظْلِمَةٌ وَ الْاٰخِرَةُ بِنُوْرِکَ مُشْرِقَةٌ اَمَّا اللَّیْلُ فَمُسَهَّدٌ وَالْحُزْنُ سَرْمَدٌ اَوْ یَخْتَارُ اللّٰهُ لِاَهْلِبَیْتِکَ دَارَکَ الَّتِیْ اَنْتَ بِهَا مُقِیْمٌ وَ عَلَیْکَ مِنِّیَ السَّلَامُ یَابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُهٗ".

"اس زمین کیلئے سعادت ہے جس نے آپ کے پاک جسم کو اپنی آغوش میں لیا۔ اب دنیا بیشک آپ کے بعد تاریک ہے اور آخرت آپ کے نور سے روشن ہے۔ رات کے وقت بیداری زیادہ اور نیند کم رہے گی، غم ہمیشہ رہے گا، جب تک خدا آپ کے اہل بیت کے لیے وہی گھر پسند نہ کرلے گا، جس میں آپ مقیم ہیں۔ (یعنی تا زندگی آپ کے پسماندہ اہل بیت علیہم السلام پر غم کی کیفیت چھائی رہے گی) یا ابن رسول اللہ! آپ کے بیٹے کا آخری سلام قبول ہو اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ کو ڈھانپ لیں"۔

اس کے بعد آپ نے قبر مبارک کو بند کر دیا اور انگشت سے قبر اطہر پر لکھا:

"هٰذَا قَبْرُ الْحُسَیْنُ ابْنُ عَلِیٍّ ابْنُ اَبِیْطَالِبْ الَّذِیْ قَتَلُوْهُ عَطْشاً غَرِیْباً".

پھر امام علی زین العابدین علیہ السلام نے دریائے فرات کی جانب رخ کیا اور اسدِ بنی ہاشم، اُمّ البنین کے لعل، چچا عباس علیہ السلام کی لاش پر آئے۔ اس کٹے ہوئے بازوؤں والی لاش کو اور زخموں سے چور بدن کو دیکھا کہ زخموں سے بھرے ہوئے اس لاشے پر ملائکہ آسمان پر اور حوریں جنت میں ماتم کناں تھیں۔ امام علیہ السلام اپنے غیور چچا کی لاش پر گر پڑے اور کٹے ہوئے بازوؤں اور سر کی جدائی کے مقام کے بوسے لئے اور لاش کو گلے لگا کر روتے رہے۔ جب آنسو رکے تو فرمایا:

"عَلَى الدُّنْيَا بَعْدَكَ الْعَفَاءُ يَا قَمَرَ بَنِيْ هَاشِمٍ وَ عَلَيْكَ مِنِّيَ السَّلَامُ مِنْ شَهِيْدٍ مُحْتَسِبٍ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ".

امام علیہ السلام نے چچا کی نمازِ جنازہ پڑھائی، اس کے بعد قبر کھودی اور اسی طرح تنہا ہی اپنے چچا کو قبر کی آغوش کے سپرد کیا جس طرح کہ تنہا اپنے بابا کی لاش کو قبر میں رکھا۔ اس مرتبہ پھر جب بنی اسد نے معاونت کا ارادہ کیا تو وہی جملہ فرمایا:

"تم الگ رہو، میرے ساتھ میری مدد کرنے والے موجود ہیں"۔

پھر آپ نے بنی اسد سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اب تمہاری امداد کا وقت آیا ہے"۔

اور پھر آپ نے باقی شہداء کی تدفین میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا۔

آپ نے تمام شہداء پر نمازِ جنازہ پڑھوانے کے بعد ایک قبر حضرت سیّد الشہداء علیہ السلام کے پیروں کی جانب کھدوائی۔ اس قبر میں حضرت علی اکبر علیہ السلام، شبیہ پیغمبرؐ، جناب لیلیٰ کی آنکھ کے تارے کو چھپادیا۔ پھر آپ نے حضرت علی اکبر علیہ السلام کے پیروں کی جانب ایک بڑی قبر کھدوائی جس میں تمام شہدائے بنی ہاشم کو دفن کیا۔

جس طرح آپ نے تمام شہدائے بنی ہاشم کی ایک ہی بڑی سی قبر بنوائی اسی طرح ایک بڑی اور بڑی قبر بنوا کر اس میں انصار و اصحاب کی لاشیں دفن کروادیں اور اس طرح تمام انصار بھی ایک ہی قبر میں مدفون ہوئے۔

حضرت حرؑ اس سے پہلے ہی دفن ہو چکے تھے کیونکہ حضرت حر علیہ السلام کا قبیلہ لشکرِ ابن سعد میں موجود تھا۔ اس نے آپ کی لاش گنج شہداء سے اٹھالی اور ان کا سر بھی لاش سے الگ نہیں ہونے دیا۔ ان کے قبیلے نے اسی جگہ حضرت حر کو دفن کیا جہاں آج قبر موجود ہے۔

شاہ اسمٰعیل صفوی اور حرؑ کی لاشِ اقدس

کبریت احمر اور انوارِ نعمانیہ میں موجود ہے کہ جب شاہ اسمٰعیل صفوی کربلا میں آیا تو اس نے ایک جگہ کی کھدائی کروائی۔ ایک قبر ظاہر ہوئی جس میں ایک میت نظر آئی۔ لاش بالکل تر و تازہ تھی اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا کہ ابھی دفن کی گئی ہے اور اس میت کے سر پر ایک رومال کی پٹی باندھی گئی تھی۔

شاہ اسمٰعیل نے رومال کھولا تو خون کی ایک دھار پھوٹ نکلی۔ بسیار کوشش کے باوجود اس خون کی روانی کم نہ ہوئی اور بالآخر شاہ اسمٰعیل کو وہی رومال اس لاش کے سر پر باندھنا پڑا۔ لہٰذا جب یہ رومال باندھا گیا تو خون رک گیا۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت حرؑ کی قبر ہے۔ جب حضرت حرؑ نے شہادت پائی اور امام علیہ السلام ان کی لاش پر آئے تو دیکھا کہ سر سے خون بہہ رہا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے پاک رومال کو آپؑ کے سر پر باندھ دیا اور خون رک گیا۔ گویا اب لاشِ حر کہہ رہی تھی کہ فرزندِ بتولؑ کے ہاتھ کا باندھا گیا رومال مجھ سے جدا کیا جائے یہ مجھے گوارا نہیں۔ چنانچہ شاہ اسمٰعیل صفوی نے حضرت حرؑ کی قبر پر گنبد بنوایا اور قبر کی حفاظت کیلئے ایک پہرے دار مقرر کیا۔

شہدائے کربلا علیہم السلام کی لاشوں کی تدفین کے بعد حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے بنی اسد کو فرمایا کہ زائرین کو قبورِ طیبہ کی نشاندہی کرنا۔ اس کے بعد آپؑ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے زندان کی طرف روانہ ہو گئے۔

بنی اسد کے لوگوں کو تدفین شہداء کی سعادت حاصل ہوئی۔ کئی ایک روایات میں مذکور ہے کہ بنی اسد اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم ہی ہیں کہ جنہوں نے شہدائے کربلا پر نماز پڑھی اور ان کے لاشوں کو دفن کیا۔

حضرت قائم آلِ محمد، حجت خدا عجل اللہ فرجہ الشریف ان الفاظ میں شہدائے کربلا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

"بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَ اُمِّیْ طِبْتُمْ وَ طَابَتِ الْاَرْضُ الَّتِیْ فِیْهَا دُفِنْتُمْ وَ فُزْتُمْ وَاللّٰهِ فَوْزاً عَظِیْماً".

"میرے ماں باپ آپ پر فدا ہو جائیں، تم بھی پاک ہو اور وہ زمین بھی پاک ہو گئی جس میں آپ دفن کیے گئے۔ خدا کی قسم آپ نے بہت بڑا رتبہ پایا"۔

مدینہ منورہ میں خبرِ شہادتِ امام حسینؑ

سب سے پہلے سید الشہداء علیہ السلام کی شہادت کی خبر آپؑ کے نانا حضرت محمد مصطفیٰؐ نے چشم گریاں و بہ موئے پریشان و خاک آلودہ ریش اور بالوں کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمٰی کو دی۔

جب سے حضرت امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے سفر اختیار کیا تھا، باقی ماندہ افرادِ بنی ہاشم آپؑ کی خبر کیلئے سخت مضطرب تھے۔ مردوں میں حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ رہ گئے تھے اور مستورات میں سے حضرت اُمّ المومنین اُمّ سلمہ سلام اللہ علیہا، حضرت اُمّ البنینؑ، حضرت اُمّ ہانی، حضرت اسماء، اُمّ لقمان، رملہ،

زینبؑ دختران حضرت عقیل ابن ابیطالب علیہم السلام مدینہ میں موجود تھیں۔

یہ خواتین بنی ہاشم کے خاندان کے اکثر افراد کی مسافرت، امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، حضرت عباس علیہ السلام، حضرت عقیل علیہ السلام کے گھروں کی بربادی اور ان کے صحنوں کی غیر آبادی، زمانے کے تغیرات اور پرآشوبی سے ہر وقت اداس اور پریشان رہتی تھیں اور نہایت بے چینی سے ان مسافروں کی خبر کی منتظر رہتی تھیں۔

عاشور کے دن حضرت عبداللہ ابن عباس علیہ السلام نے نہایت ہی دردناک خواب دیکھا۔

"رَاَی ابْنُ عَبَّاسٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّم اَشْعَثَ مُغْبَرًا وَ بِیَدِهٖ قَارُوْرَةٌ فِیْهَا دَمٌ فَقَالَ لَهٗ بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ مَا هٰذَا؟ قَالَ هٰذَا دَمُ الْحُسَیْنِ وَ اَصْحَابِهِ الْحُسَیْنِ لَمْ اَزَلْ اَلْتَقِطُهٗ مِنْذُ الْیَوْمِ".

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ ان کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں اور خاک آلودہ ہیں اور انکے ہاتھ میں ایک شیشی خون سے بھری ہوئی ہے، پھر حضرت ابن عباسؓ نے دریافت کیا:

"میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہو جائیں یہ کیا ہے؟

فرمایا: "حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کا خون ہے جسے میں اکٹھا کرتا رہا"۔

یہاں ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس شیشی میں جہاں بنی ہاشم کا خون تھا، وہیں انصار و اصحاب حسینؑ کا پاک خون بھی شامل تھا۔ واضح رہے کہ حضرت جون، جو کہ حبشی غلام تھے، نے جب حضرت امام حسین علیہ السلام سے جہاد کی اجازت چاہی تو امام علیہ السلام نے حسب معمول کچھ پس و پیش کیا تو حضرت جون علیہ السلام نے بڑے درد بھرے دل سے یہ التجا کی:

"مولاؑ! میرا بدن سیاہ اور خون بدبودار ہے۔ مگر میں آپؑ سے اس وقت تک جدا نہ ہوں گا جب تک میں اپنے اس بدبودار خون کو آپؑ کے معطر خون سے ملحق نہ کرلوں"۔

چنانچہ حضرت جونؑ کی شہادت کے بعد ان کے بدن سے خوشبو آرہی تھی اور ان کا خون اس قدر عزت پا گیا کہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ہاتھ سے ان کے خون کے قطروں کو چمن کے انصار و اصحاب واہلبیت علیہم السلام کے خون کے ساتھ اس شیشی میں جمع فرمایا اور حضرت جونؑ کی یہ پیشکش شرف قبولیت حاصل کر گئی کہ ان کا خون اہل بیت و انصار و اصحاب علیہم السلام کے مقدس خون کے ساتھ اس شیشی میں ملحق ہو گیا۔

یہ تو حضرت ابن عباسؓ کا خواب تھا۔ اب ام المومنین حضرت ام سلمیٰ کے خواب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

حضرتِ امّ سلمیٰ سلام اللہ علیہا کا خواب

"رَأَتْ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم اُمِّ سَلْمَۃَ فِی الْمَنَامِ اَشْعَثَ مُغْبَراً وَ عَلٰی رَأْسِہٖ وَ لِحیَتِہِ التُّرَابُ فَقَالَتْ لَہٗ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَا لِیْ اَرَاکَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ؟ قَالَ قُتِلَ وَلَدِیَ الْحُسَیْنُ وَ مَا زِلْتُ اَحْفِرُ الْقُبُوْرَ لَہٗ وَ لِاَصْحَابِہٖ فَانْتَبَھَتْ فَزِعَۃً وَّ نَظَرَتْ اِلَی الْقَارُوْرَۃِ الَّتِیْ فِیْھَا تُرَابٌ. اَرْضِ کَرْبَلَاءَ فَاِذَا بِہٖ یَفُوْرُ دَماً".

"حضرت اُمّ سلمٰی سلام اللہ علیہا نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ کے سر کے بال کھلے ہوئے ہیں اور آپؐ سر کے بال ریش مبارک خاک آلود ہے۔ پس انہوں نے حضورؐ سے پوچھا: میں آپ کو اس حالت میں کیوں دیکھ رہی ہوں کہ آپؐ کے سرمبارک کے بال اور ریش مبارک خاک آلود ہے؟ حضوؐر اکرم نے فرمایا:

میرا بیٹا حسینؑ کربلا میں شہید ہو گیا ہے اور میں ان کیلئے اور ان کے اصحاب کیلئے قبریں کھودتا رہا"۔

پس حضرت ام سلمٰی سلام اللہ علیہا خواب سے گھبراہٹ کے عالم میں بیدار ہوئیں اور اس شیشی کو دیکھا جو حضورؐ اکرم نے ان کو دی تھی اور بحفاظت رکھنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جب یہ سرخ ہو کر خون میں تبدیل ہو جائے تو سمجھ لینا کہ میرا حسینؑ کربلا میں شہید کر دیا گیا ہے۔ حضرت اُمّ سلمٰیؑ نے جب اس شیشی کو دیکھا تو اس میں بجائے مٹی کے جوش مارتا ہوا تازہ خون تھا۔ حضرت ام سلمٰی سلام اللہ علیہا سمجھ گئیں کہ جگرِ رسولؐ کٹ گیا اور دلِ زہراؑ کٹ گیا اور علیؑ کا نورِ عین شہید ہو گیا۔

حضرت اُمّ سلمٰی سلام اللہ علیہا کی فریاد بلند ہوئی اور آپ بلند آواز سے گریہ کرنے لگیں۔ جب ان کی آواز بنی ہاشم کی مستورات نے سنی تو بیقرار ہو کر حضرت ام سلمٰی سلام اللہ علیہا کے پاس آئیں اور واقعہ دریافت کیا۔ جناب امّ سلمٰی نے واقعہ بیان کیا تو خاندانِ عبدالمطلب علیہ السلام پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

اس خبر کی تائید ہاتفِ غیبی نے بھی کی۔ حضرت امّ سلمٰی سلام اللہ علیہا کا بیان ہے کہ گیارہویں کی رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، فضائے مدینہ سوگوار تھی اور غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہاتفِ غیبی شہادت امام حسین علیہ السلام کی خبر سنا رہا تھا اور یہ شعر با آوازِ بلند پڑھ رہا تھا:

اَیُّھَا الْقَاتِلُوْنَ جَھْلاً حُسَیْنَاہٗ!
اَبْشِرُوْا بِالْعَذَابِ وَ التَّنْکِیْلِ
قَدْ لُعِنْتُمْ عَلٰی لِسَانِ ابْنِ دَاوٗدَ
وَ مُوْسٰی وَ صَاحِبِ الْاِنْجِیْلِ
کُلُّ اَھْلِ السَّمَاءِ یَدْعُوْ عَلَیْکُمْ
مِنْ نَّبِیٍّ وَّ مُرْسِلٍ وَّ قَتِیْلٍ

شہادتِ حضرتِ امام حسین علیہ السلام کی خبر عبیداللہ ابن زیاد کی طرف سے

عبیداللہ ابنِ زیاد جب اس قبیح کارروائی سے فارغ ہو چکا تو اس نے ایک تیز رو قاصد دمشق میں یزید بن معاویہ کے پاس بھیجا، جس کے ذریعے اس ملعون نے یزید لعین کو کربلا کے واقعہ کی خبر اور قتل امام حسین علیہ السلام کی اطلاع دی اور یزید سے دریافت کیا کہ قیدی مستورات اور سروں کے متعلق کیا حکم ہے، کیا یہ دمشق بھیج دیے جائیں؟

دوسری اطلاع اس نے مدینہ کے گورنر ''عمرو بن سعید الاشدق'' ملعون کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کیلئے اس نے عبدالملک بن الحارث السلمی کو چنا اور شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی خبر مدینہ لے جانے کے لیے کہا۔ پہلے تو اس نے حیلہ و بہانہ کیا مگر اس ظالم و جابر کا حکم رد کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ ابنِ زیاد نے اس کا کوئی عذر قبول نہ کیا اور اسے طوعاً و کرہاً مدینہ جانا ہی پڑا۔

ابن زیاد نے اس قاصد کو تاکید کی کہ بعجلتِ تمام یہ خبر مدینے لے جائے تا کہ اس سے پہلے یہ خبر حاکم مدینہ تک نہ پہنچ پائے۔ ایک تیز رو سواری دی اور ساتھ ہی کچھ دینار بھی دیے اور کہا کہ اگر تمہاری سواری چلنے سے رہ جائے تو توقف نہ کرنا اور دوسری تیز رفتار سواری خرید لینا تا کہ عامل مدینہ اس خوشخبری سے جلد از جلد مسرت حاصل کرے۔

یہ سوار تیزی سے منازل طے کرتا ہوا جب مدینہ پہنچا تو خاندانِ قریش کے ایک مرد سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے اس قاصد سے حال دریافت کیا اور پوچھا:

''کیا خبر لایا ہے؟''

قاصد نے کہا: "یہ خبر میں امیر کے پاس جا کر بیان کروں گا۔ اگر خواہش ہے تو وہاں آ کر سن لو"۔

عامل مدینہ کے پاس پہنچ کر اس قاصد نے قتل امام حسین علیہ السلام کی خبر بیان کی۔ عامل مدینہ، ملعون بغضِ خاندانِ رسالتؐ میں یزید اور ابنِ زیاد سے کم نہ تھا۔ اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ خاندانِ رسالتؐ کی بربادی اور ابنِ زیاد کی کامیابی اس مردود کے لیے عید کی خبر بنی۔ اس نے منادی والے کو بلا کر حکم دیا کہ مدینہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں جا کر اعلان کر دے حسین ابن علی علیہم السلام کربلا میں قتل کر دیے گئے۔

قتل امام حسین علیہ السلام کی منادی اسی مدینہ میں کروائی جا رہی ہے جو امام حسین علیہ السلام کے نانا کا شہر ہے۔ جن گلیوں میں شہسوارِ دوشِ نبیؐ کا اعزاز صحابہ کو دکھایا جاتا تھا، جن گلیوں میں ختمی نبوتؐ جس سوار کا مرکب بنتے تھے، صحابہ "نعم المرکب" کا نعرہ لگاتے اور "نعم المرکب"، "نعم المرکب" کہہ کر جس حسینؑ کی شان ظاہر کرتے، آج منادی اسی حسینؑ کی شہادت کی خبر اسی مدینہ میں نشر کر رہا ہے۔

جب بنی ہاشم کے گھروں میں یہ صدائے دلفگار پہنچی تو تمام بنی ہاشم اور بنات عقیل علیہم السلام پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سارا مدینہ ماتم کدہ بن گیا اور گلی کوچوں سے رونے پیٹنے والوں کا سیلاب امڈ آیا۔ جب رونے کی یہ آوازیں عامل مدینہ، اُموی گورنر، عمر بن سعید ملعون کے کانوں میں آئیں تو یہ خوش ہو گیا اور اس نے ایک شاعر کا یہ شعر پڑھا:

عَجَّتْ نِسَآءُ بَنِیْ زِیَادٍ عَجَّةً
كَعَجِیْجِ نِسْوَتِنَا غَدَاةَ الْاَرْنَبِ

"بنی زیاد کی عورتوں نے نالہ و بکا کیا جس طرح کہ ہماری عورتوں نے واقعہ "ارنب" کی صبح کو آواز گریہ بلند کی"۔

پھر اس نے کہا:

"وَاعِیَةٌ بِوَاعِیَةِ عُثْمَانَ".

"یہ گریہ و بکاء اس گریہ و بکاء کا بدلہ ہے جو عثمان پر کیا گیا"۔

پھر اس شقی اور ناری نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قبر اطہر کی جانب رخ کر کے کہا:

"یَوْمٌ بِیَوْمِ بَدْرٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ".

"یہ دن بدر والے دن کا بدلہ ہے! یا رسولؐ اللہ! یا رسولؐ اللہ"۔

یعنی جنگ بدر میں بنی اُمیہ کے جن سرداروں کو بنی ہاشم خصوصاً علی ابن ابیطالب علیہما السلام نے قتل کیا تھا، اس کا بدلہ ہم

نے کربلا میں لیا ہے۔

یزید ملعون نے بھی دربارِ شام میں وقتِ دخولِ سرِ حضرت امام حسین علیہ السلام کچھ ایسے ہی اشعار پڑھے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے بیعت تو اک بہانہ تھا، انہوں نے ہر حال میں اولادِ رسولؐ کو بدر کے مقتولین کے بدلے میں قتل کرنا تھا۔

انصارِ مدینہ نے عاملِ مدینہ کے اس جملے کا بہت برا منایا اور سخت ناپسند کیا، مگر اخلاقی جرأت کمزور تھی اور جذبہ جہاد ماند پڑا ہوا تھا۔

عامل مدینہ، عمرو ذلیل منبر پر چڑھا، اسی منبر پر جس منبر پر رسولِ خدا اپنی آنکھوں کے نور اور دل بندِ بتولؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کو آغوش میں لے کر پیار و محبت کا سلوک فرماتے تھے۔ آج اسی پاک منبر پر ناپاک بنی اُمیہ کا پلید گورنر اسی حسینؑ، نواسۂ رسولؐ کے قتل کی خوشخبری فخر و انبساط کے ساتھ سنا رہا ہے۔ یہ اہلِ مدینہ کی بے حسی اور دینی حمیت کے فقدان کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس کا یہ خطبہ کیسے سن لیا؟ اس خطبے میں اس نے کہا:

''یہ درد کے بدلے درد اور صدمے کے بدلے صدمہ ہے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ حسینؑ بچ جائیں مگر انہوں نے ہماری اطاعت قبول نہیں کی۔ اگر وہ بیعت کر لیتے تو آج ان کی یہ حالت نہ ہوتی۔ ہم انؑ کی مدح کرتے تھے اور وہ ہمیں گالیاں دیتے تھے''۔

جس طرح جھوٹے خطیبوں اور مکار سیاسی مقررین کی عادت ہوتی ہے، اس نے اسی طرح بدگوئی جاری رکھی۔ ایک شخص عبداللہ بن قائف نے اٹھ کر کہا: ''اے عمرو! اگر مادرِ حسینؑ، جناب سیدہ سلام اللہ علیہا ابھی موجود ہوتیں اور اپنے لختِ جگر کو مقتول دیکھتیں تو وہ ضرور گریہ کرتیں''۔

گورنر نے عبداللہ کو جھڑکتے ہوئے جواب دیا:

''ہم تجھ سے زیادہ قریب فاطمہؑ ہیں۔ ہم خاندانی طور پر تمہاری نسبت ان سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کے والد ہمارے چچا، ان کے شوہر ہمارے بھائی، اگر وہ موجود ہوتیں تو ضرور گریہ فرماتیں مگر ہمیں اس قتل پر ملامت نہ کرتیں''۔

مدینہ میں بنی اُمیہ کے گھروں میں آج عید تھی اور بنی ہاشم کے گھروں میں ماتم۔ بنی عبدالمطلب کی عورتوں کے سروں سے چادریں گر گئیں، ان کے چہروں اور سروں اور شہادت امام حسین علیہ السلام کے صدمے کے طمانچے تھے۔

اُمّ المومنین حضرت ام سلمیٰ سلام اللہ علیہا نے جب یہ خبر سنی تو زوجۂ رسولؐ غش کھا کر گر پڑیں۔ جب افاقہ ہوا تو شدتِ درد سے کہا:

"اے اللہ! ان ظالموں کی قبروں کو جہنم کی آگ سے بھردے"۔

اس کے بعد مستورات بنی ہاشم حضرت ام سلمٰی، حضرت ام البنین، حضرت ام ہانی، حضرت اسماء، حضرت رملہ، حضرت زینب، حضرت ام لقمان، دختران جناب عقیلؑ اور دیگر مستورات بنی ہاشم سر پیٹتی ہوئی اور نوحہ وگریہ کرتی ہوئی قبر رسولؐ پر آئیں، ان کو نواسے کی شہادت اور بنی ہاشم کے اجڑنے کا پرسہ دیا۔ پھر یہ خواتین حضرت زہراءؑ کی قبر انور پر آئیں، نوحہ و ماتم کیا اور تعزیت ادا کی۔

انصار ان مدینہ کے گھر بھی ماتم کدہ بن چکے تھے۔ ان کی عورتیں بھی گریہ وفغاں کرنے لگیں۔ غرض یہ کہ سارا مدینہ ہی قتل حسین علیہ السلام کے صدمے سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ مدینہ کے درودیوار متزلزل تھے۔ جناب اسماء بنت عقیل علیہم السلام کا نوحہ اور مرثیہ بہت دردناک جسے سن کر انصار بہت روئے۔ مدینۃ الرسولؐ کے کوچہ وبازار گریہ وزاری کی آوازوں سے بھر گئے تھے، قبر رسول کانپ رہی تھی اور مدینہ کے درودیوار متزلزل تھے۔

حضرت اسماء سلام اللہ علیہا نے اس طرح مرثیہ پڑھا:

مَا ذَا تَقُوْلُوْنَ اَنْ قَالَ نَبِیٌّ لَکُم
یَوْمَ الْحِسَابِ وَ صِدْقِ الْقَوْلُ مَسْمُوْعٌ

خَذَلْتُمُوْا عِتْرَتِیْ اَوْ کُنْتُمْ غُیَبًا
وَ الْحَقُّ عِنْدَ وَلِیِّ الْاَمْرِ مَجْمُوْعٌ

اَسْلَمْتُمُوْاهُمْ بِاَیْدِیْ الظَّالِمِیْنَ فَمَا
مِنْکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ مَشْفُوْعٌ

مَا کَانَ غَدَاۃَ الطَّفِّ اِذْ حَضَرُوْا
تِلْکَ الْمَنَایَا وَلَا عَنْھُنَّ مَدْفُوْعٌ

پرسہ دینے والے قبر رسولؐ اور قبر زہراء سلام اللہ علیہا پر اظہار غم کیلئے آتے رہے۔ مدینہ میں تمام قتل حسین علیہ السلام کی سننے والیاں بنی ہاشم کے گھروں میں جمع ہوتیں اور گریہ وبکاء کرتیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفر علیہما السلام نے بھی صف ماتم بچھائی۔

یہ امامِ مظلوم علیہ السلام کے زیادہ قریبی تھے اور واقعات کربلا میں ان کا بہت زیادہ حصہ تھا۔ بنی ہاشم اور انصارانِ حسین علیہم السلام کا پرسہ دینے کے لیے لوگ ان کے پاس آتے۔ ان کے دو بیٹے حضرات عون ومحمد علیہم السلام بھی کربلا میں شہید کیے گئے۔

ان کے ملازم ابوالسلاس نے ان کے بارے میں کچھ نامناسب جملے کہے۔ جناب عبداللہ نے اسے سزا دی اور فرمایا:

''اگر میں بھی کربلا میں موجود ہوتا تو یقیناً شہادت کا مرتبہ حاصل کرتا۔ مگر میرے دو بیٹوں کی نصرت وامداد اور ان کی شہادت نے میرے دل کا غم کچھ ہلکا کیا''۔

پھر حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ''مجھ پر شہادت حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا بہت عظیم صدمہ ہے۔ میں اس بارے میں بھی سخت محزون ہوں کہ میں خود اپنی جان قربان نہیں کرسکا۔ مگر میرے بیٹوں نے راہِ حق میں قربانیاں دی ہیں''۔

حضرتِ اُمّ البنین سلام اللہ علیہا کا مرثیہ

حضرتِ ام البنین علیہا السلام کا اسمِ گرامی فاطمہ بنتِ حزام بنتِ خالد ہے۔ خاندان بنی کلاب ہے اور آپ چار بیٹوں کی والدہ ہیں۔ ان کے بیٹے شجاعت اور دلیری میں مانے ہوئے شیر تھے۔ ان چاروں بیٹوں کی بہادری اور شجاعت پر آپ کو بہت ناز تھا اور یہ چاروں ہی آسمانِ شجاعت کے چاند تھے۔ انہی چاروں بہادر بیٹوں کی وجہ سے آپ کی کنیت اُمّ البنین ہے۔ یہ چاروں دلیر عباس، عبداللہ، عثمان اور جعفر علیہم السلام ہیں۔ آپ کے ان چاروں بیٹوں کی وفاداری میں نظیر نہیں ملتی۔

جنابِ فاطمہؑ کے نام پر ان کی کنیت غالب ہے اور آپ کی یہی کنیت ''امّ البنین'' زیادہ مشہور ہے۔ آپ نے مدینہ میں حضرتِ امام حسین علیہ السلام، بنی ہاشم کے شہداء اور اپنے بیٹوں کے نام پر عزاخانہ بنایا ہوا تھا، جہاں آپ ہر وقت نالہ وزاری میں مصروف رہتیں۔ جنت البقیع میں جا کر اس قدر دردناک بین کرتیں کہ بھی دوست ودشمن متاثر ہو کر رونے لگ جاتے، آپ کے دلخراش اور جگر سوز اشعار سے اہلِ مدینہ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، حتیٰ کہ انتہائی شقی القلب اور شدید ترین دشمن خاندانِ رسالتؐ بھی آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا۔ کتب مقاتل اور مفاتیح الجنان میں بھی آپ کے یہ دردناک اشعار تحریر ہیں:

لَا تَدْعُوِنِّی وَیْکِ امَّ الْبَنِیْنِ
تُذَکِّرِیْنِی بِالْیُوْثِ الْعَرِیْنِ

کَانَتْ بَنُوْنَ لِیْ اُدْعٰی بِھِمْ
وَ الْیَوْمَ اَصْبَحْتُ وَلَا مِنْ بَنِیْنِ

اَرْبَعَةٌ مِثْلُ نُسُوْرِ الرَّبٰی
قَدْ وَاصَلُوْا الْمَوْتَ بِقَطْعِ الْوَتِیْنِ

تَنَازَعَ الْخِرْصَانُ اَشْلَاءَ هُمْ
فَکُلُّهُمْ اَمْسٰی صَرِیْعاً طَعِیْنِ

یَا لَیْتَ شِعْرِیْ کَمَا اَخْبَرُوْا
بِاَنَّ عَبَّاساً قَطِیْعَ الْیَمِیْنِ

''افسوس! اب مجھے ام البنین کہہ کر نہ پکارنا! تم مجھے ام البنین پکار کر ان شیران بیشہ کی یاد دلاتی ہو۔ جب میرے بیٹے زندہ تھے، تو میں ام البنین پکاری جاتی تھی اور آج میں بیٹوں کے بعد تنہا رہ گئی ہوں۔ میرے چار بیٹے جو گردنیں کٹوا کے موت سے بغلگیر ہو گئے، نیزوں کی ضربتوں کی کثرت نے ان کے گوشت کو چیر دیا۔ وہ سب کے سب نیزوں کے بار بار لگنے سے مجروح ہو کر زمین پر گر پڑے۔ افسوس ہے، جس طرح کہ بیان کیا گیا ہے کہ میرے عباسؑ کے بازو کٹ چکے تھے جب وہ زمین پر آیا''۔

یہ بھی انہی مغمومہ مادرِ عباس علیہ السلام کے اشعار ہیں:

یَا مَنْ رَاٰی الْعَبَّاسَ کَرًّا عَلٰی جَمَاهِیْرِ النَّقَدْ
وَ وَرَاهُ مِنْ اَبْنَاءِ حَیْدَرٍ کُلُّ لَیْثٍ ذِیْ لِبَدْ

''اے وہ شخص جس نے عباس علیہ السلام کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر بار بار حملے کرتے دیکھا جبکہ اس کے پیچھے فرزندانِ حیدرِ کرار موجود تھے، جو سب کے سب شیر دلیر تھے''۔

اُنْبِئْتُ اَنَّ بُنَیَّ اُصِیْبَ بِرَاسِهٖ مَقْطُوْعَ یَدْ
وَیْلِیْ عَلٰی شِبْلِیْ اَمَالَ بِرَاسِهٖ ضَرْبَ الْعَمَدْ

''مجھے بتایا گیا ہے کہ میرے بیٹے عباسؑ کے سر پر اس وقت وار کیا گیا جب اس کے ہاتھ کٹ چکے تھے۔ ہائے افسوس! اس وقت گرز کی ضربت نے میرے بیٹے کا سر زخمی کر دیا''۔

''لَوْ کَانَ سَیْفُکَ فِیْ یَدَیْکَ لَمَا دَنٰی مِنْهُ اَحَدٌ''۔

''اگر تیرے ہاتھ سلامت ہوتے اور تیرے ہاتھوں میں تلوار ہوتی تو تیرے قریب کوئی نہ آسکتا۔تیرے ہاتھ کٹ جانے کے بعد تیرے سر پر گرز کی ضربت لگا کر تجھے شہید کیا گیا''۔

کوفہ سے شام تلک منازل کے حالات

پسرِ مرجانہ نے ایک تیز رفتار سواری پر ایک قاصد مدینہ میں شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کی خبر پہنچانے کیلئے روانہ کیا اور دوسرا آدمی شام میں یزید کے پاس خط دے کر بھیجا۔اس خط میں پسرِ مرجانہ نے یزید کو جنگِ کربلا کی فتح کا حال لکھا اور چند امور اس لعین سے دریافت کئے:

''شہدائے کربلا کے سر میرے پاس کوفہ میں محفوظ ہیں۔جو مستورات اور بچے کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ آئے تھے،وہ میرے پاس زندان میں قید ہیں،میرے تیرے حکم کا منتظر ہوں کہ:

۱۔ انہیں سروں سمیت تیرے پاس دمشق بھجوا دوں؟

۲۔ ان عورتوں اور بچوں کو قتل کروا دوں؟

۳۔ انہیں مدینہ واپس بھجوا دوں؟

۴۔ یا انہیں اپنے پاس ہی قید میں رکھوں؟

جس طرح آپ حکم دیں ان کے ساتھ سلوک کیا جائے۔صرف آپ کے ہی حکم کا انتظار ہے''۔

گو کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ ابن زیاد نے بغیر حکم و مشورۂ یزید کے ان قیدیوں کو سروں کے ساتھ دمشق روانہ کر دیا تھا لیکن معتبر اور قابلِ اعتبار روایت یہی ہے کہ اس نے قاصد کے ذریعے پہلے یزید کی طرف سے جواب آنے تک اتنے دن دخترانِ علی ابن ابیطالب علیہم السلام کو انہی کے بابا کے دارالحکومت میں جامع مسجد کے پہلو میں زندان میں مقید رکھا۔

قاصد کی دمشق روانگی کے بعد زندان میں ایک پتھر پھینکا گیا جس کے ساتھ ایک رقعہ موجود تھا اور جس میں لکھا تھا:

''اے اہل بیت حسین علیہم السلام! دخترانِ ابوطالب علیہ السلام! قاصد دمشق بھیج دیا گیا ہے۔آپ کی قسمت کا فیصلہ یزید کے پایۂ تخت دمشق میں ہوگا۔اس قاصد کی واپسی پر اگر آپ نعرۂ تکبیر کی بلند آواز سنیں تو سمجھ لیں کہ آپ کی موت کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اگر نعرۂ تکبیر کی آواز بلند نہ ہو سمجھ لیں کہ آپ کی جانیں بچ گئی ہیں''۔

جتنے دن مدینہ کی شہزادیاں زندان میں قید رہیں،موت کا حیات کے اس فیصلے کا بیقراری اور بے چینی سے انتظار کرتی

رہیں۔ چونکہ یہ شہزادیاں کسی زمانے میں تو شہزادیاں تھیں، لیکن قتل امام حسین علیہ السلام کے بعد یہ اپنے نانا کی اُمت کے ہاتھوں گرفتارِ بلا تھیں۔ اسے کہتے ہیں زمانے کا انقلاب اور تغیر روزگار کہ جن کے در پر ہر قسم کا سائل اپنی مرادیں پاتا تھا، شاہانِ وقت سائل اور ملائکہ آسمان خدام تھے، حورانِ جنت کنیزیں اور اشراف کوفہ کی عورتیں آپؑ سے قرآن اور علوم شریعت سیکھتی تھیں۔ آپؑ اسلام کی معلمات اور امیر المومنین علیہ السلام کی شہزادیاں تھیں اور اب زندان میں موت وحیات کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہیں۔

چنانچہ جب قاصد واپس آیا تو ان بیبیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرنے کی آواز نہ سنی۔ لہٰذا شہزادیاں سمجھ گئیں کہ حاکم ظالم نے انہیں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ البتہ انہیں دمشق روانہ کئے جانے کا انتظام شروع ہو گیا۔

قاصد خط کا جواب لایا جس میں تحریر تھا:

''شہداء کے سر اور خاندانِ رسالت کی مستورات کو قیدی بنا کر میرے پاس دمشق بھجوا دیا جائے''۔

ابن زیاد نے شہداء علیہم السلام کے سروں اور حضرت ابو طالب علیہم السلام کی دختران کو اور بچے ہوئے ان یتیم بچوں کو قیدی کر کے دمشق روانہ کر دیا۔

کوفہ سے روانگی کی تفصیل

ابن زیاد نے سرہائے شہداء ایک جماعت اہل کوفہ کے ساتھ، جس کی تعداد پچاس تھی، زحر ابن قیس کی نگرانی میں شام روانہ کئے اور زحر ابن قیس کے ساتھ ابو بردہ ابن عوف ازدی اور طارق بن ظبیان بھی شامل کر دیئے۔ نیز اسی دن مستورات مخدرات کو مع یتامیٰ کے اونٹوں پر سوار کر کے اور حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے گلے میں طوق ڈال کر ایک ایسے بے پالان اونٹ پر سوار کیا گیا جو کہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا اور لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس طرح حضرت امام علیہ السلام کا بوجہ نقاہت و بیماری پشت شتر سے گرنے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

قیدیوں کے نگران، محفر ابن ثعلبہ عائذی، شمر بن ذی الجوشن، عمرو بن حجاج اور شیث ابن ربعی تھے۔ ایک ہزار سواروں کی جماعت ان کے ساتھ کر دی گئی تھی اور ان کو یہ تاکید بھی کی: ''جلد ہی اس جماعت کے ساتھ مل جانا جو پہلے سرلے کر چلے گئے تھے، تا کہ ایک ہی قافلہ ہو جائے۔ جس شہر سے بھی گزرنا، قیدیوں اور سروں کی خوب تشہیر کرنا۔''

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام اور بنات علیؑ و بتولؑ اس خستہ حالی اور ظلم و تشدد کے ساتھ قیدی بنائے گئے تھے کہ سننے والوں اور دیکھنے والوں کے بدنوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور پتھر کا کلیجہ بھی پگھل جاتا۔

تاریخ دنیا میں لڑائیاں ہوتی رہی ہیں، عورتیں اور مرد بھی قیدی ہوتے رہے، مگر تاریخ عالم کا کوئی ورق کربلا و کوفہ و شام کے تشدد کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ اس بے دردی اور ظلم کے ساتھ کسی لڑائی میں کوئی فریق قتل نہیں ہوا جس طرح حسین علیہ السلام کربلا میں شہید کیے گئے اور نہ ہی اس جور و جفا کے ساتھ کسی مقتول جماعت کے پسماندگان، عورتیں اور بچے قید ہوئے جس طرح اہل بیت فرزند رسولؐ علیہم السلام قید ہوئے۔

یہ سفر کوئی مختصر نہ تھا۔ سفر طویل، منزلیں تھکا دینے والی اور زحر ابن قیس و شمر ملعون جیسے سنگدل اور بے رحم مجسمہ ظلم و ستم کی شدید ترین نگرانی اور ہر کوچہ و مقام پر تشدد اور دھمکیاں ان کی قوت قدسیہ، روحانی طاقت اور مقصد و نصب العین کی عظمت و شرافت میں اور اس شدید امتحان میں ان کی قوت ارادی اور عزم و استقلال کی مضبوطی اور استحکام میں کوئی تزلزل پیدا نہ کر سکیں۔

اسیرانِ بنی ہاشم کی روانگی اور مستوراتِ انصار کی رہائی

کربلا میں بعض انصار اور اصحابِ امام علیہم السلام کے ساتھ ان کی مستورات بھی تھیں جنہیں بعد شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام مخدرات بنی ہاشم کے ساتھ قید کر لیا گیا تھا۔ کوفہ میں بڑے بڑے قبیلوں نے ابن زیاد کی حمایت کی تھی اور انہی قبائل کوفہ کی حمایت کے ساتھ ابن زیاد نے کربلا میں ظاہری کامیابی بھی حاصل کی۔ کوفہ کے وہ سردار جنہیں رفاقت حضرت سید الشہداء علیہ السلام میں درجہ شہادت حاصل ہوا، ان کے ساتھ انہی قبائل کی رشتہ داریاں اور خاندانی قرابتیں بھی تھیں، لہذا اس وقت ان کی مستورات کی قید ان قبائل کوفہ کو گوارا نہ تھی۔

چنانچہ انصار امام حسین علیہ السلام کی خواتین کو ان کے خاندان والوں نے سفارش وغیرہ کے ذریعے کوفہ ہی میں رہا کروا لیا تھا۔ چونکہ وہ کوفہ کی رہنے والیاں تھیں، ان کے خاندان والوں نے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی مستورات کو قیدی دیکھا تو ان کو رنج پہنچا مگر مدینہ کی رہنے والی شہزادیاں بے وارث ہو چکی تھیں اور ان کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ ان میں کچھ رسول اللہؐ کی نواسیاں تھیں، حضرت بتول سلام اللہ علیہا کی بیٹیاں اور پوتیاں تھیں اور حضرت ابوطالب علیہ السلام کی اولاد کی مستورات اور مخدرات تھیں اور ان کا کوئی سفارشی نہ تھا جو ان قیدیوں کو رہائی دلاتا۔

فاضل سماوی نے ''ابصار العین'' میں تحریر کیا ہے کہ بنی ہاشم کے سوا انصار و اصحاب امام حسین علیہم السلام کی جملہ مستورات کو جو کربلا کے بعد بنی ہاشم کی مستورات کے ساتھ قید ہو کر آئی تھیں، اپنے رشتہ داروں اور اہل قرابت کی سفارش سے کوفہ میں ہی قید سے آزاد ہو گئی تھیں اور شام جانے والی صرف خاندان بنی ہاشم کی ہی مخدرات طاہرہ تھیں۔ جو مدینہ سے ہمراہ امام حسین علیہ السلام کربلا میں وارد ہوئی تھیں۔ اسی طرح ''وقائع ایام محرم'' میں بھی منقول ہے۔

صعوبت سفر

کوفہ سے شام تک ایک طویل سفر اور دراز مسافت تھی۔ راستے میں کئی منزلیں آئیں۔ کسی منزل کو چلتے چلتے عبور کیا گیا اور کسی منزل پر قیام اختیار کیا گیا۔ اتنے بڑے اور لمبے سفر میں ان سنگدل نگرانوں نے کسی مقام پر اہل بیت رسول علیہم السلام کے ساتھ نرم سلوک نہیں کیا۔ جہاں زنجیروں اور بیڑیوں کی اذیت اور ننگے اور طویل سفر کی تکلیف تھی، وہیں اس سے بڑھ کر تکلیف دہ ان ظالموں اور اشقیاء کا مستورات اور یتامیٰ کے ساتھ پُر تشدد رویہ تھا۔ ہر کوچہ و مقام پر یہ ملعون ان مجبور اور معصوم شہزادیوں پر سختیاں کرتے۔

شمر ملعون، زحر بن قیس، ایسے سنگدل ملاعین تھے جنہوں نے سارے راستے ان بے وارث قیدیوں کو ستایا اور اذیتیں دیں۔ اہل بیتؑ کے معصوم ان کی منحوس شکلوں اور کریہہ آوازوں اور سختیوں سے شدید گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر یہ بچے سہم جاتے، ان کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلتی اور فلک ستائی مظلوم بیبیاں خاموش رہ جاتیں۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام تو ساری راہ تازیانے کھاتے گئے۔ خاموشی سے اتنا لمبا سفر طے کیا اور ان لعینوں سے شام تک کوئی بات نہ کی اور صبر کے تلخ گھونٹ پیتے رہے۔

دیوار سے ایک ہاتھ کا برآمد ہونا

جب قیدیوں کا قافلہ کوفہ سے روانہ ہوا تو اس سفر کی پہلی منزل پر قیام کیا۔ وہ منزل غیر آباد تھی۔ انہوں نے سرِ اقدس کو صندوقوں سے نکالا اور اپنے سامنے رکھ لیا۔ ان حاملانِ سرِ مطہر کا یہ دستور تھا کہ دورانِ سفر سروں کو صندوں میں بند رکھتے اور جب کسی مقام پر قیام کرتے تو صندوق کھول کر سرِ اقدس کو سامنے رکھ لیتے، کسی دیوار یا پتھر پر رکھ دیتے۔ کبھی اگر دورانِ سفر یہ لوگ اپنے آپ کو خطرے سے خالی پاتے اور اہلیانِ شہر کو ابن زیاد اور یزید کا مطیع دیکھتے تو اس وقت سرِ اطہر کو نیزے پر سوار کر کے شہر میں پھراتے۔

اس منزل پر انہوں نے امام علیہ السلام کے سرِ اقدس کو اپنے سامنے رکھا اور خود شراب خوری میں مشغول ہو گئے اور مسرّت و شادمانی کا اظہار کرنے لگے کہ یکایک سامنے والی دیوار پر ایک ہاتھ نمودار ہوا جس نے لوہے کے قلم کے ساتھ دیوار پر یہ شعر تحریر کیا:

اَتَرْجُوْا اُمَّۃٌ قَتَلَتْ حُسَیْنًا

شَفَاعَۃَ جَدِّہٖ یَوْمَ الْحِسَابِ

''کیا وہ اُمت جس نے قتل حسین علیہ السلام کے عظیم ظلم کا ارتکاب کیا، قیامت کے دن اسی حسین علیہ السلام کے نانا کی شفاعت کی امید رکھتی ہے؟''

یہ اشقیاء اس واقعے سے اس قدر گھبرائے اور خوف زدہ ہوئے کہ اس مقام پر انہوں نے اپنا قیام ملتوی کر دیا اور جلدی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

انبیاء و ملائکہ کا سرِ امام حسینؑ کے پاس آنا

ابن لہیعہ ایک محدث اور قاضی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے میں خانۂ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جو با آواز بلند کہہ رہا تھا:

''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَمَا اَرَاکَ فَاعِلاً''۔

''اے اللہ! مجھے بخش دے! لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تو مجھے نہیں بخشے گا''۔

ابن لہیعہ نے کہا:

''یَا عَبْدَ اللّٰهِ اِتَّقِ اللّٰهِ وَلَا تَقُلْ مِثْلَ ذَالِکَ''۔

''اے بندۂ خدا! اللہ سے ڈر اور ایسی بات نہ کر کیونکہ اگر تیرے گناہ بارش کے قطروں اور درختوں کے پتوں کے برابر بھی ہوں گے اور خدا سے مغفرت کا طالب ہو تو وہ تجھے بخش دے گا، کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے''۔

یہ شقی لہیعہ کی بات سن کر اس کو ایک طرف لے گیا اور کہا: ''میرے قریب آ! میں تجھے اپنے گناہ کا قصہ سناتا ہوں''۔

ابن لہیعہ اس کے قریب گیا اور اس شقی نے اپنا واقعہ یوں سنایا:

ہم پچاس آدمی تھے جو بعد از شہادت امام حسینؑ، ان کا سر مبارک لے کر کوفہ سے دمشق روانہ ہوئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ رات کے وقت سر مبارک کو ایک صندوق میں بند کر کے میرے ساتھی شراب نوشی میں مشغول ہو گئے۔ اس رات میں نے شراب نہیں پی تھی، لیکن میرے سارے ساتھی شراب کے نشے میں بدمست تھے۔

جب رات کی تاریکی چھا گئی اور اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے بجلی کے چمکنے اور کڑکنے کی آواز سنی اور دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں اور حضرت آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان سے زمین پر تشریف لائے اور ان کے ساتھ جبرئیلؑ اور دوسرے بہت سے فرشتے بھی تھے۔

جبرئیلؑ نے صندوق کا قفل کھولا، سر مبارک کو باہر نکالا، اس سر کو اپنے سینہ اور مقامِ قلب و جگر کے ساتھ مس کیا اور بوسہ لیا۔ اس کے بعد ان انبیاء علیہم السلام نے بھی، جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ آسمان سے زمین پر آئے تھے، باری باری اس سرِ اقدس کو اپنے سینوں کے ساتھ لگایا، بوسے لئے اور بہت گریہ کیا۔

ان کے بعد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سرِ مبارک کو گود میں لیا۔ آپؐ سرِ اقدس کے بوسے بھی لیتے تھے اور روتے بھی تھے۔ انبیاء آپ کو تعزیت پیش کرتے تھے اور رو رو کر فرزند کا پرسہ دیتے تھے۔ حضورؐ اکرم وارثِ ماتمِ حسینؑ تھے۔ درمیان امام حسین علیہ السلام کا سر تھا اور آس پاس اولوالعزم پیغمبر گریہ کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت جبرئیلؑ نے حضورؐ اکرم کی خدمت میں عرض کیا:

"اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَمَرَنِیْ اَنْ اُطِیْعَکَ فِیْ اُمَّتِکَ فَاِنْ اَمَرْتَنِیْ زَلْزَلْتُ بِهِمُ الْاَرْضَ وَ جَعَلْتُ عَالِیَهَا سَافِلَهَا کَمَا فَعَلْتُ بِقَوْمِ لُوْطٍ".

"یا رسولؐ اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت کے بارے میں آپؐ کے حکم کی تعمیل بجالاؤں۔ اگر آپؐ مجھے حکم دیں تو ان ظالموں اور ملاعین پر زمین کو اُلٹ دوں اور ان کو ایسے ہلاک و برباد کردوں جس طرح کہ میں نے قومِ لوط کے ساتھ کیا تھا؟"

حضورؐ نے یہ سن کر جواب میں فرمایا:

"فَاِنَّ لَهُمْ مِنِّیْ مَوْقِفاً بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ تَعَالٰی اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ".

"جبرئیلؑ! ایسا نہ کرنا۔ میں ظالموں کے بارے میں اپنا حساب کتاب قیامت کے دن پیش کروں گا"۔

اس کے بعد وہ فرشتے ہمیں قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ میں نے کہا:

"اَلْاَمَانُ اَلْاَمَانُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ".

"یا رسولؐ اللہ! امان دیجئے"۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

"اِذْهَبْ فَلَا غَفَرَ اللّٰهُ لَکَ!"

"جا! دور ہو جا! خدا تجھے کبھی نہ بخشے!"

یہ قصہ بیان کرنے کے بعد اس شخص نے کہا کہ اس صورت میں کیا مجھے بخشش کی کوئی اُمید ہو سکتی ہے؟

قطرۂ خون کا کرشمہ

جب حاملانِ سرِاقدس موصل کے قریب پہنچے توان اشقیاء نے حاکم موصل کو کہلا بھیجا کہ وہ ان کے قافلہ کیلئے اور قافلہ کی سواریوں کیلئے کھانے پینے اور چارے کا انتظام کرے اور رہائش کا بندوبست کرے۔ یہ لوگ جب بڑے شہروں کے پاس آتے تو حاکم شہر کو رہائش اور خورد ونوش کیلئے ایسا ہی پیغام بھیجا کرتے۔ چنانچہ حاکم شہر نے تو ان کی درخواست منظور کرلی مگر موصل شہر کے لوگوں نے ان بدذات لوگوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انہیں شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔

چنانچہ ان لوگوں نے شہر سے باہر ایک فرسخ دور ایک پہاڑ کے دامن میں قیام کیا۔ حاکمِ شہر نے ان کے لیے طعام اور دوسری ضروریات شہر کے باہر ان کے قیام کے پاس بھجوا دیئے۔ خاندانِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مستورات اور قیدی بچوں نے بھی وہیں قیام فرمایا کیونکہ جہاں نگرانوں کا قیام ہوتا ہے، وہیں ان کے پابند قیدیوں کو رہنا پڑتا ہے۔ مگر جو آرام وسکون اور سامانِ خورد ونوش یہ شقی اپنے لئے مہیا کرتے، مستوراتِ آلِ محمدؑ علیہم السلام اور یتیمانِ خاندانِ رسالت ان سہولتوں سے محروم رہتے۔ یہ شقی ان ذواتِ مقدسہ سے وہی سلوک روا رکھتے جو عام قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

اس جگہ امام حسین علیہ السلام کا سرمبارک انہوں نے ایک پتھر پر رکھا۔ آپؑ کے سرِاقدس کے خون کا ایک قطرہ پتھر پر گرا۔ اس وقت قافلہ تو وہاں سے چلا گیا لیکن اس خونِ اطہر کا وہ قطرہ اپنا اثر دکھا گیا اور اس کے بعد ہر سال یومِ عاشور اس مقام پر خون جوش مار کر اُبلتا تھا۔

مظلوم کے خون نے گرد ونواح کے لوگوں کے دل مائل بہ ماتم کردیئے۔ لوگوں پر شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی حقیقت آشکار ہوگئی۔ لوگ اس قطرۂ خون کا اعجاز دیکھنے کے لیے آتے، دل کھول کر گریہ وبکاء کرتے، ماتم ومراسمِ عزا بجا لاتے اور حضرت سیدۃ الزہراء سلام اللہ علیہا، مادرِ حسین علیہ السلام کو کربلا کے ان شہداء کا پرسہ دیتے۔ یہ سلسلہ یوں ہی سالوں جاری رہا اور اس مقام کو ایک عزاء خانے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

بعد میں آنے والے ایک حاکم عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ حکومت میں وہ پتھر اس جگہ سے نکلوا کر کہیں اور غائب کروا دیا۔ وہ خون کا جوش مار کر اُبلنا تو موقوف ہوگیا کیونکہ پتھر غائب کردیا گیا تھا، مگر عزاداری قائم رہی اور وہاں عزاداروں نے ایک گنبد قائم کردیا جو ''مشہد النقطہ'' کے نام سے مشہور ہے۔

سرِ امام حسینؑ کا دیر راہب میں اعجاز

کتاب ''الدمعۃ الساکبہ'' اور بعض دوسری کتب مقاتل میں ابوسعد شامی سے مروی ہے اور وہ بیان کرتا ہے:

میں ان لوگوں کے ہمراہ تھا جو ابن زیاد کے حکم سے شہدائے کربلا علیہم السلام کے سر اور مستورات بنی ہاشم و بچوں کو قیدی کر کے شام لے جا رہے تھے۔ یہ لوگ جب ایک راہب نصرانی کی عبادتگاہ کے پاس پہنچے تو انہیں خبر دی گئی کہ ایک شخص جس کا نام "نصر خزاعی" نے ایک لشکر جمع کیا ہے اور ارادہ رکھتا ہے تم پر رات کے وقت حملہ کر کے تم سے شہداء کے سرہائے مقدس اور اسیران آل محمد علیہم السلام کو چھین لے۔

اس خبر سے ملاعین قافلہ میں اضطراب پیدا ہو گیا اور انہوں نے دیر نصرانی (نصرانی کی عبادت گاہ) میں رات کے وقت پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ دَیر مضبوط تھا اور حملہ سے محفوظ تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیر کے راہب سے درخواست کی کہ رات کو اپنے گرجا میں گزارنے کی اجازت دے۔ اس نے جواب دیا:

"میرے عبادت خانے میں اتنے آدمیوں کی گنجائش نہیں۔ اگر تمہیں حملے کا خطرہ ہے اور قیدیوں اور سروں کے چھن جانے کا ڈر ہے تو اسیروں اور سروں کو میں اپنے دیر میں جگہ دیتا ہوں اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لیتا ہوں۔ اگر حملہ آور آ جائیں تو تم ان سے لڑنا اور قیدیوں اور سروں کی طرف سے مطمئن رہنا، وہ محفوظ رہیں گے"۔

راہب کی اس تجویز کو ملاعین نے قبول کر لیا اور خود دَیر کے باہر رہے اور سرہائے شہدائے کربلا علیہم السلام اور اسیران بنی ہاشم کو دَیر میں چھپا دیا گیا۔ سید الشہداء علیہ السلام کا سر اقدس ایک صندوق میں بند تھا۔

وہ راہب بیان کرتا ہے کہ جب رات اچھی طرح چھا گئی اور اندھیرا اچھی طرح پھیل گیا، شب کافی گزر چکی تھی، میں حیرانی میں ڈوبا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ قیدی کون ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہ سر کن لوگوں کے ہیں؟ کیا ان قیدیوں کے کئی وارث نہیں؟ ان سروں کے کوئی مالک نہیں؟ کہ ان سروں کو بدنوں کے ساتھ دفن کر دیتے، ان قیدیوں کو رہا کروا لیتے، کیا یہ بے وارث ہیں؟ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اس نے روشن دان میں سے اس صندوق پر نظر ڈالی۔

کیا دیکھتا ہے کہ جس کمرے میں وہ صندوق پڑا تھا اس میں بغیر چراغ کے روشنی ہے اور بغیر ہی کسی قندیل کے وہ کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس صندوق سے نور کی شعاعیں بلند ہو رہی ہیں۔ یہ ایک انوکھا واقعہ تھا اور اس کے فہم و ادراک سے بلند تھا۔ وہ حیران کھڑا دیکھتا رہ گیا اور قدرت کے کرشمے پر تعجب کرتا رہ گیا۔

اتنے میں اس کمرے کی چھت شگافتہ ہوئی، ایک نورانی عماری نازل ہوئی جس میں چند مستورات تھیں، پھر اچانک آواز آئی:

"اُطْرُقُوا وَلَا تَنْظُرُوا".

"سر جھکالو اور نظریں نیچی کرلو اور مت دیکھو!"

میں نے سر جھکالیا اور اپنی نظریں وہاں سے ہٹالیں۔ میں کافی دیر تک ان عورتوں کے رونے کی آوازیں سنتا رہا۔ ہر عورت نے سر کو گود میں لیا اور اس کے بوسے لے کر گریہ و بکاء کیا۔ آخر میں ایک مستور نے ایسی دردناک آواز میں کچھ اس قسم کے بین کئے کہ میرے عبادت خانے کی دیواریں لرز اٹھیں۔ فضا سوگوار معلوم ہوئی۔ ایسے ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بی بی اس مظلوم سر کی والدہ ہے اور اس کا بیٹا جیسے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہو۔ وہ بیبیاں ماتم و گریہ کر کے چلی گئیں۔

نصرانی اب اس کمرے میں خود داخل ہوا۔ آخر پڑھا لکھا تھا، سمجھ گیا کہ یہ کسی مقدس اور بزرگ انسان کا سر ہے۔ نبی ہے یا ولی ہے۔ اس نے صندوق کا قفل کھولا اور سر اقدس کو باہر نکالا۔ اس سر اقدس کو عزت و احترام سے غسل دیا، کافور سے حنوط کیا، خوشبو لگائی اور سامنے رکھ کر دوزانو بیٹھا اور اس طرح اس سر سے گفتگو کی، فرطِ محبت اور شدتِ درد والم سے آنسو بہا کر کہنے لگا:

"تو کسی کریم ہستی کا سر ہے! اے کریم مجھے بتا تو کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو کوئی شہیدِ راہِ حق ہے۔ تو ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا ہے جن کی مدح خدا نے تورات و انجیل میں کی۔ تو روحانی منزلت اور ربانی قوت کا مالک معلوم ہوتا ہے، جس پر نسائے آسمان اتر کر ماتم کریں۔ تو یقیناً عظیم الشان انسان ہے، مجھے اپنا تعارف تو کروا۔ اتفاق سے آج تو میرا مہمان ہوا، تو نے مجھے شرف میزبانی بخشا، اے شہید! اے مہمان! مجھے اپنے نام و مقام سے آگاہ تو فرما"۔

راہب کا بیان ہے کہ وہ سر مقدس خدا کی قدرت سے اس طرح گویا ہوا:

"اَنَـا الْمَظْلُوْم اَنَا المهموم انا الذی بسیف العدوان و الظلم قتلت. انا الذی یحرب اهل البغی ظلمت".

نصرانی نے کہا: "آپؑ پر بڑا ظلم ہوا۔ بیشک آپؑ مظلوم ہیں۔ اپنا نام و نسب تو بیان کیجئے"۔

سر اقدس سے جواب آیا:

"انـا ابـن مـحمدٍنالمصطفیٰ انا ابن علیٍّ المرتضی انا ابن فاطمة الزّهراءً انا ابن خدیجةُ الکبریٰ انا شهید کربلا انا قتیل کربلا انا الحسیْنُ بن علیٍّ".

نصرانی پہچان گیا کہ یہ نواسہ رسولؐ اور فرزندِ بتول سلام اللہ علیہا کا ہی سر اقدس ہے جو معرکہ کربلا میں شہید ہوا۔ اس راہب نے اپنے تمام شاگردوں اور اپنے اہل مذہب کو اکٹھا کیا، واقعہ بیان کیا اور سرِ اقدس کی کرامت اور نواسہ رسولؐ کی شہادت

پر گریہ وفغاں کیا۔ اس نصرانی پر اور اس کے تمام اہل مذہب پر سرِ حضرت امام حسین علیہ السلام کی کریمی سے دین حق کی حقانیت ظاہر ہوگئی، انہوں نے کلمات شہادت ادا کئے اور وہ عیسائیت ترک کر کے دین اسلام میں داخل ہو گئے۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا، سروں سے پگڑیاں اتار دیں، لباس چاک کئے، با آواز بلند گریہ وبکاء کیا اور رسولؐ کے مظلوم فرزند پر ماتم کیا۔ پہلے یہ عیسائیوں کا عبادت خانہ تھا، اب وہ بتولؑ کے لعل کا عزاخانہ بن گیا۔ اس طرح اس عظیم شہید جادۂ حق کے سر کی کرامت سے عیسائیوں کا ایک بہت بڑا عالم اپنے شاگردوں اور ماننے والوں سمیت دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا اور بتولؑ کے فرزند کا ماتم دار بن گیا۔

اظہارِ اطاعت و اظہارِ نفرت

چونکہ یہ سفر طویل تھا اور راستے میں کئی منازل پر قیام ہوتا تھا۔ سپاہِ ابن زیاد کا دستور تھا کہ جب بھی کسی بڑے شہر کے قریب پہنچتے تو اس کے حاکم کو کہلوا بھیجتے کہ ہم تیرے شہر میں قیام کریں گے، تو ہمارے کھانے اور رہائش کا انتظام کر نیز ہماری سواریوں کے چارے اور دانے کا بھی انتظام کر۔ ہم ابن زیاد کے آدمی ہیں۔ ہم نے کربلا کی جنگ فتح کی ہے، مخالفین مارے گئے ہیں، ان کی پسماندہ عورتیں اور ان کے معصوم یتیم بچے ہماری قید میں ہیں، چنانچہ یہ قیدی اور مقتولین کے سر ہم یزید کے پاس شام لے جا رہے ہیں، اس واسطے ہمارے لئے شب باشی کا انتظام کر"۔

مختلف شہروں میں مختلف ردِّعمل کا اظہار کیا گیا۔ بعض بے ضمیر حکام اور شہریوں نے فوجِ یزید کا خیر مقدم کیا، ان کا خوشی ومسرّت وشان وعزت کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ یزید کی خوشی میں اپنی خوشی ملا کر اس سے محبت واطاعت کا اظہار کیا نیز خوشامد، دنیا پرستی اور یزیدی ہوا خواہی کا ثبوت دیا۔

بعض اہلِ دل وغیور شہریوں نے ان شقی وبے دین لشکریوں سے اظہارِ نفرت کیا، ان کے ظالمانہ افعال اور کردار اور کافرانہ اقدامات کی ان کے سامنے مذمت کی۔ جونہی انہوں نے قیدی مستورات اور سرہائے شہدائے کربلا علیہم السلام کو دیکھا تو خاندانِ محمدؐ پر درود وسلام بھیجا اور ملاعین کوفہ وشام پر لعنت بھیجی۔ ہم ان کا شہروں کا مختصر حال قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

۱۔ تکریت

تکریت حاکم نے اطلاع ملتے ہی خوشی کے شادیانے بجائے، جھنڈے فضا میں لہرائے، بازار سجائے۔ ہر بستی اور ہر قبیلے کے مردوں کو اکٹھا کیا اور ایک بھاری جمعیت کے ساتھ سردارانِ فوجِ ابن زیاد ملعون کا استقبال کیا۔ ان کی خاطر وتواضع کی

کہ یہ یزید کو میری اطاعت گزاری کا حال پیش کریں اور یزید ملعون خوش ہو کر مجھے انعام دے۔

اگر کوئی آدمی ان سے پوچھ لیتا کہ یہ کن لوگوں کے سر ہیں اور یہ کس ملک کے قیدی ہیں؟ تو یہ ملاعین جواب دیتے:

''ایک خارجی نے حکومت وقت یزید سے بغاوت کی تھی اور وہ قتل کیا گیا۔ یہ اس باغی اور اس کے ساتھیوں کے سر ہیں اور یہ قیدی اس کے خاندان کی عورتیں اور بچے ہیں''۔

جب ملاعین کا یہ لشکر تکریت میں یہ افواہیں اور الزامات کاذبہ بیان کر رہے تھے اور ایک نصرانی یہ باتیں سن رہا تھا تو اس نے کہا:

''میں اس وقت کوفہ میں موجود تھا جب یہ سر اور قیدی کوفہ میں وارد ہوئے۔ میں نے تحقیق کی ہے یہ غلط کہہ رہے ہیں کہ یہ کسی باغی کا سر ہے۔ یہ حسین بن علی علیہم السلام کا سر ہے جو نواسۂ نبیؐ اور فرزندِ علیؑ و بتولؑ ہیں۔ مسلمانو! جس پیغمبر کا تم کلمہ پڑھتے ہو یہ اسی کا نواسہ ہے!''

جب نصرانیوں نے حقیقتِ حال سنی تو انہوں نے ناقوس بجا کر اپنی قوم کو اکٹھا کیا اور اپنے عبادت خانے بھی بند کر دیئے اور کہا:

''اے ہمارے اللہ! اے ہمارے معبود اور پروردگار! ہم اس قوم سے بری ہیں جو اپنے ہی نبیؐ اور رسولؐ کی ذریت کے مردوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کرتے ہیں''۔

۲۔ عسقلان

جب یہ قافلہ شہر عسقلان کے قریب پہنچا تو انہوں نے امیر عسقلان کو اطلاع دی جس کا نام یعقوب عسقلانی تھا۔ عسقلان کے امیر نے زیبائش شہر کا حکم دیا اور طنبور اور آلاتِ لہو ولعب بجانے اور خوشی و مسرت کے نغمے گانے اور کامیابی اور جشن منانے کا حکم دیا۔ حسب حکم خوشیاں ہونے لگیں، زن و مرد اکٹھے ہونے لگے اور شراب خوری کا دور چلا۔

معلوم ہونا چاہئے کہ جب بھی کوئی کمینہ اپنی مسرّت کا اظہار کرتا ہے تو شراب نوشی، لہو ولعب اور افعالِ شنیعہ نیز فحش و منکر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ فاسق و فاجر لوگ ہر منزل پر اسی قسم کی خوشیاں مناتے تھے۔ ایک تاجر شخص، جس کا نام وزیر الخزاعی تھا، نے یہ اجتماع دیکھا اور جب یہ عجیب و غریب حالات اس کے سامنے آئے تو اس نے جشن و مسرت اور خوشی کا سبب دریافت کیا تو اسے جواب ملا کہ باغی مارا گیا ہے اور اس کا اور اس کے ساتھیوں کے سر ہیں اور اس کا کنبہ قیدی ہے۔

نام دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام حسینؑ ہے۔ ماں فاطمہ زہراؑ ہیں، بھائی حسنؑ مجتبیٰ، بابا علیؑ المرتضیٰ اور نانا محمد مصطفیٰؐ ہیں۔

یہ سنناتھا کہ وزیر الخزاعی کی نظر میں دنیا تاریک ہوگئی اور اس کے بدن کا بند بند کانپنے لگا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ خاندانِ پیغمبرؐ اُجڑ گیا اور جنابِ زہراؑ کا گھر ویران ہوگیا، قیدیوں کے پاس آہ و بکاء کرتا ہوا آیا۔ حضرت سجاد علیہ السلام کو نظر آیا۔

مولاؑ نے فرمایا: ''اے بندۂ خدا! ساری دنیا خوش ہے اور تو رو رہا ہے؟ لوگ مسرور ہیں اور تو محزون ہے؟''

(جب ان صبر آزما سفروں، دکھ بھری منزلوں اور دشوار گزار راہوں میں کوئی غمگین اور سوگوار نظر آتا تو آپؑ اس سے محبت کا اظہار فرماتے اور آپؑ کے دل کے غموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا۔ وہ پرسہ اور تعزیت ادا کرتا اور آپؑ آنسو بہا کر دل کو راحت دیتے)۔

وزیر الخزاعی نے جواب دیا: ''مولاؑ! مجھے اس خبر سے عظیم صدمہ پہنچا ہے، میرا جگر پھٹ گیا ہے:

''هَلْ لَکَ حَاجَةٌ؟''

مولاؑ! کوئی حاجت بیان کیجئے تا کہ اس حالتِ اسیری اور عالمِ غربت میں میں آپؑ کی کوئی خدمت کر سکوں''۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: ''تیرے دل میں ہماری معرفت اور محبت معلوم ہوتی ہے۔ اتنا کر کہ جس کے ہاتھ میں میرے بابا کا سر ہے، اسے کہہ دے کہ اس سر کو اور سر ہائے شہداء کو ہماری مستورات کے آگے آگے رکھے، تا کہ لوگ ان سروں کا تماشہ دیکھنے میں مصروف رہیں اور ہماری مستورات ان تماشہ بین لوگوں کی نظروں سے بچ سکیں''۔

وزیر الخزاعی نے حامل راس کو کچھ درہم و دینار دیئے اور اس سر کو آگے بھجوا دیا۔ اوباش لوگ سروں کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور مخدراتِ اہل بیت علیہم السلام اس کربناک صورتحال سے کسی قدر محفوظ ہو گئیں۔

اس کے بعد وہ مومن و مولائی حضرتِ امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

''مولاؑ! کوئی اور خدمت؟''

امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر تیرے پاس کچھ چادریں ہوں تو ہماری مستورات کو سر ڈھانپنے کیلئے لا دے۔''

اس مردِ مومن، الخزاعی نے ہر مستور کیلئے چادر اور امام علیہ السلام کیلئے عمامہ پیش کیا۔ اتنے میں بازار میں ایک شور و غل بلند ہوا۔ اس کی نظر شمر لعین پر پڑی۔ اس نے شمر لعین کے گھوڑے کی باگ میں ہاتھ ڈال کر کہا:

''ظالم! تجھے کچھ خوفِ خدا نہیں؟ تو نے کس کا سر نیزے پر اٹھایا ہوا ہے؟ یہ کس کی مستورات ہیں جنہیں بے پالان

کے اونٹوں پر قیدی بنا کر بازار میں پھرا رہا ہے؟ خدا تجھے اندھا کرے اور تیرے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ تجھے کچھ شرم نہیں؟"

یہ سنناتھا کہ شمرلعین آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے اپنی فوج کے آدمیوں کو پکارا جنہوں نے اس مومن مولائی کو اس قدر مارا کہ وہ شدت ضرب سے بیہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ بیہوشی کے عالم میں پڑا رہا۔ ظالموں نے سمجھا کہ شہید ہوگیا ہے۔ قافلہ چلا گیا اور یہ مضروب وزخمی مومن ہوش میں آیا۔ جب رات ہوگئی اور اندھیرا چھا گیا تو یہ مومن اٹھتا بیٹھتا وہاں سے روانہ ہوا۔ کبھی گھٹنوں کے بل چلتا، کبھی زمین پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھتا۔ آخر یہ ایک مسجد میں پہنچا جسے مسجد سلیمانِ النبی کہا جاتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ سر برہنہ، گریبان چاک، قلب فگار و با دیدۂ اشکبار ماتم کر رہے ہیں۔

وزیر الخزاعی نے پوچھا کہ لوگ تو خوشیاں منا رہے ہیں اور تم لوگ مصروف ماتم ہو؟ انہوں نے کہا کہ اگر تو ہم میں سے ہے تو ہمارے ساتھ شریک ماتم اور شامل گریہ وبکاء ہو جا۔ وزیر الخزاعی نے اپنا دردناک قصہ بیان کیا۔ یہ حسینؑ مظلوم اور اہل بیت علیہم السلام کی مصیبت پر روتے رہے اور یہ مردِ مومن ان کے ساتھ شامل گریہ وبکاء رہا۔

مخفی نہ رہے کہ شام کے راستے میں جتنے بھی بڑے شہر آئے، ان ظالموں نے سرہائے شہدائے کربلا علیہم السلام اور مستوراتِ عصمت علیہم السلام کو بازاروں میں تشہیر کیلئے گزارا اور خانوادۂ اہل بیتؑ کا دل دکھانے کے لیے ان شہروں کو سجایا اور فتح اور جشن منائے گئے۔ یہ تو مسلمانوں کی حالت تھی جبکہ راستے میں جتنے بھی عیسائیوں کے دَیر (عبادت گاہیں) آئے اور نصرانیوں کی بستیاں آئیں، انہوں نے خاندانِ رسالت کے ساتھ سچی ہمدردی ظاہر کی۔ کئی ایک راہب کراماتِ سرِ اقدس کو دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔ چونکہ شام میں عیسائیوں کی کافی آبادی تھی، کئی ایک بستیاں اور عبادت خانے تھے، اسی واسطے صرف ایک راہب کا قصہ نہیں بلکہ کئی راہبوں کے واقعات ملتے ہیں جنہوں نے اہل بیتؑ رسولؐ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں اور عزت وتکریم کی۔ مگر مسلمانوں نے پتھروں، طعنوں اور زبان درازی سے سادات کا استقبال کیا۔

راھب کا واقعہ

الخصائص میں مذکور ہے کہ جب ملاعین نے ایک منزل پر قیام کیا تو انہوں نے سر مقدس کو نیزے پر سوار کر کے ایک دَیر کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جب رات کافی گزر گئی اور پہریداروں کے سوا سب لوگ سو گئے تو ایک راہب نے دیکھا کہ سر مقدس سے نور کی شعاعیں پھوٹ کر آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں اور سر اقدس سے تسبیح وتہلیل کی آواز آ رہی ہے اور غیب سے کوئی شخص پکار رہا ہے:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ".

وہ راہب یہ عجیب وغریب منظر دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے جھانک کر پہریداروں سے دریافت کیا: ''تم کون لوگ ہو اور یہ سر مبارک کس ہستی کا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا: ''ہم ابن زیاد، عاملِ کوفہ کے آدمی ہیں اور یہ سر لے کر دمشق میں یزید کے پاس جا رہے ہیں۔ یہ سر حسین علی علیہم السلام کا ہے، جن کے نانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور والدہ فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا ہیں''۔

راہب نے پوچھا: ''اسی محمد مصطفیٰ کا نواسہ ہے جو تمہارا پیغمبر ہے اور جس کا تم لوگ کلمہ پڑھتے ہو؟''

انہوں نے جواب دیا: ''ہاں وہی!'' راہب نے کہا:

''بِئْسَ الْقَوْمُ اَنْتُمْ لَوْ كَانَ لِلْمَسِيْحِ وَلَدٌ لَاَسْكَنَّاهُ عَلٰى اَحْدَاقِنَا''۔

''تم بہت ہی بری قوم ہو۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی فرزند ہوتا تو ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے''۔

اس کے بعد اس راہب نے مزید کہا: ''اس مقدس ہستی کے قتل ہی کی وجہ سے آسمان خون برساتا رہا اور یہ سر کسی نبی یا وصی کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سر صبح تک کیلئے مجھے دے دو اور اس کے بدلے دس ہزار درہم مجھ سے لے لو اور جب تم صبح کوچ کرنے لگو تو یہ سر مجھ سے لے لینا''۔

انہوں نے راہب کی پیشکش قبول کر لی۔ راہب نے سر تحویل میں لے کر اسے غسل دیا، خوشبو لگائی اور اپنی گود میں رکھ کر ساری رات روتا رہا۔ جب صبح نمودار ہوئی تو اس نے سر اقدس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے مقدس ومطہر سر! اس وقت میں سوائے اپنی ذات کے کسی شے کا مالک نہیں۔ میں تیری کرامات اور راہِ حق میں تیری اس طرح شہادت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتا ہوں''۔

پھر اس نے کلمۂ شہادتین پڑھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے جد امجد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ میں آپ کا غلام ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے سر ان لوگوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنا ڈیرہ چھوڑ کر پہاڑوں میں چلا گیا اور وہیں عبادت کرتے کرتے راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔

جب یہ ملاعین دمشق کے قریب پہنچے تو کہا: ''لاؤ! وہ مال جو راہب سے ملا تھا باہم تقسیم کر لیں۔'' جب درہم و دینار کی تھیلیاں کھولی گئیں تو دیکھا کہ وہ درہم ٹھیکریاں بن چکے ہیں جن کی ایک جانب:

''لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُوْنَ''۔

اور دوسری طرف:

"وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ".

تحریر تھا۔

منزلِ حمص

حمص شام کے راستے میں ایک شہر کا نام ہے۔ اس کے حاکم کو اطلاع دی گئی، جس کا نام خالد بن نشیط تھا۔ اس نے شہر کی آئینہ بندی کروائی، جھنڈے بلند کیے، لوگوں کو جمع کیا اور استقبال کے لیے شہر سے تین میل آگے بڑھا۔ جب یہ قافلہ شہر کے دروازے پر پہنچا اور عام لوگوں کو حقیقتِ حال معلوم ہوئی اور انہوں نے جب اہل بیتِ رسولؐ علیہم السلام کی اس زبوں حالی کو دیکھا تو انہوں نے اس بے دین فوج اور لشکرِ اشقیاء کی مزاحمت شروع کر دی اور ان ناپاک لوگوں کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اسی کشاکشی میں کچھ لڑائی بھی ہوئی اور ابن زیاد کے کچھ سوار مارے بھی گئے۔ لوگوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ابن زیاد کی فوج کی طرف رخ کر کے کہا:

"اَکُفْرٌ بَعْدَ اِیْمَانٍ اُمْ ضَلَالٌ بَعْدَ هُدیً".

"یہ ایمان کے بعد کفر ہے یا ہدایت کے بعد گمراہی؟"

آخر کار یہ ملاعین رسوا ہو کر وہاں سے چلے گئے۔

بعلبك

اس شہر کے حاکم نے بھی یزیدی ہوا خواہ ہونے کا ثبوت دیا اور پورا شہر سجایا، خوشیاں منائیں اور چھ میل شہر سے دوران ملاعین کا استقبال کیا اور عمدہ قسم کے کھانے اور تحائف ان کو پیش کیے۔ حضرتِ امِّ کلثومؑ نے ان کے حق میں بددعا کی:

"خدایا! ان کی کثرت کو ہلاک کر، ان کی آبادی کو برباد کر، ان کے پانی کو میٹھا نہ کر اور یہ لوگ ہمیشہ کیلئے ظلم و جور میں جتلا رہیں"۔

نصیبین

اس شہر کا حاکم منصور بن الیاس تھا۔ اس نے اطلاع ملتے ہی شہر کو سجایا اور ہر قسم کی مسرت کے اظہار کا حکم دیا۔ جب حامل سر اقدس شہر میں داخل ہونے لگا تو اس کے گھوڑے نے شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے دوسرا گھوڑا تبدیل کیا لیکن اس نے بھی شہر میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی اثناء میں سر مبارک نیزے سے زمین پر آیا۔ ایک شخص، ابراہیم موصلی

نے بڑھ اس سر مبارک کو اُٹھا لیا۔ جب اس نے توجہ سے دیکھا تو اس نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو پہچان لیا۔ اس نے ان ظالم بے دینوں کو لعنت ملامت کرنا شروع کر دی، جس کے بدلے میں ان ستم شعاروں نے ابراہیم موصلی کو شہید کر دیا۔

منتجی یہ کہ وہ لوگ سراقدس کو شہر میں داخل نہ کر سکے اور باہر ہی قیام کیا۔ جس جگہ سر مبارک نیزے سے زمین پر آیا تھا، وہاں مزار اور مشہد بنایا گیا، جسے ''مسقط الرأس'' کہا جاتا ہے۔

کفر طاب

شام کی راہ میں ایک منزل کفر طاب ہے۔ اس جگہ پر ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔ اس شہر والوں نے ان لوگوں پر دروازے بند کر دیئے اور ان ملاعین کو شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ جب ان ملاعین نے اس شہر والوں سے پانی طلب کیا تو انہوں نے کہا:

''کس منہ سے پانی مانگتے ہو؟ اولادِ رسولؐ اور ذریت رسولؐ کو تو کنارۂ دریا پر تم نے پیاسا رکھا، ان پر پانی بند کیا اور پیاسا شہید کیا۔ خدا کی قسم! ایک قطرہ پانی کا تمہیں نہ دیں گے۔ بے حیاؤ! فوراً چلے جاؤ''۔

چنانچہ یہ بے شرم و بے حیا وہاں سے چلے گئے۔

سیبور

یہاں بھی انہیں لعنت وملامت کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ لوگوں نے انہیں شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس شہر میں ایک بوڑھے آدمی نے عثمان بن عفان کے ہاں حاضری دی ہوئی تھی۔ اس نے شہر کے جوانوں اور بوڑھوں کو جمع کر کے کہا:

''میری قوم! فتنہ و فساد بری چیز ہے۔ یہ سر تمام بڑے شہروں میں پھرائے گئے، وہاں کسی نے مزاحمت نہیں کی، تم کیوں کرتے ہو؟ شہر سے گزرنے دو''۔

یہ سننا تھا کہ جوانوں کے تیور بدل گئے، غیرت نے جوش مارا، اسلامی حمیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے کہا:

''ایسا کبھی نہ ہوگا کہ قاتلانِ حسینؑ خوشیاں مناتے ہوئے اور رسولؐ کی بیٹیوں کو قید کر کے ہمارے شہر میں داخل ہوں۔ واللہ! ایسا ہرگز نہ ہوگا''۔

ان لوگوں نے ہمت کر کے شہر سے باہر گزرنے کا پل توڑ ڈالا۔ سپاہِ ابن زیاد نے یہ جب یہ دیکھا تو ان غیور جوانوں پر حملہ کر دیا۔ خونریز معرکہ ہوا۔ ابن زیادؔ کے بہت سے سوار واصلِ جہنم ہوئے اور ان جوانوں میں سے ۵۰۰ شہید ہوئے، لیکن ان

جوانوں نے ملاعین کو پل توڑ کر شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔

حضرت ام کلثومؑ نے اس شہر کا نام دریافت کیا تو جواب ملا کہ اس کا نام سیبور ہے۔ آپؑ نے دعائے خیر فرمائی:

''پروردگارِ عالم! ان کے پانی کو ٹھنڈا میٹھا کر! اشیائے خورد و نوش عام اور ارزاں کر اور ان کو ظلم و جور سے مصئون اور مامون رکھ''۔

حماۃ

جب یہ ملاعین قافلہ لے کر شہر حماۃ پہنچا تو ان لوگوں نے بھی شہر کے دروازے بند کر لئے۔ ان اشقیاء کو شہر میں داخلے سے روک دیا اور خود شہر کی دیواروں پہ چڑھ گئے اور فوجِ اشقیاء سے کہنے لگے: ''بخدا! ہم تم جیسے نجس آدمیوں کو اپنے شہر میں ہرگز داخل نہ ہونے دیں گے۔ تمہارا گزر ہماری لاشوں پر سے ہوگا''۔

جب اہل شام نے ان لوگوں کا عزم دیکھا تو وہاں سے چلتے بنے۔ نفس المہموم میں ہے کہ ایک صاحب مقاتل نے بیان کیا ہے:

''ایک سال سفرِ حج کے دوران میں نے حماۃ کے باغوں میں ایک مسجد کو دیکھا۔ اس کا نام مسجد الحسینؑ تھا۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا تو اس کے اندر ایک طرف پردہ لٹکا ہوا دیکھا۔ میں نے یہ پردہ اٹھایا تو دیکھا کہ دیوار میں ایک اطاق سی کشادہ ہے۔ اس میں ایک پتھر پر ایک سر کی گردن کا نشان ہے اور اس پر خون جما ہوا ہے۔ میں نے خادمِ مسجد سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انے جواب دیا: ''اہل شام سروں کو لے کر اس شہر کے قریب سے گزرے تو اس پتھر پر انہوں نے فرزندِ بتولؑ حضرت امام حسین ابن علی علیہما السلام کا سرِ اقدس رکھا رہا تھا''۔

صدیاں گزر جانے کے بعد باوجود بھی گردن کا یہ نشان اور خونِ فرزندِ بتولؑ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

قصر بنی مقاتل

الدمعۃ الساکبہ میں مذکور ہے: جب یہ قافلہ قصرِ بنی مقاتل پہنچا تو اہل قافلہ کا پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ اہل قافلہ نے اسی جگہ قیام کیا۔ اشقیاء نے خود تو دھوپ سے بچنے کیلئے خیام نصب کر لئے مگر ہاشمی مخدرات اور یتیموں کو دھوپ میں ہی بٹھایا۔ ان لعینوں نے خود تو ٹھنڈا پانی منگوا کر پیا مگر خاندانِ رسالتؐ کے بے وارث قیدی دھوپ کی وجہ سے اونٹوں کے سائے میں پناہ لیتے۔ پیاس کی شدت میں قلیل مقدار میں گرم پانی ملتا تھا۔ اشقیاء اپنی مرضی سے کوچ و قیام کرتے۔ انہوں نے کبھی حضرت امام

علی زین العابدین علیہ السلام اور دختران بتولؑ سے نہ پوچھا۔

جب قافلہ قیام کرتا تو جناب بتولؑ کی بیٹیاں قافلہ سے دور کسی ٹیلے کی اوٹ یا درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے قیام فرماتیں۔ اہل بیت علیہم السلام کے یتیم بچے شمرلعین اور زحر بن قیس لعین سے بہت ڈرتے تھے۔ یہ یتیم جب کبھی تھکاوٹ کی وجہ سے سو جاتے تو ظالم ایسی سخت جھڑکیاں دیتے کہ معصوم اماں اماں کہتے ہوئے گھبرا اٹھتے اور حضرت سجاد علیہ السلام خون کے گھونٹ پی کر رہ جائے۔ کسی ظالم سے کبھی کسی عرض کیلئے کوئی فرمائش نہیں کی۔ چنانچہ تاریخیں لکھتی ہیں کہ سارا راستہ آپؑ نے خاموشی سے گزار دیا۔ آنسو بہاتے، کلیجہ پکڑ کر رہ جاتے مگر کسی ظالم سے بات تک نہ کرے۔ سخت صدمہ کے وقت کبھی آسمان کی طرف اور کبھی مدینہ و کربلا کی طرف رُخ کر لیتے۔

ایک منزل پر جب قیام ہوا، سفر کی تھکی ماندی یتیم سکینہ بنت الحسین علیہما السلام نے ریت کا ایک تکیہ سا بنایا اور سو گئیں۔ یہ آرامگاہ حضرت سکینہؑ نے ایک درخت کے نیچے چند قدموں کے فاصلے پر بنائی۔ معصومہؑ عالم خواب میں تھیں کہ قافلہ نے کوچ کی تیاری کی۔ تمام بیبیاں سوار ہو گئیں۔ جنابِ سکینہؑ، جنابِ فاطمہ صغریٰ سلام اللہ علیہما کے ساتھ ایک اونٹ پر سوار ہوا کرتی تھیں۔ ساربان نے اس اونٹ کی مہار پکڑی، جس پر جنابِ فاطمہ و سکینہ بنات الحسین علیہم السلام سوار ہوتی تھیں اور چلتے ہوئے کہنے لگا:

''جلدی سوار ہو جاؤ''۔

جنابِ فاطمہؑ سوار تو ہو گئیں مگر انہوں نے ساربان سے کہا: ''جلدی نہ کرو! میری بہن سکینہؑ رہ گئی ہے۔ اسے آواز دو''۔

ساربان نے باآواز بلند کہا:

''هَلُمِّيْ وَارْكَبِيْ مَعَ النِّسَاءِ يَا سَكِيْنَةُ''.

''اے سکینہؑ! جلدی آؤ اور سوار ہو جاؤ''۔

قافلہ روانہ ہو چکا۔ معصومہؑ ڈرتی، گھبراتی ہوئی بیدار ہوئیں۔ یتیم سکینہؑ قافلے کے پیچھے آوازیں دیتی ہوئی دوڑ پڑیں۔ جنابِ فاطمہ صغریٰ سلام اللہ علیہا نے ساربان سے کہا:

''اونٹ روک لے ورنہ میں اونٹ سے اپنے آپ کو گرا دوں گی اور روزِ قیامت اپنے خون کی ناناؐ سے شکایت کروں گی اور میری موت کا ذمہ دار تو ہوگا''۔

آخر کار ساربان نے اونٹ کو روک ہی لیا اور معصومہ سکینہؑ اونٹ پر سوار ہوئیں۔

✿✿✿

عقیدہ و عمل، ایمان و عمل صالح

ورودِ شام، بازار کا سفر، دربارِ یزید ملعون

اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو مان لینے کا نام عقیدہ اور اس کے حکم کی تعمیل کو عمل کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر پیغمبر کو منجانب خدا ہادی و معلّم تسلیم کر لینے کو عقیدہ اور ان کی عملی اطاعت اور ان کے فرمودات پر عمل پیرا ہونے کو عمل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر امام کو معصوم، برگزیدۂ خدا اور دین حق کا رہنما ماننا، یہ عقیدہ ہے اور ان کی پیروی کرنا، ان کی سیرت کو اپنے کردار کے لیے مشعل راہ بنانا اور ان کے نقش قدم پر چلنا عمل ہے۔ خلاصہ یہ کہ خدا، نبی، امام پر ایمان لانا اور زبان و دل سے ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق ماننا عقیدہ اور اعضائے بدن کے ذریعے ان کے فرمودات اور احکام کی خلوصِ قلب کے ساتھ تعمیل، عمل ہے۔ جب دل قبول کرے اور اعضاء اس پر عمل پیرا ہوں، اس عقیدہ کا رکھنا اور اس پر عمل کرنا اسلام ہے۔ اسلام کے یہ دونوں اہم اجزاء ہیں اور یہ دونوں اسلام کے نہایت ضروری بنیادی حصے ہیں جن کی باہمی ترکیب و تعاون سے اسلام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

عقیدۂ شجر اسلام کی اصل اور عمل اس پاکیزہ درخت کی فرع اور پھل و پھول ہیں۔ عقیدہ کی اہمیت اپنے مقام پر بجا اور درست ہے۔ عقیدہ کی رو سے ایک غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر اپنی جان، عزت اور مال محفوظ کروا لیتا ہے اور اپنی زندگی کے گلشن کی شادابی کا مرکزی چشمہ معین کر لیتا ہے۔ اسی طرح عقیدہ اس کی سیرت و کردار کی مضبوط بنیاد ہے لیکن جب تک عمل نہ ہو اور سیرت و کردار عقیدہ کی تائید و رفاقت نہ کرے، عقیدہ اگر بنیاد ہے تو یہ اساس بے بنیاد ہے۔

جیسا کہ عقیدہ شجرِ اسلام کی جڑ ہے تو اگر کوئی درخت ایسا ہو کہ جس کا تنا خشک ہو، جس کی شاخیں کٹی پھٹی ہوں اور یہ برگ و بار سے خالی ہو، نہ پھول ہوں نہ پھل ہوں، نہ سایہ ہو اور اس کی شاخیں پھلیں پھولیں اور پھیلیں نہیں تو صرف ٹنڈ منڈ تنا کس کام کا؟ حضرات! جس طرح عقیدہ ضروری ہے اسی طرح عمل بھی ضروری ہے۔

جہاں رب العٰلمین نے ہادی اور رہنما، عقائد و خیالات، تصورات و نظریات کی اصلاح کے لیے بھیجے وہاں انہوں نے سیرت و کردار کی تشکیل پر بھی زور دیا۔ عقیدہ کی اصلاح اور یقین کا مستحکم ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ عمل تابع رہنما ہے اور کردار خالق کی مرضی کا آئینہ دار۔ وہ عمل باطل ہے جو خالق کی رضا اور اس کی خوشنودی کا باعث نہ ہو۔ وہ کردار غلط ہے جو معصوم رہنما اور انبیاء و مرسلین، آئمہ طاہرین جو اللہ کے نمائندے اور اس کے سفیر ہیں اور ہر انسان کیلئے قولی و عملی مبلّغ اور معلّم ہیں، کے

فرامین اور احکام کے مطابق نہ ہوں۔ کیونکہ ہر نیک کا عمل کا مقصد قُربَۃً اِلَی اللّٰہ ہوتا ہے اور ہر عبادت کی غایت اللہ کی رضا و خوشنودی ہے۔ جو عبادت اللہ کی رضا کی سند حاصل نہ کر سکے وہ بیکار اور بے مقصد عبادت ہے۔ جو عمل معصوم رہنماؤں کی منظوری سے محروم ہو، وہ ایک بے فائدہ مشقت ہے۔ کیونکہ راہرو کو راہ پر چلنے سے پہلے کسی سچے واقف کار رہنما سے اپنی اس راہ کا تعین کر لینا چاہئے جو اسے صحیح منزلِ مقصود تک پہنچادے۔

غلط راہ پر چلنے سے سوائے تھکاوٹ، پریشانی اور محرومی کے کچھ حاصل نہ ہوگا لیکن صحیح رہبر مل جانے اور سچے ہادی، صراطِ مستقیم اور صحیح مذہب کی پہچان کے بعد بھی اگر کوئی مسافر راہ پر نہیں چلتا تو بدنصیب ہے کہ سیدھے راستے اور سچے مذہب کی معرفت کے باوجود وہ اس صراطِ مستقیم کا راہرو نہ بن سکا۔ منزلِ مقصود کی رٹ لگاتا رہا، صراطِ مستقیم کا لفظی وظیفہ پڑھتا رہا لیکن بدبخت منزل پر نہ پہنچ سکا۔

جہاں سچے ہادی اور صحیح رہنما کی پہچان ضروری ہے، وہاں ہی اس کی تعلیمات پر عمل بھی ضروری ہے۔ اگر عمل نہیں، تعمیل ارشاد نہیں، احکامِ رہنما کی پیروی نہیں، ان کی زندگی کو نمونہ عمل نہیں بنایا گیا تو صرف دماغی شناخت اور قلبی معرفت فائدہ مند نہیں۔ صرف زبانی رٹ لگا لینے اور قولی وظیفہ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ قولی دنیا نہیں سیرت و کردار کا جہان ہے۔ عملی کوشش کی امتحان گاہ ہے۔

"خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً".

"اس نے موت وحیات کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں اچھا عمل کرنے والا کون ہے!"

قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے عقیدہ کے ساتھ عمل کو لازم قرار دیا ہے۔ ایمان کا جہاں بھی ذکر ہوا ہے وہاں اس کے ساتھ عمل صالح کا تذکرہ بھی ہے۔ قرآن پاک میں جہاں لفظ آمَنُوْا آیا ہے، وہاں ہی اس کے بعد وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ کا ذکر بھی ہے۔ صرف ایمان لانے سے جنت نہیں مل سکتی اور عقیدہ مضبوط کر لینے ہی سے قربت خدا حاصل نہیں ہوتی، جب تک کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح نہ ہو اور اعضائے بدن زبان کی اور عمل قول کی تائید نہ کردے۔

اگر قرآن مجید کی ان آیات کو جمع کیا جائے جن میں عملِ صالح کی اہمیت بتائی گئی ہے اور عمل صالح پر تاکید کی گئی ہے تو ایک باقاعدہ کتاب کی صورت اختیار کر جائیں گی۔ صرف چند آیات کو قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"وَ الۡعَصۡرِ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ .اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ".

"قسم ہے زمانے کی یقیناً ہر انسان نقصان میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا اور ایک دوسرے کو حق و صبر کی تلقین کرتے رہے"۔

ایمان، عمل صالح، حق اور صبر، اگر ان چار عناصر میں سے ایمان کو نکال دیا جائے تو امن و سلامتی کے جسم میں ایک خلط بگڑ جائے گی اور بدن کی سلامتی کا ارتقاء رک جائے گا اور انسان خسران کی لپیٹ سے نکل نہ سکے گا۔

"اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ".

"خدا کی طرف کلمات صعود کرتے ہیں اور عمل صالح ان کو بلند کرتا ہے"۔

"اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصَّالِحٰتِ طُوۡبٰی لَهُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ".

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے صالح اعمال انجام دیے ان کیلئے طوبیٰ اور بہترین بازگشت ہے"۔

انسان کی نجات اور کامیابی کا انحصار عمل پر ہے

"کُلُّ نَفۡسٍ بِمَا کَسَبَتۡ رَهِیۡنَةٌ".

"ہر نفس اپنے کیے ہوئے کاموں میں رہن ہے (جکڑا ہوا ہے)"۔

اگر اعمال نیک ہوں تو خوشحال ہے اور اگر اعمال بد ہوں تو بدحال ہے اور بدحالی کا وبال ہے۔

"لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَ اِنَّ سَعۡیَهٗ سَوۡفَ یُرٰی".

"انسان کیلئے نہیں ہے مگر اس کی کوشش اور عنقریب اس کی کارگزاری دیکھی جائے گی"۔

"لَهَا مَا کَسَبَتۡ وَ اِلَیۡهَا مَا اکۡتَسَبَتۡ".

"اس کے فائدہ کے لیے ہے جو اس نے نیکی کی اور اس کا وبال اس پر پڑے گا جس نے بدی کی"۔

عمل صالح ہی مادی، روحانی، دنیوی، اخروی ترقی و کامیابی کا واحد سبب ہے۔ اگر عمل صالح نہ ہو تو ہر قسم کی ترقی رک جاتی ہے۔ اس کے نہ ہونے سے نسبی امتیاز بھی ختم ہو جاتا ہے۔ عمل صالح کے نہ ہونے سے خاندانی وجاہت بھی بے اثر رہ جاتی ہے۔ خود حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا پیارا بیٹا عمل صالح کے نہ ہونے کی وجہ سے بحر عذاب میں غرق ہو گیا اور انتقام کی طوفانی

موجوں نے اس کو نہنگ اجل کے سپرد کر دیا۔ اس کو نافرمانِ خدا ہونے کی وجہ سے اور بدعملی کی جہت سے نبی کی محبت پدری بھی کام نہ آئی۔

ایک وقت محبت پدری جوش مارتی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کو پکار کر کہتے ہیں:

"یَا بُنَیَّ ارْکَبْ مَعَنَا وَ لَا تَکُنْ مَعَ الْکَافِرِیْنَ".

نافرمان بیٹے نے مہربان باپ کے فرمان کی کوئی پرواہ نہ کی اور طوفانی لہروں نے پسر نوحؑ کو ڈھانپ لینا چاہا۔ جب جنابِ نوحؑ اس طرف متوجہ ہوئے تو خدا کی طرف نہایت عاجزی سے عرض کیا:

"اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ".

"خدایا! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ حق ہے۔"

یہ ایک التجا تھی کہ شاید قدرت میرے بیٹے کو اپنی قدرتِ کاملہ سے بچالے۔ بیشک وہ بچا سکتا ہے، مگر بچایا نہیں۔ اس میں جنابِ نوحؑ کی سفارش بھی شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکی اور جواب ملا:

"اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ".

"نوحؑ! وہ تیرے اہل سے کہاں؟ وہ تو غیر صالح عمل ہے!"

بدعمل ہے، اس کا کردار درست نہیں۔

عمل صالح نہ ہونے کی وجہ سے رشتہ قرابت ختم ہو گیا اور روح و بدن کا رشتہ بھی جاتا ہے۔ روح بدن سے خارج ہو گئی اور کنعان اہل نوحؑ سے خارج ہو گیا۔ نبی کا بیٹا تھا، بدعملی کی وجہ سے نبی کے اہل سے خارج ہو گیا جبکہ حضرت سلمانؓ فارسی عمل صالح کی بدولت سید الانبیاء حضرتِ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل میں شامل ہو گئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نافرمانی اپنے کو بیگانہ اور فرمانبرداری بیگانے کو اپنا بنا دیتی ہے۔ یہ تو پسر نبی کا قصہ تھا۔ دو انبیاء کی بیویوں کا قصہ بھی قرآن پاک میں ملتا ہے:

شوہر نبی ہیں، صالح اور متقی ہیں جبکہ بیویاں نافرمان ہیں اور جہنم کے لائق ہیں۔ بدعمل ہیں، نافرمان ہیں۔ دنیا میں بیوی سے بڑھ کر کسے محبت حاصل ہوتی ہے؟ لیکن ان قریبی محبت داروں کو اپنے پیغمبر اور شوہر کی محبت جہنم سے نہ بچا سکی، کیونکہ عمل صالح نہ تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ

عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئاً وَ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِیْنَ"۔

"خدا نے کافر لوگوں کیلئے مثال بیان کی ہے نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی، جو ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں۔ ان دونوں عورتوں نے اپنے (پیغمبر) شوہروں کی خیانت کی۔ پس ان دونوں نے ان کو فائدہ نہ پہنچایا (خدا کی نافرمانی کی صورت میں) اور ان سے کہا گیا کہ آگ میں داخل ہونے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ تم بھی نارِ جہنم میں داخل ہو جاؤ"۔

یہ دونوں عورتیں دو انبیاء کی بیویاں ہیں۔ شرف زوجیت اور شرف صحبت حاصل ہے مگر خدا کی نافرمان ہیں۔ عمل صالح نہیں، حکم خدا ہے جہنم میں جاؤ اور صاف ارشاد ہے کہ دونوں پیغمبر خدا کے مقابلہ میں انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ جہنم میں جاتی ہیں وہ پیغمبروں کی بیویاں اور جنت میں جاتی ہے تو فرعون کی بیوی۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

"ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَةَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ بَیْتاً عِنْدَکَ فِی الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ"۔

"خدا مومنوں کے واسطے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے کہا: میرے پروردگار! میرے لیے اپنے جوارِ رحمت جنت میں مکان بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات عطا فرما اور ظالم لوگوں سے بچا"۔

حضرت آسیہ فرعون کی بیوی ہیں، پہلے یہ کافرہ تھیں۔ جب حضرت موسیٰؑ فرعونی جادوگروں پر غالب آئے اور انہیں میدانِ مقابلہ میں کامیابی ہوئی تو جہاں جادوگر جنابِ موسیٰؑ کی صداقت جان کر موسیٰؑ اور اس کے رب پر ایمان لائے، اس نیک دل ملکہ مصر پر بھی صداقتِ موسیٰؑ کا اثر ہوا اور یہ بھی موسیٰؑ پر خفیہ ایمان لے آئی۔ یہ فرعون کے اعمالِ بد سے متنفر تھی۔ زندگی میں اسے جنت کی بشارت دی گئی اور جنت کا محل دکھایا گیا۔

حضرات! دو قسم کے رشتے ہوتے ہیں۔ نسبی اور سببی۔ یہاں دونوں قسم کے رشتہ دارانِ انبیاء، عمل صالح سے محرومی کی بنا پر جنت کے حقدار نہ بن سکے۔ معلوم ہوا کہ جنت میں جانے کا انحصار ایمان اور عملِ صالح پر ہے۔ ہاں! ایمان اور عمل صالح کی موجودگی، پھر پیغمبران و ائمہ علیہم السلام کی قرابت بہت بڑا شرف اور بہت بڑی بزرگی ہے۔

واضح رہے کہ یہاں یہ کلیہ بھی قائم نہیں رہ سکتا:

"اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ"۔

"خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور پاک و طاہرہ عورتیں طاہر مردوں کے واسطے"۔

درحقیقت یہاں سے عورتیں مراد لینا ہی درست نہیں بلکہ کلمات اور اعمال بھی اسی زمرے میں آتے ہے۔ نیکوں کی بیویاں بد اور بدوں کی بیویاں نیک ہوتی چلی آئی ہیں۔ شریعت نے یہ پابندی عائد نہیں کی کہ نیک عورت کا نکاح برے آدمی کے ساتھ اور بری عورت کا نکاح نیک آدمی کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔

ہاں! عصمت میں پابندی ضروری ہے کہ معصومہ کا شوہر غیر معصوم نہیں ہوسکتا البتہ معصوم کی بیوی غیر معصوم ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر سارے کے سارے معصوم ہیں اور کسی کی بیوی معصومہ نہیں۔ نیک اور صالحہ بھی ہیں اور بدعمل بھی ہیں، نیک عمل بھی ہیں لیکن معصومہ نہیں اور کسی معصومہ کا شوہر غیر معصوم نہیں ہوتا۔ اس سے ایک کلیہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ معصوم کی بیوی تو غیر معصومہ ہوسکتی ہے لیکن معصومہ کا شوہر غیر معصوم نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کی شادی کسی غیر مرد سے اسی بناء پر نہ ہوئی کہ کوئی مردان کے کفو (جوڑ) کا نہ تھا۔ حضرت زکریاؑ ان کے بہنوئی تھے اور حضرت یحییٰؑ ان کے بھانجے۔ دونوں سے عقد حرام۔ خدا نے پسر بھی دیا مگر قدرت کاملہ سے بغیر پدر کے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں کہ ان کا کفو (ہمسر) معصومہ ہو۔ یہ شرف حاصل ہے تو صرف حسنین علیہم السلام کے بابا علی علیہ السلام کو اور زینب سلام اللہ علیہا کی والدہ جناب زہراء سلام اللہ علیہا کو۔ یہ دونوں عصمت کا جوڑا ہیں۔ شوہر بھی معصوم اور زوجہ بھی معصومہ۔ علامہ اقبال کیا ہی خوب کہتے ہیں:

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز

از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

مریمؑ کو عزت کی ایک نسبت حاصل ہے کہ وہ عیسیٰ معصوم کی ماں ہیں۔ فخر کرسکتی ہیں کہ معصومہ ہیں اور معصوم کی ماں ہیں، لیکن جناب زہراء سلام اللہ علیہا کو اس عزت کی تین نسبتیں حاصل ہیں۔ خود تو معصومہ ہیں ہی، دو معصومین کی والدہ ہیں، معصوم کی زوجہ ہیں اور معصوم کی دختر ہیں۔ اسی لیے انہیں بتول کبریٰ اور فخر مریم کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی کوئی آیت نہیں ملتی جس میں صرف عقیدہ رکھنے اور ایمان لانے پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہو۔ جہاں بھی عقیدہ وایمان کا ذکر ہے، وہاں عمل صالح کی بھی شرط لگائی گئی ہے اور جنت کا وعدہ انہی لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لانے کے بعد اعمال صالح کے پابند رہے۔ ارشاد ہے:

"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ. اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ. وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ. وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ. وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ. اِلَّا

عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ. فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَاءَ ذَالِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعَادُوْنَ. وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ. اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ. اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ وَهُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ" (المومنون)

اس آیت میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ وہ مومن کامیابی حاصل کریں گے جو اپنی نمازیں خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں اور مومن وہ لوگ ہیں جو لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، جو زکوٰۃ باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں (یعنی بے حیاء اور زناکار نہیں) سوائے اپنی زوجہ اور لونڈی کے۔ کیونکہ شرعی احکام کے مطابق اپنی ازواج اور کنیزوں کے ساتھ کوئی ملامت اور برائی نہیں۔ جو رشتہ زوجیت اور ملک یمین لونڈیوں کے بغیر اس قسم کا کام کریں وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں اور قابل عتاب ہیں۔

پھر مومنین کی تعریف جاری ہوتی ہے۔ یعنی مومن وہ لوگ ہیں جو امانتوں اور وعدوں کی پاسداری و پابندی کرتے ہیں۔ وہ لوگ ہیں جو نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ جنت کے وارث ہیں جو فردوسِ بریں میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

حضرات مومنین! یہ ان لوگوں کی تعریف ہے جو جنت میں جانے کے قابل ہیں۔ ہر مومن اپنے مقام پر یہ سوچے کہ کیا یہ اوصاف اس پر صادق آتے ہیں اور اس معیار پر وہ پورا بھی اترتا ہے، جو خلاقِ عالم نے جنتیوں کے لیے مقرر کیا ہے؟ اگر اس معیار سے محروم ہے تو کوشش کرے کہ اپنے آپ کو اس معیار پر پورا کرے اور مومنین کی ان صفات کا مصداق بنے ورنہ صرف خوش کن باتوں اور موہوم امیدوں سے، خام خیالوں سے منزلِ مقصود نہیں پاسکتا اور اگر کوئی بغیر عمل صالح اور تقویٰ کے آپ کو جنت کی جعلی اور فرضی رسید دیتا ہے اور غلط پیش گوئی کرتا ہے تو ظاہر میں تو وہ خوش گپ دوست ہے مگر درحقیقت وہ دشمن ہے۔ جو بے عمل یا بدعمل بنا کر اہل ایمان بھائیوں کو جنت سے دُور رکھنے کی مذموم کوشش کرتا ہے اور ایسا شخص وقتی طور پر تو آپ کو خوش کر کے آپ سے دادِ تحسین حاصل کر لیتا ہے لیکن اگر آپ سمجھیں، تو اس سے بڑھ کر آپ کا کوئی دشمن نہیں۔ وہ میٹھی باتوں سے آپ کو جہنم کا ایندھن بنا رہا ہے۔

حضرات! یہ تو قرآنِ مجید کی چند آیات پیش کی ہیں۔ اب آئمہ معصومین علیہم السلام کی چند احادیث بھی پڑھتے ہیں۔

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اولادِ حضرت عبدالمطلب کو مخاطب کر کے فرمایا:

"يَابَنِيْ عَبْدُ الْمُطَّلِبْ! اِنِّيْ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً".

"سنو اے میرے خاص رشتہ دارو اور عزیزو! میں خدا کے مقابلہ میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا"۔

خدا کی فرمانبرداری کرنا، اس کی نافرمانی نہ کرنا۔

اگر کسی عالم، واعظ، مدرس، پیش نماز، مجتہد کا فرزند بدعمل ہو تو اس کی بدعملی کا طعنہ اس کے باپ کو دیا جاتا ہے کہ وہ فلاں پسر فلاں عالم ایسا ہے۔ اس کا باپ کیسا ہے اور وہ خود کیسا ہے؟ کسی بزرگ اور اونچی ذات کی طرف منسوب ہونے سے ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اگر نیک عمل ہو تو دوگنا عزت بڑھے گی۔ ایک خاندانی اور نسبی وجاہت سے اور دوسرا عملِ صالح کی وجہ سے اور اگر عمل بد ہو تو اس کی اپنی عزت بھی گھٹ جاتی ہے اور خاندان کیلئے بھی وہ منحوس باعث ننگ و عار ہوتا ہے اور اپنی بدعملی سے بزرگوں کو بھی شرمسار کرتا ہے۔ خاندانی وجاہت اور شرف تب ہی حاصل ہوگا جب وہ اعمال صالحہ کے مالک بنیں۔ اگر وہ نیک عمل کریں تو دوگنی جزاء کے حقدار ہیں اور اسی طرح بدعملی کی صورت میں بھی دوگنی سزا کے مستوجب ہیں۔ جس طرح کہ ازواج رسولؐ کے متعلق ارشاد ہے:

"يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ".

"اے نبی کی عورتو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔"

تمہاری نیکی اور بدی سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متاثر ہوتے ہیں۔ تم اشرف کائنات کی بیویاں ہو۔ تمہاری حالت عام عورتوں سے امتیازی ہے۔ نسبتاً عام عورتوں سے تمہاری ذمہ داری زیادہ ہے۔

"مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ". (احزاب)

"جو کوئی تم میں سے کسی گناہ کا ارتکاب کرے گی، اس کی سزا کا عذاب دوگنا کر دیا جائے۔ جو سزا اس گناہ کی عام عورتوں کو ملے گی، اس گناہ کی سزا تمہیں اس کی دوگنا ملے گی"۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

"مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ فَهُوَ لَنَا مُحِبٌّ وَ مَنْ عَصَى اللّٰهَ فَهُوَ لَنَا عَدُوٌّ".

"جو شخص اللہ کی اطاعت کرے وہ ہمارا دوست ہے اور جو خدا کی نافرمانی کرے، وہ ہمارا دشمن ہے۔" (اصول کافی)

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندگی کے آخری ایام میں علالت میں مبتلا ہیں۔ بیماری کے تیسرے روز

آپؐ اس صورت سے مسجد میں تشریف لائے کہ سر مبارک پر درد کی وجہ سے پٹی باندھے ہوئے تھے۔ دایاں ہاتھ حضرت علیؑ کے دوشِ مبارک پر اور بایاں ہاتھ حضرت فضل ابن عباس علیہم السلام کے کندھے پر تھا۔ مسجد میں تشریف لا کر آپ ممبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا:

''اے گروہِ مردم! مہاجرین و انصار! اب وہ وقت قریب ہے کہ میں تمہارے درمیان سے غائب ہو جاؤں۔ جس کا مجھ سے وعدہ ہو، وہ آئے اور مجھ سے وعدہ پورا کروائے۔ جس کا قرض ہو، وہ آئے اور مجھ سے قرض وصول کرلے۔

اے گروہِ مردم! کسی آدمی اور خدا کے درمیان کوئی وسیلہ بجز عملِ صالح اور اطاعتِ خدا کے نہیں۔ جس کے سبب کوئی عمل خیر ہو یا کوئی شر اس سے دفع ہو۔

اے لوگو! کوئی مدعی یہ دعویٰ نہ کرے کہ وہ بغیر عمل کے کامیاب ہو جائے گا اور جنت میں پہنچ جائے گا۔ کوئی شخص یہ آرزو نہ کرے کہ میں بغیر اطاعتِ خدا، رضائے خدا حاصل کر سکتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں اس خدا کی جس نے مجھے بحق و راستی بھیجا ہے، کوئی شخص عذابِ خدا سے نجات حاصل نہیں کر سکتا مگر عملِ صالح اور رحمتِ خدا کے ذریعے''۔

یہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی اُمت کو وصیت اور فرمان ہے۔

آیئے آئمہ معصومین علیہم السلام کے ارشاداتِ عمل کے بارے میں سنئے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ''روضہ کافی'' میں فرماتے ہیں:

''اے ہم سے تعلق رکھنے والی جماعت! تم میں سے جو شخص چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ایمان ایسا کر دے کہ وہ مسلم، کامل مومن ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ خدا سے ڈرے، ان شرطوں کے ساتھ جو اس نے ایمان کے ساتھ مومنین پر لگائی ہیں۔ پس شرط لگائی ہے اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص پر جو خدا اور رسولؐ اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی ولایت کا قائل ہو کہ مومن تب ہی کامل ہو سکتا ہے جب وہ نماز کو قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، راہِ خدا میں خرچ کرے اور ہر ظاہری و باطنی برائی سے بچے''۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی شخص صرف توحید، نبوت اور امامت پر ایمان ہی لانے سے مومنِ کامل نہیں ہو سکتا جب تک اعمالِ صالح کا پابند نہ ہو اور ہر قسم کی برائی اور گناہ سے نہ بچے۔

محمد بن حفص سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا:

''ایمان ایک دعویٰ ہے اور کوئی دعویٰ بغیر ثبوت کے صحیح نہیں۔ ایمان کے دو گواہ ہیں، عملِ صالح اور نیک نیت۔ لہٰذا ہر مومن کو چاہئے کہ وہ اپنے ایمان کا ثبوت اور قول کی تصدیق عملِ صالح اور نیک نیت کے ساتھ کرے''۔ (اصول کافی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایمان اور عمل کا تعلق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: محمد بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام صادقِ علیہ السلام سے سوال کیا: ''کیا عمل ایمان کا حصہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا: ''ہاں! ایمان مکمل نہیں ہوتا مگر عمل کے ساتھ۔ عمل ایمان کا حصہ ہے اور ایمان عمل سے ہی ثابت ہوتا ہے''۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ''اسلام نام ہے تسلیم کا اور تسلیم نام ہے تصدیق کا۔ تصدیق نام ہے اقرار کا اور اقرار نام ہے عمل کا۔'' (اصول کافی)

ایک مقام پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ''جس نے زنا کیا وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔ جس نے شراب پی وہ بے ایمان ہو گیا (یعنی ایمان سے خارج ہو گیا) اور جس نے جان بوجھ کر بغیر عذر شرعی ماہِ رمضان کا روزہ نہ رکھا وہ ایمان سے خارج ہو گیا۔'' (اصول کافی)

اب وہ حضرات غور فرمائیں جو اپنے آپ کو مومن اور شیعہ کہلاتے ہیں۔ جن کی زندگیاں زنا و شراب میں گزر بسر ہوئیں اور وہ ساری زندگی ماہِ رمضان کی بے عزتی کرتے رہے اور کبھی روزہ نہ رکھا، کہاں تک مومن ہیں اور امامِ معصومؑ کی نظر میں ان کا ایمان اور زبانی دعویٰ کہاں تک صحیح ہے؟

حضرت امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: ''تحقیق بہت سے لوگ بے عمل ہیں۔ تختوں (چارپائیوں) پر گاؤ تکیے لگا کر اور کرسیوں پر بیٹھ کر کہتے ہیں کہ ہم علیؑ کے شیعہ ہیں، ہم علیؑ کے شیعہ ہیں''۔

آپؑ فرماتے ہیں: ''وہ لوگ جھوٹے ہیں۔ علیؑ کے شیعہ وہ لوگ ہیں جن کے قول کی تصدیق ان کا عمل کرے''۔

مومنین کرام! اس قسم کی آیات و احادیث بہت ہیں۔ ہم نے خوفِ طوالت سے صرف چند نقل کی ہیں اور اصول کافی کی حدیث کا اختصار کے پیش نظر صرف ترجمہ پیش کیا ہے۔ ان آیات و احادیث کی روشنی میں صاحبِ بصیرت کو عمل صالح کی اہمیت نظر آ جائے گی کہ بغیر عمل صالح کے اور گناہوں سے پرہیز کے نہ خدا راضی ہے اور نہ ہی معصومینؑ۔ نہ ہی عمل صالح کے بغیر جنت ملتی ہے اور نہ ہی جہنم سے نجات۔

اگر کوئی شخص تمہیں بغیر عمل صالح کے اور بغیر فسق و فجور سے پرہیز کے جنت کی فرضی ٹکٹ اور غلط بشارت دیتا ہے تو وہ جھوٹا ہے اور در حقیقت تمہارا دشمن ہے۔ جہالت کی وجہ سے یہ تمہیں خوش کر کے عارضی مفاد کی وجہ سے تمہیں دھوکا دیتا ہے اور اگر اس قسم کی کوئی حدیث پیش بھی کرتا ہے تو وہ حدیث جھوٹی ہے اور یونہی معصومین علیہم السلام کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

تقویٰ

اس کا معنی ہے بچنا۔ خدا سے ڈرنا اور ایسی باتوں اور ایسے کاموں سے پرہیز کرنا جو خالق و مالک کی ناراضگی کا باعث ہوں۔ قرآن مجید میں تقویٰ پر بڑا زور دیا گیا ہے اور تقویٰ ہی کو دخولِ جنت اور قربِ خدا کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے حضرات جانتے ہیں کہ بار بار اِتَّقُوا، اِتَّقُوا، التَّقویٰ، اَلْمُتَّقِیْنَ کے الفاظ ذکر کر کے تقویٰ کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

"فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْویٰ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ".

"اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ".

"وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ".

تقویٰ اختیار کرنے اور متقین کی تعریف میں کثرت سے آیات وارد ہوئی ہیں۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ "خدا سے ڈرو" کا یہ معنی نہیں کہ خدا سے بھاگ جاؤ، اس کی طرف رخ نہ کرو، اس کے قریب نہ جاؤ بلکہ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے غضب، اس کے عذاب اور اس کے عقاب سے ڈرو اور ایسے کام نہ کرو جن سے وہ ناراض ہو جائے۔ ایسی باتوں اور کاموں سے پرہیز کرو، جن کے کرنے پر اس نے عذاب کا وعدہ کیا ہے اور جن پر وہ ناراض ہوتا ہے۔

تقویٰ برائیوں، نازیبا باتوں اور ناپسندیدہ امور سے بچنے کا نام ہے۔ جن سے اس نے اپنے پیغمبروں و ہادیوں کے ذریعے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔

عملِ صالح

ایسے اُمور جن کے کرنے سے وہ خوش ہوتا ہے، ایسے کام اور اعمال جن کے بجا لانے سے خدا راضی اور مخلوق کا بھلا ہوتا ہے، معاشرے کی اصلاح اور روحانی زندگی کو طاقت ملتی ہے اور ایسے امور جن کے ذریعے بندہ خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔

تقویٰ بدنِ انسان کو برائیوں کی گندگی، گناہوں کے جراثیم اور فسق و فجور کی نجاست سے پاک رکھتا ہے اور عملِ صالح، نیکیوں کے ذریعے اور خوبیوں کے لباس سے آراستہ کرتا ہے، اطاعت خدا کی خوشبو سے معطر کرتا ہے، روحانی بالیدگی عطا کرتا ہے اور دل کو قوی کرتا ہے۔ جس شخص میں تقویٰ اور عمل صالح پایا جائے وہ خوش نصیب مومن، متقی اور صالح ہوتا ہے اور ایسے نیک بخت افراد، مخلصین کہلاتے ہیں، جو داخلی و خارجی شیاطین کے وسوسوں سے محفوظ و مصئون رہتے ہیں۔ گویا یہ افراد معصوم تو نہیں

ہوتے، لیکن درجہ عصمت کے قریب ضرور ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں پر فیضانِ الٰہی اور رحمت خدائی کی بارش ہوتی ہے۔ یہ معصومین علیہم السلام کے نائب ہوتے ہیں۔

جب انسان کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پیدا ہو جاتا ہے اور جس قدر اس کی برائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں، اس کے دل پر سیاہی کی تہہ بھی جمتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ برائیوں سے اسقدر مانوس ہو جاتا ہے کہ برائی کے بغیر وہ بے قرار رہنے لگتا ہے اور بدی اس کے گوشت و پوست میں رچ بس جاتی ہے اور کوئی پند و نصیحت اثر پذیر نہیں ہوتی۔ یہ مقام خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (خدا نے ان کے دلوں پر مہر ثبت کر دی ہے) کا ہے۔

جب کوئی انسان نیکی کرتا ہے تو اس کے دل میں نور کا ایک نقطہ جنم لیتا ہے۔ اس کی نیکیوں سے اس کے دل کا نور بڑھتا چلا جاتا ہے اور کثرتِ حسنات اور ترکِ سیئات سے اس کا دل نورانی ہو جاتا ہے اور اسے نیکیوں سے اس طرح انس و رغبت ہو جاتی ہے کہ جس طرح پرندے کو کھلی فضا سے اور مچھلی کو پانی سے ہوتی ہے۔

احساسِ عبدیت

جو احکامِ خداوند عالم کی طرف سے بندگان پر فرض ہوئے ہیں، وہ ان بندگان کی ذاتی ذمہ داری ہیں۔ ان کی ادائیگی ہر انسان پر فرض ہے۔ یہ فرائض انسان خود ادا کرتا ہے اور اس میں وکالت یا نیابت نہیں۔ یہ نہیں ہے کہ ایک انسان خود نماز ادا نہ کرے اور اپنی طرف سے کسی دوسرے سے نماز پڑھوا لے اور اس کی تکلیف ٹل جائے اور حکم کی تعمیل ہو جائے اور فرض ادا ہو جائے۔ کسی سے روزہ رکھوا لے، کسی کو روپے پیسے دے کر حج کروا لے اور خود سفر کی صعوبتوں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنا فرض ادا کر لے، ہرگز نہیں!

یہ احکام ہر انسان پر بذاتِ خود فرض ہیں۔ انہیں احکام کی فرضیت کا نام اصطلاح فقہ میں تکلیف شرعی ہے کیونکہ نماز ادا کرتے وقت خود اسے احساسِ عبدیت ہونا چاہئے۔ نماز کی ادائیگی کے دوران بندے کو خود یہ احساس ہونا چاہئے کہ میں اس کا بندہ ہوں، وہ خالق و مالک ہے، وہ عبادت کے لائق ہے، اس کی نعمتوں کا شکر مجھ پر واجب ہے۔ نیز بندے کو عبادت کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے اور اس کو خود ہی یہ فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس طرح روزہ سے بھوک و پیاس اور تعب و تکلیف خود اس کے بدن پر وارد ہو۔ حج کیلئے وہ خود سفر کی صعوبتیں برداشت کرے اور خود جا کر مناسکِ حج ادا کرے، خود طواف کرے، سعی کرے اور مقاماتِ مقدسہ پر حاضری دے کر اعمالِ حج بجالائے۔ اس طرح خلوصِ نیت، پاکیزہ دل اور خشوع و خضوع کے ساتھ حضورِ الٰہی

کی طرف دل کا رُخ موڑ کر جب یہ احکامِ اسلام بجالائے گا تو اس کا نفس نفسیاتی کثافتوں، مادّی آلائشوں اور خواہشاتِ نفسانیہ کی غلاظتوں سے پاک ہو کر روحانی آرائشوں، تجرد کی زیبائشوں اور تقرب کی سجاوٹوں سے مزین ہو کر وصال کی لذتوں سے محظوظ ہو گا۔

ایک شخص اچھا خاصا تندرست ہے، دُنیا کے تمام کام کرتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا۔ یہ شخص غفلت و کوتاہی کی وجہ سے نماز کو بجا نہیں لاتا یا پھر اس کو حقیر اور غیر ضروری سمجھ کر اس کی پرواہ نہیں کرتا اور زندگی بھر بے نماز رہتا ہے اور پھر مرنے کے بعد اس کی نماز اجارہ کسی غیر کو پیسے دے کر پڑھوا لینے سے اس کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کی نماز اجارہ پڑھنے والے کو تو معمولی رقم کا فائدہ پہنچ ہی جاتا ہے مگر یہ نماز اس مرنے والے عادی بے نماز کو کوئی فائدہ نہیں بخشتی۔

اس طرح ایک تندرست اور خوشحال آدمی جان بوجھ کر رمضان کا روزہ نہیں رکھتا۔ کون بھوک و پیاس کا صدمہ سہے؟ تمام دن کون منہ کو بند کیے رہے؟ مرنے کے بعد کسی مزدور سے روزہ رکھوا لیں گے! کیا اس کی موت کے بعد مزدوری کا روزہ اس کا فرض ادا کر سکتا ہے؟ اپنے بدن کو اس نے قبر کے کیڑے مکوڑوں کے لیے موٹا تازہ بنا رکھا ہے لیکن راہِ خدا میں اس نے اس ذرا سی مشقت کو گوارا نہ کیا اور روپوں اور دولت کے بل بوتے پر اس نے یہ کام مزدوروں سے کروا لیا۔

کیا اس قسم کی مزدوری والی عبادات اور اجرت کا روزہ اصل ذمہ دار سے ذمہ داری ساقط کروا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ ایک فرضی خوش کن بات ہے اور فقط خام خیالی ہے۔ خدا کو تو اپنے بندے کا امتحان مقصود ہے کہ بندہ اپنے معبود کے لیے کیا قربانی دے سکتا ہے۔ بندے کی صرف بھوک اور پیاس مطلوب نہیں کہ اس کی جگہ کوئی اور بھوک و پیاس برداشت کر کے خدا کی راہ میں وہ بھوک و پیاس ارسال کر دے تو اس سے خدا خوش ہو جائے گا۔ یہ شرع کے حکم کی تعمیل نہیں بلکہ خدا کے ساتھ مذاق اور شریعت کے ساتھ استہزاء ہے۔

اسی طرح ایک شخص عمداً زندگی بھر میں فریضۂ حج ادا نہیں کرتا حالانکہ روپے پیسے کی فراوانی ہے اور مال و دولت کی کثرت ہے، راستہ کھلا ہے، سواریاں موجود ہیں، سفر میں کوئی گھریلو امر مانع نہیں، تندرست ہے، سفر کر سکتا ہے۔ فرض کی ادائیگی کا احساس نہیں یا حقارت کی نظر سے اسے ٹھکرا دیتا ہے۔ ایسے شخص کو موت کے بعد حج بدل یا اس کی نیابت میں کسی غیر کا حج کرنا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

یہ نیابت و وکالت کی نمازیں، روزے اور حج وغیرہ اسی صورت میں مرنے والے مومن کے لیے مفید ہیں جب اس کی شدید خواہش و تقاضے کے باوجود وہ بیماری، مفلسی، کمزوری یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے قضا ہو گئی ہوں اور اس کے دل میں ان کے

ادا کرنے کی حسرت اور تڑپ رہی ہو۔ عادی نمازی ہو، عادی روزہ دار ہو، حج کرنے کا خواہشمند ہو لیکن بعض نمازیں، بعض روزے مجبوراً اس سے قضا ہوئے ہوں اور ان کے قضا ہونے کا اسے رنج ہو۔ اسی طرح ایک شخص عمر بھر حج کی ادائیگی کے لیے ترستا رہا مگر رکاوٹ کی وجہ سے وہ اس حسرت کو لے کر مرا۔ اس کی نیابت میں جو ورثاء کسی نائب وکیل سے حج کروائیں گے تو اسے قبر میں خوشی حاصل ہوگی اور ثواب بھی ملے گا۔

اس صورت میں تو اجارہ صحیح ہوسکتا ہے مگر پہلی صورت میں ہر گز صحیح نہیں۔ ورنہ عبادت قیمتاً بکے گی اور دولتمند لوگ اسے قیمتاً خرید لیں گے۔ اور عبادت کی گانٹھیں خود ہی آدمی خرید کر خدا کو پارسل کر دیں گے اور جنت کا انحصار مال و دولت اور کرنسی پر ہو جائے گا۔ مالدار آدمی احساسِ عبدیت سے خالی ہو جائیں گے عمل کی کوئی اہمیت نہ رہے گی۔ پڑھی پڑھائی نمازیں، رکھے رکھائے روزے اور کیے کرائے حج قیمتاً مل جائیں گے اور یہ زر خرید مال خدا کو دے کر اس کے عوض جنت کے باغوں کا اور حور و قصور کا سودا ہو جائے گا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ روحِ عبادت ختم، احساسِ عبدیت معدوم، عبد و معبود کا تعلق قطع اور روحانی تربیت و ترقی مفقود ہو جائے گی بلکہ صرف کرنسی کا اقتدار رہ جائے گا۔ صاحب ثروت کو تو دنیاوی سامان کی طرح جنت کی نعمات بھی سستی اور بے تکلیف مل جائیں گی لیکن نادار و غریب دنیاوی ساز و سامان کی طرح ان سے محروم رہے گا۔ اس قسم کا تصور نہ صرف روحِ اسلام و دین کے سخت مخالف ہے بلکہ یہ لوگوں کو بے عمل بنانے کا ایک دلفریب نعرہ اور سازش بھی ہے۔

ہم شیعہ عزادار، آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے زیادہ منسلک ہیں اور ہمارا ان ذواتِ مقدسہ سے خاص ربط اور واسطہ ہے۔ ہم ان کے فضائل اور مصائب کی مجالس منعقد کرتے ہیں اور ان کی قربانیوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اسلام کی اہمیت اور احکامِ شریعت کی پابندی کا احساس ان ہی قربانیوں کی داستانوں میں مضمر ہے۔ ہم زبانی دعویٰ تو نہایت شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں لیکن ان کے فرامین کی تعمیل اور اس کی سیرت کی پیروی کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے آئمہ ایسے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ہمیں ان سے محبت اور ولا رکھنے کا حکم اس لیے بھی دیا گیا ہے کہ جس سے انسان محبت کرتا ہے اس کے اخلاق و عادات سے متاثر ہوتا ہے۔ محبوب کی سیرت محب کے دل پر نقش چھوڑتی ہے۔

عربی میں ایک مقولہ کہا جاتا ہے:

"اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ".

"محبوب اپنے محب کا دین ہے اور محب اس کے طور طریقے اختیار کرتا ہے"۔

پس انسان کو چاہئے کہ سوچ سمجھ کر دوست بنائے۔ اگر فاسق و فاجر اور جاہل دوست بنائے گا تو اس سے فسق و فجور، جہالت اور رذالت کے سبق سیکھے گا اور اگر متقی، صالح، اہل علم اور کریم دوست ہوگا تو وہ تقویٰ، عمل صالح، صدق و کرم اور علم و عرفان جیسے اوصاف اس کے دل میں اثر کریں گے اور نیک سیرت و نیک خیالات اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں گے۔

اہل بیت رسولؐ علیہم السلام کے ساتھ تمسک کرنے اور ان کے ساتھ محبت وولا کا رشتہ قائم کرنے کا حکم علیم وکبیر نے اسی لیے دیا ہے کہ میرے بندے، میرے رسولؐ کی اُمت ان کی محبت سے ان کے اخلاق کریمہ، عاداتِ صالحہ، اوصافِ حمیدہ اور درسہائے ایثار وقربانی سیکھیں گے۔ یہ ایسے معصوم رہنما اور سچے ہادی ہیں کہ جن کا قول، جن کا عمل، جن کی گفتار، جن کا کردار، حتیٰ کہ جن کی نشست و برخاست اور رفتار حجت اور نمونہ ہیں۔

ان کو رفیق قرآن اسی لیے قرار دیا کہ قرآن عملِ صالح کی الفاظ میں تلقین کرتا ہے اور یہ ہستیاں عمل صالح انجام دے کر قرآن کے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے اور یہ کر کے دکھاتے ہیں۔ قرآن قولی ہادی ہے اور یہ عملی ہادی ہیں۔ قرآن خاکہ پیش کرتا ہے اور یہ اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ قرآن احکام دیتا ہے اور یہ مجسمہ عمل بن کر اس کی تشریح کرتے ہیں۔ قرآن متن ہے اور یہ اس کی تشریح ہیں۔ قرآن مجمل ہے اور یہ اس کی تفصیل ہیں۔

قرآن نے اسلام کی صورت الفاظ میں پیش کی اور انہوں نے اسلام کی سیرت کا نقشہ اپنے کردار میں کھینچا ہے۔ قرآن ہدایت کا کلام ہے اور یہ ہدایت کے عملی نمونے ہیں۔ جس طرح قرآن ہر غلطی سے پاک ہے، اسی طرح یہ ہر خطا سے معصوم ہیں اسی لیے انہیں قرآنِ ناطق قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے اور کسی بندے کا کلام نہیں اور نہ ہی کسی انسان کا بنایا گیا ہے، اسی طرح یہ بھی خدا کی طرف سے ہادی اور رہنما ہیں، بندوں کے بنائے ہوئے اور مخلوق کے چنے ہوئے نہیں۔

جو مقام و مرتبہ قرآنِ صامت کا ہے، وہی مقام اور مرتبہ قرآنِ ناطق (آئمہ اہل بیت علیہم السلام) کا ہے۔ جس طرح قرآن شک وشبہ سے پاک ہے اور اس کے کلامِ حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اسی طرح ان کے امامِ حق ہونے میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ کلامِ حق ہے اور یہ آئمہ حق ہیں۔ جو ان میں شک کرے، خود اس کی ذات میں شک ہے۔ قرآن تمام کتابوں سے افضل ہے اور یہ ذواتِ مقدسہ تمام ہادیوں سے اکمل۔

قرآن میں تمام سابقہ کتب اور تمام انبیاء ماسبق کے علوم و معارف موجود ہیں۔ قرآن جامع کتبِ سابقہ اور جامع علومِ انبیاء ہے۔ قرآن بھی قیامت تک محفوظ ہے اور ان ذواتِ مقدسہ کی امامت بھی قیامت تک قائم ہے۔ جس طرح باقی تمام کتب نے قرآن سے علوم حاصل کئے ہیں اور قرآن نے کسی کتاب سے علوم اخذ نہیں کئے، اسی طرح تمام دنیا نے آئمہ اہل بیت علیہم

السلام سے علوم حاصل کئے اور انہوں نے کسی سے اخذ نہیں کئے۔ جس طرح قرآن کو کتب دنیا سے ممتاز کرنے کے لیے کپڑے کے غلاف میں لپیٹ کر احترام کیا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ قرآن مجید ہے اور جس طرح یہ عام کتب سے بلند و ممتاز ہے، اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیتؑ کو چادر تطہیر میں لپیٹ کر صحابہ و ازواج سے ممتاز کر دیا اور بتا دیا کہ ان کا مقام ان سے بلند ہے۔

حضرات! ان سے محبت و تمسک کرنے کا حکم اس لیے ہے کہ ہم ان سے اعمالِ صالحہ اور ایثار و قربانی کا درس لیں۔ تو ان کی قربانیوں کے تذکروں سے ہمیں اسلام کی عظمت اور احکامِ شرع کی اہمیت کا درس ملتا ہے کہ ان ذواتِ مقدسہ نے اسلام کو اپنے اوپر قربان نہیں بلکہ اپنے آپ کو اسلام پر قربان کر دیا۔ اسلام کی زندگی کو ختم نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی زندگیاں اسلام کے لیے وقف کر دیں۔

دو چیزوں میں سے جب ایک کو باقی رکھنا اور دوسری کو قربان کرنا ضروری ہو تو جو چیز اہم ہوتی ہے، اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ حضرتِ امامِ مظلوم سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام اور جنابِ شریکۃ الحسینؑ حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے اپنی زندگی اور اپنے پردے کو باقی نہیں رکھا بلکہ اسلام کی بقاء کیلئے ہی جان و مال اور پردے کی قربانیاں دیں۔

اگر ہمیں ان کی جانی، مالی اور پردے کی قربانیوں کا احساس ہے تو ہمیں ان کی عظمت و اہمیت کا احساس بھی ہونا چاہئے اور جس کے لیے انہوں نے قربانیاں دیں، ہم اسی اسلام اور شرع کو حقیر سمجھیں تو کیا اس کا یہی مطلب نہیں کہ ہم نے اہل بیت علیہم السلام کی قدر نہ کی؟ امامِ مظلوم علیہ السلام کا نعرہ آج بھی فضا میں گونج کر ندا دے رہا ہے:

"هَلْ مِنْ نَّاصِرٍ يَّنْصُرُنَا".

اس زمانے میں شہادتِ حسین علیہ السلام کے مقصد کی مدد کی بہت ضرورت ہے۔ مقصد و غرضِ شہادت کی تائید و تبلیغ کی ضرورت ہے۔ جس مقصد کی پاسداری عقیلۃ القریش شریکۃ الحسین علیہم السلام نے کربلا سے شام تک ہر منزل پر کی۔ جس مقصدِ شہادت کی تائید میں جنابِ ام کلثوم سلام اللہ علیہا، جنابِ فاطمہ صغریٰ سلام اللہ علیہا، حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا اور حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے کوفہ و شام کے بازاروں اور ملاعین کے درباروں میں خطبے پڑھے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے انصار و اقرباء علیہم السلام کی قربانیوں کا پیغام خواہرِ امام سلام اللہ علیہا نے مجمع عام میں بیان کیا۔ اسلام کی خاطر حضرتِ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے کربلا کا سفر کیا اور اسلام ہی کی خاطر مستوراتِ بنی ہاشم و اسیرانِ آلِ محمد علیہم السلام نے مدینہ سے کربلا تک اور کربلا سے شام تک کا سفر کیا۔

حسینؑ فاتحِ کربلا ہیں اور خواہرِ حسین علیہما السلام فاتحِ شام ہیں۔ اولادِ حضرتِ ابو طالب علیہ السلام اور آلِ رسولؐ کربلا میں شہید ہوئے اور مخدراتِ بنی ہاشم، بناتِ رسولؐ قید ہو کر شام میں آئیں۔

قید کا قصہ قتل کی داستان سے کم نہیں اور بازار کا واقعہ میدانِ شہادت سے کم دردناک نہیں۔ رسولؐ کی بیٹیوں اور دخترانِ زہراؑ کو شام کے سفر کرنے پڑے۔ کس طرح نبی زادیاں شام میں آئیں، ذرا تفصیل سے سنئے:

ورود شام

عابدؑ سے یہ کسی نے وطن میں کیا کلام
گزرے ستم زیادہ کہاں تم پہ یا امامؑ؟
رو رو کے تین بار کہا شام، شام، شام
سر ننگے میرا کنبہ تھا اور گرد خاص و عام
نیزہ ہلا ہلا کے عدو شاد ہوتے تھے
بابا کا سر بھی روتا تھا اور ہم بھی روتے تھے

بِنَفْسِیْ رُؤُسٌ مُعْلَنَاتٌ عَلَی الْقَنَا
اِلَی الشَّام تُهْدِیْ بَارِقَاتُ الاَسِنَّه
بِنَفْسِیْ خُدُودٌ فِیْ التُّرَابِ تَعَفَّرَت
بِنَفْسِیْ جُسُوْمٌ بِالْعَرَاءِ تَعَرَّتِ
رَبِیْعُ الیَتَامیٰ وَالْاَرَامِلِ فَابْکِهَا
مَدَارِسُ لِلْقُرْآنِ فِی کُلِّ سَحَرَة
وَ اَعْلَامُ دِیْنِ الْمُصْطَفیٰ وَ وُلَاتِه
وَ اَصْحَابُ قُرْبَانٍ وَ حَجٍّ وَ عُمْرَه

''میری جان قربان ہو اُن مقدس سروں پر جو نیزوں پر آشکار کیے گئے اور چمکدار نیزوں پر سوار کر کے شام، بطور تحفہ بھجوائے گئے۔ میری جان فدا ہو ان رخساروں پر جو خاک آلودہ تھے اور ان اجسام پر جو میدان کربلا میں بے گور و کفن تھے۔ وہ

یتیموں اور بیواؤں کیلئے بہار تھے۔ ان پر آنسو بہاؤ جو ہر صبح قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے، جو دین مصطفیٰ، آپ کی ولایت اور علم کے والی اور اصحاب قربانی و حج وعمرہ تھے"۔

بِنَفْسِی النِّسَاءُ الْفَاطِمِیَّاتُ اَصْبَحَتْ
مِنَ الْاَسْرِ یَسْتَرْ نَفْنَ مَنْ لَیْسَ یَرْنَفُ
وَ قَدْ ابْرُوزُهَا جِهْرَۃً مِنْ خُدُوْرِهَا
عَشِیَّۃً لَا حَامٍ یَذُوْدُ وَ یَکْنَفُ
تَوَارَتْ بِخِدْرٍ مِنْ جَلَالَۃِ قَدْرِهَا
بِهَیْبَۃِ اَنْوَارِ الْاِلٰهِ یُسْجَفُ
لَقَدْ قَطَعَ الْاَکْبَادَ حُزْنًا مُصَابُهَا
وَ قَدْ غَادَرَ الْاَحْشَآءِ تَهضُوْدُ تَرْجُفُ

"ہماری جانیں قربان ان فاطمی مستورات پر، بنات علیؑ و بتولؑ پر جو قید کی وجہ سے اس قدر بے وارث تھیں اور ان لوگوں سے رحم کی طالب تھیں جو رحم سے نا آشنا تھے"۔

"سنگدل بے حیاؤں نے انہیں اس وقت بے پردہ و بے حجاب کیا جبکہ ان کے حامی و مددگار مارے گئے تھے۔ ان کی کوئی حمایت کرنے والا نہیں تھا جو دشمنوں کو ان سے دور کرتا"۔

"جلالت قدر کے پردے میں وہ محجوب تھیں اور ہیبت انوار الٰہی کی پوشش میں مستور تھیں"۔

"ان کی مصیبت اور دکھوں نے غم وحزن کی وجہ سے کلیجے پارہ پارہ کر دیئے اور دل سینوں میں لرزنے اور کانپنے لگے"۔

آخر کار حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام اپنی پھوپھیوں، ماؤں، بہنوں اور یتیم بچوں کے ساتھ دکھوں کا دریا عبور کر کے غموں کے منجدھار اور مصیبتوں کے گرداب، دمشق میں پہنچ گئے۔

ہماری لاکھ جانیں قربان ہوں مدینہ کی ان شہزادیوں اور ہاشمی مستورات پر جنہوں نے سینکڑوں میلوں کی مسافت دکھی دلوں، تھکے ہوئے زخمی بدنوں اور برہنہ سروں کے ساتھ شتران بے کجاوہ کی پشتوں پر طے کی۔ دشوار گزار راہوں، اونچے نیچے

پہاڑوں اور خارزار جنگلوں کو بھوک و پیاس کی تکلیفوں کے ساتھ عبور کیا۔ ایک شہر کے ہجوم سے وداع ہوتیں تو دوسرے شہر کے تماش بین لوگ انتظار میں ہوتے۔ کسی منزل پر قیام و کوچ اپنی مرضی میں نہ تھا۔

یہ بے وارث شہزادیاں اور بے وطن قیدی ان ظالموں کی مرضی کے پابند تھے جن کی فطرت میں ظلم و تشدد رچ بس چکا تھا۔ کوئی اور مستورات ہوتیں تو یقیناً راہ میں مر جاتیں، لیکن یہ ہاشمی مستورات تھیں جنھوں نے عزم و ہمت کی غذا اور صبر و تحمل کی خوراک سے پرورش پائی تھی۔ بیت الوحی اور مدارسِ آیاتِ قرآن کی تعلیم یافتہ تھیں۔ نبوت اور امامت کے چشموں سے سیراب ہوتی رہیں۔ حق و صداقت کی خاطر قربانی دینے کی تربیت سے آراستہ تھیں۔ عزم و استقلال کا کوہِ گراں تھیں۔ ہیبتِ الٰہیہ، عزیمتِ محمدیہؐ، جلالتِ حیدریہؑ، حشمتِ حسنیہؑ، استقامتِ حسینیہؑ اور قوتِ قدسیہ کی مالک و وارث تھیں۔ جس مقصد کو لے کر حسین علیہ السلام مدینہ سے کربلا آئے، اسی مقصد کو لے کر یہ کربلا سے شام آئیں۔ حسین علیہ السلام نے بھی اپنا عہد و پیمان پورا کر دیا اور انہوں نے بھی اپنا عہد و پیمان نبھایا۔

مقصد شہادتِ حسین علیہ السلام اور ان کے اقدامات کو جنگلوں، شہروں، بازاروں اور درباروں میں اس انداز سے پیش کیا کہ ان کی تقریر کا ہر لفظ سامعین کے دلوں میں اتر گیا۔ اسی مقصد کی عظمت، نصب العین کی پاکیزگی اور حق و صداقت کے پرچار اور اعلاءِ کلمۃ الحق نے ان کی قوتوں کو مضمحل نہ ہونے دیا۔ بدن تھک گئے مگر ارادے اور ولولے تازہ رہے۔ جسم کمزور ہو گئے مگر دل و دماغ مضبوط رہے۔ پیاس کی وجہ سے ہونٹ خشک ہو گئے، حلق کانٹا بن گئے مگر زبانیں حق و صداقت کے بیان سے تر رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے اہم اُمور اور عظیم فرائض کی انجام دہی کیلئے خدا ایسی ہی ہستیاں خلق فرماتا ہے۔

عابدؑ کے رُک رہے ہیں قدم شام آگئی
زینبؑ اسیر رنج و الم شام آگئی
چہرے پہ قیدیوں کے لکیریں ہیں خون کی
تاریخ ہو رہی ہے رقم شام آگئی

الغرض شام آگئی۔ سفر ختم ہو گیا۔ یزید کے پایۂ تخت دمشق کی دیواریں نظر آگئیں۔ دمشق سے باہر ایک مقام جسے جیرون کہتے ہیں، میں یزید کا ایک محل تھا اور یزید اس وقت اپنے اسی محل کی بالائی منزل پر بیٹھا ہوا تھا اور قیدیوں کے قافلہ اور سروں کی آمد کے انتظار میں تھا۔ اسے دور سے یثرب کے قیدی اور شہداء کے سر نظر آنے لگے۔ یہ سرور اور نشہ میں مخمور تھا اور اپنی فتح و کامیابی کے گھمنڈ میں شادمان تھا۔ اسی اثناء میں ایک کوے نے کائیں کائیں کی۔ یزید نے یہ شعر پڑھے:

لَمَّا بَدَتْ تِلْکَ الحُمولُ وَ اَشْرَفَتْ
تِلْکَ الرُؤُسُ عَلٰی رُبا جَیْرُوْن
نَعِبَ الغُرَابُ فَقُلْتُ صِحْ اَوْلَا تَصِح
فَلَقَدْ قَضَیْتُ مِنَ الرَّسُوْلِ دُیُوْنِی

"جب سواریاں ظاہر ہوئیں اور سر جیرون کے ٹیلوں پر نمودار ہوئے تو کوا چلانے لگا۔ میں نے اسے کہا اب تو چلا یا نہ چلا! میں نے رسولؐ سے اپنے قرضے چکا لئے ہیں"۔

یزید کا یہ اشارہ تھا کہ عہد نبوی کی اسلامی جنگوں اور خاص طور پر بدر کی جنگ میں جو بنی اُمیہ کے افراد خصوصاً اُموی سردار مارے گئے تھے، میں نے جنگ کربلا میں پیغمبرؐ خدا کی اولاد کو قتل کر کے اور ان کی بیٹیوں کو قید کر کے ان کا بدلہ چکا لیا ہے۔

دمشق کی سجاوٹ

یزید کو قتل حسین علیہ السلام اور جنگِ کربلا کی ظاہری فتح پر انتہائی خوشی تھی۔ اپنی مادی کامیابی اور مستورات بنی ہاشم کی دربار میں پیشی پر اس نے جشن مسرت منانے کا فیصلہ کیا اور ہر قبیلہ کے سردار کو دمشق میں ایک گروہ کثیر کے ساتھ حاضر ہونے کی دعوت دی۔

دمشق کی آئینہ بندی، بازاروں اور دیواروں کی آرائش اور دربار کی زیبائش کا حکم دیا۔ درباری افسروں کو شاہی خلعتیں تقسیم کی گئیں اور باشندگانِ دمشق اور اطراف واکناف کے لوگوں کو لباسِ فاخرہ پہننے، خوشبوئیں لگانے اور خوشیاں منانے کی تاکید کی گئی۔

زن و مرد اس مسرت میں شریک تھے۔ آلات لہو ولعب، شادیانے، طبلہ اور ڈھول بجانے کا خاص تاکیدی حکم تھا۔ ہر قبیلہ کا امیر اپنے ساتھ ایک گروہ مردم اور شادیانے اور گانے بجانے کے آلات لے کر قیدیوں کا نظارہ دیکھنے کے لیے باہر نکلا۔ ایسے مواقع پر اشرار اوباش، کمینے اور ذلیل قسم کے لوگ زیادہ تعداد میں جمع ہوتے ہیں اور بے دین، پست اور خوشامدی کمینے شاہوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں کس قدر غلط تعریف وتوصیف بیان کرتے ہیں اور ان کے مخالفین خواہ کتنے ہی شریف کیوں نہ ہوں، ان کے حق میں ناز یبا و گستاخانہ اور دل دُکھانے والے فقرات استعمال کرتے ہیں۔ یہی حالات دمشق کے بازاروں اور بیرونِ شہر مجمع عام کے تھے۔

اہل حرم کربلا سے شام تک ہر بڑے شہر میں مجمع عام اور لوگوں کا اژدہام، خلق کثیر، شریروں کی بھیڑ دیکھتے دیکھتے اور ہجوم اشرار کو عبور کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے۔ ایک شہر کی تماش بین نگاہوں سے نجات ملتی تو دوسرے شہر کے لوگ قیدیوں کے آنے کے انتظار میں ہوتے۔ دمشق تو تمام برائیوں اور بے حیائیوں کا مرکز تھا اور اہل بیت علیہم السلام کے دل دُکھانے اور انہیں غمگین کرنے کا ہر قسم کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔

حضرتِ امّ کلثوم سلام اللہ علیہا کا سوال

اہل حرم ابھی دمشق شہر سے باہر تھے کہ لوگوں کا سیلاب شہر سے باہر اُمڈ پڑا۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں تماشائی جمع تھے، جن کی نظریں قیدیوں کی جانب تھیں۔

قدرتِ خدا کہ جشن ہے قتلِ حسینؑ کا

تماشائیوں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھ کر جناب امّ کلثوم بنت علی علیہم السلام نے شمر ملعون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”شمر! میرا ایک سوال ہے“۔

حضرات! جنابِ امّ کلثومؑ کا سائل ہونا اور پھر شمر کمینے سے، دمشق سے باہر دشمن کے شہر میں کتنی اذیت ناک بات ہے۔ یہ ہے انقلابِ زمانہ!

شمر نے سوال پوچھا۔ جنابِ امّ کلثوم سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

”دیکھ شمر! ہم رسولؐ کی بیٹیاں، علیؑ و بتولؑ کی شہزادیاں ہیں۔ گھروں سے باہر کبھی نہ جاتی تھیں۔ آج دربار کی پیشی ہے۔ ہمارے سر اور چہرے بغیر چادروں کے ہیں۔ ہزاروں کے مجمع عام میں سے ہمیں نہ گزار۔ لوگوں کی نگاہوں سے دُور رکھ اور ہمیں ایسی گلی سے دربار میں لے جا جہاں لوگوں کا ہجوم کم ہو اور تماشائی زیادہ نہ ہوں۔

دوسری بات یہ کہ شہداء کے سروں کو مستورات کے محملوں سے دور رکھ تاکہ لوگ سروں کے دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ہماری طرف تماشائیوں کی نگاہیں نہ اٹھیں“۔

شریف زادیوں کا سوال تھا۔ شریف ہی شرفاء کی قدر کرتے ہیں۔ کمینے لوگ شریفوں کی قدر کیا جانیں؟ یہ کیا کم مصیبت ہے کہ شریف زادی کمینے سے سوال کرنے پر مجبور تھی اور پھر اس کمینے نے جس انداز سے جواب دیا، شریف زادی اور دختر رسولؐ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ سوائے ضبط کے کوئی چارہ نہ تھا۔ فریاد کا کوئی مقام نہ تھا۔ خودکشی حرام تھی۔ بے نیاز کی آزمائش

پر صبر کیا۔ سر جھکا لیا، مدینے کی طرف نظر کی اور امتحان دیکھ کر عزم و استقلال کو سنبھالا دیا۔

شمر نے جواب دیا: "رسول زادیو! یہ مجمع عام تو تمہارے تماشہ کیلئے ہی اکٹھا کیا گیا ہے۔ بازار تمہارے لیے ہی سجائے گئے ہیں اور عام لوگوں کو تمہارے ہی استقبال کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ جشن مسرت تمہارے واسطے ہی منایا جا رہا ہے۔ لہٰذا تمہیں مجمع عام اور بازار کی بھیڑ کے درمیان سے ہی گزاروں گا"۔

اس کمینے نے سر اٹھانے والوں کو حکم دیا کہ سروں کو محملوں کے ساتھ ساتھ رکھو اور ایسے نازیبا و گستاخانہ الفاظ کہے کہ نبیؐ زادیوں کے دل زخمی ہو گئے اور کلیجے پھٹ گئے۔ اس ملعون نے سادات کو باب الساعات سے گزارنے کا حکم دیا جس میں لوگوں کی سب سے زیادہ بھیڑ تھی۔

ایک تابعی کی روپوشی

تابعین وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ تو نہ پایا ہو لیکن ان کے اصحاب کا زمانہ پایا ہو۔ ایک تابعی کے متعلق روایت ہے کہ شہر دمشق میں رہتا تھا۔ جب سرہائے شہدائے کربلا علیہم السلام اور اسیران آل محمد علیہم السلام نہایت خستہ حالت میں قیدیوں کی طرح شام میں لائے گئے تو اس کے دل پر سخت چوٹ پڑی۔ وہ شدت غم کی وجہ سے ایک مہینہ روپوش رہا۔ اس کے دوستوں نے اس کی تلاش شروع کی اور ایک مہینہ کے بعد اس کو ڈھونڈ نکالا اور اس سے روپوشی کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا: "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم پر کیا مصیبت نازل ہوئی؟ خاندانِ رسالت کے ساتھ امت نے کیا سلوک کیا؟" پھر اس نے نہایت درد و الم میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار پڑھے:

جَاءُ و بِرَاسِکَ یَا بنَ بِنتِ محمدٍ
مُتَـرمِّلاً بِـدِمَـائِکَ تَـرمِیلاً

وَ کَاَنَّمَا بِکَ یَا بنَ بِنتِ محمدٍ
قَتَلُوا جهاراً عَامِدِیْنَ رسولا

قتلُوکَ عَطْشاناً وَ لَمْ یَتَرقَّبُوا
فِیْ قَتْلِکَ التَّاوِیلا وَ التَّنزِیْلا

وَ یُکَبِّرُوْنَ بِاَنْ قُتِلْتَ وَ اِنَّمَا
قَتَلُوْا بِکَ التَّکْبِیْرُوا التَّهلِیْلا

''اے نواسۂ رسولؐ! تیرا خون آلودہ سر نیزے پر سوار کر کے شام لائے۔ گویا کہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے رسول کو قتل کیا ہے''۔

''ان ظالموں نے تجھے پیاسا شہید کیا ہے اور تیرے قتل کرنے میں قرآن اور اس کی تاویل کا کچھ لحاظ نہ کیا''۔

''تیرے قتل پر ان لوگوں نے نعرہ تکبیر بلند کئے۔ تیرے قتل کے ساتھ انہوں نے تکبیر و تہلیل کو قتل کر ڈالا ہے''۔

سھل بن سعد ساعدیؓ

سہلؓ بن سعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر بیت المقدس کی زیارت کیلئے روانہ ہوا اور وہاں سے میں شام پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شہر کے دروازے آراستہ ہیں۔ بازار سجائے گئے ہیں۔ جھنڈے بلند کئے گئے ہیں۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں زرق برق لباس پہنے چل پھر رہے ہیں۔ دکانوں پر زرق نگار پردے لٹکائے گئے ہیں۔ گلیاں اور بازار ہجوم خلق سے بھرے ہوئے ہیں۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ عورتیں خوبصورت لباس پہنے فرطِ مسرت سے طبلے اور دفیں بجا رہی ہیں۔ زن و مرد نہایت خوشی کے عالم میں بازاروں اور گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ گویا ایک عظیم الشان جشن منایا جا رہا ہے۔ شام کی یہ حالت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔

یا اللہ! آج عید بھی تو نہیں ہے اور یہ اسبابِ سرور کیوں؟

سہلؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ دیکھا جو آپس میں کچھ خفیہ باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب گیا اور وجۂ مسرت پوچھی کہ آج یہ خوشیوں کا سامان کیسا ہے؟

انہوں نے کہا: یا شیخ! تم کوئی اجنبی معلوم ہوتے ہو اور شہر کے حالت سے ناواقف دکھائی دیتے ہو۔

میں نے کہا: میں صحابیِ رسولؐ ہوں، میرا نام سہلؓ بن سعد ہے اور میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔

انہوں نے کہا: اے سہلؓ! زمین پھٹ کیوں نہیں جاتی اور آسمان گر کیوں نہیں پڑتا؟ خون کی بارش کیوں نہیں ہوتی؟ دنیا کیوں قائم ہے؟ کتنی بڑی مصیبت واقع ہوئی ہے! یہ نواسۂ رسول کا سر عراق سے دربارِ یزید میں لایا جا رہا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام مع اقرباء و انصار میدانِ جنگ میں پیاسے مارے گئے۔ ان کی مستورات کو قیدیوں کی طرح بے پالان اونٹوں پر سوار کر کے سر برہنہ بازار کے ہجوم سے گزارنے کیلئے لایا جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت ہو سکتی ہے؟''

سہلؓ کہتے ہیں: ''یہ سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہائے! حسینؑ کا سر نیزے پر؟ رسولؐ کی بیٹیاں

اونٹوں پر بلوۂ عام میں؟ بے مقنعہ و چادر؟ اتنا ظلم؟ اور لوگ خوش ہو رہے ہیں؟؟"

قتل حسینؑ پر جشن مسرت اور نبیؐ زادیوںؑ کی قید پر عید!

سہلؓ نے سر پیٹ کر کہا: "کس دروازے سے آ رہے ہیں؟؟"

انہوں نے جواب دیا: "باب الساعات سے داخل ہو رہے ہیں"۔

شدتِ غم سے یہ صحابی روتا ہوا اس جانب بڑھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ جھنڈوں کے پیچھے جھنڈے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے نیزوں پر سر سوار ہیں۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہے جس کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے اور جس پر ایک سر ہے، جس کا چہرہ نورانی، پیشانی روشن اور چاند کی مانند گول ہے۔ زلفیں مبارک ہوا میں لہرا رہی ہیں اور ریشِ مبارک پر خضاب کا اثر ہے۔ جس کی سیاہ اور چمکدار آنکھوں سے جمال محمدیؐ اور جلال حیدریؑ آشکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ہیں۔ سہلؓ کا بیان ہے کہ سب سروں سے آگے حضرت عباس علیہ السلام کا سر تھا۔ رعب و جلال چہرۂ اقدس سے نمایاں تھا اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے مشابہ تھا۔

ان سروں کے بعد چند عورتیں بے کجاوہ اونٹوں پر سوار تھیں جن کے سروں پر چادریں نہ تھیں۔ غربت برس رہی تھی اور بے پردہ بیبیاں حسرت سے سر جھکائے ہوئے تھیں۔ لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور وہ سوئے زمین دیکھتی تھیں۔ کوٹھوں کی چھتوں پر عورتوں کا ہجوم تھا۔ قربان ہوں لاکھوں جانیں ہم عزاداروں کی، اے دخترانِ رسولؐ! بتولؑ کی بیٹیاں پشتِ شتران پر غم کے آنسو بہا رہی تھیں اور زنانِ فاحشہ کوٹھوں پر مسکرا رہی تھیں۔ بعض عورتوں کی جھولیوں میں پتھر تھے۔ یتیم بچوں اور سر برہنہ نبیؐ زادیوں پر شام کی ان عورتوں نے پتھر برسانے شروع کر دیے۔

سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ جب یہ لاوارث بیبیاں اور یتیم بچے بیکسی و مظلومی کی حالت میں بازار سے ہجوم کو چیر کر گزر رہے تھے تو یکا یک چھتوں سے پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ایک مکان کے ذربہ میں پانچ عورتیں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک بوڑھی اور کبڑی عورت تھی۔ جب حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کا چاند اس منزل کے قریب سے گزرا تو اس ملعونہ نے پتھر مارنے شروع کیے۔ ایک پتھر نورِ رسالتؐ اور عینِ بتولؑ کے دندانِ مبارک پر لگا۔

سہلؓ کہتے ہیں: "میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ میں اور تو کچھ نہ کر سکا۔ ہاتھ اٹھائے اور غمزدہ دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ یہ بددعا دی:

"اَللّٰھُمَّ اَھْلِکْھَا وَ اَھْلِکْھُنَّ مَعَھَا بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِہٖ اَجْمَعِیْنَ"۔

''خدایا! اس بد بخت بوڑھی عورت کو اور اس کی ساتھ والی عورتوں کو ہلاک کر!''

ابھی سہلؓ کی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ ڈربہ ٹوٹ گیا اور وہ ناپاک عورتیں اس میں سے گر کر ہلاک ہو گئیں۔

سہلؓ کہتے ہیں: ''پہلے اونٹ پر ایک چھوٹی بچی سوار تھی۔ میں اس کے قریب گیا اور پوچھا:

''مَنْ اَنْتُمْ؟''

قَالَتْ: ''اَنَا سَکِیْنَۃُ بِنْتُ الْحُسَیْنِ''.

''میں سکینہ بنت الحسین علیہم السلام ہوں۔''

میں نے کہا: ''میں سہلؓ بن سعد ہوں اور آپ کے جدامجد حضرت رسولؐ خدا کا صحابی ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بجالاؤں؟''

جنابِ سکینہؑ نے فرمایا: ''یا شیخ! ان سر اٹھانے والوں سے کہو کہ یہ سر ہم سے دور لے جائیں تاکہ لوگ ان سروں کو دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ہم نامحرموں کی نگاہوں سے محفوظ ہو جائیں''۔

سہلؓ کا بیان ہے کہ میں حاملین کے پاس آیا۔ میرے پاس چار سو دینار تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ چار سو دینا تمہیں پیش کرتا ہوں۔ ان سروں کو مستورات سے دور رکھو تاکہ لوگ خاندانِ رسالتؐ کی شہزادیوں کی طرف نہ دیکھیں اور سروں کو دیکھنے میں ہی مصروف رہیں۔ وہ لوگ اس بات پر آمادہ ہو گئے اور میں نے مذکورہ رقم ان کے حوالہ کر دی۔

بازار کا سفر

واضح رہے کہ جس روز مستوراتِ سادات دمشق میں پہنچی ہیں اسی روز داخلِ شہر نہیں ہوئیں۔ کم از کم ایک روز تک بیرونِ شہر بیٹھی رہیں کیونکہ ابھی تک شہر کی آرائش مکمل نہ ہوئی تھی اور بازار اور دربار سجے نہ تھے۔ اسی واسطے اسیرانِ مدینہ کو ایک دن اور ایک رات شہر سے باہر قیام کرنا پڑا۔ ویسے کئی کتابوں میں تو تین دن بھی مذکور ہیں۔

جب پوری طرح شہر کی آئینہ بندی ہو چکی تھی اور مکمل طور پر شہر سج گیا، آس پاس کے تمام رؤساء، امراء اور رعایا کے لوگ دمشق میں پہنچ چکے تو تب قیدی امام علیہ السلام اور مستوراتِ آلِ محمد علیہم السلام کو داخلِ شہر ہونے کا حکم ملا۔

کتنا مجمع تھا؟ شہر کے گلی کوچے، بازار و میدان زن و مرد سے بھرے ہوئے تھے۔ جہاں قیدی قیام پذیر تھے، کھلا میدان تھا۔ عرصہ محشر معلوم ہوتا تھا۔ تاریخیں بتاتی ہیں کہ تقریباً پانچ لاکھ کی تعداد میں شامیوں نے دخترانِ رسولؐ کا استقبال کیا اور

تماشہ دیکھا۔ دوسرے روز باب الساعات کی طرف سے بازار میں اسیرانِ آلِ محمدؑ کو داخل کیا گیا۔

یہ جو پڑھتے ہیں کہ اسیرانِ آلِ محمدؑ کو تین میل یا نو میل دمشق سے باہر حکم ملا کہ پیدل چل کر شہر میں آئیں اور پیدل بازار کا سفر کریں، بالکل غلط ہے، سراسر غلط ہے۔ کسی معتبر کتاب میں پیدل چلنے کی روایت موجود نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ امر مقصدِ یزید کے خلاف تھا کیونکہ اس ملعون کو اہل بیتؑ کی ہر طرح کی توہین مقصود تھی۔ مجمع عام اِس لئے اکٹھا کیا گیا تھا کہ لوگ قیدیوں کو دیکھیں۔ ہزاروں اور لاکھوں کے مجمع میں زمین پر چلنے والے قیدی کیسے نظر آسکتے تھے؟ معمولِ سابق کے مطابق اونٹوں پر سوار تھے اور ہر شخص اونٹوں کی بلندی پر دیکھتا تھا، جس طرح کہ سر نیزوں پر سوار تھے تاکہ ہر شخص کو نظر آئیں۔

بلند آواز سے ندا دی جاتی تھی کہ لوگو! آلِ محمدؑ کے قیدیوں کا تماشا دیکھو، آلِ محمدؑ کے اسیر آگئے ہیں۔ یہی درد سید سجادؑ اور دخترانِ زہراؑ کو کھا گیا تھا کہ بتولؑ کی بیٹیاں پشتِ شتران پر بے مقنعہ و بے چادر ہیں اور لاکھوں تماشائی ہیں۔ خود سید سجادؑ بھی اونٹ پر سوار رہے۔ کربلا سے شام تک اونٹوں کا سفر کیا۔

روایات میں اِتنا آیا ہے کہ گر پڑنے کے خوف سے سید سجاد علیہ السلام کے پاؤں اونٹ کے پیٹ کے ساتھ باندھ دیئے گئے تھے۔ بازار کا سفر تین چار فرلانگ سے زیادہ نہ تھا لیکن طلوعِ آفتاب کے کچھ بعد اسیرانِ کربلا بازار میں داخل ہوئے اور زوالِ آفتاب کے بعد دربار تک پہنچے۔ بازار کی بھیڑ اور ہجومِ عام کو چیر کر آنا تھا۔ تماشائیوں کا اصرار تھا کہ بار بار اونٹ روک دیئے جاتے یا یزید کا ارادہ یہ تھا کہ یہ سفر آہستہ آہستہ طے ہو اور مستورات و سید سجاد علیہ السلام کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچے۔

حضرات! بازارِ شام مصیبت میں میدانِ کربلا سے کم نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ بازارِ شام میں قیدیوں کا ایک قدم شہدائے کربلا علیہم السلام کی قربانیوں کے برابر ہے۔ اوباش لوگوں کے طعنے سننے، فاحشہ عورتوں کی زبان درازیاں، پتھروں کی بارش اور بے حیاؤں کے مجمع عام میں سے مستوراتِ ہاشمیہ کا بے حجاب گزرنا۔ ان کا ایک ایک قدم ہزاروں شہادتوں سے زیادہ دردناک اور غم خیز ہے۔

شہیدِ راہِ خدا شہادت پا کر راحت میں چلے گئے لیکن اسیرِ راہِ خدا کا ہر دم درد میں اور ہر پل مصیبت میں۔ پھر جہاں غیرت کا سوال ہو، مستورات ہوں اور وہ بھی قیدی ہوں۔ تمام کائنات اور سارے جہاں میں کوئی گھرانہ ان کا ہم مثل نہ ہو اور وہ برہنہ سر بازاروں میں!

آج کوئی شریف خاندان اپنی مستورات کو بازار کی طرف بھیجنے پر رضامند نہیں ہوتا حالانکہ باپردہ سواریوں کا انتظام

بھی ہوتا ہے۔ لیکن رسولؐ کی بیٹیاں، عبدالمطلبؑ کی اولاد، دختران علیؑ و بتولؑ، پرانے لباس میں سر برہنہ کنبہ قتل کروا کے، گھر جلوا کے، سامان لٹوا کے، عزیز سامنے نیزوں پر اور خود شتران بے کجاوہ پر سوار، دربار میں حاضری کیلئے لائی جا رہی ہیں:

غلغلہ یہ ہو گیا تھا ہر خاص و عام میں
سر ننگے زینبؑ آئی ہے بازار شام میں

شہیدانِ کربلا صرف ایک دن روزِ عاشور سختیاں اٹھا کر بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہو گئے لیکن حضرت سیّد سجاد علیہ السلام کربلا سے شام کے زندان تک ہر ہر قدم پر شہید ہوتے آئے۔ شہدائے کربلا علیہم السلام صرف ایک بار قتل ہوئے لیکن اسیرانِ کربلا ہر ہر قدم پر بار بار قتل ہوتے رہے۔ ان کی قید میں ہزاروں قتلوں کا درد ہے اور ان کے سفر میں کئی شہادتوں کا غم ہے۔

بہر حال قید کا قصہ قتل کی داستان سے زیادہ غم انگیز ہے اور بازاروں اور درباروں کی مصیبت میدانِ کربلا کی مصیبت سے کہیں زیادہ ہے۔

سرِ اطہرِ حضرتِ امام حسین علیہ السلام

حضرت امامِ مظلوم علیہ السلام کا سرِ اطہر نیزے پر سوار تھا۔ حسن کا بدرِ منیر تھا اور آپؑ کے چہرۂ اقدس سے رعب و جلال ٹپک رہا تھا۔ تاریخ نے اس وقت کی یوں تصویر کشی کی ہے۔ ہیئتِ محمدیہؐ اور حشمتِ حیدریہؑ نمایاں تھی، نور چمک رہا تھا، رعب ٹپک رہا تھا، بڑھاپے کے آثار نمایاں تھے، خضاب لگا ہوا تھا، آنکھیں سیاہ تھیں، ابروئیں کمان کی مانند نوکدار تھیں، پیشانی کشادہ، ریش مبارک گول، چہرہ پر بشاشت تھی۔ زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور لوگ محوِ حیرت و تماشائے جمال تھے۔ میر انیس کے بند کا کیا ہی سوزوں مقام ہے:

وہ ریش مخضب وہ رخِ سیّد والا — ہے چاند نے منہ شام کے پردے سے نکالا
وہ گیسوئے مشکیں کا رخِ پاک پہ ہالا — تھا صبح پہ دامن شبِ معراج نے ڈالا
رُخساروں پہ کچھ زلف سی لہرائی ہے
خورشید پہ زہراؑ کے گھٹا چھائی ہوئی ہے

اس سرِ مبارک سے آگے آگے ایک شخص سورۂ کہف کی تلاوت کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ اس مقام پہ پہنچا:

"اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا".

تو آواز آئی:-

"قَالَ قَتْلِیْ وَ حَمْلِیْ".

"میرا قتل ہونا اور نوکِ سناں پہ سوار ہونا اصحاب کہف سے زیادہ عجیب ہے"۔

آواز عیاں شد از سر شاہ

ہست آں عجبا یا ایں عجبا

تماشائیوں کے ہجوم میں عورتیں بھی شامل تھیں اور مرد بھی۔ جنگِ صفین میں شامی مرد کافی مارے گئے تھے۔ ان کی عورتیں بغض و کینہ دلوں میں لئے فرحان وشاداں تھیں۔ طنزیہ کہتی جاتی تھیں اور پتھر بھی مارتی جاتی تھیں۔ کچھ لوگ امیر ملک اور حاکم وقت کے حکم کی تعمیل میں آلِ محمد علیہم السلام کو سب وشتم کر رہے تھے اور کچھ خوشامد اور چاپلوسی کے سلسلے میں زبان درازیاں کر رہے تھے اور کچھ اوباش تماشہ کے خاطر جمع ہوئے تھے۔

بہر حال غمگسار اور ہمدرد نہ ہونے کے برابر تھے۔ اکثر لوگ ان کی شرافت وشان اور عزت وخاندان سے ناواقف تھے۔ عام لوگوں کی روش کے مطابق، یہ لوگ بھی ان قیدیوں کو باغی سمجھے ہوئے تھے اور لوگوں کی دیکھا دیکھی محوِ رقص و مسرت تھے۔ یہی حالت عورتوں کی تھی۔ بعض عورتیں نرم دل بھی ہوتی ہیں۔ ان کے دل بھر آتے تھے۔ جب کچھ عورتوں نے یہ نرالے اسیر دیکھے تو کہنے لگیں:

"شکل وشباہت سے یہ کسی اونچے خاندان کے قیدی نظر آتے ہیں۔ کسی شاہی خاندان کے سر اور اسیر ہیں۔ نامعلوم کس مصیبت میں گرفتار ہو کر آئے ہیں۔ ہم نے آج تک اتنے رعب وہمت والے قیدی نہیں دیکھے۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے، کوئی عظیم خاندان گرفتارِ بلا ہے"۔

کسی نے جا کر پوچھا:

"مِنْ اَیِّ السَّبَایَا اَنْتُمْ؟"

جنابِ سکینہ بنت الحسین علیہم السلام نے جواب دیا:

"نَحْنُ سَبَایَا آلِ مُحَمَّدٍ".

دربارِ یزید

منزلِ شام کہاں عترتِ شبیرؑ کہاں

ہائے سجادؑ کو لے آئی تقدیر کہاں

امام علی ابن الحسین علیہم السلام بازار کو عبور کر کے، ہجوم عام اور اشرار کی بھیڑ کو چیر کر دربار یزید تک پہنچ گئے اور سر سید الشہداء علیہ السلام بازار کا سفر طے کر کے، فاحشہ عورتوں کے پتھروں سے مجروح ہو کر، تمام سروں سمیت دربار یزید کی سیڑھیوں تک آ گیا۔

مستورات اہل بیت علیہم السلام بازار سے گزر کر اس آخری منزل تک پہنچ گئیں جس کیلئے یہ طویل سفر طے کروایا گیا تھا۔ منازل امتحان کی یہ آخری منزل تھی اور مراحل مصیبت کا آخری مرحلہ۔ سروں اور قیدیوں کا قافلہ تماشائیوں کے ہجوم میں سر دربار آ گیا، لیکن ہنوز دربار میں داخلہ کی اجازت نہ تھی اور اس قافلے کو دربار سے باہر روک کر دربار کی سیڑھیوں کے قریب ہی کھڑا کر دیا گیا کیونکہ ابھی دربار صحیح طرح سجا نہ تھا۔ اسیران آل محمدؐ علیہم السلام کو اس جگہ ٹھہرایا گیا تھا جہاں عام قیدی کھڑے کئے جاتے تھے اور مغلوبہ جنگوں کے گرفتار اسیران کا قیام ہوتا تھا۔

دربار یزید خوب سجایا گیا تھا اور یزید کیلئے ایک ایسا تخت بچھایا گیا تھا جس میں ہر قسم کی آرائش تھی۔ اس تخت کے دائیں بائیں سنہری زر کرسیاں قرینہ سے رکھی گئی تھیں، جن پر عمائدین سلطنت اور اکابر شام و قریش بیٹھے تھے۔ یزید تاج حکومت سر پر رکھے، فتح کے نشے میں چور اور خمار سلطنت میں مخمور، شاد و مسرور بیٹھا تھا۔ ہر کس کو اذنِ دخول حاصل تھا۔ چنانچہ اس کا وسیع دربار حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ آج اسے اس ظاہری کامیابی پر انتہائی خوشی تھی۔ اس کی دوہری خوشی تھی کہ ایک تو مخالفین مارے گئے، ان کے مقتولین کے سر اور ان کی مستورات کو قیدی بنا کر حاضر کیا گیا تھا۔ اس کی سلطنت وسیع اور مضبوط تھی اور اس کا غلبہ مستحکم تھا۔ دوسری خوشی اسے یہ تھی کہ اس نے خاندانی عداوت میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور جنگ بدر کے اموی مقتولین کا بھرپور بدلہ لے لیا تھا۔

جس طرح دربار میں حاضری کا یہ دن آل محمد علیہم السلام کیلئے بے حد غمناک اور شدید دردناک تھا، اسی طرح یزید کیلئے یہ دن نہایت فرحت و سرور کا دن تھا۔ پنجتن پاک علیہم السلام ماتم کناں تھے، بنی ہاشم کا گھرانہ برباد تھا اور بنی امیہ کے گھروں میں عید تھی۔ تین گھنٹے کے انتظار کے بعد سرہائے مقدسہ کو پیش کرنے کا حکم ہوا۔ فرزندِ رسولؐ، لختِ جگرِ بتولؑ، شہیدِ اصول، خطیبِ منبر سلونی کا بیٹا نیزہ کے منبر سے اتر آیا اور ایک سنہری طشت میں جلوہ افروز ہوا۔ راکبِ دوشِ رسولؐ طشتِ طلائی میں یزیدِ ملعون کے سامنے پیش ہوا۔

یزید نے دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ دسترخوان بچھایا گیا، شراب لائی گئی، یزید اور اس کے ساتھی کھانا کھانے لگے اور شراب پینے لگے۔ یزید جب کھانے سے فارغ ہوا تو بساط بچھا کر دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مشغول ہو گیا۔ اس کھیل میں

جب ساتھیوں پر کامیابی حاصل کرتا تو شراب کے جام پیتا اور اس جام میں شراب بچا کر سر امام حسین علیہ السلام کے قریب زمین پر گرا دیتا۔ ساتھ ہی خاندانِ بنی ہاشم کا برائی کے ساتھ ذکر کرتا۔ زبانی اور عملی طور پر روحِ پنجتن کو شدید اذیت پہنچاتا تھا۔

سر امام حسین علیہ السلام کے روبرو ان کی روحِ مقدسہ کو اذیت دینے کیلئے اس نے دو کام کیے۔ شطرنج کھیلی اور شراب کا دور چلایا جسے قرآن مجید نے اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ کے تحت عملِ شیطان کہا ہے۔ یہ اس کی اسلام سے کھلی بغاوت اور دین سے صراحتاً سرکشی تھی۔ گویا وہ روحِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسلسل صدمہ پہنچا رہا تھا اور احکامِ قرآنی کی بے دریغ تکذیب کر رہا تھا۔ یہ دونوں کام شیطانی اور یزیدی فعل ہیں۔

اس واسطے حضرت امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: ”جو ہمارا محب اور شیعہ ہے، وہ شراب اور شطرنج سے سخت پرہیز کرے اور اگر کسی وقت اس کی نظر شطرنج و شراب پر پڑے تو محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام پر درود پڑھے اور یزید اور اس کے خاندان پر لعنت کرے، خدا اس کے گناہ معاف کردے گا۔“

ایک فریب خوردہ شامی کی توبہ اور شہادت

سر امام حسین علیہ السلام دربارِ فاسق کے سامنے پہنچ چکا تھا اور اسیر ابھی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر تھکے ماندے اور مجمع عام کی نظروں سے اکتائے ہوئے تنگ کھڑے تھے، کہ اتنے میں چرچائے عام اور اموی ہوا خواہوں کی بدزبانی سے متاثر ہو کر ایک شامی حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے پاس آ کر طنز و تشنیع کے فقرات ادا کرنے لگا:

شیخ شامی:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ قَتَلَکُمْ وَ اَهْلَکَکُمْ وَ اَرَاحَ الْبِلَادَ عَنْ رِجَالِکُمْ وَ اَمْکَنَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْکُمْ“۔

”اللہ کا شکر ہے کہ جس نے تمہیں ہلاک و برباد کر دیا اور ملک کو تمہارے مردوں سے راحت و سکون بخشا اور امیر یزید کو تم پر فتح دی“۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے اس کی غلط فہمی دور کرنے اور اس کو صحیح حالات سے آگاہ کرنے کے لیے موثر کلام فرمایا۔ امام زین العابدینؑ کے جملے شامی شیخ کے دل کو متاثر کر گئے۔

امام سجادؑ:

”یَا شَیْخُ هَلْ قَرَاْتَ الْقُرْآنَ؟“ ”شیخ کیا تو نے قرآن پڑھا ہے؟“

شامی: ہاں! پڑھا ہے۔

امام سجادؑ:

"فَهَلْ عَرَفْتَ هٰذِهِ الْآيَةِ، "قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى"؟"

تو پھر کیا تو اس آیت کو پہچانتا ہے؟

شامی: **"نَعَمْ عَرَفْتُ"**

"ہاں! پہچانتا ہوں"۔

امام سجادؑ:

"نَحْنُ وَ اللّٰهِ الْقُرْبٰى"۔

"بخدا وہ قربیٰ ہم ہی ہیں"۔

پھر فرمایا: کیا تو نے اس آیت کو پڑھا ہے؟

"وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَىْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ الرَّسُوْلِ وَ لِذِى الْقُرْبٰى"

شامی: ہاں پڑھا ہے۔

امام سجادؑ: وہ قرابت دار رسولؐ ہم ہی ہیں۔

پھر فرمایا: کیا تو نے یہ فرمانِ خدا قرآن میں پڑھا ہے؟

"اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً"۔

شامی:

"نَعَمْ قَرَأْتُ ذَالِكَ"

"ہاں! میں نے یہ فرمان پڑھا ہے"۔

امام سجادؑ:

"نَحْنُ اَهْلَ الْبَيْتِ الَّذِيْنَ خَصَّنَا اللّٰهُ بِالتَّطْهِيْرِ"۔

"اے شامی! ہم ہی وہ اہل بیت رسولؐ ہیں جنہیں خدا نے آیہ تطہیر کے ساتھ مخصوص کیا ہے"۔

شامی:

"بِاللّٰہِ عَلَیْکَ! اَنْتُمْ هُمْ؟"

"آپ کو خدا کی قسم! کیا واقعی آپ وہی ہیں؟"

امام سجادؑ:

"وَ حَقِّ جَدِّنَا رَسُوْلِ اللّٰہِ اِنَّا لَنَحْنُ هُمْ مِنْ غَیْرِ شَکٍّ".

"مجھے میرے جدِ امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قسم ہے کہ میں سچ کہتا ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی ہم قرابت دارِ رسولؐ اور اہلِ بیتؑ ہیں"۔

یہ سننا تھا کہ اس شامی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اموی ہواخواہوں اور شامی خطیبوں کی غلط بیانیوں کا شکار اور سرکاری اہلکاروں کی سازشوں کا فریب خوردہ شامی حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے قدموں پر گر پڑا۔ اس کے دل کے گوشے حق قبول کرنے کے لیے کھل گئے۔ سابقہ گستاخی اور گزشتہ بدزبانی اور بدظنی پر نادم ہو کر معافی کا طلبگار رہا۔ امامِ حق کے قدموں کے بوسے لئے۔

اس شامی نے فرطِ الم اور شدّتِ غم سے عمامہ اتار پھینکا، گریبان چاک کیا اور زار و قطار رونے لگا۔ پھر آسمان کی طرف رُخ پھیر کر کہنے لگا:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَبْرَاُ اِلَیْکَ مِنْ عَدُوِّ آلِ مُحَمَّدٍ مِنْ جِنٍّ وَّ اِنْسٍ".

"خدایا! ہم آلِ محمد علیہم السلام کے دشمنوں سے بیزار ہیں چاہے وہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے"۔

پھر اس نے امام علی زین العابدین علیہ السلام سے توبہ کی درخواست کی۔ امامؑ نے فرمایا: "اگر سچے دل سے توبہ کرو تو خدا تمہاری توبہ قبول کرے گا۔"

اس نے سچے دل سے توبہ کی اور سابقہ غلطیوں اور بداعتقادیوں سے خدا کی مغفرت طلب کی۔ لوگوں نے اس کی اطلاع فوراً ہی دربار میں یزید کو دی۔ یزید نے اس کو گرفتار کرنے کے بعد قتل کروا دیا۔

وہ شامی جو ایک لحظہ پہلے ناری تھا، نوری ہو گیا اور شقی تھا، سعادت پا کر شہادت حاصل کر گیا۔

سرِ اقدسؑ سے یزیدِ ملعون کی گستاخی

حضرت امام حسین علیہ السلام کا سرِ مبارک یزید کے سامنے تھا۔ اس کی ایک گستاخی تو یہ تھی کہ شراب پی کر باقی ماندہ

شراب سرِ مبارک کے قریب زمین پر ڈال دیتا اور کہتا:

"اے حسینؑ! تیرا کیا حال ہے؟ تیرا باپ ساقی کوثر ہے۔ جب میں روز قیامت ان کے پاس سے گزروں گا تو وہ مجھے کوثر نہ پلائیں گے؟ تیرے نانا نے جو شراب حرام کی تھی وہی شراب میں پی رہا ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی دوستوں سے کہتا: "خوب شراب پیو! یہ شراب بابرکت ہے۔"

پھر سرِ مبارک کے قریب زمین پر وہی شراب انڈیل دیتا تھا۔ پھر اس نے کہا:

"تیرے نانا نے سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال حرام قرار دیا تھا، اسی لیے میں نے تیرا سر سونے کے طشت میں رکھا ہے۔ تیرا باپ فخر کرتا تھا کہ میں نے بدر کی لڑائی میں سردارانِ قریش کو قتل کیا ہے۔ اب تیرا سر میرے سامنے ہے۔ میں نے بدر کے دن کا بدلہ لے لیا ہے"۔

پھر اس نے یہ اشعار پڑھے:

لَیْتَ اَشْیَاخِیْ بِبَدْرٍ شَهِدُوْا
جَزِعَ الْخَزْرَجِ مِنْ وَقْعِ الْاَسَلِ
لَاهَلُّوْا وَ اسْتَهَلُّوْا فَرَحاً
ثُمَّ قَالُوْا یَا یَزِیْدُ لَا تُشَلْ
قَدْ قَتَلْنَا الْقَوْمَ مِنْ سَادَاتِهِمْ
وَعَدَلْنَا بِبَدْرٍ فَاعْتَدَلْ
وَ اَخَذْنَا الثَّارَ مِنِ ابْنِ عَلِیٍّ
وَ قَتَلْنَا الْفَارِسَ النَّدْبَ الْبَطَلِ
لَسْتُ مِنْ خِنْدِفٍ اِنْ لَّمْ اَنْتَقِمْ
مِنْ بَنِیْ اَحْمَدَ کَانَ فَعَلْ
لَعِبَتْ بَنُوْ هَاشِمٍ بِالْمُلْکِ فَلَا
خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَلْ

اِنْ یَکُنْ احمد قدماً مُرسلاً
فَلِمَ القتل عَلَیْہِ قَدْ اَحَلْ

''کاش آج میرے وہ بدر والے بزرگ موجود ہوتے اور نیزے لگنے سے خزرج کی جزع فزع دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور شاد ہو کر کہتے: یزید تیرا ہاتھ سلامت رہے، کبھی شل نہ ہو''۔

''ہم نے بنو ہاشم کے سرداروں کے بڑے سردار کو قتل کیا ہے اور جب ہم نے موجودہ واقعہ کا بدر کے واقعہ سے موازنہ کیا تو مقابلہ برابر ہو گیا۔ ہم نے علیؑ کے پسر سے انتقام لے لیا ہے اور ان کے شہسواروں اور بہادروں کو تہہ تیغ کر دیا ہے''۔

''میں بنی خندف سے نہ ہوں گا، اگر آلِ احمدؐ سے ان کی کارگزاریوں کا بدلہ نہ لوں''۔

''بنو ہاشم نے ملک حاصل کرنے اور سلطنت قائم کرنے کا بس ایک ڈھونگ رچایا تھا، ورنہ آسمان سے نہ ہی کوئی خبر آئی اور نہ ہی کوئی وحی نازل ہوئی''۔

''اگر احمدؐ واقعی رسول ہوتے تو ان کی اولاد پر تلوار کس طرح چل سکتی؟''

اس کے بعد یہ کافرانہ اشعار، تختِ سلطنت پر اس کا تمکن اور فتح کے نشہ میں بدمستی کے تکبر فرعونیت اور بے دینی کا پتہ دیتے ہیں، جس کی نظر میں قرآن غلط اور آخرت ایک فرضی فسانہ ہے۔

درحقیقت ایسے اُمورِ شنیعہ اور مظالم و مقاتل کا ارتکاب وہی کرتا ہے جسے خوفِ خدا نہ ہو، دل ایمان سے خالی ہو اور وہ عذابِ آخرت سے بے پرواہ ہو۔

اس کمینے کی گستاخی اور بے ادبی حد سے بڑھی اور اس نے ایک بید کی چھڑی منگوائی اور سرِ اقدس کے دندانِ مبارک پر مس کرنے لگا اور بدمستی کے عالم میں ایک شاعر حصین بن حمام مری کے یہ شعر پڑھنے لگا:

اَبٰی قَومُنا اَنْ یُنصِفُوْنَا فَانصَفَت
قَوَاضِبُ فِیْ اَیْمَانِنَا تَقطُرُ الدِّمَا

فُفَلِّق هَاماً مِنْ رِجَالٍ اَعِزَّةٍ
عَلَیْنَا وَهُمْ کَانُوْا اعقاد اظلما

''ہماری قوم نے ہمارے ساتھ انصاف کرنے سے انکار کر دیا۔ پس ان تلواروں نے جو ہمارے ہاتھوں میں تھیں اور

جن سے خون ٹپک رہا تھا، انصاف کیا۔ ہم ان مردوں کے سر شگافتہ کر رہے تھے جو ہم پر سخت تھے اور ظالم اور نافرمان تھے"۔

دربار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ دیکھ رہے تھے کہ بوسہ گاہِ رسولؐ پر ظالم چھڑی کی ضربیں لگا رہا ہے۔ ابو برزہ ایک ضعیف العمر صحابی رسولؐ ہیں۔ انہوں نے جب یہ بے ادبی اور جسارت دیکھی تو بیقرار ہو گئے، یہ ظلم برداشت نہ کر سکے اور درد بھری آواز میں کہنے لگے:

"افسوس ہے تجھ پر او بے حیا یزید! اپنی چھڑی کو روک لے! کس جگہ پر مار رہا ہے؟ تو فرزندِ رسولؐ کے لب و دندان کی بے ادبی کر رہا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی حسینؑ اور اس کے بھائی حسنؑ کے لبوں کا بوسہ لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہو۔ خدا تمہارے ملعون قاتل کو قتل کرے، اس پر لعنت کرے اور اس کیلئے جہنم کا بہت بڑا عذاب تیار کرے"۔

اس صحابی رسولؐ کی جرأت حق تھی۔ برملا سرِ دربار اس کے ٹوک دینے میں یزید نے اپنی بے عزتی اور رسوائی سمجھی۔ چنانچہ اس نے اسے دربار سے نکال دینے کا حکم دیا اور درباریوں نے انہیں کھینچ کر دربار سے باہر نکال دیا۔

کیفیتِ داخلہ دربار

کئی گھنٹوں کے انتظار و قیام کے بعد، طویل سفر، بازار کی مسافت اور قیام کی کوفت سے تھکے ماندے خستہ حال آلِ محمدؐ کے قیدیوں کو دربار میں پیش کیا گیا۔ دربار میں کھلے ہاتھوں پیش نہیں ہوئے، بلکہ رسن بستہ حالت میں اور صرف ہاتھ ہی بندھے ہوئے نہ تھے بلکہ گلوئے مبارک بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کیفیت کی تفصیل خود امام زین العابدین علیہ السلام بیان فرماتے ہیں:

"جب ہم قریبِ دربار ہوئے تو ہمیں رسیوں میں بری طرح جکڑا گیا تھا اور ایک لمبی رسی میں ہم کئی قیدی جکڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ جو رسی میری گردن میں ڈالی گئی تھی، اسی کے ساتھ امّ کلثومؑ اور زینبؑ و سکینہؑ کے کندھے باندھے گئے تھے۔ اسی طرح ایک رسی میں بتولؑ کی کئی بیٹیاں اور خاندانِ رسالتؐ کی کئی بچیاں گرفتار تھیں۔ اگر ہم میں سے کوئی چلنے میں تھوڑی سی بھی تاخیر کرتا تو ہمیں تازیانوں سے زدوکوب کیا جاتا۔ اسی حال میں ہم داخلِ دربار ہوئے۔ وہ ملعون تختِ حکومت پر شاد بیٹھا تھا اور میرے بابا کا سر اس کے سامنے رکھا تھا"۔

جب امام زین العابدین علیہ السلام داخلِ دربار ہوئے تو آپ پھوپھیوں، بہنوں اور یتیم بچوں کے ساتھ ایک ہی رسی میں مقید تھے اور اسی کی وجہ سے مستوراتِ بنی ہاشم خصوصاً معصوم شہزادیوں کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ چلنا دشوار تھا اور سنگدل

ملعون زحر بن قیس اس حالت میں دربار میں لایا۔
دربار جامع مسجد میں منعقد تھا۔ سب سے پہلے حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے یزید کو مخاطب کرتے ہوئے خطاب فرمایا:

"اے یزید! کیا اس حال میں شرفاء کو گرفتار کر کے لانا مناسب ہے؟ اگر رسول اللہ ہمیں اس حال میں دیکھیں تو ان کے دل پر کیا گزرے گی؟"

حاضرین دربار پر اس کلام کا اثر ہوا۔ چنانچہ یزید نے فوراً حکم دیا اور رسیاں کاٹ دی گئیں۔

یزید نے اس کے بعد مستورات بنی ہاشم کو اپنے تخت کے پیچھے بٹھا دیا اور سر کو تخت کے آگے رکھا، تاکہ خواہران حسین علیہم السلام بھائی کا اور دختران حسین علیہم السلام بابا کا سر نہ دیکھ سکیں، مگر مصیبت زدہ اور درد ستائی شہزادیوں کی نظر سے سر او جھل نہ ہوا۔ جناب فاطمہ بنت الحسین علیہم السلام نے کہا:

"یزید! فرزندِ رسول کا سر تیرے سامنے ہے اور بنات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے دربار میں قید ہو کر آئی ہیں۔ کیا اس طرح شریف خاندانوں کو قید کیا جاتا ہے، جس طرح ہمیں قید کیا گیا ہے؟"

اس خطاب کا سننا تھا کہ حاضرین دربار کی کیفیت بدل گئی، خوشی کے آثار ختم ہو گئے اور مجمع پر اداسی چھا گئی۔ ادھر حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے بھائی کا سر تخت کے نیچے ایک طشت میں دیکھا، چارۂ ضبط نہ رہا، بے ساختہ فریاد نکلی، سر پیٹ لیا اور بھائی سے مخاطب ہو کر کہا:

"یَا حسیناهٗ! یا حبیب رسولَ اللّٰہ! یا بن مکّۃَ! یَا بْنَ فاطِمۃُ الزّہراءِ سیِّدۃِ النِّساء! یَابْنَ بِنْتِ الْمصطفیٰ!"

یہ درد بھرے بین اور جگر خراش کلمات سن کر اور منظر دلفگار دیکھ کر شامیوں کی مسکراہٹیں آنسوؤں میں بدل گئیں۔ خوشی کا سماں بدل گیا اور غم کی کیفیت چھا گئی۔ قیدیوں کی غربت، سادات کی بیکسی، مستورات کی مظلومی، یتیموں کی دلدوز چیخیں اور امام علیہ السلام کی آہ وزاری نے دربار کا نقشہ بدل دیا۔

اب یزید ملعون کے چہرے پر بھی وہ پہلے والی بشاشت نہ رہی۔ اس نے حاضرین کے خیالات کا رخ پھیرنے کے لیے حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ سلسلہ کلام شروع کیا۔

حاکمِ دمشق کا امامؑ کے ساتھ مکالمہ

یزید: اے علی بن الحسین علیہم السلام! تیرے والد نے میری حکومت کو تسلیم نہ کیا۔ میری نافرمانی کی اور میرا مقابلہ کیا۔ پس بغاوت کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ تیرے والد اور تیرے دادا نے ہمارے ساتھ نزاع (لڑائی) کی اور خدا نے انہیں قتل کیا۔

اس کے بعد اس نے یہ آیت پڑھی:

"وَ مَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ".

"جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں سے ہے اور خدا گناہوں کو بہت معاف کرتا ہے"۔

امام سجادؑ: **"مَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْ السَّمَاءِ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَبْرَاَهَا اِنَّ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ"**

"کوئی ایسی مصیبت نہیں پہنچتی، زمین میں یا آسمان میں، مگر ہم نے زمین و آسمان کی پیدائش سے پہلے لوح محفوظ میں لکھ دی ہے اور یہ بات خدا پر آسان ہے، تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو خدا تم کو دے اس پر (حد سے زیادہ) خوشی نہ کرو اور خدا غرور و گھمنڈ کرنے والے متکبر کو پسند نہیں کرتا۔" یہ آیت ہمارے حق میں ہے۔

اس کے بعد یزید ملعون نے حسینی مستورات کو جو تخت کے پیچھے بیٹھی تھیں، سامنے بلایا اور ہر ایک کے متعلق پوچھنے لگا:

"مَنْ هٰذِهٖ؟"

جواب ملتا:

"هٰذِهٖ زَيْنَبُ، هٰذِهٖ اُمّ كُلْثُوْمُ، هٰذِهٖ اَمّ هَانِيٌّ، هٰذِهٖ رُقَيَّةٌ، هٰذِهٖ فَاطِمَةٌ، بَنَاتِ عَلِيٍّ وَ فَاطِمَةٌ"

اس وقت حضرت فاطمہ بنت الحسین علیہم السلام نے فرمایا:

"اے یزید! یہ تمام دخترانِ رسول قیدی بنا کر تیرے سامنے لائی گئی ہیں"۔

اس کلام سے اہل مجلس پر گریہ طاری ہو گیا اور رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

حضرتِ سکینہ بنت الحسین علیہم السلام نے اپنے بازو کی آستین سے منہ کو چھپایا ہوا تھا۔ یزید نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟

جواب ملا: "یہ سکینہ بنت الحسین علیہم السلام ہیں"۔

یزید ملعون نے پوچھا: ''کیا تو ہی سکینہؑ ہے؟''

کجا حسینؑ کا سینہ اور کجا ملعون سے گفتگو، کجا مدینہ اور کجا دربار یزید، کجا حسینؑ کی شفقت اور کجا ان ظالموں کا تشدد، دربار کی اجنبیت، نامحرموں کا مجمع اور یزید کے سامنے پیشی۔ معصومہؑ بیقرار ہو کر گریہ کرنے لگی۔

یزید نے پوچھا:

''مَا يُبْكِيكِ؟''

''تجھے کون سی چیز رُلا رہی ہے؟''

حضرتِ سکینہؑ نے جواب دیا: ''یزید! دخترِ حسینؑ تیرے دربار میں تیرے سامنے اور مجلس عام میں سر برہنہ ہے۔ منہ چھپانے کو چادر نہیں اور تو پوچھتا ہے کہ مجھے کون سی چیز رُلا رہی ہے؟''

یزید نے کہا: ''تیرے والد نے میری بیعت نہ کی، میرے حق کا انکار کیا اور میرے ساتھ تنازعہ کیا۔ اس کا انجام تیرے والد نے پا لیا''۔

حضرتِ سکینہؑ نے کہا: ''یزید! میرے والد کے قتل سے خوش نہ ہو! میرے بابا خدا اور رسولؐ کے مطیع تھے۔ میرے بابا نے حکم خدا اور فرمانِ رسولؐ پر لبیک کہا۔ حق کی خاطر میرے بابا نے جان قربان کی۔ وہ شہادت کی سعادت پا گئے۔ یزید! روزِ قیامت آنے والا ہے۔ تجھ سے خونِ حسین علیہ السلام کی باز پرس ہوگی۔ جواب دہی کے لیے تیار رہ! لیکن تیرے پاس کیا جواب ہوگا؟''

یزید کھسیانہ ہو کر رہ گیا اور اتنا کہا: ''سکینہؑ! خاموش رہ! تیرے والد کا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے''۔

حبشیوں کی غیرت

بنتِ زہراؑ ایک گوشے میں کنیزوں کے جھرمٹ میں تھیں۔ یزید نے پوچھا:

''اَيْنَ بناتُ عَلِيٍّ وَّ فَاطِمَةَ''.

شمر نے اشارہ کر کے کہا:

''هٰذِهٖ زَيْنَبُ وَ هٰذِهٖ اُمِّ كُلْثُوْمَ''۔

یزید نے چاہتا تھا کہ بناتِ علیؑ سے کلام کرے، لہٰذا حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

''مجھ سے کلام کر!''

یزید کا مقصد تھا کہ میں طنزیہ کلام سے خواہرانِ حسینؑ کا دل دکھاؤں گا اور قتل حسین علیہ السلام پر ناز کر کے حسینؑ کو قصور وار ثابت کروں گا اور اہل دربار کے سامنے حسینؑ برادر زینبؑ کو مجرم قرار دے دوں گا۔ یہ عورتیں ہیں، میرے سوالوں کا کیا جواب دیں گی؟ میں اہل دربار پر اپنی سچائی ثابت کر کے انہیں مطمئن کر دوں گا۔

اس نے حکم دیا کہ کنیزوں کو دخترِ بتولؑ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ شمر نے حضرت زینب سلام اللہ علیہا کو الگ ہو جانے کا حکم دیا۔ جناب فضہؑ وفادار کنیز نے جدا ہونے سے انکار کر دیا۔ یہ وفادار کنیز حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا کے سامنے آ گئی اور ہٹنے سے انکار کر دیا۔ شمر نے جب یہ دیکھا تو تازیانہ لیا اور مارنے کا ارادہ کیا۔ حضرتِ فضہؑ کی نگاہ ایک حبشی جماعت پر پڑی جو برہنہ تلواریں لئے یزید کی حفاظت پر مامور تھے۔ جنابِ فضہؑ نے ان کو مخاطب کر کے کہا:

''اے میرے ملک کے باشندو اور ساکنانِ حبش! میں تمہارے وطن کی ایک عورت ہوں، تمہاری قوم اور تمہارے ملک کی غیرت ہوں، آج بیکس ہوں، بے وارث ہوں، قید ہو کر تمہارے سامنے پیش ہو چکی ہوں۔ ایک نامحرم، ظالم، اجنبی شخص میری وفا کے جرم میں تمہارے سامنے مجھ پر تازیانہ اٹھا رہا ہے۔ حبش کی جماعت! تمہاری غیرت کہاں گئی ہے؟ تمہارے سامنے تمہارے ملک کی اور قوم کی بیٹی تازیانے کھائے، تمہارے وطن کی سرزمین تمہیں کیا کہے گی؟ کیا میری بے عزتی تمہیں گوارا ہے؟ میں تم سے فریاد کرتی ہوں کہ اس بیکس کی مدد کرو! میں بے وارث ہوں، میرے وارث بنو!''

حضرتِ فضہؑ کی دردبھری فریاد نے حبشیوں کے دل پر نشتر کا کام کیا۔ آپ کی آہ و پکار نے ان کی غیرت کو جگا دیا۔ قومی حمیت اور مادرِ وطن کی محبت نے ان کے احساسِ قومی کو بیدار کیا۔ فضہؑ کی بیکسی اور غربت نے ان کے دلوں کو سینوں میں تڑپا دیا۔ ان کی غیرت نے جوش مارا، رگِ حمیت تڑپ اٹھی اور ان کا خون بدنوں میں جوش مارنے لگا۔ یہ پوری جماعت تلواریں سونت کر یزید کے سامنے آ گئی اور انہوں نے گرج کر کہا:

''یزید! شمر کو روک لے! تازیانہ ہٹوا لے! یہ ہماری غیرت کو للکار رہا ہے! یہاں دربار میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی اور تیرا تخت تختے میں بدل جائے گا''۔

ان حبشیوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر یزید نے شمر کو روک دیا۔ اس طرح حبشیوں کی حمیت یزید کے ناپاک ارادوں کے آڑے آ گئی۔

اس وقت مظلومہ، بے وارث، غریب الوطن اور بے سہارا و بے آسرا بی بی نے مدینہ کی طرف رخ کر کے کہا:

''نانا! آج تیری بیٹی کا غربت میں کوئی مددگار نہیں۔ آہ! آج دخترانِ رسولؐ اور بناتِ بتولؑ بیکس و بے وارث ہیں۔

آج ہمارا بھی کوئی وارث بنتا تو یزید سے ہمکلام نہ ہونا پڑتا۔ آج ہمارا بھی کوئی ہوتا تو ہم سر برہنہ نہ ہوتیں"۔

یزید نے صرف ایک بار سرِ حسین علیہ السلام کی بے ادبی نہیں کی بلکہ کئی مرتبہ۔ جب سر مبارک دربار میں داخل ہوا تو اس وقت بھی شراب گرائی اور چھڑی مس کی اور جب مستورات داخل ہوئیں تو اس وقت اس نے دندانِ مبارک پر چھڑی مس کی اور کافرانہ اشعار پڑھے۔ اس وقت شریکۃ الحسین علیہم السلام نے دربار میں عظیم الشان اور جامع خطبہ پڑھا۔

خطیبہ آلِ محمدؐ سلام اللہ علیہا کا خطبہ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شیر دل بیٹی کا یہ تاریخی خطبہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے مقصد اور ان کی تحریک کی مفصل تاریخ ہے۔ اس میں اہل بیت اطہار علیہم السلام کی عظمت، شہدائے کربلا علیہم السلام کی جرأت اور مقصدِ شہادت امام حسین علیہ السلام کی وضاحت بیان کی گئی ہے اور یزید کے سیاہ کارنامہ اور کافرانہ کردار کی مذمت کی گئی ہے۔

اس خطبے میں حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی صداقت وحقانیت پر نا قابلِ تردید استدلال کیا گیا ہے اور یزید اور اس کے حکمرانوں کے ظلم وتشدد کا کھلا پرچار کیا گیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس خطبہ نے یزید کی باطل حکومت کی بنیادیں ہلا دیں اور یزیدیت کے باطل وظالم گنبد پر حق وصداقت کا گرز کا کام کیا۔ اس بلیغ خطبے نے بے حس کلمہ گووں کے ضمیروں کو جھنجھوڑ دیا ہے اور مسلمانوں پر تازیانہ لگایا ہے۔ ہم پورا خطبہ نقل کرنے سے معذور ہیں، البتہ اس میں سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ آلِهٖ اَجْمَعِيْنَ. صدق اللّٰه كذالک يقول ثُمَّ كان عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ اَسَاءُ وَ السُّوْءَ اَنْ كَذَّبُوْا بِآيَةِ اللّٰهِ وَ كَانوا بِها يَسْتَهْزِئُوْنَ. اَظَنَنْتَ يا يَزِيْدُ! حَيْثُ اَخَذْتَ عَلَيْنَا اَقْطَارَ الْاَرْضِ وَ آفَاقَ السَّمَاءِ فَاَصْبَحْنَا نُسَاقُ كَمَا تُسَاقُ الْاُسَارىٰ ان بنا عَلَى اللّٰهِ هَوَاناً وَ بِکَ عَلَيْهِ كَرَامَةً. وَ ان ذالِکَ الْعَظِيْمَ خَطَرُکَ عِنْدَهٗ فَشَمَخْتَ بِا نفک وَ نظرت فِي عطفک جذلان مسروراً. حيث رَاَيْتَ الدُّنْيَا لَکَ مُسْتَوْثِقَةٍ وَ الْاُمُوْرَ متسقة و حين صفالکَ مَلَكُنا وَ سُلْطانِنَا فمهلاً اَنَسِيْتَ قول اللّٰه تعالىٰ وَ لَا يَحسبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ خَيْرٌ لِاَنْفُسِهِمْ اَنَّمَا نُمْلِىْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْماً وَّ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ."

''سب تعریفیں سزاوار ہیں اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور درود و سلام ہو اس کے برگزیدہ رسولؐ پر اور ان کی آل اطہار علیہم السلام پر۔ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا اور اس کا ارشاد برحق ہے۔ 'پھر ان لوگوں کا انجام جو برائیاں کرتے ہیں، برا ہوتا ہے، اس لیے کہ انہوں نے آیات خدا کو جھٹلایا اور ان کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا'۔

اے یزید! اس بات سے کہ تو نے ہم پر زمین کی تمام راہیں بند کر دیں اور آسمان کے کنارے تنگ کر دیے اور ہمیں قیدیوں کی طرح لایا گیا اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کنیزوں کی مانند ہماری تشہیر کی گئی۔ یہ گمان کیا کہ ہم خدا کی نظر میں ذلیل و رسوا ہوئے اور تو ان مظالم کے انجام دینے کی وجہ سے خدا کے ہاں عزت پا گیا؟

تو نے دیکھا کہ آج دنیا تجھے حاصل ہے اور تمام اسباب دنیا تجھے میسر ہیں، ہمارا ملک اور ہماری سلطنت تیرے زیر اقتدار ہے، اسی واسطے تو ناک چڑھا کر اترا رہا ہے اور مسرور و شاد ہے۔

اے یزید! ٹھہر جا اور جلدی مت کر! اللہ تعالیٰ کا فرمان تو بھول چکا ہے کہ کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم نے جو مہلت انہیں دی ہے، اس میں ان کی بھلائی ہے۔ ہم نے تو اس واسطے انہیں ڈھیل دی ہے اور ان کی رسی دراز کی ہے کہ وہ جی بھر کر گناہ کر لیں اور اپنے گناہ بڑھا لیں، آخر ان کے واسطے رسوا کرنے والا عذاب تیار ہے۔

اے آزاد کردہ غلاموں کے بیٹے! کیا یہی انصاف ہے کہ تو نے اپنی بیبیوں اور باندیوں کو تو اندر خانہ پردہ میں بٹھا رکھا ہے اور رسولؐ زادیوں کو گرفتار کر کے شہر در شہر اور دیار بہ دیار پھرایا؟ غضب خدا کا! تو نے رسولؐ کی نواسیوں اور امام زادیوں کو بے مقنعہ و چادر کیا؟ رسولؐ اللہ کی امانتوں کو تو نے دشمنوں کے حوالے کر دیا، جو انہیں مجمع عام اور بازاروں میں پھراتے رہے؟ شہری اور دیہاتی، جنگلی اور پہاڑی، شریف و رذیل، قریب و بعید سب انہیں گھور گھور کر دیکھتے رہے؟ کیوں؟ کیونکہ رسولؐ زادیاں، علیؑ و زہراؑ کی بیٹیاں لاوارث تھیں؟ ان کے ساتھ ان کے مردوں اور مددگاروں میں کوئی نہ تھا۔

ہائے بے بسی! ہمارا کوئی والی وارث نہ رہا''۔

"وَ کَیْفَ یُرْتَجٰی مراقبة من لفظ فوه اکباد الْاَذْکِیاء وَ نَبَتَ لحمه مِن دماءِ الشُّهداءِ وَ کیف لَا یَسْتَبطا فی بُغْضِنَا اَهل البیتٌ مِن نظر النسا بالشنف والشنان والاحن والْاَضْفَانِ ثُمَّ تَقُوْلُ غیر ما ثم ولا متعظم لاهَلوا وَ استهلُّوا فرحا ثمّ قالوا: یا یزیدُ! لا تُشل منتحیا علیٰ ثنایا یا ابی عبدالله سیّد شباب اهل الجنّة تنکُتها بمحضرتک".

''بھلا اس شخص سے خیر و خوبی کی کیا امید ہو سکتی ہے کہ جس کی دادی نے پاکبازوں کے جگر چبائے ہوں اور جس کا گوشت شہیدوں کے خون سے اُگا ہو، جس کے دادا نے رسولؐ اللہ اور دین مصطفےٰؐ کے خلاف گروہ اکٹھے کر کے لڑائیاں لڑی ہوں؟ کس طرح ہم اہل بیتِ رسولؐ کے بغض و عناد میں وہ شخص جلدی نہ کرے، جو ہماری طرف دشمنی، کینہ اور بغض و حسد کی نگاہ رکھتا ہے؟ پھر تو خوش ہو کر کہتا ہے کہ آج تیرے بدر والے مقتول موجود ہوتے تو خوش ہو کر کہتے کہ اے یزید! تیرے ہاتھ شل نہ ہوں؟''

اے یزید! تو جوانانِ جنت کے سردار ابی عبداللہ الحسین علیہم السلام کے دندانِ مبارک اور معصوم لبوں پر اترا کر چھڑی مارتا ہے؟ نہ تو اسے گناہ سمجھتا ہے اور نہ اس حادثہ کو عظیم خیال کرتا ہے؟''

حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرمایا:

''تو ایسا کیوں نہ کرے، جب تو نے ہمیں گہرے زخم لگائے اور تو نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریّت اور اولادِ عبدالمطلب علیہم السلام میں سے ارضی ستاروں کا خون بہا کر ان کی جڑ کو اصل سے اکھیڑنے کی کوشش کی ہے؟ پھر خوش ہو کر اپنے بزرگوں کو پکارتا ہے؟ عنقریب تو انہی کے انجام سے دوچار ہوگا اور مقامِ عذاب میں تیرا ورود ہوگا۔

اے یزید! ناز نہ کر! وہ وقت آنے والا ہے جب تو اس بات کو پسند کرے گا کہ کاش تیرے ہاتھ شل ہو جاتے اور تیری زبان گنگ ہو جاتی اور تو وہ نہ کرتا جو کیا ہے اور وہ نہ کہتا جو کہا ہے''۔

''اَللّٰھُمَّ خُذْ لَنَا بِحَقِّنَا وَ انْتَقِمْ مِمَّنْ ظَلَمْنَا وَ اَحْلُلْ غَضَبَکَ بِمَنْ سفکَ دِمَائَنَا و قتل حماتنا فوَ اللّٰہِ مَا فَرَیْتَ الّاجلاک ولا حززت الا لحمکَ سِرُوْنَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّم بِمَا تحملتَ من سفکَ دماء ذریّتہٖ و انتھکت من حرمنہٖ فِی عترتہٖ و لحمتہٖ حیث یجمع اللّٰہُ شَملَھُمْ وَیَلُم وَ یاخذ بحقھم ولا تحسبن الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ امواتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ.''

پھر حضرتِ زینب عقیلہ قریش سلام اللہ علیہا نے فریاد بجنابِ خدا بلند کی اور فرمایا:

''خدایا! ہمارے لئے، ہمارے دشمنوں سے ہمارا حق اور ہمارا انتقام لے اور جن ستم شعاروں نے ہمارا خونِ ناحق بہایا

ہے اور ہمارے حامیوں کو قتل کیا ہے ان پر اپنا غضب نازل فرما!''

اس کے بعد آپؑ نے یزید لعین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''اے یزید! خدا کی قسم تو نے اپنا ہی چمڑا کاٹا ہے اور اپنے ہی گوشت کے ٹکڑے کئے ہیں۔ اے یزید! تو عنقریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور تیرے سر پر ذریت رسول کا خون اور عترتِ رسولؐ کی ہتک وحرمت کا بوجھ ہوگا، جبکہ اللہ تعالیٰ اس روز عترتِ رسولؐ اور اولادِ علیؑ اور بتول علیہم السلام کے بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کرے گا اور پراگندہ وجدا جدا قبروں سے آلِ رسولؐ اکٹھی ہوگی اور ان کے دشمنوں سے انتقام لے گا اور ان کے دشمنوں کو ان کے اعمال کی سزا دے گا''۔

حضرت زینبؑ نے شہدائے کربلا علیہم السلام کی حیاتِ ابدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ آیت تلاوت فرمائی:

''وہ لوگ جو راہِ خدا میں قتل کئے جاتے ہیں، انہیں ہرگز مردہ خیال نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے ربّ کے ہاں رزق پاتے ہیں''۔

''وَ حَسْبُکَ بِاللّٰہِ حَاکِماً وَ بِمُحَمَّدٍ خَصِیماً وَّ بِجِبْرَئِیلِ ظَہِیراً''۔

''تیرے لئے یہی کافی ہے کہ خدا حَکَم ہے، وہ عدل سے فیصلہ کرے گا اور محمدؐ تیرے دشمن ہیں اور ہمارے مقدمہ خون کا وارث جبرئیل تمہارے خلاف ہمارا گواہ و مددگار ہے۔ جن لوگوں نے تیرے لیے زمین ہموار کی ہے اور تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کر دیا ہے، انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کا انجام برا ہے اور کس کا لشکر کمزور ہے!''

''وَ لَئِنْ جرَّت علی الدَّواھِیُ مُخاطِبُتُکَ اِنِّیْ لَا سْتَصْغِر قَدرکَ وَ اسْتَعِظْمُ تَقْرِیْعَکَ وَ اسْتَکثِرتُوْ بِیُخْکَ وَلٰکِنَّ الْعُیُوْنَ عبریٰ وَالصُّدُوْرَ حری اَلاَ فَالْعَجب کُلَّ لِقَتْلَ حِزْبَ اللّٰہِ النَّجَبَاءِ بِحزب الشَّیْطٰنِ الطُّلَقَآءِ فھدہ الا یدی تنطف من دمائناو الافواہُ تخلب مِن لُحُوْمِنَا''۔

''اے یزید! انقلابِ زمانہ اور حوادثِ روزگار نے مجھے اس قدر بے بس کر دیا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہمکلام ہونے پر مجبور ہوں، ورنہ میں تجھ جیسے گھٹیا انسان کو لائق نہیں سمجھتی کہ رسولؐ اور علیؑ کی بیٹی تیرے ساتھ کلام کرے۔ میں تیرے نہایت ہی پست مقام کو اور تیری زجر وتوبیخ کی عظمت کو سمجھتی ہوں، لیکن کیا کروں؟ آنکھ گریاں، دل نوحہ کناں اور سینہ بریاں ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ میرے ناناؐ کے آزاد کردہ غلاموں کی اولاد جو شیاطین کے گروہ کی مانند ہے، خدا کے حبیب اور نجیب کو قتل کرے۔ پس یہی تمہارے ہاتھ ہیں جن سے ہمارا خون بہہ رہا ہے اور یہی تمہارے وہ منہ ہیں جن سے ہمارا گوشت گر

رہا ہے۔

اے یزید! اگر آج تو ہماری ظاہری کمزوری کو اپنے لیے غنیمت جان رہا ہے تو کل روزِ قیامت تو اسی بات کو زیاں سمجھے گا، جب تو اپنے ہاتھوں سے سوائے بدعملیوں کے کچھ نہ پائے گا۔ خدا اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا۔ ہماری شکایت وفریاد اسی کی بارگاہ میں ہے اور اسی پر ہمیں بھروسہ ہے۔

تو جس قدر چاہے مکروفریب کرلے اور مقدور بھر کوشش کرلے۔ خدا کی قسم! تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا اور ہماری یادوں کو دلوں سے محو نہیں کرسکتا اور نہ ہم پر نازل شدہ وحی اور دین اسلام کو ختم کرسکتا ہے اور نہ تو ہمارے مقام ومرتبہ کو پہنچ سکتا ہے اور نہ اس ظلم وستم کی عار اپنے سے دور کرسکتا ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب ایک منادی ندا دے گا: "آگاہ ہو جاؤ! ظلم وستم کرنے والی قوم پر لعنت ہے"۔

مظلوم واسیر شہزادی نے اپنے خطبے کا آغاز بھی حمد وثناء اور درود وسلام کے ساتھ کیا تھا اور اختتام بھی حمد باری تعالیٰ اور اپنے خاندان کے سعید وشہید افراد کے لیے دعائے خیر سے کیا۔ آپ نے مزید فرمایا:

"حمد وثناء ہے اللہ کی جو ربّ العالمین ہے، جس نے ہمارے پہلے کا خاتمہ سعادت ومغفرت کے ساتھ اور آخری کا شہادت ورحمت کے ساتھ کیا۔ ہم خدا سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ان مقدس نفوس اور سعادت مند افراد کا اجر وثواب کامل کردے اور مزید اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ہمیں ان کا صحیح جانشین بنائے۔ وہی ہے جو مہربان ہے اور محبت کرنے والا ہے۔ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۔"

تبصرہ

دمشق حکومتِ یزید کی راج دہانی تھا۔ یزید نے اس سلسلہ میں جشن مسرت منعقد کیا تھا کہ اس نے جنگِ کربلا میں ظاہری فتح حاصل کرلی تھی۔ شام کے لوگ زیادہ تر جاہل تھے۔ دمشق مدینہ سے دور تھا۔ معاویہ بن ابی سفیان نے عمداً شامیوں کو اسلام سے اور اہل بیتِ نبویؑ علیہم السلام سے دور غافل رکھا ہوا تھا۔

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ کے مصداق دمشق اور آس پاس کے باشندے اس جشن مسرت میں ایک تو اس لیے شریک ہوئے کہ اپنے ملک کے بادشاہ کو جنگِ کربلا میں کامیابی حاصل ہوئی اور وطن کی محبت اور بادشاہِ وقت کی خوشامد بھی ضروری تھی، علاوہ ازیں جنگِ کربلا میں یزید کے مخالف گروہ کی معرفت بھی انہیں حاصل نہ تھی اور عمداً ان کے تعارف سے

شامیوں کو بیگانہ رکھا گیا تھا۔

اکثریت کو یہ علم نہ تھا کہ جنگ کربلا میں خانوادۂ رسولؐ قتل کیا گیا ہے، مستورات جو قید ہو کر آئی ہیں، خاندانِ رسالتؐ اور آلِ معدنِ عصمت و کرامت کی شہزادیاں ہیں۔

دمشق کی جامع مسجد میں تمام مجمع سمٹ کر آ گیا تھا۔ جامع مسجد ہزاروں کے مجمع سے بھری ہوئی تھی۔ اذنِ عام تھا۔ شریف و رذیل، اعلیٰ و ادنیٰ، امیر و کبیر اور غریب و فقیر ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔

اگر ایک خوش بیان مقرر اور شعلہ نوا خطیب کو ایسا سجا سجایا اور بنا بنایا مجمع عام مل جائے اور لوگ بھی متوجہ ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ مجمع کی کایا نہ پلٹ دے۔ اسی ڈر سے اکثر حکمران مخالف خطیبوں کو پابند کر دیا جاتا ہے۔ خطیبہ آلِ محمد و عقیلہ بنی ہاشم حضرت زینب سلام اللہ علیہا کو یزید نے خود مجمع اکٹھا کر کے دیا تھا اور لوگوں کی توجہ بھی خود ہی تمام کر دی تھی۔

ایک تو نرالے قیدی تھے، نرالے سر تھے، دربار کا رنگ نرالا تھا اور قیدیوں کی غربت و حسرت، مظلومی اور خستہ حالی نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہوا تھا۔

گو خطیب و مقرر کیلئے تازہ دم دل و دماغ اور اعصابی قوتوں کا خوشحال ہونا اور ہجومِ افکار اور آلام و غموم سے سلامت ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ چیزیں جنابِ زینبؑ کو حاصل نہ تھیں۔

طویل سفر کی تھکاوٹ، بھوک و پیاس کی اذیت اور لوگوں کے طعنوں کا دکھ، بہتر (۷۲) کی ماتم داری اور ہجومِ عام میں سر برہنہ۔ ہر قسم کی مصیبت اور ہر نوع کا غم احاطہ کیے ہوئے تھا۔ تاہم ان تمام دکھوں اور غموں پر قابو میں رکھ کر اور حواسِ ظاہری و باطنی کو مضبوط رکھ کر مجمع عام پر غلبہ حاصل کر لیا۔ روحانی طاقت اور قوتِ قدسیہ نے جسمانی تھکی ہوئی طاقتوں کو بحال کر دیا۔ افاضۂ ربانی اور عنایاتِ الٰہیہ نے علیؑ کی سطوت کی وارث بیٹی کے دل و دماغ کو قوی اور تازہ کر دیا اور عطائے خداوندی نے مطالب و معانی کے چشمے دخترِ رسولؐ کی زبان سے جاری کر دیے۔

مظلوم و اسیر شہزادی نے ہیبتِ دربار اور یزیدی رعب و وقار کو زیر پا رکھ کر اس قدر زجر و توبیخ کی کہ یزید کا مست پندارِ فتح سر، مارے ندامت جھک گیا۔ اہلِ مجلس پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش اسیر شہزادی کا کلام سن رہے تھے۔ سرکاری مشینری نے شہدائے کربلا علیہم السلام پر جو بغاوت کے پردے ڈالے ہوئے تھے، دخترِ بتول سلام اللہ علیہا نے وہ تار تار کر دیے اور یزیدی مظالم اور ابنِ زیاد کی درندگی کو طشت از بام کر دیا۔ حقیقت کے حسین رخ سے اخفائے حجاب سرکائے اور کلامِ خداوندی کے مطابق ظلم و ظالمین کی برائی بیان کی اور خدا کی نظر میں ظالم کے مقام اور انجام کو واضح کر دیا۔

شہدائے کربلا اور اسیرانِ شام علیہم السلام کا حاضرین کو تعارف کروایا اور مسلمانوں کے خفتہ احساس کو بیدار کر کے ان کی حمیت کو تازیانہ لگایا۔ لوگوں کو بتایا کہ کربلا والے باغی نہ تھے بلکہ غازی تھے اور نمازی تھے۔ حق گو، حق شناس اور حق بین تھے۔

"لوگو! ہم خاندانِ رسالتؐ کے قیدی ہیں۔ ہم دخترانِ علی و بتول علیہم السلام ہیں۔ ہم اس بیت الوحی اور معدنِ عصمت کی پروردہ ہیں، جس گھر میں قرآن نازل ہوا اور شریعت آئی۔ میرے بابا علیؑ کی شجاعت سے مسلمانوں کو منبر ملے، جس منبر پر آج علیؑ اور اولادِ علیؑ پر سب وشتم ہوتا ہے"۔

دربار کے درودیوار پر مسرت کی جگہ حسرت چھا گئی۔ فرحت کا ماحول ماتم میں بدل گیا۔ لوگ حیرت کے دریا میں غوطے کھانے لگے۔ لبوں سے مسکراہٹ جاتی رہی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ علیؑ کی شیر دل بیٹی کی پر رعب وتاثیر آواز دربار میں گونج رہی تھی۔ زبانِ زینب سلام اللہ علیہا میں لہجہ علیؑ تھا، ہیبتِ الٰہی تھی، سطوتِ محمدیہؐ تھی، جلالت حیدریہ تھی۔ عصمتِ فاطمیہؑ کی وارث و مالک شہزادی نے دشمن کے دربار میں شہیدوں کی حقانیت اور اسیروں کی صداقت کو ثابت کر دیا۔

حق تو یہ ہے کہ شریکۃ الحسین علیہم السلام نے نہ صرف یہ کہ قتل وقید کے تمام ارمان تقریر میں نکال دیئے اور اپنے مقدس خیالات مجمع عام پر بکھیر دیئے بلکہ مظلوم کے ناحق خون اور اسیروں کی بے گناہ قید اور خانوادۂ رسولؐ علیہم السلام و دخترانِ بتولؑ کی قید وہتک حرمت کا تخم احساس لوگوں کے دلوں میں بو دیا۔ مظلومہ مسافرۂ شام نے صداقت اور حق گوئی کا حق ادا کر کے اسلام کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی۔

یزید حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا کے خطبے سن رہا تھا اور پیچ وتاب کھا رہا تھا، ہونٹ چبا رہا تھا، مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہہ سکتا تھا۔ یزیدیت کا رنگ اڑ چکا تھا اور علیؑ کی شیر دل بیٹی کا رنگ جم چکا تھا۔

شاھی خطیب

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام اور حضرتِ سیّدہ زینب سلام اللہ علیہا کے خطبہ سے چونکہ یزید کے مظالم کا پردہ چاک ہو چکا تھا اور یزید کو اسی کے دربار میں مجرم ثابت کر دیا گیا تھا اور اہلبیت علیہم السلام کی عصمت وطہارت اور شہدائے کربلا علیہم السلام کی حقانیت وصداقت اور ان کا بے جرم وخطا ہونا واضح ہو ہو چکا تھا، لہٰذا ان خطبوں نے حاضرین دربار کے خیالات یکسر بدل گئے تھے۔ سرکاری افسروں کا مکروفریب اور کذب وبطلان ظاہر ہو گیا۔

یزید نے جب اپنے دربار کی یہ حالت دیکھی تو سخت پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنے سرکاری دمشقی خطیب کو حکم دیا کہ

بالائے منبر ہو کر بنی امیہ کی مدح سرائی کرے اور حسین وعلی علیہم السلام پر سب وشتم کرے۔

حکم ملنے کی دیر تھی، سرکاری ضمیر فروش خطیب نے دولت وزر کی محبت میں دل کھول کر خاندانِ رسالت کی توہین میں مصروف ہو گیا اور یزید کے حسب منشاء امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام پر سب وشتم کے کلمات کہے اور یزید اور اس کے باپ کی خوانخواہ تعریف وتوصیف کی، تاہم حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا کے خطبہ جلیلہ کا اثر زائل نہ کر سکا۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ انہوں نے خطیب کو ڈانٹتے ہوئے مخاطب کیا اور فرمایا:

"اشْتَرَيْتَ مَرْضَاةَ الْمَخْلُوقِ بِسُخْطِ الخَالِقِ فَتَبوأ مَقْعَدَکَ مِنَ النَّارِ".

"تو نے خالق کو ناراض کر کے مخلوق کو راضی کر کیا (اور آخرت کو فروخت کر کے دنیا کو خرید لیا) پس تو اپنا ٹھکانہ جہنم کی وادی میں تیار سمجھ"۔

پھر یزید کو مخاطب کر کے فرمایا: "اے یزید! مجھے اجازت دے کہ منبر پر جا کر میں وہ کچھ بیان کروں جس میں خالق کی رضا ہو اور مخلوق کو حق گوئی سے فائدہ وثواب پہنچے"۔

یزید نے امام علیہ السلام کا مطالبہ منظور نہ کیا اور انکار کر دیا لیکن حاضرین دربار نے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور امامؑ کو اجازت دیئے جانے پر اصرار کیا۔ یزید کا بیٹا معاویہ اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے بھی اجازت دیئے جانے پر اصرار کیا اور کہا:

"یہ نحیف ونزار قیدی کیا کچھ کہہ سکے گا؟"

یزید نے جواب دیا: "تم نہیں جانتے! یہ خاندانِ رسالتؐ علم وعرفان، تکلم وبیان کے وارث ہیں۔ علم انؑ کے سینوں میں اور فصاحت وبلاغت انؑ کی زبانوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے"۔

آخر کار بصد اصرار یزید ناہنجار کو باضطرار اجازت دینا پڑی اور تھکے ماندے، بیمار وغمخوار خطیب آلِ محمدؐ منبر پر آئے۔ یزید اس سے پہلے حضرتِ زینب سلام اللہ علیہا کا خطبہ سن چکا تھا اور مجلس کا بگڑتا رنگ بھی دیکھ چکا تھا۔ اب امام زین العابدینؑ کو اجازت دینے پر مجبور تھا اور نہایت بیقراری اور بے چینی کے ساتھ کلامِ امام سن رہا تھا۔ ہونٹ کاٹتا رہا اور پیچ وتاب کھاتا رہا۔

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام منبر پر جلوہ فگن ہوئے۔ اہل دربار کی بیتاب نگاہیں خطیبِ منبر سلونی کے پوتے کی طرف اُٹھیں، بنی ہاشم کی فصاحت وبلاغت سننے کے لیے مشتاق دل متوجہ ہوئے، نرالے قیدی خطیب اور امامؑ نے یہ خطبہ پڑھا:

خطیبِ آلِ محمد علیھم السلام

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَا بدایة لہُ والدائم الَّذی لَا نفادلہُ و الاوّل الّذی لا اولیّة لہُ و الآخر الّذی لا آخریہ لہُ والباقی بعد فناء الخلق قدر اللّیالی و لایام و قسم فیما بینھم الاقسام فتبارک اللّٰہ الملک العلّام".

"سب تعریف اس خدا کی ہے جس کی ابتداء نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے دوام کا اختتام نہیں۔ وہ ایسا اول ہے جس کی اولیت سمجھ سے بلند ہے اور ایسا آخر ہے کہ جس کی انتہا نہیں۔ مخلوق کے فنا ہونے پر بھی اسے بقاء حاصل ہے۔ اس نے راتوں اور دنوں کی مقدار بنائی"۔

"معاشر النّاس! من عرفنی فقد عرفنی و من لم یعرفنی فانا اُعَرِّفُہٗ بنفسی انا بن مکّة و منٰی انا ابن المروة و الصّفا. انا بن محمدن المصطفیٰ انا بن من لا یخفیٰ انا ابن من علیٰ فاستعلیٰ فجاز سدرة المنتھیٰ و کان من رَبِّہٖ قَاب قوسین او ادنیٰ انا بن من صَلّیٰ بملائکةِ السَّمَآءِ انا بن اسری بہٖ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ انا ابن علی المرتضیٰ انا بن فاطمة الزّھراء انا بن خدیجة الکبریٰ".

"اے لوگو! تم میں سے جو مجھے پہچانتا ہے سو پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا میں اسے اپنا تعارف خود کروائے دیتا ہوں۔ میں والیٔ مکہ ومنیٰ اور والیٔ مروہ وصفا ہوں۔ میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرزند ہوں۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کی شان پوشیدہ نہیں۔ میں اس کا فرزند ہوں جس نے اتنا عروج حاصل کیا کہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے نکل گیا اور اپنے رب کے اتنے قریب ہوا کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جس نے آسمانی فرشتوں کو نماز پڑھائی۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کو شبِ معراج مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کروائی گئی۔ میں علی المرتضیٰ کا فرزند ہوں، میں سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کا فرزند ہوں، میں خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کا فرزند ہوں!

میں اس کا فرزند ہوں جو ظلم وجور سے شہید ہوا، جس کا سر پسِ گردن سے جدا کیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں جو پیاسا شہید ہوا۔ میں قتیلِ کربلا کا فرزند ہوں۔ میں اس بے وارث شہید کا فرزند ہوں جس کی شہادت کے بعد اس کے بدن سے عمامہ

اتار لیا گیا۔ میں اس مظلوم و شہید کا فرزند ہوں، جس کی بیکسی کی شہادت پر ملائکہ نے ماتم کیا۔ میں اس غریب الوطن مقتول کا بیٹا ہوں، جس کی غربت پر جنوں نے نوحے پڑھے اور پرندوں نے ہوا میں گریہ و بکاء کیا۔ میں اس بیکس ذبیح کا بیٹا ہوں، جس کا سر نیزوں پر پھرایا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں، جس کی مستوراتِ عصمت کو برہنہ سر عراق سے شام تک قیدی بنا کر لایا گیا۔

اہل مجلس! حمد ہے اس خدائے تعالیٰ کی جس نے ہمیں اچھی طرح آزمایا کہ ہدایت کا نشان اور عدل و تقویٰ ہم میں ودیعت فرما دیا اور گمراہی اور نشانِ ہلاکت ہمارے غیروں میں رکھ دیئے۔

خلاقِ عالم نے ہمیں چھ خصلتوں کے ساتھ فضیلت بخشی ہے۔ علم و حلم، شجاعت و سخاوت، محبت اور لوگوں کے دلوں میں ہماری قدر و منزلت۔ خدا نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو عالمین میں سے کسی کو اور کو نہیں دیا۔ ہمارے گھروں میں ملائکہ کی آمد و رفت رہی اور کتابِ خدا نازل ہوئی''۔

ابھی امام کا خطبہ تمام نہیں ہوا تھا کہ حاضرین دربار میں تلاطم پیدا ہوا۔ اس قدر مؤثر اور درد بھرے کلمات تھے کہ شامیوں کی غم و حزن کی وجہ سے چیخیں نکل پڑیں۔ وہ لوگ جو خوشی کے لباس میں ملبوس تھے اور جن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، دریائے غم میں ڈوب گئے۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں جاری ہو گیا، اُداسی اور حسرت چھا گئی، صدائے گریہ و بکا بلند ہوئی۔

یزید نے جب اہل دربار کا یہ تاثر دیکھا تو مؤذن کو اذان دینے کا حکم دے دیا۔ مؤذن نے اذان دینا شروع کی اور کہا: ''اللہ اکبر'' امام علیہ السلام نے جملہ دہرایا اور کہا: ''اجل و اکرم ومِمّا اخاف و احذر'' مؤذن نے کہا: ''اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ'' امام علیہ السلام نے یہ جملہ دہرایا اور جب مؤذن نے کہا: ''اشھد ان محمدً رّسول اللّٰہ'' امامؑ نے یہ صیغہ دہرا کر مؤذن سے فرمایا: ''تجھے انہی محمد رسول اللہ کا واسطہ، ذرا خاموش ہو جا، میں یزید سے کچھ کلام کرلوں!''

پھر آپؑ یزید سے اس طرح مخاطب ہوئے:

''ھذا الرّسُولُ جدّی ام جدُّکَ؟''

''یزید! یہ رسولؐ تیرے نانا تھے یا میرے؟''

''یہ رسولؐ جس کی رسالت کی گواہی تیرے موذن نے اذان میں دی ہے، تیرے نانا تھے یا میرے؟ اگر تو یہ کہے کہ تیرے نانا تھے، تو تُو جھوٹا ہے اور اگر تو یہ کہے کہ میرے نانا تھے تو پھر تجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ تو نے ان کے فرزند اور میرے بابا کو ظلم و عدو کے ساتھ شہید کیوں کیا؟ ان کا مال و اسباب کیوں لوٹا اور ان کی مستورات کو قید کیوں کیا؟''

اس کے بعد امام علیہ السلام نے گریبان چاک کر کے بہت گریہ کیا اور فرمایا: ''کوئی شخص سوائے میرے یہ نہیں کہہ سکتا

کہ رسولؐ اللہ میرے جدّ ہیں۔ پھر اس یزید نے اولادِ رسول کیوں قتل کیا؟ رسولؐ اللہ کی عترت کو کیوں قید کیا؟ یزید! عترتِ رسولؐ کو قتل کر کے اور بناتِ رسول کو قید کروا کے پھر تُو اذان کہلواتا ہے اور نمازیں پڑھتا ہے؟ ویل ہے تیرے لئے جب روزِ قیامت میرے جدّ نامدار تیرے دشمن ہو کر کربلا کا مقدمہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کریں گے''۔

اس کے بعد یزید نے اقامتِ نماز کا حکم دیا۔ لوگوں میں ہمہمہ اور چہ میگوئیاں اور غلغلہ پیدا ہو گیا۔ بعضوں نے نماز پڑھی اور بعض اُٹھ کر چلے گئے۔

زندانِ شام

حضرتِ سیدۂ زینب سلام اللہ علیہا اور حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے قصرِ یزیدیت کی بنیادیں ہلا دیں۔ ظلم واستبداد کے محلات میں شگاف پڑ گئے اور اقتدارِ یزید خطرے میں پڑ گیا۔ شامیوں پر رازِ حقیقت منکشف ہو گیا اور ظلمِ یزیدیت طشت از بام ہو گیا۔ شامیوں نے یہ خطبے ہمہ تن گوش ہو کر اور پورے انہماک کے ساتھ سنے۔ حقائق سے لبریز بیانوں نے اہل شام کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ شامی لوگ باہم چہ میگوئیاں کرتے: ''ہم کس غلطی میں مبتلا تھے؟'' ''ہم کونسی وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟'' ''یہ کیا ہو گیا؟''

یہ بدلے ہوئے رُخ دیکھ کر اور یہ ہمہمہ سن کر یزید نے اسیرانِ کربلا کو فوراً دربار سے نکال کر زندان میں بھیج دیا۔ زندان کیا تھا؟ ایک خرابہ تھا۔ خرابہ بھی اس قدر بوسیدہ تھا کہ چھت سے خالی تھا۔ مکان کا فائدہ تو یہ ہے کہ موسم کی شدت سے محفوظ رکھے۔ لیکن اسیرانِ آلِ محمد علیہم السلام کو یہ فائدہ حاصل نہ تھا۔ چھت نہ ہونے کی وجہ سے دن کی گرمی اور رات کی سردی سے یہ پاک ذوات محفوظ نہ تھیں۔

دمشق کے زندان میں عترتِ رسولؐ قید ہے۔ کھلی دھوپ نے سادات کے چہرے جھلسا دیے تھے۔ سیدانیاں دیواروں کے سائے میں بیٹھتی تھیں اور دوپہر کا وقت کھلی دھوپ میں گزار دیتیں۔ رات کو اوس پڑتی اور دن کو دھوپ ستاتی۔ اسی زندان میں مجلسِ حسینؑ منعقد کرتیں اور کربلا کے شہداء پر یہ بیبیاں گریہ و ماتم کرتیں۔ بھلا جن کے ایسے عالی قدر اور پیارے عزیز مارے جائیں، کیا انہیں عزیزوں کی موت بھول سکتی ہے؟ موت کو بھلانے والی کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی بلکہ موت یاد دلانے والے تمام اسباب موجود تھے۔ سر سامنے تھے۔ سروں کو دیکھ کر بدن یاد آتے اور کربلا کا میدان اور شہیدوں کے لاشے ہر وقت تصور میں رہتے اور دن رات گریہ میں گزر جاتے۔

شہدائے کربلا کے سرہائے مقدسہ

سرِ مقدسِ حضرت امام حسین علیہ السلام بعد از شہادت تنِ اقدس سے جدا ہونے کے بعد مختلف منازل طے کرتا رہا۔ بتولؑ کے ناز پروردہ لال اور میکائیل کے گہوارہ میں سونے والے، جبرئیل کے پروں پر راحت حاصل کرنے والے، آغوشِ بتولؑ اور دوشِ رسولؐ کے نازنین شہزادہ نے کیا کیا نشیب و فراز دیکھے۔ مگر روحِ بتولؑ ہر منزل پر فرزندؑ کے سر کے ساتھ رہی۔

عصرِ عاشور کو تکبیروں کی صداؤں میں یہ سرِ اقدس نوکِ نیزہ پر بلند ہوا اور گیارہویں کی رات کو خولی کے گھر میں رہا۔ بارہویں محرم کے دن بابا کے دارالحکومت کوفہ میں پھر اس نے عروج حاصل کیا اور بازاروں اور گلیوں کی سیر کی۔ پھر یہ خطیب، نیزے کے منبر سے اتر کر طشت میں ابنِ زیاد سامنے پیش ہوا۔ یہ منزل بھی دیکھی کہ جس جگہ رسولؐ و بتولؑ بوسے لیا کرتے تھے، ان معصوم ہونٹوں اور پاکیزہ دندان پر ابنِ زیاد لعین کی چھڑی کی ضربیں لگیں۔ معلوم نہیں اس زندہ و جاوید سر نے کتنی اذیتیں برداشت کیں اور کس حوصلہ سے یہ ظلم سہتا رہا۔

کوفہ کے بعد طویل سفر میں کبھی صندوق میں بند کیا جاتا، کبھی نوکِ سناں پر سوار کیا جاتا، کبھی دیواروں پر اور کبھی پتھروں پر رکھا جاتا۔ مسلمانوں کے یہاں تو یہی قدر و توقیر رہی البتہ کبھی نصرانیوں کو مہمان ہوتا تو وہ احترام کرتے، غسل دیتے، خوشبو لگاتے، بالوں میں کنگھی کرتے، مشک و عنبر سے معطر کرتے، دردِ دل کا اظہار کرتے اور غم کے آنسو بطور ہدیۂ عقیدت پیش کرتے۔

شام کے بازاروں میں سنان مرکب رہا اور دربار میں حکمران بانیٔ شریعت کے نواسے سے طرح طرح کی بے ادبیاں کر کے اپنے کفر و نفاق کا اظہار کرتے رہے۔

اسیرانِ آلِ محمد علیہم السلام کو زندان میں محبوس کرنے کے بعد اس یزید معلون نے حکم دیا کہ سرِ حسین علیہ السلام یزید کے شاہی رہائشی محل، جو کہ جامع مسجد کے قریب تھا، کے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔ مظلوم کا سرِ اقدس ظالم کے گھر کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ دوسرے شہدائے کربلا علیہم السلام کے سروں کو دمشق کے متعدد دروازوں اور جامع مساجد کے مختلف دروازوں پر لٹکایا گیا اور یہ مقدس سر کئی روز تک ہر آنے جانے والے کی دید کا مرکز بنتے رہے۔

ہند، زوجۂ یزید

سرِ مبارکِ حضرت امام حسین علیہ السلام جب شاہی محل کے دروازے پر آویزاں کیا گیا اور ہند بنت عمرو بن سہیل، زوجۂ یزید کو جب اس نرالے مہمان کی خبر ملی تو اس نے سرِ اقدس کی دروازے پر زیارت کی۔

(اس سے قبل شاید محلات میں گریہ وبکاء کی آوازیں پہنچ چکی تھیں اور زنانِ بنی امیہ کو مستوراتِ بنی ہاشم کے بے پردہ قیدی بن کر آنے کی خبر ہو چکی تھی)۔

ہندہ نے کیا دیکھا، فرزندِ بتولؑ کے سرِ اقدس سے تازہ خون کے قطرے گر رہے ہیں اور چاروں اطراف ایک خوشبو پھیل رہی ہے۔ ہندہ برداشت نہ کر سکی اور یہ سلطانِ وقت کی زوجہ، بے تابانہ اور بے حجاب باہر نکل آئی اور سیدھی دربار میں پہنچی۔ یزید تخت پر مرصع تاج پہنے بیٹھا تھا اور اردگرد خاص و عام جمع تھے۔ ہند برہنہ سر بغیر چادر کے دربار میں آئی اور یزید کو زجر و توبیخ کا نشانہ بنانے لگی:

''ہائے یزید! یہ حسینؑ ابن بتولؑ کا سر ہے جو میرے دروازے پر لٹکا ہوا ہے؟''

یزید نے فوراً اٹھ کر پہلا کام یہ کیا کہ ہند کے سر پر چادر ڈال دی اور کہا:

''تو اس طرح بے پردہ میرے دربار میں کیوں آئی ہے؟''

کس قدر حیرت کا مقام ہے! اس ملعون کو اپنی زوجہ کے بے حجاب آنے کا اتنا دکھ ہوا کہ فوراً اسے چادر سے ڈھانپا مگر دخترانِ رسولؐ کو اس ملعون نے کربلا سے شام کے دربار تک بے پردہ اور برہنہ سر مجمع عام میں پھرایا اور اس کو شرم و حیاء نہ آئی!

اس نے ہند کو مخاطب کر کے کہا: ''ہاں یہ حسینؑ کا ہی سر ہے۔ اس پر بے شک گریہ و بکا کر''۔

پھر اس نے اپنا جرم چھپاتے ہوئے کہا:

''ابن زیاد نے جلدی کی اور اسے قتل کر دیا''۔

شام کے مختلف واقعات

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام مستورات کے ساتھ قید خانے میں پہنچ چکے تھے اور شہدائے کربلا علیہم السلام کے سرہائے مقدسہ مختلف دروازوں پر لٹکائے گئے تھے۔ دربارِ یزید میں سرِ امام حسین علیہ السلام ایک بار نہیں بلکہ کئی بار لایا گیا اور ساتھ ساتھ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو بھی کئی بار بلوایا گیا۔

دربارِ شام کے واقعات جو بیان کیے جاتے ہیں، صرف ایک وقت کے نہیں، مختلف اوقات میں یزید دربار لگا کر سرِ امام علیہ السلام کے ساتھ بے ادبی سے پیش آتا رہا اور بعض اوقات تو اسیرانِ اہل بیت علیہم السلام بھی پیش کیے جاتے۔

سفیرِ روم

یزید کا معمول تھا کہ دربار میں بساطِ شطرنج بچھاتا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ لہو ولعب میں مشغول ہوتا، سرِ حضرت امام

حسین علیہ السلام کو سامنے رکھتا اور دکھا دکھا کر شراب پیتا، لیکن ان درباروں میں مجمع عام نہ ہوتا اور ہر کسی کو داخل دربار ہونے کی اجازت نہ ہوتی۔

ایک روز یزید نے حسب معمول دربار لگایا اور مصروف شراب وشطرنج ہوا۔ سر مقدسِ حضرت امام حسین علیہ السلام سامنے ایک طشت میں رکھا گیا تھا۔ اتفاق سے اس روز شاہِ روم کا سفیر بھی دربار میں موجود تھا۔ یہ سفیر مذہب کا عیسائی اور نصرانی قوم کا فرد تھا کیونکہ روم میں عیسائی مذہب رائج تھا۔

سفیر روم نے طشتِ طلاء میں اس خوبصورت اور بارعب و پرہیبت سر کو دیکھا۔ نصرانی نے شکل وشباہت اور رعب و جلال سے اندازہ لگالیا کہ کسی شاہی خاندان کا فرد ہے۔ اس نے یزید سے دریافت کیا:

نصرانی: هٰذَا رَاسُ مَنْ؟

یہ کس کا سر ہے؟

یزید: مَا لَکَ وَ لِهٰذَا الرَّاس؟

تجھے اس سر سے کیا واسطہ؟

نصرانی: میں جب لوٹ کر اپنے ملک جاتا ہوں تو بادشاہ مجھ سے دیدہ وشنیدہ واقعات دریافت کرتا ہے۔ چونکہ تجھے اس جنگ میں فتح حاصل ہوئی ہے اور تیرے مخالف کا سر تیرے سامنے ہے، بادشاہ مجھ سے پوچھے گا اور میں اسے بتاؤں گا۔ ہمارا بادشاہ بھی اس کامیابی میں تیرے ساتھ شریک مسرت ہوگا۔

یزید: هٰذا راسُ حسینٌ بن علیٌ ابن ابیطالبٌ!

یہ حسینؑ بن علیؑ بن ابیطالب علیہم السلام کا سر ہے۔

نصرانی: وَ مَنْ اُمهٗ؟

''اور اس کی والدہ کون ہے؟''

یزید: فَاطِمَةٌ بِنتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ.

فاطمہ بنتِ رسولؐ اللہ۔

نصرانی: اُفٍ لَکَ وَلِدِیْنِکَ لِیْ دِیْنٌ اَحْسَنُ مِنْ دِیْنِکُمْ.

"تجھ پر اور تیرے ایمان پر افسوس ہے! تم سے میرا دین بہتر ہے۔ اواپنے پیغمبرؐ کی اولاد کے قاتل! کیا تمہارا دین تمہیں یہ سکھاتا ہے کہ اپنے ہی پیغمبر کی اولاد کو قتل کرو اور قید میں ڈالو؟ اے یزید! سن لے! میں حضرت داؤد علیہ السلام کا نواسہ ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان بسیار پشتوں کا فاصلہ ہے۔ تاہم نصرانی قوم میری اس قدر تعظیم وتکریم بجالاتی ہے کہ میرے پاؤں کی خاک کو بطور تبرک اٹھالیتی ہے"۔

"وَاَنْتُمْ تَقْتُلُوْنَ ابْنَ بِنْتِ نَبِیِّکُمْ وَ مَا بَیْنَکُمْ نَبِیِّکُمْ اِلَّا اُمٌّ وَاحِدَۃٌ فَاَیُّ دِیْنٍ دِیْنُکُمْ؟"

"اور تم لوگ اپنے پیغمبرؐ کی دختر کے فرزندؑ کو قتل کرتے ہو جبکہ تم اور تمہارے نبیؐ کے درمیان صرف ایک پشت کا فاصلہ ہے؟ تمہارا کون سا دین ہے؟"

نصرانی: یزید! تم نے کنیسۂ حافر (گدھے کے سم والے گرجے) کا واقعہ سنا ہے؟

یزید: نہیں!

نصرانی: ایک جزیرہ ہے۔ اس میں نصرانیوں کی آبادی ہے۔ اس کے شہروں میں ایک بڑا شہر ہے، نہایت خوبصورت اور عظیم الشان۔ اس میں بہت سے گرجے ہیں اور ان میں سب سے بڑا گرجا کنیسہ حافر ہے۔ اس گرجے کے محراب میں سونے کا ایک ڈبہ ہے اور اس ڈبہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سواری کے گدھے کا ایک سم ریشم و دیباج کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے۔ ہر سال نصرانی لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں، اس کے اردگرد طواف کرتے ہیں، اسے چومتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں اور اس کے پاس کھڑے ہو کر خدا سے حاجات طلب کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے پیغمبروں کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ ان کی سواری کے گدھے کے سم کی بھی تعظیم وتکریم کرتے ہیں اور تم اپنے پیغمبرؐ کے قلب وجگر کے ٹکڑوں کو قتل کرتے ہو اور اس کی بیٹیوں کو قید کر کے مجمع عام میں پھرا کر خوش ہو ہو کر شراب کے دور چلاتے ہو؟ خدا تمہیں برکت نہ دے!

نصرانی کا یہ کلام سن کر یزید آگ بگولا ہو گیا اور اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور اپنی روسیاہی کو بے نقاب ہونے سے نہ بچا سکا۔ سلطانی گھمنڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے یزید نے اس سفیر کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

سفیر نے جب اپنے متعلق قتل کا حکم سنا تو یزید کو مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ"۔

"کیا واقعی تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟"

یزید: ہاں!

نصرانی: تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ گذشتہ رات میں نے عالمِ خواب میں دیکھا ہے کہ تمہارے پیغمبرؐ مجھے فرما رہے ہیں: "اے نصرانی! تو جنتی ہے!"

میں حیران ہوا کہ میں اس پیغمبرؐ کے دین پر تو نہیں، ان کے نزدیک میرے جنتی ہونے کا کیا معنی؟ لیکن اب اس کا راز کھلا۔ اگر پیغمبرؐ سچا نہ ہوتا تو نواسہ اس کے دین کیلئے قربانی کیوں پیش کرتا؟

اس نصرانی نے کلمہ شہادت پڑھا، اسلام قبول کیا اور سرِ مبارک اٹھا کر سینے سے لگایا، آنکھوں سے مس کیا اور رو رو کر اس کے بوسے لئے۔ اسی اثناء میں یزید کے جلادوں نے اسے قتل کر دیا اور اس طرح یہ نصرانی جوارِ رحمت صحبت پیغمبرِ خدا میں پہنچ گیا۔

امام زین العابدینؑ کی معجزانہ زندگی

قادرِ مطلق اور علیم وحکیم خدا اپنی حکمت کے تحت جن کی زندگی برقرار رکھنا چاہتا ہے، اسے ظالموں کے دستِ تعدی اور قاتلوں کے مذموم ارادوں سے اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعہ ان کو سلامت اور محفوظ رکھتا ہے۔ جن مقدس نفوس کیلئے میدانِ کربلا میں شہادت مقدر کر دی تھی، وہ والہانہ انداز میں اپنی ابدی خوابگاہوں کی طرف بڑھے اور اپنے میثاق کو وفا کر کے سرخرو ہوئے۔

البتہ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کیلئے معرکہ کارزار مکتوب نہ تھا، بلکہ بازار و دربار مقدر تھے۔ خاندانِ رسالتؐ کے اس باقی فرد اور مقدس یادگار کیلئے لمبی بیماری اور طویل سفر مقسوم تھا۔ اس بقیہ آلِ محمد علیہم السلام کیلئے بامقصد زندگی کو برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے ہر مقام پر ظالموں کے ارادے قادرِ کریم نے ناکام کئے، ورنہ ان سنگدلوں نے تو کئی مرتبہ امامِ عالی مقام علیہ السلام کو شہید کرنے کی تدبیریں کیں۔

عصرِ عاشور کو جب ظالم فوج لوٹنے اور غارت گری کے ارادے سے خیامِ اہل بیتؑ میں داخل ہوئی تو بعض لعینوں نے امام زین العابدین علیہ السلام کو شہید کرنے کا ارادہ کیا اور بعضوں نے ان کی مخالفت کی۔ شمر لعین تلوار سونت کر امام علیہ السلام کی طرف بڑھا لیکن حمید بن مسلم آڑے آیا اور شمر کو رکنا پڑا اور اتنے میں عمر بن سعد بھی آ گیا اور اس نے شمر کو روک دیا۔

دربارِ کوفہ میں جب ابن زیاد کا امام علیہ السلام سے مکالمہ ہوا تو وہ ملعون کوئی جواب نہ دے سکا اور غصہ میں تلملا کر قتل پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ امام علیہ السلام کو قتل کر دے۔ یہ حکم سنتے ہی حضرت زینب سلام اللہ علیہا اپنے بھتیجے اور امامِ

وقت سے لپٹ گئیں اور فرمایا:

"اے ابن زیاد! تھوڑا خون بہایا ہے؟ ابھی تیری ظالم طبیعت قتل سے سیر نہیں ہوئی؟ میں ہرگز اس سے جدا نہ ہوں گی جب تک میں بھی اس کے ہمراہ قتل نہ ہو جاؤں!"

ابن زیاد نے جب یہ منظر دیکھا تو قتل سے ہاتھ اٹھالیا۔

یزید نے اسیران آلِ محمد علیہم السلام کے قتل کا مشورہ اہل دربار سے لیا۔ بعض خوشامدی بے دینوں نے نہایت دلیری کے ساتھ قتل کا مشورہ دیا، لیکن نعمان بن بشیر نے اس کے خلاف رائے دی۔ اس وقت تو یزید اس ارادے سے باز رہا لیکن حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کے بارے میں اس کے دل میں خلش باقی رہی۔

دربار میں جب یزید نے امام علیہ السلام سے کلام کیا اور سوال و جواب ہوئے تو اس وقت بھی یزید نے قتل امام کا حکم صادر کر دیا۔ حضرت امّ کلثومؑ نے امام علیہ السلام کو گلے لگایا اور فرمایا:

"بیٹا! تیرے سوا اب اس پردیس میں ہمارا کون ہے؟"

اس معصومہ کی جگر فگار فریاد سن کر اہل دربار رونے لگے اور مجلس نے بیک زبان ہو کر کہا:

"یہ مریض نوجوان ہے۔ دکھوں اور مصیبتوں میں گھل گھل کر قریب المرگ معلوم ہوتا ہے۔ اسے قتل نہ کر!"

ایک اور روایت کے مطابق ایک شامی قتل امامؑ کے ارادے سے اٹھا، لیکن یزید نے دربار کا رنگ دیکھ کر اسے منع کیا اور قتل کی اس تدبیر کو خفیہ رکھا۔

ایک مرتبہ یزید نے امام علی زین العابدین علیہ السلام کو دربار میں طلب کیا۔ کئی طرح کے سوالات کرتا رہا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح ان کی بات گرفت میں آجائے اور قتل کا جواز پیدا ہو جائے، لیکن امام علیہ السلام یزید کو اس کے مذموم ارادوں کی تکمیل کا موقع فراہم نہ کیا۔

ایک مرتبہ یزید نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ امام علیہ السلام کو فلاں فلاں باغ میں لے جا کر قتل کر دو اور وہیں دفن کر دو۔ چنانچہ وہ سپاہی امام علیہ السلام کے ہمراہ باغ میں پہنچا اور خود قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ امام علیہ السلام نے نماز کا آغاز کیا اور مصروف بہ مناجات و عبادت ہو گئے۔

یزید کا یہ سپاہی قبر سے فارغ ہو کر قتل امام علیہ السلام کے ارادے سے آپؑ کی طرف بڑھا۔ اسی اثناء میں فضاء میں ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ سپاہی جہنم رسید ہو گیا۔ اتفاق سے یزید کا ایک بیٹا جس کا نام خالد ہے، یہ عبرتناک منظر دیکھ رہا تھا، اس

نے فوراً واپس آ کر یزید کو تمام ماجرا سنا دیا۔ یزید گھبرا گیا اور امام علیہ السلام کے قتل سے باز رہا، البتہ اس سپاہی کو اسی کے ہاتھ سے کھودی گئی قبر میں دفن کر دیا گیا۔

منہال کی ملاقات

چونکہ خاندانِ عصمت وطہارت کی شہزادیوں کا سوائے امام سجاد علیہ السلام کے کوئی وارث باقی نہیں رہ گیا تھا اور برادرؑ مظلوم کی یہی نشانی اور مقتول بھائی کی یہی یادگار تھی، اس واسطے جناب زینبؑ واُم کلثومؑ سید سجادؑ کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ زندان میں ایک دوسرے کیلئے باعث تسکین تھے۔ ویسے کبھی کبھی زندان سے باہر چلنے پھرنے چلے جاتے تھے۔

منہال بن عمرو بیان کرتا ہے کہ ایک بار امام سجادؑ کو دیکھا کہ شام کے بازار سے گزر رہے تھے، ضعف ونقاہت کی وجہ سے عصا کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔ جنابؑ کی ٹانگیں سوکھ کر سرکنڈے کی مانند ہوگئی تھیں اور رنگ زرد تھا۔ پنڈلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً بیڑیوں کے زخم تھے۔ میں نے بیمار امامؑ اور قیدی امامؑ کی دُکھ بھری حالت دیکھی تو برداشت نہ کر سکا، دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میں نے کہا:

"كَيْفَ اَصْبَحْتَ يَابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ".

"فرزندِ رسولؐ کیسے گزر رہی ہے؟"

میرا سوال سن کر امامؑ رو پڑے اور فرمایا:

"اس خستہ حال، دُکھی انسان کا کیا حال پوچھتے ہو جو یزید بن معاویہ ملعون ایسے شقی وسنگدل بادشاہ کی قید میں ہو۔ جس کی مستورات نے کبھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا ہو، سرڈھانپنے کیلئے ان کو کپڑا میسر نہ ہو اور رات دن نوحہ ومرثیہ ہو۔ دن کو دھوپ اور رات کو سردی واوس ستاتی ہو۔

اے منہال! اس اُمت میں ہماری وہ حالت ہے جو فرعون کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی تھی۔ مردوں کو قتل کر دیتے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ عرب عجم پر ہمیشہ فخر کرتے تھے کہ محمد مصطفےٰؐ عربی ہیں اور قریش فخر کرتے تھے کہ پیغمبرؐ ان کے خاندان سے ہیں۔ مگر اہل بیتِ رسولؐ کی یہ حالت ہے کہ ہمارے حقوق غصب کر لئے گئے، قتل کیا گیا اور قید کیا گیا۔ وطن سے بے وطن ہیں۔ ابھی یزید کی طرف سے امن میں نہیں۔ ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ جب بھی ہمیں بلاتا ہے تو یہ خیال دل میں گزرتا ہے کہ ہمیں قتل کرنے کیلئے تو نہیں بلایا!"

منہال بیان کرتا ہے کہ ہم باتیں کرتے ہوئے قید خانہ کے قریب پہنچے تھے کہ اتنے میں ایک بی بی قید خانہ سے باہر آئیں اور آواز دی:

"بیٹا سجادؑ! جلدی واپس آجاؤ، اتنا باہر نہ نکلا کرو۔ ہمیں شامیوں پر اعتبار نہیں رہا"۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خواہر حسینؑ، دختر زہراؑ جناب زینب سلام اللہ علیہا ہیں۔ سجادؑ آنکھوں سے اوجھل ہوئے، بیبیاں بیقرار ہو گئیں۔

خوابِ حضرت سکینہ سلام اللہ علیہا

حضرت سکینہ بنت الحسین علیہم السلام بیان فرماتی ہیں:

زندانِ شام میں چوتھی رات تھی اور میں اس رات گریہ و بکاء کرتی رہی۔ بابا کو، بھائیوں کو اور چچا عباس کو یاد کر کے روتی رہی اور روتے روتے میں سو گئی۔

عالم خواب میں دیکھتی ہوں کہ پانچ شتر ہائے نورانی ہیں۔ ان پر پانچ بزرگ بیٹھے ہیں اور ہر نورانی ناقہ کے آس پاس فرشتوں کی ایک جماعت ہے اور خدامِ جنت ان کے آس پاس چل رہے ہیں۔ وہ نورانی اونٹ تو گزر گئے لیکن ایک خادم نے میرے قریب آ کر کہا: "سکینہؑ! آپ کے جدِامجد آپؑ کو سلام کہتے ہیں"۔

میں نے کہا: "میرے جدامجد رسولؐ اللہ پر سلام ہو، تو کون ہے؟"

اس نے جواب دیا: "میں جنت کا ایک خادم ہوں"۔

میں نے پوچھا: "وہ کون بزرگ ہیں جو نورانی اونٹوں پر سوار جا رہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "پہلے حضرتِ آدمؑ، دوسرے حضرت ابراہیمؑ، تیسرے حضرت موسیٰؑ، چوتھے حضرت عیسیٰؑ اور پانچویں آپ کے جدِامجد حضرت رسولؐ خدا ہیں"۔

پھر میں نے دریافت کیا: "وہ کہاں جا رہے ہیں؟"

اس خادم نے کہا: "آپؑ کے بابا امام حسین علیہ السلام کے پاس جا رہے ہیں"۔

حضرتِ سکینہؑ فرماتی ہیں کہ میں ان کی طرف دوڑی تاکہ نانا کے پاس ظالموں کے ظلم کی شکایت کروں۔ میں نے دیکھا کہ اسی اثناء میں پانچ اور نورانی محمل اُترے۔ ان میں سے پانچ مستورات ظاہر ہوئیں۔ میں نے پوچھا:

"یہ مستورات کون ہیں؟"

جواب ملا: "پہلی مستورامّ البشر حضرت حوا ہیں، دوسرے جناب آسیہ، تیسری جناب مریم بنت عمران علیہم السلام، چوتھی حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا اور پانچویں آپ کی دادی حضرت زہراء سلام اللہ علیہا ہیں"۔

پس میں دوڑ کر اپنی دادی زہراء سلام اللہ علیہا کی گود سے لپٹ گئی اور اُمت کے مظالم کی فریاد کرنے لگی۔

جدہ ماجدہ کی آواز آئی: "بیٹی! یہ تمام دیکھ چکی ہوں۔ تمہاری تمام فریادیں سن چکی ہوں۔ میں کربلا سے شام تک تمہارے ہمراہ رہی ہوں۔

بیٹی! یہ تیرے مظلوم بابا کی خون بھری قمیض ہے۔ اسے اپنے سے جدا نہ کروں گی، جب تک بارگاہِ خدا میں اسے پیش نہ کرلوں گی"۔

حضرتِ رقیہ بنت الحسینؑ کی وفات

امامِ مظلوم حضرت امام حسین علیہ السلام کی ایک صغیر السن دختر تھیں، جسے آپ بہت پیار کرتے تھے اور وہ آپ کو بہت چاہتی تھی۔ آپ کی اس دختر کا نام رقیہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس دختر کا سن تین سال کا تھا۔ روزِ عاشور بابا کے پیار سے جدائی اور ان کی آغوش کی شفقت سے محروم ہونے کے بعد ان کی شکل دیکھنے کو ترستی تھیں اور دن رات ان کو یاد کر کے روتی رہتی تھیں۔ جب وہ بابا کو یاد کر کے روتیں تو بابا کی یاد تازہ کر کے تمام بیبیوں کو رلا دیتیں۔

ایک رات جب وہ بابا، بابا کہتے ہوئے بیدار ہوئیں تو ماں سے پوچھا: "بابا جان کہاں ہیں؟ ابھی مجھے بابا ملے ہیں"۔ پھوپھی سے کہا: "میرے بابا آئے تھے"۔

معصومہ کی اس فریاد سے بیبیوں کا غم تازہ ہوگیا۔ بیبیوں نے یتیمہ کو تسلی دینے اور خاموش کرنے کی بسیار کوشش کی مگر جس قدر تسلی دیتی تھیں معصومہ کا غم بڑھتا چلا جاتا تھا۔ یہی کہتی تھیں: "مجھے بابا سے ملاؤ، مجھے بابا سے ملاؤ، میرے بابا آئے تھے"۔

گریہ وبکاء زیادہ ہوا، زندان میں کہرام بپا ہوا اور چونکہ یہ زندان یزید کے محل کے قریب تھا، اس لیے ماتم کی صدائیں یزید کے کانوں میں آئیں اور اس نے دریافت کر بھیجا۔ جواب ملا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صغیر السن دختر نے خواب میں بابا کو دیکھا ہے اور اب بے چین ہیں۔ یہ بابا کا سر مانگتی ہیں۔ یزید نے سر بھجوا دیا تاکہ معصومہ سرِ حسینؑ سے تسلی حاصل کرے۔

ایک طشت میں رومال سے ڈھانپا ہوا سرِ اقدسِ امام حسین علیہ السلام معصومہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ معصومہ نے بابا کا

سر سینے سے لگایا، بوسے لئے اور اپنے دکھوں کی سر کے سامنے فریاد کی:

"بابا! آپ کے سر کو کس نے خون سے رنگین کیا؟ کس نے آپ کی گردن کاٹی؟ کس نے مجھے کمسنی میں یتیم کر دیا؟"

اسی طرح مظلومہ سر کو سامنے رکھ کر فریاد کرتی رہی۔ آخر میں بابا کے منہ پر منہ رکھا اور معصومہ کو غش آ گیا۔ کسی بی بی نے معصومہؑ جو ہاتھ لگا کر اُٹھانا چاہا تو معلوم ہوا کہ روح بدن سے جدا ہو چکی ہے اور یتیمہ اپنے بابا کے پاس پہنچ چکی ہیں۔

حق و باطل

اصل، صحیح، واقعی، موجود، ہو چکا یا ہونے والا ہے۔ یعنی ان تمام امور کو حق کہتے ہیں۔ جعلی، غلط، جھوٹا، بیکار، بے فائدہ، معدوم، جو کبھی موجود نہ رہا ہو، نہ اس کا وجود ہوگا، یہ تمام باتیں باطل کہلاتی ہیں۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، انبیاء علیہم السلام حق ہیں، آئمہ معصومین علیہم السلام حق ہیں، ملائکہ حق ہیں، کتب سماویہ حق ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کا وجود ہے، ہو گزرا ہے، ان کا وجود صحیح ہے، یہ سچے ہیں اور جب کہتے ہیں کہ موت حق ہے، قیامت حق ہے، حساب و کتاب حق ہے، پل صراط حق ہے، جنت و دوزخ حق ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کا وجود یقیناً ہوگا اور یہ آنے والی ہیں اور یقیناً آئیں گی۔ تو یہاں حق کا معنی وجود، وقوع اور یقین ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ پیغمبرانِ خدا حق ہیں، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق نبی ہیں اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہم السلام برحق امام ہیں، حضرت امام حسن علیہ السلام برحق ہیں، تو اس جگہ حق سے مراد سچ اور صحیح اور فی الواقع ہے۔ یعنی حضرت محمد مصطفیٰؐ سچے اور فی الواقع پیغمبر ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام سچے اور فی الواقع امام ہیں۔

حق کے مقابلے میں باطل ہے۔ ہمارا قول کہ بہت سے خدا باطل ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے خداؤں کا کوئی وجود نہیں۔ فرعون باطل ہے، اس کی خدائی باطل ہے، فرعون دعویٰ خدائی میں سچا نہ تھا۔ اس کی خدائی بناوٹی تھی۔ اسی طرح جھوٹے خدا، جھوٹے نبی، جھوٹے امام، ان کو باطل کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ لوگ سچے پیغمبر اور فی الواقع پیغمبر نہ تھے۔ ان کا دعویٰ صداقت پر مبنی نہ تھا۔ اسی طرح یہ باطل امام جھوٹے تھے اور صحیح نہ تھے۔ معیار امامت پر پورے نہ اترتے تھے۔ غلط ہیں، بناوٹی ہیں، وغیرہ۔

باطل کا معنی بیکار اور بے فائدہ ہے۔ جیسا کہ آیت قرآن میں ہے:

"رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً".

"خدایا! تو نے زمین و آسمان کو بے فائدہ اور بیکار پیدا نہیں کیا"۔

جادوگروں کے متعلق ارشاد گرامی ہے:

"وَ بَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ".

"ان کا عمل بیکار گیا اور بے فائدہ ثابت ہوا"۔

یا یہ کہنا کہ اس کی نماز باطل ہے، اس کا روزہ باطل ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی نماز اور اس کا روزہ بے فائدہ ہوگیا۔

حق و باطل کی تشریح کے بعد ہم ان دونوں قوتوں کا ابتدائے عالم سے آخرِ جہاں تک مقابلہ وتصادم بیان کرتے ہیں۔

حق و باطل دو متضاد قوتیں ہیں، جو ہمیشہ سے برسرپیکار رہیں اور ہمیشہ ہی متصادم رہیں گی۔ حق اصل اور باطل نقل۔ حق موجود رہتا ہے اور اس کا قیام صداقت وصحت پر ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل باطل معدوم ہو جاتا ہے اور اس کے قدم مضبوط نہیں ہوتے۔ یہ مکروفریب کے سہارے کچھ عرصہ زندہ تو رہتا ہے لیکن آخرکار ناکام و بے مراد ہی ہوتا ہے۔ چونکہ یہ قوتیں اس دنیا میں دائمی ہیں، اس واسطے ان کے مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔ باطل میں حسد ہوتا ہے اور حق محسود ہوتا ہے۔ باطل حق کو دبانے اور جھکانے کی کوشش کرتا ہے لیکن حق دب دب کر بھی ابھر جاتا ہے مگر باطل کے سامنے کبھی بھی جھکتا نہیں۔

اس دنیا میں حق حضرت آدم کی صورت میں اور باطل شیطان کے پیکر میں نمودار ہوا۔ حضرت آدم خلیفہ خدا تھے اور برحق نبی اور رہنما تھے۔ شیطان حاسد اور سرکش تھا۔ دراصل ابلیس کو آدم کا سجدہ کرانے سے یہ مقصود تھا کہ مخالف طاقتیں اطاعتِ خلیفۂ خدا اور ہادیٔ حق کو قبول کرلیں اور سرکشی و بغاوت سے باز رہیں لیکن حارث نے آدم کے آگے جھکنے سے انکار کردیا اور باطل اور شیطان بن گیا۔ آدم حق ہیں اور شیطان باطل۔

یہ مقابلہ تو آسمانوں پر تھا۔ روئے زمین پر حق و باطل کا ابتدائی تصادم اور ان کی پہلی آویزش حضرت آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل سے ہوئی۔ یہ دونوں بھائی ہیں۔ ایک باپ کی اولاد ہیں اور ابتدائی انسان ہیں۔ انسانوں کی مختصر آبادی کا پہلا دور ہے۔ زمین ابھی ابھی ان کے وجود سے آشنا ہوئی تھی اور ان کی زندگی کا نہال بھی پُر بہار تھا کہ حسد کی آندھی چلی، جس میں طغیان کے جھونکے نے پُر بہار اور بار آور شجر کو تاراج کر دیا۔

"وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ آدَمَ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ. لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَا اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ".

"اے پیغمبر! ان لوگوں کو آدمؑ کے دو بیٹوں کی خبر سنا دو۔ جب دونوں نے بارگاہِ خدا میں قربانیاں پیش کیں تو اللہ نے ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی اور دوسرے کی قبول نہ کی۔ جس فرزندِ آدمؑ کی قربانی نا قبول ہوئی اس نے (مارے حسد کے اور احساسِ محرومی سے غضبناک ہوکر) کہا: میں تجھے ضرور قتل کردوں گا۔ مقبول بارگاہ نے کہا: خدا تو انہی کی قربانیاں قبول کرتا ہے جن

میں تقوی ہو، اگر تُو نے مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیا اور اس غرض سے میری طرف دستِ ظلم بڑھایا تو میں اپنا ہاتھ قتل کے ارادے سے تیری طرف نہیں بڑھاؤں گا۔ میں تو خدائے ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں"۔

قابیل کی قربانی جب رد ہوگئی، قصور اس کا اپنا تھا، خلوص و تقوی سے خالی تھی، عملِ صالح شامل نہ تھا، تو مارے حسد کے جل بھن گیا۔ بھلا اس میں ہابیل کا کیا قصور تھا؟ اس کی اپنی نیکی اور خلوص اس کے کام آیا۔

یہاں حسد اور محرومی نے بھائی کو بھائی کے خلاف اکسایا۔ سعادت سے محروم بھائی کو حسد آیا اور حسد وہی کرتا ہے جو صفاتِ جلیلہ اور اخلاقِ حسنہ سے عاری ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص بلندئ درجات حاصل نہ کرسکے تو بلند پایہ شخص کے ساتھ حسد کرنے لگتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ"۔

"کیا وہ لوگوں کے ساتھ حسد کرتے ہیں اس بات پر کہ خدا نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے"؛

بہرحال قابیل نے حسد اور بغض و عناد کی بناء پر اپنے ماں جائے ہابیل کو قتل کردیا۔ روئے زمین پر انسانی قتل کی پہلی واردات تھی اور پہلی ہی بار زمین کسی انسان کے خون سے آشنا ہوئی۔

دو قوتیں تھیں، حق و باطل۔ حق کو مرتبہ ملا تقربِ خدا کا اور باطل اس مرتبہ قربِ خداوندی سے محروم رہا۔ طغیان و سرکشی کا ارتکاب باطل نے کیا۔ حق خاموش رہا۔ اس کی طرف زیادتی کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔

نتیجہ یہ رہا کہ حق جنابِ ہابیل کی صورت میں رحمتِ الٰہی کا مستحق اور باطل قابیل کی شکل میں لعنت کا حقدار بنا۔ اسی طرح زمانے کی رفتار کے ساتھ حق و باطل چلتے رہے۔ ہر دور میں باطل حق کو جھکانا چاہتا تھا لیکن حق نے باطل کے سامنے کبھی سر نہ جھکایا۔

ایک دور ایسا آیا کہ نمرود کی شکل میں باطل نے سر اٹھایا اور حق نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیکر میں باطل کو سمجھایا۔ باطل نے مادی قوت کے غرور میں حق کو دبانے اور اذیت پہنچانے کی کوشش کی۔ باطل کے پاس تخت ہے اور حق بوریا نشین ہے۔ باطل کے ساتھ کثرت ہے، سپاہ ہے، لشکر ہے، لیکن حق کے ساتھ مردانِ وفا ہیں۔ حق داعئ حق بن کر باطل کو راہِ راست پر لانے کیلئے اپنی دلیل پیش کرتا ہے۔

حضرت ابراهیم علیه السلام

نمرود دربار میں تخت پر متمکن ہے۔ جنابِ پیغمبرِ خدا تبلیغ کیلئے اس کے پاس جاتے ہیں۔ دلائل پیش کرتے ہیں۔

باطل ان کا جواب دینے سے قاصر ہے، عاجز ہے۔ جب جواب نہ بن پڑا، تشدد پر اتر آیا۔ شکست خوردہ ذہنیت کی یہ علامت ہے کہ جواب سے عاجز آجانے پر غضبناک ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرتی ہے۔

مادّی وسائل کی بناء پر باطل حق پر طرح طرح کے ظلم وستم کرتا ہے، لیکن حق اپنے اصول پر کاربند رہ کر باطل کے ہر وار کا پامردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ باطل غاصب اور حق مغصوب الحق ہوتا ہے۔ باطل قاتل، حق مقتول ہوتا ہے لیکن حق مرتا نہیں بلکہ باطل کی تلوار اسے نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ باطل قاتل بن کر بھی غالب نہیں آسکتا اور حق مقتول ہو کر بھی مغلوب نہیں ہوسکتا۔ باطل کو عارضی اور وقتی طور پر کامیابی حاصل ہوتی ہے اور حق کو ثبات ودوام اور حیات مدام حاصل ہوتی ہے۔

باطل جب اپنے دعویٰ کا استحقاق پیش نہ کر سکے اور اپنے عہدہ کا ثبوت مہیا نہ کر سکے تو زبردستی اپنا عہدہ منواتا ہے اور آگ کی طرف رخ کرتا ہے۔ آگ کی دھمکیاں دیتا ہے۔ چنانچہ نمرود نے غیظ وغضب میں آکر خلیلؑ خدا کو ہزاروں من جلتی آگ میں پھنکوایا۔ اس کا خیال تھا کہ یوں حق نمرودی آگ میں جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ اپنے معبود سے لَو لگانے والا عبد، جبرئیلؑ کی امدادی پیشکش سے بے نیاز ہو کر بے خوف وخطر آگ میں کود پڑا لیکن جلا دینے والی آگ نے گلزار بن کر حق کے لیے آغوش پھیلا دی۔ آگ کے شعلوں نے حق بن کر آنے والے مہمان کا استقبال کیا۔ لکڑی کے انگاروں نے پھولوں کا بھیس بدل کر حق کے پاؤں چومے، شرار آتش پتیاں بن کر نچھاور ہوگئیں۔ آتش کدہ کی حرارت نسیم بہار بن کر بغلگیر ہوئی۔ اپنے معبود سے لَو لگانے والا عبد جبرئیلؑ کی امدادی پیشکش سے بے نیاز ہو کر بے خوف وخطر آگ میں کود پڑا اور حق وباطل کا یہ معرکہ ختم ہوا۔ باطل شکست کھا گیا، حق کامیاب ہوگیا۔

اسی طرح ہر دور میں حق وباطل کی آمیزش رہی۔ کوئی زمانہ ان کی معرکہ آرائی سے خالی نہیں رہا۔ کبھی محدود کبھی غیر محدود۔ پھر ایک دور آتا ہے کہ باطل فرعون کے وجود میں خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ لوگوں سے کہتا ہے: ''میں تمہارا سب سے اونچا پروردگار ہوں۔'' حالانکہ یہ خدا نہیں، معمولی بندہ ہے۔ البتہ مال ودولت، لشکر وسپاہ کی کثرت ہے۔ تخت وتاج بھی ہے، مادّی طاقت اور وسائل بھی ہیں۔ اس منصب وعہدہ کا دعویٰ کرتا ہے جس کا حقدار نہیں اور زمین وآسمان کا مالک بن بیٹھتا ہے۔

لطیف حکایت

مصر میں دریائے نیل سے کاشتکاروں کی زمین سیراب ہوتی تھی۔ نیل کے پانی کی فراوانی ہے، کھیت لہلہاتے ہیں، نیل کی طغیانی پر ہی زمینداوں اور مصریوں کی معیشت منحصر تھی۔ خلاف معمول ایک مرتبہ نیل میں پانی کم ہوگیا، لبریز نہ ہوا اور کناروں

سے نہ اُچھلا۔ زمینیں خشک، موسم طغیانی کا، خود نیل تشنہ لب، کسانوں کی امیدوں پر اوس، قحط سالی کا خطرہ۔ لوگ گھبرائے ہوئے فرعون کے پاس پہنچے۔ ''خداوندا! نیل میں پانی کم ہے۔ اس سال طغیانی نہیں آئی۔ دریا میں موج نہیں آیا۔ لہریں بپھری نہیں۔ کھیت خشک پڑے ہیں۔ کاشتکاری ناممکن ہو چکی ہے۔ آپ جو خدا ہیں اور خدا کی ہر چیز پر حکومت ہوتی ہے، ہر شے اس کی تابع فرمان ہوتی ہے، آپ دریا کو حکم دیں کہ طغیانی آئے اور پانی پھیلے، زمینیں سیراب ہوں، غلہ بویا جا سکے اور خشک سالی کا خطرہ بھی ٹل جائے''۔

رعایا نے سوال کر دیا اور حاجت پیش کر دی۔ فرعون نے سن لی۔ اب فرعون سخت گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہے کیونکہ خدائی کا دعویٰ تو وہ کر چکا ہے۔ اب اس کا ثبوت پیش کرنا پڑا۔ جھوٹا بھی یہ سمجھتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں۔ گو کہ لوگوں پر اپنی صداقت ظاہر کرتا ہے۔ کسی منصب و عہدے کا دعویدار بننا تو آسان ہے لیکن انہی عہدیداروں والے کام کرنے مشکل ہو جاتے ہیں۔

یہی مقام ہے جہاں نااہل دعویداروں کی پرکھ ہوتی ہے اور مصنوعی مدعیوں کی قلعی کھلتی ہے جب دعوے کے ساتھ ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔ سائلین کے جواب دینا پڑتے ہیں، حاجتمندوں کا حاجت روا اور مشکلات میں مبتلا امت کا مشکل کشا بننا پڑتا ہے۔ دعویٰ خدائی آسان ہے لیکن مخلوق کی حاجت روائی مشکل ہے۔ نبی کہلوانا آسان ہے لیکن معجزہ نمائی مشکل ہے۔ امامت کی مسند پر بیٹھنا آسان ہے، لیکن مشکل کشائی مشکل ہے۔

اسی امتحان سے سچے اور جھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اور حق و باطل میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ حق جواب سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ باطل جواب سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اگر آپ حق و باطل کی پہچان کرنا چاہیں تو آپ کے لیے آسان طریقہ یہی ہے کہ جس مسند پر بیٹھا ہے اس سے اس مسند والے امور اور اس معیار کے مسائل دریافت کریں۔ اگر حل کر دے، لحظہ دیر نہ کرے، سوال ختم ہونے سے پہلے جواب تیار ملے، سائل کا دل مطمئن ہو جائے چاہے سائل کسی ملک کا ہو، کسی شہر کا ہو، کسی جنس و نوع کا ہو، جواب کے گوہر سے درماں لبریز ہو جائے، مرادیں پوری کر کے لوٹے تو سمجھیں کہ مسند والا حق ہے۔

اگر وہ جواب و سوال سے عاجز آ جائے، مسئلہ حل کرنے سے قاصر ہو، اس مسند والے امور کو انجام نہ دے سکے اور تخت و منبر کے معیار پر پورا نہ اترے، قوتِ حق سے کورا ہو، علم سے عاری ہو تو سمجھ لو کہ یہ باطل ہے، حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی ہے اور اصلی نہیں بلکہ جعلی ہے۔

الغرض فرعون بہت پریشان ہوا۔ لوگوں کے سامنے تو دریا کو حکم نہیں دے سکتا تھا کیونکہ دریا اس کا تابع فرمان تو نہ تھا۔

اس طرح لوگوں کے سامنے اگر حکم دیتا تو کذب و بطلان ظاہر ہو جاتا۔ کیونکہ اندرونِ دل فرعون یہ تو جانتا تھا کہ دریا میرے تابع نہیں اور میں خدا نہیں ہوں اور اگر لوگوں سے کہے کہ دریا میرا کہنا نہیں مانتا تو خدائی باطل اور لوگوں کے سامنے اپنی بے وقوفی اور اپنے جھوٹ کا اظہار۔ سو اس نے لوگوں کو تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کل میں دریائے نیل کو حکم دوں گا کہ طغیانی میں آجائے۔

لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ فرعون نے فرصت کو غنیمت جانا، صحراء کی جانب چلا گیا، عالم تنہائی میں ایک مقام پر سربسجود ہوا اور گڑگڑا کر کہا:

''اے اللہ! تو ہی رب العالمین، خالق، مالک ہے۔ میں تو جھوٹا ہوں اور تو سچا ہے۔ پس تیری بارگاہ میں سوال کرتا ہوں، تو کریم ہے، میری بات رکھ لے، تیری مخلوق قحط سالی میں مبتلا ہو جائے گی، یہ لوگ بھوکوں مریں گے، میرے نہیں تیرے بندے ہیں۔ میری تو فریب کاری، تیری ہی مخلوق ہے۔ گو نافرمان ہیں پر تیرے ہی بندے ہیں۔ تو کریم ہے، اپنے بندوں پر رحم کر! حسبِ معمول دریائے نیل میں طغیانی پیدا کر، زمینوں کو سیراب کر، کسانوں کو خوشحال کر!''

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ فرعون خدا نہ تھا۔ خدائی کا دعویٰ اس نے کیا تھا۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اصلی نہیں، جعلی ہے۔ حقیقی نہیں، بناوٹی ہے۔ مسئلہ درپیش ہوا، حل نہ کر سکا۔ یہ دستور ہے کہ مصنوعی جب کوئی مسئلہ حل نہ کر سکے تو حقیقی کے پاس آتا ہے، جعلی و بناوٹی جب جہالت کی وجہ سے عاجز آ جائے تو سچے اور اصلی وارث اور مسند نشین کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور سچا اور اصلی ایسا کریم اور لجپال ہوتا ہے کہ سائل کو خالی نہیں لوٹاتا۔ اس کو تازیانہ عبرت کی ضرب لگاتا ہے اور اس کے مکر وفریب کے محل کو ٹھوکر سے چور کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے سوال کو تشنہ جواب نہیں رکھتا۔

قصہ مختصر فرعون کا مسئلہ حل ہوا۔ اس کی مراد پوری ہوئی۔ دریا جوش میں آیا، موجیں بپھرنے لگیں، پانی کناریوں سے باہر نکل آیا، زمین سیراب، کسان خوش، دریا کے اس سیلاب نے مردہ رگوں میں خون دوڑا دیا۔ پیاسی کھیتیاں شاداب ہو گئیں۔ اُمید کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور کاشتکاروں کا غنچہ دل مسکرا اُٹھا۔ نیل کی طغیانی تو ختم ہو گئی، مگر فرعون کی طغیانی اسی طرح برقرار رہی۔ وہ بدستور دعویٰ خدائی پر قائم رہا، تخت پر بیٹھا خدائی کے راگ الاپتا رہا اور لوگ اسے سجدے کرتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد جبرئیلؑ انسانی شکل میں فرعون کے سامنے آ کر مسئلہ پیش کرتے ہیں: ''فرعون! میرا ایک غلام ہے، میں اس پر بہت کچھ کرم و احسان کرتا ہوں۔ ہر قسم کی نعمتوں سے اسے مالا مال کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ میرا نافرمان ہے۔ میں اس پر مہربان ہوں، وہ میرا نافرمان ہے اور جتنی میری مہربانی بڑھتی جاتی ہے، اس کی اتنی ہی نافرمانی بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے سرکش اور نافرمان غلام کی کیا سزا ہے؟''

فرعون نے کہا: ''اگر وہ میرا بندہ وغلام ہوتا تو میں اس کو دریائے نیل میں غرق کر دیتا۔'' جبرئیل نے کہا کہ یہ لکھ دے۔ فرعون نے اپنی تجویز کردہ سزا تحریر کر دی اور جنابِ جبرئیلؑ لے کر چلے گئے۔

فرعون نیل کی موجوں کی آغوش میں ہے۔ نہنگِ اجل منہ کھولے اسے لقمہ بنانے کو تیار ہے۔ غرق ہونے والا ہے کہ جنابِ جبرئیلؑ نے فرعون کو اس کا نوشتہ دکھایا۔ یہ تحریر کردہ سزا ہے۔

فرعون باطل، جنابِ موسیٰؑ حق۔ باطل کے سجے ہوئے بارعب وہیبت دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام داخل ہوتے ہیں اور اسے دعوتِ حق دیتے ہیں۔ تبلیغ حق کرتے ہیں۔ کلماتِ حق سناتے ہیں اور حق ماننے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن باطل کا مطالبہ ہے کہ موسیٰؑ مجھے خدا مانیں، میری ربوبیت کا اقرار کریں۔ حق و باطل کی یہ قولی معرکہ آرائی فرعون کے دربار میں شروع ہوئی۔ جنابِ موسیٰؑ نے تصدیقِ نبوت کا معجزہ دکھایا۔ عصا زمین پر پھینکا، اژدھا بن گیا۔ فرعون گھبرایا، موسیٰؑ نے پکڑ لیا اور پھر وہی عصا بن گیا۔

ہم حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ قرآن سے پیش کرتے ہیں اور حق و باطل کا یہ معرکہ کلامِ حمیدہ سے نقل کرتے ہیں:

"قَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ".

''موسیٰؑ نے کہا: اے فرعون! میں رب العالمین کا رسول ہوں اور مجھ پر واجب ہے کہ خدا پر سچی بات کہوں''۔

"قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ. قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ".

''موسیٰؑ نے کہا: میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک روشن اور واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ اے فرعون! تو بنی اسرائیل کی غلامی اور ان پر تشدد بند کر کے انہیں آزاد کر دے اور میرے ساتھ بھیج دے۔ فرعون نے کہا: اے موسیٰؑ اگر تو کوئی معجزہ لایا ہے تو پیش کر، اگر تو سچوں میں سے ہے''۔

"فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ. وَ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ"

''موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ اچھا خاصا کھلم کھلا اژدھا بن گیا اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو لوگوں کو چمکتا جگمگاتا نظر آیا''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیغامِ حق پہنچایا۔ اپنی رسالت کا تذکرہ کیا۔ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا اور فرعون کی طلب پر معجزہ بھی دکھایا۔ حق اپنی صداقت وروحانیت پر مطمئن۔ فرعون کے پاس جواب نہیں اور حق کی دلیل کا رد نہیں۔ یہ کہہ کر حاضرین دربار کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے برگشتہ کرتا ہے:

"اِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيْمٌ ٥ يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ".

"بیشک یہ بڑا ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کرے۔ پس تم کیا مشورہ دیتے ہو؟" (اعراف)

سورہ طٰحہٰ میں فرعونیوں کے اقوال یوں ذکر فرمائے گئے ہیں:

"قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى"

"اے موسیٰ! تو اس لیے آیا ہے کہ تو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جادو کے ذریعہ نکال باہر کرے؟"

فرعون اور اس کی جماعت کے سرداروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا انکار کر کے اور صداقت تسلیم نہ کر کے جادو کا بہتان لگایا۔ حضرت موسیٰؑ کی طرف سحر کو نسبت دی۔ اپنی قوم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بدظن برگشتہ رکھنے کے لیے فرعون کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حضرت موسیٰ کو تسلیم کر لینے سے فرعون کی خدائی اور سلطنت جاتی تھی۔ لہٰذا باطل نے اپنی حکومت قائم رکھنے اور سلطنت پر قابو رکھنے کے لیے اپنے باطل دعویٰ پر تلے رہنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر مفسد اور ساحر ہونے کا الزام لگایا۔ باطل جب حق کی دلیل کا جواب نہ دے سکے تو اس پر فساد اور سحر کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مفسد وہ خود ہوتا ہے اور فساد کا الزام مصلح پر عائد کرتا ہے۔

جب فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحر ٹھہرایا تو فرعون کو مشورہ دیا کہ سحر میں اس کا مقابلہ کیا جائے۔

"قَالُوْا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ٥ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَاحِرٍ عَلِيْمٍ".

"انہوں نے کہا: اے فرعون! موسیٰؑ اور اس کے بھائی کو اپنے قابو میں رکھ اور شہروں میں ہرکارے بھیج دے جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لائیں۔ پھر ان جادوگروں اور موسیٰؑ کا مقابلہ ہو اور دنیا آنکھوں سے دیکھ لے گی"۔

سورہ طٰہٰ میں آیت مذکور ہے:

"فَلَنَاْتِیَنَّکَ بِسِحْرٍ مِّثْلِہٖ فَاجْعَلْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُہٗ وَ لَا اَنْتَ مَکَانًا سُوًی".

"فرعون نے کہا: ہم بھی اس طرح کا جادو پیش کرتے ہیں۔ پس تم اپنے اور ہمارے درمیان ایک وقت مقرر کرو۔ ہم اور تم اس وقت اور اس مکان کی خلاف ورزی نہ کریں اور مقابلہ ایک کھلے میدان میں ہو"۔

الغرض مقابلہ طے ہوگیا اور جگہ بھی مقرر ہوگئی۔ عام لوگوں کو اطلاع اور دعوت بھی دے دی گئی۔ لوگوں کی طبائع تماشا دیکھنے کی بے حد مشتاق ہوتی ہے اور اس قسم کا مقابلہ جس میں تماشا بھی ہو اور فرعون بھی مع سرداروں کے خود تماش بین ہو، اندازہ لگائیں کتنے لوگ میدانِ مقابلہ اور تماشاگاہ میں اکٹھے ہوئے ہوں گے؟

میلوں تک میدان مردم سے پر تھا۔ مملکت فرعون کے ماہر جادوگر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کیلئے اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان جادوگروں کو فرعون اور اس کے درباریوں کی نصرت اور تائید بھی حاصل تھی۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے لاکھوں اور ہزاروں افراد موجود تھے۔ ادھر فرعون ایک خاص اونچے مقام پر مع وزیروں کے رونق افروز تھا۔ یہ سب کچھ باطل کی آرائش ہے۔ عددی کثرت ہے۔ مال و دولت کی فراوانی ہے، ہتھیار ہیں، لشکر ہے، مادّی قوت ہے۔

ادھر حق کے نمائندے صرف دو اشخاص، موسیٰ و ہارونؑ کہنہ و معمولی لباس میں، سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں عصا لئے داخل میدان ہوئے۔ اب حق اور باطل کی معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ یعنی موسیٰ و فرعونی جادوگروں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے۔ یہ منظر قرآنِ مجید ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

"قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِمَّآ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی".

"انہوں نے کہا: اے موسیٰ! یا تم پہلے پھینکو یا ہم پہلے پھینکنے والے بنیں۔"

"قَالَ بَلْ اَلْقُوْا".

"حضرت موسیٰ نے کہا: بلکہ تم پہلے پھینکو"۔

"فَاِذَا حِبَالُہُمْ وَ عِصِیُّہُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِہِمْ اَنَّہَا تَسْعٰی".

"فرعونی جادوگروں نے اپنے کرتبوں کی ابتداء کر دی۔ انہوں نے رسیاں اور چھڑیاں، لاٹھیاں میدان میں ڈال

دیں۔ پس ایسا معلوم ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں سانپوں کی شکل میں دوڑ رہی ہیں"۔

یہ ایک ایسا مقام تھا کہ مقابل پر ضرور اس کا اثر ہوتا ہے۔ مگر حق کی تائید نصرت خداوندی سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس مقام پر موسیٰ علیہ السلام کسی قدر گھبرائے:

"فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی. قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی".

"تو موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ وحشت سی محسوس کی۔ ہم نے کہا: موسیٰ! نہ ڈر! تو ہی غالب اور بلند رہے گا"۔

ذرا سی گھبراہٹ بتقاضائے بشریت محسوس ہوئی۔ تائید ایزدی نے بازو تھام لیا۔ پشت پناہی کی۔ ادھر سرکاری جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بنی میدان میں دوڑ رہی ہیں۔ لاکھوں نگاہیں محو تماشا ہیں۔ جادوگروں کا کمال منظر عام پر آچکا تھا۔ لوگ بنظر تحسین واستعجاب ان کا کمال دیکھ رہے تھے۔

ایک مقام پر اس طرح ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

"فَلَمَّا اَلْقَوْا سَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْھَبُوْھُمْ وَ جَآئُوْا بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ".

"پس جب ان ساحروں نے رسیاں ڈالیں تو انہوں نے لوگوں کی نظروں کو مسحور کر دیا اور ان کو ڈرایا اور بہت بڑے جادو کا مظاہرہ کیا"۔

"وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَلْقِ عَصَاکَ فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ. فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ہ فَغُلِبُوْا ھُنَالِکَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِیْنَ".

"ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا زمین پر پھینک دے۔ (موسیٰ نے عصا زمین پر پھینکا۔ اب کیا تھا نظارہ ہے) عصائے موسیٰ اژدھا بن کر جادوگروں کے جھوٹے سانپوں کو نگل رہا ہے۔ پس حق کامیاب ہو گیا اور ساحروں اور اہل باطل کا عمل بیکار ہو گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی مغلوب ہو گئے اور سب کے سب اس معرکہ آرائی میں ذلیل و خوار ہو کر لوٹے"۔

اب حق یہ تھا کہ اپنی شکست اور ناکامی پر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رب پر ایمان لاتے کیونکہ ان کے چوٹی کے ساحر میدان میں مغلوب ہو چکے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کو تسلیم کر لیتے کیونکہ بندے کی انتہائی طاقت کو خدائی قوت باطل اور مغلوب کر ہی دیتی ہے۔

اگر موسیٰ رسول رب العالمین نہ ہوتے تو میدان میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے اور ان کا عمل ساحروں کے عمل پر غالب

نہ آتا۔ اس مقام پر فرعون اور اس کے ساتھی تو باطل پر اڑے رہے اور وہ لوگ جو مقابلہ کے لیے آئے تھے اور جو موسیٰ کو شکست دینے کیلئے بلائے گئے تھے، اور جو موسیٰ کے عمل کو باطل کرنے کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اترے تھے اور جنہوں نے کامیاب ہونے پر فرعون کی طرف سے بڑے بڑے انعامات وتقرب حاصل کرنے کی امید قائم کر رکھی تھی، وہ سمجھ گئے کہ موسیٰ کا عمل جادو نہیں اور مملکتِ مصر میں ہم سے بڑا کوئی جادوگر نہیں، جس نے ہمیں شکست دے کر باطل کر دیا۔ وہ حق کی طاقت ہے۔ موسیٰ سچ کہتا ہے۔ وہ اللہ ربّ العالمین کا رسول ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم موسیٰ پر ایمان پر اور اس کے ربّ پر ایمان لے آئیں۔

"وَ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سَاجِدِیْنَ. قَالُوْا آمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ. قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا اَهْلَهَا مِنْهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ. قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ. وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ". (اعراف وطٰہٰ)

"جتنے جادوگر تھے سب کے سب موسیٰ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے اور کہا: ہم ربّ العالمین پر ایمان لائے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ فرعون (کے تو ہوش اڑ گئے اور آگ بگولا ہو کر) کہنے لگا: میری اجازت اور حکم سے قبل تم ایمان کیسے لے آئے؟ یہ تم لوگوں کا مکر ہے اس شہر میں۔ تم چاہتے ہو کہ شہر والوں کو شہر سے نکال کر خود قبضہ کر لو۔ اچھا! عنقریب اس مکر کا بدلہ تم پا لو گے۔ میں تمہارے ہاتھ اور پیر الٹا کے کٹوا دوں گا پھر تم سب کو سولی پر لٹکواؤں گا۔ پس جادوگروں نے کہا: ہم تو خدا ہی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ تو ہم سے اس بات کا انتقام لینا چاہتا ہے کہ ہمارے پاس جب ہمارے ربّ کی نشانیاں آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ (پھر انہوں نے دعا مانگی) اے ہمارے ربّ ہم پر صبر (کا مینہ) برسا دے اور ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں موت دے"۔

حق و باطل کے اس مقابلے میں حق کو نمایاں کامیابی ہوئی۔ لاکھوں انسانوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا غلبہ دیکھا۔ انسانی کمال پر ربّانی کمال کی فوقیت دیکھی۔ سحر اور اعجاز میں فرق دیکھا کہ سحر انسانی فعل ہے اور اعجاز ربّانی فعل ہے۔ مادّی طاقت عارضی ہے۔ روحانی طاقت پائیدار ہے۔ پھر نمایاں کامیابی روشن کامیابی یہ کہ مقابلین سرنگوں ہو گئے۔ شکست دینے کے ارادے سے آئے، خود شکست کھا گئے اور بحیثیت نمائندگانِ مملکتِ مصر اور فرعون ہونے کے فرعون اور تمام ملک کی شکست تھی۔ جب حق

ان پر واضح ہو گیا، باطل ظاہر ہو گیا، حقیقت کے حسین رُخ سے باطل کے پردے ہٹ گئے، تجلیات صداقت اور انوارِ حق نے شک وشبہات کی تاریکیاں دور کر دیں، دل کی گہرائیوں میں نورِ ایمان کی شمع روشن ہوگئی، برملا اپنے ایمان کا اظہار کر دیا۔

فرعون کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر جنابِ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کو تسلیم کر لیا۔ فرعون بر سر عام رسوا ہوا۔ اس کی دھمکیوں اور جھنجھلاہٹ نے ان حق قبول کرنے والوں پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کی دہشت نے ان کی رغبت کو تیز کیا اور اس کی تدبیر نے ان کی تقدیر کو بدل دیا۔ فرعون نے سخت سے سخت سزا دینے کا ذکر کر کے ڈرایا مگر ان صادق الاعتقاد اور ایمان کی پختہ بنیادوں والے اہل ایمان نے صاف صاف کہہ دیا: "فرعون! اپنے ربّ کی واضح آیات اور روشن بیّنات دیکھ کر ایمان لائے ہیں اور ربّ العلمین سے لَو لگائی ہے۔ اب کوئی طاقت ہمیں اس راہ سے ہٹا نہیں سکتی اور کوئی تند و تیز آندھی بھی ہمارے ان مضبوط اقدام کو ڈگمگا نہیں سکتی۔ ایمان ہمارے دلوں کے خانوں میں جم گیا ہے، وہ جا نہیں سکتا اور کفر اَب آ نہیں سکتا"۔

یہ دور گزر گیا اور اس کے بعد کئی دور آئے۔ باطل زور پکڑتا اور حق فہمائش کے لیے اس کے سامنے آتا۔ مقابلہ کرتے ہوئے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلتے رہے۔ آخر میں ایک ایسا دور آیا کہ حق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں ظاہر ہوا اور باطل ابوسفیان بن حرب کی شکل میں۔ ابوسفیان بنی امیہ کا ایک نمایاں فرد اور حضرت محمد مصطفیٰؐ بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اموی عادات و اطوار کا مالک اور یہ ہاشمی اخلاق وصفات کے مالک۔ باطل چلتے چلتے اس پیکر میں ظاہر ہوا اور حق محمد مصطفیٰؐ کی ذات کی صورت میں روشن ہوا۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ حق کے نمائندے اور ابوسفیان باطل کا نمائندہ۔

حق نے حق وصداقت پھیلانے کی پوری کوشش کی اور باطل نے حق کو مٹانے کے لیے اپنی تمام تر طاقت صرف کر دی۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ کئی جنگیں ہوئیں۔ ہر معرکہ میں کفر و باطل کی نمائندگی ابوسفیان کرتا اور لشکرِ شرک کی کمان کرتا۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمائندگی حق وصداقت کرتے اور فوج اسلام کی قیادت کرتے۔ آخر باطل تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ کفر و شرک کو شکست ہوئی اور باطل کے بت پاش پاش ہو گئے۔ عَلَمِ اسلام کعبہ پر لہرانے لگا۔ ذوالفقار حیدریؑ کی تیز دھار نے کفر کی للکار کو ذلت وعار سے دوچار کر دیا۔ باطل کی یلغار کو تیغ شرربار سے فی النار کر دیا اور سارے عرب میں جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ کی صدا گونجنے لگی۔

بعد ازاں حق وجودِ علی ابن ابیطالب علیہم السلام میں جلوہ گر ہوا اور باطل معاویہ بن ابی سفیان کی صورت میں۔ معاویہ ابوسفیان کا جانشین، اس کے عادات و اطوار کا وارث اور علیؑ جنابِ رسولِ خدا کے جانشین اور ان کے علم وکمال، اخلاق وافعال کے وارث۔ معاویہ باطل کا نمائندہ اور علیؑ حق کے نمائندے۔ دونوں میں معرکہ آرائی حسب معمولِ سابق باہمی حق و باطل میں

لڑائیاں اور مقابلے ہوئے۔ اس سے قبل تو حق و باطل کی معرفت اور اقرار میں اسلام کے تمام فرقوں نے اتفاق کیا۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ بن ابوسفیان کے مقابلہ میں ایک فرقہ کے اُلجھ کے رہ گیا۔

اندھی تقلید اور بے جا عقیدت ایک ایسی چیز ہے کہ انسان کی عقل وفہم پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ قلبی بصیرت پر مہر لگا کر سوچنے سمجھنے کی توفیق سلب کر لیتی ہے اور بعض اوقات انسان معاشرے کے بندھنوں میں جکڑا ہوا، حق و باطل کو سمجھتے ہوئے اخلاقی جرأت اور ایمانی دلیری پر پابندی لگا کر معاشرتی رسم وروایات کا پابند رہتا ہے۔ ضمیر کوستا ہے۔ خرد اسے ملامت کرتی ہے۔ حق اس پر واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن بے حسی اس پر چھائی رہتی ہے۔ ضمیر دبے دبے کوستا ہے۔ لیکن روایات کی بندشوں کو وہ جرأت کی چھری سے کاٹ نہیں سکتا۔ قدیمی روایات و خیالات کا مرہون رہتا ہے اور دل و دماغ کو روایتی رسن سے آزاد نہیں کروا سکتا۔

یہی کیفیت یہاں ہمارے برادران اہل سنت کی ہے۔ یہاں علیؑ ومعاویہ کی معرکہ آرائی اور حق و باطل کی لڑائی میں سچ اور جھوٹ، حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتے اور اگر امتیاز کر پاتے بھی ہیں تو ظاہر نہیں کر سکتے۔ دو باہم مخالف ومتحارب قوتیں ہیں۔ ہر ایک ہزاروں انسانوں کے خون کا ذمہ دار ہے لیکن اگر دریافت کیا جائے کہ ان دونوں میں حق پر کون ہے؟ تو نہایت بھولے پن اور سادگی یا تجاہل عارفانہ اور خیالات کی آوارگی سے جواب دیتے ہیں: ''دونوں حق پر تھے۔''

منطقیوں اور فلسفیوں نے جہاں ''اجتماع نقیضین'' کو باطل ٹھہرایا ہے وہاں ہی ''ارتفاع نقیضین'' کو بھی محال قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علیؑ ومعاویہ نقیضین اور ضدین ہیں۔ برادرانِ اہل سنت کے تقلیدی وروایتی جواب سے بیچارے منطقی بھی سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔ عقلاء حیران اور فلسفی سرگردان ہو جاتے ہیں کہ یہ کیسا جواب ہے؟ دونوں حق پر ہیں؟

ہابیل وقابیل میں سے دونوں حق پر نہ ہوئے، صالحؑ اور کدار میں سے دونوں حق پر نہ ہوئے، ابراہیمؑ ونمرود میں سے دونوں حق پر نہ ہوئے، موسیٰؑ وفرعون میں سے دونوں حق پر نہ ہوئے، عیسیٰؑ اور یہود، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوسفیان و ابولہب وابوجہل میں تے سارے حق پر نہ ہوئے بلکہ یہ دونوں گروہ باہم متصادم قوتیں تھیں اور دونوں حق پر نہ تھے تو یہ کونسا مقام آ گیا کہ دونظریاتی دشمن اور ایک دوسرے کے خونیں دشمن، دونوں کس طرح حق پر ہو سکتے ہیں؟

ایک قطعہ زمین، زیورات، مکان یا مال وجائیداد کے بارے میں لڑائی نہیں، نظریاتی واعتقادی لڑائی ہے۔ خلافت و امامت کے بارے میں نزاع ہے۔ علیؑ کہتے ہیں ''میں امام ہوں، خلیفہ رسولؐ ہوں''۔

معاویہ کہتا ہے: ''میں خلیفہ ہوں''۔

خلافت رسولؐ کے بارے میں اختلاف و مقابلہ ہے۔ دونوں تو بیک وقت خلیفہ رسولؐ ہو نہیں سکتے کہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی مملکت میں دو دعویدار ہوں اور دونوں ہی برحق ہوں۔ کوئی عقلمند دیانتدار مومن یہ باور کر سکتا ہے کہ دونوں ہی خلیفہ رسولؐ تھے؟ علیؑ بھی خلیفہ اور معاویہ بھی خلیفہ۔

دونوں کو حق پر ماننے والوں کو دونوں کی بیعت کرنی چاہئے اور ایک نئی بدعت سیہ اسلام میں پیدا کر لینی چاہئے۔ ایک کو خلیفہ مانیں تو دوسرے کو لازماً ہر حال میں باغی ماننا پڑتا ہے۔

چونکہ یہ حضرات علی علیہ السلام کو باطل پر نہیں کہہ سکتے کہ فرمانِ رسولؐ ذی شان، حامل قرآن، کتابوں کے اوراق میں، حفاظ کی زبانوں میں، اہل ایمان کے دلوں میں تواتر و تکاثر کے ساتھ وضاحت و یقین کے ساتھ موجود ہے۔

"عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَ الْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ".

"علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ"۔

"اَللّٰهُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ حَيْثُمَا دَارَ".

"اے اللہ! حق کو ادھر پھیر دے جہاں علیؑ پھر جائیں"۔

"عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ".

"علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ"۔

علاوہ ازیں کثرت سے اتنے فضائل علیؑ تفسیروں، حدیثوں، تاریخوں میں موجود ہیں کہ اگر تمام صالحین صحابہ کے فضائل جمع کئے جائیں تو فضائل علیؑ کے دریا کے قطرہ کا مقابلہ نہ کر سکیں اور یہ فضائل نہ چھپائے چھپ سکتے ہیں اور نہ ہی مٹائے مٹ سکتے ہیں۔ کوششیں تو بعض حکمرانوں نے خصوصاً مدِ مقابل نے تو بہت کوششیں کیں مگر یہ فضائل قلوبِ عارفین اور اذہانِ مومنین میں راسخ ہو چکے تھے۔ ہزاروں کانوں نے سنے، ہزاروں لاکھوں آنکھوں نے واقعات فضائل اور حالات مناقب دیکھے۔ زبانیں ان سے تر اور سینے ان سے پر تھے۔ اس واسطے ہمارے ان بھائیوں کو علیؑ کو جادۂ حق سے ہٹانے کی تو ہمت ہو نہ سکی اور معاویہ بن ابوسفیان کا شاہی خزانہ اور علاقہ شام کی زرخیز جاگیریں باطل کو بچانے کی کوشش میں مصروف ہوئیں۔ معاویہ بچ نہ سکتا تھا۔ بچانے کی فکریں لاحق ہوئیں۔

دستور ہے کہ ایک غلط کام کو صحیح بنانے کیلئے کئی غلط کام کرنے پڑتے ہیں اور ایک جھوٹ کیلئے کئی ایک جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ چونکہ یہاں امیر شام کو باطل سے بچانا مقصود ہے اور اس کے عوض درہم و دیناروں کی تھیلیاں، شاہی خلعتیں، جاری

چشمے، لہلہاتے کھیت، شاداب باغ بطور عوض پیش کیے گئے تھے۔ لہذا اس غلطی کو صحت میں اور اس کذب کو صداقت میں اور باطل کو حقانیت میں ڈھالنے کیلئے کئی جھوٹی روایات بنائی گئیں اور وضعی احادیث کا سہارا لیا گیا۔ کبھی میزاب بنایا گیا، خال المومنین کا لقب دیا گیا، قاتلانِ عثمان کی گرفتاری میں تاخیر کا سہارا لیا گیا مگر کسی طرح سے معاویہ کو خلیفہ ثابت نہ کر سکے اور جب خلافت معاویہ ثابت نہ ہو سکی تو خلیفہ رسول علی علیہ السلام، معاویہ پھر بھی باغی، ہزار کچھ کہا جائے۔

ضدین ثابت، اجتماع محال، دونوں خلیفہ نہیں ہو سکتے اور ارتفاع بھی محال کہ دونوں خلیفہ نہ ہوں اور مسندِ رسولؐ خالی رہ جائے۔ کوئی بھی خلیفہ رسولؐ نہ ہو، لازماً ایک کو خلیفہ رسولؐ ماننا پڑتا ہے۔ جب ایک کو خلیفہ ماننا پڑتا ہے تو دوسرے کو بھی تو باغی ماننا پڑے گا۔ جو خلیفہ رسولؐ وہ حق پر اور جو باغی وہ باطل۔

یہی صورتحال حضرت ام المومنین کی ہے کہ جب جنگ جمل میں دو متحارب قوتیں ہے۔ ایک لشکر کی قیادت ام المومنین حضرت عائشہ کر رہی ہیں اور دوسرے لشکر کی قیادت ابوالآئمہ نفس رسولؐ امیر المومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہم السلام کر رہے ہیں۔ اگر حضرت علی علیہ السلام اس وقت خلیفہ رسول نہیں تو کون تھا؟ اس کا نام بتایا جائے کہ اس وقت خلیفہ رسول کون تھا؟

حضراتِ اہل سنت شیعوں کو تو گمراہ کہتے ہیں جو اجماعی، وصیتی اور شورائی خلافت کے منکر ہیں۔ ان کو علی الاعلان باطل اور گمراہ اور باطل کہتے ہیں اور جو خلیفہ نصی اور اجماعی، شورائی اور وصیت رسولؐ کے مطابق ہو مگر اس کے باغی کو حق پر کہتے ہیں۔ یہاں قاعدے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اصول ختم ہو جاتے ہیں۔ عجیب خیال ہے برادرانِ اسلام کا کہ خود حضرت اُم المومنین تو اس مقابلہ پر نادم ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہیں لیکن معاویہ کو اصرار ہے کہ خلافت سے انکار ہے، ”دونوں حق پر ہیں“۔ قرآن کے خلاف، فرمانِ رسولؐ ذیشان کے خلاف، عقل کے خلاف، عدل کے خلاف، دیانت کے خلاف اور صداقت کے خلاف ہے۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

اس کے بعد یزید وارثِ معاویہ بنا۔ بلکہ معاویہ اپنا وارث اور تخت کا مالک اپنی زندگی میں یزید کو بنا کر گیا۔ اگر معاویہ کو خلیفہ رسولؐ کہنا ہو تو یزید کو بھی خلیفہ رسولؐ کہو کیونکہ خلیفہ کی مسند پر بیٹھا ہے۔ ادھر حسینؑ وارث ہیں حضرت علی علیہ السلام کے۔ حق حسینؑ کے وجود میں جلوہ گر ہوا اور باطل پیکر یزید میں نمودار ہوا۔ امام حسینؑ حق کے نمائندے اور یزید باطل کا نمائندہ۔ امام حسین علیہ السلام وارثِ انبیاء، آدمؑ و نوحؑ کے وارث، ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے وارث، یزید قابیل کا وارث، نمرود و شداد و فرعون اور ہامان کا وراث، ابوسفیان و ابولہب و ابوجہل کا وارث، معاویہ کا وارث۔

امام حسین علیہ السلام کے بدنِ مبارک میں انبیاء کی روحیں موجود، یزید کے بدن میں نمرود و فرعون کی روحیں موجود۔
جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
ہر دو قوت از حیات آید پدید

حسینؑ ابن علیؑ میں حق کی قوت بدرجہ اتم موجود، یزید بن معاویہ میں باطل کی قوت بدرجہ اتم۔ مقابلہ کھلے میدانِ کربلا میں ہوا۔ باطل کے پاس ہر قسم کی مادّی طاقت ہے اور حق کے پاس ہر قسم کی روحانی قوت ہے۔ باطل حق سے بیعت کا خواہاں ہے۔ حق باطل کے آگے جھکنے کو تیار نہیں۔ باطل حق کو دبانا چاہتا ہے، حق اُبھرنا چاہتا ہے۔ باطل ظلم کا ہر وار کرتا ہے، حق صبر کی سپر سے اس کا وار روکتا ہے۔

یزید حق سے ہاتھ طلب کرتا ہے لیکن حق اپنا ہاتھ دستِ یزید میں دینا گوارا نہیں کرتا۔ یہ ہاتھ تنہا حسینؑ کا ہاتھ نہیں، اس میں انبیاء و اوصیاء کے معصوم ہاتھ ہیں۔ اس ہاتھ میں کلمہ توحید ہے۔ حق سر تو دیتا ہے لیکن ہاتھ نہیں دیتا۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لاالٰہ ہست حسینؑ

یزید کا دادا ابوسفیان، محاربِ رسولؐ، حسینؑ کے دادا ابوطالبؑ، محافظِ اسلام، نگہبانِ رسالتؐ، یزید کا نانا ایک وحشی اور جنگلی گمنام انسان، حسینؑ کے نانا سید الانبیاء، یزید کا باپ معاویہ، حسینؑ کے بابا علیؑ، یزید کی دادی ہند جگر خوارہ، حسینؑ کی دادی جنابِ فاطمہ بنتِ اسد، یزید کی ماں گمنام، حسینؑ کی والدہ سیدۃ النساءؑ، نانا نبیوں کے سردار، بابا ولیوں کے سردار، والدہ عورتوں کی سردار اور خود جوانانِ جنت کے سردار۔

کربلا میں حق و باطل، صدق و کذب، مادیت اور روحانیت، ظلم و صبر یعنی حسینؑ اور یزید کی لڑائی ہوئی، باطل کو مادّی اور حق کو روحانی، باطل کو عارضی اور حق کو پائیدار فتح حاصل ہوئی۔

وقتی طور پر تو باطل نے خوشی کے شادیانے بجائے، جشنِ مسرت منائے، مردوں کو قتل اور مستورات کو قید کیا لیکن تھوڑے دنوں بعد جب لوگوں کی آنکھیں حقیقت سے روشناس ہوئیں، باطل کو اپنا انجام نظر آ گیا، دُنیا آنکھوں میں تاریک نظر آئی۔ مستقبل ہولناک ہو گیا۔ اپنے پرائے سب مخالف ہو گئے۔ یزید پر ہر طرف سے لعنت ہونے لگی، پھٹکار برسنے لگی۔ ملکی اور غیر ملکیوں سب نے سرِ اجلاس لعنت و ملامت کی، خود گھر والوں سے نہ رہا گیا۔ سرِ دربار مذمت کی۔ قاتل کو کہنا پڑا:

"مَالِیَ وَلِلْحُسَیْنِ".

اب قتل کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے لگا۔ قتل حسینؑ سے برأت ظاہر کرنے لگا۔ مگر اس طرح مکاریوں سے برأت ہو سکتی ہے؟ ناحق خون سے بری الذمہ ہو سکتا ہے؟ حق کی فتح کا ثبوت یہی کافی ہے کہ قاتل اپنے گھر میں اپنے مقتول کی ماتم داری کا انتظام کرتا ہے۔ قاتل کے گھر میں مقتول کی صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اور مقتول کے وارثوں کے ساتھ قاتل کی اہل خانہ عورتیں مصروف ماتم نظر آتی ہیں۔

ہاشمی عورتوں کے ساتھ سفیانی عورتیں سیاہ لباس میں ملبوس ماتم حسینؑ کر رہی ہیں۔ دمشق کے محلوں میں عزاداریٔ حسینؑ قائم ہے۔ حسینؑ پر رحمت اور یزید پر لعنت برس رہی ہے۔ یزیدی حکومت کی بنیادیں ہلنے لگیں، لوگ متنفر ہو گئے۔ خونِ معصومؑ کا اثر پھیلنے لگا۔ انتقام کے ڈر سے یزید کو کوئی چارہ نہ رہا کہ اسیرانِ آلِ محمدؐ کو رہا کر کے جلد مدینہ پہنچائے تاکہ لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہو جائیں۔ اب یزید ابن زیاد کو قاتل ٹھہرا کر اس پر لعنت کرتا ہے، حالانکہ ساری لعنت کا مستحق یہ خود ہے۔

بدلے ہوئے حالات اور نفرتِ عامہ سے متاثر ہو کر یزید کا رویہ اب نرم ہو چکا ہے اور ظلم و ستم سے اس نے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

قاتل کی دریافت

اصلی اور صحیح قاتل تو یزید بن معاویہ ہے لیکن جب اس نے رعایا کے بدلے ہوئے تیور دیکھے اور قیدیوں کی خستہ حالی اور خطباتِ اسیرانِ آلِ محمدؐ نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا اور حزن و ملال لوگوں پر طاری ہوا تو یزید نے قتل کی ذمہ داری عبیداللہ ابن زیاد عامل کوفہ پر ڈال دی۔

چونکہ شہر دمشق اور آس پاس کے علاقوں میں لوگوں کی زبانوں پر ذکرِ حسینؑ جاری ہو گیا اور یزید پر لعن طعن کا سلسلہ شروع ہو گیا، یزید کو اس قسم کی اطلاعات بہم پہنچتی رہیں۔ یزید انقلاب سے خائف ہوا اور جذباتِ انتقام سے خائف ہوا۔

ایک بار اُس نے لوگوں کو دربار میں بلایا، لوگ اکٹھے ہو گئے، اُس نے اُٹھ کر یہ تقریر کی:

"یَااَهْلَ الشَّام تَقُوْلُوْنَ اَنَاقَتَلْتُ الْحُسَیْنَ ابْنَ عَلِیِّ بْنَ اَبِیْ طَالِب وَاللّٰهِ مَا قَتَلْتُهٗ وَلَااَمَرْتُ بِقَتْلِهٖ وَاِنَّمَا قَتَلَهٗ عَامِلِیْ عُبَیْدَاللّٰهُ بْنَ زِیَادٍ".

"اے اہل شام! تم کہہ رہے ہو کہ میں نے حسینؑ بن علیؑ کو قتل کیا ہے۔ بخدا! نہ میں نے قتل کیا ہے اور نہ قتل کا حکم دیا۔

حسینؑ کو میرے گورنر عبید اللہ ابن زیاد نے قتل کیا ہے"۔

پھر اپنی فوج اور لشکر کے سرداراوں کو، جو کربلا میں اس جنگ کے ذمہ دار اور سرکردہ قائد تھے، انہیں بلایا اور ان سے قاتل دریافت کیا۔ سب سے پہلے شیث بن ربعی ملعون آیا۔ یزید نے اس سے پوچھا:

"وَیْلَکَ ءَ اَنْتَ قَتَلْتَ الْحُسَیْنَ اَمْ اَنَا اَمَرْتُکَ بِقَتْلِہٖ".

"افسوس ہے تجھ پر، کیا تو نے حسینؑ کو قتل کیا ہے؟ کیا میں نے تمہیں انؑ کے قتل کا حکم دیا ہے؟"

شیث نے کہا: خدا کی قسم! میں نے قتل نہیں کیا بلکہ مصابر بن رہینہ انؑ کا قاتل تھا۔

یزید اُس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا تو نے حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کیا ہے اور کیا میں نے تجھے انؑ کے قتل کا حکم دیا تھا؟

اس نے بھی انکار کیا اور کہا: خدا کی قسم! میں نے تو انہیں قتل نہیں کیا بلکہ قیس بن ربیع انؑ کا قاتل ہے۔

یزید نے قیس سے دریافت کیا تو اس نے شمر ذی الجوشن کو مجرم بنایا۔ شمر سے پوچھنے پر اس نے بھی انکار کر دیا اور قتل کی ذمہ داری سنان بن انس پر ڈال دی۔ سنان سے دریافت کیا گیا تو اُس نے بھی انکار کر دیا۔

یزید نے جھلا کر کہا کہ تم حیلہ بہانہ کر کے اپنی برأت ظاہر کر رہے ہو۔ دوسروں کو قاتل ٹھہراتے ہو۔ آخر حسینؑ کا قاتل کون ہے؟

اس وقت قیس بن ربیع نے کہا: یزید! اگر جان کی امان ملے تو میں صحیح قاتل کی نشاندہی کرتا ہوں اور اصلی قاتل کا نام بتاتا ہوں۔

یزید نے کہا: تجھے امان ہے، قاتل بتا۔

اُس نے کہا: فرزندؑ رسول کا قاتل وہ ہے جس نے جنگ کا علَم بلند کیا، فوجیں جمع کیں، مال و جاگیریں تقسیم کیں، لشکروں پر لشکر حسینؑ کے قتل کیلئے بھیجے اور انعامات کا لالچ بھی دیا۔

یزید نے پوچھا: وہ کون ہے؟

قیس نے کہا: وہ تیرے سوا کوئی نہیں۔ تو ہی قاتل ہے۔

یزید یہ سچا جواب سن کر لاجواب ہو گیا اور یہ کہتا ہوا:

"مَالِیْ وَلِلْحُسَیْنِ".

مجھے کیا غرض تھی حسینؑ سے؟ (میں نے یہ کام کیوں کیا؟) محل میں داخل ہو گیا۔

یزید نے حسینؑ مظلوم کا سر طشت میں رکھا، اوپر ریشمی رومال رکھ کر رونے لگا اور پچھتانے لگا۔ بار بار ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ یہ ندامت اس کی خالق کے خوف سے نہ تھی بلکہ مخلوق کے خوف سے تھی۔

ھند، زوجۂ یزید کا خواب

ہند کا بیان ہے کہ میں اپنے بستر پر محوِ خواب تھی، میں نے عالم خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں اور ملائکہ گروہ در گروہ سر امام حسین علیہ السلام کی طرف آ رہے ہیں۔ اسی اثناء میں ایک بادل آسمان سے نازل ہوا۔ اس میں سے چند بزرگ اُترے۔ ان میں سے ایک بزرگ سفید رنگ، چاند سا چہرہ رکھنے والے اُترے اور آتے ہی سر مبارک پر گر پڑے اور پیاسے لبوں اور پاک دانتوں کا بوسہ لینے لگے۔

(جن لبوں اور دانتوں کا مدینہ میں بوسہ لیا کرتے تھے، انہی جگہوں پر شام میں یزید چوب کے ساتھ گستاخی کرتا تھا)۔

وہ درد بھرے بین کرنے لگے:

"یَاوَلَدِیْ قَتَلُوْکَ اَتُرَاھُمْ مَاعَرَفُوْکَ وَمِنْ شُرْبِ الْمَآءِ مَنَعُوکَ یَاوَلَدِی اَنَاجَدُّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَھٰذَااَبُوْکَ عَلِیّ الْمُرْتَضٰی وَھٰذَااَخُوْکَ الْحَسَن وَھٰذَاعَمُّکَ جَعْفَرٌوَعَقِیْلٌ وَھٰذَانِ حَمْزَۃُ وَالْعَبَّاس".

"میرے کشتۂ جور و جفا بیٹے! انہوں نے تمہیں قتل کیا اور پہچانا نہیں؟ تمہیں پانی سے روک دیا اور پیاسا شہید کیا؟ میرے لختِ جگر! میں تیرا نانا رسولؐ اللہ ہوں، یہ تیرے بابا علیؑ مرتضیٰ آئے ہیں، یہ تیرے بھائی حسنؑ مجتبیٰ اور یہ تیرے چچا جعفر اور عقیل ہیں اور یہ حمزہ و عباس ہیں"۔

اس کے بعد جنابِ رسالت مآبؐ نے اپنے اہل بیتؑ کے اور افرادِ مقدسہ کے نام بھی لئے جو امامؑ مظلوم کی ملاقات کیلئے آئے۔

ہند کہتی ہے کہ میں اس خواب سے گھبرا کر ڈرتی ہوئی اور کانپتی ہوئی اُٹھی۔ سرِ حسینؑ کو دیکھا تو اس پر نور برس رہا تھا اور روشنی حسینؑ کے سر پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں یزید کو تلاش کرنے لگی۔ اسے میں نے دیکھا کہ ایک تاریک کمرہ میں منہ دیوار کی طرف کئے ہوئے کہہ رہا ہے:

"مَالِیَ وَلِلْحُسَیْنْ".

"مجھے حسینؑ سے کیا غرض تھی؟" "میں نے کیوں حسینؑ کو قتل کیا؟

ہند کا بیان ہے کہ یزید پر رنج وغم چھایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنا خواب سنایا۔ وہ ندامت کا سر جھکائے سنتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔

قاتل کے گھر میں مقتولؑ کا ماتم

یزید کی مسرت اب حسرت میں اور فرحت ندامت میں بدل چکی تھی۔ لوگوں کی لعنت، اپنوں کی پھٹکار، انقلاب کا خوف، انتقام کا ڈر، یزید کو بری طرح کھٹک رہا تھا۔ اب اس کا رویہ نرم ہو چکا تھا۔ اُس نے اہل بیتِ رسولؐ اور اسیرانِ یثرب کو اس قید خانہ سے نکلوا کر اپنے محل کے نزدیک خاص مکان میں بدل دیا۔ خرابۂ شام سے مکان میں تبدیلی ہند کے جزع وفزع اور دہائی وفریاد سے ہوئی یا بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر خرابۂ شام میں مقید رکھنا خلاف مصلحت تھا، اس واسطے اس نے اچھے مکانوں میں منتقل کر دیا۔

یا جناب سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کے مطالبہ پر کہ ہمیں مجلس حسینؑ منعقد کرنے اور ماتم حسینؑ برپا کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ دل کھول کر ہم گریہ وبکا کر سکیں اور مجلس و ماتم امامِ مظلومؑ کر سکیں۔

بہر حال کوئی بھی صورت ہو، اس خرابۂ زندان سے رہا ہو کر محل یزید کے قریب آ گئے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ہند وہاں سے لینے گئی ہو جبکہ اس نے سرِ دربار مجمع عام میں یزید کی مذمت کی اور بے پردہ نکل آئی تھی۔ یزید نے اس پر چادر ڈالی، گھر جانے کو کہا اور کہا:

"نَعَمْ فَاعْوِلِيْ يَاهِنْدُ وَابْكِيْ عَلٰى اِبْنِ بِنْتِ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَصَرِيْخَةِ قُرَيْشٍ".

"ہاں اے ہند! یہ حسینؑ ہی کا سر ہے۔ پس فرزندِ رسولؐ اور لائق گریہ خاندانِ قریش پر خوب گریہ وبکا کر"۔

بعض روایات میں ہے کہ ہند کے کہنے پر خاندانِ رسالتؐ کے اسیروں کو ایک خاص مکان میں ٹھہرایا گیا اور مجلس و ماتم کی اجازت دی گئی۔

چنانچہ جب اس مکان میں اسیرانِ خاندانِ محمد علیہم السلام آئے تو خاندانِ ابوسفیان کی عورتوں نے خاص گریہ وبکا کے ساتھ استقبال کیا۔ انہوں نے زیورات اُتار دیئے اور اسیرانِ جفا کے ساتھ مل کر ماتم وبکا کیا۔

ظلم وتشدد کی ایک حد ہوتی ہے۔ شام وکوفہ والے لوگ گو بشر وانسان تھے مگر ان کے دل اور کلیجے پتھر سے سخت تھے۔ جس قدر ظلم یہ لوگ کر سکتے تھے اور جتنا ستم ان کے انسانی مقدور میں تھا، انہوں نے کیا۔ لیکن یہاں ظلم وستم کی حدیں ختم ہو گئی

تھیں۔اس واسطے ان شہداء کے بدنوں اور سروں، نیز بیکس، بے وارث اور غریب ومظلوم قیدیوں کی خستہ حالی پر حیوان روئے، چرند پرند روئے، درودیوار روئے، اشجار واشجار روئے۔ حور وملائک روئے۔ زمین وآسمان روئے۔ دوست اور دشمن روئے۔ یزید رویا اور یزید کے خاندان کی عورتیں روئیں۔ چونکہ اب ماتم حسینؑ پر پابندیاں ختم تھیں، اذنِ عام تھا۔

خود آلِ سفیان اور آلِ معاویہ کی عورتیں بھی اس ماتم میں شریک تھیں۔اس واسطے دمشق کے تمام محلہ جات میں اطلاع پہنچ گئی کہ قیدی سجادؑ کے بابا، زینبؑ کے بھائی، فرزند زہراؑ کی صفِ ماتم بچھ چکی ہے۔ وارثِ ماتم، اُم المصائب کو بھائی اور عزیزوں، شہیدوں کا پرسہ دینے کیلئے کوئی عورت بھی ہو، آسکتی ہے۔

جو چھپی ہوئی مومناتِ حبدارِ آلِ رسولؐ تھیں، انہیں رونے اور پرسہ دینے کا موقعہ ملا۔ خود آلِ ابوسفیان اہتمام کر رہی تھیں۔اس واسطے اس خاص محل سرا میں نوحہ وماتم کرنے والی عورتیں کثیر تعداد میں جمع ہوگئیں۔ مستوراتِ قریش، سفیانی یا ہاشمی اور عام عورتیں سیاہ لباس پہن کر آئیں۔نوحہ وبکا کی آوازیں بلند تھیں، آنسو بہہ رہے تھے، زبانوں پر نوحے ومرثیے تھے، سروں اور چہروں پر طمانچے تھے اور دمشق کی فضا سوگوار تھی۔

زہراؑ کا لعل اب مرثیوں اور نوحوں کی صورت میں عورتوں اور مردوں کی زبان پر تھا۔ ہر سمت سے آواز آتی تھی:

"قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِلَاجُرْمٍ وَّلَاخَطَاءٍ".

دمشق کے بازاروں اور گھروں میں حسینؑ کی مظلومی کے نوحے پڑھے جا رہے تھے اور یزید پر لعنت کا ورد جاری تھا۔

حسینیؑ ماتم داروں کو بلا روک ٹوک کھلی اجازت تھی۔دردستائیوں اور دکھی شہزادیوں نے دل کھول کر ماتمی لباس میں کمر باندھ کر، سروں کے بال کھول کر غریب کربلا کا ماتم کیا۔دمشق کے درودیوار سے:

"وَاحُسَیْنَاہُ،وَاقَتِیْلَاہُ یَابْنَ رَسُوْلَ اللّٰہِ"

کی آوازیں آرہی تھیں۔تین دن متواتر، بروایت سات دن متواتر یہ ماتم قائم رہا۔اس کے بعد یزید نے رہائی کا حکم دے دیا۔

اہلبیتؑ کی رہائی

یزید نے امام سجاد علیہ السلام کو بلایا اور نہایت نرمی سے کہا کہ اگر آپؑ شام میں قیام کریں تو میں عزت واحترام سے رکھوں گا اور اگر واپس جانا چاہیں تو میں احترام کے ساتھ مدینہ پہنچادوں۔

قبل ازیں یزید امامؑ سے ان کی تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ جناب سجاد علیہ السلام نے وہ تین خواہشیں

پیش کیں:

1۔ مجھے میرے سردار و مولا بابا حسینؑ کا سر دیا جائے۔

2۔ وہ مال و اسباب جو کربلا میں تیری فوج نے لوٹا، ہمیں واپس کیا جائے۔

3۔ اگر تو میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو کوئی ایسا دیندار اور نیک خصال آدمی تیار کر جو ہماری مستورات اور یتیموں کو ہمارے حرمِ جد میں پہنچا دے۔

یزید نے جواب دیا کہ سجادؑ! آپ کے بابا حسینؑ کا سر تو آپ کو کسی صورت نہیں مل سکتا۔ جو آپ کا مال کربلا میں لوٹا گیا ہے، اس کے بدلہ زیادہ قیمتی مال آپ کو دینے کیلئے تیار ہوں اور آپ کے قتل سے میں نے درگزر کیا ہے۔ آپ خود ہی اپنے بچوں اور مستورات کو مدینہ لے جایئے۔

جناب سید سجاد علیہ السلام نے فرمایا: میں مال کا عوض نہیں لینا چاہتا۔ مجھے وہی مال واپس کر دے کیونکہ ہمارے تبرکات ہیں۔ ان میں میری جدہ ماجدہ کا چرخہ، ان کا مقنعہ، گلوبند اور قمیض بھی ہے۔

چنانچہ یزید نے وہ مال واپس کر دیا۔ رہائی کے متعلق امام سجادؑ اور یزید کا مکالمہ کتب تواریخ اور مقاتل میں مرقوم ہے۔

یہاں چند اُمور بحث طلب ہیں۔

1۔ یزید نے سر دینے سے انکار کیا مگر تحقیقی روایت بتاتی ہے کہ سرہائے شہداء کربلا میں قبورِ مقدسہ میں ابدانِ مطہرہ کے ساتھ دفن کیے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر سروں کی واپسی کے اہل بیتؑ نے واپس مدینہ آنے اور رہائی پانے سے انکار کر دیا اور اس شرط پر رہا ہوئے اور واپس آنے پر رضامند ہوئے کہ سرہائے شہداء واپس ملیں۔

چونکہ یزید رائے عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے ہر قیمت پر اہل بیتؑ کو راضی کرنا چاہتا تھا، اس واسطے اس نے شہدائے کرام کے سرہائے مطہرہ جناب سجادؑ اور جناب زینبؑ کے تقاضے کے مطابق واپس کر دیئے۔

یزید کا رویہ بدل چکا تھا۔ اس میں وہ شدت اور غلاظت نہیں رہی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اہل بیتؑ نے سروں کی واپسی پر اصرار کیا ہو اور یزید نے واپس نہ کیے ہوں۔ اہل بیتؑ نے سروں کی واپسی کا مطالبہ ضرور کیا کیونکہ سر انہیں عزیز تھے اور وہ چاہتے تھے کہ سر واپس لے جا کر اپنے مقام پر دفن کیے جائیں کیونکہ بغیر سر کے صرف بدن کے مدفن کی وہ عظمت و توقیر نہیں رہتی جو سر کے ساتھ ہوتی ہے۔ صرف ایک سر کا مطالبہ اُن کی شانِ کریمی اور حقِ رفاقت و بندہ نوازی کے خلاف ہے۔ انہوں نے تمام سروں کا مطالبہ کیا اور اس مطالبہ پر اصرار کیا۔ لہٰذا یزید کو یہ سر دینا پڑے۔

شرح شافیہ اور فاضل نراقی نے "محرق" میں لکھا ہے کہ جب یزید نے سر دینے سے انکار کیا تو امام سجاد علیہ السلام نے جلال میں آ کر فرمایا:

"اے یزید! تو گمان کرتا ہے کہ میرے بابا کا سر مجھ سے مخفی ہے؟ کیا میں اسے نہیں دیکھ سکتا اور کلام نہیں کر سکتا؟"

اس وقت سر مطہر ایک تھال میں رومال سے ڈھانپا ہوا تھا۔ بیمار امامؑ نے بابا کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَبَا عَبْدِاللّٰہِ".

رومال سرے اُتر گیا اور سر مبارک سے آواز آئی:

"وَعَلَیْکَ السَّلَامُ یَا وَلَدِیْ".

اس وقت سید سجاد علیہ السلام کی دردناک چیخ نکلی اور فرمایا:

"بابا! میں تو مدینہ واپس جا رہا ہوں، اب آپ سے وداع کرتا ہوں۔ میرا الوداعی سلام ہو"۔

اس پر تمام حاضرین مجلس پر گریہ طاری ہو گیا اور سب اہل دربار رونے لگے۔ یزید نے امام سجادؑ کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور سر مظلوم معہ سرہائے شہداء امام سجادؑ کے سپرد کر دیئے، جیسا کہ مقتل الحسینؑ مقرم، ریاض الاحزان، حبیب السیر، لہوف اور نفس المہموم میں مرقوم ہے۔

2۔ کربلا کے لوٹے ہوئے مال کی واپسی کا مطالبہ ہوا۔ کیا وہ مال لوٹنے والے افراد کوفی و شامی اپنے لے گئے تھے؟ یا شام میں یزید کے پاس پیش کیا گیا تھا؟

اگر لوٹنے والے سپاہی اپنے گھروں میں لے گئے تھے تو اتنی جلدی ان کی فراہمی کا انتظام کیسے ہو سکتا تھا؟ تمام مال اکٹھا کیسے کیا جا سکتا تھا؟ پھر امام سجادؑ بھی اس امر کو جانتے تھے کہ وہ مال شام میں ہے یا باہر لوگوں کے گھروں میں اور اس کا فراہم کرنا اب دُشوار ہے اور اس کیلئے ایک عرصہ چاہئے۔ پھر انہوںؑ نے مطالبہ کیوں کیا؟

سید اجل ابن طاؤسؒ نے لہوف میں لکھا ہے کہ اسیرانِ خاندانِ اہل بیتؑ اور سرہائے شہدائے کربلا کے ساتھ وہ تبرکاتِ انبیاء بھی دربارِ یزید میں پیش کئے گئے تھے جو امامؑ مظلوم کی شہادت کے بعد بطور مالِ غنیمت لوٹ لئے گئے تھے۔ لہٰذا تمام نہ سہی، وہ تبرکات جو دربارِ شام میں یزید کے پاس پہنچے تھے اور جنابِ سید سجادؑ نے دیکھے تھے، انہی کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا جن میں وہ اشیاء بھی تھیں جو یادگار بنتِ رسولؐ سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں اور ان کا یزید کے پاس رہنے دینا امام سجادؑ نے مناسب نہ سمجھا۔

وہ وقت ایسا تھا کہ اہل بیتؑ کے مطالبات یزید منظور کرنے پر مجبور تھا، خصوصاً جبکہ اس نے تین خواہشات کی منظوری کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

یزید زیادہ عرصہ اہل بیتؑ کو دمشق میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جو دمشق میں رہنے کیلئے سید سجادؑ سے گزارش کی تھی، یہ رسمی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ جناب سجاد علیہ السلام اور مستورات کسی صورت میں بھی مدینہ چھوڑ کر دمشق میں رہنا پسند نہیں کریں گی۔

چنانچہ یزید نے رہائی کا حکم دے دیا اور نعمان بن بشیر کو اس بات پر مامور کیا کہ اہل بیتؑ کو عزت واحترام کے ساتھ واپس مدینہ پہنچائے۔

سواریوں کا انتظام کیا گیا۔ اونٹوں پر پالان اور محمل رکھے گئے۔ یزید نے چرم اور ریشم کی چادریں بچھا کر ان پر درہموں اور دیناروں کے ڈھیر لگا دیئے اور جناب زینبؑ وام کلثومؑ سے کہا:

"خُذُوا هٰذِهِ الْاَمْوَالَ عِوَضَ مَا اَصَابَكُمْ".

"یہ قتل وقید کی مصیبتوں کا عوض ہے، علیؑ کی بیٹیو! یہ مال لے لو"۔

جناب زینبؑ وام کلثومؑ نے فرمایا:

"اے کمینے! تو کتنا بے حیاو بے شرم ہے، تو نے ہمارے گھر برباد کئے، ہمارے مردوں کو قتل کیا، ہمیں قید کیا اور پھر ہماری مصیبتوں کا بدلہ مال سے دینا چاہتا ہے؟ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"۔

نعمان بن بشیر کے ہمراہ تیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی جو اہل بیتؑ کے محافظ کی حیثیت سے ہمرکاب سفر تھی۔ اس بار پردہ و محملوں کا انتظام تھا۔ مستورات اہل بیتؑ کو باپردہ، عزت واحترام کے ساتھ محافظین کی جماعت کے ساتھ، جن کے سردار نعمان بن بشیر تھے، واپس مدینہ روانہ کرنے کا انتظام کیا گیا اور نعمان بن بشیر کو ہر قسم کی نرمی، اہل بیتؑ کی فرمانبرداری اور حفاظت کی تاکید کی گئی تھی۔

اہل بیتؑ رات کو سفر کرتے اور حسب مرضی قیام و سفر کرتے۔ جب کسی مقام پر نزول فرماتے تو محافظوں کی یہ جماعت مستورات اہل بیتؑ سے دُور قیام کرتی اور جب سفر ہوتا تو یہ لوگ محملوں کے پیچھے پیچھے چلتے اور کسی کی نظر مستورات پر نہ پڑتی۔

اس واپسی کے سفر میں اہل بیتؑ جہاں چاہتے، نزول فرماتے اور جب چاہتے کوچ فرماتے۔ نعمان بن بشیر اور ان کے ساتھ ان کے احکام کی تعمیل کرتے۔ چونکہ ظالم ظلم کرتے کرتے تھک چکے تھے اور عام لوگوں کی لعنت و پھٹکار سے یزید پریشان و

پشیمان ہو چکا تھا، اس لئے اس نے ان پاسبانوں کو نرمی اور تواضع کا حکم دیا تھا۔ لیکن وہ گہرے زخم جو اہل بیتؑ نے بوقت داخلہ بازار و دربار شام میں کھائے تھے، وہ کہاں مندمل ہونا تھے اور وہ آنسو جو کربلا سے شام تک بہتے گئے، کہاں بند ہوتے ہیں! قیدیوں کی رہائی اور شام سے رُخصتی ان اندرونی دُکھوں کا کیا علاج کر سکتی ہے جو کربلا اور کوفہ و شام میں لاحق ہوئے!

ورودِ کربلا

جابر بن عبداللہ انصاریؓ

آلِ محمدؐ کا جو قافلہ اس مقام پر پہنچا جو دوراہہ تھا، ایک راستہ مدینہ کو اور دوسرا کربلا کی طرف جاتا تھا۔ جنابِ سید سجادؑ اور مستوراتِ مخدرات نے رہبر سے کہا کہ ہمیں کربلا کی طرف لے چلو تاکہ شہداء کی ابدی خواب گاہوں کی زیارت کریں۔

چنانچہ جنابِ زینب سلام اللہ علیہا کے حکم کے مطابق کربلا کا راستہ اختیار کیا گیا۔ جب سرزمین کربلا میں اسیرانِ شام کا ورود ہوا جہاں آلِ رسولؐ کے گھر اُجڑے تھے اور جہاں گلستانِ زہراؑ تاراج ہوا تھا، ان دردستائی بیبیوں کو عاشور کا دن یاد آ گیا۔ بھلا عاشور کا دن وہ کب بھول سکتی تھیں، خصوصاً عصرِ عاشور۔

مؤمنین! ذرا غور فرمائیں کہ کربلا کا میدان ہو اور مستوراتِ آلِ محمدؐ ہوں اور رونے پر پابندی ختم ہو چکی ہو تو کس قدر گریہ بکا ہوا ہوگا۔ کس زور سے ماتم ہوا ہوگا۔ جنابِ زینبؑ و اُمِ کلثومؑ کو بھائیوں، اُمِ لیلیٰ اکبرؑ کو، ربابؑ اصغرؑ کو اور تمام بیبیاں اپنے عزیزوں کو یاد کر کے اس دردناک لہجہ میں نوحہ پڑھتی تھیں جن کو سن کر پتھر کا کلیجہ بھی پھٹ جائے اور شدتِ غم سے دل پارہ پارہ ہو جائے۔

ادھر شام سے اسیرانِ آلِ محمدؐ واپس ہوئے اور ادھر مدینہ سے جنابِ جابرؓ بن عبداللہ اور بنی ہاشم کی ایک جماعت عین اسی وقت کربلا میں وارد ہوئے۔ دونوں سوگوار اور ماتم دار قافلے ایک ہی وقت میں زمین کربلا میں وارد ہوئے۔ رونے کی گھڑی تھی اور ماتم کا دن تھا۔ نوحوں اور فریادوں سے میدان گونج رہا تھا۔ مستوراتِ اہل بیتؑ اور زائرین کی جماعت کے ماتم اور نالہ و فریاد سے دھرتی ہلتی اور زمین کانپتی تھی۔

آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور زبان پر مرثیے تھے۔ اِدھر سے جنابِ سید سجادؑ اور اُدھر سے جنابِ جابرؓ انصاری اور بنی ہاشم کی ایک جماعت اکٹھے مل کر روئے۔ جنابِ جابرؓ نے امام سجاد علیہ السلام کو پرسہ دیا۔ بہنیں بھائیوں کی قبروں پر آئیں۔ وارثوں اور زائرین نے عزیزوں اور شہیدوں کے مدفن پر بیٹھ کر خوب ماتم کیا۔ آس پاس کی بستیوں میں بنی اسد کی عورتوں نے

جب سنا کہ خواہر حسینؑ اور پسر مظلوم امامؑ شام سے واپس آ گئے ہیں اور بہنؑ نے بھائی اور امام سجادؑ نے بابا کی صف ماتم بچھائی ہوئی ہے۔ مظلوم شہیدوں کے وارث کربلا پہنچے ہوئے ہیں۔

وہ عورتیں سیاہ لباس پہن کر جناب زینبؑ وامِ کلثومؑ اور تمام مستورات کو پرسہ دینے کیلئے آئیں۔ بنی اسد کی یہ عورتیں بارہ محرم کو وقتِ دفن اجساد بھی ماتمی لباس میں آئی تھیں۔ اب اسیرانِ شام کے ورود کے وقت بھی ماتمی لباس میں گریہ وبکا کرتی سر پیٹتی دخترانِ زہراؑ کے پاس تعزیت کرنے کیلئے آئیں۔ تین دن اہل بیتِ رسولؐ کربلا میں مقیم رہے اور برابر گریہ وماتم ہوتا رہا۔

زیارتِ جابرؓ

بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز صفر کی بیس تاریخ تھی۔ جنابِ جابرؓ انصاری نے فرات پر غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور قبر امامِ مظلوم اور مدفن تمام شہداء پر زیارت پڑھی جو کتب زیارت میں مذکور ہے۔

عطیہ بن سعد عوفی کوفہ کا باشندہ ہے، تابعی ہے۔ جابرؓ بن عبداللہ انصاری مدینہ کے رہنے والے ہیں اور صحابی ہیں۔

عطیہ بن سعد کا بیان ہے کہ میں حضرت جابر کے ہمراہ تھا، جب وہ زیارتِ قبر حسین علیہ السلام کیلئے کربلا میں وارد ہوئے۔ جنابِ جابرؓ نے نہر فرات پر غسل کیا، ایک چادر کمر پر باندھی، دوسری چادر بدن پر اوڑھی، آہستہ آہستہ ننگے پاؤں قبر مبارک کی طرف چلے اور کوئی قدم بغیر ذکرِ خدا کے نہ اٹھاتے تھے۔

عطیہ کا بیان ہے کہ حضرتِ جابرؓ نے مجھے کہا کہ مجھے قبر مس کرواؤ۔ میں قبر پر لے جا کر قبر مس کروائی۔ جونہی قبر مطہر کو مس کیا، جنابِ جابر غش کھا کر گر پڑے۔ میں نے ان پر کچھ پانی چھڑکا۔ تھوڑی دیر کے بعد غش سے افاقہ ہوا۔ تین بار کہا:

"یاحسینؑ، یاحسینؑ، یاحسینؑ"۔

پھر کہا: "آج دوست، دوست کو جواب نہیں دیتا، کیونکر جواب دے کہ سر تن سے جدا ہو چکا ہے، مولاؑ کی رگیں کٹ چکی ہیں، خون بہہ گیا ہے"۔

جنابِ جابر قبر پر بہت روئے اور زیارت پڑھی جسے زیارتِ اربعین کہتے ہیں۔ جب یہ جملے ادا کئے:

"وَالَّذِی بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ نَبِیًّا لَقَدْ شَارَكْنَاكُمْ فِیْمَا دَخَلْتُمْ فِیْهِ"۔

اس وقت عطیہ نے کہا کہ ہم کس طرح ان کے عمل میں شریک ہوئے جبکہ ہم نشیب وفراز اور ان کے ساتھ جہاد میں شریک نہ ہوئے۔ انہوں نے تو سر کٹائے، ان کی عورتیں بیوہ ہوئیں، بچے یتیم ہوئے۔

جابرؓ نے کہا کہ میں نے خود جنابِ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

"مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ"۔

"جو کسی قوم کو پسند کرتا ہے، اُسی قوم کے ساتھ محشور ہوگا"۔

اور جو کسی قوم کا عمل پسند کرتا ہے، وہ اس عمل میں کسی قدر شریک ہوتا ہے۔ مجھے اُس خدا کی قسم جس نے محمد مصطفےٰؐ کو حق کے ساتھ بھیجا اور میرے ساتھی اس نیت و عقیدہ پر ہیں جس پر جنابِ امام حسین علیہ السلام اور اُنؑ کے اصحاب تھے۔

چہلم کے دن کا عربی مرثیہ

بیس صفر کی مناسبت سے ایک عربی شاعر نے اسیرانِ شام کی کربلا میں واپسی پر چند اشعار لکھے ہیں جنہیں ہم باترجمہ ہدیہ قارئین کرتے ہیں:

قُمْ جَدِّدِ الْحُزْنَ فِي الْعِشْرِيْنِ مِنْ صَفَر
فَفِيْهِ رُدَّتْ رُؤُوْس الْآلِ لِلْحُفَرِ
يَازَائِرِيْ بُقْعَةِ اَطْفَالُهُمْ ذُبِحَتْ فِيْهَا
خُذُوْا تُرْبُهَا كُحْلًا اِلَى الْبَصَرِ
وَالْهَفْتَاهِ لِبَنَاتِ الطُّهْرِ يَوْمَ رَنَتْ
اِلَى مَصَارِعَ قَتْلَاهُنَّ وَالْحفرُ

"اے مردِ مومن! اُٹھ اور بیسویں صفر کو اپنا غم و حزن تازہ کر کیونکہ اس روز آلِ بنی ہاشم اور اصحاب کے سر کربلا میں دفن ہونے کیلئے واپس آئے تھے۔ زائرین بقعہ کربلا اس خطہ میں بنی ہاشم کے اطفال ذبح کئے گئے۔ اس خطہ زمین کی مٹی بطور سرمہ آنکھوں میں لگا۔

ہائے افسوس! پاک شہزادیاں جس دن روتی چیختی اپنے مقتولوں کی قتل گاہ اور قبور پر گئیں، کتنا غمناک منظر تھا"۔

رَمَيْنَ بِالنَّفْسِ مِنْ فَوْقِ النِّيَاقِ عَلٰى
تِلْكَ الْقُبُوْرِ بِصَوْتٍ هَائِلٍ ذَعْرِ
فَتِلْكَ تَدْعُوْا حُسَيْنًا وَهِيَ لَاطِمَةٌ
مِنْهَا الْخُدُوْدُ وَدَمْعُ الْعَيْنِ كَالْمطر

"شہیدوں کی وارث مخدراتِ بنی ہاشم کی نظریں جب قبروں پر پڑیں اور ان کے محل قبور مطہرہ کے قریب پہنچے تو انہوں

نے بیتاب ہو کر اونٹنیوں سے اپنے آپ کو قبروں پر گرا دیا۔ ہر بی بی قبر کو گلے لگا کر، مدفن پر بیٹھ کر اپنے عزیز کا مرثیہ پڑھنے لگی۔

ان میں سے ایک بی بی اس حال میں حسین علیہ السلام کو پکار رہی تھی کہ منہ پیٹ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی"۔

وَتِلْکَ تَصْرَخُ وَاجدَّاهُ وَابَتَاهُ
وَتِلْکَ تَصْرَخُ وَیُتْمَاهُ فِی الصِّغَرِ
فَلَوْ تَرَوْا اُمَّ کُلثُوم مُنَاشَدَةً
وَلَهِیَ وَتَلْثِمُ تُرْبَ الطَّفِّ کَالْعِطْرِ

"کوئی بی بی 'وَاجدَّاهُ، وَاابَتَاهُ' کہہ کر فریاد کر رہی ہے اور کوئی بچی اپنے چھوٹے سن میں یتیم ہونے کا دردناک بین کر رہی ہے۔ پس کاش! اُمِ کلثومؑ کو اس حالت میں نوحہ کرتے دیکھتے کہ ارضِ کربلا کی مٹی اپنے سر کے بالوں میں ڈال رہی ہیں"۔

یَادَافِنَ الرَّاسِ عِنْدَالجثۃِ حتفظوا
بِاللّٰہِ لَا تَنثرُوا تُرابًا عَلٰی قَمرِ
لَا تَدْفِنُوا الرَّاسَ اِلَّا عِنْدَ مَرقَدِہٖ
فَاِنَّھَا رَوضَۃُ الفردوسِ وَالزَّھَر

"اے سرِ حسینؑ کو ان کے بدن کے ساتھ قبر میں دفن کرنے والے! ذرا خیال کرنا، چاند پر مٹی نہ ڈالنا۔ تم کس دل سے قمرِ زہراؑ کو زمین میں دفن کر رہے ہو؟ اس سر کو سوائے مرقدِ بدنِ حسینؑ کے کہیں اور دفن نہ کرنا کیونکہ وہ باغِ فردوس کا ایک ٹکڑا ہے"۔

لَا تغسلوا الدَّمَ مِنْ اَطْرَافِ لِحْیَتِہٖ
خَلُّوْا عَلَیْھَا خِضَابَ الشیبِ وَالکبر
لَا تُخْرِجُوْا اَسْھُمًا فِیْ جِسْمِہٖ نَشَبَتْ
خَوْفًا یغورُ دمًا یطموا عَلَی الْبَشَر

"انؑ کی ریش مبارک میں جو خون لگا ہوا ہے، اسے نہ دھونا۔ یہ بزرگی اور ضعیفی کا خضاب ہے، اسے رہنے دو اور جو

تیروں کی نوکیں انؑ کے بدن میں پیوست ہو چکی ہیں، انہیں نہ نکالنا، مبادا خون جوش مار کر تمام بدن پر نہ پھیل جائے''۔

رُشُّوْا عَلٰی قبرہٖ ماءً فَصَاحِبُہٗ
مُعَطَّشٌ نَیلَلُوْا اَحْشَاہُ بِالقطر
لَا تَدْفُنُوْا الطِّفْلَ اِلَّا عِنْدَ وَالِدِہٖ

''اس مظلوم شہیدؑ کی قبر پر کچھ پانی چھڑک دینا کیونکہ صاحبِ قبر پیاسا شہید ہوا جبکہ شدت پیاس سے قلب وجگر بھن رہے تھے اور گردن پر شمر کا خنجر تھا۔ اس طرح قبر پر پانی چھڑک کر مظلوم حسینؑ کا دل ٹھنڈا کر دینا۔ شش ماہے اصغرؑ کو باپؑ کے ساتھ آغوشِ قبر میں دفن کر دینا کیونکہ معصوم بچہ باپ کی گود سے مانوس ہے اور یتیمی کی طاقت نہیں رکھتا''۔

یَا رَاجِعِیْنَ السَّبَایَا قَاصِدِیْنَ اِلٰی
اَرْضِ الْمَدِیْنَۃِ ذَالِکَ المربع الخَضِرِ
خُذُوْا لَکُمْ مِنْ دَمِ الاحْبَاب تحفتکُمْ
وَخَاطِبُوْا الجَدَّ ھٰذَا تُحْفَۃُ السَّفَرِ

''اے واپس ارضِ مدینہ جانے والے قیدیو! وہ ارضِ پاک سرسبز ہے۔ اپنے پیاروں، عزیزوں کے خون کا تحفہ بنالو، جب کوئی مسافر سفر سے واپس آتا ہے تو کوئی نہ کوئی تحفہ لاتا ہے۔ تم بھی خون آلود کپڑے وغیرہ، خونِ شہداء محفوظ کر کے رکھ لو۔ جب مدینہ جانا تو جدِّ امجد کو مخاطب کر کے کہنا: نانا! یہ اس سفر کا تحفہ لائی ہیں''۔

ہر بی بی قبورِ مطہرہ پر دل کھول کر روئی۔ چند دن قیام کے بعد جناب سجادؑ نے سفر کی تیاری کی۔ اس روز بیبیوں نے قبروں سے آخری وداع کیا۔ جناب سکینہؑ نے آخری بار بابا کی قبر سے وداع کرتے ہوئے کربلا کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے زمینِ کربلا! میں زہراؑ کے چاند کو تیرے سپرد کر کے جا رہی ہوں۔ افسوس! تیری گود میں بنی ہاشم کے ستارے دفن ہوئے ہیں جن کے بدنوں کو خون کے ساتھ غسل دیا گیا اور زمین کربلا کی خاک اُڑ اُڑ کر گرد کا لباس پہناتی رہی''۔

کامل التواریخ میں ہے کہ جنابِ رُبابؑ بنت امراء القیس زوجہ حسینؑ پر، اس بے گور وکفن اور پیاسے شہید کی دھوپ میں لاش دیکھ کر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے اسی قبر پر رہائش اختیار کر لی۔ پورا ایک سال قبر پر مجاور بن کر بیٹھی رہیں۔ اس کے بعد واپس مدینہ گئیں اور یہ بھی منقول ہے کہ ساری زندگی سایہ میں نہ بیٹھیں اور نہ ٹھنڈا پانی پیا۔ وفادار بیوی اپنے معصومؑ آقا کی

مظلومانہ شہادت کے صدمہ میں گھل کر اپنے آقائے نامدار کو جنت میں جا ملیں۔ سدا دھوپ میں بیٹھنے سے رنگت تبدیل ہوگئی تھی۔

مدینہ میں مراجعت

جناب سجاد علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کی پھوپھیاں، بہنیں اور دیگر مستورات شب و روز گریہ و بکا اور ماتم حسینؑ میں مصروف ہیں اور کسی وقت بھی گریہ و بکا سے فارغ نہیں ہوتیں، ایک قبر سے اُٹھتی ہیں تو دوسری قبر پر گریہ و بکا کرنے بیٹھ جاتی ہیں، تو انہوں نے سفر کی تیاری کی اور تین دن کے قیام کے بعد مدینہ روانہ ہوئے۔

دستور ہے کہ جب مسافر وطن کی طرف مراجعت کریں تو ان کے چہروں پر خوشی کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور دل مسرتوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ مگر یہ مسافر مدینہ اس قسم کے مسافر نہ تھے جنہیں وطن جانے کی خوشی ہوتی۔ یہ حسرتوں کے ساتھ، گریہ و ماتم کے ساتھ واپس جارہے تھے کیونکہ یہ سارا خاندان شہید کروا کے، گھر بار لٹوا کر، قیدی کہلوا کر واپس ہورہے تھے۔ اس واسطے حسرت ان کے دامن گیر تھی، رنج والم ان پر چھایا ہوا تھا۔

آلِ محمدؐ کی شہزادیاں اپنے عزیزوں کو زمین کربلا کے سپرد کر کے حسینؑ و عباسؑ ایسے بھائیوں، اکبرؑ و قاسمؑ، عونؑ و محمدؑ ایسے فرزندوں سے محروم ہو کر گھر لوٹ رہی تھیں، گودیں بچوں سے خالی تھیں، رسیوں اور تازیانوں کے نشان بدنوں پر نمایاں تھے۔

بشیر کا بیان ہے کہ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے خیام گاہِ امام سجادؑ پہنچا۔ وہاں لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ گزرنے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ میں گھوڑے سے اُتر پڑا۔ لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور زبان پر نوحے تھے۔ زنانِ مدینہ سر کھول کر ماتم کر رہی تھیں۔ اتنی گریہ و بکا کی صدائیں تھیں کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ وفاتِ رسولؐ کے بعد مدینہ میں اس قدر غم و ماتم کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اُس روز ہوا۔ ہر مرد گریہ کناں اور ہر عورت ماتم دار تھی۔

بشیر کہتا ہے کہ میں مجمع کو چیر کر امامؑ کے خیمہ کے نزدیک پہنچا۔ ابھی امامؑ خیمہ کے اندر تھے۔ اسی اثناء میں اسیرِ دمشق، وارثِ حسینؑ امام سجاد علیہ السلام خیمہ سے باہر آئے۔ حالت یہ تھی کہ آنکھوں سے اشکوں کی برسات جاری تھی۔ انؑ کے ہاتھ میں رومال تھا۔ بار بار آنسو پونچھتے تھے مگر آنسو تھمتے نہ تھے۔ مولاؑ کے پیچھے خادم نے کرسی اُٹھائی ہوتی تھی۔

خادم نے کرسی رکھی، مولا سجادؑ اس پر بیٹھے۔ جونہی فرزندِ رسولؐ اس پر بیٹھے اور لوگوں کی نظر پڑی، دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور شہیدانِ کربلا کا پرسہ دے رہے تھے۔ رسمِ تعزیت ادا کر رہے تھے اور اشکوں کا ہدیہ پیش کر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب امام سجاد علیہ السلام نے گریہ پر قابو پایا اور آواز بولنے کے قابل ہوگئی تو لوگوں کو ہاتھ کا اشارہ

کیا کہ ذرا بیٹھ جاؤ اور خاموشی سے سنو۔ لوگ بیٹھ گئے اور آوازِ گریہ خاموش ہوگئی تو جناب سجاد علیہ السلام نے یہ خطبہ پڑھا۔ (ہم اصل خطبہ کا صرف ترجمہ پیش کر رہے ہیں):

حمد وثنائے ذاتِ پروردگار کے بعد فرمایا:

''اے لوگو! خدا کا شکر ہے کہ اس نے عظیم مصائب اور شدید رنج وآلام کے ساتھ ہمارا امتحان لیا۔ اسلام کی دیوار میں سخت رخنہ اور شگاف پڑ گیا۔ امام حسینؑ اور اُن کی عترت ظلم و جور سے شہید کر دی گئی۔ امامؑ مظلوم کی مستورات اور انؑ کے یتیم بچوں کو قید کیا گیا اور ان مقدس سروں کو نیزوں پر اُٹھا کر شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ یہ اتنی بڑی مصیبت اور اتنا بڑا صدمہ ہے۔ جس کی کوئی مثال نہیں۔

اے لوگو! تم میں کون ہے جو آنجنابؑ کی شہادت کے بعد خوش ہو؟ کونسا دل ہے جو اس مصیبت پر غمگین نہ ہو؟ کونسی آنکھ ہے جو اس صدمہ پر آنسو نہ بہائے؟ میرے مظلوم باباؑ کی بیکسی کی موت پر ساتوں آسمانوں نے اپنی بلندیوں سمیت گریہ وبکا کیا۔ دنیا کے سمندر اپنی موجوں کے ساتھ، آسمان اپنے ارکان سمیت، زمین اپنی اطراف سمیت، درخت اپنی شاخوں کے ساتھ، مچھلیاں سمندروں کی موجوں میں، تمام ملائکہ مقربین اور حور و عین، ساکنانِ آسمان وزمین روئے۔

لوگو! وہ کونسا دل ہے جو اس مصیبت پر پھٹ نہ جائے؟ وہ کونسا کان ہے جو یہ درد بھری خبر سن کر متاثر نہ ہو؟ آنکھیں رو رہی ہیں دل غمگین ہیں، ہمیں وطن سے دُور کیا گیا، ہماری جماعت کو اس طرح قتل اور قید کیا گیا، گویا کہ ہم نہایت ذلیل اور گھٹیا قوم کے آدمی ہیں۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا، کوئی ناپسندیدہ امر ہم سے صادر نہیں ہوا، نہ اسلام کے امر کی سرتابی کی۔ ہمارے جدؐ امجد نے تو ہمارے احترام واجلال کی وصیت فرمائی تھی۔ انہوں نے ہم پر اتنا ظلم کیا کہ اس سے زیادہ کر ہی نہ سکتے تھے۔ ہم نے صبر کیا۔ خدا نے ہمیں صبر کی توفیق عطا فرمائی اور اس کا شکر ہے کہ اس نے امتحان میں ہمیں کامیاب کیا''۔

قلب وجگر میں گہرے زخم تھے۔ بہتے ہوئے آنسوؤں، کھلے سروں اور خاک آلودہ بالوں کے ساتھ نوحہ ومرثیہ پڑھتی ہوئی مستورات مدینہ وارد ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ واپس وطن مدینہ آنا ضروری تھا ورنہ بفرمان ان کے وطن واپس جانے کے لائق نہ تھیں۔

کتنی مسرت ہوتی ہے جب مسافروں کو اپنے شہر کی دیواریں نظر آتی ہیں اور کتنی حسرت اور کس قدر رنج ہوا تھا ان درد ستائی شہزادیوں کو جب انہیں مدینہ کی دیواریں نظر آئیں۔ جوں جوں وطن نزدیک آتا ہے، مسافروں کے دل بڑھتے ہیں مگر جوں جوں مدینہ قریب آرہا تھا، ان کے دل گھٹتے جارہے تھے۔ کس عزت کے ساتھ یہ مستورات گئی تھیں اور کن حسرتوں اور

دردوں کے ساتھ واپس آئیں۔

جب یہ اُجڑے ہوئے مسافر مدینہ کے قریب پہنچے تو جناب سجادؑ نے مدینہ سے باہر قیام کا حکم دیا۔ اونٹ بٹھائے گئے، خیمے نصب کئے گئے اور یہ اُجڑے ہوئے مصیبتوں کے مارے ہوئے مسافر اونٹوں سے اُترے۔ اہلِ مدینہ کو ابھی اس قافلہ کی کوئی اطلاع نہیں ہوئی تھی۔

جناب سجاد علیہ السلام نے بشیر بن جذلم کو، جو قافلہ کے ہمراہ پاسبانوں میں سے تھا، فرمایا کہ بشیر! تمہارے باپ ایک شاعر تھے، خدا اُن پر رحم کرے، تو بھی کچھ شعر کہہ لیتا ہے؟ بشیر نے عرض کی: ہاں مولاؑ! میں بھی شاعر ہوں۔

امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا کہ جا شہرِ مدینہ میں اور اہلِ مدینہ کو ہمارے آنے کی منادی کر دے اور انہیں شہادتِ حسینؑ کی خبر سنا دے۔

بشیر گھوڑے پر سوار ہوا اور جب مسجد نبویؐ کے دروازے پر آیا تو بلند آواز سے روتے ہوئے لوگوں کو خبر دی:

یا اھل یثرب لا مقام لکم بھا
قُتِل الحُسینُ وَ اَدْمَعِی مِدْرَارٌ
الجسم منہ بکربلاء مُضَرَّجٌ
والراسُ منہ علی القناۃ یُدارُ

''اے مدینہ والو! اب یہ شہر رہنے کے لائق نہیں رہا۔ حسینؑ کربلا میں شہید کر دیئے گئے اور میری آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔ جسم حسینؑ تو صحرا کی تپتی ریت پر خون میں غلطاں، بے گور و کفن چھوڑ دیا گیا اور ان کا سر نوکِ نیزہ پر نصب کر کے جا بجا پھرایا گیا۔

''اے اہلِ مدینہ! دیکھو، امام زین العابدینؑ، فرزندِ حسینؑ باپؑ کو شہید کروا کے، پھوپھیوں، بہنوں اور باقی مستورات کے ساتھ بیرونِ مدینہ قیام فرما ہیں۔ میں تمہیں انؑ کی آمد کی اطلاع اور شہادتِ حسینؑ کی خبر دینے آیا ہوں''۔

بشیر بیان کرتا ہے کہ جونہی میں نے یہ اعلان کیا، مدینہ شہر میں جس قدر عورتیں تھیں، بے حجاب ہو کر کھلے سروں کے ساتھ روتی پیٹتی ہوئی اور نوحہ و فریاد کرتی ہوئی گھروں سے نکل پڑیں اور تمام مرد روتے ہوئے بیتابانہ سوئے قافلہ دوڑ پڑے۔ مدینہ میں کہرامِ ماتم بپا ہو گیا۔ اسی اثناء میں مَیں نے ایک عورت کو دیکھا جو جنابِ امام حسینؑ پر یہ نوحہ پڑھ رہی تھی:

نعی سیّدی ناعٍ نعاہ فاوجعا
وامرضنی ناعٍ نعاہ فجاعا
فَعَنسیٌّ جودابالدمع واسکبا
وجودابدمعٍ بعددمعکما معا
علٰی من دَھَاعرش الجلیل فزعزعا
فاصبح ھٰذاالمجدو الدین اَجدعا
علٰی بن نبی اللّٰہِ وابنِ وصیّہ
وَان کَانَ عنّاشاحط الداراشعاء

''خبر دینے والے نے مجھے میرے سردار وآقا کی شہادت کی خبر دی ہے۔ شہادت کی خبر نے میرے دل میں درد پیدا کیا اور شہادت کی خبر نے مجھے بیمار اور غمناک کر دیا۔

پس اے میری دو آنکھو! بہت اشک بہاؤ اور آنسوؤں پر آنسو لگا تار بہاؤ۔ اے میری دونوں آنکھو! اس مظلوم ومقتول پر روؤ جس کی شہادت نے عرشِ خدا کو لرزا دیا۔ یہ بزرگی، یہ دین ذلیل وخوار ہو گئے۔ اے آنکھو! گریہ کرو''۔

ایسی مصیبت جو کس قدر عظیم، کتنی دردناک، غم انگیز، دل خراش، شدید تر، تلخ ترین اور تباہ وبرباد کرنے والی ہے، ہم ان مصائب وآلام، شدائد واحزان کے عوض اجر وثواب کے بارگاہِ ربّ العالمین سے اُمیدوار ہیں، وہ غالب وانتقام لینے والا ہے۔

صعصہ بن صوحان ایک صحابی ہیں۔ ان کے فرزند صوحان نے معذرت پیش کی کہ مولاؑ! میں مریض ہوں۔ زمین گیر ہو چکا تھا۔ چلنے پھرنے کے لائق نہ رہا۔ اس واسطے نصرتِ امام علیہ السلام کا فریضہ ادا نہ کر سکا۔

مولاؑ نے اُس کا عذر قبول فرماتے ہوئے، اس کے اور اس کے باپ کیلئے دعائے خیر فرمائی۔

مؤمنین! کیا حال ہوا ہوگا اُجڑی، ستائی، دردماری، مستورات کا جب زنانِ مدینہ نے آکر شہداء کا پرسہ دیا ہوگا! خصوصاً بنی ہاشم کی وہ مستورات جو مدینہ میں رہ گئی تھیں۔ اُمِ سلمہؓ، اُم البنینؑ، اُمِ ہانیؓ، خواہر امیر المؤمنینؑ، اُمِ لقمانؓ، اسماءؓ، رملہؓ، زینبؓ، دخترانِ عقیلؑ ابن ابی طالبؑ، جب باہم گلے مل کر روئی ہوں گی تو عرشِ خدا لرزا ہوگا، آسمان تھر تھرائے ہوں گے، زمین کانپی ہوگی اور در ودیوارِ مدینہ سے صدائے نوحہ وبکا بلند ہوئی ہوگی۔

یہ تباہ حال قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہوا، ہزاروں کی تعداد میں زن ومرد نوحہ کناں بچشم گریاں تھے۔ جب جنابِ اُم

کلثوم کی نظر مدینہ پر پڑی تو اپنے حزن وملال کا اظہار اپنے مرثیہ میں بیان کیا:

مدینہ جدّنا لا تقبلینا
فبالحسرات والاحزانِ جئنَا

الا اخبر رَسول اللّٰہِ عنّا
بانّا قد فجعنا فی ابینَا

خرجنا منکِ بالاَھلین جمعًا
رَجعنا لارجال ولا تبینا

وکنانی الخروج بجمع شملٍ
رجعنا بالقطیعة خائفینَا

وانّا رِجالنَا بالطّفِ صَرعٰی
بلارُؤسٍ وَقَدذبحوا البنینا

فلونظرت عیونک الاسرٰی
عَلٰی اقتاب الجمال محملینا

اناطم لونظرتِ الی السَّبایا
بناتِک فی البلاد مشتیقًا

فنحنُ الضّائِعَاتِ بلاکفیل
ونحن النائحات عَلٰی اَخینا

اناطم لونظرت الٰی الحیارٰی
وَلوابصرت زین العابدیْنَ

"اے میرے نانا کے مدینے! ہمیں قبول نہ کر۔ ہم حسرتوں اور غموں کے ساتھ واپس آئی ہیں۔

لوگو! رسولؐ اللہ کو ہماری طرف سے کہہ دو کہ ہمیں بابا کے متعلق دشمنوں نے زبان درازیاں کر کے دُکھ پہنچایا۔

اے مدینہ! جب تجھ سے چلے تھے تو ہماری جماعت اکٹھی تھی لیکن جب واپس آئے ہیں تو نہ ساتھ مرد ہیں اور نہ بچے۔ مرد تو کربلا میں قتل ہو گئے اور کچھ بچے شام کی راہ اور دمشق کے شہر میں دفن ہو گئے۔ آباد نکلے تھے، برباد ہو کر آئے ہیں۔ ہمارے سارے مردوں کی لاشیں، سروں کے بغیر کربلا میں رہ گئیں اور بچے بھی ذبح ہو گئے۔

نانا! آپ کی آنکھیں ہمیں اس حالت میں دیکھتیں کہ کس طرح اونٹوں پر سوار کر کے ہمیں شہر بہ شہر اور بازاروں میں پھرایا گیا۔

اماں! آپ دیکھتیں کہ آپ کی بیٹیوں کو قید کر کے مختلف شہروں میں تشہیر کیا گیا۔ ہمیں بے وارث اور غریب سمجھ کر بے عزت کیا گیا۔ ہم اپنے بھائی پر نوحہ پڑھتی تھیں۔

اماں! کاش ہمیں پریشانی اور بے ردا حالت میں دیکھتیں، زین العابدینؑ کو دیکھتیں کہ کس مظلومانہ حالت میں ہیں۔

نانا! زینبؑ بے پردہ خیمہ سے نکلنے پر مجبور ہوئیں اور فاطمہ کبریٰ عریاں سر کے ساتھ نالہ و فریاد کرتی رہیں۔ سکینہؑ درد بھرے دل اور جگر سوختہ کے ساتھ رب العالمین کے دربار میں فریاد کرتی تھیں"۔

آلِ محمدؑ کے اُجڑے ہوئے گھروں کے بارے میں ایک شاعر ابن قتیبہ کے تاثرات ہیں جو اس نے مکینوں سے خالی مکانات کا اپنے اشعار میں نقشہ کھینچا ہے، اشعار ملاحظہ ہوں:

مررت علٰی ابیاتِ آلِ محمدً
فلَم اَرھا امثالھا یوم حَلَّت

فلا یبعدُاللّٰہُ الدیار واَھلُھَا
وان اصبحَتْ منھم برغمی تَخلَّت

اَلاانَّ قتلی الطَّفِ مِنْ الِ ھَاشم
اَذَلَّتْ رِقَاب المسلمین فذلَّت

وَکَانُوْاغیاثاً ثماضحَوْرَزِیَّۃً
لقدعَظمَتْ تلکَ الزرایاوَجَلَّت

اَلَمْ تَرَاَنَّ الشَّمْسَ اَضْحَتْ مَرِيْضَةً
لِفَقْدِحسيْنٍ والبلاه اقْشَعَرَّتِ

''میں آلِ محمدؐ کے گھروں کے قریب سے گزرا، ان گھروں کی وہ حالت نہ تھی جبکہ گھر والے گھروں میں مقیم تھے۔ خدا گھر والوں کو گھروں سے دُور نہ رکھے۔ اگر وہ گھر، گھر والوں سے خالی ہیں۔ آلِ ہاشم کے شہیدوں نے مسلمانوں کی گردنیں جھکا دی ہیں۔ وہ کسی وقت تو ضعیفوں اور مسکینوں کے پناہ دینے والے تھے اور فریاد کو پہنچنے والے تھے، اب خود فریادی اور مصیبت زدہ ہیں۔ آلِ محمدؐ پر جو مصیبتیں آئیں، وہ بہت بڑی ہیں۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ سورج امام حسینؑ کے مفقود ہونے سے مریض ہو گیا ہے اور شہر پراگندہ ہو گئے ہیں؟''

ایک اور شاعر کہتا ہے:

وَقَفْتُ عَلٰی دارالنبی مُحمدً
فَالْفَيْتُهَا قَدْاَقْفَرتْ عَرصَاتُمَا

وامرت خلاءً من تلاوة قاریٔ
وعَطّل مِنهَاصومُهاوصلوٰتها

والفوتُ من السّادات مِن الِ هاشم
ولَمْ يَجتمع بَعدَالحسين شَتَاتُها

فاعینی لقتل السبط عبریٰ لوعتیٰ
عَلٰی فقدهم ما تنقضیٰ زفراتُها

''میں نے محمد مصطفٰےؐ کی عترتؑ کے گھروں کو دیکھا جن کے دالان غیر آباد تھے، مکینوں کی رونقوں سے خالی تھے۔ جہاں قرآن مجید کی تلاوتیں شب و روز ہوتی تھیں، اب وہ گھر تلاوت اور صوم و صلوٰۃ کی دینی رونقوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

قتل حسینؑ کے بعد سادات بنی ہاشم کی زندگی مجتمع نہ ہو سکی۔ میری آنکھ فرزندِ رسولؐ کی شہادت پر اشک ریز ہے۔ انؑ کی شہادت پر میری آہیں برابر جاری ہیں اور میرے گریہ و غم کی سوزش قائم ہے''۔

جب سادات کا یہ اُجڑا ہوا اور لٹا ہوا قافلہ مدینہ میں داخل ہوا تو سیدھا مسجد نبویؐ اور مزار مقدس کے پاس گیا۔ راوی کا

بیان ہے کہ وہ دردناک منظر اہلِ مدینہ کو کبھی نہ بھولے گا کہ دخترانِ رسولؐ اور بناتِ علیؑ و بتولؑ جب ظلم کے ساتھ تمام مرد شہید کروا کر، متاعِ رسولؐ لٹوا کر، قیدِ ذلّت جھیل کر ناناؐ کے شہر میں داخل ہوئیں تو رونے کی صدائیں بلند تھیں، حسرت چھائی ہوئی تھی اور غم و رنج کی ردائیں اوڑھے ہوئے تھیں۔

گودیں بچوں سے خالی تھیں۔ قتل کے درد اور قید کے دُکھوں کی ستائی ہوئی کوفہ و شام کی قیدوں کا رنج اُٹھائے ہوئے بیکس و بے وارث شہزادیاں مزارِ ناناؐ کے سامنے مصیبتوں کے واقعات مرثیوں اور نوحوں میں بیان کر رہی تھیں۔ جب جناب اُم المصائبؑ نے مسجدِ نبویؐ کی چوکھٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا:

''نانا! میں آپؐ کے لاڈلے حسینؑ کی شہادت کی خبر دیتی ہوں''۔

کوئی دل نہ تھا جو بیقرار نہ ہوا ہو، کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہوئی ہو، کوئی کلیجہ نہ تھا جو فگار نہ ہوا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مظلوم سیدانیوں کے بین کلیجہ ہلا رہے تھے اور شہر مدینہ میں غم و الم کا طوفان برپا تھا۔ مسجدِ نبویؐ کے بعد یہ ماتمی جلوس مزارِ نبویؐ پر گیا۔ جنابِ اُم کلثومؑ نے قبرِ رسولؐ پر جا کر کہا:

''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَاجَدَّاہُ، اِنِّیْ نَاعِیَۃٌ اِلَیْکَ وَلَدَکَ الْحُسَیْنَ''۔

''نانا! آپؐ پر درود و سلام ہو، ہم اسیرانِ شام حسرتوں اور آلام کے ساتھ آگئے ہیں۔ نانا! میں آپؐ کے پیارے آغوش کے پالے حسینؑ کی خبر لائی ہوں۔

نانا! حسینؑ ساتھیوں کے ساتھ شہید ہو گئے اور ہم تمام مستورات بچوں کے ہمراہ بے پردہ قید کی گئیں''۔

اس وقت جنابِ زینبؑ نے بلند آواز کے ساتھ کہا:

''یَاجَدَّاہُ اِلَیْکَ الْمُشْتَکٰی مَاجَرٰی عَلَیْنَا. فَوَاللّٰہِ مَارَاَیْتُ اَقْسٰی مِنْ یَزِیْدَ وَلَارَاَیْتُ کَافِرًا وَّلَا مُشْرِکًا شَرًّا مِنْہُ وَلَا اَجْفٰی وَاَغْلَظَ فَلَقَدْ کَانَ یَقْرَعُ ثَغْرَاَبِیْ عَمِّ بِمِخْصَرَۃٍ وَّھُوَ یَقُوْلُ. کَیْفَ رَاَیْتَ الضَّرْبَ یَاحُسَیْنُ''۔

''اے جدِ بزرگوار! جو مصائب و آلام ہم پر گزرے، ان کی شکایت میں آپؐ کے حضور کرتی ہوں۔ پس خدا کی قسم! میں نے یزید سے زیادہ کوئی سنگ دل اور کوئی کافر و مشرک بھی اس سے بدتر نہیں دیکھا اور نہ اس سے زیادہ بدخو اور جفا کار و ستم شعار دیکھا۔ وہ ملعون اپنی چھڑی میرے بھائی کے پاکیزہ لبوں اور پاک دانتوں پر مارتا تھا اور نہایت بے حیائی و گستاخی سے کہتا

تھا: حسینؑ! اس ضربِ چوب کو کیسا پاتے ہو؟"

جنابِ امام سجاد علیہ السلام نے اپنا چہرہ قبرِ رسولؐ پر رکھ دیا۔ قبرِ رسولؐ کو گلے لگا کے روتے تھے اور کہتے تھے:

اُنَاجِیْکَ یَاجَدَّاہُ یَاخَیْرَ مُرْسَلٍ
جبکَ مقتول و نسلک ضَائِعٌ
اَنَاجِیکَ محزونَاعَلِیْلاًموجلاً
اَسِیْرَاوَّمَالِیَ حَامِیٌ وَّمَدَافِعٌ
مُبِیْنًا کَمَا تُسْبٰی الاماوُوَمَسَّنَا
مِنَ الضَّرِمَالَا تحملہُ اِلَّاضَائِعٌ
اَلَایَا جَدُیَاجَدَّاہُ بعدکَ اَظھَرت
اُمَیّۃُ فِیْنَامکرھاوالشتائِع

حالت یہ تھی کہ اہلِ مدینہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور ہر طرف "وامحمّداہُ واعلیّاہُ، واحسیناہُ" کی صدائیں بلند تھیں۔

ناسخ التواریخ میں مذکور ہے کہ پندرہ روز تک گریہ وبکا اور نوحہ و مرثیہ کا سلسلہ شہر میں جاری رہا۔ یہ عمومی ماتم تھا جو سارے شہر میں قائم رہا ورنہ اہلِ بیتِ رسولؐ کے گھروں میں تو صفِ ماتم جنابِ مختارؒ کے انتقام تک بچھی رہی۔

معلوم نہیں یہ مظلوم و اُجڑے ہوئے مسافر کس حال میں گھروں میں داخل ہوئے ہوں گے اور اُجڑے گھروں کی حالت اور خالی گھروں کی بربادی دیکھ کر اُن کے دلوں پر کیا گزری ہوگی!

آباد زمانہ بھی دیکھا، پُررونق گھر بھی دیکھے، اب یہ اُجڑے ہوئے گھر جو بربادی کا مرثیہ اور تباہی کا نوحہ پڑھ رہے تھے، اپنے مکینوں کے بچھڑ جانے کا دردناک قصہ زبانِ حال سے بیان کر رہے تھے۔ آنے والے مسافروں کا حسرت نے استقبال کیا۔ گریہ وبکا نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بربادی طواف کر رہی تھی اور تباہی گلے مل رہی تھی۔ آنسوؤں کا طوفان تھمتا نہ تھا۔ سروں پر ہاتھ رکھ کر نبی زادیاںؑ بین کرتی تھیں۔

مولا حسین علیہ السلام کا گھر خالی، عباسؑ کا دالان اُجڑا ہوا، حسنِ مجتبیٰؑ کا صحن ویران پڑا تھا۔ عقیلؑ کا گھر سنسان، جناب

عبداللہ ابن جعفر کا گھر بے رونق تھا۔ بنی ہاشم کے محلہ میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ مستورات بنی ہاشم جو مدینہ میں رہ گئی تھیں، حضرت اُمِ سلمہؓ، اُم البنینؑ، اُم ہانیؓ، دُختران جناب عقیلؑ، جناب اُمِ ہانیؓ، رملہؓ، اسماءؓ، زینبؓ، کس طرح نبی زادیوںؑ اور ظلم رسیدہ بیبیوں کے گلے مل کر روئی ہوں گی! انہوں نے حالات دریافت کئے ہوں گے اور انہوں نے بتائے ہوں گے۔ انہوں نے ایک ایک شہید کا حال پوچھا ہوگا اور انہوں نے بتایا ہوگا۔

بہر حال غموں کے پہاڑ تھے جو آلِ رسولؐ نے سروں پر اُٹھائے اور دُکھوں کے دریا تھے جو انہوںؑ نے عبور کئے۔ تاریخ عالم میں کوئی ایسا قافلہ نہیں ملتا جو اس طرح لٹا ہوا واپس آیا ہو اور کوئی ایسے شہید و اسیر نہیں دیکھے جن پر اس قدر گریہ و بکا کیا گیا ہو۔ کوئی ایسی داستان نہیں جو اتنی دردناک ہو اور کوئی ایسی تحریک و اقدام نہیں جو اس قدر حیرت انگیز و کامیاب ہو۔

پس اُجڑے ہوئے اہل بیتؑ رسولؐ برباد گھروں میں مقیم ہو گئے۔ نعمان بن بشیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب واپس جانے لگا تو دُخترانِ جناب امیر علیہم السلام نے چند زیورات اس کی خدمت کے صلہ میں اس کے پاس بھیجے اور ساتھ ہی معذرت بھیجی کہ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چیز نہیں جو تمہاری خدمت کے عوض دیں۔

نعمان بن بشیر نے یہ زیورات لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ خدمت میں نے قربۃً الی اللہ اور قرابتِ رسولؐ کی نیت سے کی ہے، دُنیوی غرض سے نہیں کی۔

پاسبانِ یزید چلے گئے اور اہل بیتؑ رسولؐ نے صفِ ماتم گھروں میں اور جناب سجاد علیہ السلام نے بیت الحزن میں شہیدوں کا غم زندہ رکھنے کیلئے بچھائی۔ مرد جناب سجادؑ کے پاس اور عورتیں جناب زینبؑ اور دیگر مستورات کے پاس پرسہ دینے اور تعزیت کرنے کیلئے آتی تھیں۔

یہ غم ایسا نہ تھا جو ختم ہو جاتا یا کم ہو جاتا۔ ہر روز تازہ تھا اور ہر گھڑی زندہ تھا۔ سوگوار مستورات اور غمخوار بیبیوں نے کبھی کھانا نہ پکایا اور کبھی اچھا کپڑا نہ پہنا۔ نہ سروں میں تیل لگایا اور نہ آنکھوں میں سرمہ۔ نہ کبھی ٹھنڈا پانی پیا اور نہ اچھا کھانا کھایا۔ سیاہ لباس ہوتا، صفِ ماتم ہوتی اور نوحہ و بین ہوتے۔

جناب سجاد علیہ السلام ان کے پاس کھانا بھجواتے جو زندگی برقرار رکھنے کیلئے کھالیتیں۔

جناب سجاد علیہ السلام کے پاس جب غلام کھانا یا پانی لے کر آتا تو امامؑ کی آنکھیں برسنے لگ جاتیں۔ غلام عرض کرتا:

مولاؑ! کب تک روتے رہیں گے، رونے کی حد ہوتی ہے، آپؑ کا رونا کب ختم ہوگا؟

فرمایا: ''جناب یعقوبؑ کا ایک لعل گم ہوا تھا اور اس کی زندگی کا اُنہیں علم بھی تھا، پھر بھی اتنا روئے تھے کہ روتے روتے

آنکھیں سفید ہوگئیں۔ میرے اٹھارہ بنی ہاشم کے افراد میدانِ کربلا میں مارے گئے اوران کی لاشیں میں نے گرم ریت پر خاک و خون میں غلطاں، بے گور وکفن دیکھیں۔ میں نے اپنے بابا، اپنے چچاؤں اور بھائیوں کو خاک وخون میں غلطاں دیکھا اور پھوپھیوں، ماؤں اور بہنوں کو جلتے ہوئے خیموں سے عریاں سر نکلتے دیکھا۔ بھلا یہ غم میں کیسے بھلا سکتا ہوں اور یہ گریہ کیسے ضبط کرسکتا ہوں؟''

واقعہ کربلا کے بعد جناب سجاد علیہ السلام چونتیس برس زندہ رہے اور یہ مدت عبادت اور گریہ و بکا میں بسر ہوئی۔ کھانا آنسوؤں میں بھیگ جاتا اور پانی اشکوں میں مخلوط ہو جاتا۔

جنابِ اُمِ رُبابؑ نے ٹھنڈا پانی پینا اور سایہ میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ دھوپ کی شدت کی وجہ سے رنگت تبدیل ہوگئی تھی اور اسی غم میں انتقال فرما گئیں۔

مدینہ سے یہ قافلہ چلا تھا تو پچاس محمل تھے۔ بنی ہاشم کے مرد بھی تھے اور مستورات بھی تھیں۔ لیکن یہ مصیبت زدہ قافلہ واپس پلٹا تو چند محمل تھے۔ مرد تمام راہِ خدا میں میدانِ کربلا میں کام آئے۔ بیوہ، دُکھی بیکس شہزادیاں یتیم بچوں کے ساتھ اسیر ہو کر کوفہ وشام روانہ ہوئیں۔ کچھ بچے عصرِ عاشور کو شدتِ پیاس سے اور گھبرا کر رحلت کر گئے۔ کچھ بچے گھوڑوں کے گھمسان میں پامال ہو گئے۔ کچھ شام کی راہ میں مدفون ہوئے اور کچھ زندانِ شام میں انتقال کر گئے۔

بنی ہاشم کی یہ شہزادیاں شام کی قید سے رہا ہو کر واپس وطن آئیں اور رونے پیٹنے اور عبادت میں مشغول رہیں۔ غم کم نہ ہوتا تھا اور مصیبت تازہ ہوتی رہتی تھی۔ پانچ سال کے بعد جنابِ مختارؒ نے انتقام لیا اور عبیداللہ ابن زیاد ملعون کا سر مدینہ آیا تو سوگوار مستورات اور آلِ محمدؐ کے ماتم داروں کا غم ہلکا ہوا۔

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

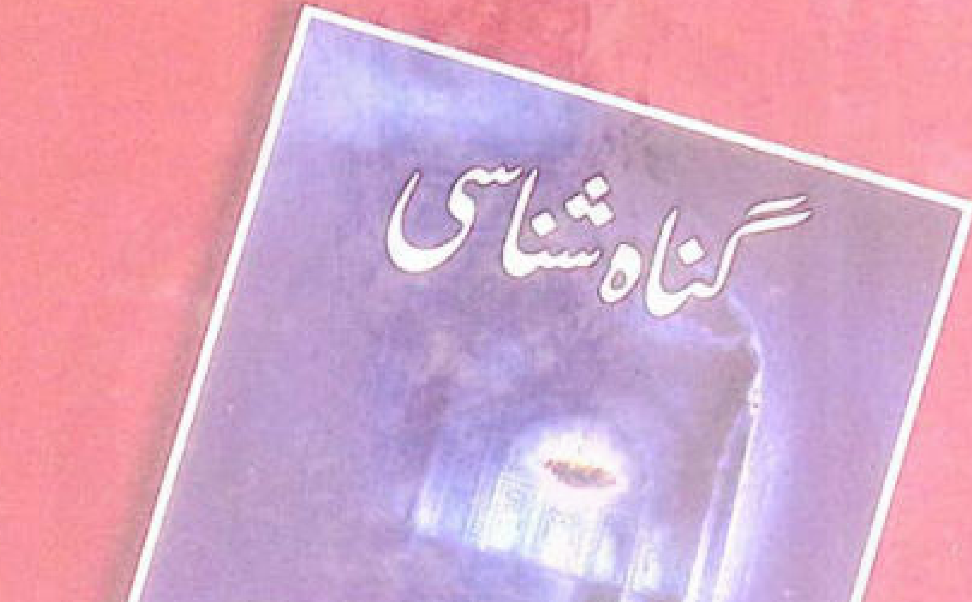
امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز

امامیہ
پبلیکیشنز


گناہ شناسی
آیت اللہ محسن علی قرائتی
مولانا نذیر حسین ناصری